ماہر القادری

پین اسلامک اسٹیم شپ کمپنی لمیٹڈ

فخر کے ساتھ

اعلان کرتی ہے کہ حال ہی میں اس کے بیڑے میں ایک اور جہاز ''سوکوشی مارو'' (۸۱۳۵ ٹن وزنی) کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ مسافر اور مال بردار ہے اور جدید وضع کا بہت ہی تیز رفتار جہاز ہے —

اب کمپنی کے بیڑے میں ذیل کے چار جہاز ہیں:—

''سفینۂ عرب''   ''سفینۂ مراد''

''سفینۂ طارق''   ''سوکوشی مارو'' (ابھی اسکا نام نہیں رکھا گیا)

انشاءاللہ زمانۂ قریب میں کمپنی پچھلے سال سے کہیں بہتر نتائج دکھائیگی
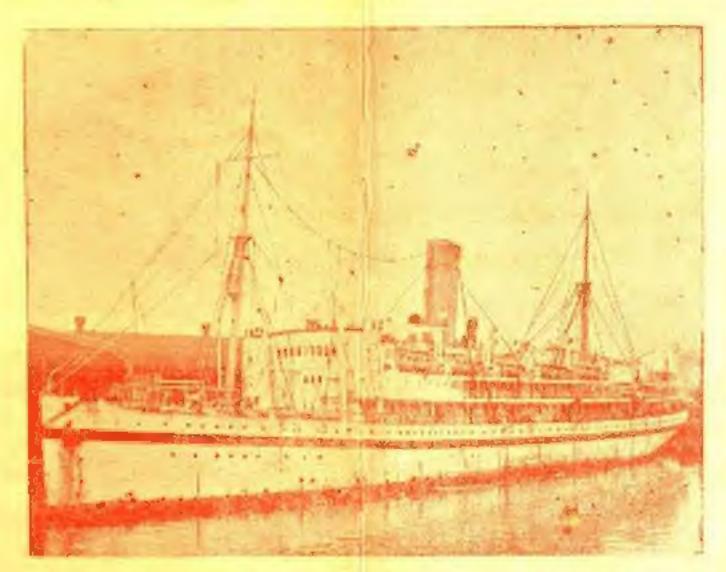
اس بین الاسلامی کمپنی کے حصص خرید کر پاکستان کو صنعتی اور اقتصادی طور پر مضبوط بنائیے

قیمت فی حصہ ۱۰۰

حصص کے لئے لکھئے:

پین اسلامک اسٹیم شپ کمپنی لمیٹڈ

۴۔ بندوق والا بلڈنگ میکلوڈ روڈ — کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

یہ جو ہم خوب لہک لہک کر پڑھتے ہیں :—

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

اور ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بھی

اے خدا ! شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

تو کیا واقعی ہمیں شکوہ سنجی کا حق حاصل ہے، اور جس رحمت، لطف و کرم اور انعام و عطا کے ہم مستحق ہیں اُس سے ہمیں محروم کر دیا گیا ہے؟ آج کی صحبت میں ہم اسی چیز کا جائزہ لینا چاہتے ہیں !

ہم سب اللہ کے فضل سے مسلمان ہیں، اللہ، رسول، کتاب، ملائکہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، کلمہ اور درود پڑھتے ہیں اور اسلام اور صرف اسلام کو "صراطِ مستقیم" سمجھتے ہیں —————— مگر یہ سب کچھ "پڑھنے"، "کہنے" "سمجھنے" اور اعتقاد رکھنے" تک محدود ہے، خود ہماری زندگیاں "کرنے" سے خالی نظر آتی ہیں، ہم باتوں کے دھنی، گفتگو کے مردِ میدان اور زبانی دعووں کے رستم و افراسیاب ہیں مگر جب "عمل" کی باری آتی ہے تو ہم سے زیادہ ناکارہ، کاہل، سُست، پیماں شکن، وعدہ فراموش، اور غفلت شعار شاید ہی دُنیا میں کوئی ہوگا، ہمارے اعمال ہماری زبان کا بالکل ساتھ نہیں دیتے، ہم "نفاق" کے مرض میں مبتلا ہیں، دینِ اسلام جس کے عشق کا ہم دعویٰ کرتے اور جس کی محبت کا دم بھرتے ہیں، اپنے عمل سے ہم اُس کے ایک ایک حکم اور ایک ایک ضابطہ کی نفی کرتے ہیں، ہم اپنی اعمالیوں میں شاید "بنی اسرائیل" پر بھی سبقت لے گئے ہیں، اور پچھلی نافرمان اُمتوں کو ہم نے سرکشی اور نافرمانی میں کوسوں

پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ آدمی سے زندگی میں کوئی لغزش ہو ہی نہیں سکتی اور نہ مسلمان کے بارے میں ہمارا معیار یہ ہے کہ وہ تقدیس و عصمت میں "جبریل" بن جائے کہ جہاں خطا اور لغزش کا امکان ہی نہ ہو! غلطیاں ہو سکتی ہیں، گناہوں کا ارتکاب ممکن ہے، خواہشِ نفس کا غلبہ ہو سکتا ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مسلمان غلطی، لغزش گناہ اور نافرمانی ہی کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنالے، یعنی جب وہ "فرشتہ" نہیں بن سکتا تو پھر اسے لامحالہ شیطان بن جانا چاہیئے، ایک تو ہوتی ہے کبھی کبھار کی لغزش کہ کوئی خطا ہوگئی، اللہ سے خلوص و ندامت کے ساتھ مغفرت طلب کی اور آئندہ کے لیے اور زیادہ محتاط ہوگئے، ندامت و توبہ سے تو قلب میں بڑا گداز پیدا ہوتا ہے ——

—— لیکن یہاں یہ صورت ہی نہیں، ہم "عاشقانِ رسول" اور "فدائیانِ اسلام" تو گناہوں پر جم گئے ہیں لغزشیں اور نافرمانیاں ہماری عادتِ ثانیہ بن گئی ہیں، بُرائی کا احساس ہی مٹتا جارہا ہے اور بعض گناہ تو ہماری نگاہوں میں حسین اور محبوب بن گئے ہیں، قوم کی قوم ہی بے عملی، بدکرداری اور طغیان و سرکشی کا شکار ہے، خرابیاں دو چار اور دس بیس نہیں، بلکہ اتنی ہیں کہ اُن کا شمار مشکل ہے۔

ہماری تجارت سُود، سٹہ، لاٹری اور طرح طرح کی ناجائز منفعتوں سے آلودہ ہے، ہماری تجارت گاہیں درحقیقت دھوکے کی منڈیاں ہیں، قصائی اور ترکاری فروش سے لے کر بڑے بڑے بیوپاریوں تک ہر کوئی گاہک کو فریب دینے کی کوشش کرتا ہے، مسلمانوں کی کسی بستی میں ایک چھٹانک خالص دودھ کا دستیاب ہونا مشکل ہے، کس کس طرح سے چیزوں میں ملاوٹیں کی جاتی ہیں، کیسے کیسے تجربہ کار ڈنڈی مار اور کیسے کیسے شاطر کم تولنے والے ہم "ویل للمطففین" کی وعید سُننے والے مسلمانوں میں موجود ہیں، مول تول کرتے وقت شاید ہم کو اپنا "مسلمان" ہونا یاد ہی نہیں رہتا۔ تجارت، معاملت اور لین دین میں جائز اور ناجائز کی بہت ہی کم لوگ پروا کرتے ہیں، شاذ و نادر جیسے اُردو پسیدی! ہماری نادہندگی اور بدمعاملگی اس حد تک پہونچ چکی ہے کہ غیر مُسلم ہم سے معاملہ کرتے ہوئے ڈرتے ہیں، ہماری بددیانتی ضرب المثل بن گئی ہے —— حالانکہ ایک دور ہماری تاریخ میں ایسا بھی گزرا ہے کہ ہماری دیانت، راستبازی اور خوش معاملگی کی دُنیا قسم کھاتی تھی اور تجارت اور کاروبار میں ہم سے زیادہ ساکھ اور کسی کی نہ تھی، لفظ "مُسلم" تجارتی اعتماد کے لیے اپنی جگہ خود سب سے بڑی ضمانت تھا اور اب اسی مقدّس نام کو ہم نے اپنے اعمال سے ذلیل اور بے اعتماد بنا دیا ہے۔

ہمارے اغنیا اور دولت مند نشۂ مال و دولت میں سرشار ہیں، وہ حکومت کا لگایا ہوا ہر قسم کا "ٹیکس" دے سکتے ہیں مگر اللہ کا مقرر کیا ہوا ٹیکس —— زکوٰۃ —— ادا نہیں کرتے، "زکوٰۃ" کا تو لفظ ہی شاید وہ بھول چکے ہیں اس لیے اُن کی کوٹھیوں، خزانوں، تجوریوں، الماریوں اور بنکوں میں وہ مال و دولت جمع ہے جس کا غالب حصہ نجاست آلود ہے! اپنے ذاتی عیش و راحت پر وہ بے اندازہ دولت خرچ کرسکتے ہیں اور کرتے ہی ہیں مگر حاجت مندوں کو وہ بھیک دیتے بھی ہیں تو پیشانی پر سیکڑوں بل ڈال کر جیسے وہ کوئی بڑا اذیت وہ کام انجام دے رہے ہیں، ہاں! جہاں نام و نمود کا موقعہ ہو، کسی جلسہ یا انجمن کی صدارت میسر ہو، اخبارات میں نام یا فوٹو چھپنے کا امکان ہو، عہدیداروں کی خوشنودی اور قربت ملتی ہو، —— وہاں وہ خوب دل کھول کے خرچ کرتے اور عطیے DONATIONS دیتے ہیں، وہ لاکھوں روپیہ خرچ کرکے کوئی سڑک، ہسپتال، مدرسہ، یتیم خانہ، پبلک لائبریری یا ہال بنوادیں گے

بشرطیکہ اُن کا مجسمہ وہاں نصب ہو سکے، اُن کے نام کی تختی لگ سکے، یا اُن کے نام سے نسبت ہو سکے، یہی وہ غلط کار اور خود پرست گروہ ہے جس کے حرکات و اعمال کی بدولت "کمیونزم" ——— جو دُنیا کی سب سے بڑی لعنت ہے ——— روز بروز فروغ پا رہا ہے، یہ لوگ اس آگ کے لئے ایندھن اکٹھا کر رہے ہیں، جو اُن کے قصر و ایوان، کوٹھیوں، بنگلوں اور کارخانوں کے ساتھ دوسروں کے رہنے کی جھونپڑیوں اور آرام گاہوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے کر جہنم بنا دے گا۔

حدیث شریف میں رشوت لینے والے (مُرتشی) رشوت دینے والے (راشی) اور بیچ کے آدمی (رائش) پر لعنت آئی ہے، مگر ہمارے اہلِ معاملہ اور اہلِ دفاتر اور اربابِ محکمہ زیادہ تر اس لعنت میں گرفتار ہیں، رشوت اب "حق" بن کر رہ گئی ہے، مٹھی گرم کئے بغیر کاربرآری ذرا مشکل ہی سے ہوتی ہے، "جلبِ منفعت" کے یہ سلسلے دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں، "پرمٹ" کس کس ہیر پھیری کے ساتھ ملتے اور حاصل کئے جاتے ہیں اور پھر وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں کس کس طرح منتقل اور فروخت ہوتے رہتے ہیں، عہدیداروں کے بھتوں اور کلرکوں کے سفر خرچ کی داستان کچھ کم پُراسرار نہیں ہے۔

جیب کترے، اُٹھائی گیرے، چور، ڈاکو، رہزن اور قاتل ہم مسلمانوں ہی کے بھائی بند ہیں، عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں ہم جا کر دیتے ہیں، ہمارے ہی وُکلا و جان کر چوروں، قاتلوں اور مجرموں کے مقدموں کی پیروی کرتے اور اُن کو عدالتوں سے چھڑوانے کے لئے پُورا زور لگاتے ہیں، شراب خانے اور ناچ گھر ہمارے ہی دم قدم سے آباد ہیں، جوئے کے استال قومی خدمت کے نام پر ہم لگاتے ہیں اور عورتوں کو نچوا کر اُس کی آمدنی قومی فنڈوں میں ہمیں دیتے ہیں ——— سینما گھروں پر جا کر عوام مسلمانوں کی بے خبری، فاقہ مستی، بے فکری اور ہوس پرستی کے مناظر دن رات میں کم سے کم تین بار دکھائی دے سکتے ہیں، ٹکٹ کے لئے کئی کئی گھنٹہ دھوپ میں بیٹھے رہنا، پولس والوں کے ڈنڈے اور تماشائیوں کے دھکے کھانا، قرض دام بیکر اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر سینما دیکھنا، یہ سب ذلتیں آخر کس لئے گوارا کی جاتی ہیں؟ —— آنکھوں کے لطف و تفریح کے لئے! اور یہ نہیں ہوتا، نہیں ہو سکتا کہ سینما دیکھا، ڈیڑھ دو گھنٹہ آنکھیں سینکیں اور چلے آئے، چلو چھٹی ہوئی: مگر چھٹی پھر کہاں ملتی ہے، خیال و فکر پر سینما چھایا رہتا ہے، فلمی اسکرین کے مناظر زندگیوں کے اسکرین پر دُہرائے جاتے ہیں، جوان لڑکوں اور لڑکیوں میں جو رومان انگیز بے باکیاں پیدا ہوئی ہیں، اُن میں "سینما" کا بھی بہت کچھ ہاتھ ہے۔

نماز جس کی قرآن شریف میں سب سے زیادہ تاکید آئی ہے، اور حدیث میں جسے "دین کا ستون" فرمایا گیا ہے کہ جس نے نماز قضا کی گویا اُس نے دین ہی ڈھا دیا، کفر اور اسلام کے درمیان وجہِ امتیاز "صلوٰۃ" ہی ہے، مومن کو "معراج" نماز ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے لیکر بہت بعد تک کے مسلمان اس بات کا تصوّر ہی نہ کر سکتے تھے کہ کوئی مسلمان "بے نمازی" بھی ہو سکتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ہم یہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ کوئی آدمی بغیر کھائے پئے زندہ رہ سکتا ہے، جس طرح کھانا پینا ہر زندگی کے لئے ضروری ہے، اسی طرح ایمان و اسلام کا سب سے زیادہ ضروری اور اوّلین تقاضا "نماز" ہے، مسلمان اور "بے نمازی" یہ ایک اچنبھے کی بات ہے ——— مگر یہ "اچنبھا" اب ہماری زندگیوں کا معمول بن کر رہ گیا ہے، نماز کی طرف سے عام غفلت پائی جاتی ہے، جلسوں، ہوٹلوں، کلب گھروں، سڑکوں اور کالجوں، مدرسوں، دفتروں، ریلوں، جہازوں، اور سیرگاہوں میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ۔

مسلمانوں کی اکثریت "بے نمازی" ہے! ہم ایسی صحبتوں اور دعوتوں اور اجتماعوں میں بھی شریک ہوئے ہیں جہاں دو دو سو ڈھائی ڈھائی سو مسلمانوں میں سے دو تین مسلمانوں نے نماز پڑھی ہے، باقی سب سگریٹ پیتے، پان چباتے، باتیں کرتے شعر پڑھتے اور تاش کھیلتے رہے، اور کچھ ایسے "مذہبی مسلمان" بھی ہیں جو جمعہ کے جمعہ نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ کو احسان مند کر آتے ہیں اور یہ عادت انھوں نے عیسائیوں سے سیکھی ہو کہ اُن کے یہاں عبادت کے لئے اتوار کا دن مقرر ہے!

علماء سے اصلاحِ حال کی توقع ہو سکتی تھی سو اُن کی اکثریت فریبِ نفس کی مریض ہے، اُن میں حق گوئی کا جذبہ نہیں رہا، امیروں، دولت مندوں اور حاکموں کی بُرائیوں پر وہ احتساب نہیں کرتے، نام و نمود اور شہرت کی طلب بھی اُن میں پائی جاتی ہے، اور بعض بعض تو ان میں ایسے بھی ہیں کہ جو اس ٹوہ میں رہتے ہیں کہ کسی جلسہ میں تقریر کرنے، صدر بننے یا کسی حاکم کے یہاں وفد لے جانے کا کوئی موقعہ میسر آ جائے، سرمایہ دار اُن سے دُعا کے طالب رہتے ہیں اور اسی جھاڑ پھونک اور دُعا، گوئی کے طفیل میں اُن کو "دستِ غیب" کی کرامت حاصل ہے، یہ حضرات دین کے بنیادی کاموں سے غفلت برتتے ہیں اُن میں نسیمِ سحری کی خوش خرامی تو ہے مگر طوفانوں جیسا جوش نہیں ہے، وہ اس میں خوش رہتے ہیں اور صرف اسی کو دین کا بہت بڑا کام خیال کرتے ہیں ——— کہ کسی سرمایہ دار نے مسجد بنوا دی، مدرسہ قایم کرا دیا، کوئی کتاب چھپوا دی، کسی کو حج کے لئے بھجوا دیا، بس اللہ اللہ خیر سلا، دین کا فرض پورا ہو گیا ——— وہ چاہیں تو اپنے رسوخ و اثر کو استعمال کر کے دین کی سربلندی کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں مگر بیٹھے بٹھائے خطروں اور مشقتوں کو مول کون لے؟ جنت بہر حال یوں بھی مل جائے گی، اور مغفرت کے وہ اس طرح بھی مستحق ہیں ——— حالانکہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:- "اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ..." (کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ اللہ نے ابھی یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں وہ کون لوگ ہیں جو اُس کی راہ میں جان لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں)

نماز میں "آمین" کہنے اور نہ کہنے، رفع یدین کرنے اور نہ کرنے پر اُن کو اپنے مسلک کی مطابقت اور عدم مطابقت کے اعتبار سے خوشی اور رنج ہوتا ہے مگر "حق" کی مظلومیت اور اجنبیت کا غم اُن کی ایک رات کو بھی بے خواب نہیں بناتا، نکاح و طلاق کے مسائل بتا کر، اذان دے کر اور نماز پڑھا کر جمعہ کے دن کپڑوں میں خوشبو لگا کر اور کھجور سے روزہ افطار کر ہمارے عُلما مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اقامتِ دین کا حق پُوری طرح ادا ہو گیا، اس حقیقت کو شاید وہ بھول جاتے ہیں کہ جن کی "سُنت" کی اتباع میں وہ جو کچھ کرتے ہیں اُن (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ پر بدر و خیبر بھی فتح ہوا تھا اور جب وہ دُنیائے ناپائیدار سے رُخصت ہوئے ہیں تو اسلامی اسٹیٹ رسول اللہ نے چھوڑی تھی جس میں اللہ کے قانون کے سوا اور کسی کا قانون نہ چلتا تھا، عام طور پر ہمارے علماء کرام اور مفتیانِ عظام اس فریضے سے غافل ہیں اور نظامِ حق کے قیام کو انھوں نے شاید دُنیا داری اور سیاست کا کام سمجھ رکھا ہے!

ہماری زبوں حالی پر نہ جانے کتنی صدیاں گزر چکی ہیں، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلمانوں کا گھریلو ماحول عصمت و غیرت کے اعتبار سے قریب قریب ہر دور میں قابلِ قدر بلکہ مثالی رہا ہے، ہندوستان میں انگریزوں نے مسلمانوں کے گھریلو ماحول ہی سے متاثر ہو کر ریلوں، ویٹنگ روموں، کالجوں اور اسکولوں میں مردانہ اور زنانہ کی تفریق اور امتیاز کو گوارا کیا بلکہ آخر وقت تک باقی رکھا ... مگر مسلمانوں کا یہ امتیاز بھی اب ختم ہوتا جا رہا ہے، غیرت اب سرِ بازار رُسوا ہو رہی ہے اور عصمت اب پبلک

اسٹیجوں پر ناچ کر، گا بجا کر اور ایکٹنگ کرکے عوام سے داد و ستائش اور قدردانی کا خراج وصول کر رہی ہے، مسلمانوں کی جوان اور نوخیز لڑکیاں جس طرح کس بندھ کر اور بن سنور کر سڑکوں پر نکلتی ہیں، اُسے دیکھ کر ارباب غیرت کے دل شرم کے مارے کٹ کٹ جاتے ہیں، ہم جو یہود و نصاریٰ کی صنفِ نازک کی معاشرت پر انگلیاں اُٹھاتے تھے، اب اُن کے آگے آنکھیں اُٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتے،

ہمارا ذہین اور لکھا پڑھا طبقہ "اسلام" کے نعرے تو لگاتا ہے، مگر اُس کے پیشِ نظر وہ اسلام نہیں ہے جس کی نمائندگی اور ترجمانی صدیق و فاروق اور عثمان و علی (رضی اللہ عنہم) کی زندگیاں کرتی تھیں، بلکہ اُن کے سامنے امان اللہ خاں، مصطفےٰ کمال پاشا اور رضا شاہ جیسے لیڈروں کے کارنامے ہیں اور ان کو انھوں نے "اسلام" کا نام دے رکھا ہے، وہ کسی مسئلہ میں کتاب و سنت میں کوئی نظیر اور مثال تلاش کرنے کی بجائے، ان لیڈروں کی زندگیوں کی طرف رجوع کرتے ہیں ——— اور ان سے ذرا زیادہ بلند ادیبوں اور انشا پردازوں کا جو گروہ ہے وہ اپنے قلم کے زور سے "دین" کو بازیچۂ اطفال بنائے دے رہا ہے، اور قرآن کی تفسیر کو انھوں نے آسکر وائلڈ کی افسانہ نگاری کا رنگ دے دیا ہے ——— "معارف القرآن" ——— "دو قرآن" ——— اور "دو اسلام" جیسی کتابیں ہمارے ادب میں آ رہی ہیں، "دین کی سربلندی" کے نام پر دین کو گرانے کی کوشش، تاریخ کا ایک عجیب و غریب موڑ ہے، یہ فتنہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی گمراہ کن ہے، وہ لوگ جو تکلیفات شرعی اور دینی پابندیوں سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں، اُن میں یہ "خیالات" مقبول ہو رہے ہیں، اگر اسی انداز کی کتابیں ہمارے لٹریچر میں آتی رہیں، "نیاز فتح پوری" اور "برق جیلانیوں" کی کوششوں کی بدولت ہمارا نوجوان طبقہ "اللہ اکبر" کہہ کر اللہ کے احکام کی گردن پر "تجدید و اصلاح" کی چھری بے دریغ چلا دے گا ——— فکر و بصیرت (؟) کی ہائے وہ روشنی (؟) جس میں دھوئیں اور اندھیرے کے سوا اور کچھ نہ ہو ———

مسلمانوں کی "تفریط" کا یہ عالم ہے کہ بدعت شکنی اور توحید پرستی کے نام پر مولد النبی اور جنت البقیع تک کو کھود کر پھینک دیتے ہیں ——— اور دوسری طرف "افراط" کا یہ رنگ ہے کہ قبروں پر میلے لگاتے ہیں، چراغ جلاتے ہیں، طواف کرتے ہیں، درگاہوں کی چوکھٹوں کو چومتے ہیں، غیر اللہ کے ناموں کی دُہائی دیتے ہیں، اُن سے مُرادیں مانگتے ہیں، عرضیاں لکھ لکھ کر قبروں کی جالیوں اور مُنڈیروں میں باندھتے ہیں، مدار کی چھڑیاں، بی بی کی صحنک، امام جعفر صادق کے کونڈے، کسی کے نام کی "گاگر" کسی کی منت کا "پنکھا" اور کسی کا "توشہ" ہے ——— جانوروں کو غیر اللہ سے منسوب کرکے قربانی کرتے ہیں، "بدعت" کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ضلالت" فرمایا تھا مگر اس "ضلالت" پر ذوق و وجدان اور اسلاف پرستی نے "سعادت و ثواب" کی مہریں لگا دی ہیں، "وہابیت" اور "نجدیت" کی مخالفت کا جوش "توحید" کی بنیادیں کھوکھلی کئے دے رہا ہے، مشرکانہ رسوم کے لئے یہود و نصاریٰ کے فریسیوں اور صدوقیوں کی طرح عجیب عجیب حسین اصطلاحیں تراش لی گئی ہیں ——— جب ہماری نازمانیوں، بد اعمالیوں اور بے عقیدگیوں کا یہ عالم ہو تو پھر "فضل" کے نہیں، "غضب" ہی کے ہم مستحق ہیں، اللہ تعالیٰ کسی پر ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا، اُس کے یہاں عدل ہی عدل اور خیر ہی خیر ہے، ہم جن مصیبتوں اور پریشانیوں میں گرفتار ہیں اس کے ذمہ دار خود ہم ہیں، ہم وہ کاٹ کر رہے ہیں جو ہم نے بویا ہی تھا۔

پھر ... کیا کریں؟

جب مسلمانوں کی زندگیوں کا یہ رنگ ہو، تو پھر کیا کریں؟ مایوس ہو جائیں، ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ

رہیں، تقدیر پر شاکر ہو جائیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے اُسے بہر حال ہونا ہے، اور جو ہونے والا ہے، وہ ہو کر رہے گا، ہمارے کرنے سے کیا ہو گا؟ نقار خانہ میں طوطی کی آواز کا وزن ہی کیا ہے، گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چند دیا سلائیوں کی رگڑ سے بھلا کہیں اُجالا ہو سکتا ہے ——— تو یاد رکھیے کہ یہ سب کمزوری کی باتیں ہیں، ایسے موقعوں پر شیطان غلط قسم کی قناعت اور بے جا صبر کی تلقین کیا کرتا ہے، ناامیدی مسلمان کا شیوہ ہی نہیں ہے، ایمان آدمی کو انتہائی حوصلہ مند اور پُرامید بنا تا ہے، مسلمان کا حال اُس طبیب حاذق و دردمند کی طرح ہوتا ہے اور ہونا چاہیے جو مریض کی آخری سانس تک اُس کے علاج معالجہ کے لئے دوڑ دھوپ کئے جاتا ہے۔

گمراہیوں کے ہجوم سے ہمیں مرعوب نہ ہونا چاہیئے بلکہ ہم جن صداقتوں اور حقیقتوں پر ایمان رکھتے ہیں اُن کو مسلسل پیش کرنا ہمارے فرائض میں داخل ہے ——— پس ہر دردمند مسلمان جو اصلاح کا جذبہ رکھتا ہے اُس کا کام یہ ہے کہ انفرادی طور پر ماحول کے سنوارنے اور بدلنے کے لئے کوشش کرے، اگر اُس کی سعی و توجہ سے ایک شخص بھی نمازی بن گیا، ایک سود خوار بھی سود لینے سے باز آگیا، ایک بے حجاب عورت نے بھی بے حجابی کو چھوڑ دیا، ایک دولت مند بھی زکوٰۃ دینے لگا، ایک پیشانی بھی قبر کے سامنے جھکنے سے رُک گئی، ایک فاسق میں بھی تقویٰ کی صفت پیدا ہو گئی، ایک رشوت لینے والے نے بھی رشوت لینا ترک کر دیا ——— تو یہ خود اپنی جگہ بہت بڑا کام ہو گا، مگر یہ کام آسان نہیں ہے، اس میں لوگوں کی جھڑکیاں اور گالیاں سُننی پڑیں گی، وقت کا ایثار کرنا ہو گا، بہت سوں کی ناراضگی بلکہ بعض حالات میں عداوت مول لینی پڑے گی، کیا عجب ہے کہ اپنے پرائے اور یگانے بیگانے بھی بن جائیں، حق و صداقت کی راہ میں پھول نہیں کانٹے ہی بچھے ہوتے ہیں، یا تو "حق و صداقت" کا نام لینا چھوڑ دینا چاہیئے اور اگر یہ تڑپ موجود ہے تو پھر قربانیوں کے بغیر اصلاحِ حال کا موقع میسر نہیں ہو سکتا۔

یہ تو رہا انفرادی معاملہ ——— مگر "دین" میں "اجتماعی تقاضے" بھی تو موجود ہیں، اس کے لئے شاید کہا جائے گا کہ کوئی "انجمن" بنا دیں، کسی "جماعت" کی بنا ڈال دیں، کوئی "سوسائٹی" قائم کر دیں ——— جی! اللہ کے فضل سے تجدید و اصلاح اور اسلامی انقلاب کی جد و جہد کے لئے "جماعتیں" پہلے سے موجود ہیں ——— "اخوان المسلمون" اور "جماعتِ اسلامی" ——— عرب ممالک میں "اخوان المسلمون" اپنا کام بڑی گرم جوشی اور خلوص و دیانت کے ساتھ انجام دے رہی ہے، اور ہمارے نواح میں "جماعتِ اسلامی" نے اس بارِ گراں کو اپنے شانوں پر اٹھا لیا ہے، اگر آپ حق کی فتح، باطل کی شکست، اسلام کی سربلندی اور کفر کی ذلت چاہتے ہیں تو اُن مجاہدین کے ساتھ شانہ بشانہ اللہ کی راہ میں گرم سفر ہو جائیے، زیادہ سوچنے کا وقت نہیں رہا، تذبذب دور ہو جانا چاہیے، دو ٹوک فیصلہ ادھر یا اُدھر، حق کا غلبہ منظور ہے یا کفر کا! اگر کفر کے غلبہ پر اطمینان ہے تو پھر ہم آپ سے کچھ نہیں کہتے ——— اور اگر ایسا نہیں ہے، حمیتِ اسلامی کی رمق ابھی باقی ہے اور دینی غیرت کی چنگاری ابھی موجود ہے، تو پھر خدا کا نام لیکر اُٹھیے اور حق و باطل کی کشمکش میں حق پرستوں کا ساتھ دیجیے، اس عزم کے ساتھ اُٹھیے کہ آپ اور صرف آپ ہی کو فتحمند ہونا ہے، دنیا کی قیادت اور پیشوائی کے سزاوار آپ ہیں، تخت و تاج کے کھلونوں اور حکومت و فرماں روائی کی ان کٹھ پتلیوں کو "صالحین" کے لئے ایک نہ ایک دن جگہ بہر حال چھوڑ دینی ہے یہاں تک کہ خدا کی خدائی میں صرف خدا کا حکم چلے اور کائنات نیکیوں سے معمور ہو جائے ———

ماہر القادری
۲۴ مارچ ۵۲ء

محمد ابو زہرہ
(کلیہ حقوق جامعہ فواد مصر)

مترجمہ:- طٰہٰ یٰسین
رفیق دار العروبہ

قرآن کا عرفانی اعجاز ـــــ شریعتِ قرآنی

اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر نبی کو ایسے معجزوں کے ساتھ مبعوث فرمایا جو عقل کے لئے حیران کن تھے - قدرتِ انسانی جن کی مثل لانے سے عاجز تھی - اور جو ہر ایسے شخص کو جس کو اللہ تعالیٰ نے کچھ بھی نورِ بصیرت عطاء فرمایا ہے، ایمان و تسلیم پر آمادہ کر دیتے تھے، ہر معجزہ نبی کے دورِ بعثت کے مناسب حال ہوا کرتا تھا - اس میں ان کی عقلوں کی رسائی کو بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا، کہ وہ معجزہ وغیرہ کے باب میں قدرت انسانی کے حدود کس حد تک سمجھتے ہیں اور ساتھ ہی اُن کے حالات کی اصلاح بھی پیشِ نظر ہوتی تھی - موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ایک ایسے شہر میں وقوع پذیر ہوا تھا، جو سحر اور جادو کے فن کو حدِ کمال تک پہونچا چکا تھا - اسلئے ان سے اسی قسم کے معجزے ظاہر ہوئے - عیسیٰ علیہ السلام ایک ایسی قوم کے درمیان تھے، جو مادّی قوت کے غلبہ پر ایمان رکھتی تھی - اور مادّی حدود سے باہر کسی چیز کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھی - اس لئے عیسیٰ علیہ السلام کے تمام معجزات مادہ سے بھی برتر ایک قوت کو ثابت کرنے والے تھے - یہاں تک کہ آنحضرت علیہ السلام کی پیدائش بھی اسی نوع کی تھی - اور یہی ایک چیز رُوح کے غلبہ، اسبابِ مادّیہ کی ناپائداری، مسبّبات کی اسباب سے بے نیازی، اور بغیر اسباب کے مسبّبات کے ظاہر ہو سکنے کی کھلی ہوئی دلیل تھی -

انبیاء سابقین کے تمام معجزات مادّی اور حسّی معجزات تھے، جو روحانی حقائق اور وحیِ آسمانی کے اسرار کو کھولنے والے ہوتے تھے، جو احساس کو ٹھوکے دے کر اسے قبولِ حق پر آمادہ کرتے، اور عقل کو حیران کر کے اپنا مطیع بنا لیتے تھے اور ہر وہ شخص، جس کے دل پر پردہ نہ ہو، صدقِ دل سے ایمان لاتا تھا - جو انکار اور ہٹ دھرمی کی راہ پر اڑا رہتا تو صرف اپنی بدبختی کی شامت سے - اور اس کی یہ گمراہی خود اس کی نفس کی حقیقتوں کو اس سے پوشیدہ کر دیتی تھی -

لیکن، انبیاء سابقین کے معجزات کے برخلاف، ہم دیکھتے ہیں، کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ مادّی نوع کا نہیں ہے، جو مادّی طور پر اپنے وجود کا پتہ دے - اور نہ کوئی امر محسوس ہے، کہ اس کے اعجاز کو کھلی آنکھوں سے دیکھا جا سکے - بلکہ وہ ایک امر معنوی ہے، جو عقل و فہم ہی سے سمجھا جا سکتا ہے - اور ہر زمانہ میں انسان کا حاسۂ مدرکہ اس کا ادراک کر سکتا ہے - لیل و نہار کی گردشیں نہ اس کی حجیّت کو ختم کر سکتی ہیں، اور نہ اس کے اعجاز کو زائل کر سکتی ہیں -

یہاں پر بادی النظر میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ امر معنوی کیوں ہے ؟ اور انبیاً سابقین کے معجزے محسوس معجزے کیوں تھے ؟ کیا وجہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تو کلام ؟ ہے، اور دوسرے معجزات مادّی واقعات و حقایق ہیں ؟

اس سوال کا جواب ہمیں خود نفس شریعت محمدّی اور حقیقت قرآن سے معلوم ہو سکتا ہے - شریعت محمدی ہمیشہ قایم اور باقی رہنے والی شریعت ہے - یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اس وقت تک، کہ تمام رُوئے

زمین کا صرف ایک اللہ ہی وارث ہو، تمام نسلوں اور قوموں کو اپنا مخاطب بناتی ہو۔ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسان، خواہ ان میں کتنے ہی نسلی، وطنی اور تہذیبی اختلافات ہوں، اس کے مخاطب ہیں۔ اس لئے یہ ناگزیر تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ اس عموم اور خلود سے مطابقت رکھنے والا ہوتا۔ اور یہ اس صورت میں ممکن نہیں تھا، کہ آپؐ کے معجزات مادی واقعات ہوتے، جو اپنے وقت کے ساتھ ختم ہو جاتے، اور سوائے اس شخص کے جو اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہو، کوئی اس کو علم یقین کے ساتھ نہیں جان سکتا۔ اس آگ کی ماہیت کو جس میں ابراہیم خلیل اللہ ڈالے گئے تھے، اور اس نے انھیں جلایا نہیں تھا، سوائے ان کے جنھوں نے اس کا مشاہدہ کیا تھا، اور کوئی یقین کے ساتھ نہیں جان سکتا۔ اس عصائے موسیٰ کو، جو اژدہے میں تبدیل ہو گیا تھا، اور جادوگروں کے بنے بنائے کھیل کو نگل رہا تھا، سوائے اُن کے جنھوں نے اسے دیکھا تھا، اور کوئی کلی طور پر نہیں سمجھ سکتا۔ عیسیٰ علیہ السلام کا مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو چنگا کرنا، کوئی ایسا شخص باور نہیں کر سکتا، جس نے اسے محسوس نہ کیا ہو۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ وہ قرآن متلو ہے، جو شریعت محکمہ کے احکام پر مشتمل ہے۔ وہ قیامت تک باقی رہنے والا، دیکھا اور پڑھا جانے والا ہے۔ اس کی حقیقت کو وہ شخص بھی سمجھ سکتا ہے، جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی، انھیں دیکھا اور ان سے گفتگو کا شرف حاصل کیا، اور وہ بھی، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مسعود کے دس صدیوں بعد گزرے، بلکہ دسیوں صدیوں بعد بھی، اگر زمین پر انسان کی عمر اتنی طویل ہو سکے۔ اس کے ماننے والے نے ہر دور میں اس کو اسی حالت میں محفوظ رکھا ہے، جیسے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ○ — بے شک ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزے کو ان کے بعد بھی ہر دور کے انسان ایسے ہی کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، جیسے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مخاطبین اوّلین نے دیکھا تھا۔ اگرچہ ان صحابہ کرام کو ایک علمی فضیلت حاصل ہے، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی براہ راست مخاطبت، اور ان سے گفتگو کا فیض ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ نبی کی ذات حق کا منبع، عرفان کا مبدا، ہدایت کا سرچشمہ اور نور وجود ہے۔

ہر زمانے کے لوگ، جب اس کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں، تو یہ اللہ کی حجت ہے، جو ان پر قایم ہو جاتی ہے۔ وہ گمراہ ہوتے ہیں تو جہل و نادانی یا دلائل کے نقص اور معاملے کے مشکوک ہونے کی وجہ سے نہیں ہوتے، بلکہ بصیرت کے اندھے پن، خواہشات کی غلامی اور اوہام کے غلبہ کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

علماء قدیم و جدید نے اس پر بہت کلام فرمایا ہے، کہ قرآن کا وہ کونسا خاص اعجاز ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قرآن کا یہ اعجاز وہ سچے واقعات ہیں، جن کو نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے طریق وحی کے کسی دوسرے ذریعے سے نہیں جانا۔ اس لئے کہ انھوں نے نہ کسی استاد کے آگے زانوئے ادب تہ کیا، نہ تعلیم پائی، اور نہ زیادہ سیر و سیاحت ہی کی تھی کہ ان سفروں سے انھیں تجرباتی علم حاصل ہوتا۔ بلکہ بطحاء مکہ سے سوائے دو دفعہ کے انھوں نے آگے قدم ہی نہیں بڑھایا تھا۔ ایک مرتبہ اس وقت، جبکہ وہ بارہ برس کے تھے، اور دوسری مرتبہ اس وقت، جبکہ ان کی عمر تقریباً پچیس سال کی تھی۔ آپ کے اس طرح امی ہونے کے باوجود

واقعات کا سچا ہونا اس کے قرآن من اللہ ہونے کی ایک کھلی ہوئی دلیل ہے۔

بعض کہتے ہیں، کہ یہ اعجاز، قرآن کا ان حقائق علمیہ کو نیز پر مشتمل ہونا ہے جن تک عقل انسانی کی رسائی صدیوں بعد جا کر ہوئی ہے؛ اور یہ قرآن میں اس نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بیان ہوئے ہیں، جنھوں نے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، نہ کوئی تعلیم حاصل کی، نہ کسی استاد سے فیض پایا۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ اعجاز، قرآن کے اسلوب بیان، اس کی ہم آہنگی، اور ترتیب میں پوشیدہ ہے۔ ایک بڑا گروہ اسی کا قائل ہے۔ قرآن کریم کی مختلف عبارتیں بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ قرآن کریم نے اپنے مخاطبین کو چیلنج کیا تھا، کہ تم ایسی بس سورتیں ہی لے آؤ خواہ گھڑ کر ہی سہی، تو وہ اس سے عاجز آ گئے تھے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ قرآن کا اسلوب ایک معجزہ ہے۔ اور اس کے معجزہ ہونے میں کسی قسم کا شک نہیں ہو سکتا۔

ہمارا خیال ہے، کہ علماء کرام نے یہ سبب جو کچھ فرمایا ہے، وہ بلاشک قرآن کے اعجاز کے اسباب ہیں۔ لیکن ایک سبب اور بھی ہے، جس کی طرف ہمارے علماء کا خیال نہیں گیا۔ حالانکہ ہم اسے تمام اسباب سے زیادہ قوی سبب پاتے ہیں یا تمام اسباب سے زیادہ قوی سبب نہ بھی کہا جا سکے تو بھی قوی ترین سبب کے ہم پلہ ضرور ہے۔ اس سے قرآن تمام انسانوں کے لئے معجزہ قرار پاتا ہے۔ صرف عرب، یا کسی خاص دور کے لئے نہیں، بلکہ تمام زمانوں اور نسلوں کے لئے اس کے معجزہ ہونے کی یہی دلیل ملتی ہے —— یہ ہے قرآنی شریعت۔ وہ تمام احکام جن پر قرآن مشتمل ہے، خواہ وہ احکام گھریلو زندگی سے متعلق ہوں، یا اجتماعات سے بحث کرتے ہوں، یا بین الاقوامی تعلقات کی وضاحت کرتے ہوں، اپنے باب میں اپنی مثال آپ ہیں، نہ کسی سابق شریعت کو اس پر تقدم حاصل ہے، اور نہ کوئی معاصر قانون ہی ان امتیازی خصوصیات کا حامل ہے۔ پھر جب یہ ساری باتیں اس امی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوئی ہیں، جو نہ پڑھ لکھ سکتا تھا، نہ کوئی تعلیم ہی اس نے پائی تھی، نہ تلقین و توقیف سے، نہ تجربے اور سیر و سیاحت سے، تو یہ ایک ایسا اعجاز معلوم ہوتا ہے، جس کا ظاہری سبب معلوم کرنے کے لیے عقلیں حیران رہ جائیں۔ لامحالہ ماننا پڑتا ہے، کہ یہ سب اسی قدیر کی طرف سے ہے، جو قادر و توانا ہے۔ اور یہ ساری باتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لاشریک ذات کی طرف سے بلاکم و کاست پیش فرمائیں۔

یہ اجمال کسی قدر تفصیل کا طالب ہے —— اس شریعت کی اصلی قدر و قیمت معلوم کرنے کے لئے اور یہ جاننے کے لئے کہ لوگوں نے اس کو کس حیثیت سے دیکھا ہے، ہمیں اپنے ماضی کے صفحات الٹنے ہوں گے، اور مستقبل پر بھی ایک نگاہ ڈالنی ہوگی۔

جہاں تک ماضی کا تعلق ہے، ہم دیکھتے ہیں، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے قریبی دور میں قانون روما[1] کا زیادہ چلن تھا۔ اس قانون کی تصنیفات —— خواہ وہ ماضی سے متعلق ہوں یا عہد بعد سے —— مصر و شام، اور عرب سے لگے ہوئے، اور اسے مغرب اور شمال کی جانب سے گھیرنے والے دوسرے ملکوں میں رائج تھیں۔ آج کے اس دور میں بھی علماء قانون کا کہنا ہے، کہ قانون روما، وہ اکمل ترین قانون ہے جس سے عقل انسانی کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ بہت سے موجودہ اور

[1] ROMAN LAW

مروجہ قوانین نے بھی اسی قانون کو اپنی اصل تسلیم کیا ہے۔ اسی منبع سے وہ پھوٹے ہیں، اور اسی کی بنیادوں پر، انھوں نے اپنی عمارت کو استوار کیا ہے۔

اگر کوئی شریعت اسلامیہ کی حقیقی قدر و منزلت جاننا چاہے، اور یہ معلوم کرنا چاہے، کہ وہ کس طرح عقل انسانی کے معیار سے بلند تر ہے، تو وہ، اس کا اور قانون روما کا موازنہ کرے۔ اس لئے کہ قانون روما نے بازار عام میں اپنی خاص ساکھ پیدا کر لی ہے۔ جسٹنین کے عہد سلطنت ۵۲۳ء میں، وہ اپنے کمال کو پہونچ چکا تھا۔ اس دور میں وہ آغاز سلطنت روما ۷۵۳ء قبل مسیح سے لیکر ۵۳۲ء بعد مسیح تک کے تمام قوانین کا خلاصہ تھا، جس میں تمام پچھلے قوانین کے عیوب اور کوتاہیوں کی اصلاح کر دی گئی تھی۔ دوسرے الفاظ میں وہ قریب قریب تیرہ صدیوں کے قانونی تجربوں کا نچوڑ تھا۔ اسی دوران میں یونانی فلسفہ ظاہر ہوا، اور اپنے عروج کو پہونچا۔ رومیوں نے یونان کے سولن اور لائیکر گس کے قوانین، اور یونان کے علم نظم اجتماعی سے اپنے قانونی تجربوں میں مدد لی۔ ان فلسفیانہ نظم اجتماعی کے خاکوں سے بھی انھوں نے فائدہ اٹھایا جس کو فلاسفۂ یونان نے پیش کیا تھا، اور جس میں انھوں نے بتایا تھا، کہ وہ مثالی نظام زندگی کیا ہو سکتا ہے جس میں اعلیٰ درجہ کی اجتماعیت پروان چڑھ سکتی ہے۔ مثال کے طور پر فلاطون کی "قانون" اور "جمہوریت"، ارسطو کی "سیاست"، اس کے علاوہ اور بھی علماء و فلاسفہ یونان و روما کی عقلی کاوشیں ہیں، جن سے انھوں نے استفادہ کیا۔

آپ کہہ سکتے ہیں، کہ قانون روما، تیرہ صدیوں میں عقل انسانی نے حقوق و واجبات کی تنظیم میں جو کچھ کمالات حاصل کئے، ان سب کا خلاصہ ہے، جب ہم اس کا اور اس شریعت کا موازنہ کرتے ہیں، جو نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے پیش فرمائی، تو حق اور عدل وہی معلوم ہوتا ہے، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اور جو ان کے اقوال سے بعد کے فقہاء کرام نے مستنبط کیا۔ اس مقام پر ہمیں لامحالہ اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کسی انسان کی بنائی ہوئی نہیں، بلکہ اس اللہ کی بنائی ہوئی ہے، جو علیم و حکیم اور لطیف و خبیر ہے۔

قرآن اور اس کے سابقہ اور معاصر قوانین کا آپ خواہ کسی حیثیت سے موازنہ کریں، آپ پر روحانی بلندی و رفعت اور زمینی اخلاق کا فرق واضح ہو جائے گا۔

مساوات قانونی کے اعتبار سے، ہم دیکھتے ہیں، کہ شریعتِ محمدی تمام معاصر قوانین سے بلند درجہ پر فائز ہے۔ جن میں سے کسی نے بھی مساوات کی اس اصل کا اعتراف نہیں کیا۔ قرآن کہتا ہے:-

یاایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ و	اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا
جعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم	ہے اور تمھاری الگ الگ ذاتیں اور قبیلے بنائے تاکہ آپس کی پہچان
عند اللہ اتقاکم　　(الحجرات)	ہو۔ اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ بزرگ وہی ہے جو زیادہ متقی ہو۔

لیکن تمام سابق اور معاصر قوانین میں سے کسی میں بھی ایسی اجناس اور یوان کے درمیان کامل مساوات کا سراغ نہیں ملتا۔ بلکہ ان کے ہاں تو ایک ہی قوم کے افراد کے درمیان بھی مساوات کا وجود نہیں۔

شریعت قرآنی غلاموں کی سزا میں تخفیف کے اصول پر عامل ہے۔ اور ان کے لئے آزاد آدمی سے نصف سزا قرار دیتی ہے۔ چنانچہ قرآن لونڈیوں کے بارے میں کہتا ہے:-

فاذا احصن فان أتين بفاحشة فعليهن نصف ما على المحصنات من العذاب
(النساء)

پھر جب یہ لونڈیاں قید نکاح میں آجائیں اور اس کے بعد بدکاری کی مرتکب ہوں تو ان پر شریف بیبیوں کی آدھی سزا ہوگی۔

اسی طرح غلام کا بھی حال ہے، کہ اگر وہ بدکاری کا مرتکب ہو، تو اس کی سزا، آزاد کی سزا سے نصف ہوگی۔

لیکن قانون روما کہتا ہے :- جو کوئی کسی پاک دامن بیوہ عورت، یا کنواری کی عصمت دری کرے، تو اس کے طبقہ اعلیٰ سے ہونے کی صورت میں بطور سزا اس سے نصف مال لیا جائے گا، اور طبقہ ادنیٰ سے ہونے کی صورت میں، اُسے کوڑے لگائے جائیں گے، اور ملک بدر کر دیا جائے گا۔

کوئی بھی غیر جانب دار شخص، بیک نظر دیکھ کر ہی، شریعت قرآنی کے نقطہ نظر کی صحت کا اعتراف کرے گا۔ اس لئے کہ شخاص اور سزاؤں کے درمیان نسبت تصاعدی ہونا چاہیے نہ کہ نسبت معکوس۔ بڑے آدمی کی سزا بڑی ہو اور چھوٹے آدمی کی سزا چھوٹی۔ حقیر آدمی کے لئے جرائم کا ارتکاب زیادہ آسان ہے، اس لئے اس کی سزا میں تخفیف ملحوظ ہے۔ اور ایسا آدمی جو لوگوں کی نگاہوں میں بڑا قرار پا جاتا ہے، تو اس کی بڑائی کے اعتبار سے اس پر ذمہ داریاں بھی زیادہ ہوتی ہیں، اور اس کے چھوٹے جرائم بھی بڑے جرائم شمار ہوتے ہیں، اس لئے اس کی سزا بڑھا دی جانی چاہیئے ——— جاہ و ثروت اور دوسرے دنیوی، سبب ایسے نہیں، جن کے ساتھ ذمہ داریاں نہ ہوں، بلکہ ان کی کمی بیشی کے اعتبار سے کم یا زیادہ ذمہ داریاں ان کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔

ایسے قوانین، جو اس کے برعکس اصول پر عمل پیرا ہیں، جیسے قانون روما، وہ ظالمانہ قوانین ہیں۔ اس لئے کہ ان کی منطق قوت کی منطق ہے۔ اگر کوئی شخص جاہ و مرتبہ والا ہوتا ہے، تو اس کی سزا کم کر دی جاتی ہے، اور اگر کوئی کمزور ہوتا ہے، تو اس کی سزا زیادہ کر دی جاتی ہے۔ وہ سفید پوش کی پشت پناہی کرتا ہے، اور کمزور کی طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھاتا۔ قرآن نے اس کو "حکم جاہلیت" سے تعبیر کیا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ان یہودیوں کے بارے میں فرمایا، جنھوں نے ایک شریف زانی کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مقررہ سزا سے کم تر سزا کا مطالبہ کیا تھا۔

افحکم الجاهلية يبغون ومن احسن من الله حكماً لقوم يوقنون
(المائدہ)

تو پھر کیا وہ "حکم جاہلیت" کے طلب گار ہیں، حالانکہ یقین و ایمان کی دولت سے مالا مال لوگوں کے لئے، اللہ سے بہتر، اور کون حکم کرنے والا ہو سکتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

انما اهلك الذين من قبلكم انهم كانوا اذا سرق الشريف تركوه واذا سرق الضعيف قطعوه - وايم الله لو أن فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها

تم سے پہلے کے لوگ اس لئے ہلاک ہوئے کہ جب کوئی شریف چوری کرتا، تو چھوڑ دیتے، اور کمزور چوری کرتا، تو اس کا ہاتھ کاٹتے۔ قسم بخدا، اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرے، تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دوں۔

اسلام سے قبل کمزور، درماندہ، اور محتاج، بھوکا اور گرفتار بلا تھا۔ ایسے میں اسلام نے آکر زکوٰۃ شروع کر دی۔ ہر مالدار کے مال میں ان کا حق متعین و مخصوص کر دیا۔ کوئی مالدار اس حق زکوٰۃ کو ادا کئے بغیر نہیں چھوٹ سکتا۔ یہاں تک کہ امام شافعیؒ نے فرمایا: جب کسی مالدار کے مقررہ مقدار مال پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے، تو وہ اس حصہ مال کا مالک نہیں رہتا جس پر زکوٰۃ واجب

ہوئی ہے اسی لئے اگر وہ زکوٰۃ ادا کئے بغیر اس میں تصرف کرے تو وہ تصرف باطل ہوگا۔ اگر وہ منفرد صدقہ اور زکوٰۃ ادا کئے بغیر مر جائے تو وہ اس کے ترکے میں سے لی جائے گی، اور اس کے تمام قرضوں پر اس کو مقدم رکھا جائے گا۔

اسلام، زکوٰۃ کو احسان کی قبیل سے شمار نہیں کرتا، جو لینے والے کی گردن جھکا دے۔ بلکہ مالداروں پر اس کو فرض قرار دیتا ہے، جو فقراء و مساکین کی نیابت میں حاکم اسلام ان سے حاصل کرتا ہے، اور محتاجوں میں ہر ایک کی ضرورت کے مطابق تقسیم کرتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے سال ارادہ کیا تھا، کہ وہ بنفس نفیس ملکوں کا دورہ کریں، اور محتاجوں میں ہر ایک کو اس کی ضرورت اور ان کے اہل و عیال کے مطابق، بیت المال سے ان کے حقوق تقسیم کریں۔ زکوٰۃ کے علاوہ بیت المال کی دوسری رقوم سے کسی کو کچھ دیا جاتا ہو، تو وہ ان کی اسلام کی راہ میں قربانیوں، اور تکالیف کے مطابق دیا جائے

قانون روما، اپنے ایک دور میں، قرض دینے والے کو اس بات تک کا مجاز گردانتا تھا، کہ اگر قرض دار، قرضے کی رقم ادا نہ کر سکے تو وہ اسے غلام بنالے۔ لیکن قرآن، جو ایک نبی اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوا، اور جو ان پر اللہ رب العزت تبارک و تعالےٰ نے نازل فرمایا، یہ قانون قرار دیتا ہے، کہ ایسے قرض داروں کے قرض ادا کرنے کا حکومت بندوبست کرے گی، جو اپنے قرض ادا نہیں کر سکتے۔ بشرطیکہ ان کا قرض بینا، اسراف اور فضول خرچی کی قبیل سے نہ ہو۔ بلکہ حاکم وقت پر فرض ہے، کہ وہ ان لوگوں کے قرض بہر حال ادا کرے، جو اجتماعی زندگی اور سوشل کاموں میں نمایاں مقام رکھتے ہوں، جیسے وہ، جو لوگوں کے درمیان صلح کرانے والے ہوں۔ ان لوگوں کا قرض بیت المال سے ادا کیا جائے گا، خواہ وہ اتنے زیادہ عاجز اور معذور نہ ہوں، کہ اپنا قرض ادا نہ کر سکیں ——— ——— اور یہ سب ادائیگیاں زکوٰۃ کے مال سے ہوں گی، جیسا کہ نصوص قرآنی سے ہمیں معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے خیال میں، یہ وہ اعلیٰ اور مثالی نمونے ہیں، جو کسی انسانی قانون میں ہم نہیں پا سکتے۔ پھر جب حال یہ ہو، کہ یہ سب باتیں ایک اَن پڑھ شخص نے بتائی ہیں، جو نہ لکھ پڑھ سکتا تھا، اور نہ جس نے تعلیم ہی حاصل کی تھی، تو کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے، کہ یہ سب باتیں اس اللہ کی طرف سے ہیں، جو قادر و توانا ہے؟

غلامی، دنیا میں، ایک ثابت شدہ حقیقت بن چکی تھی۔ فلاسفہ یونان نے بھی اپنے پیش کردہ خاکوں میں اس کا اقرار کیا تھا، اور اس کو ایک عادلانہ نظام قرار دیا تھا، جس میں کسی قسم کے ظلم کا شائبہ بھی نہیں۔ کسی قانون نے بھی اسے بُرا نہیں ٹھیرایا تھا۔ ارسطو کا کہنا تھا کہ "غلامی نظامِ فطرت ہے۔ اس لئے کہ لوگوں کا ایک طبقہ ایسا ہے، جو صرف غلام ہی بن کر رہ سکتا ہے، اور ایک طبقہ ایسا ہے، جو آزاد ہی زندگی بسر کر سکتا ہے ——— ایسے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور فرمایا:۔

الناس سواسیۃ کاسنان المشط　　　　تمام انسان آپس میں ایسے برابر ہیں، جیسے کنگھی کے
کلکم لآدم و آدم من تراب　　　　دانے۔ تم سب آدم سے ہو اور آدم مٹی سے تھے۔

قرآن کریم نے اپنی محکم آیات میں کہیں بھی غلامی کا حکم نہیں فرمایا، بلکہ اس کے برخلاف، آزاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ قرآن کریم کی کوئی نص بھی ایسی نہیں جس سے غلامی کی اباحت ثابت ہوتی ہو، بلکہ اس کی تمام نصوص غلاموں کے آزاد کرنے کو واجب قرار دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ اسلام نے اپنی عادلانہ جنگ میں بھی قیدیوں کے غلام بنانے کا ذکر نہیں فرمایا، بلکہ فرمایا:۔

حتیٰ اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد و اما فداء حتی تضع الحرب اوزارھا (محمد)	یہاں تک کہ جب تم انہیں خوب قتل کر چکو تو مضبوط باندھ لو۔ پھر یا احسان کیجیو یا معاوضہ لیجیو، حتیٰ کہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔

یہاں قیدیوں کے بارے میں دو ہی صورتیں بتائی ہیں:— یا تو ان پر احسان کرکے چھوڑ دو، یا ان کی قوم کے لوگ زرِ فدیہ دینے پر قادر ہوں، تو زرِ فدیہ لے کر رہا کر دو[۵]

قرآن نے آزاد کرنے کے اسباب کو بہت وسعت دی ہے، اور حریت انسانی سے متمتع ہونے کا ہر ایک کو حق دیا ہے۔ اس کا دروازہ ہر ایک کے لئے کھلا ہوا ہے، اور کسی کو روک ٹوک نہیں۔ قرآن نے آزاد کرنے کو بڑے ثواب اور نیکی کی بات قرار دیا ہے، خواہ آزاد کردہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو۔

ارشاد فرمایا:—

فلا اقتحم العقبہ وما ادراک ما العقبہ فک رقبۃ (البلد)	سو وہ دھمک سے گھاٹی پر، اور تو کیا سمجھا، وہ گھاٹی کیا ہے۔ وہ ہے گردن کا چھڑانا۔

جس نے بغیر عذر رمضان کا روزہ توڑا، اس پر ایک غلام کا آزاد کرنا فرض کیا گیا جس نے قسم کھا کر توڑ دی، اس پر ایک غلام کا آزاد کرنا فرض کر دیا گیا۔ جس نے خطاً کسی مومن کو قتل کر دیا، اس پر ایک غلام کا آزاد کرنا فرض کر دیا گیا۔ جس نے اپنی بیوی کے لئے ماں سے مشابہ کوئی لفظ کہا، اس پر ایک غلام کا آزاد کرنا فرض کر دیا گیا۔

اگر کوئی غلام آزاد ہونا چاہے، مثال کے طور پر یوں کہ وہ اپنی قیمت ادا کر دیگا، تو اس کا آقا اسے مکاتب قرار دے، اور اسے چھوڑ دے کہ وہ قیمت کما لائے۔

اگر کوئی محرمات میں سے کسی کا مالک ہو جائے، تو وہ اسے چھوڑ دے

کسی نے اپنے غلام کو ناروا مارا، تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو آزاد کر دے۔

---

۵ ہمیں تعجب ہے کہ صاحب مضمون، باوجود اپنے علم و فضل کے، اس آیت سے وہ مطلب لے رہے ہیں جو عام طور پر مغرب سے مرعوب ذہنیتیں لیتی ہیں۔ حالانکہ نہ عقلی طور پر اس نتیجہ کو درست قرار دیا جا سکتا ہے، نہ نقل و روایت کی رو سے یہ صحیح ہے۔ اور نہ قرآن کے الفاظ ہی ان معنی میں محدود ہیں۔ غلامی کے مسئلہ پر آج کے حالات سے قیاس کرنا مرعوب ذہنیت کے مظاہرے کے علاوہ، اصولاً بھی غلط ہے، اور ساری غلط فہمیوں کی بھی جڑ ہے۔ اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے آج سے تیرہ صدیوں پیشتر کی یہ حالت پیش نظر رہنی چاہیئے، جب کہ ایران ملک کو غلام بنا کر رکھنے کا عام طریقہ رائج تھا۔ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ اسیرانِ جنگ کا تبادلہ ہو، یا انہیں فدیہ دے کر چھڑا لیا جائے۔ ان حالات میں اسلام نے اسیرانِ جنگ کے غلام بنانے کو جائز قرار دیتے ہوئے، ان کے ساتھ حسن سلوک کی سخت تاکید کی ہے۔ چنانچہ احادیث میں مختلف جنگوں کے موقع پر غلام بنانے کا تذکرہ آتا ہے۔ البتہ جنگ کے علاوہ کسی دوسرے طریقے سے غلام بنانا سخت حرام قرار دیا گیا۔ آیت محولہ بالا میں لفظ "من" آیا ہے۔ جس کے معنی صرف "احسان" کے ہیں۔ جس طرح احسان کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے، کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے، اسی طرح ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے، کہ قید کی حالت میں ان کے ساتھ احسان کا برتاؤ کیا جائے۔

(ملخص از تصریحات مولانا مودودی) تفہیمات حصہ دوم

یہ سارے احکام ایسے دور میں دسنے گئے ہیں جب کہ انسانی حقوق کو بالکل نظر انداز کیا جارہا تھا۔ قرآن کے حکیمانہ احکام میں سے یہ بعض ہیں، جو قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی روشن شہادت ہیں۔

ڈاکٹر قاضی عبدالحمید
ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی

برگساں اور اقبال

بیسویں صدی کے فلسفہ پر ہنری برگ ن سے زائد شاید کسی کا اثر پڑا ہو۔ ہنری برگساں ۱۸۵۹ء میں نیکلو یہودی والدین سے پیدا ہوا۔ بچپن زمانے طالب علمی میں اُس نے ادب اور سائنس کی تعلیم حاصل کی۔ سائنس کے مطالعہ نے اُسے فلسفہ کی طرف مائل کر دیا۔ تمام عمر وہ پیرس یونیورسٹی میں فلسفہ کی تعلیم دیتا رہا۔ اُس کی سب سے مشہور تصنیف تخلیقی ارتقا creative evolution ہے۔ ۱۹۱۱ء میں اُس نے معلمی کا پیشہ ترک کر دیا، اور اپنے آپکو سیاسی مسائل اور بین الاقوامی مسائل کے لئے وقف کر دیا۔ ۱۹۲۸ء میں اُسے ادب میں نوبل پرائز ملا۔ ۱۹۴۱ء میں اُس نے انتقال کیا۔

اپنے فلسفہ کے ذریعہ برگساں نے روحانی عنصر کی برتری ثابت کی اور نسان کے لئے آزادیٔ عمل کو تسلیم کیا، اس طرح اُس نے مادیت اور تشکیک کے فلسفہ کی مخالفت کی جو علوم طبعی کے ماہرین نے پیدا کی تھی وہ کہتا ہے کہ حقیقت اصلی سے شعور اور مادہ پیدا ہوتے ہے اور پھر ان دونوں میں تقابل ہوتا ہے۔

برگساں کے نزدیک کائنات کی حقیقت اصلی تغیر ہے، بقول اقبال:۔

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

زندگی ایک مسلسل بہتا ہوا دریا ہے لیکن ہماری عقل اُس کے مختلف اجزا کا ادراک کرتی ہے اس لئے وہ ہمیں محدود دکھائی دیتی ہے۔ زندگی میں تخلیقی ارتقا جاری ہے۔ یہ ارتقا اُس قوت کے باعث ہوا ہے جسے برگساں élan vital کہتا ہے۔ یہ زندگی کی قوت ہے جو ہر چیز میں کارفرما ہے۔ اسی کے باعث کائنات کا وجود ہوا۔ اسی کے باعث جمادات نے نباتات کی شکل اختیار کی اور نباتات نے حیوانات کی اور اسی کے باعث حیوانات ترقی کرتے کرتے بالآخر انسانوں میں تبدیل ہو گئے۔

یہ زندگی کی قوت کیوں وجود میں آئی؟ یہ élan vital کیوں جاری ہے؟ برگساں اس کا کوئی جواب نہیں دیتا بلکہ اسے ایک بنیادی حقیقت تسلیم کرتا ہے۔ البتہ وہ زندگی کے سفر پر ایک نظر ڈالتا ہے اور اُن منازل کو بیان کرتا ہے جن میں سے ہو کر زندگی گزری ہے۔ دوران ارتقا میں زندگی کو اپنے سفر کی منازل طے کرنے کے لئے بہت سی چیزیں ایجاد کرنا پڑیں تاکہ وہ اس کے ذریعہ آگے بڑھ سکے۔ ان کے ذریعہ وہ ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کر سکے۔ اُس پر قابو پا سکے۔

اس قسم کی قوت، یک عقل بھی ہے جو انسانی زندگی میں اسی تخلیقی قوت élan vital نے پیدا کی ہے تاکہ اس کی مدد سے زندگی کا دراز سفر طے کر سکے۔ نسان اس عقلی قوت کے ذریعہ عمل کے لئے مقاصد متعین کرتا ہے۔ لیکن حقیقت اصلی سے اس کا سروکار نہیں ہوتا چنانکہ اس کا مقصد حقیقت اصلی کا علم حاصل کرنا نہیں ہوتا بلکہ عملی زندگی کے لئے اُصول اور قوانین فراہم کرنا ہوتے ہیں۔ عقل زندگی کی سطح سے ہمیں واقف کراتی ہے جس کا اظہار مکان SPACE اور مسلسل SERIAL TIME زمانہ میں ہوتا ہے۔ حالانکہ حقیقت اصلی کا اظہار اس کے مقابلہ میں شعور کی وحدت

میں ہوتا ہے جس کا علم ہمیں وجدان کے ذریعہ ہوتا ہے اور جو خالص وقت میں بنیادی وجود رکھتا ہے۔ جبلت جب باشعور ہو جاتی ہے تو وجدان کہلاتی ہے۔ حقیقت اس طرح ایک تخلیقی جذبہ دکھائی دیتی ہے۔ ایک ایسا جذبہ جو تخلیقی تغیر کے ذریعہ زندگی کا مسلسل ارتقا کر رہا ہے۔ یہ ایک زبردست آگے بڑھنے کی قوت ہے۔ یہ جمادات، نباتات اور حیوانات اور انسانوں میں یکساں موجود ہے۔ اسی قوت کے باعث چیزیں نشو و نما پا رہی ہیں۔

لیکن برگساں کہتا ہے کہ چیزوں کے ارتقا کی کوئی راہ مقرر نہیں کی جا سکتی۔ اُس کے خیال میں یہ داخلی جذبہ خود مستقل بالذات وجود رکھتا ہے اور آئندہ کے کسی مقصد کے لئے یہ وجود نہیں رکھتا۔ چیزیں اس لئے ارتقا نہیں کر رہی ہیں کہ ان کا کوئی خاص مقصد ہے۔ بلکہ وہ اس لئے ارتقا کر رہی ہیں کہ یہ اُن کی داخلی فطرت ہے اس طرح برگساں آزادیٔ عمل کی تعلیم دیتا ہے۔ تخلیقی جذبہ انھیں نمو کی طرف مائل کر رہا ہے۔ البتہ جب عقل کی نظر سے ہم ان چیزوں کی طرف دیکھتے ہیں تو ہمیں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ چیزوں کا کوئی مقصد ہے۔ عقل زندگی کی طرف مُڑ کر دیکھتی ہے۔ وہ زندگی کے لئے عملی مقاصد متعین کرتی ہے اس لئے وہ زندگی کی وحدت کو توڑ دیتی ہے۔ اُسے پارہ پارہ کر کے وہ زندگی کا مطالعہ کرتی ہے۔ یہی کام سائنس انجام دیتا ہے۔ اس کے ذریعہ اشیاء کا ادھورا علم حاصل ہوتا ہے اور ہم کبھی حقیقت اصلی کے سرچشمہ تک نہیں پہونچ سکتے۔ جو کہ ایک مسلسل بہتا ہوا دریا ہے۔ جس کا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ جس کی کوئی منزل ہے۔

ایک ایسی تغیر پذیر مسلسل حقیقت کا علم صرف ایک ایسے وقت کے ذریعہ ہو سکتا ہے جس کا نہ ماضی ہو، نہ حال نہ مستقبل چنانچہ برگساں ایک خالص وقت کا قائل ہے جو ان قیود سے آزاد ہو وہ وقت جس کا ماضی، حال اور مستقبل ہو انسانی عقل کی تخلیق ہے جو عملی مقاصد کے حصول کے لئے وجود میں آیا ہے۔ اس بنا پر برگساں serial time کے ساتھ ایک خالص وقت کا بھی قائل ہے۔

غرضکہ برگساں کے فلسفہ کے مندرجہ ذیل بنیادی خصائص ہیں :-

(۱) اصل حقیقت سے شعور اور مادہ پیدا ہوئے۔

(۲) élan vital تخلیقی جذبہ زندگی میں کارفرما ہے۔

(۳) وجدان جس کے ذریعہ ہمیں اس تغیر پذیر حقیقت کا علم ہوتا ہے۔

(۴) اصلی وقت جس میں اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے اور جو ماضی، حال اور مستقبل کی قیود سے آزاد ہے۔

(۵) عقل تخلیقی جذبہ کی تخلیق ہے جو اُس نے سفر کی ایک خاص منزل میں تخلیق کر لی ہے تاکہ زندگی کا سفر طے کر سکے۔

(۶) زندگی صرف ارتقا کر رہی ہے لیکن اس ارتقا کی نہ کوئی منزل ہے نہ مقصود۔

اقبال کی فکر پر برگساں کا کافی اثر پڑا ہے خصوصاً وہ برگساں کے فلسفہ تغیر سے کافی متاثر ہوا ہے۔ چنانچہ زندگی کی حقیقت وہ بھی تغیر سمجھتا ہے، چنانچہ وہ حقیقت حُسن کے عنوان کے تحت لکھتا ہے :-

خدا سے حُسن نے ایک روز یہ سوال کیا　　جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دُنیا　　شب دراز عدم کا فسانہ ہے دُنیا
ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اسکی　　وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جس کی
کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سُنی　　فلک پہ عام ہوئی اخترِ سحر نے سُنی

سحر نے تارے سے سُن کر سنائی شبنم کو　　　فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے　　　کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

اقبال نے اپنے کلام میں سیکڑوں جگہ اس خیال کو شاعری کا حسین جامہ پہنایا ہے۔
وہ برگساں کے ساتھ اس خیال میں بھی متفق ہے کہ زندگی کی اصل تغیر ہے چنانچہ وہ اپنی نظم چاند اور تارے میں اسی خیال کا اظہار کرتا ہے۔

ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے　　　تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے رہے وہی فلک پر　　　ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا　　　چلنا چلنا مدام چلنا
بے تاب ہے اس جہاں کی ہر شے　　　کہتے ہیں جسے سکوں نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کشِ سفر سب　　　تارے، انساں، شجر، حجر سب
ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا؟　　　منزل کبھی آئے گی نظر کیا
کہنے لگا چاند ہم نشینو!　　　اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو!
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی　　　یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ　　　کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے　　　پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں　　　جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں
انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق انتہا حسن

لیکن اقبال برگساں کے خلاف خرامِ زندگی کا انجام حسن سمجھتا ہے۔ لیکن برگساں کے نزدیک انجامِ زندگی مطلق نہیں ہے بلکہ مسلسل خرامِ زندگی ہی مقصودِ حیات ہے۔ ایک جذبہ ہے جو بلا مقصد تخلیق کئے جاتا ہے اس کے تخلیقی جذبہ پر شک ہوتا ہے کہ کہیں وہ شوپن ہاور کے اندھے ارادے کی مانند نہ ہو برگساں کے خلاف اقبال زندگی کا ایک مقصد سمجھتا ہے۔ زندگی کی ایک منزلِ مقصود ہے جس کی طرف وہ تدریجاً ارتقا کر رہی ہے۔ اقبال کا فلسفۂ خودی اس تصویر پر ایستادہ ہے۔ اقبال زندگی کی انتہا کو حسن کہتا ہے۔ کائنات میں تناسب و ہم آہنگی پیدا کرنا انسانی و کائناتی زندگی کا عین مقصدِ حیات ہے اس ہم آہنگی و تناسب کے لئے وہ انسانی خودی کی تہذیب و تربیت کا قائل ہے۔ اور یہی تہذیب و تربیت انسانی خودی میں وہ ملکہ پیدا کر دیتی ہے جو بالآخر اُسے خودیِ اعلیٰ یعنی خدا کے ساتھ ہم آہنگ کر دیتی ہے۔

اقبال برگساں کے ساتھ اس خیال میں متفق ہے کہ حقیقتِ اعلیٰ کا احصا عقل کی بجائے وجدان سے ہو سکتا ہے۔ وہ وجدان کی بے پناہ قوتوں کا قائل ہے۔ عقل کو وجدان کے مقابلہ میں وہ ایک کم تر درجہ کی چیز سمجھتا ہے۔

elan vital تخلیقی جذبہ کی جگہ اقبال عشق کی جامع اصطلاح استعمال کرتا ہے عشق کے باعث ہی کائنات وجود میں آئی اُسی کے باعث یہ کائنات ارتقا کر رہی ہے۔

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دم بدم

عشق کو اقبال بہرصورت عقل پر ترجیح دیتا ہے چونکہ وہ زندگی کی اصل ہے

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اقبال و برگساں دونوں عقل کا حصہ زندگی کے ارتقا میں ثانوی تسلیم کرتے ہیں۔

اقبال برگساں کی طرح ایک خالص وقت کا قائل ہے۔ وہ آزادانہ مکان و زمان کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ اُس کے وجود کو اضافی تسلیم کرتا ہے جو ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے آزادانہ وجود نہیں رکھتے جس طرح کہ آئنسٹائن کے نظریہ اضافیت نے ثابت کیا ہے بلکہ در اصل ایک ہیں۔ چنانچہ ہماری کائنات صرف تین "بعد" لمبائی، چوڑائی اور اونچائی نہیں ہیں بلکہ اُس کے ساتھ ہمیں ایک چوتھا عنصر وقت بھی شامل کرنا پڑتا ہے جس کے بغیر ہم چیزوں کی ماہیتِ اصلی سمجھ نہیں سکتے۔

غرضکہ اقبال اور برگساں کے خیالات میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے لیکن پھر بھی دونوں کی اپنی انفرادیت ہے۔ اقبال کی فکر پر اسلامی فکر کا گہرا اثر ہے وہ صوفی شعرا خصوصاً مولانا روم سے کافی متاثر ہوا ہے۔ مغربی مفکرین کے خیالات نے اُس کے یہاں ثانوی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

elan vital تخلیقی جذبہ اور اقبال کے تصورِ عشق میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے لیکن پھر بھی دونوں ایک نہیں ہیں۔ عشق کے تصور میں روحانی شوق و ولولہ پایا جاتا ہے۔ اس میں سوز و گداز بھی ہے۔

برگساں کے یہاں تخلیق صرف تخلیق کی خاطر ہے لیکن اقبال کے یہاں تخلیق کائنات ایک مقصد کی خاطر ہے۔ جس کی طرف کائنات تدریجاً بڑھ رہی ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ مقصد روحانی ہے۔ اقبال کے یہاں نمو اور تغیر کے تمام تصورات موجود ہوتے ہوئے بھی زندگی کا ایک مقصد ہے ایک حد بندی ہے۔ ایک انجام ہے یعنی زندگی کی ایک حد جہاں جا کر وہ ختم ہو جائیگی برگساں کے یہاں اِس کی کوئی حد نہیں ہے۔ ایک تسلسل ہے جو چلا جاتا ہے۔

یہ خیال کہ وجدان کے ذریعہ حقیقتِ اعلیٰ کا علم ہو سکتا ہے دونوں میں مشترک ہے۔ لیکن اقبال کے وجدان میں روحانی عناصر زیادہ نمایاں ہیں۔ وہ زندگی کو روحانی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے اور اِس لئے انسان کی تہذیب و تربیت پر زور دیتا ہے۔ وہ اِس مقصد کے لئے عقل کا استعمال جائز قرار دیتا ہے بشرطیکہ وہ بنیادی جذبہ عشق کے تابع ہو کر رہے۔

غرضکہ برگساں اور اقبال دونوں کائنات کی اصل حقیقت روحانی تصور کرتے ہیں اور دونوں آزادئ عمل کے قائل ہیں دونوں تغیر کو زندگی کا ایک زینہ اور سفر سمجھتے ہیں اور وجدان کو عقل کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں ——— ———

برگساں کائنات کا کوئی مقصد متعین نہ کر سکا وہ تخلیق کا صرف تخلیق کی خاطر قائل ہے اور اقبال نے زندگی کو مقصد قرار دیا ہے اُس کی خاطر اُسے زندگی کے ارتقا کی حدبندی بھی کیوں نہ کرنی پڑے!

ــــ یہ مقالہ آل پاکستان ریڈیو کراچی سے نشر کیا گیا تھا جس کی اشاعت کی اجازت صاحب مقالہ نے پاکستان ریڈیو سے حاصل کر لی ہے!

ماہر القادری

اُردو ادب کو ترقی دیجیے اور "زبان" کی حفاظت کیجیے!

اُردو زبان پر جتنا سخت وقت آیا ہے، اتنا سخت وقت کسی زبان پر کاہیکو آیا ہوگا، ہندوستان میں اُسے دیس نکالا دیا جا رہا ہے، اور تو اور یو۔پی جس کے آب و گِل میں اُردو شامل ہے اور جہاں برگ و گیاہ خدا کے نام کے بعد اُردو کا نام لے کر اُگتے ہیں، وہاں کی اسمبلی نے اس جھوٹ کا اعلان کردیا کہ اُردو اِس خطہ کی علاقائی زبان نہیں ہے۔

خیر! یہ تو پرائے دیس کی باتیں تھیں مگر اپنے دیس پاکستان میں اُردو کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے، وہ کچھ کم تکلیف دہ نہیں ہے۔ مشرقی بنگال کے حادثات شرمناک اور الم ناک ہی نہیں خطرناک بھی ہیں! اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ بنگالی ہندوؤں نے کچھ شرارت پسندوں کو اُبھار دیا تھا اور اُردو دشمنی کی اِس تحریک میں غیروں کا ہاتھ ہے اور نراین گنج میں "جگتا بنگال" کے نعروں کی پہل کمیونسٹوں اور ہندوؤں نے کی تھی، مسلمانوں نے تو اُن کی "لے" میں "لے" ملادی تھی، تو اس سلسلہ میں ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ بنگال[1] میں اگر کچھ ایسے سادہ لوح اور بچگانہ ذہنیت رکھنے والے مسلمان بستے ہیں، جو دوسروں کے کہنے میں آکر اُردو دُشمنی اور قانون شکنی میں مبتلا ہو سکتے ہیں، تو کل کسی دوسری صوبائی عصبیت پر بھی اُنہیں آسانی کے ساتھ اُبھارا جاسکتا ہے، جب کوئی بنیادی عقیدہ وحدتِ فکر اور متحدہ اصول ہیئتِ نظر نہ ہو تو ہر لالچ پر زاویہ نگاہ بدل سکتا ہے۔

ان تمام خرابیوں کی ذمّہ دار حکومتِ پاکستان کے اربابِ حل و عقد ہیں کہ "اسلام" جو ان تمام جاہلانہ تقسیموں اور گروہی اور صوبجاتی عصبیتوں کا خاتمہ کرسکتا تھا، اُس کو اُنھوں نے حکومت کے حدودِ عمل میں داخل ہی نہیں ہونے دیا اور لُطف یہ ہے کہ:-

---

[1] متحدہ بنگال

دل میں بت خانے پنہاں
لب پر ہے اسلام اسلام

ہر تقریر میں "اسلام" کا ذکر اور اس طرح ذکر جیسے یہ بیچارے خدا اور رسولؐ کے حکم کے بغیر پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں پیتے، مگر اختیار و اقتدار اور عمل و فعل کی دنیا میں ان "عاشقانِ اسلام" اور "فدائیانِ دین" نے اسلام کو اچھوت بناکر رکھ دیا ہے۔

اسلام کے بعد، مسلم لیگی لیڈروں نے سب سے زیادہ "اردو" کو سراہا ہے مگر یہ وعدے یہ تعریفیں اور اردو کی یہ قصیدہ خوانیاں بس زبان تک ہی محدود رہیں، ابتک حیلے حوالے ہی ہوتے رہے، اس ڈھیل، کمزوری اور لیت و لعل سے دشمنوں نے بروقت فائدہ اٹھایا، اگر پاکستان کے بننے کے بعد ہی اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت دے دی جاتی تو آج یہ برا دن دیکھنا نہ پڑتا ــــــ چند لوگ غلطی کرتے اور غفلت برتتے ہیں اور پوری قوم اور سارے ملک کو اس کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔

کوئی چاہے کتنی ہی دشمنی اور بدباطنی پر اتر آئے مگر اردو زبان مٹ نہیں سکتی۔

کیا مٹائے گا کوئی اس کو مٹانے والا
دل میں آنکھوں میں خیالوں میں نہاں ہے اردو

یہ ایک زندہ زبان ہے اور نہ صرف زندہ بلکہ اتنی وسیع اور جامع زبان کہ دنیا کی کسی ترقی یافتہ زبان سے اس کا پلہ نیچا نہیں ہے۔

حکومت کو جو کرنا ہے وہ کرتی رہے گی مگر اردو کے بہی خواہوں اور بولنے والوں پر بھی تو اردو کی حفاظت اشاعت اور بقا کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے، یہ مضمون اس "زبان" کا مظہر ہے جسے اگر آپ نے بھلا دیا تو اردو کو ایک دوسری "ٹریجڈی" کا سامنا کرنا ہوگا، ہم ان لوگوں کے ہم نوا نہیں ہیں جو اردو کو "بے میل" بنانا چاہتے ہیں اردو کو اس کی "فطرت" اور بنیادی ساخت پر باقی رہنا ہے اور رہنا چاہیئے ــــــ زبان کی ترقی اور وسعت کے ہم پرزور حامی ہیں مگر اس کے لئے بھی خاص سلیقہ درکار ہے، یہ نہ ہو کہ ترقی و وسعت کی بے اعتدالی زبان کے حلیہ کو ہی بگاڑ کر رکھ دے۔

کل ساری دوپہری سر پر گزری ہے، پورا بازار چھان مارا، تب کہیں جاکر ایک تنبولی کے یہاں مہوبہ کے پان ملے، پان دلا کہتا تھا کہ دساور سے بہت تھوڑا مال آتا ہے، اور بھارت کے بیوپاری من مانی قیمت وصول کرتے ہیں، اس اتوار کو پانوں کا جہاز نہ آیا تو دیسی پان بازار میں ڈھونڈے نہ ملیں گے، اور کسی کے یہاں ملے بھی تو سونے کے مول ملیں گے ــــــ تنبولی کے یہاں سے پانوں کی ڈھولی مول لیکر، پھول والوں کے سامنے سے میں گزر ہی رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

——— ارے! تم ہو ناصر ... میں نے لرزتے ہوئے کہا۔ اب ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے، ناصر کہنے لگا ... بھیا!
میٹھی عید پر تمہاری بھتیجی کے ہاتھ پیلے کرنے کا ارادہ ہے، ایک جگہ بات پکی ہوگئی ہے (کس جگہ ...؟ میں نے پوچھا) تم نے بارہ بستی
کے تحسین خاں کا تو نام سُنا ہوگا (میں نے گردن ہلادی) بڑے نامی گرامی آدمی تھے، اور رُعب و داب تو ایسا تھا کہ اُن کے پیشاب میں
چراغ جلتا تھا، پولس کی بھلا مجال تھی جو اُن کی اجازت کے بغیر گاؤں میں قدم دھر جائے، ایک دفعہ ایک تھانیدار کسی ٹھاکر
کے یہاں دوڑ کر آگیا، خاں صاحب کو جو پتہ لگا تو انھوں نے اپنے محلے کے دس بارہ جوان پٹھوں کو اشارہ کردیا، اور پھر جو پولس
والوں کی پٹائی ہوئی ہے تو اُن لال صافے والوں کو چھٹی کا دودھ یاد آگیا ——— انھی خاں صاحب کے نواسے سے میری
بچی کا رشتہ پکا ہوا ہے، لڑکے کی عمر بیس اکیس سال کی ہے، میٹرک پاس ہے اور ایک نجی مدرسہ میں منشی فاضل کی پڑھائی
پڑھتا ہے، ریلوے کے محکمہ میں سوا سو روپیہ مہینہ کا نوکر ہے، ماں باپ کا اکلوتا ہے، طبیعت کا نیک اور شریف ہے، تمھیں معلوم
ہے ناصر بھیا! تمہاری بھتیجی کو میں نے کس لاڈ پیار سے پالا ہے، اپنا دیس ہوتا تو ہر طرح کی سہولت تھی، دو چار ہزار قرض پانی بھی مل سکتا
تھا یہاں پاکستان میں لُٹ پٹ کر آئے ہیں، تمہاری بھابی نے اُس کے جہیز کے لئے ایک ایک چیز سینت سینت کر رکھی ہے،
برادری کے پچاس سو آدمیوں کے ہاتھ بھی دُھلانے کا ارادہ ہے، عزت آبرو اللہ کے ہاتھ میں ہے، میں اسی فکر میں مارا مارا
پھرتا ہوں، شکر کے لئے راشن کی دُکان پر گیا تھا مگر وہاں گاہکوں کی لمبی ڈوری لگی ہوئی ہے، آدھ گھنٹہ تک کھڑا ہو کر چلا
آیا ——— اور بھائی! تم کہیں باہر جلسے یا مشاعرے میں چلے نہ جانا، تمھیں اس کاج میں ضرور شریک ہونا پڑے گا،

بانا کے چوراہہ پر پہونچ کر اُس میرے دوست نے کہا اب مجھے یہاں سے صرافہ میں جانا ہے، بچی کی چیز بن رہی ہے،
سُناروں کے وعدے بھائی! قیامت کے وعدے ہوتے ہیں، جب جاؤ یہی کہیں گے کہ چیز کٹائی میں پڑی ہے، سُنار کی
دکان کا جب تک کوڑی پھیرا نہ کرو، وقت پر چیز مل ہی نہیں سکتی (تو یوں کہو خوب دھوم کی شادی کرنے کا ارادہ ہے تمہارا ———
——— میں نے کہا) دھوم کی شادی یہاں پردیس میں کیا ہوگی، ہمارے پاس دھرا ہی کیا ہے، پچھلے سال میری بڑی
بہن کی بیماری میں تمہاری بھابی کا سارا ٹوم چھلا بک گیا ——— ایسا زمانہ بھی ہم پر یہاں کراچی میں گزرا ہے کہ تین تین
وقت تک ایک کھیل بھی اُڑ کر منہ میں نہیں گئی، وہ وقت بھی کٹ ہی گیا، ایمان ثابت، منزل آسان! سو اللہ تعالیٰ نے
یہ منزل بھی آسان کردی، کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہیں آئی، لگی کے روزگار ہیں، مجھے اچھی خاصی بچت ہونے لگی
پیسہ کی اگلی سی محتاجی نہیں رہی، آج میرے پاس دس بارہ ہزار کی جمع پونجی ہوتی مگر ایک دوست نے بھروسے پر رکھ کر سات
ہزار کی رقم سائیکلوں کی دُکان میں پھنسوا دی، منافع تو بھاڑ چولہے میں گیا اصل رقم گل گئی، آدمی کو جس روزگار کا تجربہ نہ ہو
اُس میں ہاتھ ڈالنا پرلے درجہ کی حماقت ہے اور میں یہ حماقت کر بیٹھا، دل کو یہ سمجھا کر صبر کرلیا کہ جو رقم ڈوب گئی، وہ جانے
کے لئے ہی آئی تھی، پاس رہتی تو نہ جانے اور کیا مصیبت پیش آتی!

اُس چوراہے سے میں اور وہ میرا دوست دونوں جُدا ہوگئے، اُس نے صرافہ کی راہ لی اور میں ٹرام میں بیٹھ گیا، اور
یہ "بیٹھنا" میری زبان سے یوں ہی رو میں نکل گیا، بیٹھنے کی وہاں جگہ ہی کہاں تھی، کئی آدمی تو پائدان پر کھڑے تھے، آدمی
پر آدمی گرا پڑتا تھا، اسی دھکم دھکا میں بولٹن مارکیٹ آگیا، میں وہاں اُتر پڑا، ڈاک خانہ میں خط ڈالنے تھے، سڑک پر موٹروں
اور بسوں کا اتنا ہجوم اور راہ گیروں کی اس قدر بھیڑ تھی کہ سڑک کو پار کرنا دوبھر ہوگیا، جیسے تیسے ایک طرف سے دوسری
طرف پہونچا، چند قدم چلا ہوں گا کہ فٹ پاتھ پر تماشائیوں کا ہجوم نظر آیا، بہت سے آدمی حلقہ باندھے ہوئے کھڑے تھے،

میں اُن تماشائیوں میں جا ملا، لانبا آدمی ایسے موقعوں پر بڑے فائدے میں رہتا ہے، ذرا پنجوں کو اُٹھا کر، گردن کو جو اونچا کیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ فٹ پاتھ پر کچھ پٹاریاں رکھی ہیں، ایک چِت کبرا سانپ، کُنڈلی مارے بیٹھا ہے، اور ایک سانپ کو ایک فقیر نما وضع کا آدمی اپنے ہاتھ میں اُٹھائے ہوئے ہے، پھر اُس نے پٹاریوں سے نکال نکال کر سانپ دکھانے شروع کئے، قسم قسم کے سانپ تھے، گندے دار، سیاہ، مٹیالے رنگ کے، اُنگلی سے بھی کم پتلے اور بانس کی پھنگی سے زیادہ موٹے! دیکھنے والے مرعوب ہوتے جا رہے تھے کہ جو شخص اتنے سانپوں کو قابو میں کر سکتا ہے اُس کو نہ جانے کیا کیا جادو منتر اور ٹونے ٹوٹکے آتے ہوں گے، سانپوں کے بعد اُس نے مٹی کی ایک کوری ہانڈی پر بندھے ہوئے کپڑے کی گرہ کھولی اور اُس میں سے ایک بچھو نکالا، کالا بھجنگ بچھو کہ پتھر پر ڈنک مارے تو پتھر بھی پانی ہو جائے، اس سے بڑے بچھو دوزخ میں ہوں تو ہوں، اس دُنیا میں تو شاید نہ ہوں گے، لنبائی چوڑائی میں مٹی کے سکورے کی برابر تھا وہ بچھو! یہ تماشا ہو چکا تو اب اُس شخص نے دواؤں کا ایک ڈبہ نکالا اور چٹخے دار تقریر شروع کر دی، اب بھیڑ چھٹنے لگی، میں بھی وہاں سے چلا آیا۔

موٹر بسوں کے اڈے پر آج اور دنوں کے مقابلہ میں بھیڑ کم تھی، زیادہ دیر انتظار کرنا نہیں پڑا، بس میں آسانی کے ساتھ جلد جگہ مل گئی، میں جس سیٹ پر بیٹھا اُس پر دو مسافر پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے اور خوب گھل مل کر باتیں کر رہے تھے ——— اُن کی باتیں!

تم اُس اپنے دوست فیروز سے بچے رہنا، وہ بڑا بھیترا آدمی ہے، کہتا کچھ ہے، کرتا کچھ ہے، اُس بالشتیے کو سیدھا سادہ نہ سمجھنا بس کی گانٹھ ہے! حرفوں کا بنا ہوا، کاینتی (کعبتینی) بھنکیت، چار سو بیس! وہ قرآن کا جامہ پہن کر بھی میرے سامنے آکر کوئی بات کہے تو میں اُس کا یقین نہ کروں، باتیں بنانی اُس سے ہاں! خوب آتی ہیں، ذرا سی دیر میں آدمی کو شیشہ میں اُتار لیتا ہے مگر بھیا! اُس کے کاٹے کے منتر نہیں، پہلے اُمیدوں کے سبز باغ دکھاتا ہے اور پھر ایسے جنگل بیابان میں لیجا کر چھوڑتا ہے کہ جہاں ساری عمر آدمی بھٹکتا ہی رہے، ہمارے قصبہ میں ایک بڑے زمیندار تھے، چار تو اُن کے پاس سالم گاؤں تھے اور کئی گاؤں میں حصہ تھا اُن کا! پانسو چھ سو بیگہ کی سیر تھی، بیوپار بھی وہ کرتے تھے، روئی کے بیچ میں اُن کی پتّی تھی، سرکار سے اُن کو خطاب تو "خاں صاحب" کا ملا تھا مگر سب لوگ اُن کو نواب صاحب نواب صاحب کہتے تھے، اُن کے یہاں کسی بات کی کمی نہ تھی، سچ مچ نوابی ٹھاٹ تھا، اُن کے دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا، موٹر، بگھی، رتھ، منجھولی، بہلیں، تام جھام ہر طرح کی سواری وہ رکھتے تھے، اُن کی حویلی کیا تھی چھوٹا موٹا قلعہ تھی، دروازہ اتنا اونچا کہ دیکھنے میں سر کی ٹوپی گر پڑے! نواب صاحب ہاتھ کے سخی بھی تھے، ڈوم ڈھاڑی، بھاٹ، نقال، ہیجڑے، بجتری، کسبیں، سدا سہاگ فقیر اور نہ جانے کس کس بھیس اور قماش کے لوگوں کو وہ دیتے دلاتے رہتے، محرم میں کچی کھانڈ کے شربت کی سبیل لگتی، رجبی اُن کے یہاں وہ دھوم کی ہوتی کہ دور دور سے لوگ مولود شریف سننے، روشنی دیکھنے اور تبرک لینے کے لئے آتے دس بارہ من نکتی کا خرچ تھا رجبی پر!

ہاں! تو یہ فیروز بھی ترکیب لگا کر اُن کے یہاں جا گھسا اور چند دن میں اُن کا مصاحب بلکہ یوں کہئے نواب صاحب کی ناک کا بال بن گیا، نواب صاحب شکار میں جا رہے ہیں تو فیروز ساتھ ہے، کلکتہ، بمبئی کا سفر کر رہے ہیں تو فیروز ہمرکاب ہے، گانے بجانے کے جلسوں میں فیروز، نواب صاحب کے زانو سے زانو ملائے بیٹھا ہے، نواب صاحب پر اُس نے ایسا جادو کیا کہ اُس سے پوچھے بغیر تنکا بھی نہ توڑتے تھے، پُرانے پُرانے مصاحبوں کے چراغ گُل ہو گئے اُس کے سامنے! فیروز کی اب بات چلتی تھی، اُسی کے اشاروں پر سب کام ہوتے تھے۔

ارے صاحب! جن دنوں اُس کی کمان چڑھی ہوئی تھی تو میں اُس سے ملنے کے لئے گیا، نوکر نے ڈیلی پر اطلاع کرنے سے انکار کیا کہ صاحب آرام فرما رہے ہیں، میں نے اُس کو ڈانٹ پلائی کہ اپنے صاحب کو میرا نام لیکر جگا دو، جو جناب، کوئی گھنٹہ سوا گھنٹہ کی انتظاری کے بعد فیروز صاحب تشریف لائے، ریشمین دُلائی اوڑھے ہوئے، سر پر قیمتی گلوبند بندھا ہوا، انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی پہنے ہی ہوئے، کہ رات نواب صاحب کے یہاں کلکٹر صاحب بہادر کی دعوت تھی، بہت رات گئے وہاں سے آنا ہوا، دو ڈھائی کے عمل کہیں آنکھ لگی، طبیعت بھاری بھاری سی ہے اور اب نو بجے مجھے بڑے صاحب سے ملنے کے لئے جانا ہے، آپ پرسوں شام کو آئیں تو مناسب ہے، اب تو میں جلدی میں ہوں ——— میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ فیروز مجھے ٹالنا چاہتا ہے، اور اس طرح کے غچّے دینے اُسے بہت آتے ہیں!

میری بیوی فیروز کے یہاں ایک بار گئی تھیں، وہ کہتی تھیں کہ اب سے چند مہینے پہلے تک فیروز کی بیوی زیور سے بالکل ننگی تھی ہاتھوں میں چاندی کی ہلکی ہلکی چوڑیاں تھیں، دو کانوں میں پانچ چھ ماشہ کے سنہری بندے۔ مگر اب تو وہ سر سے پیر تک زیور میں لدی رہتی ہے جھومر، جھمکے، گلوبند، موہن مالا، نولکھا، جڑاؤ چوڑیاں، پہونچیاں، اور پیروں میں سونے کی بھاری بھاری پازیب! پانسو سے کم کا تو اُس کے بدن کا جوڑا نہ ہوگا، دوپٹے پر ایک ایک بالشت کا ٹانکا لگا ہوا، اور اُس کی مُہریوں پر سلمے ستارے کا کام! وہ سونے کے کمرے میں مسہری کا ہیکوتھی چھپر کھٹ تھا، ریشمین چادر، خوبصورت تکیے، اور لحاف پر قیمتی پلنگ پوش جھم جھم کرتی ہوئی۔ پردوں کی جھالر تک پر موتی ٹکے ہوئے تھے!

وہ جو کسی نے کہا ہے کہ گیہوں کی روٹی کو فولاد کا پیٹ چاہیئے، سو فیروز سے یہ دولت ہضم نہ ہو سکی، دل کا اوچھا اور نسل کا کمینہ تھا، اُس کے پردادا نے گھر میں ایک بھنگن ڈال لی تھی، اُس کے دادا اُسی مہترانی کے پیٹ سے پیدا ہوئے، خاندانی شرافت تو رنگ لا کر رہی، نواب صاحب کی ایک زمیندار ٹھاکر سے لاگ ڈانٹ تھی، زمین کے بٹوارے پر جھگڑا ہو گیا، ٹھاکر کا ایک آدمی مارا گیا، فیروز نے نمک حرامی کی، ٹھاکر سے ساز باز کر لی، اِدھر کی خبریں اُدھر پہونچاتا، گھر کا بھیدی بن کر لنکا ڈھا رہا تھا، وہ تو نواب صاحب کی قسمت اچھی تھی کہ یہ بھانڈا بہت جلد پھوٹ گیا، ورنہ فیروز کے کرتوت تو نواب صاحب کے ہاتھوں میں جھنجھنا پکڑا کر چھوڑتے! یہ فیروز بڑی چلتی رقم ہے، یہاں کراچی میں بھی وہ ایک مالدار آدمیوں کو آسامی بنا چکا ہے، اس سے زیادہ ربط ضبط بڑھانا ٹھیک نہیں، بس دور ہی کی صاحب سلامت اچھی! ... ... اور ... ... ! ابھی اُن دونوں کی باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ میں راستہ میں اُتر گیا، دل تو یہی چاہتا تھا کہ یہ باتیں سنتا ہی رہوں، ایسی میٹھی بولی روز روز سننے میں کہاں آتی ہے... مگر مجھے اُن لوگوں سے بہر حال جدا ہونا تھا!

بس سے اُتر کر فُٹ پاتھ پر چل رہا تھا کہ راستہ میں ایک عورت آتی ہوئی نظر آئی، خوب بنی سنوری ہوئی، دیدہ زیب صورت چہرے پر چھبن، اور چال میں دلکشی، چھریرا بدن، نازک اس قدر کہ اگر وہ پان کھاتی تو گلے سے پان کی پیک صاف دکھائی دیتی اس انداز کے ساتھ سہج سہج چل رہی تھی کہ لوگ ادبدا کر دیکھیں اور اُس کی جوانی، دلکشی، اور سحر آفرینی کی داد دیں، بے باکی اور بے حجابی کی جو تھوڑی بہت کور کسر رہ گئی تھی اُسے تنگ اور چُست بلاؤز نے پورا کر دیا تھا، شرم و حیا اُس کے پاس بھی نہ پھٹکی تھی، اور دیدے کا پانی ڈھل چکا تھا، عورت پن اُسے کوس رہا تھا کہ مجھے اس طرح راہ چلتے رُسوا اور بے عزت نہ کرو۔

میں نے سوچا کہ ہم نے وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب گھروں میں مٹی کے دیے جلتے تھے، پھر لالٹین، لیمپ اور دیوار گیر بال آئیں، اُس کے بعد گیس کے ہنڈے اور اب بجلی کے اُجالے کا دور دورہ ہے، اگلے زمانہ میں روشنی کم تھی مگر غیرت کی فراوانی تھی

جیسے جیسے دُنیا ترقی کرتی گئی، انسانیت گرتی چلی گئی،

زوالِ ابنِ آدم ہو رہا ہے۔
یہ کیا دُنیا کا عالم ہو رہا ہے

اگلے لوگوں کی کیا آن بان اور کیسا رکھ رکھاؤ تھا۔ عورت کی آبرو اُن کو اپنی جان سے بڑھ کر عزیز تھی، عورتیں گھروں کی ملکہ تھیں، باغوں کی تتلیاں نہ تھیں، اور اب نوجوان لڑکیاں پارکوں اور سیر گاہوں میں ہر رنگ بچاتی پھرتی ہیں، ہرنیوں کی مانند کلیلیں اور تتلیوں کی طرح آوارہ خرامی! ہم یہ نہیں کہتے کہ پچھلے لوگ سب کے سب فرشتے تھے اُن میں کسی قسم کی بُرائی ہی نہیں پائی جاتی تھی، بُرائیاں تھیں مگر اُن کو کسی نے "آرٹ" نہیں سمجھا، پردہ کی بدولت ہوسناکیاں زیادہ سے زیادہ تاک جھانک تک محدود رہتیں، یہ جھٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ نہ تھا کہ ذرا ملاقات ہوئی، اور موٹر، ٹیلیفون، کلب گھر، کالج، اسکول اور سیر گاہوں نے رنگین موقعے فراہم کر دیئے —— دوسری قومیں اپنے حالات بہتر طور پر جانتی ہیں، ہم اُن سے کیا کہیں مگر مسلمانوں کو تو یہ مغرب زدہ تہذیب کسی طرح راس آ نہیں سکتی، اس سودے میں تو اُن کو گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔

کی مسلماں نے ترقی جو فرنگی بن کر
وہ فرنگی کی ترقی ہے مسلماں کی نہیں (اسد ملتانی)

نغمہ و فریاد

میکش اکبرآبادی

پھر بہار آئی نہایا اشکِ شبنم سے چمن — خون سے لالے کے ہیں دہکے ہوئے کوہ و دمن
آدمیت کا ہے خوں محفل میں بھی خلوت میں بھی — مجھکو وہ دنیا ملی ہے جس میں شہر اچھے نہ بن
ہوش میں لانے کو میرے کتنے دل بے چین تھے — ہوش جب آیا تو بیگانہ ہے ساری انجمن
پرچم آزادی کا لہرا دیا گیا کچھ اس طرح — میں یہ سمجھا مل گیا شاید غریبوں کو کفن
چھن لیا ہے جاہلوں کی اکثریت نے مجھے — ملک اب تیرا ہے اے جمہوریت کی انجمن
خاک کو کب تک یہ سجدے ماہ و انجم کو بھی دیکھ — جان قدرِ آدمیت اے پرستارِ وطن

میری بربادی ہے پروانہ ہلاکت کا تری
"تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن" (اقبال)

وقار انجم (بی۔ اے)

خار زاروں سے گزر۔ راہ گزر پیدا کر — سنگ ریزوں میں سما۔ لعل و گہر پیدا کر
ہاں یہ اٹھتی ہوئی لہریں بھی کنارہ بن جائیں — ایسے انداز سے طوفان میں گھر پیدا کر
قیس و فرہاد کی راہوں سے گزرنے والے — وہی صحرا۔ وہی سودا۔ وہی سر پیدا کر
آپ تعظیم کو اٹھے گا ادب سے پردہ — دیکھنے والے محبت کی نظر پیدا کر

دعوتِ عمل

عزیز حاصل پوری

تجھے تو ہے ہوسِ سروری عمل کے بغیر — نہ لیگا کوئی غلامی میں بھی عمل کے بغیر
تری یہ خام خیالی ہے مسلمِ غافل — خود آگہی و خدا آگہی عمل کے بغیر؟
عمل سے جوہرِ انسانیت نکھرتا ہے — کچھ آبرو نہیں انسان کی عمل کے بغیر
چمن میں سعیٔ عمل سے بہار پیدا کر — شگفتہ ہو نہیں سکتی کلی عمل کے بغیر
عمل کے نور سے ظلمت مٹا زمانے کی — کہ دور ہوگی نہ یہ تیرگی عمل کے بغیر
نہ ہو دلیل تو دعویٰ ہے دعویٰ باطل — کہے گا کون تجھے متقی عمل کے بغیر

آشوبِ روزگار

محمد ولی نیازی

نہ مل سکا کسی صورت جو درد و غم سے فراغ — بھڑک اٹھے مرے لب پر تبسموں کے چراغ
شکستِ ضبط پہ خنداں ہیں آنسوؤں کے کنول — فروغِ تندیٔ صہبا سے جل اٹھے ہیں ایاغ
رہِ حیات میں یوں آج تیری یاد آئی — کہ جیسے دور کہیں جھلملا رہے ہوں چراغ

دو غزلیں

جگر مراد آبادی

یک لحظہ خوشی کا جب انجام نظر آیا
شبنم کو ہنسی آئی، دل غنچوں کا بھر آیا

یہ کون تصور میں، ہنگامِ سحر آیا
محسوس ہوا جیسے خود عرش اتر آیا

خیر اس کو نظر آیا، شر اس کو نظر آیا
آئینے میں خود عکسِ آئینہ نگر آیا

اس بزم سے دل بیکر، کیا آج اتر آیا
ظالم جسے سمجھے تھے مظلوم نظر آیا

گلشن کی تباہی پر، کیوں رنج کرے کوئی
الزام جو آتا تھا، دیوانوں کے سر آیا

ہر چند ترا چھپنا، زیبا ہے تجھے لیکن
ضد پر کوئی دیوانہ اے دوست، اگر آیا

۲

بسمل سعیدی

فراہم جس قدر عشرت کے ساماں ہوتے جاتے ہیں
سکونِ روح سے محروم انساں ہوتے جاتے ہیں

نگاہِ عشق کی ناقدریاں کر کے وہ کیوں خوش ہیں
خود اُن کے حسن کے جلوے بھی ارزاں ہوتے جاتے ہیں

کبھی طرزِ تغافل تھے یہی اندازِ محبوبی
جو اب صرفِ نوازشہائے پنہاں ہوتے جاتے ہیں

جبیں قدموں سے اُن کے اٹھتی جاتی ہے دمِ رخصت
سجودِ شوق آنسو بن کے قرباں ہوتے جاتے ہیں

شبابِ حسن روداد فزوں کا اُن کے اب یہ عالم ہے
کہ ہم شرمندۂ شوقِ فراواں ہوتے جاتے ہیں

قطعہ

ابھی جامِ مئے رنگیں لبِ لعلیں تک آیا ہے
مگر آنکھوں میں مچلنے سے غلطاں ہوتے جاتے ہیں

فضائے خلد پر جیسے گھٹا سی چھاتی جاتی ہوں
رخِ گلرنگ پر گیسو پریشاں ہوتے جاتے ہیں

قطعہ

ہمیں اب ٹونک میں رہ رہ کے دلی یاد آتی ہے
شبِ دردِ وطن شامِ غریباں ہوتے جاتے ہیں

نفس کی آمد و شد کا یہ عالم ہے جدائی میں
کہ نشتر جیسے پیوستِ رگِ جاں ہوتے جاتے ہیں

الٰہی! امتیازِ حق و باطل کیا کرے کوئی
کہ عصیاں آج کل ہمرنگِ ایماں ہوتے جاتے ہیں

خبر بھی ہے، غرورِ دولتِ دنیا! کہاں ہے تو
ترے عشرت کدے گورِ غریباں ہوتے جاتے ہیں

تعالی اللہ، فیضِ باغباں، بسمل، تعالی اللہ
خس و خاشاکِ گلشن گل بداماں ہوتے جاتے ہیں

وقار عظیم (رام پور)

THE ARROW AND THE SONG

نغمہ و پیکاں

I shot an arrow into the air —
It fell to earth, I knew not where,
For so swiftly it flew the sight —
Could not follow it in its flight.

میں نے پھینکا ہوا میں اک پیکاں　　وہ زمیں پر گرا نہ جانے کہاں
تھا سبک سیر اس قدر کہ نگاہ　　کم روی سے نہ جا سکی ہمراہ

I breathed a song into the air
It flew to earth I knew not where,
For who has sight so keen and strong,
That it can follow the flight of song.

میں نے گایا ہوا میں اک نغمہ　　وہ نہ جانے کہاں کہاں گونجا
باصرہ کس کا ہے قوی ایسا　　جو تعاقب کرے ترنم کا؟

Long, long afterwards in an oak
I found the arrow still unbroke,
And the song from beginning to end,
I found again in the heart of a friend

اک شجر میں پس ہزار زماں
ناشکستہ ملا مجھے پیکاں
اور نغمہ — تمام یکبارے
یافتم باز در دلِ یارے

H. W. Longfellow
(1807—1882)

قابل اجمیری

نظر آئی!

جہاں اُمید کی کوئی کرن نظر آئی
وہیں سے ایک نئی تیرگی اُبھر آئی

یہ ہر نگاہ تجلّی تری نکھر آئی
ابھی تھی خوب ابھی خوب تر نظر آئی

شکستِ غم پہ مسرت سے آنکھ بھر آئی
خزاں گئی تو بہار خزاں اثر آئی

عجیب چیز ہے خاکستر محبت بھی
ذرا کسی نے چھوا اور آگ اُبھر آئی

ہوا تھا ہجر کا احساس لمحہ بھر کے لئے
پھر اس کے بعد تری یاد عمر بھر آئی

شبِ وصال تو کیا آئے گی مگر لیکن
شبِ فراق بھی آئی تو بے سحر آئی

بہت حسین ہیں خوابوں کے سلسلے قابل
ستارے ڈوب گئے تو سحر نظر آئی

عارف حجازی

گلستاں کی طرف!

فصلِ گل میں دیکھتا ہوں جب گلستاں کی طرف
ہاتھ بڑھ جاتا ہے خود جیب و گریباں کی طرف

اللہ اللہ میرے عزم شوق کی بے تابیاں
جا رہا ہوں بیخودی میں پھر بیاباں کی طرف

چند تارے بھی جو نکلے ہیں تو دھندلائے ہوئے
کون دیکھے منظرِ شام غریباں کی طرف

سوچتا ہوں دیکھ کر حسنِ تجلّی کی بہار
کیا یہ آئے گی کبھی میرے شبستاں کی طرف!

پوچھنا عارف سے پھر اس چاک دامانی کا راز
جب بہار آئے کبھی صحنِ گلستاں کی طرف

ساغر (مین پوری)

اعتبار سے پہلے!

کوئی وعدہ حسیں نہیں ہوتا
عشق کے اعتبار سے پہلے

اہتمام خزاں بھی لازم ہے
انتہائے بہار سے پہلے

موت مانگوں کہ زندگی مانگوں
آپ کے انتظار سے پہلے

عقل ہنستی تھی وحشتِ دل پر
دامنِ تار تار سے پہلے

خان بہادر سید رضا حسین

... اور میں دیکھتا چلا گیا!

میرے دوست عارف کو علامہ اقبال کی خدمت میں باریابی حاصل تھی۔ مجھے جب علامہ کے کلام کے مفہوم میں دشواری پیش آتی تو میں عارف ہی کی طرف رجوع کرتا، وہ سمجھا دیا کرتے، آج چار برس کے بعد کراچی کے لارڈ کیسٹ میں مل گئے، اور میرے سوال کرنے سے پہلے پوچھنے لگے کہ کہو کراچی میں علامہ کے ارشادات سے کیا نفع حاصل کر رہے ہو،

میں:۔ عارف صاحب! آپ سنکر بہت خوش ہوں گے کہ علامہ کے کلام کا بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو رہا ہے، بس کوئی دن میں یورپ اقبال کے کلام اور پیام سے گونجنے ہی والا ہے۔

عارف:۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ توریت و انجیل کے تراجم کتنے زبانوں میں ہوں گے؟ تمھارے خیال میں ان تراجم سے ان صحائفِ آسمانی کی ہدایات کہاں تک یہود و نصاریٰ کے اصول زندگی پر اثر انداز ہوئیں؟ توریت کی کتاب احبار دیکھو اور یہود کے کردار، تمھارے یہاں تو آمدنی کا صرف چالیسواں حصّہ مستحقین کے لئے علٰحدہ کیا گیا ہے، اس سے زائد توفیق پر چھوڑ دیا گیا ہے، یہود کے یہاں تو "دہیک" یا دسواں حصّہ نکالنے کا حکم ہے۔ لیکن کون یہودی کروڑ پتی "دہیک" محتاجوں کو دیتا ہے۔ حضرت عیسیٰ ابن مریم نے سرمایہ داری کو ام الخبائث قرار دیدیا، لیکن آج انجیل کے پرستار کیا کر رہے ہیں ؎

رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں   گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کے عمارات

اشاعتِ کلام ہی اگر بڑی چیز ہوتی تو آج یورپ ارشادِ مسیح کو کیوں بھول جاتا کہ "سوئی کے ناکے سے ایک اونٹ کا گزر جانا آسان ہے، لیکن ایک دولت مند کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے"

میں:۔ اس کا بھی انتظام کیا گیا ہے کہ یونیورسٹیوں میں ہونہار طلبا، علامہ کے کلام پر علمی تحقیقات کے بعد مقالات مرتب کریں گے،

عارف:۔ حقیقت تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ تعمیلِ ارشاد کی کوفت تم سے اٹھائی نہیں جاتی، اس لئے تعلیم کلام سے اپنی غفلتوں اور خود گزاشتوں پر پردہ ڈالنا چاہتے ہو۔ تم عاشق نہیں ہو بُت پرست ہو، تم کو خود علامہ کی طنز یاد نہیں، کس قدر دردمندی کے ساتھ فرماتے ہیں:۔

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن، تم ہو   نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن، تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن تم ہو   بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن، تم ہو
ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کرکے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے

میں:۔ معاف فرمائیے گا! اس میں مبالغہ نہیں کہ اقبال کا کلام ہمارے وجدان میں گُھل مل گیا ہے، ہماری محفلیں اسی کے سے گرمائی جاتی ہیں، مکتب کے بچّوں سے لیکر صوفی، درویش، علما، اور جدید تعلیم یافتہ، سب اقبال کے

کلام پر وجد کرتے ہیں۔

عارف :- اس کو میں خود تسلیم کرتا ہوں، مسرور علامہ کے ارشاد پر، شکر غیر کے سمجھنے کا، اگر تم نے علامہ کو ٹھوکر سے شاعر بنا دیا، جب وقت قیام آیا تو اُن کے احکام کو تکیہ لگا کر قوالوں کی زبان سے سُنتے ہو، اور کلفت کی جگہ لطف اُٹھانا چاہتے ہو، وہ جادہ پیمائی کے لئے تم کو تیار کرتے تھے، تم خامہ فرسائی کی داد چاہتے ہو۔

میں :- آپ تشریف لے چلیں، جو کچھ ہو رہا ہے خود ملاحظہ فرمالیں، میں کیا عرض کروں، انہیں دنوں میں مرکزی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا، میں نے لیجا کر عارف کو گیلری میں بٹھا دیا، نیچے مجلسِ آئین کی گرم گفتاری پر عارف مسکرائے اور کہنے لگے :-

عارف :-

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری

میں :- لیکن یہ تو علامہ نے یورپ کی جمہوریت پر اعتراض کیا ہے !

عارف :- اور یہ جو آپ کے سامنے ہے اسی کی نقل یا نقل النقل ہے۔ صل سے صرف اس قدر فرق ہے کہ انگریز اپنی مجالس میں اپنی زبان جائز رکھتا ہے وہ آپ اپنے بھائیوں سے انگریزی زبان میں ہم آہنگ ہیں۔ ذرا کان لگا کر سُنئے قرآن، اسلام اور رسول اللہ کی سنت اور اسلامی معاشرے کا ذکر ہو رہا ہے، لیکن لیسے بحث پر تقریر انگریزی میں ہو رہی ہے اور طلاقت و تلفظ دونوں شہادت دے رہے ہیں کہ کوئی غیر مانوس زبان ہے۔

میں :- اسلام کی جمہوریت کس لحاظ سے فرنگ کی جمہوریت سے مختلف ہے ؟

عارف :- انگلستان کی جمہوریت اس کے سوا اور کیا ہے کہ ایک صاحبِ فہم واثر اپنے حلقۂ اثر کو پہلے استوار کرتا ہے۔ پھر اس حلقے کے افراد اپنے اپنے حلقوں کو مضبوط کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ تمام حلقے امداد باہمی کے اصول پر ایک گروہ یا پارٹی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، محرک اول تو قائد یا لیڈر بن جاتا ہے، اُس کے پیچھے معتقدین یا پارٹی کے رُکن ہوتے ہیں جو اپنے معاونین کے ووٹ سے پارٹی کو برسرِ اقتدار لانا چاہتے ہیں۔ ایسے گروہ یا ایسی پارٹیاں دو تین، چار، پانچ، ہو جاتی ہیں۔ فرانس میں تو درجنوں تک نوبت پہونچ گئی ہے۔ ان میں سے جس پارٹی کے آدمی تعداد میں زیادہ ہو گئے وہ حاکم بن گئی، باقی محکوم رہ گئیں یا سازش شروع ہو گئی کہ چند پارٹیاں مل کر برسرِ اقتدار پارٹی کو شکست دے دیں۔

بر خلاف اس کے اسلام چاہتا ہے کہ لوگ بلا کسی ترغیب کے نگاہ ڈالیں کہ ان کے وقت میں کس شخص کو ایسا امین اور ایسا فہیم سمجھا جائے کہ اس پر بارِ خلافت ڈالا جائے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو فرانس کا انقلابی فلسفی، ژین ژاک روسو، اپنی زبان میں جنرل وِل[ط] یا منشاءِ عام کہتا ہے جس شخص پر اس قسم کی نظرِ انتخاب پڑتی ہے، وہ خوش ہونے کے بجائے اُلٹا فکر مند ہو جاتا ہے، اپنا سارا آرام کھو بیٹھتا ہے، اس کے اعزا اور اقربا اس کے انتخاب پر تشویش میں پڑ جاتے ہیں کہ اب وہ ان کو کسی قسم کی مدد دینے کے قابل نہیں رہ گیا۔ اس شخص کی توجہ خدا کی مرضی کے تحت صرف جمہور کے بہبود کی طرف مرکوز رہتی ہے، علامہ اس کو یوں بیان کرتے ہیں :-

وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ
در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف
وصل و فصلش لا یراعی لا یخاف

ط General will

یعنی اس قانون سے نہ تو یہ اُمید رکھنی چاہیئے کہ یہ کسی کی رعایت کرے گا، اور نہ اس کا امکان ہے کہ یہ کسی سے ڈر کر کوئی کام کرے گا۔ یہ تو وہی کرے گا جس میں عوام الناس کا فائدہ ہو، عدل اُس کا مسلک اور بے استبدادی اُس کا شیوہ ہوگا۔

اسمبلی سے ہم لوگ باہر نکلے تو مہاجرین کا ایک غول پریشان حال دکھائی دیا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ روئی کا بازار ستر سے ایک سو پچاس پر پہونچ جانے کی وجہ سے بازار میں روئی ڈھائی گنا مہنگی ہو گئی۔ ان مہاجرین کو اس سردی میں اپنے بچوں کو محفوظ رکھنے میں بڑی دقت در پیش آرہی ہے۔ پہلے سلائے ہوئے کپڑے والوں نے بھی موقعہ دیکھ کر اپنا مال مہنگا کر دیا۔ معلوم نہیں کتنے بچے روز سردی سے مر رہے ہیں۔ لیکن سرمایہ داروں نے اونچے نیچے بھاؤ کے فرق میں کروڑوں روپے کھینچ لے۔

عارف:- ؎ ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات

آپ ابھی اسمبلی میں تعلیم قرآن پر گرم گفتاری کی کیفیت ملاحظہ کرتے ہوئے آرہے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کیا نمائش ہے کہ آپ قرآن پڑھانے کے لئے تڑپ رہے ہیں، لیکن خود احکام قرآن پر عمل تو کیا توجہ کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ صاف احکام احتکار کے خلاف کتاب حق میں موجود ہیں، اور احتکار ہی چیز ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ چیزیں جو خاص غریب کی ضرورت کی ہیں، یعنی روئی اور چنا، ان کے ذخیرہ اندوزی سے ان کا بھاؤ اس طرح نیچے اوپر کیا جاتا ہے کہ سرمایہ دار غریب کے منہ میں چنا اور بدن پر روئی آنے نہیں دیتا۔

راستے میں ہم لوگ خالق دینا ہال پر رک گئے۔ معلوم نہیں کس قسم کا جلسہ ہو رہا ہے۔ ٹکٹ خرید کر احاطے کے اندر گئے تو معلوم ہوا کہ کوئی سیاسی کانفرنس ہو رہی ہے موٹروں پر موٹریں چلی آرہی ہیں جن کے لئے راستہ بند کر دیا گیا ہے۔ ایک طرف انگریزی قسم کے خورد ونوش کا انتظام تھا۔ لوگ اکثر امیرانہ انگریزی لباس میں ملبوس۔ کہیں کہیں عبائیں، عمامے اور ڈاڑھیاں بھی نظر آتی تھیں۔ ارباب حل وعقد اور حاضرین وسامعین سب مسلمان لیکن توحید کے فرزند ٹولیوں میں تقسیم۔ عہدہائے بلند مناصب کی تقسیم پیش نظر تھی سب بے محابا ترغیب، "بے بکار قسمیں" "آتش طراز گفتگو" "تیار سواریاں"۔ میں عارف کی طرف دیکھنے لگا اور وہ میری طرف مخاطب ہوئے:-

کہتا تھا عزازیل خداوند جہاں سے — پرکالۂ آتش ہوئی آدم کی کفِ خاک
جاں لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب — دل نزع کی حالت میں خرد پختہ و چالاک
جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست — باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

عصرانہ کا وقت قریب تھا، دفاتر سے عاملانِ اعلیٰ، انگریزی لباس میں بادپا موٹروں پر ہوٹلوں کی طرف جا رہے تھے، عارف کہنے لگے:-

ترا وجود سراپا تجلیٔ افرنگ — کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

آگے بڑھے تو کالج کی ایک عمارت دکھائی دی۔ نوجوان لڑکے شور مچاتے ہوئے قہوہ خانوں کی طرف جا رہے تھے۔ ہاتھ میں سگرٹ، آنکھوں پر عینک، قہقہے، مذاق، غیر سنجیدگی حرکات سے نمایاں۔ ——— عارف کی زبان سے بے اختیار یہ شعر نکل گئے:-

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر — نیست از نقد و قماش و سیم و زر
مالِ او فرزند ہائے تندرست — تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست

باتوں باتوں میں ہم لوگ ایک ایسی جگہ پہونچ گئے جہاں قطار در قطار مخلوق سینما کے ٹکٹ کے انتظار میں کھڑی تھی۔ غضب یہ تھا کہ برقعہ پوش عورتیں بھی ایک قطار میں دکھائی دیتی تھیں۔ عارف نے سینما کی طرف رخ کیا تو مجھے بڑا تعجب ہوا۔ میں رکا تو کہنے لگے کہ دل کو کتنی ہی تکلیف

کیوں نہ ہو لیکن اپنی ملت کا حال زار دیکھنا ضروری ہے۔ غرض ایک مکلف نشست گاہ میں لوگ مے نوشی میں مصروف تھے۔ رقص ہو رہا تھا۔ عارف نے کہا کہ سینما کے متعلق علامہ کے اشعار تو ذرا پڑھنا۔ چنانچہ میں نے عرض کیا:۔

وہی بت فروشی وہی بت گری ہے	سینما ہے یا صنعت آذری ہے
وہ صنعت نہ تھی، شیوہ کافری تھا	یہ صنعت نہیں شیوہ ساحری ہے
وہ مذہب تھا اقوام عہد کہن کا	یہ تہذیب حاضر کی سوداگری ہے
وہ دنیا کی مٹی یہ دوزخ کی مٹی	وہ بت خانہ خاکی یہ خاکستری ہے

عارف کچھ دیر چپ رہے۔ پھر بولے تو کہنے لگے کہ کیا ان چیزوں کا انسداد ممکن نہیں؟ میں نے عذر کے طور پر کہا کہ موقع نہیں ملا ہے۔ دستور بن رہا ہے۔ انشاء اللہ یہ چیزیں رفتہ رفتہ دور ہو جائیں گی۔

عارف:۔ اس میں تو کسی موقع اور محل کا سوال نہیں، دستور کے انتظار کی بھی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ اگر آج یہ معلوم ہو کہ شہر میں ہیضہ ایک وبائی شکل اختیار کر رہا ہے تو روکنے کے لئے دستور کا انتظار یا فرصت کا انتظار تو ایک جرم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ شراب خوری کے بند کرنے میں کیا بڑے انتظام کی ضرورت ہے، صوبہ بمبئی میں شراب نوشی آخر بند ہے تو کیا مصیبت آ گئی۔ اسی طرح سے مسلمان مستورات کو بے محابا رقص سے روکنے میں کیا دقت۔ آپ کوئی تعرض نہ کیجئے صرف یہ اعلان کر دیجئے کہ ایسی بے باک عورتوں سے پاکستان کے یا اسلام کے حقوق لے لئے جائیں گے، پھر دیکھئے کہ حالات سدھرتے ہیں کہ نہیں!

میں:۔ دو مشکلیں آ پڑی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ جمہور تو ہمارے اور نادان، نابالغ بے دست و پا جمہور ہے۔ دستور جمہوریت جو اس وقت نمائندگی کر رہا ہے وہ کسی اور جمہور جو زوردار اور قوی الجثہ جمہور تھا اس کے بدن پر سے ناپ لیکر بنایا گیا ہے۔ اس لئے جمہور و دستور جمہور میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ یہ دستور اُسی قدر ہمارا نمائندہ ہے جیسا کہ ایک محکمہ کا افسر اس محکمہ کے ملازمین کا نمائندہ سمجھا جا سکتا ہے۔ ہم بمنزلہ ایک نابالغ کے ہیں اور ہمارے وزرا گویا ہمارے ولی ہیں، ہم اگر کبھی کسی الٹی سیدھی رائے کا اظہار بھی کر دیتے ہیں تو بعض وقت وہ کہہ دیتے ہیں کہ تم کو اس سے کیا؟ اگر ہم کہہ دیں کہ آدمی کی جگہ تم کسی ستون کو سلام کر دو، تو تم ستون ہی کو سلام کیا کرو۔ یہ نمائندگی نہیں ہوئی بلکہ بزرگی ہوئی۔ مگر چونکہ دستور میں نمائندگی کا لفظ استعمال ہوا ہے اور نفسیاتی طور پر کوئی شخص یہ نہیں چاہتا کہ اس کو نابالغ سمجھا جائے، اس لئے اسی بزرگی خوردی کو ہم نمائندگی کہتے ہیں، مگر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو قوت اصل نمائندگی میں مضمر ہے، وہ محض لفظ نمائندگی کے استعمال سے تو پیدا نہیں ہوتی دوسری مشکل یہ ہے کہ ہم کو جو خاکہ دستور کا انگریز دے گیا ہے اس میں اس قسم کے ارتقا کے لئے کوئی گنجایش ہی نہیں ہے۔ یوں کھینچ تان کر آپ کچھ وزیر تعلیم پر ڈال دیجئے، کچھ وزیر داخلہ کے سپرد کیجئے، سینما کو صنعت مان کر کچھ وزیر صنعت کے متعلق کیجئے، لیکن ان منتشر مساعی میں کوئی ربط نہ پیدا ہوگا۔ قومی ارتقا تو ایک جسم نامی کی شکل رکھتا ہے، وہ مفرد چیزوں سے مرکب نہیں ہوتا مثلاً وہ تعلیم کسی کام کی نہیں ہے، جس میں خدمت ملت کا جذبہ پیدا نہ کیا جائے اور ملت کی وہ تربیت ناقص ہے جس میں جذبہ سپہ گری نہ ابھر سکے۔ لیکن ہماری مشکل یہ ہے کہ چونکہ یہ مقاصد انگریز کے نفع کے منافی تھے اُس نے اُس خاکے میں جو اس نے ہماری طفل تسلی کے لئے بنایا ان چیزوں کی گنجایش ہی نہ رکھی۔

عارف:۔ حریم تیرا خودی غیر کی معاذ اللہ   دوبارہ تازہ نہ کر کاروبار لات و منات

لیکن آپ نابالغ کیوں بنے ہوئے ہیں؟

ملیں :- ابھی شاید چند دن ہمیں اسی عالم میں رہنا ہوگا۔

عارف :- کوئی اور قوت نہیں جس سے کام لیا جائے؟ علما تو پاسبان دین کہے جاتے ہیں آخر یہ لوگ کیا کام کر رہے ہیں؟ تحریک خلافت کے وقت تو یہ تین تین محاذ سنبھالے ہوئے تھے، انگریزوں کے مظالم برداشت کئے، جو قدم قدم نا غیروں کی منافقت سے پالا پڑا لیکن اب تو انگریز بھی نہیں ہے، اور غیر بھی نہیں۔ یہ کیوں نہیں غریب مہاجرین اور بے لبس ملت کا ساتھ دیتے۔

ملیں :- ہم مسلمانوں کا ہر طبقہ اپنے مشاغل کو کسی مذہبی معیار پر نہیں بلکہ ایک معاشرتی میزان پر تولتا ہے۔ اس سے علما بھی مستثنیٰ نہیں۔ مان لیجئے کہ ایک بستی میں پانی نہیں ہے۔ علما، وزرا، حکام اور سادہ سب ہی فرمائیں گے کہ کچھ انتظام ہونا چاہیئے۔ کسی کو یہ خیال نہ ہوگا کہ اتباع خلفائے راشدین کا موقع ہے، مشکیزہ تلاش کرکے پانی پہونچادیں۔ ہم سب کا مذہب ہمارے معاشرے سے دب گیا ہے۔

علما بڑے جوش و خروش کے ساتھ غزوہ خندق بیان فرماتے ہیں مگر اُن کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مٹی کھودنی نہیں تھی، بلکہ یہ سبق دینا تھا کہ معاشرتی امتیاز کو مساوات سے بند نہ کرو، تاکہ طبقاتی تفرق سے ملت میں انتشار نہ پیدا ہونے پائے۔ علامہ اقبال کا "نالۂ ابوجہل" اسی بات کو سمجھاتا ہے۔ ابوجہل کو حضور سرور کائنات سے شکایت تھی کہ آپ نے اس قدر مساوات کو پختہ کر دیا ہے کہ

در نگاہ او یکے بالا و پست　　　با غلام خویش بر یک خواں نشست

مگر اب کراچی میں ابوجہل کو یہ شکایت بہت کم مسلمانوں سے ہوگی۔

جہاں ہم غزوۂ خندق بیان کرتے ہیں بہتر ہو کہ ہم سنتِ رسولؐ ادا کرنے کے لئے "یوم خندق" میں غریبوں کے لئے مٹی کھود کر مکان بنانے یا ان کے یہاں پانی پہونچانے میں وقت صرف کریں، یہ "اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی" ملت کی شیرازہ بندی کے لئے ضروری ہے اور ملت ہی کی طاقت حکومت کی قوت کی ضامن ہو سکتی ہے۔

عارف :- سورۂ الحمد میں صاف دو راہوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ جس پر نعمت عطا ہوتی ہے، دوسری جس پر غضب نازل ہوتا ہے۔ یہی سبق فلسفۂ تاریخ کا بھی ہے۔ اب خوب و ناخوب کا فرق سمجھنا چاہیئے۔ مثال کے طور پر دو غیر اسلامی حکومتوں پر نظر ڈالئے۔ زار نکولس ثانی کی حکومت میں کلیسا کی مقتدر ہستیاں جمہور کو نظر انداز کرکے شہنشاہ اور اس کی بیگم پر اثر انداز ہوگئیں سیاست کچھ دن ان کے ہاتھ میں رہی لیکن بالآخر ایک ایسا انقلاب آیا کہ اُس کا سیلاب تاج شہنشاہی کے ساتھ تسبیح خانقاہی کو بھی بہالے گیا۔ دوسری طرف دیکھئے کہ انگلستان میں کلیسا کے آزاد پیشوا اپنے معتقدین کے عقائد کے لئے گھر بار چھوڑ کر ان کے ساتھ مصائب کا مقابلہ کرنے امریکہ چلے گئے اور اسی غمِ ملت کے سبب وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے۔

علامہ اس غمِ ملت کو عین مذہب قرار دیتے ہیں :-

مسلمانی غمِ دل در خریدن　　　چو سیماب از تپِ یاراں تپیدن
حضور ملت از خود در گزشتن　　　دگر بانگ انا الملت کشیدن

روحِ انتخاب

حضرتِ عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں، کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین کی ایک مجلس میں تشریف لائے، تو اُن کی طرف خطاب کر کے فرمایا:۔

یامعشر المهاجرین خمس اذا ابتلیتم بهن واعوذ بالله ان تدرکوهن لم یظهر الفحشة فی قوم قط حتی یعلنوا بها الا فشی فیهم الطاعون والاوجاع التی لم یکن مضت فی اسلافهم الذین مضوا، ولم ینقصوا المکیال والمیزان الا اخذوا بالسنین وشدة المؤنة وجور السلطان علیهم ولم یمنعوا زکوٰة اموالهم الا منعوا القطر من السماء ولولا البهائم لم یمطروا ۰

ولم ینقضوا عهد الله وعهد رسوله الا سلط الله علیهم عدوا من غیرهم فاخذوا بعض ما فی ایدیهم ۰

ومالم تحکم ائمتهم بکتاب الله ویتخیروا مما انزل الله الا جعل الله باسهم بینهم ۰

اے گروہِ مہاجرین! میں خدا سے تمہارے لئے پانچ باتوں میں پڑنے سے پناہ مانگتا ہوں:۔ جب کسی قوم میں برملا فحش کام ہونے لگتے ہیں، تو لوگ طاعون اور دوسری ایسی گوناگوں بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جن سے ان کے اسلاف محض ناآشنا اور بے خبر تھے۔

اور جب کوئی قوم ناپ تول میں کمی کرنے لگتی ہے، تو وہ قحط سالی، سخت محنت، اور مظالمِ سلطانی میں پھنس جاتی ہے۔

اور جب کوئی قوم زکوٰۃ ادا نہیں کرتی تو اُن پر بارش بند ہو جاتی ہے، اگر اُن کے چوپائے نہ ہوں، تو اُن پر مینہ کی ایک بوند بھی نہ

اور جب کوئی قوم اللہ اور رسولؐ کے ساتھ عہد شکنی کرتی ہے، تو اللہ اُن پر دشمن مسلّط کر دیتا ہے، جو اُن کے اموال چھین لیتا ہے۔

اور جب کسی ملک کے حُکّام احکامِ خداوندی کے مطابق فیصلے کرنا چھوڑ دیتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ اُس قوم میں پھوٹ ڈال دیتا ہے ؛

(ابن ماجہ باب العقوبات)

(۲) حمد و ثنا کے بعد آپؐ نے فرمایا:۔

اما بعد۔ فان اصدق الحدیث کتاب الله واوثق العری کلمة التقوی وخیر الملل ملة ابراهیم وخیر السنن سنة محمد واشرف الحدیث ذکر الله واحسن القصص هذا القرآن وخیر الامور عوازمها وشر الامور محدثاتها۔ واحسن الهدی هدی الانبیاء واشرف الموت قتل الشهداء واعمی

امابعد۔ ہر ایک کلام سے خدا کی کتاب سچائی میں بڑھ کر ہے۔ سب سے بڑھ کر مضبوط کڑا التقویٰ کا کلمہ ہے سب ملتوں سے بہتر حضرت ابراہیمؑ کی ملت ہے سب سے بہتر طریقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے اللہ اللہ کے ذکر کو سب باتوں پر شرف حاصل ہے۔ سب بیانات سے بہتر یہ قرآن ہے۔ بہترین کام اولوالعزمی کے کام ہیں بدعات بدترین چیزیں ہیں۔ انبیا کی روش سب روشوں سے اچھی ہے سب سے بہتر موت شہیدوں کی موت ہے۔ ہدایت کے بعد گمراہی سب سے بڑھ کر اندھا پن ہے۔

العمی الضلالة بعد الهدیٰ - وخیر الاعمال ما نفع وخیر الهدیٰ ما اتبع وشر العمیٰ عمی القلب والید العلیا خیر من الید السفلیٰ - وما قل وکفیٰ خیر مما کثر والهیٰ وشر المعذرة حین یحضر الموت وشر الندامة یوم القیامة ومن الناس من لا یاتی الجمعة الا دبراً - ومنهم من لا یذکر الله الا هجراً - ومن اعظم الخطأ اللسان الکذوب وخیر الغنی غنی النفس. وخیر الزاد التقویٰ - وراس الحکمة مخافة الله عزوجل وخیر ما وقر فی القلوب الیقین - والارتیاب من الکفر والنیاحة من عمل الجاهلیة والغلول من جر جهنم و السکر کی من النار والشعر من ابلیس والخمر جماع الاثم والشر المأکل ما کل مال الیتیم - والسعید من وعظ بغیره - والشقی من شقی فی بطن امه وانما یصیر احدکم الی موضع اربعة اذرع - والامر الی الاخرة وملاک العمل خواتمه والشر الروٴیا رؤیا الکذب و کل ما هو آت قریب - وسباب الموٴمن فسوق وقتاله کفر - واکل لحمه من معصیة الله وحرمة ماله کحرمة دمه - ومن یتال علی الله یکذبه - ومن یغفر یغفر له - ومن یعف یعف الله عنه ومن یکظم الغیظ یاجره الله -

ومن یصبر علی الرزیة یعوضه الله -

ومن تتبع السمعة یسمع الله به -

ومن یصبر یضاعف الله له - ومن یعص الله یعذبه الله

(زاد المعاد، صفحہ ۲۶۳)

بہترین کام وہ ہیں جو مفید ہوں بہترین روش وہ ہے جس کی پیروی ہو سکے۔ بدترین کوری دل کی کوری ہے۔ بلند (دینے والا) ہاتھ پست (لینے والے) ہاتھ سے اچھا ہے۔ تھوڑا اور کافی اس غفلت ڈالنے والی مالداری سے اچھا ہے۔ بدترین عذر وہ ہے جو بحالت نزع کیا جائے قیامت کی ندامت سب سے بدتر ہے۔ بعض لوگ جمعہ پڑھنے آتے ہیں۔ مگر ان کے دل پیچھے لگے رہتے ہیں۔ اور بعض لوگ بہت کم کم خدا کا ذکر کرتے ہیں۔ جھوٹی زبان سب گناہوں سے بڑا گناہ ہے۔ نفس کی فارغ البالی بہترین فارغ البالی ہے۔ بہترین توشہ تقوی ہے۔ خدا سے ڈرتے رہنا سب سے بڑی دانائی ہے۔ یقینی بات خوب دل نشین ہوتی ہے۔ شک پیدا کرنا کفر (کی علامت) ہے۔ مُردے پر نوحہ کرنا جاہلیت کی یادگار ہے۔ خیانت کرنا جہنم کا سامان کرتا ہے۔ بدمست ہونا آگ میں جلنا ہے (بیہودہ) شعر گوئی شیطانی کام ہے۔ شراب تمام گناہوں کا مجموعہ ہے۔ یتیم کا مال کھا جانا بدترین روزی ہے۔ سعادت مند دوسروں سے عبرت پکڑتا ہے۔ بدبخت ماں کے پیٹ میں ہی بدبخت ہوتا ہے۔ ہر شخص کو چار ہاتھ زمین (قبر) میں جانا ہے۔ کام کا انجام دیکھنا چاہئیے۔ عمل کا مدار انجام پر ہے۔ جھوٹا خواب بدترین خواب ہوتا ہے۔ ہر آنے والی چیز قریب ہے۔ مومن کو گالی دینا فسق ہے۔ اور اس سے لڑنا کفر (کی علامت) ہے۔ مومن کی غیبت کرنا اللہ کی معصیت ہے۔ مومن کا مال اُس کی جان کے برابر محترم ہے۔ جو خدا سے استغنا کرتا ہے خدا اسے جھٹلاتا ہے۔ جو لوگوں کی عیب پوشی کرتا ہے، خدا اس کی عیب پوشی کرتا ہے۔ جو معافی دیتا ہے خدا اُس کو معاف کرتا ہے۔ جو غصہ پی جاتا ہے خدا اُس کو اجر دیتا ہے۔ جو نقصان پر صبر کرتا ہے۔ خدا اُس کو عوض دیتا ہے۔ جو لوگوں کے عیوب پھیلاتا ہے۔ خدا اس کو رسوا کر دیتا ہے۔ خدا صابر کو دُگنا اجر دیتا ہے۔ نافرمان کو خدا عذاب دیتا ہے!

پھر آپ نے تین دفعہ استغفار پڑھ کر ختم فرمایا۔

ہماری نظر میں

القرآن الحکیم

"القرآن الحکیم" (پارہ اوّل) مع ترجمہ و تفسیر، از:- مولانا عبدالماجد دریابادی، ضخامت ۴۰۵ صفحات، بڑا سائز، کاغذ، کتابت، طباعت، سرورق ہر چیز نہایت دیدہ زیب، ہدیہ دو روپیہ، ملنے کا پتہ:- تاج کمپنی لمیٹڈ، بندر روڈ آفس کراچی۔

اُس ربِّ قادر و برتر اور مقلب القلوب کا فضل ہے کہ "فلسفی عبدالماجد" کو اُس نے "مولانا عبدالماجد" بنا دیا، جس قلم نے تقریباً چالیس سال قبل دین اور روحانیت کا مذاق اُڑایا تھا وہی قلم دین کی حمایت کے لئے وقف ہو گیا، کون کہہ سکتا تھا کہ "فلسفہ جذبات" کا مصنف، ایک دن قرآنِ کریم کا مترجم اور مفسّر بن جائے گا اور اتنی بڑی سعادت اُس کو میسّر آئے گی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے ترجمہ و تفسیر کے ساتھ پہلا پارہ (الٓمٓ) تاج کمپنی نے بلاک پر شائع کیا ہے، عربی تحریر کی رنگین زمین ہے اور حاشیہ پر خوبصورت بیل ہے، تاج کمپنی کتابت و طباعت کی خوبیوں کے لئے غیر معمولی شہرت رکھتی ہے، "تاج کمپنی" کا نام ہی طباعت کی دیدہ زیبی کی ضمانت ہے۔

۱۱ر جنوری ۱۹۵۲ء کا "صدق" ہمارے سامنے ہے، جس میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے اس بات کا شکوہ کیا ہے کہ فٹ نوٹ، قوسین اور پیراگراف اُس طرح نہیں لکھے گئے، جس طرح اصل مسودہ میں لکھے گئے تھے، "یہ سارے التزامات موجودہ مسلسل طرزِ کتابت میں ضائع ہی گئے"

مولانا موصوف آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"اس سے بھی بڑا ظلم مجھ پر یہ ہوا ہے کہ پارہ بغیر میرے مفصّل دیباچہ کے نکلا ہے! دیباچہ میں یہ سب تصریحات درج تھیں کہ اتنی تفسیروں اور ترجموں کی موجودگی میں آخر اس نئی خدمت کی ضرورت کیا تھی، ترجمہ بڑی حد تک کہاں سے ماخوذ ہے، تفسیری معلومات کے مآخذ کیا کیا ہیں، وغیرہ! اب ان تصریحات کی غیر موجودگی میں اگر کوئی ریویو نگار صاحب یہ اعتراض کر دیں کہ یہ ترجمہ تو بڑی حد تک فلاں مشہور ترجمہ سے سرقہ کر لیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ میں اس کا کیا جواب دے سکوں گا۔ ۔ ۔"

ترجمہ کوئی شک نہیں کہ عام فہم اور سلیس ہے، تفسیر بھی پُر از معلومات، مفید اور کار آمد ہے۔ فاضل مترجم اور لائق مفسّر نے بہت سی مشہور اور مستند تفاسیر سے استفادہ کے بعد یہ تفسیر مرتب کی ہے خاص طور سے حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ العزیز کی مشہور تفسیر "بیان القرآن" ترجمہ اور تفسیر کے وقت موصوف کے پیش نظر رہی ہے۔ قرآن پاک کے یورپین مترجمین و ناقدین اور سر سید احمد خاں مرحوم کی تفسیر پر بھی کہیں کہیں خوب اور برمحل طنز کی ہے! اس چیز نے افادیت کو اور بڑھا دیا ہے کہ صاحبِ تفسیر و ترجمہ کی بائبل پر بھی نظر ہے!

یہ تفسیر اُردو پڑھنے والوں کے لئے خاص طور پر لکھی گئی ہے اس لئے بیضاوی، مدارک، کشاف وغیرہ تفاسیر کے جو عربی اقتباسات دیئے گئے ہیں اُن کا اُردو ترجمہ بھی ہونا چاہئے تھا، نحوی ترکیبوں سے جہاں بحث کی گئی ہے، وہ بھی اُردو خوانوں کو کچھ اجنبی سی محسوس ہو گی مگر عربی داں طبقہ اس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے!

بہر حال یہ تفسیر اور ترجمہ اُردو میں ایک مفید اضافہ ہے۔ تاج کمپنی کو باقی پاروں کی طباعت میں کام کی رفتار کو تیز تر کر دینا چاہیئے اور مولانا عبدالماجد دریابادی جس نہج پر کتب چھاپتے ہیں اُس کا لحاظ بس ضروری ہے اور خاص طور سے اُن کا لکھا ہوا دیباچہ تو ضرور شائع ہونا چاہیئے، موجودہ صورت میں بھی تاج کمپنی کا کام قابلِ تحسین ہے!

حیاتِ مالکؒ

"حیاتِ مالکؒ" از:- سید سلیمان ندوی، ضخامت ۱۸۰ صفحات مجلد قیمت ڈیڑھ روپیہ، ملنے کا پتہ:- مکتبۃ الشرق، آرام باغ، کراچی!

علامہ سید سلیمان ندوی کی یہ بالکل ابتدائی تصنیف ہے جو اب سے پینتیس سال قبل ۱۹۱۷ء میں سب سے پہلے شائع ہوئی تھی، "حیاتِ مالکؒ" کے ایک دو نہیں متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں جو دلیل ہے اس کی مقبولیت کی! اب پاکستان میں مکتبۃ الشرق نے اس کا خوبصورت ایڈیشن چھوٹے سائز پر شائع کیا ہے۔

جناب سید صاحب کی یہ پہلی تصنیف اس بات کی بولتی ہوئی شہادت ہے کہ صاحبِ موصوف کی مضمون نگاری کی ابتدا ہی "پختگی" اور "تحقیق" سے ہوئی ہے! اور اُن کی پاکیزہ باطنی کی یہ دلیل ہے کہ علامہ ممدوح نے اُس مقدس شخصیت کی سیرت کو موضوعِ نگارش بنایا جسے مدینے سے مدینہ والے سے اور صاحبِ مدینہ کی سُنت سے غیر معمولی عقیدت، محبت اور شغف تھا، امام دارالہجرہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ و قدس سرہٗ کی ذات میں خوبیوں کی بوقلمونی نظر آتی ہے ایک طرف وہ صاحب حجۃ فقیہ ہیں دوسری طرف بلند پایہ محدّث ہیں اور صرف محدّث و فقیہ ہی نہیں بلکہ صاحبِ تقویٰ بھی! اُن کا سب سے نمایاں وصف حق کی راہ میں اُن کی استقامت ہے، حضرت امام مالک علیہ الرحمۃ نے اظہارِ حق میں بادشاہوں اور حاکموں کی شانِ جلالت کی مطلق پروا نہیں کی، بادشاہتیں تو خود امام مالک کی علمی عظمت کے اردگرد گھومتی تھیں۔

اس کتاب میں فاضل مُصنّف نے نہایت سلیقہ کے ساتھ تاریخی واقعات کو مُرتّب کیا ہے، اندازِ بیاں دل نشین اور سلیس ہے، امام مالکؒ کے طفیل میں اسلامی تاریخ کی بہت سی نامور اور قابلِ قدر شخصیتوں سے بھی تعارف ہو جاتا ہے، بعض فقہی مسائل کی بحث بھی درمیان میں آگئی ہے خاص طور سے علمِ حدیث کے طالب علموں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف یہ کہ مفید بلکہ ضروری ہے۔

امام مالکؒ کی جمع کی ہوئی احادیث کا مجموعہ (موطا) کس درجہ کا ہے، اس بارے میں مُصنّف کی رائے سُنئے:-

"طبقۂ اولیٰ یعنی موطا، بخاری اور مسلم میں موطا کا کیا درجہ ہے؟ علمائے حدیث اس جواب میں مختلف الرائے ہیں، عام عُلماء تو اس کو مُسلم بلکہ ترمذی کے بھی بعد جگہ دیتے ہیں لیکن محققین قدماء اور عموماً متاخرین میں شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ اس کو بُخاری سے بھی مقدم سمجھتے ہیں اور خود میں بھی بقدرِ طلبِ حدیث سے یہی اعتقادِ جازم رکھتا ہوں (صفحہ ۱۰۲)

"حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہم) جو اسرارِ شریعت کے رازداں تھے" (صفحہ ۱۵) اس میں "رازداں" کی جگہ واقف کار کا یا اسی قبیل کا کوئی لفظ آنا چاہیئے تھا، کیونکہ "اسرار" پہلے آچکا ہے پھر "رازدانی" غیر ضروری تکرار ہے ——— "جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن ابی طالب" (صفحہ ۲۲) میں کتابت کی غلطی کے سبب نسب نامہ کے ناموں میں ترتیب کے اعتبار سے تقدیم و تاخیر ہو گئی ——— "لاترفعوا اصواتکم صوت النبی" (صفحہ ۴۳) میں کاتب صاحب نے "فوق" کا لفظ چھوڑ دیا، اور کاپی اور پروف پڑھتے وقت بھی نگاہ سے چوک ہو گئی۔

سچ تو یہ ہے کہ "حیاتِ امام مالکؒ" پڑھ کر ایمان تازہ ہوتا ہے اور دل میں نیک بننے کی تڑپ پیدا ہوتی ہے، ایک ایک صفحہ پر دل کہتا ہے ۔ ۔ ۔ یا اللہ! کیا اُمت میں اب کوئی "امام مالکؒ" پیدا نہ ہو گا؟

اجتہاد

"اجتہاد" از:- خالد انصاری، ضخامت ۱۲۸ صفحے، کتابت بہت پاکیزہ، طباعت پاکیزہ تر، قیمت دو روپیہ ـــــ ملنے کا پتہ:- مولانا خالد انصاری، اتوارہ- بھوپال (سینٹرل انڈیا)

فقہ کی تاریخ پر علامہ محمد خضری کی کتاب دار المصنفین اعظم گڑھ کی طرف سے اُردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہے، اب مولانا خالد انصاری نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور تحقیق و معلومات کے سمندر کو سچ مچ ایک کوزہ میں بند کر دیا ہے، ابتدائی صفحات میں فقہ اسلام کے دَور قائم کئے ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مقدس میں فقہ کی کیا نوعیت تھی، پھر خلفائے راشدین کے دورِ سعادت میں کیا صورتیں ظہور میں آئیں، اُس کے بعد بنو امیہ کے زمانہ میں پُوری ایک صدی تک فقہ اسلامی کا قافلہ کن منازل سے گزرا اور اُس کے قافلہ سالار کون تھے؟ مدینہ، مکہ، کوفہ، بصرہ، شام، مصر اور یمن کے فقیہوں کے علاوہ تابعین فقہاء (رحہم اللہ تعالیٰ) کے مختصر حالات بھی دیئے ہیں، پھر امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، اور امام حنبل (اللہ تعالیٰ کی اُن سب پر رحمت ہو) کے فقہی مذاہب سے بحث کی ہے، فقہ کے اُن مذاہب کا بھی ذکر کیا ہے جو فنا ہو گئے!

تقلید، اجتہاد، قیاس اور اجماع کی فقیہانہ بحثیں بھی اس کتاب میں موجود ہیں اور بعض مقامات فاضل مصنّف کی ذہانت، وسعتِ مطالعہ اور ژرف نگاہی کا پتہ دیتے ہیں ـــــ لائق مصنّف یہ مانتے ہیں کہ فرائض و واجبات، سُنن تشریعی اور حرام و حلال میں ذرہ برابر رد و بدل نہیں ہو سکتا مگر تمدنی و سیاسی تغیرات کا لحاظ کرتے ہوئے، اجتہاد کی ضرورت بہر حال باقی رہتی ہے اور رہنی چاہیئے مگر افسوس ہے کہ گزشتہ چند صدیوں سے ہمارے فقہاء اور علماء پر "تقلید" کا اس قدر غلبہ ہے کہ روحِ اجتہاد دبی دبی سی نظر آتی ہے ـــ

(صفحہ ۳) "ان ادوار کی تفصیل یہ ہے ـــ" "ادوار" لکھنا چاہیئے تھا دورہ کی جمع "دوروں" سے FITS اور کی طرف خیال جاتا ہے، یوں بولتے ہیں "فلاں شخص پر آج کل مرگی کے دورے پڑتے ہیں" ـــ (صفحہ ۱۵) "اوقات دیمول کی یادداشت" "واو عطف" کی جگہ "اور" لکھنا چاہیئے تھا ـــ (صفحہ ۱۹) "بشرط پسندی ایک گھوڑا خریدا" یہ "پسندی" پہلی بار دیکھنے میں آیا، "بشرط پسند" لکھنا چاہیئے تھا ـــ (صفحہ ۶۳) "اور وہ کثرتِ لغزشوں کی وجہ سے غیر معتبر تھے" "لغزشوں کی کثرت" لکھنا تھا، یہاں اضافت وجدان پر سخت گراں گزرتی ہے ـــ (صفحہ ۷۷) غالباً کتابت کی غلطی کا سبب ہے کہ "شمس الائمہ محمد السرخسی" کی جگہ "شمس الائمہ محمد السرخی" چھپ گیا۔

مصنف نے آخر میں منظوم قطعہ تاریخ چھاپ کر، کتاب کے وزن کو افسوس ہے کہ ہلکا کر دیا۔

یہ روحِ تن عِلم دیں کہتی ہے	کہ یارب خدا حافظ و خیر باد
اس آشفتہ دوراں میں خالد میاں	لکھا تو نے کیا خوب یہ اجتہاد

اس قسم کے بچکانہ شعروں کا اس علمی بلند پایہ کتاب کے ساتھ آخر کیا جوڑ ہے؟

بہر حال "اجتہاد" کا مطالعہ عوام ہی نہیں، بعض خواص کی معلومات میں بھی کچھ نہ کچھ اضافہ ہی کر دے گا!

مجیبی صاحب کی کتابیں

جناب ایس احمد مجیبی کی انشاپردازی کا شاید آغاز ہی نصیحت و اخلاق کی باتوں سے ہوا ہے، وہ برسوں سے بچّوں کے لئے ایسی کتابیں لکھ رہے ہیں، جو نونہالانِ قوم کی زندگیوں کو اسلام اور اخلاق کے سانچوں میں ڈھال سکیں، ادب و انشاء کی اس صنف میں موصوف کافی شہرت رکھتے ہیں، اُن کی تحریر بہت زیادہ سادہ، سہل، دل آویز اور بچّوں کی نفسیات سے ملتی جلتی ہوتی ہے، مجیبی صاحب کی چند کتابیں ہمارے

پاس تبصرے کے لئے آئی ہیں ــــ

(۱) "اسلامی حکومتیں" (حصّہ اوّل) ضخامت ۱۴۴ صفحے، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ!

جناب الیاس احمد مجیبی نے اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارک، دورِ عہدِ خلافت راشدہ کے اہم تاریخی حالات کے علاوہ بنو امیہ اور بنو عباس کی حکومتوں کے واقعات سہل اور سلیس انداز میں قلم بند کئے ہیں، علامہ سید سلیمان ندوی نے اس کتاب پر اپنی قیمتی رائے درج فرمائی ہے، اُس کے یہ چند جملے، کتاب کی افادیت کے لئے سند کی حیثیت رکھتے ہیں! فرماتے ہیں:ــ

"زبان حسبِ معمول دستور صاف ستھری اور طرزِ ادا بھی دلچسپ۔ واقعات کے انتخاب میں حُسنِ مذاق کو کام میں لایا گیا ہے اور افادی پہلوؤں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔"

دُوسرا رُخ:ــ پہلے تو کتاب کا نام ہمیں کھٹکتا ہے، بنو اُمیہ اور بنو عباس مسلمانوں کی حکومتیں تھیں مگر خلافتِ راشدہ کی طرز کی "اسلامی حکومتیں" نہ تھیں! حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے البتہ عہدِ خلافت کی یاد تازہ کردی، ورنہ زیادہ تر "ملوکیت" ہی کا غلبہ رہا، جس طرح ایک فاسق بھی بہرحال "مسلمان" ہی ہوتا ہے اور اُسے ہم دین سے خارج نہیں کرسکتے۔ اس اعتبار سے اسلامی دائرہ کو وسعت دی جائے تو اموی اور عباسی حکومتیں بھی "اسلامی" کہی جاسکتی ہیں اور مورخین نے ایسا کہا ہے ــــــ مگر ذمہ داری اور احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ اور مُسلمان بادشاہوں کی حکومتوں میں امتیاز کیا جائے اور فکر و نظر کو اس "التباس" سے بچایا جائے۔

اس غلطی میں مغربی مورخین نے جان کر لوگوں کو اُلجھایا ہے، وہ تو مسلمان بادشاہوں کی شراب نوشی اور ان کی محفل کے رقص و نغمہ گری کو بھی "اسلامی تمدّن" کے نام سے پکارتے ہیں، حالانکہ حق یہ ہے کہ الحمرا اور تاج محل بھی اسلامی تمدّن کے مظہر نہیں ہیں، ہاں مُسلمان شہنشاہوں کے ذوقِ تعمیر اور دولت و آسودگی کی یادگاریں ہیں۔

(صفحہ ۱۰) "حضور نے پردہ فرمایا" "پردہ کرنا" یہ صوفیانہ اصطلاح ہے، "رحلت" یا "انتقال" لکھتے تو اچھا تھا ــــــ ــــــ (صفحہ ۱۰) "جھوٹی ناموس" "ناموس" کو مؤنث لکھا ہے ــــــ (صفحہ ۱۷) "شہنشاہِ دوعالم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم" حدیث میں کسی انسان کو بادشاہوں کا بادشاہ (شہنشاہ) کہنے کی ممانعت آئی ہے، "شہنشاہ" تو صرف خدا کی ذات ہے، مولانا شبلی نعمانی سیرۃ النبی میں "شہنشاہِ کونین" عقیدت کے جوش میں لکھ گئے ہیں، مگر ہمارے لئے تو رسول اللہ کا قول حجت ہے۔

صفحہ (۳۰) ان باتوں سے ۔ ۔ ۔ مال و دولت پر بے جا گھمنڈ کرنے والوں کی شان و شوکت کو "گھُن لگا" ــــ "گھُن لگا" یہاں اُکھڑا اُکھڑا سا لگتا ہے ــــــ (صفحہ ۱۴۱) "ہارون وہاں سے پلٹا، راستہ ہی میں تھا کہ سنا نقفور اپنی بات سے پھر گیا، ہارون بہت چلا پھر پلٹا۔ ۔" "چلا" کی جگہ کوئی زیادہ موزوں لفظ لانا چاہیئے تھا۔

(۲) "حبیبِ خدا"، ضخامت ۱۹۲ صفحے، قیمت دو روپے، لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت دیدہ زیب!

اس سے اوپر جس کتاب (اسلامی حکومتیں) پر ابھی ابھی تبصرہ ہوچکا ہے اُس کتاب کا مضمون "حبیبِ خدا" میں ۲۸ صفحے

لہ کہیں کہیں ترمیم اور اضافہ ضرور کردیا ہے۔

عہ گو ہم اسے مذکر بولتے ہیں، لیکن لغت دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ "مؤنث" ہی ہے۔

صفحہ ۱۲۵ کے بعد آخر کتاب تک جو مضمون ہے وہ بیشک اضافہ ہے اور بہت خوب ہے! حضور کی سیرتِ مقدسہ کے بعض گوشے سلیقہ کے ساتھ پیش کئے ہیں ——— صفحہ (۱۷۰) پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی تعریف میں یہ فقرہ "بڑی پچھے دار باتیں کرتیں اور تقریر بھی فرماتی تھیں" وجدان میں کھٹک پیدا کرتا ہے، "پچھے دار باتوں" میں بعض اوقات "ذم" اور اکثر "طنز" کا پہلو ہوتا ہے، آئندہ اشاعت میں یہ جملہ ضرور بدل دینا چاہئے۔

(۳) "پیارے نبی" ضخامت ۱۰۲ صفحے، قیمت ایک روپیہ، طباعت وکتابت عمدہ! اس کتاب میں بھی حضور اقدس خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مقدس سیرت کو آسان زبان میں لکھا ہے اور زبان اس قدر سہل ہے کہ نو دس سال کے بچے بھی اسے سمجھ سکتے ہیں، کتابت بھی کھلی کھلی ہے کہ بچوں کو پڑھنے میں آسانی ہو۔

(۴) "چار ستارے" ضخامت ۹۰ صفحات، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ!

کتاب کا نام ہی بتا رہا ہے کہ اس میں آسمانِ حق وصداقت کے کن درخشندہ ستاروں کا ذکر ہوگا، جناب مجیبی صاحب نے خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کے مبارک حالات اپنے مخصوص دل نشین انداز میں لکھ کر انسانیت اور اخلاق کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔

(۵) "مہاجرین وانصار" ضخامت ۱۹۰ صفحات، کتابت خوب، طباعت خوب تر، کاغذ سفید چکنا، سرورق رنگین دیدہ زیب، قیمت ڈیڑھ روپیہ!

اس کتاب میں مجیبی صاحب نے مہاجرین وانصار میں سے بعض مشہور صحابہ کے مختصر حالات قلم بند کئے ہیں، مولانا عبدالماجد دریابادی کا اس پر چند سطروں کا پیش لفظ ہے، یہ کتاب شروع سے آخر تک مفید ہی مفید اور مبارک ہی مبارک ہے!

(صفحہ ۱۱۶) "جب مُہم اُن کے سپرد ہو جاتی تو حضور بےفکر ہو جاتے" "بےفکر" اپنی جگہ صحیح استعمال ہوا ہے اور یہ بولا بھی جاتا ہے مگر یہاں "بے فکر" ہی لکھنے کا محل تھا کیونکہ طلباء "بےفکر" کے مقابلہ میں "بے فکر" کو زیادہ آسانی سے سمجھ سکیں گے ——— (صفحہ ۱۳۸) "دور تک آدمی ہی آدمی ٹھٹ لگ گئے" ہم نے تو اس طرح لوگوں کو بولتے سُنا ہے "آدمیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے" (صفحہ ۱۴۹) "ایک دن قرآن مجید کی ایک جہادی آیت پڑھتے پڑھتے مارے جوش کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔" ——— "جہادی آیت" سے مصنف کی مُراد یہ ہے کہ وہ آیت جس میں "جہاد" کا ذکر ہو مگر یہ ترکیب نامانوس ہے!

اس دورِ مادہ پرستی میں جبکہ فحش لٹریچر، عُریاں تصویروں اور فلموں نے لوگوں کے اخلاق بگاڑ دیئے ہیں، اس قسم کی کتابوں کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے، ایسا پاکیزہ لٹریچر تو مسلمان بچوں کی گھٹی میں حل کرکے پلانا چاہئے کہ زندگی اسلام واخلاق کے ستونوں پر اُستوار ہو، جناب الیاس مجیبی صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے گا ——— یہ تمام کتابیں "اُردو گھر ۲/۹ مارٹن روڈ، کراچی سے مل سکتی ہیں!

۵۷ء کے ہیرو

"۱۸۵۷ء کے ہیرو" از:— سیدہ انیس فاطمہ بریلوی ضخامت ۱۱۲ صفحات، مجلد، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ، ملنے کا پتہ:— دفتر "العلم" ایجوکیشنل کانفرنس، سندھ مدرسہ، کراچی۔

محترمہ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی نے ہندوستان کی جنگِ آزادی جو غدر سنہ ستاون کے نام سے مشہور ہے اُس کے تین معرکہ آراؤں (H E R O E S) کے حالات لکھے ہیں! کتاب پر مقدمہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا لکھا ہوا ہے اور ظاہر

ہے کہ خوب تر ہونا چاہیئے اور ہے!

عام طور پر لوگ اودھ کی جانباز ملکہ ——— حضرت محل —— کا نام بھی نہیں جانتے، اس کتاب کے ذریعہ اس حریت پسند خاتون کا تعارف ہوتا ہے جس نے کامل دس ماہ تک انگریزوں کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا، "حضرت محل" چاند بی بی، اور جھانسی کی رانی کی ہم پلہ تھیں، اگر بنگال اور دلی کی طرح لکھنؤ میں بھی گھر کے لوگ غداری نہ کرتے، اور نیپال کا راجا انگریزوں کو ان نازک حالات میں جلد اُن کے قدم اکھڑنے ہی والے تھے، مدد نہ پہنچاتا تو حضرت محل کے عزم جرأت آزمانے انگریزی حکومت کا شیرازہ قمع کر دیا ہوتا اور سب سے زیادہ نمک حرامی تو بہارا جہ بال کرشن نے کی جو "حضرت محل" کے سامنے اُن کی وفاداری کا دم بھرتا تھا اور اندرونی طور پر انگریزوں سے ملا ہوا تھا!

حضرت محل کے بعد، جنرل بخت خاں اور جنرل محمود خاں کا تذکرہ ہے، یہ بھی جنگ آزادی کے قافلہ کے نقیب تھے! اس کتاب میں بعض ایسی تاریخی معلومات بھی ہیں جو کم سے کم ہماری نگاہ سے ابھی تک نہ گزری تھیں اور نہ کسی کی زبان سے سننے میں آئیں!

مرزا غالب نے جن نواب تجمل حسین خاں کی اپنے شعروں میں تعریف کی تھی۔

دیا ہے اور کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے   بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا   کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

تو اس کتاب سے پہلی بار یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ بھی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے معرکہ آراؤں میں تھے مگر غدر کی ناکامی کے بعد نواب تجمل حسین خاں ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے اور اُن کی زندگی بڑی عسرت میں بسر ہوئی!

اندازِ نگارش کافی شگفتہ اور طرزِ بیان دلچسپ ہے، بعض مقامات پر سیدہ انیس فاطمہ کے قلم نے جوش و اثر کی تصویریں کھینچ دی ہیں، تاریخی حوالوں اور "[illegible]" کو سلیقہ کے ساتھ مرتب کیا ہے اور "تاریخ" کو کہیں غیر شگفتہ نہیں ہونے دیا، زبان بھی ہوئی بلکہ منجھی ہوئی ہے ——— رشید احمد صدیقی کی اس رائے کی

"سیدہ انیس فاطمہ لائق تحسین ہیں کہ انھوں نے اپنے لئے ادب کا وہ راستہ اختیار کیا جو ہماری اچھی صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہے اور صحیح منزل کی طرف رہبری کرتا ہے ———" ہم حرف بحرف تائید کرتے ہیں!

"حضرت مشکل آسان ثانی"

"حضرت مشکل آسان ثانی" از ——— سید مراد علی طالع، ضخامت ۲۴۰ صفحے قیمت قسم اوّل ایک روپیہ قسم دوم بارہ آنہ ملنے کا پتہ:- اردو کتب خانہ اسلامیات خانقاہ عنایت اللّٰہی حیدر آباد دکن (بھارت)

دکن میں ابو البرکات سید علامہ محمد شاہ زعم قادری الرفاعی ایک بزرگ گزرے ہیں یہ کتاب اُنھی کے سوانح حیات پر مشتمل ہے ——— مگر یہ "مشکل آسان ثانی" کیا ہے؟ اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ ابو البرکات صاحب مرحوم کی شکلیں اللہ تعالیٰ بہت جلد آسان کر دیا کرتا تھا تو ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے اور اگر یہ "مشکل کشا" کے انداز کا کوئی لقب یا خطاب ہے تو قابلِ اعتراض ہے، مشکلوں کو آسان کرنے والا خدا کے سوا اور کون ہو سکتا ہے،

یہ کتاب کیا ہے، اچھی خاصی ایک "کشکول" ہے، قرآن کی آیت جس صفحہ پر درج ہے اُس کے سامنے کے صفحہ پر کتاب کو مرتب

---

[1] صفحہ ۱۱ پر غالباً سہو کتابت کے سبب "کٹورہ" ——— "کھٹورہ" چھپ گیا!

کرنے والے صاحب کی ایک عدد تصویر زیب قرطاس (؟) ہے، پھر درگاہ اور خانقاہ کے فوٹو ہیں، اردو کتب خانہ اسلامیات کے افتتاح کا گروپ بھی ہے، انھی "حضرت مشکل آسان ثانی" کی درگاہ کے کمسن سجادہ نشین کی تصویر بھی ہے، ایک فوٹو گروپ میں خواجہ حسن نظامی صاحب بھی تشریف فرما ہیں ——— پھر مختلف لوگوں کے مضامین ہیں غزلیں ہیں، قطعے ہیں اور کوئی کوئی مضمون تو چند سطروں ہی کا ہے۔

بدعات کبھی ایک حال پر نہیں رہتیں، ان میں اضافے اور ترمیمیں ہوتی رہتی ہیں اور ہر جگہ کے "مبتدعین" نئے نئے شگوفے چھوڑتے رہتے ہیں، چنانچہ دکن میں "صندل" کی رسم ہے، جس کو "صندل شریف" کہا جاتا ہے، جن بزرگ کے حالات اس کتاب میں درج ہیں، ان کے "صندل شریف" کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔

"حضرت مشکل آسان ثانی کا صندل ہر سال ۵ ربیع الاول کو بعد نماز عصر جلوس کے ساتھ مسجد چوک سے برآمد ہوتا ہے ... عصر کی نماز تک تمام معتقدین اور متعلقہ اصحاب مسجد چوک میں جمع ہو جاتے ہیں اور عصر کے بعد صندل کے پیالوں، نئے غلاف مبارک اور پھولوں کی چادروں وغیرہ کی کشتیاں ایک شامیانے کے نیچے برآمد کی جاتی ہیں، جلوس میں پہلے اونٹ پر ایک سبز جھنڈا لہراتا ہے، پھر نوبت گاڑی ہوتی ہے اس کے بعد تاشہ، باجہ، مولود کی جماعتیں ——— رفاعی فقراء اور معتقدین و احباب، آخر میں سجادہ صاحب اور ان کے برادران خورد جو کشتیوں کے شامیانے کے آگے آگے اوراد اور درود شریف پڑھتے ہوئے ... ..."

ان حالات کو پڑھئے اور فرزندانِ توحید کی اس "بدعت نوازی" پر خون کے آنسو بہائیے! کیا ان میں سے کسی ایک "رسم" کی بھی عہدِ رسالت اور دورِ صحابہ کو چھوڑئیے، تابعین اور تبع تابعین کے دور میں کوئی نظیر ملتی ہے، کیا یہ اس قسم کی حرکتیں نہیں ہیں جو پچھلی نافرمان امتوں سے سرزد ہوئی تھیں اور اللہ کا غضب بھڑک اٹھا تھا!

ادبی اعتبار سے بھی اس کتابچہ کا کوئی وزن نہیں ہے، جو روپیہ اس کے چھپنے میں لگا ہے، وہ ہر طرح سے ضائع ہی ہوا ہے، نہ اس میں دین کا کوئی فائدہ ہے اور نہ دنیا کا! ہم جانتے ہیں کہ ہماری یہ تحریر بعض دلوں پر بہت گراں گزرے گی مگر افسوس ہے کہ لوگوں کو خوش رکھنے کے لئے ہم حق بات کو چھپا نہیں سکتے!

پیرِ حرم اور زائرِ حرم

"پیرِ حرم اور زائرِ حرم" از شیخ عبدالرحیم ایڈوکیٹ ہائی کورٹ لاہور ضخامت ۱۱۰ صفحات، قیمت بارہ آنہ، ملنے کا پتہ:- میسرز گلاب ٹریڈنگ کمپنی ۱۳۶ فیروز پور روڈ، لاہور۔

گزشتہ سال اللہ تعالیٰ نے شیخ عبدالرحیم صاحب کو زیارتِ حرمین شریفین کی توفیق عطاء فرمائی، یہ کتابچہ وہاں کے مشاہدات اور تاثرات کا آئینہ دار ہے، یہ حجاج کے سفرناموں سے بالکل مختلف چیز ہے یوں سمجھئے کہ یہ "سفر نامہ" نہیں بلکہ "شکایت نامہ" ہے، جتنے سفر نامے اب تک ہماری نظر سے گزرے ہیں ان میں حکومت سعودیہ کے عمال کی بے پروائی، معلمین کے نازیبا سلوک اور وہاں کے دوسرے اہلِ معاملہ (موٹر ڈرائیور، حمال وغیرہ) کی شکایتیں سب میں پائی جاتی ہیں، شیخ صاحب نے اس کو مستقل موضوع بنا کر اپنے تاثرات کاغذ پر منتقل کر دئے۔

اس داستان کا ایک ایک ٹکڑا انتہائی تکلیف دہ ہے کہ ہم "آفاقی" اور غیر عرب اہلِ حجاز سے کتنی محبت اور حسنِ ظن رکھتے ہیں ہمیشہ سے سنتے آئے ہیں کہ اہلِ عرب مہمان نوازی اور مسافر نوازی میں اپنا جواب نہیں رکھتے مگر خود حجاز میں پہنچ کر

اس "حسنِ ظن" کو خلافِ توقع تجربہ سے سابقہ پڑتا ہے، حجاز کا بادشاہ، اور اُس کے عمال اور معلّمین وغیرہ سب مال و دولت کی حرص میں مبتلا ہیں اور جلبِ منفعت کی یہی ہوس حجاج کو طرح طرح کی مشکلوں اور پریشانیوں میں مبتلا کرتی ہے۔

قوم کی بڑی بدنصیبی ہے کہ ہمارے یہاں مصلحین (؟) بھی پیدا ہوئے تو مصطفےٰ کمال اور امان اللہ خاں جیسے۔ آزاد خیال بادشاہ ہیں تو فاروق والیٔ مصر اور رضا شاہ فرمانروائے ایران کی طرح! اور مذہبی حکمراں ہیں تو ابنِ سعود کی مانند!

ع تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم!

پٹرول کے بعد سلطان ابن سعود کی آمدنی کا غالباً سب سے بڑا ذریعہ یہی حاجیوں کا گراں بار "ٹیکس" ہے! اور نجد کے حامیانِ سُنت اور ماحیانِ بدعت (؟) علماء جنھوں نے قبوں، قبروں اور مقدس آثار کے انہدام پر فخر کیا تھا، ابن سعود سے کچھ نہیں کہتے کہ اُس نے "قیصریت" اور "کسرائیت" کی یاد تازہ کردی ہے!

مصنّف کا اندازِ بیان دلنشین ہے، مقامات کے املا میں ایک جگہ تسامح نظر آیا "خُبَر" کو "خُوبَر"[1] (صفحہ ۵۹) لکھا گیا ہے، پاکستانی سفیر کو بار بار "ہائی کمشنر" کہا گیا ہے، مصنّف ایڈوکیٹ ہیں "ہائی کمشنر" کی اصطلاح تو اُن سے پوشیدہ نہیں، سفارتی نمائندوں کے لئے یہ لفظ مخصوص ہے، مصر، ورمملکتِ سعودیہ میں پاکستانی نمائندے کی حیثیت سفیر (AMBASSADOR) کی ہے، صفحہ (۹۷) پر جن "سید بزرگ" کا ذکر کیا گیا ہے وہ "سید" نہیں ایک ترکی الاصل فاضل ہیں، جن کا نام ابراہیم حمدی ہے مگر مدینہ منورہ میں ابراہیم خربوطلی کے نام سے مشہور ہیں، باقی اُن کے متعلق جو شکایت کی گئی ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

یہ کتاب (بیرِ حرم اور وزائرِ حرم) اس قابل ہے کہ اس کو اُردو سے عربی میں منتقل کرکے ابن سعود کے پاس بھیجا جائے تاکہ "جلالتہ الملک" کو کچھ تو غیرت آئے، اس لئے کہ مسلمان کی دینی غیرت کو جب حرکت ہوتی ہے تو وہ بہت کچھ تلافی مافات کر دیتا ہے کاش! ایسا ہو سکے!

کون جیتا — کون ہارا

"کون جیتا — کون ہارا" از: — ولی وارثی ضخامت ۲۲۲ صفحات مجلد گردپوش کے ساتھ، قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ، ملنے کا پتہ:۔ اُردو بک اسٹال، بیرون لوہاری دروازہ، لاہور

ہندستان کی تقسیم کے بعد جو ہولناک فسادات رونما ہوئے، اُن پر افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں نے بہت کچھ لکھا ہے مگر اُن میں حقیقت افسانہ کے ساتھ ملی جلی تھی، اس کتاب کے ناشر نے آغاز میں لکھا ہے:۔ ..... "یہ کتاب ایک خاندان کی سچی اور مربوط سرگزشت ہے ..... " اس لئے اِس ناول کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے!

ناول کا پلاٹ خاصہ مربوط ہے، لکھنے والے نے جو کچھ لکھا ہے خاص تاثر کے ساتھ لکھا ہے اور اندازِ بیان بھی دلچسپ ہے، اور کہیں کہیں مکالمے نفسیات کی عکاسی کرتے ہیں۔

(صفحہ ۱۵) اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اُتنا ہی وہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے (صفی لکھنوی)

---

[1] خُبَر — خلیج فارس کے غربی ساحل پر ظہران کے ہوائی اڈہ سے کوئی چھ میل مشرق کی طرف ایک مختصر سی آبادی کا نام ہے (م۔ ع)

حیرت ہے کہ صفی لکھنوی کے اس مشہور شعر کو ناول نگار نے جو خود شاعر بھی ہیں "اقبال" سے کس طرح منسوب کر دیا ——— (صفحہ ۱۸) "یہاں سے متعدد راستے اِدھر اُدھر کو کھلتے ہیں" . . "پھٹتے ہیں" لکھنا چاہیئے تھا ——— (صفحہ ۹۴) "اپنے کام کاج سے مصروف ہونے لگی" "سے" "کی جگہ" "میں" کا محل تھا ——— (صفحہ ۹۰) "پھر غسل کیا، اور نمازیں پڑھیں، کچھ وظیفے بھی کئے" . . "وظیفہ کرنا" روزمرہ نہیں ہے، وظیفہ کے ساتھ "پڑھنا" بولتے ہیں ——— (صفحہ ۱۱۷) "دونوں سرداد کی قبر پر جا پہونچیں، سعیدہ نے فاتحہ کہا" . . "فاتحہ کہنا" پہلی بار نظر سے گزرا اور کوفت ہوئی "فاتحہ پڑھنا" یا "فاتحہ دینا" یا "فاتحہ پہونچانا" بولتے ہیں۔

(صفحہ ۱۴۰) "اور پتوں کی چرچراہٹ نے جاسوسی کی" . . "پتوں کی آواز کو کھڑکھڑاہٹ کہتے ہیں، چرچراہٹ نہیں کہتے۔" . . "چرچراہٹ" کا یہ محل ہے :—

"وہ دونوں پلنگ پر بیٹھ گئے اور اُن کے بوجھ سے پلنگ چرچرانے لگا"

(صفحہ ۱۶۲) "گلاب نے اچانک بندوق اُٹھائی اور اپنے چند ساتھیوں کو تعلید کا اشارہ کرکے گھوڑے پر سوار ہوگیا" . . "تعلید" یہاں کتنا ناموزوں لگتا ہے ———

عمل کی آگ سے دُنیا جلا دے
کہ یہ ظلمت کدہ پھر جگمگا دے (صفحہ ۱۶۷)

یہ خود ناول نگار کے قطعہ کا پہلا شعر ہے اور نہایت کمزور بلکہ مضحکہ انگیز ہے "عمل کی آگ سے دُنیا کا جلانا" آج پہلی مرتبہ سُننے میں آیا . . . واہ!

(صفحہ ۲۲۰) خود ناول نگار کی ایک رجزیہ نظم ہے

بڑھے چلو

. . . .

علی علی پکارتے فسادیوں کو مارتے
سنورتے اور سنوارتے

"علی" سے اگر حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہ کی ذات گرامی مُراد ہے تو پھر ایک توحید آشنا مرد مومن کو ہرگز زیب نہیں دیتا کہ حوادث اور مصیبتوں میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو پُکارے!

یہ جملہ کتنا پُرجوش ہے :— "خاکِ سمرقند سے کر راس کماری تک شمشیر زنی کرتے دلوں کی اولاد نہتی تھی اور ہمالیہ کے غاروں میں تپسیا کرنے والے بندوقیں لئے پھرتے تھے ——— (صفحہ ۱۶۳) ——— جہاں اس قسم کا اندازِ بیان ہے وہاں عبارت بہت جاندار ہوگئی ہے، بہرحال یہ ناول دلچسپ فرور ہے!

آیاتِ شفا

"آیاتِ شفا" از :— شفا گوالیاری ضخامت ۴۴ صفحات، قیمت بارہ آنہ، ملنے کا پتہ: شفا گوالیاری بیرون بدھ وارہ، بھوپال!

یہ جناب شفا گوالیاری کے کلام کا مجموعہ ہے، جس پر سب سے پہلے حضرت سیماب مرحوم کا قطعہ تاریخ زیبِ قرطاس ہے ——— "بنائے شرحِ آیاتِ شفا" سے ۱۳۶۴ ہجری نکلتے ہیں، پھر جناب رضا قریشی گوالیاری نے

شفا صاحب کے سوانح حیات نظم بند کئے ہیں اُس کے بعد جناب رضا علی صاحب وحشت اور مولانا بصیر اکبر آبادی کے قطعات ہیں، وحشت صاحب نے "سلکِ مروارید آیاتِ شفا" سے اور بصیر صاحب نے "مژدہ صحت ہے آیاتِ شفا" سے تاریخ (۱۳۶۴ ہجری) نکالی ہے، پھر صفی لکھنوی مرحوم، مولانا محوی لکھنوی، نیاز فتحپوری اور جوش ملسیانی کی آراء درج ہیں۔

شفا گوالیاری کے کلام میں صفائی اور سادگی پائی جاتی ہے، وہ سامنے کی باتیں بھی سلیقہ کے ساتھ شعر میں بیان کر جاتے ہیں، ان شعروں سے اُن کے کلام کی خوبیوں کا اندازہ ہو سکے گا:—

ارے ! نادان ! یوں بھی آشیاں کوئی بناتا ہے — مزاجِ باغباں دیکھا، نہ رنگِ آسماں دیکھا

درس عبرت ہے مرا نام زمانے کے لئے — نامِ اُلفت کا نہ اب بھول کے دنیا لے گی

رہین مستی حال بھی ہے، اسیرِ فکر مآل بھی ہے — چمن کو اپنا سمجھنے والا، بحال بھی ہے نڈھال بھی ہے

اور یہ مصرع بھی

؎ زمیں پہ پھولوں کے نقش بھی ہیں، فلک پہ تاروں کا جال بھی ہے

نہ جانے میں جہانِ شوق میں کیا بنتا جاتا ہوں — کہ جوشے مٹتی جاتی ہے، مرا دل ہوتی جاتی ہے

زمانہ کچھ کہے اے دوست! لیکن شکریہ تیرا — کوئی تو مصلحت تھی جو مجھے دیوانگی دے دی

دوسرا رُخ:— بعد رہائی بھی نہ میں زنداں سے جاؤں گا — بیٹھا رہوں گا عزت زنداں لئے ہوئے (صفحہ ۴۳)

مفہوم کچھ کھلا نہیں، پھر "عزت" نے بات کو اور گنجلک بنا دیا

روک لیں گی "تبسمات" ابھی — ہے مرے غم کدے میں رات ابھی (صفحہ ۴۹)

تبسم کی جمع "تبسمات" اس سے پہلے کم سے کم ہماری نگاہ سے نہیں گزری اس لئے نامانوس معلوم ہوئی،

حسنِ لطیف کو تو لطافت میں لاکے دیکھ — ہنس کر نہ دیکھ اُن کی طرف مسکرا کے دیکھ (صفحہ ۵۸)

حسنِ لطیف کو "لطافت میں لانا" آخر کیا بات ہوئی؟ اور یہ اندازِ بیان کیا ہے!

محبت میں کچھ ایسی ساعتیں بھی دل پہ گزری ہیں — کہ اُن کی یاد سے پہلے خود اپنی یاد کی میں نے (صفحہ ۶۲)

کہنا یوں چاہئے تھا "میں نے خود اپنے کو یاد کیا"— "اپنی یاد کی میں نے" یہاں کچھ اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے!

؎ ہر ذرہ جبیں بن جاتا ہے، ہر چیز نظر ہو جاتی ہے (صفحہ ۷۰)

تنقید نگار (ماہر القادری) کی بہت مشہور غزل کا یہ مصرع ہے:—

؎ ہر ذرہ دل بن جاتا ہے، ہر چیز نظر ہو جاتی ہے

اسی طرح خاکسار کے اس شعر سے

یہ روز روز کی مشقِ سجود ختم تو ہو
جبیں میں جذب ہی کر لوں نہ آستانے کو

توارد ہو گیا ہے، شفا صاحب نے کہا ہے:—

نیازِ عشق یہ حد نیاز بننے دے
جبیں کو جذب نہ کر لوں میں آستانے میں

جناب شفق صاحب آئندہ اپنے کلام کا مجموعہ اگر چھپوائیں تو پہلے اُس پر نگاہِ انتخاب ضرور ڈال لیں کہ کمزور شعر چھٹ چھٹا کر جاندار شعر باقی رہ جائیں، بلطف آب مکدر میں نہیں، آبِ مصفا میں ہے۔

مقالاتِ صارم

"مقالاتِ صارم" از:- عبدالصمد صارم فاضل الجامع الازہر (مصر) ضخامت ۱۰۵ صفحات، قیمت مجلد ڈیڑھ روپیہ، غیر مجلد ایک روپیہ، ملنے کا پتہ:- ادارہ علمیہ دھنی رام روڈ، نئی انار کلی لاہور!

یہ کتاب مولانا عبدالصمد صارم صاحب پروفیسر عربی و فارسی یونیورسٹی اینڈ نیل کالج لاہور کے مقالات کا مجموعہ ہے، جن میں سے اکثر مقالے مُلک کے مشہور علمی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں، مضامین کی بوقلمونی اور رنگا رنگی کا یہ عالم ہے کہ "جمع قرآن" پر بھی ایک مضمون ہے اور دو مقالے "چیونٹیوں" اور "مرض سل" پر بھی ہیں۔

"خوارج" پر جو تاریخی مقالہ ہے وہ کافی معلومات آفریں ہے مگر "جمع قرآن پر ایک نظر" جس مقالہ کا عنوان ہے اُس کے بعض حصے مزید تشریح اور قوی تر دلائل کے متقاضی ہیں۔

"کثرتِ ضحک و مزاح" (صفحہ ۱۰) ——— "قلتِ اکل" (صفحہ ۱۱) "اگر اجازتِ دخول مل جائے" (صفحہ ۱۸) اُردو کی سلاست پر اس انداز کی عربی تراکیب گراں ہیں اور آخری جملہ میں تو "ذم" کا پہلو نکلتا ہے، عربی میں یقیناً اس طرح بولتے ہیں: ہم نے بغداد کے بعض دفاتر اور مقامات پر ۔ ۔ ۔ "ممنوع الدخول" (NO ADMISSION) کی تختیاں لگی ہوئی دیکھی ہیں مگر اُردو میں "داخلہ" بولا جاتا ہے۔

جناب صارم صاحب کے لکھنے کا انداز سیدھا سادہ ہے، جو کہیں "سپاٹ" بھی ہو جاتا ہے، موصوف اگر عربی کتابوں کے تراجم کی طرف توجہ فرمائیں تو وہ زیادہ مفید خدمت انجام دے سکیں گے۔

دعوۃ الحق

ماہنامہ "دعوۃ الحق" سرپرست و نگراں:- مولانا احتشام الحق تھانوی، مدیر:- مولانا دلدار علی غازی ضخامت ۴۰ صفحات، سالانہ چندہ چھ روپیہ (پاکستانی) نو روپے (ہندستانی) ملنے کا پتہ: منیجر ماہنامہ "دعوۃ الحق" جیکب لائن، کراچی نمبر ۳

"دعوۃ الحق" کے تین شمارے اب تک منظرِ عام پر آچکے ہیں، صورت کے اعتبار سے یہ ماہنامہ کافی دیدہ زیب ہے، اس قدر قیمتی کاغذ تو شاید سرکاری رسالوں کو بھی میسر نہیں آتا، مضامین بھی خوب ہیں اور بعض خوب تر! مولانا دلدار علی غازی بڑے سلیقہ کے ساتھ اس علمی اور دینی مجلّہ کو مُرتب فرماتے ہیں، "رشحات" پڑھنے سے پہلے ہمیں معلوم نہ تھا کہ جناب غازی صاحب اتنی شگفتہ اور جاندار نثر لکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کے زورِ قلم اور روانیٔ خامہ کو اپنے دین کی خدمت کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے۔

جمادی الاولیٰ کے شمارہ میں کئی مضمون "ناتمام" ہیں اور ایک تو کُل دو صفحہ کا مضمون ہے جس پر "باقی آئندہ" لکھا ہوا ملتا ہے، ایک ہی شمارے میں کئی کئی مضمونوں اور مقالوں کو "قسطوں" میں چھاپنا شاید ناظرین کی طاقتِ انتظار پر گراں گزرے گا۔

"دعوۃ الحق" دارالعلوم اسلامیہ اشرف آباد (ٹنڈو الٰہ یار — سندھ) کا ترجمان ہے، اُس کی پشت پر علمائے کرام کی ایک جماعت ہے، لہذا اُس کے ذریعہ اگر "فتنۂ انکارِ حدیث" کا توڑ ہوتا رہے تو یہ بہت بڑا کام ہوگا۔

"دعوۃ الحق" کا ہم کُھلے دل سے خیر مقدم کرتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ "نظامِ حق" کے قیام میں وہ پوری پوری

ساعدت کرے گا اور اُس کی کوششیں صرف جزئی اصلاح تک محدود نہ رہیں گی ——— ایک دینی پرچہ کا اُردو ادب میں اضافہ خود ہماری دلی مسرت اور تقویت کا باعث ہے! اللہ تعالیٰ "دعوۃ الحق" کی زندگی اور کام میں برکت عطا فرمائے!

کلیاتِ اکبر

"کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی" (جلد دوم و سوم) ۴۰۰ صفحات، مجلّد، قیمت سات روپے
ملنے کا پتہ:- ملک دین محمد اینڈ سنز، بل روڈ لاہور ——— اور ——— دین محمدی پریس میکلوڈ روڈ، کراچی۔

"بزمِ اکبر" حضرت اکبر الٰہ آبادی کے سوانح حالات، کلام اور پیام کو پھیلانے اور عام کرنے کے لئے وجود میں آئی ہے، ایک دو کئی کتابیں منظرِ عام پر لا چکی ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا، "کلیاتِ اکبر" کی دوسری اور تیسری جلد ہمارے سامنے ہے جسے "بزمِ اکبر" نے بڑے سلیقہ، اہتمام اور سعی و محنت کے ساتھ شائع کیا ہے، لکھائی، چھپائی، کاغذ، جلد، غرض ہر چیز اپنی جگہ دیدہ زیب بلکہ مثالی ہے، اکبر کا کلام اسی اہتمام کے ساتھ چھپنے کا مستحق بھی تھا۔

جناب مُلّا واحدی صاحب ناظم شعبۂ تصنیف و تالیف بزمِ اکبر نے کتاب کے شروع میں "عرضِ حال" کے عنوان سے اظہارِ حال فرمایا ہے، اُس کے بعد حضرت اکبر الٰہ آبادی کی غزلوں سے کلیات کا آغاز ہوتا ہے، بزمِ اکبر نے کُلیات کو جُوں کا توں چھاپ دیا ہے، انتخاب نہیں کیا اور غالباً پچھلی ترتیب کو بھی نہیں بدلا، اس لئے ظاہر ہے کہ ہر قسم کے اشعار اس میں شامل ہیں، وہ اشعار بھی ہیں جو اکبر کے شاعرانہ مقام سے فروتر ہیں ——

ایک سرسری نظر میں جو شعر ہم نے منتخب کئے ہیں، وہ "ناظرین" کی ضیافتِ طبع کے لئے حاضر ہیں، بجا ہوگا اگر ہم انہیں نمک پاروں اور قند و نبات کے کوزوں سے لذت اندوز ہو کر رہ جائیں:——

سبزہ باغ آب میرے اشکِ لعل کو نہ دکھا مُیر ——— موج پر رنگ جیسے گا نہ کبھی کائی کا

دنیا کی غفلتوں کی تصویر ہیں بگولے ——— بنیاد ہے ہوا پر سر آسماں پر ہیں

حُسن کے باب میں اکبر کی سند ٹھیک نہیں ——— یہ تو ہر اک بُتِ کمسن کو پری کہتے ہیں

سانس کی طرح چلے منزلِ ہستی میں بشر ——— مدعا یہ ہے کہ دم بھر کو بھی بیکار نہ ہو

ہر ذرہ چمکتا ہے انوارِ الٰہی سے ——— ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدا بھی ہے

ایک صورتِ سرمدی ہے جس کا اتنا جوش ہے ——— ورنہ ہر ذرّہ ازل سے تا ابد خاموش ہے

خزاں میں ہوش جب آئے گا خبر دلیں گے ——— بہار تک تو ہمیں نشۂ شراب رہے

عجیب جلوے ہیں ہوش دشمن کہ وہم کے بھی قدم رُکے ہیں
عجیب منظر ہے حیرت افزا نظر جہاں تھی وہیں تھمی ہے

خیال دوڑا، نگاہ اُٹھی، قلم نے لکھا، زباں بولی
مگر یہ دل کی اُلجھنیں ہیں کسی نے اس کی گرہ نہ کھولی

یہ دُنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے ——— خدا ہی خوب واقف ہے کسی پر کیا گزرتی ہے

نئے عنصر نہیں آتے چمن میں گُل کھلانے کو ——— یہی ذرّے اُبھرتے ہیں، یہی مٹی سنورتی ہے

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا ——— طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

جب ایسی قوم ہے تو پیشوا بھی اُسی کے لیے ہیں — مثل سچ ہے کہ جیسی روح ہے ویسے فرشتے ہیں

اللہ کی راہ اب تک ہے کھلی، آثار و نشاں سب قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ میں چلنا چھوڑ دیا

غنچہ مُرجھا کے گرا شاخ سے افسوس نہ کر — کھل بھی جاتا تو یہی تھا کہ پریشاں ہوتا
دل میں کہتے تھے کہ یہ ہوگا وہ ہوگا لیکن — کٹ گئی عمر اُمیدوں ہی میں کچھ بھی نہ ہوا
مُبتلائے بحث کو رازِ خدا کی کیا خبر — معنئ بے لفظ و لفظِ بے صدا کی کیا خبر
دُنیا میں ہوں دُنیا کا طلب گار نہیں ہوں — بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں
زبانیں شاخ طوبیٰ اور دل غفلت کے تھالے ہیں — بہت ہے اللہ اللہ کم مگر اللہ والے ہیں
تمہاری احتیاطیں مطمئن کرتی نہیں مجھ کو — سمجھتا ہوں قدم رکھتا ہے چور آہستہ آہستہ
جو مضطرب ہے اُس کو اُدھر التفات ہے — آخر خدا کے نام میں کوئی تو بات ہے
مایوس ہوں باغ عالم سے اُمید سے یاری چھوٹ گئی — جس پیڑ کو سینچا سوکھ گیا، جس شاخ کو باندھا ٹوٹ گئی

ہرچند بگولہ مضطرب ہے اک جوش تو اُس کے اندر ہے
اک وجد تو ہے اک رقص تو ہے بے چین سہی برباد سہی

کافی اگرچہ لیٹنے کو اک پلنگ ہے — انگڑائیوں کو عرصۂ دُنیا بھی تنگ ہے
وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں — وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے
ذہن عالی اور ہے، جمعیت دل اور ہے — علم منزل اور ہے اور قرب منزل اور ہے
تازگی رنگِ گل پژمردہ میں ممکن نہیں — کیا چلے بادِ صبا کی، لُطفِ شبنم کیا کرے

اگرچہ تکلیف نزع میں ہے سکونِ خاطر بھی کم نہیں ہے
کسی سے ملنے کی ہیں اُمیدیں، کسی سے چھٹنے کا غم نہیں ہے

کیا شان ترے جمال میں ہے — ہر وقت زمانہ حال میں ہے

فروغِ دل اب نہیں ہے باقی وہ سوز و ساز اس میں اب کہاں ہے
یہ آہ و فریاد ہے جو لب پر بجھی ہوئی شمع کا دھواں ہے

خدا پرست کے تیور ہی اور ہوتے ہیں — خفا معاف وہ جو بر ہی اور ہوتے ہیں
قدر دانوں کی طبیعت کا عجب رنگ ہے آج — بلبلوں کو ہے یہ حسرت کہ وہ اُلّو نہ ہوئے

صفحہ (۲۰) پر ایک شعر ہے:-

"من علیہا فان" پر ہی ختم ہے قولِ "فنسٹ" — کیوں عبث برپا ہے اتنا شورِ طفلاں ان دنوں

فٹ نوٹ میں "فنسٹ" کو "مسئلہ تنازع للبقا" لکھا ہے، حالانکہ انگریزی رسم الخط میں SURVIVAL OF THE FITTEST — اور اُردو میں اُس کا ترجمہ "بقائے اصلح" لکھنا چاہیے تھا۔

دونوں کے خواستگاروں میں شیخ جی گھرے ہیں ــــــ بارہ برس پر آخر گھوڑے کے دن پھرے ہیں (صفحہ ۵)

"گھورے" کی جگہ افسوس ہے کہ "گھوڑے" چھپ گیا، یہ فاش غلطی ہے اور بہت سے لوگ اس سے دھوکے میں پڑ جائیں گے۔

چیز وہ ہے جو بنے یورپ میں ــــــ بات وہ ہے جو پائنیر میں چھپے (صفحہ ۹)

یہ شعر بھی غلط چھپا ہے

راحتِ زیست کے سامان سے دھوکے میں نہ آ ــــــ امتحاں گاہ کو تو عیش کی منزل نہ سمجھ (صفحہ ۲۰۰)

چونکہ اس غزل کے قوافی "نرگس" اور "آفس" وغیرہ ہیں اس لئے حضرت اکبر نے "منزل" نہیں "مجلس" نظم کیا ہوگا۔

بنائے کالج شیعہ الگ ہوئی بھی تو کیا ــــــ وہی ہے منزلِ مقصود گو ہے راہ خدا

"راہِ خدا" بالکل غلط چھپا ہے، "راہِ جُدا" ہونا چاہیئے، اس لئے کہ "جُدا" ردیف ہے اور "خدا"، "بادشاہ" وغیرہ قوافی ہیں۔

اکبر الٰہ آبادی نے ایک ایسی بحر میں بھی غزل کہی ہے جو اہلِ عرب کے لئے مخصوص ہے (فعولن، مفاعیلن، فعولن مفاعیلن) مطلع ہے :۔

کھلے گل، بہار آئی، چمن کا سماں بدلا ــــــ ادھر آ مرے ساقی، پلادے مجھے صہبا

ہم اُردو جاننے والے اسے پڑھتے ہیں تو ناموزوں ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔

ہم نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی عرض کرتے ہیں کہ لسان العصر حضرت اکبر الٰہ آبادی نے مسلمان عورتوں کی "بے حجابی" کے خلاف اپنی شاعرانہ قوت کو زیادہ تر صرف کیا تھا جو لوگ اکبر کے کلام سے عقیدت رکھتے ہیں، اُن کا فرض ہے کہ وہ اکبر کے پیام کے لئے بھی عملی جدوجہد کریں، وہی صرف کتابوں کی اشاعت تو مسلمان شاعروں، ادیبوں، فقیہوں اور عالموں کی کتابیں تو "نول کشور پریس" میں بھی چھپتی رہی ہیں، "بزمِ اکبر" اگر حضرتِ اکبر کے کلام کی اشاعت کے ساتھ فتنۂ بے حجابی کو روکنے کا بیڑا اُٹھالے تو وہ اسلام کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دے گی اور قوم کو ایک بہت بڑی لعنت سے نجات مل جائے گی، اور اس نیکی کا اکبر الٰہ آبادی کو بھی ثواب ملے گا!

"اوراقِ گل"

"اوراقِ گل" ـــــ ضخامت ۸۰ صفحات، قیمت چار آنہ، ملنے کا پتہ :۔ اُردو مجلس ملتان شہر۔

خواجہ محمد شفیع صاحب کی "اُردو مجلس" دلّی میں مسلمانوں کی غارتگری اور تباہی کے بعد درہم برہم ہوگئی، مقامِ مسرت ہے کہ ملتان میں اُردو کے بہی خواہوں نے اس کی تجدید کی، "اوراقِ گل" اسی اُردو مجلس ملتان کی غالباً پہلی پیش کش ہے، جس میں نثر کے علاوہ غزلیں، نظمیں اور قطعات بھی شامل ہیں، کتابچہ کا نام نیا نہیں ہے۔ اب سے کوئی دس سال پہلے ریاست رام پور نے شعراء کا تذکرہ "اوراقِ گل" کے نام سے چھاپا تھا۔

"اوراقِ گل" کا "پیشِ لفظ" اس طرح شروع ہوتا ہے :۔

"اس حقیقتِ کبریٰ سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کسی قوم کی صحت و توانائی جس قدر یقینی طور پر ادبیات سے ظاہر ہوسکتی ہے، اس قدر کسی اور چیز سے نہیں ہوسکتی، ایسا کوئی اور آئینہ نہیں ہے جس میں کسی عہد کی سیرتیں اور خواہشیں ایسی درستی سے منعکس ہوتی ہوں۔" ۔۔۔

نظموں اور غزلوں میں مذاقِ العیشی کی نظم سب سے اچھی ہے، خاص طور سے یہ شعر :۔

حدیثِ بے خبراں "لاالٰہ" تک محدود ــــــ حدیثِ باخبراں لاالٰہ الا اللہ

"عالم آشوب" کے دو شعر ہیں :-

پابند ہوتی جا رہی ہے قوتِ فہمیدِ حق ــــــ مفقود سے مفقود تر ہے آج کل تائیدِ حق
آئینہ موجود میں ہے حالِ استقبالِ دوں ــــــ اور پردۂ ماضی سے رو جیں جھانکتی ہیں بے سکوں

"فہمیدِ حق" کی ترکیب ہی اول تو نرالی ہے، اُس پر ستم بالائے ستم "مفقود تر"! دوسرے شعر میں "استقبالِ دوں" اور پھر مصرعِ ثانی ــــ[۱] اور پردۂ ماضی سے روحیں جھانکتی ہیں بے سکوں

بول رہا ہے کہ مجھے ایسے شخص نے نظم کیا ہے جو موزوں طبع تو ہے مگر شاعرانہ صلاحیتوں سے محروم ہے!

اُردو مجلس ملتان کے ارکان کی خدمت میں ہم گزارش کرتے ہیں کہ اگر وہ اپنی مجلس کو نیک نام بنانا چاہتے ہیں تو پھر اُنھیں بلند اور دلچسپ کتابیں پیش کرنی چاہئیں۔

خلاصہ فسانۂ عجائب

"فسانۂ عجائب کا خلاصہ" از :- الیاس احمد مجیبی، ضخامت ۱۱۱ صفحے، لکھائی، چھپائی اور کاغذ دیدہ زیب، قیمت ایک روپیہ دو آنہ،

ملنے کا پتہ :- اُردو گھر ۸۰/۴ مارٹن روڈ، کراچی نمبر ۵

"فسانۂ عجائب" اُردو زبان کی بہت مشہور کتاب ہے، اب سے بیس پچیس سال قبل اس کے بعض حصے اسکولوں کے کورس میں بھی شامل تھے، میرزا رجب علی بیگ سرور "فسانۂ عجائب" کے مصنف ہیں، جناب مجیبی صاحب نے اس کتاب کا خلاصہ پیش کیا ہے، تکلف یہ ہے کہ اس کاٹ چھانٹ، تراش خراش اور انتخاب کے باوجود افسانہ کہیں سے بے ربط ہونے نہیں پایا، بلکہ شاید اور زیادہ دلچسپ ہی ہو گیا ہے کہ مصنف جب کوئی نیا باب شروع کرتے ہیں تو اس انداز کی :-

"راویانِ شیوہ بیان، داستان سرایانِ طلاقتِ لسان، حاکیانِ شیریں زبان فرسِ خامہ کو بیچ میدان عشق و محبت کے جولاں گہ رقمطراز ہیں ۔ ۔ ۔"

عبارت لکھتے ہیں، اس خلاصہ میں ایسی عبارت باقی نہیں رہی

جس زمانہ میں فسانۂ عجائب لکھا گیا ہے اُس زمانہ میں "عورت" کو "رنڈی" کہتے تھے، بعد میں جا کر یہ لفظ بازاری عورتوں، کسبنوں اور طوائفوں کے معنی میں استعمال ہونے لگا ــــــ "فسانۂ عجائب" کی عبارت کے دو نمونے ہم یہاں پیش کرتے ہیں :- عنوان ہے بیانِ لکھنؤ :-

"انصاف سے جو اس شہر کو دیکھے، جہاں کی دید کی حسرت نہ رہے، سُبحان اللہ! عجب شہر گلزار ہے، ہر شخص باوضع قطع دار ہے، نان بائی خوش سلیقہ، شیرمال کباب، نان و نہاری، جہاں کی نعمت اس آب داری کی، جس کی بو باس سے دل طاقت پائے، دماغ معطر ہو جائے، سُرخ پیاز سے بگھار، شیرمال کی جھنکار، شیرمال شنگرف کے رنگ خستہ بھربھری، ایک بار کھائے، نعمتِ جہاں کا مزہ پائے، تمام عمر ہونٹ چاٹتا رہ جائے، کباب کی وہ آب و تاب کہ مُرغ و ماہی کا دل محرومی سے کباب، اورک کا لچھا، میاں خیر اللہ کی دوکان کا، باریک سے باریک ۔ کترا، کم نایاب، حسینی کا حلوا سوہن، پر عجیب جوبن ہونٹ سے کھائے، دانت لگانے کی نوبت نہ آئے ــــــ

[۱] "فسانۂ عجائب" ہمارے سامنے نہیں ہے، اُسی انداز پر یہ عبارت ہم نے خود لکھی ہے (م - ق)

ہر کنجڑن کی تیلی جون آدمی صورت دیکھتا ہے، رعب حسن سے بات نہ کر سکے، سندر نین پری زاد، سرو قامت رشک شمشاد، موے قرینے سے چنے، روزمرہ محاورے دیکھے نہ سنے، کبھی کوئی پکار اٹھی :— میاں ٹکے کو ڈھیر لگا دیا ہے، کوئی موزوں طبیعت یہ فقرہ سناتی :— مزا انگور کا نکتروں میں، اور تنبولی رمز و کنایہ کرتے ہوئے لوا لٹولی میں چبا چبا کر ہر دم یہ دم بھرتے :— گمٹی کا منھ کالا، مہوبا گرد کر ڈالا عنبر ہے نہ گلال، آدھی میں ٹکڑا لال ..."

" انجمن آرا بے چاری مصیبت کی ماری سب کا منھ حیرت سے تکتی تھی اور روتی تھی، نہ بین کر آتے تھے، نہ غل مچایا جاتا تھا، گھٹ گھٹ کر جان کھوتی تھی، خواصیں سر کھول کر کہتی تھیں :— " ہے ہے ہم اس جنگل میں لٹ گئے، وارث سے چھٹ گئے" لوگو ! ہم کدھر جائیں، کیوں کر اس بلا سے نجات پائیں کوئی کہتی تھی :— "شیطان کے کان بہرے خدا نخواستہ اگر جان عالم کے دشمنوں کا رونگٹا میلا ہو، شہزادیاں خاک میں مل جائیں گی، غم جدائی سے جان گنوائیں گی، ہم ان کے ماں باپ کو منھ کیا دکھائیں گی ..."

خلاصہ "باغ و بہار"

"باغ و بہار" کا خلاصہ از :— الیاس احمد مجیبی ضخامت ۱۱۲ صفحات، قیمت ایک روپیہ دو آنہ، ملنے کا پتہ :- اردو گھر، ۴/۸۰ مارٹن روڈ کراچی

" فسانہ عجائب" کی طرح میر امن دہلوی کی مشہور کتاب باغ و بہار (چہار درویش) کا بھی خلاصہ مجیبی صاحب نے بڑے سلیقے کے ساتھ کیا ہے اور کتاب کو خاصے اہتمام کے ساتھ چھپوایا ہے -

اس کتاب کا تاریخی نام " باغ و بہار" ہے، جس کے ۱۲۱۷ (ہجری) اعداد نکلتے ہیں، یعنی اب سے ڈیڑھ سو سال پہلے یہ کتاب لکھی گئی تھی، حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں اس قدر باکمال انشا پرداز کیسے پیدا ہو گیا جس کی عبارتیں کی عبارتیں " سہل ممتنع " ہیں ! مرزا رجب علی بیگ سرور نے " فسانہ عجائب " اس کے بعد لکھی ہے مگر میر امن کی تحریر کی سادگی اور بیساختہ پن اس میں نہیں ہے !

" باغ و بہار" میں جو روزمرہ اور محاورے استعمال ہوئے ہیں اُن میں سے بعض اس قابل ہیں کہ اُن کو باقی رکھا جائے ورنہ زبان اردو کو نقصان پہونچے گا ——— مثلاً " میرا نام لیوا اور پانی دیوا کوئی نہیں " ——— گھڑک کر بولے ——— (یعنی ڈانٹ کر بولے) ——— چوٹّے (بہ معنی چور) ——— ہرج مرج ——— !

اس کتاب میں بعض ایسے لفظ بھی آئے ہیں جو اب بولے نہیں جاتے اور متروک ہو گئے :—

" تلپھنا " (تڑپنا اور بے چین ہونا) ——— رو ہت (رونق) منھ پہ رو ہت (رونق) آئی ——— اور " تھاموں " کا املا " تھانبوں " ——— اور جیل خانہ کو جو " پنڈت خانہ " لکھا ہے اُسے پڑھ کر حیرت ہوئی ! کہ قید خانہ کو پنڈت خانہ آخر کس مناسبت سے کہتے تھے ؟

ہمارے یہاں کی بڑھی بوڑھیاں " تاکید " کو جو " تقید " بولا کرتی تھیں، اب معلوم ہو کہ وہ ایک زمانہ میں اردو روزمرہ رہ چکا ہے، میر امن نے تاکید کو " تقید " ہی لکھا ہے !

خلاصہ نگار نے جگہ جگہ مشکل لفظوں کے قوسین میں معنیٰ بھی دے دئے ہیں (صفحہ ۱۷) " چاوچوز " کو " لاڈ ناز " لکھا ہے " لاڈ پیار " لکھنا چاہیئے تھا ——— (صفحہ ۱۹) " نکھٹو " کو " بے غیرت " لکھا ہے، حالانکہ نکھٹو نکمے آدمی کو کہتے ہیں، جو کچھ کرتا دھرتا نہ ہو ——— ضرب المثل ہے، نکھٹو گئے گھاٹ، ترازو لائے نہ باٹ !

باغ و بہار کا صرف ایک اقتباس :—

"ایک بارگی آواز رونے کی بُرج کے اندر سے آئی کہ اے بچے! جس نے تجھے تیر مارا آہ کا تیر اس کا کلیجہ میں لگیو، وہ اپنی جوانی سے پھل نہ پاوے اور خدا اس کو میرا ساڈکھیا بنا دے، میں یہ سُن کر وہاں گیا، دیکھا کہ ایک بزرگ مسند پر بیٹھا ہے اور ہرن آگے لیٹا ہے، اُس کی جانگ سے تیر کھینچتا ہے اور بد دعا دیتا ہے میں نے سلام کیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا کہ حضرت سلامت! یہ تقصیر نادانستہ اس غلام سے ہوئی، خدا کے واسطے معاف کرو، بولا کہ بے زبان کو ستایا ہے اگر انجان یہ حرکت ہوئی اللہ معاف کرے گا، میں پاس جا بیٹھا، تیر نکلنے میں شریک ہوا، بڑی دقت سے تیر نکالا، زخم میں مرہم بھر کر چھوڑ دیا، پھر ہاتھ دھو دھا کر پیر مرد نے کچھ حاضری کھلائی، میں نے کھا پی کر لمبی تانی!

کوئی مانے یا نہ مانے مگر یہ واقعہ ہے کہ مرزا غالب کے خطوط میں میر امن کی تحریر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور ڈیڑھ سو سال کے بعد بھی "باغ و بہار" کی شگفتگی اور بہار سامانی کا وہی عالم ہے!

رازِ حیات

"رازِ حیات" از:— لطافت ہما للت پوری، ضخامت ۱۶۷ صفحات، قیمت ڈیڑھ روپیہ (بلا جلد) ملنے کا پتہ:— کتب خانہ اشرفیہ بھورا پیر، رنچھوڑ لائن، کراچی!

جناب ہما للت پوری کی غزلوں اور نظموں کا یہ مجموعہ تعمیر ادب "لکھنؤ" نے پیش کیا ہے، ہما صاحب دلِ بیدار و درد مند رکھتے ہیں، بُرائیوں سے اُنھیں نفرت اور نیکیوں سے محبت ہے، انھوں نے اصلاحی نظمیں بڑی دردمندی کے ساتھ کہی ہیں، اس نیکی کا اُن کو یقیناً اجر ملے گا مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اُن کا "واعظانہ رنگ" شاعرانہ نکتوں پر غالب آگیا ہے، غزلیں بعض کافی طویل ہیں اور "تغزل" بس کہیں کہیں جھانک کر رہ جاتا ہے۔

(صفحہ ۹۹) ۵ رختِ ہستی موت کی تلوار سے کٹ جائے گا——— "رختِ ہستی" کا کتنا خلاف محاورہ ہے، "رخت" تسمہ، ڈوری یا رشتہ کو نہیں "اسباب" اور ساز و سامانِ سفر کو کہتے ہیں——— (صفحہ ۱۰۲) ۵ سیکڑوں دشمن ہیں تیرے اور تو بے ہوش ہے——— "بے ہوشش" یہاں "غافل" کے معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے جو درست نہیں، "مدہوش" کہنا چاہئے تھا،

اے چشمِ مستِ یار کوئی جامِ ناز اور ‏ ‏ آنے لگے ہیں ہوش میں کچھ بے خودی سے ہم (صفحہ ۱۱۱)

"جامِ ناز" کتنی نامانوس ترکیب ہے!

یہی تو اور بھی طرزِ کرم رُلاتا ہے ‏ ‏ کبھی نہ دیکھ سکے آپ اشکبار مجھے (صفحہ ۱۲۸)

کس قدر کمزور اور بے کیف شعر ہے!——— ایک دوسرا شعر بھی اسی انداز کا ہے :-

معمہ سا بنا جاتا ہوں خود اپنی نگاہوں میں ‏ ‏ کیا ہے آپ نے جب سے شریکِ داستاں مجھ کو (صفحہ ۱۲۵)

اس پر ناشر اور شاعر کی خود اعتمادی اور خوش فہمی کا یہ عالم ہے کہ کتاب کے سرورق پر "کاپی رائٹ محفوظ" اس ڈر سے لکھ دیا ہے کہ کہیں دوسرے لوگ اُن کی کتاب کو دھڑا دھڑ چھاپنا شروع نہ کر دیں!

---

۵ یعنی ناشتہ کرایا۔

یقین وتمدّن

"یقین وتمدن" از:- رقیہ علامہ خلیل عرب، ضخامت اسّی صفحے، سرورق رنگین اور بہت خوبصورت، قیمت ایک روپیہ چار آنہ، ملنے کا پتہ:- ریاض سنز پبلشرز بکسیلرز نکل روڈ، کراچی!

محترمہ رقیہ خلیل عرب نے یہ کتاب قوم و ملک کی اعتقادی اور عملی اصلاح کے لئے لکھی ہے، اور کوئی شک نہیں کہ بہت مفید باتیں بیان کی ہیں، جگہ جگہ قرآنی آیتوں کے حوالے ہیں، نیک مشورے دیئے ہیں اور بھلائی کی تبلیغ کی ہے، جہاں تک کتاب کے مضامین لکھنے والی کی نیت اور کام کی افادیت کا تعلق ہے اُس کے لئے تحسین و تائید کے علاوہ کسی مسلمان کی زبان سے اور کوئی بات نکل ہی نہیں سکتی ——— مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ہماری دینی بہن کی تحریر میں پختگی پیدا نہیں ہوئی، کہیں کہیں تو "ترجمہ" سا معلوم ہوتا ہے، ہم کتاب کے چند جملوں کا انتخاب کئے بغیر بالکل شروع کی عبارت ہی یہاں درج کرتے ہیں:-

"قدرت اپنی تعمیری کارفرمائیوں میں انسانی چیرہ دستیوں پر غالب ہے، اس دُنیا کا پیدا کرنے والا ایک جہان نہیں بلکہ جہانوں کا پالنے والا ہے، بیسویں صدی کا انسان علم و تہذیب کے بلند بانگ دعووں کے ساتھ تمدن کے بھاری ذخائر لئے ہوئے برق رفتاری سے دوڑ رہا ہے، یہ وحشت اور درماندگی کی اسی بدنام وادی میں گرنے جا رہا ہے جس میں تاریخ کے سیاہ دور کا انسان جہالت کے اعتراف کے ساتھ راہ کی طلب میں بے راہ ہو کر ٹھوکریں کھا چکا ہے"!

عبارت غلط نہیں ہے مگر ہم جو فسق و معصیت اور کفر و جاہلیت کے مورچوں کو شعر و ادب کی قوت سے سر کرنے کے لئے چلے ہیں، اُس کے لئے ضرورت ہے کہ ہمارا اسلامی ادب فکر و خیال کے علاوہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی انتہائی شستہ، شگفتہ، رواں، سلیس اور باوقار ہو جس سے طبیعتیں مانوس ہوں اور بار بار پڑھنے کو جی چاہے! "تعمیر انسانیت" سو بہی سا ہے ہم اچھی سے اچھی کتابوں کی اشاعت کی توقع رکھتے ہیں!

میراث

"میراث" از:- پرکاش پنڈت، حجم ۲۲۲ صفحے، قیمت تین روپے (مجلّد) ملنے کا پتہ:- مکتبہ شاہراہ دہلی!

جناب پرکاش پنڈت کے افسانوں کا مجموعہ مکتبہ شاہراہ نے چھاپا ہے جس پر ممتاز حسین صاحب کا سنجیدہ "پیش لفظ" ہے! افسانے دلچسپ ہیں، اور بعض مقامات پر تو افسانہ نگار کے قلم نے "آرٹ" کی بلندیوں کو چھو لیا ہے، بعض دوسرے "ترقی پسند ادیبوں" کی طرح پرکاش پنڈت کے یہاں اُلجھاؤ نہیں پایا جاتا، جو کچھ کہا ہے سوچ سمجھ کر عام فہم انداز میں کہا ہے۔

اس میں دو تین "افسانچے" بھی ہیں، جن میں "کرداروں" کی رنگارنگی نہیں ہے، افسانہ ایک دو کرداروں ہی کے اردگرد گھومتا ہے، اور بعض افسانہ میں صرف ایک ہی "کردار" پر افسانوی محل تعمیر کیا گیا ہے، کہیں کہیں فلسفہ آمیز خیالات کی شدت نے "آورد" بھی پیدا کر دی ہے۔

(صفحہ ۲) "گھر کی تمام سیاہی سفیدی کی مالک تھیں" ——— روزمرہ یوں ہے "گھر کی سفید و سیاہ کی مالک تھیں" ——— صفحہ (۲۴) "ایک حزیں سی مسکراہٹ" ——— "ایک غمگین سی مسکراہٹ"

زیادہ موزوں تھا ـــــ (صفحہ ۵۰) "پر تصنع لاتعلقی" ـــــ پوری ترکیب ہی نامانوس اور بھدا ہے ـــــ صفحہ (۹۴) "پلک جھپکنے کی دیر میں نہ جانے کہاں سے کہاں نمودار ہو جاتا ہے" ـــــ دیر کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ "پلک جھپکتے نہ جانے کہاں سے کہاں نمودار ہو جاتا ہے" لکھنا تھا اور "نمودار ہونا" بھی یہاں وجدان کو کھٹکتا ہے ـــــ صفحہ (۱۰۵) "اُس کا ذہن ایک طرف کو ڈھلک پڑتا تھا" ـــــ "ذہن کا ڈھلک پڑنا" "ترقی پسندانہ" ترکیب ہے جو اہلِ نظر کے لئے یہاں مقبول نہیں ـــــ (صفحہ ۱۰۶) "خیالات کی یہ روانی ٹوٹ جاتی" "ہو" غالباً کتابت کی غلطی ہے۔ "ٹوٹ جاتی" ہوگا، "روانی کا ٹوٹ جانا" عام طور پر نہیں بولتے۔ "خیالات کا یہ سلسلہ ٹوٹ گیا" لکھنا تھا۔ (صفحہ ۱۱۰) "سمبندھی" ـــــ سنسکرت میں "سمبدھی" ہی کہتے ہیں مگر اُردو میں "سمدھی" اور "سمدھن" بولتے ہیں اور اسی طرح لکھنا اور بولنا چاہیئے، پنجاب کا حال نہیں معلوم ممکن ہے وہاں "سمبندھی" ہی بولتے ہوں ـــــ صفحہ (۱۱۲) "کل کلوترا اگر تری بہن کو لوگ دیکھنے کو آئیں" ـــــ "کل کلاں کو" بولتے ہیں "کل کلوترا" پہلی بار دیکھنے میں آیا ـــــ (صفحہ ۱۲۲) "مجھے دودھ کے مانند سفید مسکراتی آنکھیں" ـــــ "آنکھوں کی سفیدی" آنکھوں کے حُسن میں داخل نہیں ہے اور یہاں آنکھوں کی خوبصورتی ہی دکھانا منظور ہے ـــــ (صفحہ ۱۲۹) "اُس کی مسکراہٹ جیسا کہ میں نے دیکھا اپنی ڈگر سے ہٹی ہوئی تھی" ـــــ مسکراہٹ کا ڈگر سے ہٹنا آخر کیا بات ہوئی!

(صفحہ ۱۳۰) "حلیمی برتی" یہ "حلم" سے "حلیمی" بنایا ہے جو ہرگز مستعمل نہیں ہے اور وجدان کے لئے تکلیف دہ ہے ـــــ (صفحہ ۱۴۰) "وہ ادیبا کر رہ پڑی" معلوم ہوتا ہے افسانہ نگار کو "ادیبا" کے معنیٰ ہی معلوم نہیں ہیں ـــــ (صفحہ ۱۳۷) "کچھ الفاظ اُس نے جان بوجھ کر حلق میں اٹکائے" ـــــ "الفاظ کا حلق میں اٹکانا" ذوقِ سلیم پر کس قدر گراں گزرتا ہے (صفحہ ۱۴۸) "بزاز کی دکان اب کھدر خاشے کے ساتھ بٹے ململ کی جھلک بھی دکھائی دینے لگی" ـــــ "خاشے" کیا "خاصے" بولتے ہیں جو ایک کپڑے کا مشہور نام ہے ـــــ (صفحہ ۱۴۹) "آنولے کا تیل" ـــــ یہ "آنولہ" نہیں "آملہ" ہے، "آنولہ" تو ضلع بریلی کے ایک قصبہ کا نام ہے ـــــ (صفحہ ۱۷۱) "گالوں پر لالی چھیٹ لی" ـــــ "چھیٹ لی" توبہ! یہ کہاں کی زبان ہے! "گالوں پر لالی تھوپ لی" کا محل تھا ـــــ (صفحہ ۱۸۳) "بچپن میں کہیں وہ گھر کی سیڑھیوں سے ڈھلک پڑی تھی جس سے دائیں ٹانگ کا ٹخنہ اُتر گیا، بہتیرے حیلے کئے مگر اصلی حالت پر نہ آسکا" ـــــ "حیلے" کا یہاں کیا موقع تھا۔ "بہت سے جتن کئے" "تدبیریں کیں" "یا دوا دارو اور مرہم پٹی کی" اسی انداز سے اظہار خیال کرنا تھا ـــــ (صفحہ ۱۹۰) "کئی بار اُس کی سگائی کا چرچا اٹھا" ـــــ "چرچا ہوا" بولتے ہیں، اس طرح لکھنا چاہیئے تھا "کئی بار اُس کی سگائی کی بات چیت چلی"!

(صفحہ ۲۱۱) "ڈھولک کی آواز پر چھپٹاتا رہا" ـــــ نہ جانے یہ "چھپٹانا" کیا بلا ہے؟ اس لفظ کو کئی جگہ استعمال کیا گیا ہے!

زبان و بیان کی ان لغزشوں کے باوجود، پرکاش پنڈت اظہارِ خیال پر کافی قدرت رکھتے ہیں، کہیں کہیں تو انھوں نے گنگا جمنا کی موجوں کی روانی کا غذ پر دکھا دی ہے، اگر وہ ذرا محتاط ہو کر لکھیں اور ان "ترقی پسندوں" کی ریس نہ کریں تو اُن کے افسانے اور زیادہ دلچسپ اور اثر انگیز ہو جائیں ـــــ صرف ایک نمونہ:-

"جب کبھی وہ بازار میں نکلتی، لوگوں کی نگاہیں کچھ اس طرح اُس کی طرف اُٹھ جاتیں جیسے انھوں نے

زندگی میں پہلی بار کسی عورت کو دیکھا ہو ——" (صفحہ ۴۴ افسانہ "دھنک)

یہ وہ مقام ہے جہاں "نثر" کی حدیں "شاعری" سے مل جاتی ہیں۔

جمہوریت اور مغربی تحریکیں

"جمہوریت اور مغربی تحریکیں" مترجم :- عبدالوہاب ظہوری، قیمت تین روپیہ (مجلد) ملنے کا پتہ :- مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد دکن

یہ کتاب چیکوسلواکیہ کے سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ایڈورڈ بینس (BENES) کے خطبات اور تقریروں کا مجموعہ ہے، جسے حسن صعب معری (نائب سفیر لبنان برائے استنبول) نے عربی میں ترجمہ کیا، اور عربی ترجمہ کو جناب عبدالوہاب ظہوری نے اُردو میں منتقل فرمایا عبدالوہاب ظہوری بہت سی عربی کتابوں کے ترجمے کر چکے ہیں، اور اس صنف میں اُن کو کافی مشق ہو گئی ہے، اس کتاب کا ترجمہ بھی شستہ اور رواں ہے، "تیاری" کا جگہ جگہ املا "طیاری" ضرور کھٹکتا ہے

ڈاکٹر بینس نے یورپ کی سیاسی اور جنگی کشمکش کا بڑی خوبی سے ایک مورخ اور ناقد کی حیثیت سے تجزیہ کیا ہے، جمہوریت، فسطائیت، اشتمالیت اور اشتراکیت کے داعیات اُن کے حدودِ عمل اور نتائج اور عوام میں ان کی مقبولیت اور عدم مقبولیت کے اسباب بیان کئے ہیں، مصنف کا خیال ہے کہ پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء) نے انسانیت کو عملی جمہوریت اور سیاسی حریت کے میدان میں کوسوں دُور آگے بڑھا دیا —— یورپ کی موجودہ حالت کے بارے میں اُن کی رائے یہ ہے :-

"یورپ اپنی زندگی کے مرحلوں میں سے انتہائی نازک مرحلہ کو عبور کر رہا ہے، اس لئے کہ متضاد نظریات کا سیلاب ہر طرف سے اُس پر اُمڈ رہا ہے اور اُسے مجبور کر رہا ہے کہ جن قدروں پر وہ ایمان لایا ہے اُن کی ازسرِ نو تجدید کرے۔"

بہرحال تاریخ و سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ یقیناً فائدہ بخش ہوگا، اور ہم تو اس کتاب کو پڑھ کر اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ جب تک دُنیا وحیِ آلہی سے بے نیاز ہوکر، جو انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کی غلام رہے گی، امن و سلامتی کی شاید ایک صبح بھی اُس پر ٹھیک طرح سے طلوع نہ ہوسکے گی!

اُردو انسائیکلوپیڈیا

مخزنِ علوم و فنون یعنی اُردو انسائیکلوپیڈیا، ضخامت ۸۰ صفحات، بڑا سائز (خوشنما ٹائپ پر) مرتبہ :- ادارہ ادبیات حیدرآباد دکن

۱۹۴۰ء میں ادارۂ ادبیات اُردو نے "انسائیکلوپیڈیا" کی ترتیب و اشاعت کا کام شروع کیا تھا، جو کئی سال تک ہوتا رہا، اور ہزار ہزار صفحہ کی دو جلدیں مرتب بھی ہو گئیں مگر افسوس ہے کہ اُن کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی —— کیوں؟ اس "ٹریجڈی" سے سب واقف ہیں، ہم بار بار اِس "المیہ" کو دُہرا کر مظلوموں کے زخموں کو کیوں چھیڑیں!

جتنے اوراق چھپ چکے تھے "ادارۂ ادبیات اُردو" انھیں منظرِ عام پر لے آیا، یہ کام اگر اسی نہج پر ہوتا رہتا تو اُردو ادب میں گرانقدر اضافہ کا سبب ہوتا، یہ بالکل نئی چیز تھی، اِس کام کے لئے ہر فن کے ماہرین کی خدمات سے فائدہ اُٹھایا گیا تھا، یہ چند صفحے اُن کی کوششوں کے گواہ ہیں —— ٹائپ بہت خوشنما ہے،

طباعت اور کاغذ بھی خوب ہے، صفحہ اول پر "عمالقہ" غلطی سے "امالقہ" چھپ گیا ہے،

"انسائیکلو پیڈیا" کے یہ چند صفحے، آنے والوں کے لئے یقیناً "نشانِ راہ" ثابت ہوں گے۔ دقیقی کے اشعار جب فردوسی سے شاہنامہ لکھوا سکتے ہیں تو کیا عجب ہے کہ ان اوراق کو دیکھ کر آنے والے ادیب، اہلِ علم اور زباں داں اس کام کو پایۂ تکمیل کو پہونچادیں۔

شراب بندی

"شراب بندی" از:- عبدالرزاق سعید، ضخامت ۳۲ صفحے ملنے کا پتہ:- ادارۂ تبلیغ الاسلام ٹن ٹن پورہ اسٹریٹ بمبئی نمبر ۹

جناب عبدالرزاق صاحب سعید نے یہ کتابچہ "شراب بندی" کے متعلق قرآن اور حدیث کی روشنی میں لکھا ہے، اندازِ نگارش سہل اور دل میں اُتر جانے والا ہے ——— یہ حدیث شراب خوار کے لئے کتنی تہدید آمیز اور خوفناک ہے۔ (شارب الخمر کعابد وثن) شراب خوار بُت پرست جیسا ہے ——— حضورؐ نے حضرت ابوالدرداء سے فرمایا ——— تو اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا اگرچہ تیرے ہاتھ پاؤں کاٹ دئے جائیں یا تو جلا دیا جائے اور فرض نمازوں کو جان بُوجھ کر کبھی ترک نہ کرنا جس نے جان بُوجھ کر نماز ترک کر دی میں اُس سے بری الذمہ ہوگیا، اور شراب نہ پینا کہ یہ (یعنی شراب) ہر بُرائی کی کنجی ہے ——— حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے یہ قصہ بیان فرمایا ——— بنی اسرائیل کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا اُس نے ایک آدمی کو گرفتار کیا اور کہا یا تو شراب پی، یا زنا کر، یا سُور کا گوشت کھا ورنہ لوگوں سے تجھے قتل کروا دیا جائے گا، تو اُس نے شراب کو (سب سے آسان جان کر) گوارا کر لیا، جب وہ شراب پی کر بدمست ہوگیا تو پھر اُس نے تمام افعالِ کبیرہ انجام دئے جو اُسے بتائے گئے تھے۔۔۔!

کاش! پاکستان میں اس "نہی عن المنکر" کی صدائے بازگشت سُنی جا سکے!

سیاسی ادارات

"سیاسی ادارات" از:- محمد رحمت علی ایم۔ اے (عثمانیہ) ضخامت ۴۰ صفحے، قیمت ایک روپیہ چار آنہ، ملنے کا پتہ:- رضوی اینڈ کمپنی نظام شاہی روڈ، حیدرآباد دکن!

اس کتابچہ میں یونان، روما اور عہدِ وسطیٰ کے سیاسی دستور و قوانین پر روشنی ڈالی گئی ہے، جن کے پڑھنے سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، ایک تاریخ کے طالب علم کے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔

یونان (اسپارٹا) میں جاہلیت کا یہ رنگ تھا ——— کہ "اگر کوئی بچہ تندرست نہ ہوتا تو اُسے ٹائگاکوس نامی پہاڑ سے گرا کر مار دیا جاتا" (صفحہ ۷) ——— یونان کے بادشاہوں میں جب کوئی مرتا "تو اُس کی نیک نامی کے قصیدے لکھے جاتے اور کم از کم ہر گھر سے بارہ افراد کا سینہ کوبی کرنا لازم ہوتا ———" جاہلیت جہاں بھی کہیں پائی جائے اُس کے قریب قریب ایک ہی سے انداز ہوتے ہیں۔

صفحہ (۲) پر "زمین" کی جمع "زمینیات" بنائی ہے جو درست نہیں مگر دکن میں اس طرح بولا اور لکھا جاتا ہے ——— صفحہ (۱۲) پر "جمود" کی جگہ "انجماد" لکھا ہے، "طب" و "موسیمات" کی اصطلاح نہ جانے "ادب" میں کہاں سے آگئی!

بادۂ نورس

"بادۂ نورس" از:- عزیز ربانی، قیمت درج نہیں، ملنے کا پتہ:- مکتبۂ اسلامیہ دار المبلغین۔ لکھنؤ۔
یہ جناب عزیز ربانی کی غزلوں، نظموں اور قطعوں کا مجموعہ ہے، اس قسم کے شعر جہاں کہیں آگئے ہیں تو لطف پیدا ہوگیا ہے:-

ملت کے گریباں میں کہاں کفر کا تکمہ　　دامانِ سحر میں گرہ شام کہاں تک
ابھی تو خشک لبی کا گلہ ہے رندوں کو　　بجھے گی پیاس تو رو دیں گے تشنگی کے لئے

(صفحہ ۱۹) اوطان پرستی کا یہ الزام کہاں تک "اس "اوطان پرستی" نے شعر کو بے مزہ اور ثقیل بنا دیا — (صفحہ ۲۱)

وہ ذوقِ بندگی دُنیا سے ماورا ہوکر　　کہ شانِ وجد میں خود سنگِ آستانہ تھا

"شان" یہاں مصرعہ پورا کرنے کے لئے زائد لفظ لایا گیا ہے! (صفحہ ۲۲):-

حُسن تیری یاد میں رنگیں سماں پاتا ہوں میں　　چاند تاروں کی حسیں دُنیا پہ چھا جاتا ہوں میں

بہت کمزور اور بے مزہ شعر ہے! کوئی شک نہیں کہ عزیز ربانی میں شاعرانہ صلاحیت پائی جاتی ہے اور اُن کے مستقبل سے ہم اچھی توقع

ننھی پردیں

"ننھی پردیں اور دوسری کہانی" - از:- بیگم ہرمزی جلیل، ضخامت ۴۰ صفحات۔ قیمت چھ آنہ ملنے کا پتہ:- ۲/۱۴ جیکب لائن، کراچی ۳ — محترمہ بیگم ہرمزی جلیل نے چھوٹے بچوں کے لئے سات مزیدار کہانیاں لکھی ہیں، زبان انتہائی سہل اور آسان ہے، بس ایک جگہ "عمرو عیار کی زنبیل" جو روز میں قلم سے نکل گیا ہے، وہ چھوٹے بچوں کی استعداد سے بہت اونچا ہے — (صفحہ ۲۷) "پھر میں چپ ہو تا تو اپنی ٹھوڑی چباتیں" چھوٹے بچوں کے بہلانے کیلئے انگلی یا انگوٹھا تو ضرور اُن کے منہ میں دے دیتے ہیں کہ وہ چوسنے میں لگ کر رونا دھونا بند کر دیں مگر "ٹھوڑی کا چوسنا" پہلی بار سننے میں آیا یہ ناممکن نہیں ہے مگر عجیب سا ضرور لگتا ہے۔!

یہ کہانیاں بہر حال دلچسپ ہیں اور سب سے بڑی خوبی کی بات ان کی اخلاقی افادیت ہے!

معذرت!

(۱) مارچ ۱۹۵۸ء کے "نقشِ اول" میں "تیسری سل" لکھا گیا ہے، یہ کتابت یا سنگ سازی کی شوخیٔ سہو ہے "سال" مذکر ہے!
(۲) "رنگ و آہنگ" پر تبصرہ کرتے ہوئے جو یہ لکھا گیا تھا کہ "بے پروا" اُردو ترکیب ہے، اُسے درست فرما لیا جائے، "بے پروا" فارسی ترکیب ہے، اور فارسی عربی لفظ کے ساتھ اضافت جائز ہے!
(۳) "ایک عورت اندر دو ملک" میں "پاپ کٹنے" پر جو تنقید کی گئی ہے، تو "پاپ کٹنا" روزمرہ ہے اور وہ اس طرح بولا جاتا ہے — "بھئی! اس آدمی کو کچھ روپے دے دلا کر اُس کا پاپ کاٹو"!

(م - ق)

فاران

پین اسلامک اسٹیم شپ کمپنی لمیٹڈ

پچھلے سال یعنی ۱۹۵۱ء میں پین اسلامک کے جہاز ''سفینۂ عرب'' اور ''سفینۂ مراد'' کے ذریعہ تقریباً ۱۱ ہزار حاجی فریضۂ حج سے مشرف ہوئے

امسال یعنی ۱۹۵۲ء میں حکومت پاکستان نے از راہ نوازش ہماری کارکردگی سے خوش ہوکر مجموعی حج ٹریفک کا ۵۰ فیصدی حصہ ہمارے جہازوں کے لئے مخصوص فرمادیا ہے

خدا کی ذات سے امید ہے کہ ہمارے جہاز امسال سال ماسبق سے کہیں زیادہ حجاج کی خدمت بجا لاسکینگے

آپ بھی فی حصہ مبلغ ۱۰۰ روپیہ دیکر کمپنی کے
پر منفعت کاروبار میں حصہ دار بن سکتے ہیں

معلومات اور مطبوعہ لٹریچر کے لئے لکھئے :

مینجنگ ڈائرکٹر **پین اسلامک اسٹیم شپ کمپنی لمیٹڈ**
ادریس چیمبر - ۱۴ ووڈ اسٹریٹ — کراچی

جلد ۲ ــــ شمارہ ۲

ماہنامہ

فاران

مئی سنہ ۱۹۵۲ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپے (پاکستانی) ــــ فی پرچہ ۸ آنے
۸ روپے (ہندستانی) ــــ فی پرچہ ۱۱ آنے

مقام اشاعت

دفتر: فاران کیمبل اسٹریٹ

کراچی نمبرا

نظم و ترتیب

حصۂ نظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل!

چیتا پور (دکن) سے ایک خط ہمیں وصول ہوا ہے، جس میں لکھا ہے:-

"دکن میں کمیونسٹوں کی کامیابی نے سابقہ حالات کو بڑی حد تک بدل دیا ھے، اب مسلمان جوق درجوق کمیونزم کی آغوش میں بھاگ رھے ھیں، اب حال یہ ھے کہ کالج کے کسی مسلمان طالبعلم سے پورے پورے زورِ بیان اور قوتِ استدلال کے ساتھ بھی اگر یہ کہا جاتا ھے کہ اسلامی نظام موجودہ دُنیا کا واحد حل اور بہترین نظامِ حیات ھے تو وہ پوری بے اعتنائی سے کہہ دیتا ھے کہ وہ تو ناقابلِ عمل ([illegible]) نظام ھے اگر اس (اسلام) میں کچھ بھی جان ھوتی تو آج پاکستان میں وہ جاری وساری ھوتا، لیکن آپ دیکھتے ھیں کہ باوجود قرارداد مقاصد منظور کرنے کے وہ اسلامی شریعت کے بجائے مغربی جمہوریت ھی کو نافذ وجاری کئے ھوئے ھیں اور مستقبلِ قریب میں کوئی توقع بھی نہیں کہ شریعت نافذ ھو سکے، حکومتِ پاکستان یہ ثابت کر رھی ھے کہ مغربی جمہوریت، اسلامی شریعت سے بہتر اور قابلِ عمل ھے ——— بتائیے ھم اس کا جواب کیا دیں؟"

پہلے تو ہم مکتوب نگار کی خدمت میں عرض کرتے ہیں وہ معترضین سے کہہ دیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کو دُنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی، آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں نظامِ اسلامی انشاء اللہ نافذ ہو کر رہے گا، چند لوگوں کی غفلت اور نااہلی کو دیکھ کر اسلام کے بارے میں وہ کوئی رائے قائم نہ کریں، اسلام افلاطون کی "ریاست" کی طرح کوئی خیال، واہمہ اور مفروضہ نہیں ہے، یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت، اور ایک تاریخی واقعہ ہے، دُنیا اس کو تجربہ کر کے دیکھ چکی ہے، یہ عمل میں آچکا ہے، لاکھوں بلکہ کروڑوں زندگیوں نے نظامِ اسلام کے قابلِ عمل ہونے کی شہادت دی ہے، تاریخ کے طالب علم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلام جس حکومت میں نافذ تھا اُس سے بہتر حکومت آج تک دُنیا میں قائم نہیں ہو سکی، تمدن و تہذیب اور سیاست و حکومت کی پوری تاریخ میں تنہا حضرت عمر فاروقؓ کی مثال نہیں مل سکتی، عوام اور مزدوروں کے سیکڑوں رہنما مل کر بھی فاروقِ اعظم کی گرد کو نہیں پہونچ سکتے، کمیونزم اور اسلام کا بھلا مقابلہ ہی کیا ہے، کمیونزم دُنیا کے لئے عذاب اور

لعنت ہے اور اسلام سعادت و رحمت ہے ——— اور یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں محض خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں کہہ رہے ہیں اور نہ اس لئے کہ قلم ہمارے ہاتھ میں اور کاغذ ہمارے قبضہ میں ہے، کیمونزم پر تنقید کی جاتی ہے تو اس پر احتساب بھی نہیں ہوتا لہٰذا جو کچھ ہم لکھ دیں گے اس پر کوئی روک ٹوک بھی نہیں ہوگی ——— اس قسم کی ذہنیت سے ہم سو بار پناہ مانگتے ہیں، ہمارے مذہب نے دشمنی اور بیزاری کے بھی حدود مقرر کر دئے ہیں اور ہمیں کسی قوم یا فرد کی دشمنی میں بھی جائز حدود سے تجاوز کرنے سے روکا گیا ہے۔

کیمونزم سے جو نوجوان متاثر ہیں اُن سے کہہ دیجئے کہ کسی نظریہ یا اُصول کا محض چل جانا یا وقتی طور پر مقبول ہونا اس کے مفید اور صالح ہونے کی دلیل نہیں ہے، دُنیا میں بہت سی بُری باتیں رواج پا جاتی ہیں اور رواج پا رہی ہیں، ہٹلر کو اپنے زمانہ میں کتنی عظیم الشان شہرت، عظمت اور مقبولیت حاصل تھی، اُس کی کامیابی کو دیکھ دیکھ کر لوگوں نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ "فاسزم" بھی ایک جاندار اور مفید چیز ہے اور اگر ہٹلر کہیں کامیاب ہو جاتا تو وہ لوگ جو صرف کسی اصول اور نظریہ کے "چلنے" کو دیکھتے ہیں، "ڈکٹیٹر شپ" اور "فاسزم" کا کلمہ پڑھنے لگتے، ہٹلر اُن کے نزدیک دُنیا کا نجات دہندہ ہوتا اور عظمت و مقبولیت کا جو تاج "اسٹالن" کے سر پر آج رکھا ہوا ہے، ہٹلر کے سر پر نظر آتا۔

اسلام اور کیمونزم کے جانچنے اور پرکھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ دونوں کے اصولوں کا مقابلہ کر کے دیکھا جائے، ایک ایک شق کا تجزیہ کیا جائے نظری بھی اور عملی بھی! لوگوں کی سمجھ پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ نظام جو بالکل پیٹ، روٹی اور جنسی خواہشات پر قائم ہو، جہاں اخلاق و پاکیزگی کے لئے ذرہ برابر گنجایش نہ ہو، اُس "نظام" سے مرعوب اور متاثر کس طرح ہو جاتے ہیں، اخلاق کی نفی کر کے اور پاکیزگیٔ کردار کو مٹا کر روٹی، کپڑا، اور تن کی آسودگی مل بھی گئی تو یہ بہت خسارہ کا سودا ہے، یہ تو جانوروں اور چوپایوں کی زندگی ہوئی کہ جن کے سامنے کوئی اخلاقی تصور نہیں ہوتا، صرف کھانا، پینا، سونا اور جنسی لذت حاصل کرنا ہی اُن کا مقصود ہوتا ہے ——— "کیمونزم" درندوں، چوپایوں اور جانوروں کے لئے تو مفید نظام ہو سکتا ہے مگر اُن انسانوں کے لئے وہ ایک عذاب اور لعنت ہے جن کی زندگیوں کی سب سے قیمتی متاع اخلاقی قدریں ہیں۔

نظریوں اور اصولوں کے بعد اسلام اور کیمونزم کے رہنماؤں کی زندگیوں کا مقابلہ کر کے دیکھیں کہ عوام کی خدمت کے لئے کس نے کیا کیا، رہنے سہنے، کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے، لوگوں سے ملنے جلنے اور اُن کے ساتھ تعلقات قایم رکھنے میں کس کا کیا عمل تھا؟ عوام کا درد اُس مقدس اور درد مند انسان کے دل میں تھا، جو غریبوں کے گھروں پر اپنی پیٹھ پر لاد کر غلہ کی بوریاں لے جاتا تھا اور جس کے کرتہ میں بیسیوں پیوند لگے رہتے تھے، یا عوام کا وہ شخص درد مند ہے جو اپنی بیٹی کو بیس لاکھ کا گراں بہا جہیز دیتا ہے، ایک انسان تھا جس کا دروازہ عوام کے لئے کُھلا ہوا تھا جس کا گریبان تھام کر ایک بڑھیا اپنا حق طلب کر سکتی تھی، اور دوسری طرف دوسرا آدمی ہے کہ عوام بیچاروں کا تو ذکر ہی کیا ہے، حکومتوں کے سفراء جس کی بارگاہِ جبروت میں شرف باریابی حاصل کرنے کے لئے ترستے رہتے ہیں اور جس کے کسی قول و فعل پر تنقید کرنے کی کوئی جُرأت ہی نہیں کر سکتا اور اگر کوئی قسمت کا مارا ایسا کر گزرے تو پھر اس کی جان کی خیر نہیں ——— یہ "اینٹی امپیرلزم" "Anti - Imperialism" کا نعرہ لگانے والے کیمونسٹ شاید اس کو بھول جاتے ہیں کہ اسٹالن اپنی ذات سے تنہا متعدد شہنشاہوں اور بہت سے بادشاہوں کا جواب ہے، افسطس، جسٹینین، جمشید اور قیصر و کسریٰ کو وہ شاہانہ اختیارات، وہ خسروانہ جلال اور وہ غیر مسئول اقتدار کہاں نصیب تھا، جو جلالت مآب "اسٹالن" کو حاصل ہے، سوویٹ روس میں جو اطلاع و خبر پر پہرے بٹھا رکھے ہیں یہ طلسم کسی نہ کسی دن تو ٹوٹے گا، جبر و استبداد

پر آخر پردہ کب تک پڑا رہے گا، صرف پروپیگنڈے کے ذریعہ دنیا کی آنکھوں میں آخر کب تک دُھول جھونکی جاتی رہے گی ــــــ ایک دن آئے گا اور انشاء اللہ عنقریب آئے گا جب یہ غبار چھٹے گا اور حقائق بے نقاب ہو کر سامنے آئیں گے اُس وقت لوگوں کو معلوم ہو گا کہ جس چشمہ پر "آبِ حیات" کے سائن بورڈ لگا دئے گئے تھے اُس میں خون، پیپ اور زہر کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

دکن کے اشتراکیت زدہ نوجوانوں کو یہ پیام بھی پہونچا دیجئے کہ پاکستان کے اربابِ اقتدار پاکستان میں نظامِ اسلامی کے قیام میں جو غفلت برت رہے ہیں، اس غفلت کو زیادہ دن تک برداشت نہیں کیا جاسکتا، قراردادِ مقاصد کوئی بچوں کا کھیل اور جادوگروں کی نظربندی نہ تھی، یہ پاکستان کے سب سے زیادہ ذمہ دار آئینی ادارہ (مرکزی اسمبلی) کا وعدہ اور اقرار تھا، جو پورا ہو کر رہے گا، اس کو کچھ دن کے لئے موخر کیا جاسکتا ہے مگر ہمیشہ کے لئے ٹالا نہیں جاسکتا، پاکستان کے اربابِ اقتدار نے اگر قراردادِ مقاصد کی خلاف ورزی کی یا حیلے حوالے کر کے وہ اسے ٹلاتے رہے تو پھر ایک دن وہ بھی آئے گا کہ زمامِ اقتدار اُن کے ہاتھوں سے لی جائے گی، اختیار و منصب کی کرسیاں اُن کو خالی کردینی ہوں گی، پاکستان کی عنانِ حکومت اُنھی کو سونپی جاسکتی ہے اور وہی اس کے اہل ہیں جو یہاں اللہ کے دین کو پورے کا پورا قایم کرنے کا عزم رکھتے ہوں، جن کی زندگیاں اسلام کی شہادت دیتی ہوں اور جن کا دل اسلام اور ملت کے درد سے لبریز ہو!

اربابِ اقتدار کی خدمت میں

پاکستان کے اربابِ اقتدار کی خدمت میں ہماری یہ گزارش ہی اور گزارش ہی نہیں بلکہ شکایت ہی، شکوہ ہی، پُرزور احتجاج ہو کہ انھوں نے جو طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہو اُسے دیکھ کر خود مسلمانوں میں "اسلام" کے بارے میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہو رہے ہیں، وہ "اسلام" جو سراسر عمل ہی عمل، حرکت ہی حرکت، اور زندگی ہی زندگی ہو جسے "دینِ فطرت" کہا جاتا ہو اور جس پر "اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا" کی مُہرِ انتخاب و پسندیدگی لگی ہوئی ہو، اس کے متعلق غیر نہیں خود اپنے بھائی بند مسلمان ہی کہہ رہے ہیں کہ یہ ایک "ناقابلِ عمل" نظام ہی، اگر قابلِ عمل ہوتا تو پاکستان میں اس کو نافذ اور قایم ہونا چاہیے تھا ــــــ یہ ایک دردناک حزنیہ ایک الم انگیز ٹریجڈی اور ایک ایسی دہشت ناک اطلاع ہے جسے سُن کر غیرت مندوں کی نیندیں اُڑ جانی چاہئیں!

یہ دیکھ کر کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا مگر وہاں اسلام نافذ نہ ہوسکا یا نافذ نہیں کیا گیا ــــــ جن مسلمانوں کے دلوں میں خود اسلام سے بیزاری اور بیگانگی پیدا ہوگی تو یہ گناہ آخر کس کے اعمالنامہ میں لکھا جائے گا اور اس کی ذمہ داری کس کے سر آئے گی؟ اُن کے سرجنھوں نے پاکستان کو اسلامی اصولوں پر چلانے کا وعدہ کیا تھا، جو ہر تقریر میں "اسلام" کے گن گاتے ہیں مگر "اسلام" کو حکومت کے نظم و نسق میں داخل نہیں ہونے دیتے!

کیا پاکستان اسلام کو رُسوا کرنے کے لئے بنا تھا، کیا اُس کی تشکیل اس لئے ہوئی تھی کہ لوگ اُسے دیکھ کر خود اسلام کے بارے میں یہ رائے قایم کریں کہ وہ ایک "ناقابلِ عمل" چیز ہے! دعوے اس کے کہ پاکستان میں اسلام سربلند ہوگا اور عمل یہ ہے کہ پاکستان میں اسلام رُسوا اور ذلیل ہو رہا ہے ــــــ

تاریخ میں ایسی مثال شاید نہیں یقیناً نہیں مل سکتی کہ کسی قوم کو زمین کے کسی خطہ کو حاصل کرنے کے لئے اتنی بھاری قربانیاں دینی پڑی ہوں، لاکھوں مسلمانوں کے قتل و غارت گری اور گھر سے بےگھر ہونے پر صبر کیا جاسکتا ہے، مگر یہ جو ہزاروں عصمتوں کا خون، اور بے شمار مسلمان خواتین کی آبروریزی ہوئی ہے، اور اَن گنت مسجدوں کی جو بے حرمتی عمل میں آئی ہے،

اس پرکس دل سے صبر کریں، ان زخموں کے لئے کہاں سے مرہم لیکر آئیں ـــــــ کاش! اس قسم کی خبریں سُننے سے پہلے کان پھوٹ جاتے کہ فلاں مسجد میں قرآنِ پاک کے اوراق پھاڑ پھاڑ کر، ظالموں نے مسلمان عورتوں سے مباشرت کی ـــــــ یہ تمام رسوائیاں بے حرمتیاں اور ذلتیں "پاکستان" ہی کے لئے گوارا کرنی پڑیں!

اگر پاکستان میں عورتوں کی سربازار پریڈ کرانی تھی، مینا بازار لگانے تھے، قمار بازی کے اسٹال اور شراب خانے قایم کرنے تھے، "منکر" کا مٹانا اور "معروف" کو قایم کرنا مقصود نہ تھا، اسلامی دستور کے نفاذ کا ارادہ نہ تھا، اسلامی ماحول پیدا کرنے کی کوئی تڑپ دلوں کے اندر نہ تھی ـــــــ زیادہ سے زیادہ مصر اور ایران اور ترکی کے طرز پر ایک حکومت قایم کرنی تھی تو پھر ہندستان بٹوا کر یہ تباہیاں، رسوائیاں اور ذلتیں آخر کس لئے مول لی گئیں، جب یہی کچھ کرنا تھا تو اس کے لئے "متحدہ ہندستان" آخر کیا بُرا تھا؟

تباہیوں اور مصیبتوں کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا، ہندستان کے چار کروڑ مسلمان "پاکستان" بنوانے ہی کے جرم میں "غلامی" کی ذلتیں بھگت رہے ہیں، اُن کی بے دست و پائی اور لاچاری کا یہ عالم ہے کہ اُن کے رسولؐ کی توہین کی جاتی ہے، اور وہ کچھ نہیں کر سکتے حالانکہ انگریز کے زمانہ میں اُن کی دینی حمیت، اسلامی غیرت اور حوصلہ مندی کا یہ عالم تھا کہ "شاتمِ رسولؐ" کو وہ زندہ نہ چھوڑتے تھے، بھارت کی سیکولر اسٹیٹ میں مسلمان بچوں کو ایسی کتابیں پڑھنی پڑ رہی ہیں کہ آنے والی نسل شاید فاروق، علی، خالد اور طارق (رضی اللہ عنہم) کے نام بھی یاد نہ رکھ سکے گی اُس کے ہیرو تو "ارجن" "بھیم" اور "ابھیمنیو" ہوں گے، وہ مکہ اور مدینہ سے کہیں زیادہ اجودھیا، بندرابن اور ہردوار کو جانیں گے؟

تقسیمِ ہند کے بعد ہزاروں مسلمانوں کو ارتداد اختیار کرنا پڑا ہے، مسجدوں کے پیش اماموں اور قرآن حافظوں نے ڈاڑھیاں منڈا کر، قشقہ لگا کر اور جنیو پہن کر سود کا گوشت کھایا ہے، بھارت میں مسلمانوں کی پستی اور کم ہمتی کا یہ عالم ہو گیا ہے کہ بعض مقامات پر ہندوؤں اور سکھوں کو وہ اپنی بیٹیاں دے رہے ہیں، قوم جان بچانے کے لئے ہر رسوائی اور بے عزتی کو گوارا کر رہی ہے ـــــــ ہولی، دوالی اور دسہرہ کے تہوار آتے ہیں تو بھارت کے مظلوم مسلمان سہمے سہمے اور ڈرے ڈرے رہتے ہیں کہ نہ جانے اُن پر کیا گزر جائے، بعض کلہ گو مشترکہ تمدن کی آڑ لیکر جان بخشی چاہتے ہیں، اُن کو اس پستی تک اُتر آنا پڑا ہے کہ "محمد رام" "گوپال حسن" اور "موہن خواجہ" جیسے نام تک رکھنے میں اُن کو عار محسوس نہیں ہوتا، یہ تمام ذلتیں، تباہیاں، مصیبتیں اور گراوٹیں صرف "پاکستان بنوانے" کے جرم میں برداشت کی جا رہی ہیں!

اتنی بے نظیر قربانی، عظیم الشان ایثار اور لرزہ براندام ذلتوں اور تباہیوں کے بعد جو "پاکستان" حاصل ہوا ہے، اس میں وہی کچھ ہو رہا ہے جو متحدہ ہندستان میں ہوتا ـــــــ متحدہ ہندستان کی اسی بنیاد پر تو مخالفت کی گئی تھی کہ ملی جلی حکومت میں مسلمانوں کا مذہب، کلچر، زبان اور تہذیب محفوظ نہ رہ سکے گی، یہ مطالبہ اپنی جگہ درست تھا ـــــــ ـــــــ مگر ہم دریافت کرتے ہیں کہ کیا پاکستان بننے کے بعد مسلمانوں کا مذہب، کلچر، زبان اور تمدن محفوظ ہو گیا، زبانی دعووں اور خیالوں میں محفوظ ہو گیا ہو تو ہو گیا ہو مگر عملاً تو وہ اور خطرے میں پڑ گیا، پانچ سال ہونے کو آئے ابھی تک دستور ہی تیار نہیں ہو سکا، اور جس دستور کا خاکہ پیش کیا گیا، وہ نہ صرف یہ کہ غیر اسلامی تھا بلکہ غیر جمہوری بھی تھا، دستور سازی میں تاخیر پر تاخیر اور تعویق پر تعویق ہو رہی ہے، شاید اس کا انتظار کیا جا رہا ہے کہ رفتہ رفتہ قوم کا دینی احساس کُند ہو جائے اور کتاب و سُنت کی بنیاد پر دستور سازی کا مطالبہ بھول میں پڑ جائے!

"بلبل چودھری" اور "مس آزوری" کے رقص کے جلسوں کی سرپرستی کس نے کی تھی؟ موسیقی کے مقابلوں کے انعامات کس کے ہاتھ سے تقسیم ہوتے ہیں؟ سٹی مسلم لیگ کراچی کے زیر اہتمام کھلے خزانے جوئے کے جو اسٹال، گیم آف اسکل "GAME OF SKILL" کے نام پر قائم ہوئے تھے اُس کو کس کی منظوری حاصل تھی؟ شہنشاہ ایران کو مسلمان لڑکیوں نے سینہ تان تان کر سلامی کس کے اشارے پر دی تھی؟ مسز روزویلٹ کے خیر مقدم کے لئے دخترانِ ملت کا اونٹ گاڑیوں پر جو جلوس نکالا گیا تھا اُس میں کس کا ایماء شریک تھا؟ ——— کیا یہی وہ اسلامی تہذیب اور مسلم کلچر ہے جو متحدہ ہندستان میں محفوظ نہ رہ سکتا تھا اور پاکستان میں اُس کی حفاظت کی جا رہی ہو، ناچ، گانے بے حجابی اور مرد و زن کے اختلاط کے لئے تو متحدہ ہندستان" میں پاکستان سے زیادہ بہتر مواقع حاصل تھے، جب یہی کچھ کرنا تھا تو قوم کو ان آتشیں آزمائشوں میں کیوں ڈالا گیا ——— اے عزت مآب لیڈرو؟ قوم نے تمہارا آخر کیا بگاڑا تھا، تمہارے ساتھ کونسی دشمنی کی تھی، جو اُس بیچاری کو سرگشتگی و حیرانی کے اُس دوراہے پر لیجا کر چھوڑ دیا کہ نہ اُسے رزق ملتا ہو اور نہ موت ہی آتی ہو، ہندستان کی دس کروڑ قوم کو دو حصّوں میں کاٹ کر آخر تم نے قوم کو کیا دیا؟ ہندستان میں جو غریب مسلمان رہ گئے ہیں اُن کی تم کوئی مدد نہیں کر سکتے، اُن کو تم نے بُھلا دیا جیسے کہ اُن سے تمہارا کوئی واسطہ ہی نہیں تھا، اُن کی مظلومیت کا تمہیں احساس تک نہیں ہوتا، تم میں اسلامی حمیت ہوتی تو بھارت کے مسلمانوں کو مظلومیت سے چھڑانا تمہارے پروگرام کا ایک جز ہوتا ——— ؟

بھارت سے جو مسلمان پاکستان میں آنا چاہتے ہیں، اُن کو تم قانونی طور پر پاکستان میں آنے نہیں دیتے وہ بیچارے جان پر کھیل کر خود ہی چلے آتے ہیں اور جس حال سے آتے ہیں اُس منظر کو پیش کرنے کی کس کے دل میں تاب ہے، یہاں پاکستان میں آکر اُن کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُس کے تصور سے دل کو دُکھ ہوتا ہے، اس دردناکی کا کوئی ثبوت چاہتا ہو تو کراچی کے گلی کوچوں میں جا کر مہاجرین کی جھونپڑیوں کو ایک نظر دیکھ آئے، کیڑے مکوڑے شاید اپنے بلوں اور سوراخوں میں اس سے زیادہ چین سے رہتے ہوں گے، مہاجرین کی آبادکاری اور اُن کے فلاح و بہبود کے لئے ایک محکمہ قائم ہے لاکھوں روپیہ سالانہ عملہ کی تنخواہوں پر صرف ہو رہا ہے مگر کام؟ کام کا یہ رنگ ہے کہ فائلوں پر تجویزیں ہی ہوتی اور خیالوں میں اسکیمیں ہی بنتی رہتی ہیں جو کچھ اب تک ہوا ہے وہ حالات کی نزاکت کے اعتبار سے لائقِ تعریف نہیں ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے اُس میں سُستی پائی جاتی ہے۔

ہم سرمایۂ دولت اور معاشرتی حیثیت (SOCIAL STATUS) میں "انصاف" کے قائل ہیں، اور اس تفاوت کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو فطری اور ناگزیر ہے، حکومت کا ایک وزیر اور ایک کلرک اور چپراسی بالکل ایک ہی انداز پر نہیں رہ سکتے ——— مگر اس غیر معمولی تفاوت کو بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا کہ ایک کو چھینک آ جائے اور ذرا کان گرم ہو تو سول سرجن اُس کے طبی مشورہ کے لئے حاضر ہوں اور دوسری طرف جاں بلب مریضوں کو دوا اور غذا بھی میسر نہ آ سکے، اس قسم کا "تفاوت" فطری تفاوت نہیں مصنوعی بلکہ ظالمانہ تفاوت ہے۔

پاکستان بننے کے بعد انگریزوں کے پیدا کئے ہوئے تنخواہوں کے "غیر معمولی تفاوت" کو معتدل ہو جانا چاہیئے تھا، حکومت اور اربابِ حکومت کے ٹھاٹ باٹ پر جو روپیہ پانی کی طرح خرچ ہوتا ہے، اُس کی رفتار میں کمی ہو جانی ضروری تھی —— مگر نہیں ہوئی، آج بھی ستبیّ میں شاہانہ دربار لگتا ہے، صدیق و فاروق کی سُنّت کی جگہ انگریز کی سُنّت تمام لوازم کے ساتھ زندہ و پایندہ ہے، گورنر جنرل کے مصارف بے اندازہ ہیں جو ممکن ہے ملکہ وکٹوریہ کے جانشینوں کو زیب دیتے ہوں مگر صدیق و فاروق

اور عثمان و علی (رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین) کے جانشینوں اور نام لیواؤں کو تو کسی عنوان زیب نہیں دیتے ——— یہ عہدیداروں کے طرح طرح کے بھتے اور الاؤنس، یہ سفارتوں کے شاہانہ مصارف، یہ بات بات پر انگلستان اور امریکہ کے سفر، یہ افتتاح کی شاندار رسمیں، یہ پُرتکلف ڈنر اور پارٹیاں ——— اُس قوم کے "بیت المال" سے جس کی بڑی آبادی مفلس اور قلاّش ہو، جس کی بیوائیں گلیوں اور سڑکوں پر بھیک مانگتی پھرتی ہیں جس کے بوڑھے اور اپاہج فٹ پاتھ پر زخمی جانوروں کی طرح تڑپتے اور بلبلاتے رہتے ہیں، اور جس کے بعض بیماروں کو ایک خوراک دوا اور ایک پیالی دودھ میسر نہیں آتا۔

یہ وہ عاقبت نااندیش روش ہے جو "کمیونزم" کے لئے پاکستان میں حالات کو سازگار بنا رہی ہے، اگر ارباب اقتدار اور سرمایہ داروں نے اپنی روش کو نہ بدلا اور غفلتوں اور عیش سامانیوں کا یہی عالم رہا تو "کمیونزم" کو صرف زبانی وعظ اور تحریری مقالے آخر کب تک روک سکیں گے، اس طوفان کا مقابلہ تو چٹان نہیں طوفان ہی سے کیا جا سکتا ہے مگر طوفان بننے کے لئے زحمت کون گوارا کرے، یہ کام تو بڑا ایثار، قربانی دردسری اور خلوص و دردمندی چاہتا ہے اور یہاں اسی جنس کی کمی ہے ——— لوگ، اس غفلت میں نہ رہیں کہ انگلستان اور امریکہ کی پشت پناہی "کمیونزم" سے بچالے گی، چین میں ہم اس کا حشر دیکھ چکے ہیں کہ چانگ کائی شک اور اُس کے ساتھی امیروں، جاگیرداروں، درباریوں اور عہدیداروں کی اقربا نوازیوں، عیش کوشیوں اور غفلتوں نے "کمیونزم" کے لئے راستہ ہموار کر دیا اور انگلستان اور امریکہ کی امداد اور پشت پناہی دھری کی دھری رہ گئی، کمیونزم کا توڑ صرف اسلام کا معاشی نظام کر سکتا ہے اور پاکستان میں آج تک زکوٰۃ کا نظام بھی قایم نہیں ہو سکا، ہاں! ایک زکوٰۃ کمیٹی البتہ بن چکی ہے ——— اور کمیٹیاں تو یہاں بنتی ہی رہتی ہیں۔

کمیونزم پاکستان میں خدانخواستہ آگیا تو اس مصیبت کا شکار تو وہ لوگ ہوں گے جن کو اسلام سے ہمدردی ہے اور جو مسلمان بن کر جینا اور مرنا چاہتے ہیں اور جو اسلام کے سوا کسی اور دوسرے نظام حیات کو قبول ہی نہیں کر سکتے مگر جو اسلام کا درد اپنے اندر نہیں رکھتے اور جو ہوا کے ساتھی ہیں اُن کا کیا ہے جب انگریز تھا تو اُن کے دفتروں، عدالتوں اور ڈرائنگ روموں میں وکٹوریہ، ایڈورڈ اور جارج کی تصویریں لگی ہوئی تھیں، انگریز کے بعد انھوں نے مسٹر محمد علی جناح مرحوم کی تصویریں آویزاں کر لیں، اور کمیونزم آگیا تو قائد اعظم کی تصویر مارشل اسٹالین کی تصویر سے بدل جائے گی، ان لوگوں کا کیا بگڑے گا، یہ تو اُس وقت بھی مزے میں رہیں گے، حکومت چین میں ماؤزے تنگ نے جو شاہانہ جشن برپا کیا تھا اُس میں قیمتی شرابوں کے جام بڑی تنخواہ پانے والے عہدیداروں، خوشحال ادیبوں، کھاتے پیتے آرٹسٹوں اور دولت مندوں ہی کے حصے میں آئے، کمیونزم آنے کے بعد تو اس ذہنیت کے لوگوں کو اور چھوٹ مل جائے گی، آج اُن کی غیر اخلاقی اور غیر اسلامی حرکتوں پر تنقید بھی ہو سکتی ہے اور سوسائٹی کے ڈر سے وہ بہت سی انتہا پسندانہ بے شرمیوں سے رُک بھی جاتے ہیں مگر کمیونزم آنے کے بعد یہ تمام اخلاقی بندھن ٹوٹ جائیں گے ——— اور

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

پر بھی کھول کے عمل کیا جائے گا ——— اس ذہنیت کے لوگ جن کا کوئی نصب العین نہ ہو پاکستان کو ڈبو دیں گے، اُن کے پیش نظر تو صرف اُن کا ذاتی مفاد اور اپنی تن پروری اور عیش و آسودگی ہے، اب وہ چاہے جس نظام کے تحت بھی ملے!

اسلامی قانون کے نفاذ اور اسلامی تہذیب کے احیاء کے وعدوں کے بعد "اُردو زبان" کو پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کا بہ تکرار وعدہ کیا گیا، مگر دوسرے وعدوں کی طرح یہ وعدہ بھی شرمندۂ ایفاء نہ ہو سکا، انگریز کی نیاز مندی دلوں میں رچی ہوئی اور اُس کی مرعوبیت دماغوں پر چھائی ہوئی تھی، اس لئے انگریز کی زبان (انگریزی) چھوڑتے ہوئے دل دکھا اور اپنے خداوندانِ نعمت کی اس یادگار کو باقی رکھا گیا، یہاں تک کہ مشرقی بنگال میں "زبان اُردو" کے خلاف ایک ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا، جس میں پاکستان کی وحدت اور سالمیت کے لئے بہت سے خطرے نظر آتے ہیں۔

ہم اس قناعت کے لئے بھی تیار تھے کہ پاکستان بننے کے بعد چاہے ہمیں آسودگی نہ ملتی مگر "دین" تو ملتا، دُنیا بلا سے بگڑ جاتی لیکن "آخرت" تو سنور جاتی ——— مگر یہاں تو دین ہی ملا اور نہ ٹھکانے سے دنیا ہی میسر آئی۔

ہم نے "فاران" کے صفحات پر بارہا پاکستان کے اربابِ اقتدار پر تنقید کی ہے، انھیں توجہ دلائی ہے مگر اُس کا کوئی نتیجہ دیکھنے میں نہیں آیا، معلوم ہوتا ہے حکومت کا محکمہ اطلاعات ہماری آواز اوپر والوں تک نہیں پہونچاتا، اگر یہ بات صحیح ہے تو حکومت کی یہ غفلت حددرجہ قابلِ افسوس ہے اور اگر ہماری گزارشیں اوپر تک جاتی ہیں تو پھر بالادست طبقہ میں معلوم ہوتا ہے کہ احساس کی کمی ہے!

ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ اب تک جو کچھ ہم کہتے رہے ہیں اور اس وقت جو کچھ عرض کر رہے ہیں، اگر وہ نادرست اور مبالغہ آمیز ہے تو ہمیں ان تہمت تراشیوں اور مبالغہ آمیزیوں پر متنبہ اور آگاہ کیا جائے، اگر ہمارے قلم سے کوئی بے جا اور خلافِ واقعہ بات نکل گئی ہو تو اُس کی ہم معافی چاہیں گے، خاموشی کے ساتھ چُپ چاپ نہیں! اس کا اعلان کریں گے کہ ہم سے فلاں بھول چوک ہو گئی ——— اس لئے کہ لوگوں پر تہمتیں جوڑنا اور انہیں بدنام کرنا ہمارے نزدیک بہت بڑا اخلاقی گناہ ہے، اربابِ اقتدار کی روش پر جب بھی ہم نے تنقید کی ہے تو دل کو تکلیف ہوئی ہے کہ کاش! اس کا موقعہ نہ آتا، ہمیں تو اس کی توقع تھی کہ ہم غلطی کریں گے تو ہمیں ٹوکا جائے گا، ہماری زندگیاں اور سیرتیں کج ہوں گی تو اُن کی کجی نکالی جائے گی، خلافِ شریعت باتیں ہم سے ظہور میں آئیں گی تو ہم پر شرعی حدود جاری کی جائیں گی، قدم قدم پر اوپر سے ہماری رہنمائی ہوگی کہ کتاب و سنت کا یہ تقاضا ہے، حق وانصاف کا یہ مطالبہ ہے اور صراطِ مستقیم اس طریقہ کا نام ہے مگر تاریخ کا عجب حزنیہ ہے کہ جو کام اربابِ اقتدار کے کرنے کا تھا وہ ہم جیسے ہیچمدانوں کو کرنا پڑ رہا ہے، ہماری نگاہیں تو اُن کو ڈھونڈ رہی ہیں جن کو قرآن نے "اولی الامر" فرما کر، خدا اور رسولؐ کے بعد جن کی اطاعت کا حکم دیا ہے!

ہم پھر عرض کرتے ہیں اور پورے خلوص و درد مندی اور احترام کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ موجودہ صورتِ حال کو اب زیادہ دن تک برداشت نہیں کیا جا سکتا، قرآن اب صرف الماریوں اور جزدانوں کی زینت بن کر نہیں رکھا جائے گا، اسے حکومت کے ایوانوں پر قبضہ کرنا ہے اور رسول اللہ کی مقدس سنت صرف سیرۃ النبی کے جلسوں تک ہی محدود نہ رہے گی، اس کو ہماری معاشرت پر غالب آنا ہے، وعدوں کے سبز باغ ہم نے بہت دیکھ لئے اب ہم "عمل" اور "ایفاء" کا مطالبہ کرتے ہیں جلد، بہت جلد! جو لوگ اس کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے یا کسی سبب سے اسلامی خطوط پر پاکستان کو چلانا نہیں چاہتے، اُن کو یا تو خود ہی اقتدار کی کرسیوں سے ہٹ جانا چاہیئے کہ شرافت اور احساسِ ذمہ داری کا یہی تقاضا ہے ورنہ اُن کو ایک دن ہٹ جانا پڑیگا، لوگ اس بھلاوے میں نہ رہیں کہ "اپوا" (W.A.P.P.A.) اور زنانہ نیشنل گارڈ جیسے اداروں اور انجمنوں کے ذریعہ وہ رفتہ رفتہ "قوم" کی ذہنیت کو بدل دیں گے، ایسا نہیں ہونے دیا جائے گا، یہ لعنتیں تو انشاء اللہ تو خود مٹ کر رہیں گی، یہاں تک کہ حکومت اور معاشرت پر اللہ کا پورے کا پورا دین غالب آجائے اور تقویٰ اور نیکوکاری سوسائٹی کا مزاج بن جائے!

ماہر القادری
۲۴ر اپریل ۵۳ء

حسن امام وارثی

باکمال فن کار

بینظیرشاہ وارثی

گویند ذکرِ خیرش در خیلِ عشقبازاں
ہر جا کہ نامِ حافظ در انجمن بر آید

سید صدیق احمد بن سید احسان علی شاہ گردیزی کڑہ مانکپوری ابھی جوان ہوئے تھے کہ اُن کی قسمت رسا اُن کو حضرت حاجی سید وارث علی شاہ قدس سرہ متوطن قصبہ دیوہ شریف ضلع بارہ بنکی صوبہ اودھ کے سلسلۂ بیعت وارادت میں لے آئی۔ ملبوس شاہی یعنی جامۂ احرام شریف سے بھی نوازے گئے اور حسب معمول خطاب بینظیر سے سرفراز ہوئے۔ اسی نام سے روشناس زمانہ رہے۔

بینظیر شاہ کی ولادت[1] غدر ۱۸۵۷ء کے قریبی سالوں میں سے کسی سال ہوئی ہوگی۔ قیاس یہی کہتا ہے کیونکہ ۱۹۱۸ء میں جب میں نے ان کو پہلی بار دیکھا تھا تو اُس وقت سن شریف ساٹھ برس سے متجاوز معلوم ہوتا تھا۔ صدر کی کسی بیماری کی وجہ سے ایک پھیپھڑا خشک کر دیا گیا تھا جس سے کاٹھی ایک طرف سے کج ہو کر رہ گئی تھی۔ قد نکلتا ہوا۔ خط و خال موزوں، جوانی میں خاصے حسین ہوں گے۔ اپنے خطاب و تخلص کے ساتھ اسم بامسمیٰ ہونے کا نشہ مستولی ہونے کے باوجود رعونت مزاج میں نام کو نہیں تھی بلکہ ان کی بے نفسی کے تجربے ہوئے۔ شاعری میں اُن کا واقعی بینظیر ہونا میرے نزدیک ناقابل انکار ہے۔

افسوس کہ حیدرآباد دکن میں جمعہ کے دن ۳۰ ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ مطابق ۲ ستمبر ۱۹۳۲ء کو یہ گوہر یکتائے ہنر ڈھیروں مٹی میں دبا دیا گیا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؎

بناکامی نیرد ہر کہ راہ عشق پیماید
عناں را نرم کن دیں فرد گانے ہر قدم بشنو

قبل اس کے کہ کلام بینظیر کے چیدہ شہپاروں سے ناظرین کو لطف اندوزی کا موقع دیا جائے، غیر مناسب ہوگا اگر مندرجہ بالا اجمالی بیان کی کچھ تفصیل و تشریح کر دی جائے جن کا تعلق راقم الحروف کی ذات سے وابستہ ہے۔ کون جانے پھر اس کی نوبت آسکے یا نہیں ؎

جب تک رہے رہے نہ رہے اختیار ہے — جانِ حزیں سے کوئی بھی قول و قسم نہیں

---

[1] "انتخاب زرین" میں سر راس مسعود نے ۱۸۶۳ء لکھا ہے۔ میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ (ح۔و)

اپنے بزرگوں سے شوخی رامپوری و میر وحید الہ آبادی کے بڑے دلچسپ تذکرے اور چیدہ چیدہ اشعار سنکر مجھے بڑی حسرت ہوا کرتی تھی کہ ؎

در محفلے کہ یاراں شرب مدام کردند
چو نوبت من آمد، آتش بجام کردند

خدا کا کرنا دیکھئے کہ جناب نادر شاہ خاں شوخی رامپوری کے تلمیذ رشید ہمارے شہر کے رئیس جناب سید احمد علی عشرت مرحوم مغفور سے اصلاح سخن کا مجھے شرف حاصل ہوا۔ اور میر وحید کے قابل فخر شاگرد سید بینظیر شاہ سے میرے وہ مراسم قایم ہوئے جس کا احسان خدا دھرتا ہے کہ فاصبحتم بنعمتہ اخوانا۔ کلام بینظیر کے بے خبر معترف ہم لوگ بہت زمانہ سے تھے۔ اس کی صورت یہ ہوئی تھی کہ ایک مجذوب برادر طریقت ہمارے یہاں آیا کرتے تھے جن کو مثنوی بینظیر کا ایک نادر انتخاب برزبان یاد تھا اور بڑی مستانہ دھن میں وہ اس کو سُنایا کرتے تھے۔ گرچہ مجذوب غریب نے کبھی ان اشعار کی نسبت اپنی ذات کے ساتھ نہیں کی تھی مگر عقیدت مند مصر رہا کرتے تھے کہ انھیں کا کلام ہے چنانچہ حضرت قبلہ گاہی علیہ الرحمۃ کی بیاض میں وہ اشعار اسی طرح مندرج آج بھی موجود ہیں۔ ہوش سنبھالنے کے بعد جب کلام بینظیر تک رسائی ہوئی تو شاہ صاحب سے ملنے کا۔ بڑا اشتیاق پیدا ہوا ؎

آں دل کہ پریشاں شود از نالۂ بلبل
در دامنش آویز کہ با وے خبرے ہست

شہر گیا کے جوانمرگ طبیب سید شمس الحسن عرف نخوں سہسوانی ہمارے خاندانی مراسم تھے۔ ایک دن اُن سے ملنے گیا تو ایک دیرینہ سال احرام پوش بزرگ چوکیوں کے فرش پر اُن کے پاس بیٹھے نظر آئے۔ طریقۂ نشست چونکہ مشرب واتی کے منافی تھا اس لئے علیک سلیک سے آگے میں نے شاہ صاحب کی پذیرائی نہیں کی۔ حکیم صاحب مرحوم نے ہمارا تعارف یوں ضروری نہیں سمجھا کہ اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میں اپنے خانوادے کی ایسی شہرۂ آفاق ہستی سے صورت آشنا بھی نہ ہوں گا۔ اب یاد نہیں کہ اُسی دن یا اس کے دو ایک روز بعد شاہ صاحب بلا تکلف غریب خانہ پر تشریف لاکر خود ہی متعارف ہوئے۔ مشربی ہم آہنگی کا فقدان، ایک حد تک سدّ راہ شوق ضرور تھا مگر خسرو اقلیم شعر وفن کی یہ ذرہ نوازی بھی تو نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھی۔ آسی آخرالذکر حیثیت سے ممدوح الشان سے ملنا گوارا کیا تھا مگر جب روابط کافی بڑھ گئے۔ شاہ صاحب میرے ہی یہاں اُٹھ آئے اور رہنے سہنے لگے۔ پھر کچھ عرصہ بعد گھر سے صاحبزادی اور صاحبزادے کو بھی بلا لیا۔ جب سن و سال کا تفاوت بھی مزاحمت سے باز رہا اور ہم آپس میں کافی حد تک بے تکلف ہو چکے تو پھر مشربی بے راہ روی پر بھی گفت و شنید ہونے لگی۔ جہاں اُن کے فیض صحبت سے بہرے علمی اور معلوماتی افادہ و استفادہ کی انتہا نہ رہی، وہیں ممدوح نے میری جسارتوں کو قبول فرما کر اپنی اصلاح خیال میں بھی دریغ نہیں فرمایا۔ یہ کیا کم ثبوت اس بات کا ہے کہ وہ کتنے بے نفس تھے۔ مثنوی "الصحف الاخریٰ" (دلایات الوارث) اُن کا آخری تحفہ میرے پاس محفوظ ہے جو مجھے دیکر شاہ صاحب حیدر آباد روانہ ہوئے تھے اور وعدہ حتمی ہوا تھا کہ وہاں سے واپس آکر مثنویات پر نظر ثانی کے بعد ضروری حد تک اضافہ کے ساتھ جدید نشر و اشاعت کی جائے گی۔ افسوس کہ حیات مستعار نے دھوکا دیا اور کام ادھورا رہ گیا ؎

با غمزہ ایں معاملہ پیش از الست بود
حرف بلےؔ نبود کہ زخم بلا رسید

بے نظیر شاہ کیا نہیں جانتے تھے؟ ان کی "خدادانی" کو تو خدا جانے مگر فقیروں، فقیہوں، عالموں، حکیموں، پروفیسروں، ڈاکٹروں کسی سے مات کھانے والے وہ نہیں تھے۔ ندوۃ العلماء والے آن سے راضی، علی گڑھ والوں نے انکو سر دل آنکھوں پر رکھا۔ شعراء میں سہل ممتنع کو پانی کر دینے والا ان کے مثل کہاں تھا۔ جڑی بوٹی سے وہ دلچسپی کہ ایک دن وہ خود بھی ختم ہو جاتے اور اپنے ساتھ کئی کو لے مرتے۔ ہوا یہ کہ بالوں کے سیاہ کرنے کا روغن تیار کر رہے تھے۔ کڑاہ چڑھائے دوائیں کوٹ کوٹ کر چمچے سے خود چلاتے جاتے تھے۔ ہم لوگ سب کے سب ارد گرد جمع سیر دیکھ رہے تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ اشعار آبدار شاہانہ دُھن میں سناتے سناتے پتہ نہیں کیا بھوگ ہوا کہ بھک سے تیزابی مادے کی طرح پورا کڑاہ جل اُٹھا۔ شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے اور شاہ صاحب اُس میں گم شدند۔ سب کے حواس جا چکے تھے۔ پھر بھی دور کھسک جانے والوں نے فوراً اسکو محسوس کر لیا اور ابھی خیالات پریشاں "حرف و صوت" کا جامہ بھی پہننے نہیں پائے تھے کہ بے نظیر شاہ ہنستے ہوئے بڑے خوش و خرم بال بال بچے بچائے ہماری طرف اطمینان دلاتے آتے نظر آئے۔ اگر وہ شاہ صاحب ہوتے تو ہم ان کے ہیولے کو بھوت سمجھ کر ضرور ان سے بھاگتے۔ اُن کی بزرگی کا ایک طرف تو پاس احترام رکھا گیا اور اپنی خفت مٹانے کے لئے دوسری طرف کیفیت مستولی کے رد عمل کو اس حد تک قبول کر لیا کہ اُن کے بچ نکلنے پر شکر خدا اور مبارکباد دیجا۔ لے ہم سب اُن پر برس پڑے کہ آپنے سب کی جانیں خطرے میں ڈال دی تھیں۔ ان کی بے نفسی کا دوسرا ثبوت لیجئے کہ اس پر وہ جی کھول کر خوب ہنسے اور فرمایا تو اسی قدر کہ بھائی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ خطرے میں تو میں خود تھا۔ دیکھا آپنے؟ ع بانوشش و نیشش یکدل این ست شرب عشق!

کئی سال تک یہ بھی شریف میری طرف سے ہوتی رہی۔ ایک سال میں نے شاہ صاحب سے اصرار کیا کہ آپ تو منظوم میلاد شریف دیجئے۔ وہاں کیا انکار تھا فتوحات کے اشعار چن کر اکٹھا کر لئے گئے اور اسی دن میلاد شریف تیار۔ دوسرے دن شاہ صاحب نے فلسکیپ کا غذ کے لمبائی میں دو دو ٹکڑے کئے۔ ان کو ایک کے نیچے ایک جوڑ کر لانبا سا "طومار" تیار کیا اس پر باریک قلم اپنے ہاتھ سے کل اشعار میلاد منظوم صاف کر دیئے۔ دفتری سے پشت کاغذ پر چاندی کے چھاپ کا ساٹن سبز رنگ چڑھوایا گیا۔ کناروں پر کرن ٹانکی گئی۔ جامع مسجد کو بقعۂ نور بنا کر جب بعد عشا منبر کا سہارا لیکر بسنتی احرام میں ملبوس شاہ صاحب نے اپنے خاص شاہانہ ترنم کے ساتھ میلاد منظوم سُنایا تو حاضرین کا عجب عالم ہو گیا تھا۔ یہ نادر و یادگار تحریر شاہ صاحب کے ایک مرید کے پاس محفوظ ہونی چاہیئے جن کو میں نے بحالت مجبوری قدرداں سمجھ کر حوالہ کر دی تھی۔ اس نظم کا اقتباس ذرا طولانی ضرور ہوگا مگر قدرشناس کیا اتنا بھی گوارا نہیں کریں گے؟ ؎

چوں سر کنم حدیثِ تو با ذوقِ اہلِ حال
کارے کنم کہ لفظ چوں معنی شود لذیذ

اچھا اب ملاحظہ فرمایئے :-

ستایش کروں میں خداوند کی — گرہ کھولتا ہے جو ہر بند کی
اُسی کے لئے حمد شایاں ہے سب — یہ قدرت اسی کی نمایاں ہے سب
نہیں بے سبب جب کسی کا ظہور — سبب بھی اسباب کا ہے ضرور

اسی کے مراحم کے نقش و نگیں — کہ فرشِ خلائق ہے جبدِ زمیں
نجومِ فلک اور اوتادِ کوہ — دکھاتے ہیں قدرت کے شان و شکوہ
سپیدہ دمِ صبح عین الفتوح — جلائے قلوب اور تنویرِ رُوح
نسیمِ سحر کی یہ اٹھکیلیاں — یہ ہر مرغِ تسبیح میں تر زباں
یہ شام و سحر سُرخ رنگِ شفق — یہ سبعًا شدادًا طبق بر طبق
یہ خورشید کا دوپہر کو جلال — یہ چار دہ کا کمال و زوال
یہ اجرام و آثار و اطوار بھی — فلک بھی، ثوابت بھی سیار بھی
یہ موسم، یہ اوقات کا اختلاف — ھوَ اللّٰہ کا آئینہ ہے کے صاف
دکھاتا ہے قدرت کے اجلال کو — بتاتا ہے گل کے خط و خال کو
کہ تعیین سب اعتباری ہے یہ — کسی اور کی اختیاری ہے یہ
یہ کہسار میں چشمہ ہائے رواں — یہ ہر نہر اس کی طلب میں رواں
یہ آبِ وصدائق، یہ حَب و نبات — منافعِ عوام و متاعِ ثقات
بلا اعتبارِ مناصب تمام — خلائق میں جاری رہی فیضِ عام
علیٰ قدرِ ادراک مانا اُسے — کسی نے نہ جز اُس کے جانا اُسے
یہی فہم معمولی و درکِ عام — حقیقت میں ہیں مُنتہائے کرام
جو آندھی چلی فکر و تحقیق کی — بہت علمِ باطن کی تشریق کی
رہی بحثِ کیفیت و مدرکات — کسی کا نہ مدرک ہوا سرِّ ذات
تفاوت جو ہے جنسِ امثال میں — پڑے اختلافات اقوال میں
ہر اک زعم میں اپنے کامل ہوا — مگر پھر بھی مطلب نہ حاصل ہوا
رہی اس کی تحقیق اب تک محال — ہیں کیا چیز یہ نفس ذہن و خیال
یہ ذی قوتِ باطنی و ظاہری — قدیم و ہیولیٰ سے دونوں بری
تو ماہیت اُن کی کھلے کس طرح — بڑھیں جو صلے فکر کے کس طرح
مگر اندرونی جو ترکیب ہے — ہمارے لئے وجہ تہذیب ہے
یہ حکمت ہے خلاقِ آفاق کی — یہی اصل ہے علم اخلاق کی
ہیں اسباب ہی موجبِ شر و خیر — نہیں کوئی معلول علت بغیر
یہ سب گم ہوں گو عالمِ ذات میں — مگر شک نہیں اعتبارات میں
اُدھر سے نہ ملتے جو ذہن و حواس — تو آتا کہاں سے یقین و قیاس
جو واجب کے جلوے سے خالی نہیں — تو ہرگز یہ عالم خیالی نہیں
وجودِ خیالات کا اعتراف — بتاتا ہے اقرارِ منکر کا صاف

جو خارج نہیں ذات سے یہ نمود
یقیناً دوامی ہے کُل کا وجود

ہوں ظاہر ہیں گو ہم تجدد گزیں
فنا استحالے سے ممکن نہیں

غرض کچھ ہو انجام و آغازِ دہر
مگر اس قدر تو کھلے رازِ دہر

یہ عالم محلِ مظاہر ہے کیوں
یہ موجود فی الخارج آخر ہے کیوں

نہ تھے جب زمان و مکاں غیر نور
کہاں سے ہوا مادّے کا ظہور

یہی داخلی خارجی مدرکات
بتاتے ہیں مقصود و منشائے ذات

جو مفہوم سے قلب آگاہ ہے
یہ ادراکِ وہبی من اللہ ہے

اگر معرفت اس کا مصقل بنی
تو یہ چھوٹی چنگاری مشعل بنی

اگر کاہلی اس کی مانع ہوئی
تو بیشک یہ تقدیر ضایع ہوئی

یہ ادراک کیا شئے ہے فی نفسہٖ
رہا اس میں حیران ہر فلسفی

نہ سمجھا کوئی جز خواصِ خدا
قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ ہے کیا

کریں عمر اس فکر میں کیوں تلف
یہ اعراض معروض ہیں کس طرف

نہ مدرک جو ہو سترِ امر و دود
ہیولے کا ہم مان لیں کیوں وجود

اگر منتزع ہوں حقایق تمام
ہیولیٰ ہے اُس وقت کس شئے کا نام

کوئی شئے جو معدوم و مفروض ہو
وہ کیا بہرِ اعراض معروض ہو

اگر مان بھی لیں ہیولیٰ ہے کیا
نہ معلوم مصداق اس کا ہے کیا

تو کیا ان قضایا سے حاصل ہمیں
ضروری نہیں سعیٔ باطل ہمیں

اگر نفس کے اپنے محرم نہیں
ہمیں خود ہیولیٰ سے کچھ کم نہیں

یہ فرضی خیالات دلاف و گزاف
ہے مجذوب کی بڑ کا آئینہ صاف

نہ ہے حکمت و صُنعِ ربِّ امیں
حقیقت کسی شئے کی کھلتی نہیں

نہیں گو معیّن قضائے خیال
احاطہ ہے اسرارِ حق کا محال

بجز اس کے کہ محسوس فی الذہن ہو
کوئی سمجھے کیا عالمِ امر کو

بتائیں یہ پابندِ ظن و قیاس
کہ تلقی ہے کیا چیز کیا ہے مساس

جو ہو ظنِ محض اور فرضی خیال
وہاں کلیہ کا اثر ہے محال

نہ ہو کلیہ تو قیامِ اصول
ہو کس طرح لے جانِ اہلِ عقول

انہیں خاص وجہوں سے اس علم کا
نہ اب تک کوئی مسئلہ طے ہوا

رہا اجتہادات ذہنی میں شک
نہ کامل ہوا فلسفہ آج تک

زمانے کے پڑنے تو چلتے رہے
اصول ان کے لیکن بدلتے رہے

ہوا مستعد اس پہ ہر ذی کمال
رہی اس کی تکمیل لیکن محال

محقق بنے گو کرام و کبار ۔۔۔ بالا جماع کچھ بھی نہ پایا قرار
تفاوت جو ہے وہ کب داوہام میں ۔۔۔ گھرے اختلافات داوہام میں
یہ حاصل ہوا کچھ بھی حاصل نہ تھا ۔۔۔ کوئی اِن میں انسانِ کامل نہ تھا
بڑے فلسفی اُس طرف کیا مجال ۔۔۔ یہی عجز ہے اس کی قدرت پہ دال
نہ جب تک ہو روح القدس کی مدد ۔۔۔ ہے بے فائدہ اس طرف جدّ و کد
یہ احساس فی الذہن و درکِ خیال ۔۔۔ ہے جلوہ گہِ قدرت ذوالجلال
تو اب فطرتاً یہ ضرورت ہوئی ۔۔۔ جہاں میں رہے فرد کامل کوئی
اٹھا دے خدا اس کے دل سے حجاب ۔۔۔ ہو القا و الہام سے فیضیاب
نہ جب تک مکمل ہوئی راہ بود ۔۔۔ مسلسل ہوا انبیا کا ظہور
یہ ظاہر ہے توریت و انجیل سے ۔۔۔ نہ تھے وہ نبی خیر کے واسطے
جو کامل ہوئی رحمت ذوالجلال ۔۔۔ محمدؐ کو بخشا گیا یہ کمال
ہوئی آپؐ کے دم سے تکمیلِ دیں ۔۔۔ محمدؐ ہوئے افضل المرسلیں
تھا جس عین کا ظلّ کلامِ رسل ۔۔۔ یہاں جلوہ گر تھا وہی عینِ کل
تھے الفاظ عینِ تمثّل تمام ۔۔۔ بنا امرِ روح القدس خود کلام
کلامِ خدا، ذات سے تھے ہوگیا ۔۔۔ یہ تاریک کوچہ بھی طے ہوگیا

سنا اہلِ ادراک نے لا کلام
محمدؐ کے منہ سے خدا کا کلام

یہاں تک تو یونہی، بنے دینا ضرور تھا کیونکہ فلسفیانہ مباحث تسلسل ہی چاہتے ہیں۔ اشعار مندرجہ بالا کے صنائع و بدائع کی تشریح طوالت طلب، اُس پر اگر رموز و نکات پر بھی اظہارِ خیال کیا جائے تو پھر تو ع شب آخر گشتہ و افسانۂ ما افسانہ ہی خیزد کا مضمون ہو کر روایتی شبِ ہجر کی طرح کبھی ختم ہونے کو نہ آئے۔ لہذا میں ایک لطیفہ اشلمے کے بعد آگے بڑھ چلوں گا۔ ۳۲ و ۳۳ کے ابیات میں "کل" کا لفظ کافی غور طلب ہے۔ اور لکھنے والے کی نادرہ کاری پر دال۔

"میلادِ منظوم" سے اب چند منتخب اشعار پیش کرتا ہے۔ بینظیر کو قرآنی آیات، احادیث کے جملوں، عربی کے فقروں کو نظم میں موزونیت کے ساتھ کھپانے میں کمال تھا۔ آیات میں تحریف نہیں کرتے تھے۔ البتہ ضرورتِ شعری کی مجبوریوں سے بسا اوقات الفاظ میں کمی بیشی یا اعراب میں کچھ تصرف روا رکھتے تھے۔ وہ بھی اس احتیاط کے ساتھ کہ مفہوم و مطالب کسی طرح بدلنے نہ پائیں۔ میں اس پر سختی سے مصر ہوں کہ آیاتِ قرآنی کا احترام انتہائی حدود تک کرنا چاہیے۔ اور اس بارے میں کسی سے رو و رعایت نہیں برتی جائے۔ ممکن ہے کہ حبک الشیٔ یعمی کا پردہ میری نگاہوں پر پڑ گیا ہو اس لئے بینظیر کی نادرہ کاری میں کوئی نقص مجھے نظر نہیں آیا۔ ورنہ یہ ممکن نہیں تھا کہ میں دانستہ ایسے اشعار منتخب کرتا جو میرے قرار دادہ اصول کو توڑنے والے ٹھہرتے۔ اس "گزارشِ احوالِ واقعی" کے بعد اشعار نذرِ ناظرین با تمکین ہیں:۔

ہے نار است ہر جا بحالِ زبوں ۔۔۔ وَاَصْحَابُ صِدْقٍ، هُمُ الْفَائِزُوْن

وہ اُدْعُوْا بِعَہْدِیْ پکارے اگر — تو مجنوں مشقت پہ باندھے کمر
ادا ہو قضا فرض و واجب کے ساتھ — محبت ہو حفظِ مراتب کے ساتھ
نہیں حق سے تعزیر کا کچھ گلہ — فَلِلّٰہِ الْحُجَّۃُ الْبَالِغَہ
یہاں بحثِ عقلی ہے بالکل فضول — اِذَا مَا تَجَلّٰی تَحَارَ الْعُقُوْل
لکھا ہے صحیحین میں جا بجا — ھُوَ الرَّدُّ مَا لَیْسَ فِیْ اَمْرِنَا

اسی منظوم میلاد کے ساتھ وہ نعتیہ قصیدہ بھی شاہ صاحب نے اسی رجبی شریف کے موقعے کے لئے دوبارہ اضافہ اشعار کے ساتھ تیار کیا تھا جس کے بارے میں میرا دعویٰ ہے کہ جہاں سے جنیظر نے ابتدا کی ہے وہاں قاآنی کا خامہ بھی نہیں ہو سکا حالانکہ اسی بحر میں انہیں ردیفی قافیوں کے ساتھ اسی موضوع نعت شریف کو لیکر اس نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ جنیظر نے نعت خوانی کا پورا حق ادا کر کے منقبت چار خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم و دوازدہ امام علیہم السلام و ہر سہ محبوبان باری تعالےٰ یعنی حضرت محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، محبوب الٰہی سلطان نظام الدین اولیا قدس اللہ اسرارہم کی مدایح لکھکر محبوبیت کو اپنے پیر و مرشد پر ختم کر کے ع غلامش جنیظر آمد بدعوائے سلیمانی لکھکر قصیدہ کو اتمام تک پہونچا دیا ہے۔ فجزاہم اللہ خیر الجزا۔ اس قصیدے کی تعریف نہیں ہو سکتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ان ھذا الا کلام البشر کہا جائے تو بجا ہے۔ الشعراء تلامیذ الرحمٰن کی تصدیق جس کو منظور ہو وہ اس قصیدے سے ع جلائے قلوب اور تنویر روح، حاصل کرے۔ جس قدر غور و خوض سے اشعار قصیدہ کا مطالعہ ہوگا اُسی قدر حُسن کاری کے عدیم النظیر نمونے ملتے چلے جائیں گے اور جنیظر کا روح القدس سے فیضیاب ہونا مصدق ہو جائے گا۔ اچھا تو۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید۔ ع بیا در ید گر اینجا بود سخندانے!

قصیدۂ نعت ومناقب

زہے آں شاہد مطلق، بملبوس سلیمانی — محمدؐ مرسل برحق، امیر بزم امکانی
بحد داخل ز حد بیروں، بکل شامل ز کل افزوں — ازل قربت، ابد مقروں، بلفرستگاہ دورانی
دمش؟ دمساز ہر ہیبت جمش؟ جرعہ کش دولت — غمش؟ مجموعۂ عشرت، بہر جمع پریشانی
وجودش؟ نقطۂ امکاں، محیط عرصۂ دوراں — قرار مرکز ایماں، مدار دور کیہانی
محبت؟ ساغر آشامش، مئے دیخانہ، ازنامش — خم روح القدس جامش، شرابش روح یزدانی
بہ تیرہ خاکداں، نورے۔ تجلائے بہر طورے — بہر ویرانہ، معمورے۔ بہر دل فیض لمعانی
بکوئے او چو بنشیند، کسے تا دوئے او بیند — پر جبریل بگزیند، بفرق او مگس رانی
دلایش آیۂ رحمت، جہاں را مایۂ عشرت — کہ خاکش؟ سایۂ دولت، ردیفش، ظل سبحانی
نگار حسن روز افزوں، بہار گلشن بیچوں، — قرار ہر دل محزوں، نشاط ہر گراں جانی
وجودش سرور عالم، شہودش نیر اعظم، — درودش مفخر آدم، نبی انسی وجانی
بستی و طرب کو شم، مئے یادش ہمی نوشم، — ز نوشانوش در جوشم از نم تا کوس خاقانی

چوں زنگی، اسم زیبالیش، بہ وہ برلب لبود لیش — نثار رنگ بہ بالیش، بود لعل بدخشانی
زہے مہر درخشندہ، بہ بام اوج تابندہ — بر اوجِ بام پایندہ، بحشمت ہائے سلطانی
کمالش ہمعنانِ حق، جلالش خود نشانِ حق — مقالش داستانِ حق، بہ تفصیلاتِ حقانی
چہ لطفش؟ جزو کُل اودا، بہ تبعیت رسل اودا — چہ عقلش؟ عقلِ کُل اودا بود طفلِ دبستانی
چو آں مخفی عیاں آمد، جمالش درمیاں آمد — جلالش دیدیاں آمد، بشمشیرِ نگہبانی
سرِ آب بقا دارم، ہوائے آشنا دارم — محمدؐ ناخدا دارم، چہ باک از موجِ طوفانی
محمدؐ مدعائے من، محمدؐ ناخدائے من — بیادش بودہائے من بہ شورآباد وجدانی
خدا یش خود ثنا گفتہ، یدش دست خدا گفتہ — رسولِ حق نما گفتہ، خوشا مقصودِ ایمانی
چہ نامش مصطفیٰؐ زیبد، چہ محبوبِ خدا زیبد — ثنائے او چہا زیبد، باخلاصِ خوش الحانی
شجر ہا میوہ بار آرد، ثمر ہائے بہار آرد — گہر ہا شاہوار آرد، کعبِ او بر نیسانی
دُرِ یک دانہ در قلزم، بدیدہ صورتِ مردم — بگرد دل حیرتِ انجم، رہش را ذرّہ فانی
خیالش چوں بسر آید، زمانِ غم بسر آید — بجودش مختصر آید، طنابِ حرصِ طولانی
کمش افزوں جہانے را، سمش تریاق جانے را — غمش ہر ناتوانے را، دہد زور نریمانی
ہزاراں سرِ عیاں بینی، نمایاں نورِ جاں بینی — دمِ جاں را رواں بینی، بفرشش عینِ اعیانی
جمال آرا جلال او، کمال افزا خیال او — زسیلابِ نوالِ او، ہمہ را جوششِ طغیانی
ز جامش قطرہ خوردہ، مسیحا شد دلِ مردہ — بہ بیہوشی سبق بردہ، ز حکمت ہائے لقمانی
خدا را مصطفیٰؐ داند، کسے وصفش چہا داند — خدا را خود خدا داند، نہ ذہنِ انسی وجانی
چو اورا کے تواں گفتن، ز خاکش کے تواں گفتن — ثنائش کے تواں گفتن، گزارم فرضِ ایمانی
اَلَا اِذْ جِئْتَ اَوَّابًا، تَجِدْهُ الْاٰنَ تَوَّابًا — حقیقت را اگر یابا، نہ من دانم نہ تو دانی
چو عشقش گشتہ جانِ من، نماندہ خود نشانِ من — زبانِ او زبانِ من هُوَ اَلْاَفْصَحُ وَ لَا ثَانِی
بہ ارض و سما نازد، جلال و کبریا نازد — محمدؐ را خدا نازد، من ولاف ثنا خوانی
حقیقت را وجود از وے، ہویت را شہود از وے — محبت را نمود از وے، رواں را کیفِ وجدانی
قضا ترسندہ جاہش را، قدر جویا پناہش را — یکے آمد نگاہش را، چہ دشواری چہ آسانی
مزارش روضۂ خرم، دیارش جنتِ عالم — جوارش ہر مسیحا دم، شہیدِ بوئے ریحانی
امیدِ بخششِ عامش، برید پرسشِ کامش — نویدِ گردشِ جامش، کلیدِ عیشِ روحانی
جمالش مَنْ رَاٰنِیْ گو، جلالش لَنْ تَرَانِیْ خو — کمالش تشنہ کامی جو، خیالش موجِ عرفانی
اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صدرک، بہ تسکینش بخواں ذکرک — علوئے شانِ او ذکرک، بحدثِ امرِ اعلانی
چو در رویش نہاں بینی، جمال اللہ عیاں بینی — بچشمِ جہاں بینی، ہمہ علمِ خدادانی
زہے مرسل زہے شانش، بحق آل و یارانش — خداوندا پئے جانش، نجاتم باد ارزانی

چہل و یک اشعار مندرجہ بالا کے بعد باقی ہی کیا رہ جاتا ہے کہ اب بیان معراج شریف کے کام میں لایا جائے۔ مگر یہ ہمارا اندازہ ہے۔ مبدءِ فیاض کا خزانۂ عامرہ بھی کہیں خالی ہوتا ہے؟ بقول حضرت بیدم "شکوۂ کوتاہیِ داماں، ممکن ہے مگر اُدھر سے کمی نہ کبھی ہوئی نہ کبھی ہو۔ صدق طلب و خلوص مطلب درکار ہے۔ پھر ع کمی کیا ہے مولیٰ کے دربار میں!

بیانِ معراج شریف

زہے سیاحِ عرش آرا، کہ سبحان الذی اسریٰ — فاوحیٰ ربّ ما اوحیٰ، باطلاقِ ہمہ دانی

برفت و شادماں آمد، بہ گنجِ بے کراں آمد — ہمہ آرامِ جاں آمد، باشالِ جہاں بانی

ہمہ و تنہا کہ پیش آمد، بر ہمہائے خویش آمد — ہم از اندازہ بیش آمد، بکف نقدِ فراوانی

مکانِ لامکاں آمد، نشانِ بے نشاں آمد — ضمانِ ہر زماں آمد، بارشاداتِ ربانی

شہِ کرد بیاں آمد، بہ عرش آشیاں آمد — رہِ حق را نشاں آمد، بشعلہائے نورانی

کلامش وحیِ حق آمد، ہدایت را سبق آمد — ادب را مستحق آمد، خبر چوں نصِ قرآنی

خدا را ترجماں آمد، حقایق داستاں آمد — معانی را بیاں آمد، بیاں را سرِّ پنہانی

باحکام و حِکَم آمد، حِکَم را خود حَکَم آمد — کرا سیف و قلم آمد، براتہائے خاقانی

مرکب را بسیط آمد، بسائط را محیط آمد — لطایف را خریطہ آمد، رُسُل را مہرِ سلطانی

اشعارِ قصیدہ ناظرین کے مطالعہ میں آچکے۔ معانی و بیان کی خوبیاں بالتشریح لکھی جائیں تو دفتر کا دفتر تیار ہو جائے۔ صرف نشستِ الفاظ اور ان کو قرأت کرنے میں جو آہنگ داؤدی پیدا ہوتا ہے۔ اسی پر اکتفا کی جائے، تو عالم دعای دو دوں کی دعوتِ عام ثابت ہو۔ ممکن ہے دو چار اشعار کسی کو ایسے نظر آئیں جن کا شامل انتخاب ہونا محلِ نظر ٹھہرے ورنہ جو شعر بھی ہے جانِ سخن ہے۔ بارگاہ نبوت میں درود و سلام متکاثر پیش کرکے دیکھئے کہ بینظیر کس راستے سے دربار خلافت راشدہ کا رخ کرتے ہیں:۔

محمد داور اوّل، محمد جوہر اوّل — محمد مظہر اوّل، ابوبکر ہو الثانی

"ثانی اثنین اذ ہما فی الغار" کی تلمیح کتنی بے ساختہ، بے تکلف اور نادر اندازِ بیان کے ساتھ کی گئی ہے۔ واقعی اعتراف کے قابل ہے۔ بینظیر تفضیلیہ نہیں تھے مگر اہل طریقت میں حضرت مولیٰ کرم اللہ وجہہ جس طرح مانے جاتے ہیں اس کو جانتے ہوئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں ہے اگر مدحت خلیفہ چہارم میں اشعار کی تعداد زیادہ ہو۔ تیرہ خانوادہ ہائے طریقت جس کے دم سے قایم ہوں اس کے متعلق کیا غلط ہے جو بینظیر رخصتِ شاعری سے کام لیکر عجیب ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے کہتے ہیں:۔

جہانے مست از جامش علی نامِ خدا نامش،
نصیری بندۂ خامش، خدا گوید بنادانی!!

اس "خدا گوید بنادانی" کا کیا جواب ہو سکتا ہے؟ اسی طرح جب امامت کے مسند نشینوں کو نام بنام خراجِ عقیدت پیش کرنے پر آتے ہیں تو حضرت امام حسین علیہ السلام کی شان میں کہتے ہیں ؎

چوں عہدِ شورشین آمد، ادائے فرضِ عین آمد — بالیقین حسینؑ آمد، شہیدِ نازِ ربانی،

"شہید ناز ربانی" کا بھی جواب میری نظر سے نہیں گزرا ہے - عجیب و غریب بات بےنظیر کے قلم سے نکل گئی ہے۔
اُس زمانہ قیام میں کتنے ہی قصائد فارسی بجواب اساتذۂ قدیم سننے میں آئے تھے - کون جانتا تھا کہ حیدرآباد دکن سے باغ رضواں کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں - اور اکثر مسافر اِدھر سے اُدھر بھٹک کر چلے جاتے ہیں - اس کی خبر ہوتی تو مجموعۂ کلام ہی روک رکھتا - اب تو یہ خیال بھی "مشتے بعد از جنگ" ہے - بیس برس بیت گئیں - دُنیا نے کیسے کیسے انقلاب دیکھے - کیا پتہ کس کا کیا حشر ہوا - کلام بےنظیر کتنا باقی بچا، کتنا ضائع ہوا - اسی لئے تحویل حافظہ میں جو بچے کچھے اشعار ہنوز موجود ہیں - پہلے انہیں کو قلمبند کئے دیتا ہوں۔
ایک قصیدے کے دو اشعار:-

محبت کر آتش بجاں انگند — مرا شہید اندر دہاں انگند
چوں اکنوں منم یکّہ تازِ سخن — کہ باشد کہ با من عناں افگند

ایک قصیدے کا صرف مطلع یاد ہے - فرماتے تھے محبوب بادشاہ دکن کے ابتدائی عہدِ حکومت میں رمضان المبارک کے عدم احترام سے متاثر ہو کر قلم اٹھایا تھا - بلفوائے "آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد" اپنے مقصد کے اعتبار سے قصیدہ پوری طرح سے کامیاب رہا - احکام ضروری بالفور صادر کئے گئے ؎

الا کہ حرمتِ ماہِ صیام باید کرد — عیاں نماز و نہاں شربِ جام باید کرد

ایک غزل کا یک مطلع بھلائے نہیں بھولا ؎

زورِ بیکاں ساتھ اپنے لے اڑا نخچیر کو!
اب میں اپنے دل کو ڈھونڈھوں یا تمہارے تیر کو؟
بعد میرے ایک بھی مجنوں نظر آتا نہیں
کس کے سر ماروں میں اپنے پاؤں کی زنجیر کو

اس قدر پامال طرح میں سب سے الگ اچھوتے انداز کا مطلع کہہ دینا بےنظیر ہی کا کام تھا۔
ایک مطلع اور یاد آگیا - اس غزل کے اشعار بہت تھے - کاش حوادث نے حافظے پر ڈاکہ نہ ڈالا ہوتا ؎

کیفیت مے کا تری مستانہ ادا ہو جانا
مے پرستی کا اُسی دن سے روا ہو جانا

اسی زمین میں انہیں قوافی و ردیف کے ساتھ تو بہتوں کی غزلیں سنے بیٹھا ہوں مگر اس مطلع کا رنگ مضمون کسی سے ملتا نظر نہ آیا - سر راس مسعود مرحوم بیرسٹر ہو کر پٹنہ میں پریکٹس (وکالت) کرنے آئے تھے تو ممدوح سے اکثر ملنا ہوتا تھا - وہ بےنظیر شاہ کے کلام کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے - چنانچہ اپنے "انتخاب زریں" میں انھوں نے بےنظیر شاہ کو بھی مشاہیر میں گنا ہے - "انتخاب زریں" سے چیدہ اشعار غزل حسب ذیل قابل مطالعہ ہیں اور بےنظیر کے خاص رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں:-

ترے رُخ پہ چشم کر نظر رہ گئی — بہی ہم سے اڈ ختہ گرہ گئی
اِدھر رہ گئی یا اُدھر رہ گئی — وفا کی شکایت مگر رہ گئی

ازل میں مرا انجام لکھا گیا
شبِ غم کی لیکن سحر رہ گئی

نہ کچھ بھی رہا تو بھی سب کچھ رہا
تری یاد دل میں اگر رہ گئی

کبھی کہہ دیا تھا کہ مرتے ہیں ہم
شکایت انہیں عمر بھر رہ گئی

تری شامِ گیسو کی خوشبو کہاں
گلوں تک نسیمِ سحر رہ گئی

غنیمت ہے جس کو عداوت نہ ہو
محبت بس اب اس قدر رہ گئی

بڑی خیر گزری کہ اے شبِ آہ
انہیں ہوتے ہوتے خبر رہ گئی

خدا جانے آنکھوں میں اب کیا رہا
نظر تو ترے بام پر رہ گئی

نہ توڑا انہیں غیر سے بینظیر
محبت میں اتنی کسر رہ گئی

۲

نہ رہے اکیلے جنوں میں بھی یہ تلاشِ ہمسفری رہی
خرد و حواس جو چل بسے تو جنوں میں بے خبری رہی

ہوئے پھول خشک چمن جلا، کہیں نام کو نہ تری رہی
یہی اپنے زخم ہرے رہے، یہی پیتی آنکھ بھری رہی

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل گئے
یہ مری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

بڑی احتیاط طلب ہے یہ جو شراب ساغرِ دل میں ہے
جو چھلک گئی تو چھلک گئی جو بھری رہی تو بھری رہی

مری فردِ جرم کو دیکھ کر یہ خیال تھا کہ اٹھے نظر
یہی ایک شکلِ امید تھی وہی آج تک نظری رہی

رہے باخبر تو نہ یہ کھلا کہ مآل و غایتِ عشق کیا
ہوئے بے خبر تو خبر ہوئی کہ خبر سے بے خبری رہی

مجھے پاسِ وضع ضرور تھا یہ کمالِ عقل و شعور تھا
مری پردہ پوش جنوں میں بھی مری حق پردہ دری رہی

وہ ہزار دِیپ کہیں رہا، وہ ہزار پردہ نشیں رہا
وہی بینظیر حزیں رہا، وہی اس کی جلوہ گری رہی

۳

کیوں اس قدر جہان کی خاطر پہ بار ہوں
تیرا فراق ہوں نہ ترا انتظار ہوں

برباد ہو کے بھی مجھے اچھی جگہ ملی
دل سے ترے نکل نہ سکا وہ غبار ہوں

آئے ہیں بدلیوں کے دل آ شوقِ میکدہ
گھوڑے پہ میں ہوا کے ابھی سے سوار ہوں

چھایا ہے سارے باغ پہ رنگِ فغاں مرا
اس سے غرض نہیں کہ خزاں ہوں بہار ہوں

ساقی جو پی ہو غیر کے ہاتھوں سے تو حرام
رندی میں بھی یہاں ہے پرہیزگار ہوں

ساقی وہ آفتاب چھپا، وہ اذاں ہوئی
مے جلد بھر کے جام کہ میں روزہ دار ہوں

زخمی تڑپ رہا ہوں مگر آہ بینظیر
یہ بھی خبر نہیں کہ میں کس کا شکار ہوں

۴

نہ ہوا بنی آنکھ جو حسن بیں تو جہاں میں کوئی حسیں نہیں
جو وہ غزنوی کی نگاہ ہو وہی صنم ہے زلفِ ایاز میں

یہ جہاں نہیں یہ ہے آئینہ، ہے تصورِ ہمہ، دا ہمہ
وہی جلوہ آئینہ ساز کا ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

ہمہ تن تصورِ دید ہوں، طرب آشنائے نوید ہوں
کہ ترانہ کش ہیں خموشیاں مرے دل کے پردۂ ساز میں

مرے جرم کیا ہیں گناہ کیا، تری شانِ لطف پہ میں فدا
کہ جلال میں بھی کمی نہیں ترے عفوِ بندہ نواز میں

تو چراغِ دیر و حرم سہی، تجھے کیا پڑی ہے جو تو سنے
کہ تمام رات بسر ہوئی ہے کسی کی سوز و گداز میں

پسِ مرگ دادِ وفا ملی، یہ مرادِ دستِ دعا ملی
کہ تری وفا نے اٹھائے مرے پھول دامنِ ناز میں

نہ عروج کچھ نہ نزول ہے، یہ خیال وہم فضول ہے
جو بلندیاں ہیں نشیب میں وہی پستیاں ہیں فراز میں

دلِ زار ہند میں کیوں ڈرے، مجھے دفن کوئی کہیں کرے
مری خاک بھی، مری روح بھی ترے در پہ ہوگی حجاز میں

جو بنا یہاں وہی مٹ گیا، جو مٹا یہاں وہی بن گیا
یہی منظرؔ رواج ہے رہِ عشق شعبدہ باز میں

۵

یہ مانا کوئی حد ہوس کی نہیں
محبت مگر اپنے بس کی نہیں

کوئی رہ گیا ہے پسِ قافلہ
یہ نالے، صدائیں جرس کی نہیں

مرے بال پرواز ٹوٹے ضرور
مگر تیلیاں بھی قفس کی نہیں

نہ ٹوٹے گی مر کر بھی یہ قیدِ عشق
یہ زنجیر تارِ نفس کی نہیں

محبت کو تسکین سے کیا غرض
ضرورت ہی فریادرس کی نہیں

بس اے ضبطِ گریہ بس اے ضبطِ آہ
کہ برداشت اتنی اُمس کی نہیں

یہ دنیا نہیں قابلِ اعتبار
اگر ایک کی ہے تو دس کی نہیں

ازل سے کسی کا ہوں میں منظرؔ
یہ الفت برس دو برس کی نہیں

۶

ترے غم نے یہ دن دکھایا مجھے
کہ مجھ سے بھی آخر چھڑایا مجھے

ستم کرتے مل کر تو پھر لطف تھا
جدائی میں کیا آزمایا مجھے

نہ دیکھا کچھ اُن میں بجز اندازِ جور
مگر وہ بھی کیا تھا جو بھایا مجھے

۷

یہ کس سے ملے ہیں وہ خلوت میں آج
اشارے ہیں کچھ اہلِ اسرار میں

ملے گا کسی دن خریدار بھی
جو یوسف کو لائے ہیں بازار میں

بس اب خانہ آباد اے رنجِ ہجر
بہت دن رہے تیری سرکار میں

خدا جانے کیا اُس صنم نے کہا
گرہ دی برہمن نے زنار میں

پھرے مدتوں دشت وحشت میں ہم — پر اُلجھا نہ دامن کبھی خار میں

کہاں تک ہوا و ہوس بینظیر

ازل سے ہے ضد عشق و انکار میں

۸

محبت کا جذب و اثر دیکھئے — وہ خود لینے آئے خبر دیکھئے

وہ آخر ملے بات کی بات میں — وہ طول اور یہ مختصر دیکھئے

نہیں کھولتے آنکھ کیوں بینظیر

وہ آتا ہے کوئی ادھر دیکھئے

۹

دعا میں رہے سوزِ جانکاہ بھی — اثر کا اثر، آہ کی آہ بھی

وہاں آنے جانے سے مطلب یہ ہے — نکل آئے شاید کوئی راہ بھی

خدا جانے کس پر ہے تیری نظر — گدا بھی ترے در پہ ہے شاہ بھی

کرے کیا مسیحا دردِ دل کا علاج — کوئی دردِ دل سے ہو آگاہ بھی

اُسی کی ہے قسمت کہ جس کی مراد — ملے اور پھر حسبِ دل خواہ بھی

۱۰

خدا ہی کرے اس کی مشکل کو سہل — جو مرتا نہ ہو اور مرتا بھی ہو

محبت ہی میں اک یہ اعجاز ہے — کہ جیتا ہوا شخص مرتا بھی ہو

قیامت ہے اس کی ادا دیکھنا — پھر آئینہ رکھ کر سنورتا بھی ہو

تغافل کا اُس سے گلہ کیا کریں — جو اقرار کر کے مکرتا بھی ہو

وہ کیوں عشق کا نام لے بینظیر

جو بدنام ہونے سے ڈرتا بھی ہو

۱۱

جفا پر وہ نازاں پشیماں ہم — اک انسان وہ ہیں اک انسان ہم

نہیں رکھتے دامن گر اے جنوں — نچوڑیں گے تیرا گریبان ہم

کہاں جائیں گھر چھوڑ کر اے جنوں — اسی کو بناتے ہیں میدان ہم

شبِ غم، سحر تک تڑپتے رہے — اذاں پر لگائے ہوئے کان ہم

کوئی آئے بھی اب تو کیا بینظیر

گھڑی دو گھڑی کے ہیں مہمان ہم

ابیات

ستم دیکھکر یا کرم دیکھکر ——— غرض مرتے کچھ تو ہم دیکھکر
پہونچ جائیں اس در پہ اب دم کہاں ——— ہماری تمنا کہاں، ہم کہاں
وہ میرا سوال اور آنکھوں میں آنسو ——— وہ گھبرا کے منظور کرنا کسی کا
بتو میں اور جاؤں سوئے کعبہ ——— خدا میرے تمہارے درمیاں ہے
کون لے جائے مجھے اس بے خبر کے سامنے ——— رات دن رہتا ہی جو میری نظر کے سامنے

رنگ تغزل تو نظر سے گزر چکا۔ ناظرین کے آگے اب بالکل دوسری صنف سخن کے نمونے لائے جاتے ہیں۔ موقعہ یہ ہے کہ ندوۃ العلماء کا کوئی خاص جلسہ تھا جس میں یہ مسدس "المنظام معروف بہ چہل بند بے نظیر" اہل علم و بصیرت نیز اکابر ملت کو سنایا گیا تھا۔ اور جیسا چاہیئے تھا مصطلحات عقول عشرہ کا بدیع استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ بعض بند عام فہم نہیں ہے جیسا کہ پہلے ہی بند کے مطالعہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے:۔

زہے نتائج اعمال قوت نظری ——— محرکات سراپردہ ہائے بے خبری
مظاہرات مجاز بصائر و بصری ——— مصدقات بطون مظنۂ بشری
مصورات محالات و ممکنات ہیں یہ
مکاشفات و مناظر کی کائنات ہیں یہ

فاران کے ناظرین میں خاصی تعداد ایسوں کی ہوگی جن کے لئے مندرجہ بالا اور اسی قبیل کے بند خراش دماغ کا باعث نہیں ہو سکتے مگر پھر بھی ایسے ناظرین کا خیال ضرور رکھنا چاہیئے جو ع پیادہ میروم و ہمرہاں سوار انند۔ کہہ سکتے ہوں، اس لئے سوائے اس محولہ بالا بند کے جو بطور نمونے لیا ہے۔ ذیل کے انتخاب میں عموماً میں نے سہل ممتنع یا اسی کے قریب قریب عام فہم اشعار چن کر رکھے ہیں۔ اور یہی شاہ صاحب کا مخصوص طریقہ بھی تھا کہ رموز و غوامض روحانی و مابعد الطبیعاتی ہوں یا نکات فلسفہ اپنے طرز بیان میں ان کو پانی کی طرح رواں اور قند و نبات کی طرح گوارا بنا دیتے تھے۔ اس کا ایک نمونہ میلاد منظوم میں مطالعہ ہو چکا ہے اس سے بڑھ کر اس مسدس میں منیظر شاہ کامیاب نظر آئیں گے:۔

جہاں میں علم و خرد کی جو قصہ خوانی ہے ——— مشاہدات و تجارب کی سب کہانی ہے
عطاء جود خدائے قدیر کے صدقے ——— کمال عقل ترقی پذیر کے صدقے
مشاہدات میں عقل ذلیل کو کیا دخل ——— یقین اجر میں صبر جمیل کو کیا دخل
وجود فیصلہ میں قال و قیل کو کیا دخل ——— امور پیش نظر میں دلیل کو کیا دخل
اسی کی شان ہے صورت پذیر اسما میں ——— اسی کے امر کی تصویر چشم بینا میں
اسی کے حکم کے نقش و نگار دنیا میں ——— اسی کے عزم کی نیرنگیاں تماشا میں
قدیم و عالم و قادر، صفات ہیں اس کے
بری جہت سے مگر سب جہات ہیں اس کے
اسی کے عزم کی یہ سب شگوفہ کاری ہے ——— صفات و ذات میں تمیز اعتباری ہے
یہ انتظام، یہی فطرت الٰہی ہے ——— بلا تغیر و تحویل حکم شاہی ہے

بڑا فریضہ یہی ہے کہ اس کو پہچانے　　نظامِ امرِ الٰہی کو آدمی جانے
خلاف اس کے نہ دل میں کسی طرح ٹھانے　　یہ علم، علم ہے دیگر علوم افسانے

خدا کی دین ہے جس کو یہ چیز مل جائے
تمیزِ حُسن کہ حُسنِ تمیز مل جائے

وہاں کرم ہو، کرم کی جہاں ضرورت ہو　　وہاں ہو قہر جہاں قہر عین رحمت ہے
وہاں سکوت ہو جس جا سکوت نعمت ہو　　وہاں بیان ہو، واجب جہاں ہدایت ہے

کوئی محیطِ ازل سے نکل نہیں سکتا
نظامِ ناظمِ قدرت بدل نہیں سکتا

خلل پذیر نظامِ جہاں نہیں ہوتا　　خلافِ وقت و محل کچھ یہاں نہیں ہوتا
جو چاہتا ہو کوئی وہ کہاں نہیں ہوتا　　فقط عدم ہو جہاں کچھ وہاں نہیں ہوتا

کبھی نہ ہو سکے ایسا کوئی خیال نہیں
خیالِ اہلِ جہاں حاملِ محال نہیں

حواسِ خمسۂ ظاہر کی حِس تو پیدا ہے　　حواسِ باطن و پنہاں کے آگے پردہ ہے
وہاں مشاہدہ غایب، یہاں تماشہ ہے　　وہ کام میں، یہ معطل ہیں، یہ غضب کیا ہے

خیال میں نظر آتی ہیں جس قدر شائیں
اسی نظر کو انہیں دیکھ لیں تو ہم جانیں

ہوائے سیر میں ہمت دلیر ہوتی ہے　　فقط حجاب کے اٹھنے کی دیر ہوتی ہے

تعلقات میں اس کی تمیز واجب ہے　　ہمیں جو کھینچ رہا ہے وہ ہم پہ غالب ہے

اسی گروہ سے خدمت پہ جو ہوئی مامور　　رسول اور نبی کہہ کے وہ ہوئے مشہور
قریب تھے وہ خداوند سے خودی سے دور　　انہیں کے دم سے منور ہر ایک مشعلِ نور

وہ فیضیاب تھے ہر وقت ذاتِ مطلق سے
بلا جواز نہ سے، یقیناً وہ مل گیا حق سے

وہ عاشقانِ الٰہی کے شمعِ محفل تھے　　وہ کاروانِ محبت کے خضرِ منزل تھے
نجومِ اوجِ ولایت تھے، ماہِ کامل تھے　　ادھر جہاں سے اُدھر وہ خدا سے واصل تھے

رچے ہوئے تھے ازل سے وہ رنگِ حق میں
یہی وہ لوگ تھے انساں جو تھے حقیقت میں

اُسی گروہ کے سردار احمدِ مرسل　　ظہورِ آخر و امرِ تجلّیِ اوّل
وہ آفتابِ رسالت وہ صدرِ بزمِ ازل　　تمام خلق سے لاریب اشرف و افضل
سے خدا وہ شہِ بے نظیر مل جائے　　کہ جس کے ملتے ہی تو اسے قدیر مل جائے

اب صرف مثنوی کی صنف باقی رہ گئی ہے۔ اسی کے ذریعہ بینظیر شاہ کو شہرت حاصل ہوئی تھی۔ سب سے اوّل مثنوی "الکلام یعنی جواہر بینظیر و کتاب مبین" ۱۳۰۸ھ میں مکمل ہوئی تھی جو مطابق ۹۱-۱۸۹۰ء ہے۔ اگر سر راس مسعود مرحوم کا بینہ سن لات صحیح مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس مثنوی کا تکملہ شاہ صاحب اٹھائیس انتیس سال کی عمر میں کر چکے تھے۔ یہی نہیں بلکہ یہ کہ دیوہ شریف سے اپنا تعلق ظاہری منقطع بھی کر چکے تھے۔ اور حضرت شاہ غلام جیلانی صاحب سجادہ نشین بانسہ شریف سے خلافت بھی حاصل ہو چکی تھی۔ راقم الحروف جو ۱۹۱۱ء تک بینظیر شاہ سے روشناس نہیں تھا اس کی وجہ یہی تھی کہ وارثیوں میں وہ نیک نام نہیں تھے۔ یہ بھی عجیب واقعہ ہے کہ باوجودیکہ بینظیر شاہ بیعت وارارت سے دست بردار تک ہو گئے تھے اور احرام اتار کر معمولی لباس بھی پہننے لگے تھے۔ مگر اس پر مستقل مزاجی سے وہ قایم نہیں رہ سکے۔ احرام بھی دوبارہ اختیار کر لیا۔ اور مریدین کو شجرہ جو دیتے تھے اس میں اپنا واسطہ دیوہ شریف ہی کا لکھ کر دیتے تھے۔ ممکن ہے کسی کو اپنے والد ماجد یا شاہ غلام جیلانی کے سلسلہ میں مرید کیا ہو مگر مجھے ایسے کسی مرید کی واقفیت نہیں ہے۔ بہرکیف مثنوی زیر نظر کے اندر اس کا کافی ثبوت مل سکتا ہے کہ اچھے خاصے کہنہ مشق کی کہی ہوئی ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ اسی مثنوی کی تیاری میں بینظیر کو سہل ممتنع کی مشق بہم پہونچی۔ چنانچہ بحر خفیف کی اُن کی غزلیں جو زیادہ کامیاب ہیں اس کو ثبوت میں لیا جا سکتا ہے۔

مثنوی کی ابتدا میں جو حمد لکھی ہے اس میں سورۂ فاتحہ کے ابتدائی جملے اور خاتمہ کے لفظوں کو شامل کر کے ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے:-

پلا ساقیا راح فضل و کرم　　اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ النِّعَمْ
نہیں کوئی اُس کا شریک و کفو　　ھُوَ الْمُغْنِیْ لَا نَظِیْرَ لَہٗ
رحیم اور رحمٰن و فرد و خبیر　　وَصَمَدٌ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر
وہ باقی ہے غیر اس کا معدوم ہے　　احد ہے وہی حیّ و قیوم ہے
ھُوَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ مَنْ　　اَللّٰہُ اِلٰہُ الْعٰلَمِیْنَ حَکَمُ الزَّمَنْ
وہ ہے مالک یوم دین حساب　　ھُوَ الْمُسْتَعَانُ اِلَیْہِ الْمَاٰب
فَقُلْ اِھْدِنَا یَا غَنِیُّ الْاَکْمَلِیْن　　صِرَاطَ الرَّسُوْلِ وَلَا الضَّآلِّیْن

اب میں مثنوی کا وہ اقتباس نذر ناظرین کرتا ہوں جو مجذوب صاحب کی زبانی سنا کرتا تھا:-

بہار صبح

پلا آج ساقی صبوحی مجھے　　کہ حاصل ہو تا قوت روحی مجھے
کروں غرغرہ آب کوثر سے آج　　اٹھوں نشہ آلود بستر سے آج
وہ مے ہو پیوں جس کو سُن کر اذاں　　برنگ دعائے سحر ہوں رواں
ستارے جو چھٹکے تھے افلاک پر　　وہ آتے ہیں اب جا بجا کچھ نظر
نہ وہ چشمکیں ہیں نہ وہ شوخیاں　　نہ وہ جگمگے ہیں سر آسماں
فراہم جو پہلے تھے انگور سے　　نہ اک اک کو تکتے ہیں اب دُور سے

سحر کا سپیدہ بھی ہے کیا غضب
چھپے جاتے ہیں پردۂ شب میں سب

ہوئی صبحِ خنداں جو پرتو فگن
پریشاں ہوئی چرخ کی انجمن

ریاضِ سحر میں جو پھولی شفق
ہوا رنگ تاروں کا یک بار فق

سحر کا جو دھڑکا ستانے لگا
فلک اپنی افشاں چھڑانے لگا

سنی بادِ صبحِ چمن کی جو دھوم
کئے گل فلک نے چراغِ نجوم

ستارے جو تھے زیبِ بزمِ فلک
چمکتی تھی جن کی اک اک دم پلک

وہ ایک ایک کر کے روانہ ہوئے
سحر ہوتے ہی سب فسانہ ہوئے

مگر کچھ وہ ہیں رنگ تزئینِ صبح
چنے گا انہیں دم میں گلچینِ صبح

سو وہ بھی ہیں کچھ جھلملاتے ہوئے
ندامت سے آنکھیں چراتے ہوئے

ستارے جو باقی رہے خال خال
نہ ان کا رہا کچھ کسی کو خیال

جو تل کی طرح جابجا پا گیا
انہیں چُن کے مرغِ سحر کھا گیا

فلک پر وہ کچھ روشنی صبح کی
وہ ہلکی سی مہتاب کی چاندنی

جو نجمِ سحر بھی لجانے لگا
قمر اپنا بستر اٹھانے لگا

چڑھائی تھی مہتاب گردونِ رات
اُسی کے یہ سب پھول تھے بے ثبات

نظر کی جو گردوں کی منظرگاہ پر
ہوائی سی چھٹنے لگی ماہ پر

شفق میں ہے جو رنگِ صبحِ اُمید
ہوا جاتا ہے چہرۂ مہ سپید

کیا کارواں نے نہ شب کو مقام
پسینے پسینے تھا اس سے تمام

ستارے جو تھے جلوہ گر چرخ پر
پسینے کے قطرے تھے وہ سر بسر

فلک سے یہ سب گوہرِ بے شمار
کئے فرقِ صبحِ طرب پر نثار

گرے صورتِ اشک جو خاک پر
وہ شبنم کے قطرے بنے سر بسر

یہ سب مشتری ہو گئے جب نہاں
بڑھائی قمر نے بھی اپنی دکاں

سحر کا عمل حسبِ مرضی ہوا
خطِ کہکشاں خطِ فرضی ہوا

اصول اس کے موضوعہ جتنے تھے سب
ثبوتِ سحر کے ہوئے وہ سبب

ضیا صبح کی پھیلی اطراف میں
شبِ ہجر جا کر چھپی قاف میں

شفق پھول کر رنگ لانے لگی
نئی آگ دل میں لگانے لگی

کھڑی ہے الگ شمع بھی کیا اداس
پتنگوں کے کچھ ڈھیر ہیں آس پاس

ہوئی دل جلوں کے یہ غم میں تباہ
کہ اٹھنے لگا فرق سے دودِ آہ

تمام اس کی ترکی جو بالکل ہوئی
سحر ہوتے ہی شمع بھی گل ہوئی

نمایاں ہوئے خوب آثارِ صبح
جہاں میں ہوا گرم بازارِ صبح

ہوا صبح صادق کا جس دم یقیں — تو بستر سے اُٹھنے لگے نازنیں
کوئی شاخِ گل کی طرح جھومتا — اٹھا کوئی ساغر کا لب چومتا
اٹھا کوئی سرگرم حمد و سپاس — کوئی نیند کے جھونک میں بدحواس
اٹھے شہر کے زاہدِ حق پرست — اٹھے رندِ میخانہ ساغر بدست
شبِ ہجر سے ڈرنے والے اُٹھے — شبِ وصل پر مرنے والے اُٹھے
اٹھے رہ نشینانِ کوئے بتاں — اُٹھے ساکنانِ درِ دلستاں
کسی کو کوئی گدگداتا اُٹھا — کوئی منہ چھپا کر لجاتا اُٹھا
گجر صبح کا غل مچانے لگا — جو سوتے ہیں اُن کو جگانے لگا
نہ جاگا پر اس پر بھی بختِ عدو — بنا جا کے سبزہ لبِ آبجو
اذانوں کی آواز آنے لگی — دعا تا سرِ عرش جانے لگی
ہوا جس گھڑی کم اذانوں کا شور — اٹھا دیر سے بید خوانوں کا شور
طیور آشیاں سے نکلنے لگے — سمن بُو روش پہ ٹہلنے لگے
رخِ لالہ کو اوس دھونے لگی — شفق رشک سے خون رونے لگی
گُل اندام کپڑے پہننے لگے — پری چہرہ بن ٹھن کے تننے لگے
یہ اٹکھیلیوں پر نسیم سحر — کہ آتے ہیں جھونکوں پہ جھونکے اِدھر
اڑی پھرتی ہے آج گل کی شمیم — کھلاتی ہے غنچوں کو موجِ نسیم
جھکا دیتی ہے سر صبا کی جھپٹ — جنوں خیز ہے بوئے گل کی لپٹ
دیا دایۂ نشو نے بے خطر — ہر اک طفلِ غنچہ کو شیرِ سحر
کھلے پھول، غنچے چٹکنے لگے — چمن کے چمن لو مہکنے لگے
یہ شبنم سے تازہ ہیں رُخسارِ گل — کہ انجم ہوئے زیبِ دستارِ گل
یہ سبزے پہ قطرے ہیں چھائے ہوئے — کہ مخمل پہ موتی بچھائے ہوئے
ہوئے برگِ گل عہد میں تر زباں — غدلنے بھرا موتیوں سے دہاں
ٹپکتی ہے شبنم جو وقتِ سحر — ہوئے وجد میں آ کے گریاں شجر
جو شاخیں گریں شوق میں جھوم کر — اٹھیں یار کی خاکِ پا چوم کر
ہر اک شے پہ چھایا ہی جو رنگ ہو — ہے سکتے ہیں آئینۂ آب جو
جو ہے آج گلشن میں خوشحال ہے — نعم بختِ خوابیدہ پامال ہے
عجب وقت ہے یہ عجب یہ سماں — کہ حیرت کے عالم میں ہے آسماں
سہانی سحر یہ سہانی فضا — یہ مرغانِ خوش نغمہ و خوش نوا
کہیں نغمہ زن طوطیِ خوش مقال — کہیں نالہ کش بلبلِ خستہ حال

اُٹھی ہر طرف چہچہوں کی صدا
فغانِ عنادل نے باندھی ہوا

وہ گلزار میں قمریاں نعرہ زن
وہ صحرا میں فریادِ زاغ و زغن

غرض اپنی اپنی زباں میں طیور
ہیں سرگرم تسبیح ربِّ غفور

اُدھر کوڑیالہ بھی ہر رنگ کا
مسطح زمیں پر کھلا جا بجا

کھلا ہے وہ سبزے پہ یوں باغ باغ
ہوں دریا میں جس طرح روشن چراغ

ہر اک رنگ کے خوبصورت نگیں
زمرد کے تختے پہ دیکھے نہیں

یہ ہوتا ہے گردِ سحر سے عیاں
کہ آتا ہے کوئی بڑا کارواں

وہ ظلمت کے سناٹے میں کچھ اثر
چھپا زیرِ دامانِ گردِ سحر

یہ دیکھا ہی تھا چشمِ ادراک نے
پڑھی آیۂ فتح افلاک نے

سنہری شعاعوں کے نیزے لئے
ہراول بڑھے لشکرِ صبح کے

شفق کے پھریرے اُڑے چرخ پر
شعاعوں نے گاڑے[1] علم‌ہائے زر

لب جو تھا گہرے کا جو کچھ دھواں
چمکنے لگیں اُس میں چنگاریاں

شعاعوں کی جاروب نے ایکبار
کیا صحنِ افلاک کو بے غبار

ہوئی اشکِ شبنم سے تر گل زمیں
پھواریں بھی کہرے کی گرنے لگیں

ہوا ختم چھڑکاؤ کا انتظام
ہوا صاف مطلع سحر کا تمام

سنہری شعاعوں کا عکس آب میں
کہ جو گھر کرے قلبِ بیتاب میں

چمک کر دکھاتا ہے یہ صاف صاف
کہ آئینے کا ہے بسنتی غلاف

یہ نہروں میں عکسِ شفق کا نشاں
لگی آگ پانی میں اللہ کی شاں

شعاعوں کی پانی پہ چنگاریاں
ہیں سطحِ بلوریں پہ گلکاریاں

درختوں کے سائے کا دھوئیں پر شغل
کہ شیشوں میں ڈھلے زمرد کے نخل

کھڑے ہیں خموش اب شجر صف بہ صف
کہ عالم ہے سناٹے کا ہر طرف

زمین و فلک پر یہ چھایا جلال
کہ عادی ہوئے تعلق سے اہلِ کمال

اٹھا کر طیور اپنے سر بار بار
کے دیکھتے ہیں بصد انتظار

کسی کو کوئی دیکھنے کے لئے
وہ جھانکا دریچے سے افلاک کے

پڑا دھوپ کا عکس کہسار پر
شعاعیں چمکتی ہیں اشجار پر

تری اوس کی دھوپ کھونے لگی
ہوا بھی ذرا گرم ہونے لگی

پرندے زمیں پر اترنے لگے
ہرن کھل کے جنگل میں چرنے لگے

---

[1] توازن الفاظ کے اعتبار سے یہ لفظ یہاں بھلا نہیں لگتا (مدیر)

اُڑے کھول کر قاز وسُرخاب پر
گرے مرغ آبی وہ تالاب پر

وہ کھیتوں میں چڑیاں بھی آنے لگیں
وہ چُن چُن کے دانے اٹھانے لگیں

ہوا پھر وہی کار و بارِ جہان
ہوئے لوگ معروفِ کارِ جہان

ہوا میں ابھی تک نہیں کچھ غبار
رطوبت لگی اُڑنے بنکر غبار

گو شہر میں یہ نہیں آب و تاب
کہ ٹیلوں کی ہے اوٹ میں آفتاب

بلندی پہ کچھ دھوپ آنے لگی
وہ کلسوں پہ سونا چڑھانے لگی

منڈیروں پہ کچھ کچھ جھلکنے لگی
ادھر کو وہ در در پہ چمکنے لگی

غرض چاک جب سحر ہو گیا
قریب آدھ گھنٹے کے دن چڑھ گیا

مثنوی کے ابواب اور فصلیں مصنف نے اور ہی اعتبار سے قایم کی ہیں۔ انہیں میں اِدھر اُدھر وہ لآلی بکھرے پڑے ہیں جن کو سلیقے سے رولنے والا چاہے تو خود مصنف کی طرح ایک اور میلاد منظوم، تالیف کر دے یا دیگر دلپسند سرخیوں کی تحت گلچینی کا حق ادا کر کے رنگ برنگ کے گلدستے تیار کرے۔ "بہارِ صبح" کے بعد "صبح بہار" دیکھئے تو پتہ چلے گا کہ فطری شاعر کو کس قسم کی حساس اور موشگاف طبیعت بخشش ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ کتنے نازک فرق قایم کر کے مابہ الامتیاز خصوصیات کو نمایاں کر دیتا ہے۔ بینظیر کو یہ جوہر ودیعت کیا گیا تھا۔

صبح بہار

پلا ساقیا وہ مئے لالہ فام
گلابی رہیں میری آنکھیں مدام

ابھی جل رہا ہے قمر کا چراغ
کھلا ہے سرِ چرخ تاروں کا باغ

وہ جو کہکشاں کی سڑک ہے اُدھر
شعاعوں نے چھڑکا ہے اُسے رات بھر

ہر اک سمت ہے کیا سہانا سماں
فرح بخش ہے کیسی تاروں کی چھاؤں

ابھی تک نہیں آتی آواز کوس
جبینِ فلک ہے جبینِ عروس

وہی مشعلیں جلتی ہیں آب میں
وہی پھول پھولے ہیں تالاب میں

کہیں پاسباں اونگھتے ہیں بجد گزار
پڑے ہیں کہیں مست شب زندہ دار

گئے شہر سے بھاگ کر دور چور
نہیں اب کہیں پہرے والوں کا شور

تجلی کا ہے ہر طرف گو ہجوم
مگر ماند ہونے لگے ہیں نجوم

پڑتی ضو ستاروں کی مدھم مگر
ابھی ہنس رہا ہے چراغ قمر

تجلی میں ڈوبی ہوئی چاندنی
بنی آرہی صبح سے جیسے رتی

قریب آتی جاتی ہے اب صبح وصل
یہ نقلی ضیا ہوگی دم بھر میں اصل

شفق آسماں پر ہوئی خیمہ زن
گلابی رنگا چرخ نے پیرہن

لہ یہ بیت بھی قافیہ کے اعتبار سے محل نظر ہے۔ تہ چھاؤں

شعاعوں کا جو نکا جو آنے لگا
چراغِ قمر جھلملانے لگا

بدلنے لگا رنگ پیرِ فلک
دکھانے لگی ضو شفق کی جھلک

دمِ صبح وَالْفَجر پڑھنے لگا
اُجالا بھی رہ رہ کے بڑھنے لگا

نظر آ رہا ہے آدمی دور کا
پھٹی پَو وہ تڑکا ہوا نور کا

گیا سیر کو غرب میں آفتاب
نظر آئی وہ شرق میں آب و تاب

پڑا بہتے پانی میں عکسِ شفق
بنی سطحِ دریا گلابی ورق

اُڑا ہر طرف وہ ابر اور گلال
ہوا دامنِ موج تک لال لال

مچانے لگا شور ہر سو گجر
جگانے لگی بانگِ مرغِ سحر

ہوئی صبحِ رنگیں ادا خندہ زن
چمکنے لگی جگمگاتی کرن

نمازی اُٹھے سُن کے شورِ اذاں
چلے جانبِ بت کدہ بید خواں

بڑھے جام در دستِ رندانِ مست
درِ میکدہ پر اُٹھے مے پرست

شعاعوں کی بڑھنے لگی اب بہار
بنا لالہ زار فلک شعلہ زار

سنہرا ہوا عارضِ چرخِ پیر
نکلنے پہ ہے آفتابِ منیر

وہ چھایا گلستاں پہ رنگِ شفق
مُطلّا ہوئے سارے گُل کے ورق

وہ بلبل، وہ طوطی شکر شکن
چہکتے ہیں کیا کیا طیورِ چمن

جوانانِ گلشن لبِ جوئبار
اُٹھے بہرِ تعظیمِ فصلِ بہار

عنادل کا ہر سمت جوش و خروش
نسیمِ چمن مست و نزہت فروش

کہیں بلبلِ زار کے چہچہے
کہیں شاہدِ گُل کے وہ قہقہے

بہار آئی نکھرے نہالِ چمن
بدلنے لگے نخلِ رختِ کہن

وہ بوٹوں میں کلّے لگے پھوٹنے
عنادل کے چھکّے لگے چھوٹنے

درختوں نے پہنا وہ دھانی لباس
لبِ نہر سبزہ زمرد اساس

نئی پتّیاں وہ چمکنے لگیں
وہ کھِل کھِل کے کلیاں مہکنے لگیں

رہا چینِ سرسبز تازہ بہار
اُڑی دوشِ بادِ سحر پر سوار

حسینانِ نازک ادا لالہ رو
روش پر ٹہلتے ہیں ہم رنگ و بو

کھلے پھول بیلے کے وہ لاجواب
وہ پھولے ہزاروں طرح کے گلاب

وہ پھولی چنبیلی کھلا موتیا
کھلی چاندنی باغ میں جابجا

وہ گڑہل کھلا اور خیرو کھلا
وہ نرگس کھلی اور شبّو کھلا

وہ پھولی نواڑی کھلی کاسنی
وہ لالہ کھلا، وہ کھلی کاسنی

چمن زیورِ گُل سے زیبا نگار
وہ نوخاستہ نوعروسِ بہار

(باقی)

بھرا مے سے لائے کار نگیں ایاغ — دہکنے لگا آتشِ گل سے باغ
یہ قدرت کا ہے قدرتی انتظام — کھلے پھول لاکھوں طرح کے تمام
وہ پھولوں پہ اڑتی ہوئی تتلیاں — دکھاتی ہیں قدرت کی صناعیاں
پڑے ہیں جو اس لطف سے بے خبر — جگاتی ہے ان کو نسیمِ سحر
لئے گلخنِ موجِ بادِ بہار — ٹہلتی ہے جوشِ نمو پر سوار
گرے رس پھولوں پر شہد کی مکھیاں — وہ چھتوں سے جھکنے لگیں ٹہنیاں
بھری گود شاخوں کی اثمار سے — ٹپکنے لگا شہد اشجار سے
وہ گدرائے پھل رنگ لانے لگے — انار اپنے جوبن دکھانے لگے
وہ انگور وہ رس بھری لیچیاں — لٹکتی ہیں آموں میں وہ کیریاں
تر و تازہ سرسبز ہے ہر شجر — لدے ہیں درختوں میں فصلی ثمر
وہ نارنگیوں اور لیموں کے پھول — کہ ہے سونگھے ہوں مست اہلِ عقول
وہ فصلِ ربیعی کے خرمن کے ڈھیر — جنہیں دیکھ کر قحط سالی ہو سیر
وہ صحرا کی دیکھے کوئی اب بہار — گر پھولوں سے ہر شاخ ہے شعلہ زار
وہ پھولا ہوا ڈھاک بھی ہر طرف — لگائے ہے اک آگ سی ہر طرف
وہ سرخی میں سینبھل کے گل بے عدیل — دکھاتے ہیں رنگِ ریاضِ خلیل
وہ سکھرے کے پھولوں کی بو تیز و تند — جسے سونگھتے ہی کھلے ذہن کند
دکھاتے ہیں اس وقت کیا کیا پھبن — چمکتی ہو چاندی کی جیسے کرن
کدھر سے یہ آئی ہوا یا عجیب — گر ہے کروندے کا جنگل قریب
عجب مست خوشبو ہے پھولوں کی واہ — ہوئی جاتی ہے دل کی حالت تباہ
بہت دور وہ جھاڑیاں ہیں مگر — ہوا میں لپٹ آرہی ہے ادھر
کہیں نیم کے پھول عطر آفریں — کہیں بیچ کچنار کے نازنیں
کرن پھول اگو ہوئے بیشمار — دکھاتا ہے چاندی کے گھونگھر دار
وہ سہجن کے وہ سرخ گونچی کے پھول — املتاس اور بال کنگنی کے پھول
وہ صحرا کا ہر نخل پھولا ہوا — غمِ بادِ صرصر کو بھولا ہوا
ہوا میں ہے نشو و نما کا اثر — ہیں مستی پہ وحش و طیور و بشر
دکھاتا ہے پھولوں کا جوبن ابھار — امنگوں پہ ہے جوشِ رنگِ بہار
نہیں ہوتا یہ زورِ مستی کبھی — نئے تازہ بہار اور سحر ہے نئی
فلک پر وہ چہلیں دکھاتی ہوئیں — شعاعیں بڑھیں جگمگاتی ہوئیں
ہوئی دھوپ ٹیلوں پہ جلوہ فگن — درختوں کی چوٹی پہ چمکی کرن

تجلی سے عالم ہوا فیضیاب
وہ نکلا چمکتا ہوا آفتاب [1]

" بہارِ صبح " دیکھی، " صبح بہار " دیکھی، پھر " صبح بنارس " دیکھنے میں عار کیسی ؟ اسی بنارس میں غالب " چراغِ دیر " لیکر ڈھونڈنے نکلے تھے تو کیا ہاتھ آیا تھا ؟ یہی نا کہ :-

ز الا دم زن و تسلیم لا شو
بگو اللہ و برقِ ما سوا شو

اب ذرا دیکھئے کہ بینظیر صبح ہی صبح بنارس میں کیا پلتے ہیں ؟ بتانِ بت پرست و برہمن سوز " کہاں تک اس شیخ حرم کو رام کرتے ہیں :-

صبح بنارس

پلا ساقیا راحِ ریحاں سرشت ۔۔۔ کہ ہو موج بے زلفِ حورِ بہشت
نمونہ ہے قدرت کا ہر مہ جبیں ۔۔۔ تعالی اللہ حسنِ جمال آفریں
وہ مے دے ملے چشمِ بینا مجھے ۔۔۔ کہ بے بادہ مشکل ہے جینا مجھے
ہو مستِ الیسی مری چشمِ نم ۔۔۔ کہ حیراں ہو چشمِ غزالِ حرم
چلوں جوششِ مستی میں یوں جھوم کر ۔۔۔ لٹے بے خودی خاکِ پا چوم کر
اگر لغزشِ میں گرم رفتار ہوں ۔۔۔ قیامت پکارے کہ تیار ہوں
پھنسے جذبِ دل میں وہ رشکِ پری ۔۔۔ میں دل دیکے سیکھوں رہِ دلبری
یہ پیدا ہو سوزِ نہاں میں کمال ۔۔۔ تمنا ہو شمعِ حریمِ وصال
مزا کچھ انہیں سرد آہوں میں ہو ۔۔۔ کہ اک پیاری صورت نگاہوں میں ہو
نہ جب تک ملے وہ مرادِ دلستاں ۔۔۔ کسی گل سے ملتا ہے یہ دل کہاں
وہ مے دے کہ جو امتحاں ہو مرا ۔۔۔ خدائے جہاں پاسباں ہو مرا
مجھے لغزشوں سے بچاتا رہے ۔۔۔ تصور میں جلوہ دکھاتا رہے
شفق پھولی کچھ پو بھی پھٹنے لگی ۔۔۔ سیاہی شبِ غم کی چھٹنے لگی
سہانی ہو کس رجہ تارو کی چھاؤں ۔۔۔ ٹہلنے کی خاطر مچلتے ہیں پاؤں
بچھاتے ہوئے برگ چھالے خضر ۔۔۔ لبِ گنگ تڑکے سے ہیں جا بے گیر
وہ جوگی بھی دھونی رمائے ہوئے ۔۔۔ ہیں پوجا میں آسن جمائے ہوئے
وہ سیلے، وہ جوڑے چھکتے ہوئے ۔۔۔ وہ کانوں میں مندر لٹکتے ہوئے
وہ گھنٹے بجاتے ہوئے برہمن ۔۔۔ ہیں بت خانوں میں کس طرح نعرہ زن
نہانے کو وہ نازنینانِ شہر ۔۔۔ چلی آتی ہیں کس طرح سوئے نہر
وہ تھالی میں سیندور چندن لئے ۔۔۔ کوئی آ رہا ہے عجب آن سے

[1] اس نظم کے بعد قرآن کی اس آیۃ " فبای آلاء ربکما تکذبان " کی معنویت پر غور کیجئے۔

بنارس کی وہ ریشمی ساڑیاں — وہ گھونگھٹ لٹکتا ہوا الاماں
ہر اک کی نئی دھج نیا ڈھنگ ہو — لبِ گنگ[۱] اس وقت کیا رنگ ہو
نزاکت سے کوئی لچکتی ہوئی — اِدھر آرہی ہے جھجکتی ہوئی
وہ بھیگے ہوئے بال بکھرے ہوئے — وہ چہرے بہت صاف نکھرے ہوئے
کسی کا وہ گورا چھریرا بدن — کوئی دھان پان اور رشکِ سمن
کوئی زلف ڈالے ہوئے دوش پر — کسی کی نزاکت سے دُہری کمر
کٹوری میں کوئی لئے پھول پان — کھڑی ہے وہ مندر میں مندر کی جان
کسی کا چلے سر پاک[۲] خم — کہ عصمت بھی کھائے اسی کی قسم
زمیں پر نظر سر وہ گردونے کوئی — کدورت کو خاطر سے دھوئے کوئی
چترنی کوئی تو کوئی پدمنی — کوئی ان میں رادھا کوئی جانکی
مہادیو کو جل چڑھا کر تمام — چلی جاتی ہیں اپنے گھر شاد کام
وہ بانکی رسیلی کوئی خوش نظر — لجاتی ہوئی آرہی ہے ادھر
کوئی عشق منزل کی شیوہ خرام — کہ چیلے ہوں جس کے کرشن اور رام

چلیں گھر کی جانب جو وہ جھوم کر
تجلی بڑھی اُن کا منہ چوم کر

لہ شاعر کا شاہد وہاں ہو نکلا شوخ ہو جاتا ہے مگر اس "شوخی نظارہ" کے نتائج سے بچنے کے لئے شروع میں وہ دعا مانگ چکا ہے۔ کہ سہ بے لغزشوں سے بچاتا ہے (مدیر)

صبح کے مناظر تو دیکھ لئے گئے۔ انگریزی کی مثل ہے کہ "صبح ہی سے دن کا اندازہ مل جاتا ہے" شاموں کا بھی اسی پر قیاس کر لیا جائے۔ مثنوی میں حسب ذیل عنوانات پر مجھے بینظیری موء قلم کی دلچسپ خوبیوں کے شاہکار ملے ہیں:۔

جواہر بینظیر

۱- خادمان اسلام ۲- اسلام ۳- فلکیات ۴- حنفیت

کتاب مبین

۱- رویت ہلال ۲- صبح ۳- بارش ۴- بیکسی ۵- چڑھا دن ۶- بہار صبح ۷- موسم سرما ۸- شام ۹- بسنت ۱۰- بھیگی ہوئی رات ۱۱- صبح بنارس ۱۲- صبح کا دوسرا سماں ۱۳- ریل اور اسٹیشن ۱۴- ریل کا سفر گرمیوں میں ۱۵- حسین بہجور ۱۶- عالم حیرت ۱۷- اصطلاحات موسیقی ۱۸- صبح بہار

واضح باد کہ یہ کل سرخیاں (چند ہی استثناء کے ساتھ) قریب قریب میری اپنی قایم کردہ سہی مگر پھر بھی سرسری ہی ہیں۔ بہت ممکن ہے زیادہ بلیغ نظریں اور بھی بہت کچھ اسی مثنوی سے انتخاب کرلیں۔ مندرجہ بالا فہرست سے چند اقتباسات جو پیش کئے جا چکے ہیں وہی اس بات کے لئے کافی دلکشی ہیں کہ بینظیر کا درجہ دیدہ وروں کو دکھا دیں اس لئے اب میں اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں۔ اس مثنوی کے علاوہ بعض مخصوص احباب کی فرمایش پر ایک مختصر مثنوی اور بینظیر نے لکھی تھی جو دو ورق پر چھپوا کر ہم لوگوں میں انھوں نے تقسیم کی تھی اب اس کو پیش کیا جاتا ہے:۔

لہ یہاں "ناز" کا محل تھا (مدیر)

تاروں بھری رات

کہاں ہے تو اے ساقیٔ بزم زیب … کہ تاروں بھری رات ہو دلفریب
کواکب یہ افلاک بوے ہوئے … کنول حوضِ گردوں میں پھولے ہوئے
سمندر میں بہتے ہوئے یہ چراغ … ہے صحن گردوں میں تاروں کا باغ
نہیں چاند کا گو فلک پر نزول … کھلے ہیں مگر چاندنی کے یہ پھول
مسہری سجی قدرتِ پاک کی … بسی سیج پھولوں سے افلاک کی
قنادیل روشن عجائب نگار … مصابیح آیاتِ پروردگار
تناسب سے قدرت نے چھوٹے بڑے … زبرجد کے گنبد میں ہیرے جڑے
یہ خورشیدِ تاباں کے آنکھے ہوئے … کہ چترِ گردوں میں ٹانکے ہوئے
سوئے چرخ یہ تتلیاں نور کی … گئیں ٹڈیاں بن کے بلور کی
غضب جگمگاتی ہوئی قمریاں … بنا کامدانی کا تھان آسماں
بھری بوٹیوں سے ردائے فلک … بنی بیل خود کہکشاں کی سڑک
شبِ تار کی شال تانے ہوئے … جہاں نیند کی دل میں ٹھانے ہوئے
مگر چشمِ انجم جھپکتی نہیں … ستاروں کی بوندیں ٹپکتی نہیں
کچھ ایسا ہی خوفِ شبِ تار ہے … کہ ہر انجم اک چشمِ ہشیار ہے
کھلے گوڑیا لے سپرِ کوہسار … کہ شبنم سے بھیگا ہوا سبزہ زار
جو سیارے رہتے ہیں ان میں رواں … وہ ہیں ان کی ترتیب کے پاسباں
جو ثابت ہیں محور بدلتے نہیں … کہ گرد اپنے پھرتے ہیں چلتے نہیں
ہوا بوجھ سب کا سنبھالے ہوئے … گردوں کو فضا میں اچھالے ہوئے
بہم ان میں جو ربطِ جذبات ہے … علیٰ قدرِ جسم و مسافات ہے
جو چھوٹے ہیں ریگِ بیاباں سے بھی … بڑے ہیں وہ خورشیدِ تاباں سے بھی
کچھ آباد، کچھ ان میں خالی بھی ہیں … جمالی بھی ہیں کچھ جلالی بھی ہیں
تپش دن کو خورشیدِ تاباں کی تھی … خبر کس کو اس بزمِ شایاں کی تھی
حرارت سے دن بھر یہ پالے پڑے … کہ گردوں کے پاؤں میں چھالے پڑے
شب و روز کے اتنے اُلٹے ورق … کہ چھایا جبینِ فلک پر عرق
یہ اودے ہوا سے بکھلتے نہیں … بلندی پہ جسم جسم کے گلتے نہیں
فضا جوششِ نم سے پسیجی ہوئی … ردائے شبِ تار بھیگی ہوئی
شبِ تیرہ پھیلائے زلفوں کا جال … یہ موتی پروئے ہوئے بال بال

لٹیں کھولے لیلائے شب خندہ زن — کہ اُلجھے ہیں کالوں نے سبزے میں
ستارہ دھوتی رمائے ہوئے — یہ تابندہ جگنو ہیں چھائے ہوئے
لٹکتے ہیں گنبد میں تمجید کے — یہ انڈے ہیں سیمرغ خورشید کے
شعاعوں سے دُھل دُھل کے نکھرے ہوئے — یہ ہیں مُہرۂ عاج بکھرے ہوئے
یہ ریزے جو اس خوانِ یغما کے ہیں — شکر پارے قند مصفا کے ہیں
تجلی کے قالب میں ڈھالے ہوئے — یہ فنجانِ سیمیں اُجالے ہوئے
مسکن تپِ غم میں رنجور کے — چمکتے ہوئے قرص کافور کے
یہ سب نوشدارو سے معمور ہیں — شبِ غم کے زخموں کے انگور ہیں
جبینِ فلک کیا پُرافشاں ہے آج — کہ ہر شب سے بہتر چراغاں ہے آج
جھروکے نہ دیمے ہیں یہ حور کے — یہ روزن ہیں اس قبۂ نور کے
سماں تھا یہی دن کو بھی جلوہ گر — مگر تابِ خور تھی حجابِ نظر
چمک اٹھی قسمت جو ناہید کی — ردا اُڑ گئی نورِ خورشید کی
بتانے لگا چرخِ نیلوفری — یہ پروین، یہ زہرہ، یہ ہے مشتری
نہ آئی شبِ تیرہ کے داؤں میں — نمایاں رہی تیرگی چھاؤں میں
نہیں روشنی پھر بھی نزدیک و دور — ممیز ہے گہری سیاہی ضرور
ستاروں کا یہ عکس تالاب میں — کہ لہراتی ہیں بجلیاں آب میں
گہر ہائے روشن تہِ آب سے — نظر آتے ہیں کثرتِ تاب سے
انہیں دیکھ کر ہو رہا ہے گماں — تہِ آب بھی ہے کوئی آسماں
لبِ موج سے آرہی ہے صدا — الحمد للہ ذی الکبریا
نہیں دشت میں روشنی کا نشاں — مگر کچھ معاون ہے تاروں کی چھاں
نہ ہوتے جو محجوب شمس و قمر — تو اتنے ستارے نہ آتے نظر
نہ یہ نجم ثاقب میں ہوتی چمک — کہ چھٹتے ہوائی سے زیرِ فلک
نہ تارے سحر تک پڑیں گے نہ ماند — کہ تاریخ آخر ہے غائب ہے چاند
ہے اس جزر و مد سے یہ حکمت عیاں — کہ دیکھے جہاں یہ بھی پورا سماں
ملے چشمِ بینا کو اس سے سبق — کہ سب کو تغیر ہے جز ذاتِ حق

ہر امر ازل ہے سپاس آفریں
لک الحمد یا صانع العالمین

عتیق فکری

کائنات گواہی دیتی ہے

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ
یہ ہے تمہارا رب اس کے سوائے کوئی معبود نہیں وہ ہر شئے کا خالق ہے سو تم اس کی عبادت کرو!
وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ
اور وہ ہر شے پر وکیل ہے۔ آنکھیں اسے نہیں پاسکتیں اور وہ آنکھوں کو پاسکتا ہے
الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝
اور وہ باریک بین خبردار ہے!

اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس نے پہلے ہی انسان کو تاکید کر دی ہے کہ میرے وجود مطلق کو حسیات و مشاہدات سے ماوراء سمجھو صرف یقین ہی رکھنا بندے کے لئے کافی ہے!

انسان کو بغیر خدا کے وجود کا اقرار کئے چارہ نہیں ...... خدا کے وجود پر چاہے بغیر کسی دلیل کے ایمان لایا جائے ..... یا دلیل کے ساتھ ہر صورت ایمان لانا ہی پڑتا ہے ...... اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں جو اُلجھن ہر وقت رہتی ہے ..... کہ اس کائنات کو کس نے بنایا ہے ..... کیسے بنایا ہے ..... یہ مسئلہ ایسا ہے کہ جس کا حل صرف ایک قادرِ مطلق ہستی کے وجود کا اقرار کرنے سے ہی ملتا ہے ..... ورنہ یہ اُلجھن مرتے دم تک قلب و ذہن کو مضطرب رکھتی ہے ..... انسان دنیا کے منطقی طریقوں سے اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی بڑی کوشش کرتا ہے مگر جیسے ہی ایک کانٹا شک کا دور ہوتا ہے تو بیسیوں کانٹے خرد کی راہ میں بچھے ہوئے پاتا ہے متشککین اور مذبذبین زندگی بھر اپنے ذہنی اوہام اور اندیشوں میں اُلجھے رہتے ہیں اور ان پر یقین و اطمینان کی ایک صبح بھی طلوع نہیں ہوتی ـــــــ آہ! یہ بے اطمینان اور یقین سے دور زندگی۔

خیال و فکر کی شیشہ گری میں کچھ بھی نہیں
یقیں نہ ہو تو فقط آگہی میں کچھ بھی نہیں

لیکن انسان نے اس "چنیں" اور "چناں" کے چکر سے نکل کر جب یہ کہہ دیا کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے اور دنیا کا سارا کارخانہ اُسی کے حکم اور مشیت کے تحت چل رہا ہے۔ گھانس کی ایک پتی بھی اُس کے حکم کے بغیر نہیں اُگ سکتی ـــــــ تو اس اقرار اور یقین کے ساتھ شکوک و اوہام کے سارے کانٹے دل کی رگوں سے نکل جاتے ہیں اور آدمی اپنے دل کے اندر ایک طرح کا اطمینان اور روشنی محسوس کرتا ہے، اُسے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اندھیرے سے نکل کر بجلی کی روشنی میں آ گیا۔
موجودہ دور کا تعلیم یافتہ طبقہ جو مغربی مادیت کے ملحدانہ نظریوں کے چکر میں پھنسا ہوا ہے اور جس پر نیم فلسفیانہ تقدیت

کی دُھول چڑھی ہوئی ہے، وہ تصوّر و ایقان سے راہِ فرار اختیار کرتا ہے، اور وہ شاید شکر اور نمک کی طرح خالق کے وجود کو دیکھنا چھونا اور چکھنا چاہتا ہے اور وہ نہیں جانتا کہ بہت سے علمی حقایق لمس، ذائقہ اور مشاہدہ سے بلند ہیں ——— اس کی معلومات کا دار و مدار "سائنس" کے تجربوں پر ہے۔ حالانکہ جس سائنس کی طرف آج دُنیا مائل ہے اُس کی معلومات آج بھی ظنّی تصوّر کی جاتی ہیں۔ . . . مسٹر سموئیل سائنس دانوں کی درماندگی کو یوں بیان کرتے ہیں:۔

سائنس داں ابھی تک خود اپنی تحقیق پر مطمئن نہیں ہیں اپنی مجبوریوں کا یوں اعلان کرتے ہیں جن لوگوں نے صحیح معنوں میں سائنس کو سمجھا ہے اُنہوں نے خدا کا اقرار کیا ہے۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

اصولِ علت و معلول ہماری اُمید کا واحد مرکز ہے اگر یہ کائنات معلول اور خدا علت ہے تو ذات علت اگر پوری طرح نہیں لیکن بہر حال کسی نہ کسی قدر معلول میں دیکھی جا سکتی ہے۔ . . . راگ سے مغنی پر تصویر سے مصوّر پر اور فکر سے مفکر پر اور کائنات سے خالق پر ہم استدلال کر سکتے ہیں . . . پھر فرماتے ہیں کہ اسپینوزا کہتا ہے کہ جیسے جیسے ہم معلولات کو سمجھتے جائیں گے خدا ہماری سمجھ میں آتا جائے گا۔ . . .

(یقین و عمل اُردو ترجمہ صفحہ ۵۹)

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:۔

انسانی عقل ارادہ و مقصد رکھتی ہے اس لئے یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ خالق کائنات بغیر اُن صفات کے ہوگا یہ خیال کرنے کے لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ افعال فطرت کے پیچھے کوئی مقصد و ارادہ موجود نہیں ہے کیا ہم اس سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ . . . انسانیت کی تاریخ اور موجودہ تہذیب میں ذاتِ خداوندی سے متعلق کوئی اور تفصیل مل سکتی ہے؟

اس طرح ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں:۔

جو مفکرین اصولِ علت و معلول کو تسلیم کرتے ہیں اور جو خالق کو مدبّر ازلی مانتے ہیں اُن کے نزدیک عقل ارادہ اور مقصد سب اُسی خالق کے تابع ہے۔ . . .

ڈاکٹر کروکس جب انگلستان کی رائل سوسائٹی کے پریذیڈنٹ مقرر ہوئے تو اُنھوں نے اپنے پہلے لیکچر میں یہ کہا:۔

میں برابر تین سال سے نہ صرف اِس امر کا معتقد ہوں بلکہ بذریعہ دلائل اِس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچا سکتا ہوں کہ عالمِ فطرت میں ایک زبردست صاحبِ عقل ہستی حکومت کر رہی ہے جو مادہ سے بالاتر ہے۔

دورِ عصرِ جدید کے ایک بہت بڑے سائنسدان سر جیمس جینز (SIR JAMES JEANS) فرماتے ہیں:۔

جو کچھ کہا گیا ہے اور جن جن نتائج پر ہم پہونچ سکے۔ . . سچ تو یہ ہے یہ تمام تر محض قیاس و ظن اور غیر یقینی ہے اس مسئلہ پر ہم نے گفتگو کی کوشش کی ہے کہ دورِ حاضرہ کی سائنس اِن مہمات مسائل کے متعلق جو شاید سرحد ادراکِ انسانی کے باہر ہیں حتمی طور پر کچھ کہہ سکتی ہے ہم اس سے کچھ زیادہ دعوے نہیں کر سکتے کہ ہم زیادہ سے زیادہ روشنی کی ایک دُھندلی سی جھلک دیکھ پاتے ہیں۔

اور شاید یہ بھی ہمارا فریب نگاہ ہی تھا۔ کیوں کہ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں دیکھنے کے لئے اپنی آنکھوں پر زور دینا پڑا۔ لہذا ہم بمشکل کہہ سکتے ہیں کہ دورِ حاضرہ کی سائنس حقیقت کے متعلق کوئی دعویٰ پیش نہیں کر سکتی شاید یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ سائنس کو یہ دعوے کرنا ترک کر دینا چاہیئے اکثر ایسا ہوا ہے کہ دریائے علم نے خود اپنے بہاؤ کے خلاف پلٹا کھایا ہے۔ (دیکھو "The Mysterious Universe"

ڈاکٹر اٹیکن :۔

علم الافلاک کے ماہر جو کیلیفورنیا کی رصد گاہ کے ڈائرکٹر تھے لکھتے ہیں :۔

کائنات ابتدا اور اُس کی انتہا کے متعلق ہم کچھ بھی نہیں جانتے

سر فرانسس ینگ ہسبنڈ اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں :۔

ہم سائنس سے جو کچھ معلوم کر سکتے ہیں وہ اتنا ہی ہے کہ علم کا سمندر بے کنارہ ہے ہم یہی معلوم کر سکتے ہیں کہ ہم فطرت کے متعلق بھی سب کچھ نہیں جان سکتے۔

(The crisis of civilisation PP 94 - 95)

سائنس دانوں کی تحریروں کے یہ اقتباسات آئینہ دار ہیں سائنس کے عجز اور درماندگی کے! جس سائنس کے بل بوتے پر آج ہمارے مغرب زدہ نوجوان خدا کے وجود پر طنز کیا کرتے ہیں، اُن کو شاید اس کی خبر نہیں ہے کہ بڑے بڑے سائنس داں "گو مگو" کے عالم میں ہیں اللہ تعالیٰ کے وجود کا اگر وہ اقرار نہیں کرتے تو انکار بھی نہیں کرتے، وہ تو صرف اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ ہماری دسترس قابو اور تجربہ و مشاہدہ سے یہ چیز باہر ہے۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے نہ نفی کرتے ہیں اور نہ اثبات۔ ۔ ۔

علامہ لیٹریہ جو مادئین (L ATTRE) کا بہت بڑا رہبر گزرا ہے اپنے شبہات بیان کرتے ہوئے اپنی کتاب فلسفہ حسیہ سے متعلق چند کلمے لکھتے ہیں :۔

جب ہم اصول کائنات اور اُن کی غایت سے بالکل جاہل ہیں تو پھر کسی وجود سابق یا لاحق کا ثبوت یا انکار ہمارے لئے کچھ ضروری نہیں یعنی نہ تو ہم وجودِ حکمت الہٰی کا انکار کریں اور نہ اس کو ثابت کرنے کی کوشش کریں بس ہم انسانوں کی زندگی نفی اور اثبات کے درمیان ہونی چاہیئے یہی صحیح ہے۔

اسی طرح اور بھی بہت سے مادئین نے اثبات و نفی کے درمیان راستہ اختیار کیا ہے اور اپنی کوتاہیاں بیان کی ہیں جسے ہم طوالت کی وجہ سے نظر انداز کرتے ہیں[1]۔ علامہ ہرشل (HERCHEL) جو علم ہیئت کے فاضل تسلیم کئے جاتے ہیں فرماتے ہیں:

علم اور سائنس میں جس قدر وجود خالق پر بڑی بڑی دلیلیں ظہور پذیر ہوتی جاتی ہیں علماء جیالوجی۔ ۔ ریاضی۔ ۔ فلکی اور طبعی ان تمام کا وجود خالق پر کامل اتفاق ہے۔ ۔ ۔

فاضل اجل علامہ فونتنل (FONETE NNLLE) اپنی انسائیکلوپیڈیا میں تحریر فرماتے ہیں :۔

سائنس کی اہمیت صرف اسی میں نہیں ہے کہ وہ ہماری عقلوں کے لئے بہت مفید ہے بلکہ اصل اہمیت یہ ہے کہ وہ ہماری عقلوں کو خالق عالم تک پہنچا دیتی ہے اور ہمارے قلوب پر خداوند عالم کی عظمت و جبروت

---

[1] ہم اپنی کتاب "ارتقائے فکر" میں اُن سائنسدانوں کے اقوال بھی پیش کریں گے جنہوں نے کھُل کر اللہ تعالیٰ کے وجود کا اقرار کیا ہے۔

اور اُس کے مقدس جلال کا سکہ بٹھا دیتی ہے۔

گزشتہ تحقیقات سے یہ صاف ظاہر ہو گیا ہو گا کہ سائنس کو کسی بھی چیز کا کلی ادراک و معلومات کا دعوٰے نہیں ہے مضلسند ہہ ہہ اپنی کتاب[1] میں لکھتے ہیں:-

سائنس کو اب اپنے متعلق احساس ہو گیا ہے۔۔۔ اس لئے اب اُس میں فروتنی اور انکسار بھی آگیا ہے اب ہمیں یہ نہیں پڑھایا جاتا کہ حقیقت کا علم حاصل کرنے کے لئے سائنس کا طریقہ ہی واحد طریقہ ہے واحد طریقہ تو ایک طرف اب تو دنیائے سائنس کے مشاہیر اس امر پر مُصر ہیں اور بڑی شدت سے مصر ہیں کہ جہاں تک ادراک کا تعلق ہے سائنس صرف جزوی سا علم ہم پہنچا سکتی ہے۔

علم النفسیات کے ماہرین نے عقل کے بارے میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ تنہا عقل کسی طرح بھی انسان کو سیدھے راستہ پر نہیں ڈال سکتی بلکہ یہ لاشعور میں دبئے ہوئے کچھ ایسے حالات ہوتے ہیں جن کے اثرات انسان کے شعور پر اثر انداز ہوتے ہیں بعض اوقات تو ساری زندگی اپنی لاشعوری اُلجھنوں کا مرقع ہوتی ہے اور تمام تر شعوری نظام لاشعور کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔۔۔ عقل خود بھی فریب خوردہ ہوتی ہے اور اُس کے تجربات بھی فریب نظر ہو جاتے ہیں۔۔۔

ڈاکٹر جوڈ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:-

عقل در اصل ہماری خواہشات کی باندی ہے اس کا کام یہ ہے کہ ہم جن مقاصد کو غیر شعوری طور پر حاصل کرنے کی خواہش کریں ان کے حصول کے لئے ذرائع ہم پہنچائے اور جو کچھ ہم کرنا چاہیں اُس کے جواز کے لئے دلائل مہیا کرے۔۔۔۔

پروفیسر ALFRED COBAA R عقل کے متعلق فرماتے ہیں:-

عہد حاضر کا سب سے بڑا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ اب چاروں طرف سے عقل اور عقل پرستی پر حملے شروع ہو گئے ہیں۔ سائنس نے خود عقل کے قلعہ پر دھاوا بول دیا ہے جدید ریاضیات کے انکشاف نے کائنات کے معمہ کو پھر سے اُجاگر کر دیا ہے علاوہ بریں علم النفس کے ماہرین نے دُنیا کے علم میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا ہے جس کی رو سے عقل کو اب نفس انسانی کی کائنات میں کوئی مقام حاصل نہیں ہو سکتا، قانون عقل پر سب سے آخری ضرب کاری علم التصورات کے تجزیہ نے لگائی ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم کے اسلوب دلائل پر نگاہ ڈالئے ساتھ ہی اپنے ذہن کو یکسو کر کے تدبر سے کام لیجئے پھر دیکھئے کہ شکوک کی گرہیں ایک ایک کر کے کُھلتی ہیں کہ نہیں قلب مضطر کو سکون میسر آتا ہے یا وہی خلش باقی رہتی ہے جسے سائنس اور خرد بھی آج تک نہ مٹا سکی۔۔۔ کائنات ارضی اور کائنات سماوی دونوں کی طرف بغور دیکھئے سورج۔ چاند۔ ستارے۔۔۔ کہکشاں صبح و شام کا طلوع و غروب، یہ رنگا رنگی، یہ بوقلمونی، فلک بوس پہاڑ۔۔۔ زمین کو ایک ہی موج میں نگل جانے والا سمندر یہ ہریالی یہ چمن یہ نازک نازک گلوں کی پتیاں، یہ رنگ رنگ کے پھول اُن کی مسرت بیز نکہتیں، کیا یہ سب کچھ اتفاق کی کرشمہ سازیاں ہیں یونہی خود بخود سب کچھ وجود میں آگیا ہے ان چیزوں کا کوئی خالق و موجد نہیں اس

---

[1] یہ حوالجات "معارف قرآن" سے ماخوذ ہیں۔

کائنات کی تخلیق و تنظیم محض بخت و اتفاق کا نتیجہ ہے کسی مدبر و مبصر حکیم و علیم کا اس پر کنٹرول نہیں یہ عالم رنگ و بو بغیر کسی قادر مطلق ہستی کے وجود میں آگیا ہے۔ شکر ہے کل تک مادئین جس مادے کا ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے آج وہ مادہ سائنس کی نظر میں کائنات کا کچھ بھی نہیں لگتا اُس کی جگہ توانائی (انرجی) نے لی ہے وہ تمام عمارت جو مادے کے بل بوتے پر تعمیر کی جارہی تھی آج دھڑام سے زمین پر آرہی۔ ۔ ۔ ۔

آئیے اور دیکھئے کہ خود خدا نے ہمیں کن دلائل سے اپنے قادر مطلق ہستی ہونے کا ثبوت دیا ہے اور ہمیں سمجھانے کے لئے کیا اسلوب اختیار فرمایا ہے:۔

ان فی خلق السموات والارض واختلاف اللیل والنھار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من مّاء فاحیا بہ الارض بعد موتھا وبث فیھا من کل دابۃ وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض لایٰت لقوم تعقلون ؁	بے شبہ آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے اُلٹ پھیر میں اور ان جہازوں میں جو انسان کے لئے فائدہ رساں سامان لے کر سمندر میں چلتے ہیں اور آسمان سے اس پانی کے برسانے میں اور پھر اس پانی کے ذریعہ مرے پیچھے زمین کو زندگی بخشنے میں اور زمین میں ہر طرح کے جو چلنے والے پھیلائے ہیں اس میں اور ہواؤں کے کبھی ادھر کبھی اُدھر بہنے میں اور آسمان اور زمین کے بیچ میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

یں خود خدا نے ہمارے مشاہدے اور گرد وپیش کی چیزوں سے دلائل کا کام نہیں لیا ایک تصویر سے مصوّر اور راگ سے مغنی کا وجود ثابت کرنا جو فلاسفہ کا طریقہ ہے قرآن کے طریقے سے بہتر ہے۔ اثبات و استدلال کا یہ کس قدر دل نشین، فطری، سادہ اور صحیح اسلوب ہے، یہی چیز فلسفہ اور سائنس میں علت و معلول کے قالب میں ڈھل کر طرح طرح کے فلسفیانہ مباحث کا رنگ اختیار کر لیتی ہے!

عقل تجربات، واقعات اور مشاہدات و محسوسات کے دائرے سے باہر قدم نہیں رہ سکتی وہ جو کچھ اپنے گرد و پیش دیکھتی اور محسوس کرتی ہے اُسی کی بنیاد پر نتائج اخذ کرتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے بھی محسوسات و مشاہدات ہی کو اپنے وجود کے اثبات کے لئے "دلیل" بنایا ہے ——— ایک ذراسی آلپن جب خود بخود پیدا نہیں ہو سکتی اور وہ اپنے وجود کے لئے کسی موجد اور صانع کی محتاج ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی بڑی منظم اور مرتب کائنات خود بخود وجود میں آگئی ہو، جو عقل زمین و آسمان کے اس نظام کو دیکھ کر بھی یہی کہتی ہے کہ یہ سب کچھ آپ ہی آپ وجود میں آگیا ہے، وہ ایک صحت مند نہیں بلکہ مریض عقل ہے، اُس کو روگ لگ چکا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں قلب و گوش پر مہریں لگادی جاتی ہیں اور نگاہوں پر حجابات ڈال دیئے جاتے ہیں (ختم اللہ علیٰ قلوبھم و علیٰ سمعھم و علیٰ ابصارھم غشاوۃ۔۔۔)

یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ کائنات ارض و سماء کی ہر ایک چیز کی تخلیق کی طرف توجہ دلا کر انسان کو اس بات کا یقین دلایا ہے کہ یہ تمام موجوداتِ عالم صرف میری ہی قدرتِ کاملہ کا ظہور ہیں۔

افی اللہ شک فاطر السمٰوٰت والارض	کیا آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے خدا میں شک ہے۔

جو لوگ اس کائنات کو بخت و اتفاق کا سبب سمجھتے ہیں، اُن کے اس باطل تصور کی اس طرح نفی فرمائی:۔

ام خلقوا من غیر شیئٍ ام ھم الخالقون	کیا وہ آپ سے آپ بن گئے یا اپنے آپ خالق ہیں یا نہیں

ام خلقوا السمٰوات والارض بل لا یوقنون ○ (کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے (یہ کوئی بات نہیں) بلکہ انکو یقین نہیں۔

انسان ہے کہ گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے اور اپنی خرد کے بھروسہ پر مباحث کی گجڑیوں میں اُلجھتا جارہا ہے۔

ومن اٰیٰتہ ان تقوم السمآء والارض اور اُس دلیلوں میں سے ایک یہ ہے کہ آسمان اور زمین اُسی کے حکم سے قایم ہیں۔

کیا یہ دلیلیں عقل سلیم اور وجدان پر گراں گزرتی ہیں؟ ان سے ہم صانع حقیقی کا سُراغ نہیں لگا سکتے؟ اس ہستی مطلق کا الیقان پیدا نہیں ہوسکتا؟ کیا سائنس اس سے بڑھ کر کوئی روشن دلیل پیش کرسکتی ہے؟ فلسفہ اور سائنس کو اس بات پر زعم ہے کہ یہ تمام اجرام سماوی کشش وانجذاب کے تحت قایم ومنظم ہیں مگر اس جذب وکشش کی قوت کا خالق کون ہے؟ خالی یہ جذب وکشش ہی تو کائنات کا حل نہیں ہیں۔۔۔۔ نیوٹن۔ NEWTON ” جو جذب کشش کے انکشاف کا بانی ہے کیا کہتا ہے :-

گو قیام سیارگان جذب وکشش کی وجہ سے ہے لیکن حرکت دوری صرف جذب کی وجہ سے نہیں ہوسکتی کیونکہ اس صورت میں تمام کروں کو خط مستقیم پر حرکت کرنا چاہیئے تھا۔ لہٰذا ایک ایسی ہستی غالب موجود ہے جو تمام کروں کو خط مستقیم سے دفع کرتے ہوئے حرکت دوری میں لاتی ہے۔

کل فی فلک یسبحون ہر ایک اُن میں سے اپنے مدار میں تیرتا ہے۔

صنع اللہ الذی اتقن کل شئ یہ اللہ تعالےٰ کی صنعت ہے جس نے ہر ایک چیز کو مضبوط نظام پر بنایا ہے۔

کل شئ عندہ بمقدار اُس کے نزدیک ہر ایک شے کا اندازہ ہے۔

اب کیا کیا جائے اُن کا جن کے دل ودماغ حق کو قبول نہ کرسکتے ہوں اور اُن کی فطری صلاحیتوں کا آئینہ شکوک ووساوس کے زنگ سے اندھا ہوگیا ہو۔۔۔۔

ذرا اس ارشاد باری تعالےٰ کی طرف بھی تو غور فرمایئے۔

سنریھم اٰیاتنا فی الاٰفاق وفی انفسھم حتیٰ یتبین لھم انہ الحق۔

عنقریب ہم اُن کو دُنیا بھر میں اپنی قدرت کی نشانیاں دکھائیں گے اور خود اُن کی ذات میں اُن کو قدرت کی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ اُن کو واضح طور پر نظر آجائے گا کہ وہی سچا خدا ہے!

حسن بن اسماعیل الھضیبی

ترجمہ:- عبدالقادر حسن

وہ

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

۱۲ر فروری ۱۹۵۲ء کے "الدعوۃ" کے "حسن البنّاء نمبر" میں جناب حسن بن اسمٰعیل الھضیبی کا یہ مضمون شائع ہوا ہے اور اس مختصر سے مضمون کا یہ پہلو بہت اہم ہے کہ یہ اُس شخص کے خیالات ہیں جو اس وقت "الاخوان المسلمون" کے مرشدِ عام (امیر) ہیں اور علم و فضل اور عمل کے اعتبار سے جس کی شخصیت حسن البنّاء شہید سے ملتی جلتی ہے!

حسن بن اسمٰعیل اپنی ممتاز صلاحیتوں سے اپنے لئے ایک خاص مقام حاصل کر چکے ہیں، موجودہ نازک اور ناساز گار حالات میں اگر "اخوان" کی قیادت آپ کے ہاتھوں میں نہ ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ "اخوان" کو کچل دیا جاتا۔ موصوف کی صلاحیت کار اور فراست کا یہ نتیجہ ہے کہ ان نازک حالات میں "اخوان المسلمون" نہ صرف یہ کہ زندہ رہی بلکہ اُس کے وقار میں اور اضافہ ہو گیا۔ (مترجم)

سب سے پہلے میں نے اسے اُس کے ہاتھوں کے لگائے ہوئے پودوں سے پہچانا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مجھے جب دیہاتوں اور شہروں میں جانے کا اتفاق ہوتا تو حق و صداقت اور کامل آزادی کے داعی "اخوان المسلمون" کے اشتہارات دیکھنے میں آتے میں یہی سمجھتا کہ یہ بھی کوئی ایسی ہی انجمن ہوگی جو حفظ قرآن، غربا نوازی اور نماز روزہ کی تبلیغ کرتی پھرتی ہیں، اور جنھوں نے حق و صداقت اور آزادی کا مفہوم بس اتنا ہی سمجھ رکھا ہے۔ اور نماز روزہ اور حفظ قرآن کی حد تک ہی ان کے فکر کی پرواز ہے۔ اس لئے میں نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی، ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ قرآن پڑھتے ہیں لیکن نہ تو اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ عمل کی طرف بڑھتے ہیں نماز روزہ اور حج وغیرہ ادا کرتے ہیں لیکن ان عبادات سے ان کے دل کوئی اثر قبول نہیں کرتے، اور ان کی زندگیوں میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا، غربا نوازی ہوگی لیکن اکثر بلا موقع و محل کے اور دین کے تقاضوں سے ہٹی ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ایسی انجمنیں معاشرے کے سنجیدہ عنصر کے لئے اپنے اندر کوئی کشش نہیں رکھتیں۔ اور اسی لئے میں نے "اخوان المسلمون" کو سمجھنے کے لئے کسی قسم کی کوشش نہ کی۔

پھر ایک روز چند دیہاتی نوجوان مجھ سے ملنے کے لئے آئے عمر اور مرتبہ میں اپنے سے بڑوں سے ملنے میں نوجوانوں کے اندر جو جھجک پائی جاتی ہے اور جس کی وجہ سے وہ ایسی ملاقاتوں سے ہچکچاتے ہیں، یہ سب کچھ ان میں نہیں تھا ان کے دلوں میں جراَت تھی یقین اور اعتماد تھا نشست و برخاست میں ایک وقار تھا باتیں ہونے لگیں۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ یہ دیہات کے رہنے والے معمولی پڑھے لکھے بڑے کتنے ادب کے ساتھ بڑوں کے پاس بیٹھتے ہیں ان میں ذرہ بھر تصنع اور

بناوٹ کی جھلک نظر نہیں آتی۔ سب کو برابر سمجھتے ہیں یہ محسوس نہیں کرتے کہ کوئی کسی سے بڑا ہے۔ مسئلہ مصر کے متعلق وہ باتیں کرتے رہے جیسے کوئی مہذب اور لکھا پڑھا نوجوان باتیں کر رہا ہو۔ اس مسئلہ کو پیش کرنے اور گفت و شنید میں جتنی غلطیاں سرزد ہو چکی تھیں۔ وہ ان سے خوب واقف تھے اور صرف ان سے واقف ہی نہ تھے بلکہ ان سب کا ایسا حل بھی ان کے پاس تھا جسے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ دینی مسائل میں ان کی گفتگو نہایت ہی سلجھی ہوئی اور تقلید کی بندشوں سے یکسر آزاد تھی اور صرف دینی مسائل پر ہی نہیں بلکہ جنھیں خالص دنیوی مسائل سمجھا جاتا ہے۔ ان پر بھی بولنے کی ایسی ہی قدرت رکھتے تھے۔ مجھے ان سب باتوں سے بڑا تعجب ہوا اور میں نے پوچھا تم لوگوں نے یہ سب کچھ کہاں سے سیکھا ہے؟ کہنے لگے ہم — "الاخوان المسلمون" سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی دعوت ہمہ گیر ہے، تربیت، اخلاق، سیاست، معیشت معاشرے کی اصلاح اور سب چھوٹے بڑے مسائل پر حاوی ہے، زندگی کا کوئی گوشہ بھی اس کے ہمہ گیر تصور سے الگ نہیں۔

اس دن سے مجھے اخوان کی تحریک سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور میں نے ان کا لٹریچر پڑھنا شروع کر دیا، داعی سے تعارف کا موقع پیدا ہوئے بغیر ان کی دعوت سے دلچسپی بڑھتی گئی میں نے اسے اس کے ہاتھوں کے لگائے ہوئے پودوں سے پہچانا تھا ع

قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا

انھی دنوں کا واقعہ ہے کہ ایک شام کو اپنے دوستوں کے ساتھ نیل کے کنارے سیر کر رہا تھا کہ کچھ لوگ ہم سے ملے۔ ہم نے ان سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ حسن البناء آج رات تقریر کر رہے تھے۔ ہم بھی جلسے میں گئے اور حسن البناء کی تقریر سنی۔

" .. .. ہماری نگاہیں حسن البناء پر جمی ہوئی تھیں، پُر کیف محویت کا عالم طاری تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ نور یا مقناطیس کا ہالہ اس چہرے کے گرد پڑا ہوا ہے جس سے جاذبیت بڑھتی جا رہی ہے اور دل کھنچے چلے جاتے ہیں۔ ۔ ۔

" .. یہ تقریر کوئی ایک گھنٹے چالیس منٹ تک جاری رہی اور اس اثنا میں مجھے یہ خلش رہی کہ تقریر ختم ہو جائے گی اور یہ روح پرور افسون ٹوٹ جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ .. اس کی بات پر خلوص دل کی گہرائیوں سے نکلتی اور دلوں میں اترتی چلی جاتی ——— میں نے جب کبھی کسی کی تقریر سنی یہی تمنا رہی کہ اللہ کرے جلد ختم ہو لیکن یہاں تو بات ہی اور تھی

" .. .. .. وہ ایک پرسکون، شفاف ندی کا بہتا ہوا پانی تھا وہ ایک ایسا دل نشین نغمہ اور شیریں راگ تھا جس کی تانیں ٹوٹتی ہی نہیں، جو زیر و بم سے نا آشنا ہیں، اس میں سوز ہے، کیف ہے، نور ایمان ہے اور علم و اطلاع کے ذخیرے ہیں!

ایک عرصہ گزر گیا اور مجھے ان سے ملنے کا موقع نہ مل سکا، اور جب ملنے کا اتفاق ہوا تو میں نے ان کو نہایت ہی متواضع پایا اور تصنع سے پاک دیکھا۔ وہ بے مثل متانت اور وسیع علم کا مالک تھا، ان کے ذہن کی وسعتیں ہر چھوٹی اور بڑی بات کو سمیٹے ہوئے تھیں، ان کی امیدیں ٹھوس اور بلند تھیں، اور ان سب خصوصیات پر تعصب اور لالچ سے پاک ایک دینی روح چھائی ہوئی تھی، "وکذالک جعلنا کم امۃ وسطاً" بلاشبہ وہ ایک موہوب شخصیت تھی!

اور آج میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میں نے ان کے منہ سے کوئی ایک کلمہ بھی ایسا نہیں سنا جس میں کسی کی آبرو اور دین پر ناشائستہ اشارہ بھی کیا گیا ہو، حتیٰ کہ ان لوگوں کے متعلق بھی جنھوں نے ان کو دکھ پہونچائے اور آبرو اور دین پر حملے کئے،

وہ اللہ کی قائم کردہ حدود کا سختی سے پابند تھا، یہ وہ حسن البناء ہے جسے قتل کر دیا گیا.. ۔ ۔ ۔ صدیوں کے بعد خطۂ ارضی پر ایک عظیم داعی پیدا ہوا جسے قتل کر دیا گیا۔

ترجمہ عربی اشعار:-

"میرے[1] ساتھی نے مجھے قبروں پر روتا دیکھ کر ملامت کی کہ میں آنسو نہ بہاؤں!

اور کہا "کیا تم لواء اور دکادک کے درمیان واقع ایک خاص قبر کی یاد میں جس قبر کو دیکھتے ہو رو دیتے ہو؟

میں نے کہا "چھوڑ دو بھی، غم غم کو ابھارتا ہے (میرے لئے) یہ سب قبریں مالک کی قبریں ہیں"

اور اب حسن البناء کا لگایا ہوا پودا جس سے میں نے اسے پہچانا تھا جوان ہو چکا ہے اور کتاب اللہ کی طرف ان کی دعوت دلوں میں جم چکی ہے۔ ان کے شاگرد آج معلم بن کر لوگوں کو حق و صداقت کی تعلیم دے رہے ہیں تمام مشکلات کے باوجود وہ بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ آج وہ پہلے سے زیادہ باجرا اور صابر ہیں، ہر ظلم کو برداشت کرنے کے خوگر بن چکے ہیں، اور یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کی دعوت کے دشمن اس کے ساتھیوں سے بہت زیادہ ہیں۔

اور آج وہ ایک طویل جدوجہد کے لئے سر بکف ہیں:—— "الاخوان المسلمون" آج صرف مصر کی ایک تنظیم کا ہی نام نہیں بلکہ وہ عالم اسلام میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک احیاء اسلام اور اسے پوری طرح نافذ و قایم کرنے والی تحریک کا نام ہے اور انشاء اللہ رہے گا۔—— اخوان کا نام آج انڈونیشیا، سوریا اور پاکستان میں گونج رہا ہے اور جو مقامی حالات کی بنا پر "الاخوان المسلمون" کے نام سے موسوم نہیں وہ ان کے دعوتی اسلوب، مقاصد اور طریق کار میں ہمنوا ہیں وہ عوام کو صحیح اسلام سمجھانے اور اسلام کو ان تمام خرافات سے پاک کرنے میں پوری سرگرمی کو شاں ہیں جو اسلام میں نہیں ہے لیکن اس کے جز بنا دیئے گئے ہیں،

سامراجی اور ان کے مددگار یا منافق اور ظالم اس دعوت میں اپنے لئے خطرہ محسوس کر رہے ہیں، اور اس سے مرعوب ہیں اس لئے کہ حق جہاں کہیں بھی پایا جائے باطل اس سے خوفزدہ رہتا ہے۔ حسن البناء نے اپنی دعوت پھیلائی، اپنا پیغام پہونچا دیا اور اپنے رب کے ہاں خوش خوش پہونچ گئے!

یا ایتہا النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیة، فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی" — اے اطمینان والی روح! تو اپنے پروردگار کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش ہو اور وہ تجھ سے خوش، پھر تو میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا!

اور اب ان کے شاگردوں اور ساتھیوں کو وہ بوجھ اٹھا لینا چاہیئے جسے حسن البناء صبر و استقامت اور قوت و اخلاص کے ساتھ اٹھائے ہوئے تھے۔ . . . اور وہ انشاء اللہ ضرور اٹھائیں گے۔

ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز۔ الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰة واٰتوا الزکوٰة وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبة الامور، — اور بیشک اللہ تعالےٰ اس کی مدد کریگا جو کہ اللہ کی مدد کریگا، بیشک اللہ تعالےٰ قوت والا اور غلبہ والا ہے یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں گے اور زکوٰة دیں اور نیک کاموں کے کرنے کو کہیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے،

---

[1] یہ اشعار اس مشہور مرثیہ کے ہیں جو متمم بن نویرہ نے اپنے بھائی مالک کی موت پر کہے تھے حضرت عمر رضی اللہ کی فرمائش پر متمم بن نویرہ نے ان کے بھائی زید بن خطاب رض کی وفات پر ایک مرثیہ کہا، حضرت عمر رضی اللہ نے اس مرثیہ کو ایسا پسند فرمایا جیسا مالک کا مرثیہ تھا متمم بن نویرہ نے عرض کیا:- "زید میرا بھائی نہیں مالک میرا بھائی تھا"

تازہ ترین

جگر مرادآبادی

دورِ صہبا ہے کہ فردوس بداماں ہے ساقی

آج بھی یوں تو ہر اک رند جواں ہے ساقی — مگر اک آن جو پہلے تھی کہاں ہے ساقی

طنز و تعریض کی آخر کوئی حد ہوتی ہے — آدمی ہوں مرے منہ میں بھی زباں ہے ساقی

کعبہ و دیر کا چھٹنا تو گوارا لیکن — دل کو آرام وہاں تھا نہ یہاں ہے ساقی

اپنے منصب کا نہ احساس نہ رندوں کی خبر — دیر سے آج خدا جانے کہاں ہے ساقی

دو رباعیاں!

جوش ملیح آبادی

اک غنچہ کھلا تو لاکھ غنچے نکلے — اک نکتہ کھلا تو لاکھ نکتے نکلے

پیچیدہ معمہ سے برآمد ہوا حل — حل کو کھولا تو سو معمے نکلے

اختر رضوانی

نکلا ہے تمناؤں کا حاصل کیا کیا — ڈوبے ہیں سفینے لبِ ساحل کیا کیا

اک لفظ "ترقی" کا سہارا لیکر — احباب ہوئے رو بہ تنزل کیا کیا

واردات

ندیم جعفری

کبھی یقیں کے کرشمے، کبھی جہاں کے فریب — عجیب رنگ سے کھائے ترے جہاں کے فریب

جو کچھ گزر رہی ہے گزر جائے گی مگر — پہونچے نہ بات اُس نگہِ شرمسار تک

اب دل ہے اور تہمتِ شوقِ گریز پا — حالانکہ بات تھی یہ ترے انتظار تک

ہو گیا حرفِ تمنا داستاں در داستاں — بن گئے کونین میں افسانہ در افسانہ ہم

محسوسات

عزیز حاصل پوری

زندگی کی راہ میں حاصل کسے آرام ہے — زندگی بے تابیٔ جذبات ہی کا نام ہے

جسکو حاصل ہے خوشی وہ غم بھی دیکھے گا ضرور — صبح کی آمد حقیقت میں دلیلِ شام ہے

آبلہ پائی مری سیراب کس کس کو کرے — خارزارِ دشت میں ہر خار تشنہ کام ہے

بزدلی ہے دوریٔ منزل سے گھبرانا عزیز — پائے ہمت کے لئے ہر فاصلہ دو گام ہے

شفیق جونپوری

دو غزلیں

اب خانۂ صیاد پہ الزام نہیں ہے
ہم کو تو نشیمن میں بھی آرام نہیں ہے

گر دیکھنے والے کی طلب خام نہیں ہے
وہ کونسا جلوہ ہے جو بیجام نہیں ہے

میں خوش ہوں کہ تخصیصِ جفا میرے لئے ہے
شایانِ محبت کرمِ عام نہیں ہے

دیکھو تو محبت ہی محبت ہے جہاں میں
ڈھونڈھو تو زمانے میں کہیں نام نہیں ہے

میں ہوں کہ مری آہ سے دنیا کو شکایت
تو ہو کہ جفا کر کے بھی بدنام نہیں ہے

انساں پہ ہے انساں کی حکومت اگر اے دوست
فردوسِ بریں بھی ہو تو آرام نہیں ہے

منعم کو ہے پردیس میں بھی دیس کی راحت
نادار تجھے گھر میں بھی آرام نہیں ہے

زلفوں کی گھٹا ہو، رخِ رنگیں کی بہاریں
ساقی ہو تو قیدِ سحر و شام نہیں ہے

۲

آئینہ کچھ بھی نہیں آئینہ گر سب کچھ ہے
یہ سمجھ لے تو حقیقت میں نظر سب کچھ ہے

عشق نازاں کہ مرا فیضِ نظر سب کچھ ہے
حسن کہتا ہے جدھر میں ہوں ادھر سب کچھ ہے

قدرِ شب کب ہوئی جب ڈوب گئے سب تارے
اسی دھوکے میں رہے ہم کہ سحر سب کچھ ہے

ہمنفس وہ بھی جسے دیکھ کے رو دیتے ہوں
وہی اجڑی ہوئی ویران نظر سب کچھ ہے

بے حجابی نے کیا حسن کو رسوا آخر
ہم نہ کہتے تھے بس پردۂ در سب کچھ ہے

کششِ سوزِ نہاں حد ادب سے نہ بڑھے
ان کی معصوم نگاہوں کو خبر سب کچھ ہے

ایک ٹوٹے ہوئے آئینۂ دل میں بخدا
دیکھنا چاہو تو اے اہلِ نظر سب کچھ ہے

اک ذرا نیند سی آنکھوں پہ ہے طاری ورنہ
آج بھی بندۂ مومن کی نظر سب کچھ ہے

لاکھ ہوتی رہے مریخ و قمر کی تحقیق
اپنی ہستی کو بھی سمجھے تو بشر سب کچھ ہے

اقبال

کارواں خواب میں تھا "بانگِ درا" سے پہلے　　ساز میں سوز نہ تھا تیری نوا سے پہلے

اللہ اللہ! ترا قافلۂ نطق و کلام　　"بالِ جبریل" کے سایہ میں ہوا گرمِ خرام

صرف مشرق نہیں، مغرب کو بھی پیغام دیے　　نگہ و فکر پہ "اسرارِ خودی" فاش کیے

تو کبھی شعلۂ رقصاں، کبھی رفتارِ نسیم　　موجِ کوثر ترے اشعار، کہیں "ضربِ کلیم"

اک نئی طرز، نئے باب کا آغاز کیا　　"شکوہ" اللہ تعالیٰ سے بصد ناز کیا

حُسن و اُلفت کے فسانوں میں نہ ہوس شامل تھی　　تو نے تقدیس عطا کی، انھیں عصمت بخشی

چہرۂ فکر و معانی کو نکھارا تو نے　　زلفِ دوشیزۂ اُردو کو سنوارا تو نے

تیرے شعروں میں کہیں معرکۂ بدر و حنین　　کہیں ایمانِ براہیمؑ، کہیں عزمِ حسینؓ

اس لئے ہے تری ایک ایک مجھے بات قبول　　تیرا سرمایۂ دانش تھا فقط عشقِ رسولؐ

تو کہ لندن کی بھی راتوں میں سحرخیز رہا　　غیر ماحول میں خوددار و کم آمیز رہا

ہو سکے ضبط نہ اسپین میں تجھ سے آنسو　　قوم کے غم میں تری آنکھ نے رویا ہے لہو

اس قدر خوفِ خدا، سوزِ دروں، جذبۂ حق　　بھیگ جاتے تھے ترے اشک سے قرآں کے ورق

محفلِ رومیؒ و عطارؒ تھی مدت سے خموش　　تیرے نغموں نے بنایا اُسے ہنگامۂ جوش

علم و حکمت کے مسائل کو دیا شعر کا رنگ　　کس نزاکت سے ہم آہنگ کیے شیشہ و سنگ

فکرِ افسردہ کو پرواز عطا کی تو نے
لبِ خاموش کو آواز عطا کی تو نے

ماہر القادری

حسن شاہ خیالی

اور وہ کہتی رہی!

"جب دیکھئے جب وظیفہ پڑھ رہے ہیں یا کتاب پڑھ رہے ہیں لڑکے بڑے ہوئے جا رہے ہیں ان کی تعلیم کا خیال نہیں، لڑکی جوان ہو رہی ہے اس کی شادی کی فکر نہیں۔ بس میں زیور بیچے جاؤں اور گھر چلائے جاؤں آپ سے کچھ نہ کہوں" حمیدہ نے بہت ہی جھلا کر کہا۔

نصیر نے بڑی مایوسی کے ساتھ حمیدہ کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ کیسی مسکراہٹ! رونے سے بدتر۔ اور بولا "میں سمجھتا تھا کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے اور تم بڑی سمجھدار ہو۔ یہ دونوں باتیں غلط نکلیں۔" حمیدہ کو غصہ تو بہت تھا مگر وہ نصیر کی اس بات پر ہنس پڑی اور ترچھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا، جو اس کی عادت تھی، اس نے کہا "اچھا، اس تمام ہوحق کے باوجود ابھی اس محبت اور عشقبازی کا خیال جناب کو باقی ہے؟"

"کیوں کیا ہوا" نصیر نے جھپٹ کر کہا۔ "بیوی سے محبت اور عشق میں کیا عیب ہے، اس پر میری "ہوحق" کیوں قابل طعن ہے۔ پھر میں نے اپنی محبت اور عشق بازی کا ذکر ہی کب کیا یہ تو تمہاری سنگدلی کی شکایت ہے کہ اس طرح اعتراض کر رہی ہو؟"

حمیدہ نے شوخی سے جواب دیا "میں نے اس قسم کی بیوقوفی کا کب دعویٰ کیا تھا جس میں آپ مبتلا تھے اور سمجھ رہے تھے کہ میں بھی ہوں؟"

نصیر نے متحیر ہو کر کہا "کیا واقعی تمہیں مجھ سے کبھی محبت نہ تھی"؟

حمیدہ اور قریب آ کر نصیر کے بالکل مقابل کھڑی ہو گئی اور خوش طبعی سے بولی "کیوں نہ ہوتی؟ بہت ہے۔ مگر وہ ملکوتی محبت نہیں کہ "کوئی غرض نہیں ہے، کوئی مقصد نہیں ہے، بس ایک بار نظر بھر کے دیکھ لوں، تمہارے خیال میں بیٹھا رہوں، تمہاری یاد میں محو رہوں۔" مجھے تو تمہارے ساتھ ایسی محبت تھی جیسی مرد کے ساتھ عورت کو ہوتی ہے اور ایسی ہے جیسی بیوی کو میاں کے ساتھ ہونی چاہیئے۔"

نصیر نے حیرت اور سنجیدگی سے کہا "کیا مطلب؟ مجھے تمہارے ساتھ ایسی محبت تھی جیسی مرد کے ساتھ عورت کو ہوتی ہے؟"

حمیدہ نے برجستہ جواب دیا۔ "سیدھی سی بات ہے۔ میں جانتی تھی کہ مجھے کسی نہ کسی کی بیوی بننا ہے۔ یہاں سے پسند اور ناپسند کا معاملہ شروع ہو گیا۔ میرے دل میں یہ تمنائیں پیدا ہونے لگیں کہ وہ شخص وجیہ ہو، خوش رو ہو، تندرست ہو، بہادر ہو، سمجھدار ہو، ذی علم ہو، کمانے والا ہو، میرا قدردان ہو اور وہ ہر اچھی بات جو مرد میں ہونی چاہیئے اس میں ضرور ہو۔ مگر اس میں عیب کیا تھا جو تم پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ کیا میں تلاش میں نکلی تھی؟ میں نے ریشہ دوانیاں کی تھیں؟ میں نے تمہارے پاس پیغام بھیجے تھے؟ تمہیں لبھایا تھا، تمہارے سامنے اپنی نمائش کی تھی۔ تم ہی پرچے اور پرزے لکھ لکھ کر میرے کمرے میں پھینکتے تھے۔ اُف! میں کیسی سہمی ہوئی رہتی تھی کہ کسی نے دیکھ لیا تو سات پشت کی ناک

کٹ جائے گی۔ مجھے غصہ آتا تھا اور جی میں کہتی تھی کہ یہ کیسا آدمی ہے، ابا جان کے پاس پیغام کیوں نہیں بھیجا۔ مجھے معلوم تھا ابا جان منتظر تھے۔ مگر آپ تو بے عمل آدمی ٹھیرے، مدتوں اپنے آپ خلجان میں رہے اور مجھے رکھا۔"

نصیر نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "تمہیں کیسے خلجان میں رکھا؟ تمہیں تو محبت ہی نہ تھی۔"؟

"پھر وہی الٹی باتیں" حمیدہ ذرا شرما گئی "میں نے کب کہا کہ محبت نہ تھی۔ تمہارے خطوط نے اور تمہاری تاک جھانک نے میری یکسوئی میں خلل ڈالا اور مجھے بھی تمہارا خیال رہنے لگا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ تم اسی گروہ سے تھے جس میں میری شادی ہو سکتی تھی۔ گھر میں یہ ذکر بھی سنتی تھی کہ لڑکا بہت اچھا ہے حمیدہ کا اس سے رشتہ ہو جائے تو اچھا ہے۔ تمہارا خود ستائی کو جی چاہتا تھا تم نے شادی کے بعد مجھ سے پوچھا کہ "تمہیں مجھ سے محبت تھی میں نے کہدیا کہ تھی اور سچ کہا۔" حمیدہ نے یہ کہہ کر نظریں نیچی کر لیں اور ہنسنے لگی۔

نصیر نے فخر آمیز شکایت سے کہا "پھر آپ کو کیوں نفرت ہو گئی"؟

حمیدہ حسرت زدہ نصیر کے مقابل تخت پر بیٹھ کر بولی "نفرت! نفرت کیسی!! یہ نفرت ہے کہ اس آزاد اور خود مختار ملک کی تعمیر میں جو اللہ کا ایک عظیم عطیہ ہے میں تمہاری صلاحیتوں کو بروئے کار دیکھنا چاہتی ہوں، تمہارے بچوں کی تعلیم و تربیت کیلئے وہ سامان مانگتی ہوں جس سے وہ ملک و ملت کا نام روشن کرنے کے قابل ہوں، اور وقت آ جائے تو میدان جنگ میں اسی شیر کے بچے ثابت ہوں جو تنہا حملہ آور شیاطین کے مجمع میں برچھا تان کر گھس گیا تھا اور جب انہیں بھگا کر واپس آیا تو جسم پر گہرے زخم تھے۔ میں تو دہلی کے اس واقعہ پر ساری عمر نازاں رہوں گی، مگر تمہارے لئے بھی اس میں ایک سبق ہے۔ جب اللہ کے بھروسے پر تم نے اقدام کیا تو دوسرے مسلمانوں کی بھی ہمت بندھی اور وہ نعرے لگاتے ہوئے تمہارے ساتھ شریک ہو گئے۔ اللہ اسی طرح مدد کرتا ہے۔ وہ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھنے والوں پر اپنی نعمت ضائع نہیں کرتا۔"

نصیر نے خفیف ہو کر کہا "تو پھر یہ برہمی کیوں ہے؟ نماز، روزہ، ذکر اور فکر ایسی بری چیزیں نہیں کہ تم ان پر مسلسل اعتراض اور طعن کئے چلی جا رہی ہو"؟

"پھر بات کو الٹ کر دیا" حمیدہ نے جھلا کر کہا "میں کیا مسلمان نہیں ہوں کہ نماز، روزے اور ذکر و فکر پر اعتراض کروں مگر یہ اللہ کے ساتھ آپ کا ویسا ہی عشق ہے جیسا میرے ساتھ تھا کہ بلاوجہ آہ و شیون میں مصروف ہیں۔ عمل میں بھی تو کچھ ہونا چاہئیے۔ آپ تو صرف ذکر اور فکر کی لذت میں مست پڑے رہتے ہیں۔

نصیر نے مسکرا کر کہا "میرے عشق میں کیا خرابی ہے"؟

حمیدہ نے مستعدی سے جواب دیا "بے عملی بجائے خود بداعمالی ہے" "نماز، روزہ، ذکر اور فکر عمل نہیں"؟ نصیر نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "جی نہیں۔ یہ خوش اعمالی کے لئے تربیت ہے" حمیدہ نے زور دیکر کہا "تاکہ اپنی تمام صفات کے ساتھ اللہ بندے کے فکر و خیال پر چھا جائے۔ یہ ہوتے ہی وہ ان کاموں میں مصروف ہو جاتا ہے جن سے اللہ راضی ہو۔ بیوی بچوں کی پرورش ان میں بڑا اہم کام ہے، معاشرتی زندگی کی بنیاد۔ اللہ کی رضا جوئی کی فکر میں جتنے کام کئے جاتے ہیں سب عبادت ہیں اور ان میں مصروفیت کا ہر لمحہ ذکر و فکر ہوتا ہے۔ آپ شعر خوانی فرماتے ہیں، وفور عشق کے مزے لیتے ہیں۔ میں تو اس کی بالکل قائل نہیں۔ میرے ساتھ آپ کو بڑی محبت ہے۔ تین بچے ہو لئے اس وقت تک گرویدگی کا وہی انداز ہے جو ابتداء میں تھا مگر مجھے کبھی اپنے فرائض کی انجام دہی سے غافل پایا؟ بتایئے؟ خدمتگار کی طرح

صبح سے شام تک لگی رہتی ہوں اور اسی میں خوش ہوں۔ آپ سمجھتے ہوں گے یہ سب میں آپ کے لئے کرتی ہوں اور بچوں کی ممتا ہے۔ بالکل نہیں۔ میں نے تو اسی روز اپنی خواہشات کو اپنے رب کے حکم کے تابع کر دیا جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ شوہر کی خوشنودی کے لئے بیوی کا سنگھار کرنا بھی عبادت ہے، بشرطیکہ اللہ کے حکم کی تعمیل میں ہو۔ گویا محض نیت صحیح رکھنے کے اجر میں اس نے وہ سب باتیں میرے لئے حلال ہی نہیں کیں جو میرے نفس کو مرغوب ہیں، بلکہ انہیں عبادت بنا دیا۔ البتہ میں حدود سے نہیں گزر سکتی۔ اول تو خدا کا شکر ہے کہ آپ اس قماش کے مرد ہی نہیں اور اگر ہوتے بھی تو میں خلوت کو جلوت میں خوار کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوتی۔ کتنی ہیں جو مردوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سڑکوں پر گھومتی ہیں۔ یہ شوہروں کی خوشنودی کے لئے کرتی ہوں یا نفس کے تقاضے سے بہر حال جرم کرتی ہیں۔ اگر انہیں اللہ کا خوف ہوتا، یا اس کی رضا جوئی کی فکر، تو یہ ایسے شوہروں سے طلاق لے لیتیں۔

"تم طلاق لے لیتیں" نصیر نے شوخی سے کہا

"ضرور اور فوراً اللہ کو ناراض کر کے تم سے نکاح قائم رکھتی تو میرے حقوق کی حفاظت کون کرتا۔ اس وقت تو میں اس کی وکالت میں ہوں ذرا حق تلفی کر کے دیکھئے کل قیامت کے دن کیسی گوشمالی ہوتی ہے" یہ کہہ کر حمیدہ خوب ہنستی ہوئی برآمدے کی طرف چلی گئی۔

تھوڑی دیر میں وہ ایک پان لئے ہوئے آئی، اپنے ہی ہاتھ سے وہ اس نے نصیر کو کھلایا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی پشت پر زور دے کر وہ اس کے پاس بیٹھ گئی، اور بولی "دیکھئے میری آپ سے دو فرمائشیں ہیں۔ پہلی یہ کہ کوئی کاروبار کیجئے اور دوسری یہ کہ اس پر سنجیدگی سے غور کیجئے کہ ہندوستان میں مسلمان کیوں ایسے ذلیل ہوئے اور ان پر اللہ نے اس قوم کو مسلط کر دیا جو سات سو برس تک ان کی محکوم رہی تھی۔ یہ خواہ مخواہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے کچھ اسباب ہیں۔ ان اسباب کو دفع کرنے کیلئے سخت جدوجہد کیجئے، اس کام میں اپنی زندگی صرف کر دیجئے۔ آج اس سے بڑی اور کوئی عبادت نہیں۔ بیشک یہ بڑی مہم ہے مگر مجھے اعتماد ہے کہ اس کے سر کرنے کی صلاحیتیں اللہ نے آپ کو دی ہیں۔ انہیں بیٹھ کر ضائع کرنا ناشکری ہوگی۔ کیسے تعجب کی بات ہے کہ مسلمان اپنی ان تمام ذلتوں اور خواریوں کو بھول گئے جو ہندوستان میں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ یہاں آ کر ناچ رہے ہیں ہنس رہے ہیں اور عیش و نشاط میں مصروف ہیں۔ انہیں کیا ہو گیا ہے! انہیں غیرت نہیں آتی! یہ پاکستان عیش و نشاط کے لئے بنایا تھا! یہ لاکھوں جانیں ان کی رنگ رلیوں کے لئے ضائع ہوئی تھیں! پھر ان ہزاروں عورتوں اور لڑکیوں کی تذلیل جو آج تک کفار کی ہوس کا شکار ہیں! اُف یہ پاکستانی مرد اب تک کیسے اپنے آپ کو مرد اور مسلمان سمجھے جاتے ہیں! یہ ہنستے کیسے ہیں!! انہیں نیند کیسے آتی ہے!

روحِ انتخاب

ریاضات و مجاہدات جو تقلید سنّت نبویؐ کے سواء اختیار کرتے ہیں۔ معتبر نہیں۔ کیونکہ ہندو جوگی اور برہمن اور فلاسفۂ یونان بھی اس امر میں شریک ہیں مگر وہ ریاضات ان کے حق میں بجز ضلالت کے اور کچھ نہیں بڑھاتے اور بغیر خسارت کے اور کسی طرف رستہ نہیں دکھاتے۔

مشایخ رح سے جو شطحیات (مغلوب الحالی کے کلام) ظاہر ہوئے ہیں۔ اور انھوں نے مخالف شریعت سخن کیا ہے۔ وہ بھی طریقت کی رو سے مقام کفر میں ہیں۔ کیوں کہ یہ موقع سکر اور بے تمیزی کا ہے۔ جو بزرگان حقیقی اسلام کی دولت سے مشرف ہوئے ہیں۔ وہ اس قسم کی باتوں سے پاک و مبرا ہیں اور ظاہر و باطن میں انبیاء کی اقتداء کرتے ہیں۔

لوگ یوم عاشورہ۔ شب برات۔ شب ۲۷ رجب اور اول شب جمعہ ماہ مذکور جس کو لیلۃ الرغائب کہتے ہیں کمال تے ہیں اور پورے اطمینان سے نوافل کو با جماعت ادا کرتے ہیں اور اس فعل کو نیک و مستحسن شمار کرتے ہیں جانتے کہ یہ امور شیطان کے فریب ہیں جو برائیوں کو اچھائیوں کی صورت میں دکھاتا ہے۔

لیکن کابرین کے احوال میں استقامت ہے۔ اس قسم کی موہوم عبادتوں کو تجویز نہیں کرتے۔ اور بغیر اجمال و تفصیل یا استدلال و کشف کے اور کوئی فرق نہیں سمجھتے

سلوک جس سے مراد شریعت کی پابندی ہے مثل توبہ و زہد وغیرہ اگر جذبہ سے نہ ملایا جائے۔ تو جذب ناتمام اور ناقص ہے بہت سے بے دین ہندو لوگوں کو ہم نے دیکھا ہے کہ وہ بھی جذب رکھتے ہیں۔ مگر چونکہ صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت سے آراستہ نہیں ہیں۔ اس لئے خراب و ابتر ہیں اور سوائے جذب کی ظاہری صورت کے اور کچھ ان کے حصہ میں نہیں ہے۔

شریعت کی مخالفت (اگرچہ بال برابر بھی ہو) کے ہوتے ہوئے اگر وجد و حال حاصل ہو تو وہ استدراج میں داخل ہے۔ انجام کار یہ چیزیں اس کو رسوا کریں گی۔ محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے بغیر خلاصی ناممکن ہے۔

علوم شرعیہ جن کا منبع منصب نبوت ہے سراسر صحو (ہوش کی چیزیں) ہیں۔ اور ان علوم کے مخالف جو چیز بھی ہو وہ سکر کی وجہ سے ہے۔

کوئی شخص بھی القاء شیطانی سے محفوظ نہیں جب انبیاء میں یہ چیز متصور کیا متحقق ہو۔ تو اولیاء میں تو بطریق اولیٰ ہوگی۔ بڑھ سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس القاء پر متنبہ کئے جاتے ہیں اور ان کے باطل کو حق سے جدا کر دیتے ہیں

علماء کے علوم نبوت رسول اللہ صلعم کے چراغ (دراصل طاقچہ چراغ) سے حاصل کئے گئے ہیں جن کی تائید وحی قطعی سے کی گئی ہے۔ اور ان صوفیہ کے علوم و معارف کا منبع کشف و الہام ہے جہاں خطا کا دخل ہے۔

پس سالک کو چاہیئے کہ حقیقت کار تک واصل ہونے سے قبل باوجود اپنے کشف و الہام کی مخالفت کے علماءِ اہلِ حق کی تقلید کو لازم جانے۔ علماء کو حق پر اور اپنے آپ کو خطا پر سمجھے۔ کیونکہ علماء کا سہارا تقلیدِ انبیاء علیہم السلام ہے۔ جن کی تائید وحی قطعی سے ہوئی ہے۔ اور جو خطا و غلطی سے محفوظ ہے اور اس کا کشف و الہام احکامِ ثابتہ بالوحی سے مخالفت کی بنا پر خطا اور غلط ہیں پس اپنے کشف کو قولِ علماء پر مقدم رکھنا فی الحقیقت احکامِ قطعیہ منزلہ پر مقدم رکھنا ہے۔ اور یہ عین ضلالت و خسارت ہے۔

یہ مقام منجملہ اغلاط کشف کے ہے الغرض جو چیز قطعی ہے اور لائق اعتماد ہے وہ کتاب و سنت ہے وہ وحی قطعی سے ثابت شدہ ہے

میں نے اپنے والد بزرگوار سے سنا کہ فرماتے تھے کہ بہتر فرقوں میں سے جو اکثر گمراہ ہوئے ہیں اور راہِ راست گم کر بیٹھے ہیں ان سب کا باعث طریقِ صوفیہ میں داخل ہونا ہے۔ کیونکہ انجام تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے غلطیوں میں پڑ گئے۔ اور گمراہ ہو گئے۔

صوفیہ کی سکر والی باتوں سے بھلا کیا ملتا ہے اور ان کے حال و وجد سے کیا کچھ بڑھ جائے گا۔ وہاں تو وجد و حال کو جب تک ترازوئے شرع سے وزن نہ کریں نصف پیسہ کے بدلے نہیں خریدتے اور کشف و الہام کو جب تک کتاب و سنت کی کسوٹی پر نہ کسیں۔ نصف جَو کے بدلے لینے کو پسند نہیں کرتے۔ طریقِ صوفیہ پر چلنے کا مقصد اعتقاداتِ شرعیہ میں زیادتی یقین کو حاصل کرنا ہے۔ جو کہ حقیقتِ ایمان ہے۔ نیز ادائیگی احکامِ عملیہ میں سہولت بھی حاصل کرنا ہے۔ نہ کہ اس کے علاوہ کوئی بات۔

قیاس و اجتہاد اصولِ شرعیہ میں سے ایک اصل ہے جس کی پیروی کے لئے ہم مامور ہیں۔ برخلاف کشف و الہام کے کہ ہم کو اس کی پیروی کا امر نہیں فرمایا۔ الہام دوسروں پر حجت نہیں

اس بارے میں انتہائی چیز یہ ہے کہ خطائے کشف، خطائے اجتہادی کا حکم رکھتی ہے جس میں ملامت و عتاب اٹھا لیا گیا ہے۔ بلکہ درجاتِ ثبوت میں سے ایک درجہ اس کے حق میں متحقق ہے۔ ہاں اس قدر فرق ہے کہ مقلدانِ مجتہد بھی مجتہد کا حکم رکھتے ہیں اور خطا کے صدور پر درجاتِ ثواب میں سے ایک درجہ پاتے ہیں۔ برخلاف مقلدانِ اہلِ کشف کہ وہ معذور نہیں ہیں اور خطا کے صدور پر ایک درجۂ ثواب سے بھی محروم ہیں۔ کیونکہ الہام و کشف غیر پر حجت نہیں ہیں۔ اس قسم کے مغالطے صوفیہ کو بہت ہوتے ہیں۔

کوئی ایسی ضروری بات نہیں کہ شریعت کے سوا اس کی احتیاج پڑے۔ طریقت و حقیقت جس کے ساتھ صوفیہ ممتاز ہیں۔ ہر دو خادمِ شریعت ہیں

شریعت کے ایک جزو بنام اخلاص کی تکمیل کے لئے طریقت و حقیقت خادمِ شریعت ہیں حقیقت کار بس یہی ہے۔ لیکن ہر ایک کا فہم یہاں تک نہیں پہنچتا۔ اکثر جہاں کے لوگ خواب و خیال میں آرام کئے ہوئے ہیں اور اخروٹ اور کشمش پر اکتفا کرتے ہوئے شریعت کے کمالات کو کیا جانیں۔ اور طریقت و حقیقت کی حقیقت تک کہاں پہنچیں یہ لوگ شریعت کو پوست خیال کرتے ہیں اور حقیقت کو مغز نہیں جانتے کہ حقیقتِ معاملہ کیا ہے صوفیہ کی بےہوشی کی باتوں پر دھوکہ کھائے ہوئے ہیں اور احوال و مقامات پر مفتون ہیں۔

کیونکہ حقیقت و طریقت سے مراد حقیقتِ شریعت ہے اور طریقت بھی اسی کی حقیقت ہی ہے نہ یہ کہ شریعت کوئی علیحدہ چیز ہے اور طریقت و حقیقت کوئی اور چیز ہیں۔ یہ الحاد و زندقہ ہے۔

پس طریقت و حقیقت جو ولایت سے وابستہ ہیں۔ خادمانِ شریعت ہیں جو کہ مرتبۂ نبوت سے پیدا ہوئے۔ مختصر یہ کہ شریعت کے بغیر چارہ نہیں خواہ صورتِ شریعت ہو یا حقیقتِ شریعت اس لئے کہ تمام اعلےٰ سے اعلیٰ کمالات ولایت و نبوت، خود احکامِ شرعیہ ہیں۔ کمالاتِ ولایت تو صورتِ شریعت کا نتیجہ ہیں۔ اور کمالاتِ نبوت، حقیقتِ شریعت کا ثمرہ۔

واجب الوجود تعالےٰ شانہٗ کی ذات وصفات کی معرفت کے متعلق جو کچھ شرع میں وارد ہوا ہے۔ اس کی شناخت کرنا واجب ہے۔ اور جو معرفت کہ شریعت کے باہر سے حاصل ہو۔ فقیر کے نزدیک اس کو معرفتِ خدا کہنا جرأت ہے۔ اور حق تعالےٰ پر ظن وتخمین سے حکم لگانا ہے۔ قول تعالےٰ:۔ تم اللہ پر وہ چیز کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔ (تقولون علی اللہ مالا تعلمون)

ظاہر کو ظاہر شریعت روشن سے آراستہ کرنا اور باطن کو ہمیشہ حق تعالےٰ سے وابستہ رکھنا کارِ عظیم ہے۔ دیکھیں کہ کس صاحبِ قسمت کو ان دو نعمتوں سے مشرف کرتے ہیں۔ آج کل ان دو نسبتوں کو جمع کرنا بلکہ خود ظاہرِ شریعت پر استقامت کرنا بھی بہت مشکل ہے۔ بلکہ کبریتِ احمر سے بھی نہایت کمیاب۔

علماءِ ظاہر اہلِ سنت خواہ بعض اعمال میں قاصر کیوں نہ ہوں۔ مگر پھر بھی ذات وصفات کے متعلق ان کی درستیٔ عقاید کا جمال اس قدر نورانیت رکھتا ہے کہ اس کے مقابلے میں وہ کوتاہی مضمحل اور ناچیز نظر آتی ہے اور بعض صوفیہ باوجود ریاضات ومجاہدات کے چونکہ ذات وصفات کے متعلق اس قدر درستیٔ عقیدہ نہیں رکھتے۔ اس لئے وہ جمال ان میں نہیں پایا جاتا۔ اب علماء اور طالبانِ علم کی محبت بہت پیدا ہو گئی ہے اور ان کا طریق خوش معلوم ہوتا ہے۔ بندہ آرزو رکھتا ہے کہ ان کے زمرہ میں رہے۔

پس علماء کی نظر صوفیہ کی نظر سے بلند واقع ہوئی ہے اور وہ ذات جو ان صوفیہ کے نزدیک ثابت ہے۔ وہ ان علماء کی نگاہ میں ماسویٰ میں داخل ہے۔

آپ کا یہ ذکر کرنا کہ نظر ہمت میں طالبانِ علم صوفیہ پر مقدم ہیں۔ بہت ہی زیبا نظر آیا۔ مشہور ہے ظاہر، باطن کا عنوان ہے۔ ۔ ۔ ۔ طالب علموں کو مقدم رکھنے سے ترویج شریعت حاصل ہوتی ہے۔ وہی لوگ حاملانِ شریعت ہیں اور ملتِ رسول اللہ صلعم انھی سے قائم ہے۔ کل قیامت کے روز شریعت کے متعلق پوچھیں گے۔ تصوف کے متعلق نہ پوچھیں گے

جاننا چاہیئے کہ جس جس مسئلہ میں علماء اور صوفیہ باہمی اختلاف رکھتے ہیں۔ جب آپ باریک نظر سے ملاحظہ فرمائیں گے تو حق بجانب علماء کو پائیں گے۔ اس میں راز یہ ہے۔ کہ علماء کی نظر تو بوجہ متابعتِ انبیاء علیہم السلام کے کمالات وعلومِ نبوت میں نفوذ کر چکی ہے۔ اور صوفیہ کی نظر صرف کمالات ومعارف وولایت میں محدود ہے!

(مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ)

ہماری نظر میں

فتویٰ دیوبند کا تحقیقی جائزہ "جماعت اسلامی کے متعلق فتویٰ دیوبند کا تحقیقی جائزہ" از:- ابو محمد امام الدین رام نگری
ضخامت ۱۱۸ صفحات، قیمت غیر مجلد ایک روپیہ چار آنہ، مجلد ایک روپیہ آٹھ آنہ ——— ملنے کا پتہ:- مکتبہ تحفظ اردو رام نگر بنارس اسٹیٹ (بھارت)

جماعت اسلامی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی مخالفت میں دیوبند سے جو فتویٰ شائع ہوا تھا اُس پر "فاران" کے صفحات پر تنقید کی جا چکی ہے ——— اب جناب ابو محمد امام الدین رام نگری نے علماء دیوبند کی ان تحریروں اور فتووں کے ما لہ و ما علیہ پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور دیوبند کے "مفتیانِ کرام" نے جو الزامات تراشے ہیں اُن کی کمزوریاں ظاہر کی ہیں اور وہ بھی دلیلوں اور کتابوں کے حوالوں کے ساتھ! فاضل مصنف نے جو کچھ لکھا ہے، انتہائی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ لکھا ہے، مولانا ابو محمد امام الدین کو اللہ تعالےٰ جزائے خیر عطاء فرمائے گا کہ اُن کی یہ کتاب بہت سے پڑھنے والوں کو جماعتِ اسلامی کی بارے میں بدگمانی سے بچالے گی۔

دیوبند کی علمی خدمات بہت شاندار ہیں، ہندستان سے لے کر خاکِ سمرقند و بخارا تک کی اس چشمہ نے آبیاری کی ہے اور زنجبار و افریقہ کی زمین بھی اس ابرِ کرم کی منت گزار ہے، دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کا آغاز حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہما اللہ تعالیٰ کی دینی اور علمی خدمات سے ہوتا ہے یہ وہ بزرگ تھے جن کی پاک زندگی نے تابعینِ کرام کی یاد تازہ کر دی تھی، دیوبند نے علما ہی نہیں مجاہد بھی پیدا کئے ہیں اور ان میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس سرہٗ کا نام سرِ فہرست نظر آتا ہے!

جس دیوبند کا ماضی اس قدر تابناک رہا ہو اور جس کی دینی خدمات اس درجہ شاندار ہوں اُس کو "جماعتِ اسلامی" کے خلاف معرکہ آرا دیکھ کر جس قدر تکلیف ہوتی ہے اُس کا اظہار نہ زبان سے ممکن ہے اور نہ قلم سے! جماعتِ اسلامی "دین" کے جس کامل اور ہمہ گیر پروگرام کو لیکر اُٹھی ہے، اُس کی سب سے زیادہ "دیوبند" ہی سے تائید ہونی چاہیئے تھی، ہم نیازمند اس اُمید میں تھے کہ حق کی اس آواز پر "دیوبند" سے "لبیک" کی صدائیں بلند ہوں گی ——— مگر یہ دیکھ کر دل لہو لہو ہوگیا کہ تائید و معاونت تو ایک طرف رہی، مذہبی طبقہ میں "جماعتِ اسلامی" کی سب سے زیادہ مخالفت میں "دیوبند" ہی پیش پیش ہے!

علماء دیوبند کی تحریریں، فتوے اور جناب مولانا سید حسین احمد مدنی اور مولانا ابواللیث ندوی امیر جماعت اسلامی ہند کی خط و کتابت ہم نے پڑھی ہے، مولانا ابواللیث صاحب نے مولانا مدنی کی خدمت میں حاضر ہونے کی کتنی کوشش کی، مقصد یہ تھا کہ جماعتِ اسلامی کے لٹریچر کے جن حصوں پر علماء دیوبند کو اعتراض ہے اُن کو صاف کر دیا جائے، گفتگو میں بہت سی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کے رفع ہونے کا امکان ہے، مگر ملنے سے گریز فرمایا گیا یہاں تک کہ جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کے خلاف فتووں کی مہم شروع ہوگئی!

اس عناد اور مخالفت کی "لے" یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ جماعتِ اسلامی کی اچھی سے اچھی چیز کو بھی لوگوں

کے سامنے مشتبہ انداز میں پیش کیا جاتا ہے اور کوئی عیب نہ ہونے پر بھی "مودودی طرزِ فکر" کا الزام لگا کر اس پر طعن کی جاتی ہے تاکہ لوگوں میں اسلامی جماعت اور اُس کے لٹریچر سے بدگمانی اور بیزاری پھیلے یا کم سے کم شبہ تو پیدا ہو جائے۔

چار مہینے ہوئے رام پور کے مشہور رسالہ "الحسنات" نے "سیرت نمبر" شائع کیا تھا اُس پر دارالعلوم دیوبند کے آرگن مجلہ "دارالعلوم" نے جو تبصرہ فرمایا ہے، اُسے ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

"ابوسلیم عبدالحیٔ صاحب جماعت اسلامی ہند کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں۔ جس طرح اور کئی جرائد و رسائل بڑے لوگوں تک مودودی صاحب کی خاص تعلیمات و افکار کو پہونچانے کا کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح "الحسنات" بچوں کی دنیا میں ان کے ذہن سے قریب رہ کر یہ خاص فکر پھیلانے پر مامور ہے۔ اور ہماری دیانتدارانہ رائے ہے کہ جب تک مودودی صاحب کے لٹریچر سے حدیث نبی کریم صلی اللہ وسلم۔ صحابہ کرام اور فقہ و تصوف سے متعلق ان دراز دستیوں کو نہیں نکال دیا جاتا جن پر علماء امت نے دینی نقطۂ نظر سے اعتراض کئے ہیں اُس وقت تک "الحسنات" کو اپنے لٹریچر میں ان افکار کی آمیزش نہ کرنی چاہیئے۔ چونکہ وہ بچوں کا رسالہ ہے۔ اس لئے بچوں کی ذہنی تربیت کے سلسلہ میں اس کی بڑی ذمہ داریاں ہیں۔ الحسنات کے زیر نظر سیرت نمبر میں ایک بڑی کمی تو ہمیں یہ نظر آئی کہ اپنے خاص اسکول کے سوا دوسرے طبقات کو اس میں لکھنے کی دعوت نہیں دی گئی جتنے مضامین ہیں وہ انھی حضرات کے ہیں۔ جو یا مودودی فکر سے اتنا تعلق رکھتے ہیں کہ انھوں نے اس فکر کے سامنے دوسرے تمام افکار کا انکار کر دیا ہے۔ حالانکہ ذکر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس ایک ایسی مجلس ہے جس میں اس طبقہ واریت کا خیال بھی نہ آنا چاہیئے تھا۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مودودی جماعت سے باہر دوسرے حلقوں میں بحمد اللہ اس وقت بھی ایسے بہت سے علماء و فضلاء موجود ہیں جو سیرت کا گہرا اور محققانہ علم رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر بڑی بڑی کتابیں ان کے قلم سے نکلی ہیں۔ ان حضرات سے اگر مضامین حاصل کئے جاتے تو وہ ہر چند ایک مخصوص نقطۂ نظر کی ترجمانی تو نہ کرتے۔ مگر سیرت نبوی کے موضوع پر ان کے مضامین کی بڑی حیثیت ہوتی۔ دوسری بڑی کمی اس نمبر کے مضامین کی یہ ہے کہ سب مضامین اپنے خاص افکار کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ ایک دو مضامین کو چھوڑ کر بقیہ سب مضامین میں واقعات سے نتائج اخذ کرنے کا انداز وہی ہے۔ جو تحریک جماعت اسلامی کے سارے لٹریچر کی بنیاد ہے۔ مضامین کی اس خاص تربیت سے الگ ہو کر اس کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ ادارہ الحسنات نے اس نمبر پر کافی محنت کی ہے۔ اگرچہ اس مختصر سے مجموعہ کو سیرت نبوی کا کوئی بڑا ذخیرہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن جو کچھ ہے اس سے ادارۂ الحسنات کی محنت۔ خوش سلیقگی اور حسنِ ترتیب کا نمایاں ثبوت ملتا ہے۔"

جن حضرات نے رسالہ "الحسنات" کے "سیرت نمبر" کو نہیں پڑھا وہ ہماری گزارش پر اسے پڑھ کر دیکھیں اور پھر فیصلہ فرمائیں کہ اس شمارے میں وہ کونسی بے دانشی، بدعقیدگی اور دین کی غلط ترجمانی پائی جاتی ہے جسے "مودودی فکر" سے تعبیر کیا گیا ہے؟ "الحسنات" کے "سیرت نمبر" کے مطالعہ کی سعادت ہم حاصل کر چکے ہیں اور خدا جانتا ہے کہ ایک ایک سطر پر مضمون نگاروں اور رسالہ کے ترتیب دینے والے کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک پر اس قدر شگفتہ اور معلومات آفریں مضامین جو بچوں کی نفسیات سے بھی ملتے جلتے ہوں، بہت کم دیکھنے میں آئے ہیں، کتنی پاکیزہ نظروں سے یہ "سیرت نمبر" مزین ہے اور قرآنی آیات کی روشنی میں نبی اُمّی (ﷺ) کی زندگی کا

کی سیرتِ مقدسہ کو جس اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا ہے وہ اپنی جگہ بے مثال جدت اور شاہکار ندرت ہے!

سیرت نمبر کے بعض مضامین میں اس کی ضرور جھلک پائی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالےٰ کے حکم سے عرب میں عملاً دین کے نظام کو قایم کیا اور حضورؐ جس اسلامی حکومت کو چھوڑ کر دنیا سے تشریف لے گئے ہیں اس حکومت میں اللہ تعالےٰ کے سوا اور کسی کا قانون نہ چلتا تھا ـــــــ اگر اس کا نام "مودودی فکر" ہے، تو "مودودی فکر" پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں ـــــــ اور ہماری دعا ہے۔ کہ

؎ الٰہی ساری دنیا کو یہی آزار ہو جائے

اللہ اور رسولؐ کے احکام کو عملاً نافذ کرنے کا نام اگر "مودودی فکر" ہے، ایک ایسی حکومت کے قیام کے لئے جدوجہد کرنا جہاں کا اقتدارا علیٰ اللہ تعالیٰ کی "حاکمیت" ہو ـــــــ اگر "مودودی فکر" ہے تو خدا گواہ ہے کہ یہ ٹھیک قرآنی فکر ہے اور اس "فکر" پر جو طنز کرتا ہے، وہ خود دین کو ہدفِ ملامت بناتا ہے!

ماہنامہ "دارالعلوم" کی اس تنقید میں "مودودی صاحب" جو لکھا گیا ہے وہ "دیوبند" کی موجودہ ذہنیت کی غمازی کرتا ہے حالانکہ وہ اپنے یہاں کے بعض اُن لوگوں کو "مولوی" اور "مولانا" لکھتے اور کہتے ہیں کہ جن کو دارالعلوم دیوبند سے رسمی طور پر "اسناد" تو عطاء فرمادی جاتی ہیں مگر اُن کی علمی بصیرت اور دینی فہم جیسی کچھ ہوتی ہے اُس سے خود اکابرِ دیوبند ناواقف نہیں ہیں ـــــــ ان حضرات کو یہی "جذبہ" (؟) تو بے چین کئے ہوئے ہے کہ یہ "مودودی" جسے کسی دارالعلوم سے نہ تو دستارِ فضیلت عطاء ہوئی، نہ کسی شیخِ طریقت نے اُسے خرقۂ خلافت عطا فرمایا، یہاں تک کہ تصوف کے کسی خانوادے سے اُسے "شجرہ" بھی نہیں دیا گیا ـــــــ اُس کو دین و تقویٰ کے بارے میں گفتگو کرنے کا حق کیا ہے؟ ہم بات کو زیادہ بڑھانا نہیں چاہتے، صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ "الجہاد فی الاسلام" "پردہ" "حقوق الزوجین" اور "تفہیم القرآن" کا مصنف اگر "مولوی" "مولانا" اور "عالمِ دین" نہیں ہے تو پھر اس موجودہ دنیا میں کسی "عالمِ دین" کا شاید وجود ہی نہیں پایا جاتا۔

انہی مفتیانِ کرام اور علماءِ عظام کی اس افسوسناک ذہنیت کی پرچھائیں مدرسہ مظاہر العلوم پر پڑ گئی تھی کہ بے چارے مولانا محمد زکریا قدوسی مرحوم جیسے نیک نفس انسان کو جماعتِ اسلامی کی رکنیت کی پاداش میں مدرسہ سے علیحدہ ہونا پڑا، کیا ان کا تفقہ، تقویٰ اور تصوف اسی قسم کا ظلم سکھاتا ہے، مومن کی فراست تو ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے، وہ دوست دشمن میں نہایت آسانی سے تمیز کر لیتا ہے، اُسے تو خوب و ناخوب کی بڑی پرکھ ہوتی ہے، اگر ان حضرات کی "فراست" جماعتِ اسلامی کا لٹریچر پڑھ کر اسی نتیجہ پر پہونچی ہے کہ یہ بے دینوں کی جماعت ہے، اور اس جماعت کی کتابیں مسلمانوں کو دین سے بیزار بناتی ہیں ـــــــ تو پوری دیانت اور احسان و تقویٰ کی تمام صفات کے باوجود یہ بے دانشی کا فیصلا اور یہ ایک فاسد رائے ہے! آدمی نیک نیتی کے ساتھ بے خبری کے عالم میں اگر کسی فکری یا عملی لغزش کا مرتکب ہو جائے، تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اُس کو معاف کر دے گا، مگر جن لوگوں کو اُن کی غلطی پر متنبہ کیا جائے، ان کو بتایا جائے کہ تم نے فلاں مسئلہ میں جو رائے دی غلط ہے، فلاں شخص کے بارے میں جو بات کہی ہے اُس میں صحت نہیں ہے، اصل حقیقت یہ اور یوں ہے ـــــــ اور سب کچھ جاننے اور معلوم کرنے کے بعد بھی کوئی اپنی رائے پر جما رہے تو یہ حقیقت میں بہت بڑی بدتوفیقی

"جماعتِ اسلامی" اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لئے اُٹھی ہے، یہی اُس کا مقصد ہے، یہی اُس کی منزل ہے اور یہی اُس کی تمنا ہے، لہٰذا جو کوئی جماعتِ اسلامی کو بدنام کرتا اُس پر تہمتیں جوڑتا اور اُس کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلاتا ہے وہ حقیقت میں "صدعن سبیل اللہ" کے جرم کا ارتکاب کرتا ہے، جو حضرات جماعتِ اسلامی کی دُشمنی اور مخالفت میں مُبتلا ہیں وہ دراصل دین و صداقت کے راستہ میں دیواریں کھڑی کر رہے ہیں! آج "جماعتِ اسلامی" کے متعلق سب کچھ کہا اور کیا جاسکتا ہے، اُس سے متاثرین مدرسین مدرسوں سے نکالے جاسکتے ہیں اور اُس کے متفقین طلباء کو پریشان کیا جاسکتا ہے، مسجدوں کے دروازے بھی اُن پر بند ہوسکتے ہیں مگر کل قیامت کے دن جب میزانِ عدالت کھڑی ہوگی اُس دن کے لئے بھی یہ "مفتیانِ عظام" اور "حامیانِ دینِ مبین" کچھ سوچ رکھیں ——— ہمیں اندیشہ ہے کہ اُن کی "فقیہانہ موشگافیاں" کہیں اُس دن اُن کے لئے شرمندگی کا سبب نہ بن جائیں۔

اقبالؔ کے اس مصرعہ کو:-

؎ دینِ ملّا فی سبیل اللہ فساد

بارہا پڑھا تھا مگر اُس کے حقیقی معنی ان "فتووں" کے بعد سمجھ میں آئے۔ - - - ؟؟

مفتیانِ دیوبند کو شاید اس کا علم نہیں ہے کہ اُن کے فتووں نے جہاں بعض لوگوں کو جماعتِ اسلامی سے بیزاری اور بدگمانی میں مبتلا کیا ہے، وہاں خود اُنھی کے حلقہ میں ایسے حق پرست علماء اور اہلِ بصیرت افراد بھی ہیں، جو ان فتووں کو پڑھ کر جماعتِ اسلامی سے اور قریب ہوگئے اور اُن کی حق شناسی پر گروہی عصبیت غالب نہ آسکی!

آنے والے مورخ بڑی حیرت اور انتہائی دردناکی کے ساتھ ان واقعات کو قلمبند فرمائیں گے کہ ایک جماعت نظامِ حق کو قایم کرنے کے لئے اُٹھی تھی اور اُس کے گرانے اور نیچا دکھانے کی ذمہ داری اُن علماء نے اپنے ذمہ لے لی تھی جن سے دعوت و ارشاد، تصوف و تقویٰ، علم و تفقہ اور طریقت و بیعت کی بہت سی نسبتیں وابستہ تھیں!

اللہ کا دین اب صرف حُجروں، خانقاہوں اور مسجدوں میں محدود ہو کر نہیں رہ سکتا اُسے حکومت، معیشت اور تجارت و سیاست پر بھی غالب آنا ہے، چاہے یہ "مفتیانِ شیوہ بیان" دین کے اس غلبہ کو "خلافِ سُنت" اور "دُنیا داری" ہی کیوں نہ بتاتے رہیں اور اس انداز کی جدوجہد کرنے والوں کے کام میں ان کو چاہے "خارجیت" ہی کیوں نہ نظر آئے!

فاران

جلد ——————— ۴
شمارہ ——————— ۳

— ماہنامہ —

فاران

جون سنہ ۱۹۵۲ء

— ایڈیٹر —

ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپے (پاکستانی) ——— فی پرچہ ۸ آنے
۸ روپے (ہندستانی) ——— فی پرچہ ۱۱ آنے

مقامِ اشاعت

دفتر فاران :-
کیمبل اسٹریٹ
کراچی نمبر ۱

نظم و ترتیب

حصۂ نظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل!

وہ پاکستان جو اسلام اور صرف اسلام کے مقدس نام پر وجود میں آیا ہے اُسی پاکستان کی ایک ریاست سوات میں جماعت اسلامی کے کارکنوں پر جو ظلم ہوا ہے اُس نے حجاج کے ظالمانہ کارناموں کو پھر سے زندہ کر دیا ہے، کسی فرد، جماعت یا اس کے کارکنوں کے طریق کار اور مسلک سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے بلکہ کیا جا سکتا ہے مگر اختلاف کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ شرافت و انسانیت اور عدل و قانون کی ساری حدیں توڑ دی جائیں اور حکومت یا اُس کے کارندے اور گماشتے بالکل وحشیانہ حرکات پر اتر آئیں۔ ——— سوات اگر کوئی کافر حکومت ہوتی اور اس کا والی ہندو، سکھ، عیسائی، مجوسی یا یہودی ہوتا تو غیرت مند دلوں کو شاید اس قدر اذیت نہ ہوتی اور یہ کہہ کر اور سوچ کر مضطرب قلب کو تسلی دی جا سکتی تھی کہ کفر کو اسلام سے سدا کا بیر ہے، ایسا ہونا کوئی غیر متوقع بات نہیں ہے، کفر نے اہلِ ایمان کے لئے بارہا آتشکدے بھڑکائے ہیں اور صلیبیں کھڑی کی ہیں ...... مگر سوات کا والی تو اللہ کے فضل سے مسلمان ہے، جو اللہ اور رسولؐ پر ایمان رکھتا ہے اور کلمہ گویوں کے حقوق پہچانتا ہے، تو ایک مسلمان والیٔ ریاست کا خود اپنے دینی بھائیوں کو اس طرح بے عزت کرنا، اُن پر ظلم و ستم ڈھانا اور جبر و ستم کے شکنجوں میں کسنا، انتہائی تکلیف دہ اور نہایت درجہ مذموم اور افسوسناک ہے!

ہم والیٔ ریاست سوات اور وہاں کے ارکان حکومت سے دریافت کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے کارکنوں نے آخر کس جرم کا ارتکاب کیا تھا جس کی پاداش میں اُن کو ان شدائد اور عقوبتوں کا نشانہ بنایا گیا، کیا انھوں نے سوات کی پردہ نشین خواتین کو بے پردہ کرنے کے لئے وہاں کوئی "اپوا" (A. P. W. A.) قائم کی تھی، کیا اُن بیچاروں نے کوئی مینا بازار لگایا تھا، قمار بازی کے اسٹال قائم کئے تھے، رقص و سرود کے جلسوں کا اہتمام کیا تھا، شراب خانے اور ناچ گھر بنائے تھے، ناجائز طریقوں سے تجارتی پرمٹ حاصل کئے تھے، کسی کا مال مارا تھا، کسی کا حق غصب کیا تھا، کسی کی بہو بیٹی کو بُری نظروں سے دیکھا تھا، رشوت دی تھی یا لی تھی، چور بازاری کی تھی، کسی اسلامی شعار کی توہین کی تھی ——— آخر اُن کا قصور کیا تھا، اور وہ کس جرم کے مرتکب ہوئے تھے جس کی اُن کو اس درجہ اہانت آمیز سزائیں دی گئیں جو

پیشہ ور مجرموں کو بھی نہیں دی جاتیں۔

جماعتِ اسلامی کا مسلک اس کا پروگرام اور اُس کے کارکنوں کی زندگیاں سب کے سامنے ہیں، اُن کے پروگرام کا کوئی جُز خفیہ اور پوشیدہ نہیں ہے وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں یا کرنے کا عزم رکھتے ہیں اور جو اُن کا مسلک ہے [illegible] عوام کے سامنے واشگاف انداز میں کھول کر سامنے رکھ دیا ہے، اُن کی ہر بات عالم آشکار ہے اس [illegible] کو پیش کرتے ہیں اور اسلام نہ کوئی معمہ ہے نہ کوئی راز اور خفیہ اسکیم ہے وہ تو اپنی فطرت [illegible] واقع ہوا ہے!

جماعتِ اسلامی کے ارکان اللہ کے دین کا غلبہ چاہتے ہیں مسجدوں اور خانقاہوں سے لیکر [illegible] اُن کی تمام جدوجہد کا محور اور مرکز نظامِ اسلامی کا قیام ہے! یعنی یہ کہ دنیا میں اللہ اور رسول کے [illegible] حقیقی حاکمیت اللہ تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے اور اس حق میں اُس کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا، جماعتِ اسلامی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بنیاد پر قائم ہوئی ہے وہ اسلام کو "مذہب" نہیں دین کامل سمجھتی ہے ——— ایسا دین جس کے حدودِ عمل میں مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں ہی نہیں، تجارت گاہیں، کھیتیاں، ڈیری فارم، مدرسے، کالج، دفاتر، پارلیمان، کارخانے اور تمام کاروباری ادارے شامل ہیں، اسلام۔ قیصر اور کلیسا کی تقسیم کو گوارا نہیں کر سکتا، اسلام راہبوں اور بکشوؤں کا مذہب نہیں ہے کہ جو دنیا کو چھوڑ کر خانقاہوں میں معتکف اور غاروں اور جنگلوں میں اقامت گزیں ہو جاتے ہیں، اسلام تو انسانوں سے، اُن کے گرد و پیش سے اور اُن کی مدنی زندگی سے سروکار رکھتا ہے، وہ اُن انسانوں ہی کے لئے تو ضابطۂ حیات اور دستورِ زندگی بنا کر بھیجا گیا ہے جو اس مادی دنیا میں رہتے ہیں! اسلام صالحیت، پاکبازی، نیکی اور تقوے کی اس تحدید اور تنگ دامانی کو پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتا کہ تقویٰ بس مسجدوں، مدرسوں اور خانقاہوں ہی میں گھٹ کر رہ جائے اسلام کا تقاضا تو یہ ہے کہ مسجدوں سے لیکر حکومت کے ایوانوں تک تقویٰ اور صالحیت کا دور دورہ ہو، اور فاسقوں فاجروں اور اپنی زندگی سے اسلامی احکام کی نفی کرنے والوں کو زمامِ حکومت ہرگز ہرگز نہ سونپی جائے اور جہاں غلطی سے سونپ دی گئی ہو، وہاں اس کی جدوجہد کرنی چاہئے کہ حکومت کی کنجیاں غلط کاروں کے ہاتھوں سے نکل کر صالح آدمیوں کے ہاتھوں میں آجائیں تاکہ اللہ کی زمین پر نیکی کو زیادہ سے زیادہ پھیلنے کے مواقع میسر آسکیں!

یہ وہ پروگرام ہے جو جماعتِ اسلامی کے پیشِ نظر ہے اور جس کو بروئے کار لانے کے لئے اُس کے ارکان جدوجہد کر رہے ہیں، پاکستان کی پانچ سالہ تاریخ گواہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کے کارکنوں نے جس قدر ضبط و نظم اور امن پسندی کے ساتھ کام کیا ہے اُس کی مثال دوسری فعال جماعتوں میں ملنا مشکل ہے، ایسا بھی ہوا ہے کہ اُن کے اجتماعات میں دوسری پارٹی کے لوگوں نے انتشار پیدا کرنے کی کھلم کھلا کوشش کی ہے مگر جماعتِ اسلامی والوں نے انتہائی صبر و ضبط سے کام لیکر ٹکراؤ کی نوبت نہیں آنے دی! پنجاب کا الیکشن اُن کی نیکوکاری امن پسندی ڈسپلن اور حق شناسی کی سب سے بڑی شہادت ہے، انھوں نے ظاہری شکست قبول کر لی مگر ووٹوں کی تعداد بڑھانے کے لئے ناجائز ذرائع استعمال نہیں کئے ——— "ظاہری شکست" ہم نے اس وجہ سے کہا ہے کہ اخلاقی مورچوں پر حقیقی فتح جماعتِ اسلامی کی ہی ہوئی، اخباروں میں مسلم لیگ کی فتح لکھی گئی مگر اللہ کے رجسٹر میں نصرت کے خانہ میں اُن کا نام لکھا گیا جنھوں نے عدل و تقویٰ کی حد سے تجاوز نہیں کیا!

جس جماعت کا یہ پروگرام اور یہ کردار ہو اُس کے کارکنوں کے ساتھ ریاست سوات میں جو ظالمانہ سلوک کیا گیا ہے

وہ دین، اخلاق، تمدن، تہذیب اور حکومت کے عام قانون، غرض کسی نقطۂ نگاہ سے بھی جائز نہیں ہے، والیٔ سوات اور ان کے حالی موالی خدا کے ان نیک بندوں کو ستا کر خوش نہ ہوں بلکہ اس دور روزہ حکومت پر نہ اترائیں، ایک دن آئے گا جب اُن کی خدا کے حضور پیشی ہوگی اور اس دن اس ظلم کے لئے وہ کوئی عذر پیش نہ کر سکیں گے، وہ بڑا سخت دن ہوگا ظالموں کے لئے! انصاف کی ترازو کھڑی ہوگی اور اللہ تعالیٰ عدل و نصفت کے پُر جلال تخت پر جلوہ افروز ہوگا، ظالم اور بدکار جہنم کی طرف بُری طرح سے ہانکے جا رہے ہوں گے اور کوئی زمین و آسمان کے برابر زر و مال دے کر بھی اللہ کے احتساب سے چھٹکارا نہ پا سکے گا، اللہ تعالیٰ کے یہاں رشوتیں نہیں چلتیں، وہاں ڈالیاں اور تحفے قبول نہیں کئے جاتے اور نہ کسی کی خوشامد اس کے انصاف میں لچک پیدا کر سکتی ہے، آج دنیوی قانون کی لچک سے فائدہ اٹھا کر، بڑے آدمیوں کی پشت پناہی کے بھروسہ پر اپنے ہوا خواہوں کی امداد اور زر و مال کا سہارا لیکر عقوبتِ جرم سے بچا جا سکتا ہے، واقعات کی تلبیس کی جا سکتی ہے، حقائق چھپائے جا سکتے ہیں مگر کل قیامت کے دن ان میں سے ایک سہارا بھی کام نہ آئے گا!

خاص و عام سب جانتے ہیں کہ پاکستان میں جماعت اسلامی کے مٹھی بھر ارکان آزمائشوں میں ڈالے جا رہے ہیں، قید و بند، پولیس کی نگرانی، دفتروں سے اخراج، رسالوں اور اخباروں کی بندش، لٹریچر پر پابندی اس قسم کی تمام صعوبتیں اس کے ارکان برداشت کرتے رہے ہیں مگر ریاست سوات کی جماعت اسلامی کے ارکان اپنی قربانیوں میں سب سے آگے بڑھ گئے، ہم اس سعادت پر ان کو مبارکباد دیتے ہیں، اُن کی استقامت اس گئے گزرے زمانہ میں ایک مثال ہے ارباب بصیرت اور اہل دل کے لئے! ملک کی عام روش کو دیکھ کر کبھی کبھار دل میں یاس کی جھلک پیدا ہو جاتی تھی مگر خدا جانتا ہے کہ سوات کے ان مردانِ مجاہد نے ہماری ہمتوں کو بلند اور ہمارے عزائم کو مضبوط تر کر دیا، دل نے کہا اور ضمیر نے اس کی تصدیق کی کہ جس سرزمین میں ایسے جانباز حق پرست موجود ہوں وہاں بجا حق کو کوئی طاقت دبا سکتی ہے، نہیں باطل جو دبانے کی کوشش کرے گا وہ خود دب کر رہ جائے گا۔

سوات کے مظلوم مجاہدو! تم پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں اور خدا کی نصرت ہر آن تمہارے ساتھ رہے، جب طائف کے بازاروں میں دنیا کے سب سے بڑے انسان پر پتھروں کی بارش ہو رہی تھی اور بازاری چھوکرے اس کے پیچھے تالیاں بجا رہے تھے ــــــ جب بلالؓ حبشی کو گرم ریت پر لٹا کر جلتے ہوئے پتھروں سے داغا جا رہا تھا ــــــ جب حسینؓ کا سر نیزے کی انی پر رکھا ہوا تھا ــــــ جب عبد اللہؓ ابن زبیر کی لاش لٹک رہی تھی ــــــ جب امام مالکؒ کی مدینہ کے بازاروں میں تشہیر ہو رہی تھی ــــــ جب امام احمدؒ بن حنبل کو بوجھل بیڑیاں پہنا کر بغداد سے طرطوس لے جایا جا رہا تھا اور معتصم باللہ کے حکم سے اُن کی پیٹھ پر کوڑے برس رہے تھے ــــــ اس وقت کیا ہو رہا تھا؟ حق و صداقت کی تاریخ لکھی جا رہی تھی، فتح و نصرت کے مرقعے کھینچ رہے تھے، کامیابیوں کے دروازے کھل رہے تھے، عزتیں بلند تر ہو رہی تھیں، حق اونچا ہوا چلا جا رہا تھا، تمہیں مبارک باد کہ حق کی راہ میں تمہاری قربانیوں نے بھی اس روشن تاریخ میں چند سطروں کا اضافہ کر دیا

سلام اُس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں
بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سرفروشی کے فسانے میں

تم تو خدا کی قسم معزز ہو اللہ کی نگاہ میں بھی اور بندوں کی نظروں میں بھی! ذلیل، پست اور سفلہ تو وہ ہیں

جنھوں نے تمھارے ساتھ اتنا گراہوا سلوک کیا۔ تم تاریخ کی پیداوار نہیں ہو بلکہ خود تاریخ ساز ہو، تم زندہ ہو کر آنے والے مورخ جب تمہارا حال لکھیں گے تو فرطِ عقیدت سے اُن کے قلم جھک جھک جائیں گے، شاہراہوں اور بازاروں میں کشاں کشاں تشہیر کرنا مجرموں اور غلط کاروں کے لئے ذلت کا سبب ہوتا ہے، مگر حق پرستوں کی تو یہ معراج ہوتی ہے، ہمارا دل کہہ رہا ہے کہ جب سوات کے گلی کوچوں میں اے مجاہد! تمھاری ڈاڑھی کے بال نوچے جارہے تھے اور تمھیں زدوکوب کیا جارہا تھا تو اُس وقت نبی امی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی روحِ مقدس کو مخاطب کر کے تم زبانِ حال سے عرض کر رہے ہوگے

بجرمِ عشق توام می کشند غوغائیست
تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشائیست

لمحۂ فکریہ

ہم نے بارہا اس مسئلہ پر کافی غور و خوض کیا کہ آخر بات کیا ہے کہ ایک دُنیا جماعتِ اسلامی کی مخالفت پر تُلی ہوئی ہے؟ علمائے کرام اور مفتیانِ عظام[1] اُس کے درپئے تخریب ہیں ارباب اقتدار کی پیشانیاں جماعتِ اسلامی کا نام سُن کر شکن آلود ہو جاتی ہیں، کمیونسٹوں کو اُس سے بیر ہے، اور مغرب زدہ طبقہ تو اُس کے نام سے کانوں پہ ہاتھ دھرتا ہے ——— اس عام مخالفت کے یہ معنیٰ ہیں کہ جماعتِ اسلامی میں یا تو کوئی خرابی موجود ہے یا اُس کے کارکنوں میں کوئی ایسی بُرائی پائی جاتی ہے جس نے لوگوں کو اُن کا مخالف بنا دیا ہے!

ہم نے پہلے جماعتِ اسلامی کے لٹریچر اور اُس کے پروگرام پر نظر ڈالی اور خدا جانتا ہے کہ ہمیں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جو لوگوں کو جماعتِ اسلامی کی دشمنی پر آمادہ کر دے، جماعتِ اسلامی کا لٹریچر پاکیزہ ترین لٹریچر ہے، اس میں دین، اخلاق اور انسانیت کی اتنی دل نشین ترجمانی کی گئی ہے کہ کم سے کم اُردو زبان میں تو اس کی مثال نہیں ملتی، ہمیں ایسے بہت سے نوجوان ملے ہیں، جن کی زندگیاں جماعتِ اسلامی کا لٹریچر پڑھ کر بدل گئی ہیں، وہ دین و اخلاق سے پہلے جتنے دُور تھے، اُتنے ہی اب قریب ہو گئے ہیں، جماعتِ اسلامی کے ادب نے بہت سوں کو الحاد اور اشتراکیت کے فتنہ میں مبتلا ہونے سے بچا لیا ہے، جماعتِ اسلامی کا لٹریچر نہ ہوتا تو کمیونسٹوں، دہریوں، ملحدوں اور ان فرائڈ زدوں کے ادب نے ہندستان اور پاکستان کے مسلم حلقوں میں کبھی کا میدان جیت لیا ہوتا، جماعتِ اسلامی کی کتابوں نے زندقہ و الحاد کے اس زور کو توڑا، اور لکھے پڑھے نوجوانوں میں دین و اخلاق کی اسپرٹ پیدا کی، کسی کو ہماری بات میں شک ہو یا مبالغہ نظر آئے تو ہم اس کے شواہد پیش کرنے کے لئے تیار ہیں، اور ہم ایسے بیسیوں اشخاص کی نشان دہی کر سکتے ہیں، جن کی زندگیوں کو جماعتِ اسلامی کے لٹریچر نے سنوارا ہے۔!

جماعتِ اسلامی کے کارکنوں کی زندگیوں کا ہم نے قریب اور دور سے مطالعہ کیا تو وہ بھی ہمیں بلند اور پاکیزہ تر نظر آئیں، اُن میں خلوص ہے، دیانت ہے، تقویٰ ہے اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کی تڑپ ہے، ہم نے اُن کی نماز روزے کو بھی دیکھا ہے اور بندوں کے ساتھ اُن کے معاملات اور تعلقات کا بھی جائزہ لیا ہے، کیا صاف ستھری زندگیاں اور کیسے سلجھے ہوئے دماغ ہیں! وہ دیکھنے میں مٹھی بھر ہیں مگر اُن کے عزم و جوش کا یہ عالم ہے جیسے یہ ساری کائنات پر

---

[1] ان میں "مستثنیات" بھی ہیں!

چھا کر رہیں گے، وہ نام و نمود کے مواقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتے، دکھاوے کی باتیں اُن کو نہیں آتیں حلال ذریعوں اور جائز طریقوں سے وہ روزی حاصل کرتے ہیں، وہ بالکل قدسی نژاد اور فرشتہ صفت بھی نہیں کہ اُن سے کبھی غلطی ہی نہ ہوتی ہو لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ لغزش و نسیان کے باوجود شیطان کے ایجنٹ بننے کا کام وہ ہرگز انجام نہیں دے سکتے اور اُن کا ایمان کسی قیمت پر بھی نہیں خریدا جا سکتا، جماعتِ اسلامی کے کارکنوں سے اُن کے ہمسایوں، محلہ والوں اور شہریوں کو کوئی گزند نہیں پہونچتا، ہم نے متعدد مقامات پر خود جماعتِ اسلامی کے مخالفین سے دریافت کیا اور اُن کو جماعتِ اسلامی کے مسلک سے اختلاف کے باوجود جماعتِ اسلامی کے کارکنوں کی سچائی، دیانت، اخلاص اور صاف ستھری زندگی کا معترف اور مدح خواں ہی پایا۔

پھر جماعتِ اسلامی کی مخالفت کا یہ ہنگامہ کیوں بپا ہے؟ چار طرف دشمنی کا مظاہرہ کیوں ہو رہا ہے؟ تصوف وافتا کی بزم سے لیکر قانون و اقتدار کی بارگاہوں تک یہ برہمی آخر کس لئے ہے؟ اس کا جواب خود ہمارے وجدان نے دیا، اور ایک مثال اللہ تعالےٰ نے ہمیں سجھادی، جو ٹھیک اس صورتِ حال پر منطبق ہوتی ہے:

فرض کیجئے کہ ایک گھرانے میں بہت سی خرابیاں پائی جاتی ہیں، وہاں کے نوکر کام چور بھی ہیں اور سودے سلف میں ہیت پھیری کرکے کچھ بچت بھی کر لیتے ہیں، اس خاندان کے افراد عیش و تنعم کے عادی ہیں، فضول خرچ اور غیر محتاط ہیں، آمدنی کے بعض ذرایع بھی ناجائز ہیں، پتنگ بازی، سینما بینی اور اسی قسم کی دوسری "بازیوں" میں اس گھرانے کے نوجوان مبتلا ہیں، نماز روزہ کی بھی کچھ یوں ہی سی پابندی ہے پڑھی پڑھی نہ پڑھی نہ پڑھی، جی چاہا اور دن ذرا نرم نظر آیا تو روزہ رکھ لیا ورنہ دن نکلتے ہی افطار! اس گھر کی بعض لڑکیاں آزادی کی طرف مایل ہیں اور چاہتی ہیں کہ اخلاق و نگرانی کی بندشیں نرم اور ڈھیلی ہی ہوتی رہیں۔

اُسی گھرانے کا کوئی غیرت مند، حساس اور شریف آدمی اگر جزئی اصلاح کے لئے اٹھتا ہے تو اُس کو کم سے کم مخالفت کا سامنا کرنا ہوگا، اُس نے اگر نوکروں کے سودے سلف لانے پر نگرانی شروع کردی تو نوکروں کے علاوہ اور کوئی شخص ذرا سی بھی ناگواری محسوس نہ کرے گا، اُس نے گھر والوں کو نماز روزے کے لئے تاکید کی مگر دوسری بدعنوانیوں کو جوں کا توں رہنے دیا تو تھوڑی سی ناگواری کے بعد گھر والے نماز روزے کے عادی ہو جائیں گے اور وہ اُس شخص کی مخالفت نہ کریں گے اس لئے کہ اُن کو بس ذرا نماز روزے کی پابندی کرنی پڑے گی ورنہ اُن کی دوسری بے عنوانیوں اور عیش سامانیوں میں کوئی خلل واقع نہ ہوگا ——— اُس "مصلح" کو مخالفتوں سے تو اُس وقت دوچار ہونا پڑے گا جب وہ پورے گھر کی اصلاح کا بیڑا اٹھائے اور اُس کے پروگرام میں "جز" نہیں "کل" کی اصلاح شامل ہو اور وہ گھریلو زندگی کو نیکی اور تقویٰ کی بنیادوں پر اٹھانے کی کوشش کرے، اس کے بعد گھر کے جس شخص میں جتنی برائی پائی جاتی ہے اور "اصلاح" سے جس جس کے فایدے، عیش اور رنگ رلیوں پر زد آکر پڑتی ہے وہ اُس کا مخالف ہو جائے گا، اب اُس کے خلاف سازشیں کی جائیں گی، اُسے طرح طرح سے مطعون کیا جائے گا، گھر والے کہیں گے کہ یہ تو اصلاح کی آڑ میں گھر کی جڑیں اور بنیادیں ہی کھود رہا ہے، غرض مخالفتوں کا ایک طوفان اُس کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوگا،

جماعتِ اسلامی کا بیچ مچ یہی حال اور ٹھیک یہی پوزیشن ہے اُس کے پیشِ نظر قوم و ملت کی فلاح اور اسلام کی بہبودی کا جامع اور ہمہ گیر پروگرام ہے، اس لئے مسلمانوں کے جس طبقہ میں جتنی کمی پائی جاتی ہے اور جس کسی

کا ذاتی مفاد جس قدر متاثر ہوتا ہے، اُسی قدر جماعت اسلامی پر لے دے ہوتی ہے، درگاہوں کے مجاور، قبروں کے متولی اور عُرسوں کے "منتظمین" "جماعتِ اسلامی" سے بیحد ناراض ہیں کہ اسلام کا نظام اگر کہیں پورے کا پورا برپا ہو گیا تو اِن مشرکانہ رسموں اور بدعتوں کی جڑ ہی کٹ جائے گی اور اُن کی کمائی کے تمام ایسے ذرائع ختم ہو جائیں گے، جماعتِ اسلامی پر "بے دینی" کا الزام سب سے پہلے اہلِ بدعت ہی نے لگایا ہے ——— وہ علما جنھوں نے گروہ اور جتھے بنا رکھے ہیں، جن کو حاشیہ نشین اور عقیدت مند ہر وقت گھیرے رہتے ہیں اور اسی نیاز عقیدت سے جن کا نفس فربہ ہوتا رہتا ہے، جماعتِ اسلامی سے خفا ہیں کہ ہماری "پاپائیت" اس طرح ختم ہو جائے گی ——— خانقاہی ذہنیت رکھنے والے بھی جماعتِ اسلامی سے بیزار ہیں کہ خالص اسلام اگر نافذ ہو گیا تو اس کی "خشکی" ہماری رنگینی اور کیف و وجد پر غالب آ جائے گی اور "نص" کے آگے "قص" کا چراغ نہ جل سکے گا ——— وہ حضرات جو کافرانہ قانون کے سایہ اور غیر اسلامی ماحول میں نمازیں پڑھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ تبلیغِ دین کا فرض ادا ہو گیا، وہ بھی جماعتِ اسلامی سے بچے بچے رہتے ہیں اور جماعت کے کام کو زیادہ پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے، اس لئے کہ وہ "اسلامی حکومت" کے قیام کی جدوجہد کو "دنیاداری" کا کام سمجھتے ہیں، اُن کو وہ "تقویٰ" پسند ہے جس میں کسی طرح کا خطرہ نہ ہو، عافیت ہی عافیت اور سکون ہی سکون ہو، جہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے کسی جابرانہ طاقت سے تصادم کی نوبت ہی نہ آئے، یہ "یارانِ ساحل" طوفانوں میں اُتر کر کشتی کو بچانے کے قائل نہیں ہیں، ہاں! کنارے پر بیٹھے ہوئے صرف دُعائیں مانگ کر، چلّے کھینچ کر اور وظیفے پڑھ کر طوفان کا رُخ پھر جانے کی توقع رکھتے ہیں!

کلب گھروں میں ناچنے اور جوا کھیلنے والے "مہذب غنڈے" شراب خوار، لاٹری، سٹّہ اور معمّوں کے ذریعہ دولت بٹورنے والے، رشوت خور، بددیانت تاجر، ظالم زمیندار، زکوٰۃ ادا کرنے والے عیش پسند قارون صفت سرمایہ دار، فحش نگار شاعر اور ادیب اور وہ لوگ جو مغربی انداز پر بے اخلاق زندگی گزار رہے ہیں یا گزارنا چاہتے ہیں، یہ سب کے سب جماعتِ اسلامی کے مخالف ہیں کہ جماعتِ اسلامی جو اخلاقی معاشرہ قائم کرنا چاہتی ہے اُس میں ان لوگوں کی نفس پرستیوں اور دراز دستیوں کے لئے سرے سے کسی قسم کی گنجائش ہی نہ ہو گی۔

کمیونسٹ جس جماعت کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھتے ہیں وہ "جماعت اسلامی" ہی ہے، جماعتِ اسلامی کے کام اور پروگرام کو دیکھ کر کمیونسٹ بڑا خطرہ محسوس کر رہے ہیں، اُن کی خفیہ ڈائریوں میں دشمنوں کی فہرست میں ——— جن کو وہ مٹانا چاہتے ہیں سب سے اوپر "جماعتِ اسلامی" ہی کا نام لکھا ہوا ہے ——— وہ عورتیں جو بے باک ہیں، بے حجاب ہیں اور آزاد ہیں "جماعتِ اسلامی" کو اپنی رنگ رلیوں اور خوش فعلیوں کی راہ میں سنگِ گراں سمجھتی ہیں، وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ جماعتِ اسلامی جس سوسائٹی کی تخلیق چاہتی ہے اُس میں اُن کے حسن و جمال، لب و رخسار اور نیم عریاں جسموں کی نمایش نہ ہو سکے گی، اُن کو اس کا موقع نہ دیا جائے گا کہ وہ اپنی اداؤں سے غیر مردوں کو لبھا سکیں، عورت چراغِ خانہ بن کر رہے گی اُسے "شمعِ انجمن" ہرگز ہرگز نہیں بننے دیا جائے گا، اختلاطِ مرد و زن کی اجازت نہ ہو گی، مینا بازار نہ لگ سکیں گے اور نہ عورتوں کو ناچنے اور گانے بجانے کی چھوٹ مل سکے گی، اسلامی نظام میں اسکول اور کالج صحیح معنوں میں "تربیت گاہیں" ہوں گی عشق بازی کی "تجربہ گاہیں" نہ ہوں گی ——— تو اس ذہنیت کی عورتیں اور اُن کے ہواخواہ مرد طرح طرح سے جماعتِ اسلامی کے خلاف ریشہ دوانیاں کرتے رہتے ہیں ——— قادیانیوں کو معلوم ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت میں اُن کی کیا پوزیشن

ہو گی اس لئے جہاں تک ان کا بس چلتا ہے جماعتِ اسلامی کی تخریب میں یہ لوگ اپنی طرف سے کمی نہیں کرتے۔

وہ اربابِ اقتدار جو صدیق و فاروق، عثمان و علی اور عمر بن عبدالعزیز (رضی اللہ عنہم) کی بجائے قیصر و کسریٰ اور جمشید و شداد کی روش اختیار کرنے کے خواہشمند ہیں جو اقتدار کی زیادہ سے زیادہ ہوس رکھتے ہیں، جو عہدے اس لئے حاصل کرتے ہیں کہ اُن کی خدمت میں سپاسنامے پیش ہوں، اُن کے اعزاز میں ڈنر، لنچ، اور ایٹ ہوم دئے جائیں، اُن کے فوٹو اخباروں میں چھپیں، اُن کے حضور سرِ نیاز اور جبینِ عقیدت خم ہوتی رہیں، اپنے دوستوں اور عزیزوں کے نوازنے کے انھیں موقعے میسر آئیں اُن کی زبان قانون ہو اور اُن کا قلم "خامۂ تقدیر"! عوام اُن کے خادم ہوں اور وہ اُن کے مخدوم بلکہ "اَن داتا" ——— تو یہ حضرات جماعتِ اسلامی کے پروگرام کو اپنے اقتدار کی موت سمجھتے ہیں، اسی لئے جماعتِ اسلامی ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔

جماعتِ اسلامی کے وہ نیم مذہبی ذہین افراد بھی مخالف ہیں اور وہ اُسے "ملاؤں کی جماعت" کہتے ہیں جو اسلامی احکام میں اپنی خواہشوں کے مطابق "ترمیم" اور "اضافہ" چاہتے ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "احادیث" کے منکر ہیں اور دُنیا میں سب سے زیادہ چڑ جنھیں سُنّتِ رسولؐ سے ہے، اور جنھوں نے قرآنِ کریم کی شرح و تفسیر کو "طلسم ہوشربا" اور "الف لیلہ" کا رنگ دیدیا ہے ——— یہ ہیں وہ مخالفین جن کا "جماعتِ اسلامی" کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے، جماعتِ اسلامی کے خلاف ایک دو نہیں دسیوں محاذ کھلے ہوئے ہیں، یہ صورتِ حال حق شناسوں کے لئے موجبِ ملال تو ہے مگر غیر متوقع نہیں ہے، جو جماعت بھی انبیاء علیہم السلام کے انداز پر اللہ کے دین کو سربلند کرنے کے لئے اٹھے گی اُس کو اس قسم کی عداوتوں، مخالفتوں، اور مزاحمتوں سے دوچار ہونا لازمی ہے، مصر کی "اخوان المسلمون" کی زندہ مثال ہمارے سامنے ہے کہ خود مسلمانوں ہی نے "اخوان" کے مٹانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی، "اخوان" کو ہزار آفریں کہ شدائد اور مصائب اُن کی ہمتوں کو پست نہ کرسکے، وہ زندہ ہیں اور باطل کو کچلنے کے لئے زندہ ہیں اور انشاء اللہ زندہ اور پایندہ رہیں گے۔

جو فرد یا جو جماعت بھی انبیاء کرام کے انداز پر کام کرے گی اُس کا نمرود سے بھی مناظرہ اور مجادلہ ہوگا، فرعون اور ہامان سے ٹکراؤ کی صورت بھی پیش آئے گی، اُس کے لئے صلیب بھی کھڑی کی جائے گی، اُس کی راہ میں کانٹے بھی بچھائے جائیں گے، اُس پر پتھراؤ بھی ہوگا اور دولت مند اور صاحبانِ اقتدار اُس کے پیچھے لونڈوں اور غنڈوں کو بھی لگادیں تاکہ اُس کا مذاق اڑائیں اور عوام میں اُسے بے عزت کریں، ان حق پرستوں کو ابوجہل اور ابولہب ہی نہیں عبداللہ بن اُبی جیسے منافقین بھی ملیں گے، اُن کے خلاف بدر و احد کی لڑائیاں بھی ہوں گی ——— یہ سب کچھ پیش آئے گا اور آنا چاہئیے!

مخالفین اچھی طرح سُن رکھیں کہ "جماعتِ اسلامی" دین کی سربلندی کے جس پروگرام اور عزم کو لیکر اُٹھی ہے، کوئی مخالفت اُسے روک نہیں سکتی، سدا ایک سے حالات نہیں رہیں گے، طائف و مکہ کے مظلوموں اور ستائے جانے والوں کے لئے "فتح مکہ" مقدر کر دی گئی ہے اور انشاء اللہ ہو کر رہے گا، تاریخ اپنے کو دہرائے گی یہاں تک کہ

اللہ کا دین غالب ہوجائے!

[illegible]، ماہرؔ القادری

عاصی ضیائی رامپوری

اُردو ادب میں اسلامی رجحانات

(ایک مجمل خاکہ)

مُسلمان اس برِّصغیر میں صرف جسموں کے فاتح بن کر نہیں آئے' ان کے ساتھ ایک مستقل اور پائدار نظامِ تمدن تھا جس نے تھوڑے ہی عرصے میں یہاں کے قدیم بسنے والوں کی فکری و عمرانی دنیا اگر پوری طرح بدل نہ دی تو خاصی طرح متاثر ضرور کردالی۔ اگرچہ یہاں وہ جس حیثیت سے آئے تھے اس کو اسلامی نظام کے مثالی زمانے کے حالات سے کوئی نسبت ہی نہیں دی جا سکتی' پھر بھی جو کچھ بھی کردار و خصوصیات وہ اپنے ساتھ لائے تھے ان کو بھی یہاں کے رہنے والوں میں ڈھونڈنا عبث تھا، لہٰذا وہ کردار و عادات مقامی باشندوں میں اس قدر مقبول ہوئے کہ رفتہ رفتہ ان میں بھی نفوذ کرتے گئے۔ ان کے رہن سہن میں تبدیلی ہوئی' ان کے آداب معاشرت بدلے' ان کی زبانیں اور ادب میں نئی جھلکیاں پیدا ہوئیں اور سب سے بڑھ کر اُن کے عقائد و اعمال بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

اُردو زبان کی پیدائش و ارتقا خود مثال ہے اس بات کی کہ اسلامی فکر (اگرچہ کسی قدر باطل کی آمیزش کیساتھ سہی) کسی غیر اسلامی فکر پر کیا کیا کچھ اثر نہیں ڈال سکتی۔ ہمارے بعض اکابرِ سیاست و زبان خواہ کہا کریں کہ اردو کی پیدائش و ارتقا میں مسلمان اور ہندو[1] برابر کے شریک ہیں' یہ واقعہ ہے کہ اُردو ادب کا وجود ہی اسلامی فکر و نقطۂ نظر کا نتیجہ ہے۔ اس کی ابتدا ہی اس طرح ہوئی کہ اس زبان کو مسلمانوں نے کس مپرسی کے عالم سے اُٹھا کر دنیا کی متمدن ترین زبانوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ نہ مسلمان صوفیا اپنے وعظ و ارشاد اور تبلیغ و تزکیہ کے لئے اسے استعمال کرتے' نہ یہ اس قدر وسیع' گراں قدر اور سنجیدہ ادب پیدا کر سکتی۔ آخر یہی دلّی اور متھرا مسلمانوں سے پہلے بھی اسی ملک میں تھے' پھر اس خطے نے کون سی بادقار اور پُرمغز ادب کی حامل زبان پیدا کی' اور کی بھی تو اس کا چند ہی صدی کے اندر کیا حشر ہوا؟ اُردو سے پہلے مقامی زبانوں میں "مذہبی ادب" بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ سنسکرت، ماگدھی، پالی، اودھی، تمام زبانیں جن بن بعض بانیانِ ادیان یا اُن کے ابتدائی پیروؤں نے اپنے دین کی تبلیغ کی تھی' قصۂ پارینہ بن کر ختم ہو چکی تھیں' مسلمانوں کی آمد کے وقت لوگوں کا جو مذاق تھا وہ یہ مادی [illegible]' اور تنگ جو طرزِ تحریر سے بخوبی ظاہر ہو سکتا ہے۔ اس وقت کی زبانوں کا ادب کیا ہے سوائے شاعری کے؟ اور شاعری کیا ہے سوائے توہم پرستی کے مظاہرے' فخر نسب یا رامش و رنگ' اور فواحش کی لذت پرستی کے؟ عورت ان شاعروں اور ادیبوں کے اعصاب پر کس قدر سوار ہو چکی تھی' اس کی شہادت ایلورا اور اجنٹا کے غاروں سے لیجئے جن کے نقش و نگار کا شاید ہی کوئی جز عورت کے شہوت انگیز آسنوں (POSES) سے خالی ہو' یا چوٹی کے شاعروں کے مزاجِ شاعرانہ سے حاصل کیجئے' جن میں سے کوئی شخص حقانی نظمیں بھی لکھتا ہے تو معبودِ حقیقی کو شوہر اور اپنے تئیں اظہارِ عبودیت کے لئے اُس کی بیوی یا سہاگن بنا کر لکھتا ہے!

---

[1] چاہے ہندو مسلمانوں کے برابر کے شریک نہ ہوں مگر اُردو ادب اور اُردو زبان کی تعمیر و ترقی میں اُن کا حصہ ضرور ہے (م ۔ ق)

لیکن جب مسلمان آتے ہیں تو ہمیں اُن کے یہاں پڑاؤ ڈال دینے کے تھوڑے ہی عرصے بعد مقامی زبانوں کی لے بدلی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ اردو کے علاوہ دوسری بولیوں میں بھی شاعری کی پرانی چولیں رفتہ رفتہ بدل جاتی ہیں۔ وقت کے بگڑے ہوئے حالات اور ناکارہ معاشرے پر تنقید و اصلاح کرنے والے چند مسلح اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور بڑی حد تک پہچانا جاسکتا ہے کہ یہ کسی اور ہی کی زبان سے بول رہی ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں مسلمان یہاں آکر بسے اور پندرھویں صدی میں کبیر جیسے مصلحین ہنود کا سلسلہ شروع ہوا، جو نانک، تلسی داس، چیتنیہ وغیرہ سے ہوتا ہوا آج تک کسی نہ کسی بگڑی ہوئی حالت میں جاری ہے۔ مسلمانوں سے پہلے کوئی ہندو شاعر اس طرح سوچ نہیں سکتا تھا۔ کہ

سانس ماس سب جیو تمہارا　　　　تو ہے اکھرا پیارا
نانک شاعر یو کہت ہے　　　　سچے پروردگارا

یا　　　　دین گنوایو دُنی سے (نانک)　　　　دنی نہ آیو ہاتھ
پیر کلہاڑی ماریو　　　　غافل اپنے ہاتھ (کبیر)

کبیرا شبد سرونے ہے ([illegible])　　　　مت مورے سکھ چین
کوئی نگارا سانس کا　　　　باجت ہے دن رین

لیکن جیسا میں اوپر عرض کرچکا ہندوستان میں مسلمان کوئی واقعی معیاری مسلمان بن کر نہیں آئے تھے۔ مزید برآں دو ڈھائی صدی گزرنے کے بعد وہ اپنے سابق مقام سے بھی گر چکے تھے۔ اب ان کا اولین مقصد اعلاءِ کلمۃ اللہ نہیں رہا تھا۔ یہ کام اُن کے خیال میں صرف اہلِ خانقاہ و مدرسہ ہی کے لئے خاص ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے غیر مسلم پڑوسیوں پر اپنے دینی اعمال کا کوئی اچھا اثر نہ ڈال سکے۔ بلکہ بعض ذہین غیر مسلموں کو، جن کا مطمحِ نظر لوگوں کو بزعمِ خود رسمی اعمال سے نجات دلاکر ایک عالمگیر اخوت میں منسلک کرنا تھا، مسلمانوں کی پابندی عبادات، واضح طور پر کھٹکی۔ کبیر کہتا ہے ؎

کانکر پاتھر جوڑ کے مسجد لے بنائے
تا چڑھ ملّا بانگ دے کیا بہرا ہوا خدائے؟

کبیر غریب کو تو معلوم نہ ہوسکا کہ مسلمانوں کا خدا بہرا نہیں، اور اذان محض ایک اعلانِ جہاد اور دعوتِ مبارزت ہے ایک مسلم کی طرف سے تمام باطل طاقتوں کو! البتہ اس شعر کے لکھوانے کے ذمہ دار مسلمان بھی بڑی حد تک ہیں، جن کے اعمال و فرائض کی ادائگی میں سے احساسِ فرض اور روحِ تقویٰ، جو تعمیرِ سیرت کے اسباب ہیں، خارج ہو کر ان کی جگہ رسمیت اور ظاہرداری پیدا ہوتی جارہی تھی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ توحید کا تصور، اور مالکِ حقیقی کا تمام نوعِ انسانی کا یکساں مالک، حاکم اور محسن ہونے کا خیال جو ان ہندو شاعروں کے ہاں ملتا ہے، یقیناً اسلامی معاشرے ہی کی ذہین منت ہے، ورنہ جو قوم مختلف دیوتاؤں کے ماننے بلکہ مختلف پیشوں کے اپنانے کی بنا پر گروہ در گروہ بٹ گئی ہو اور نفاق اور ہٹ دھرمی نے ان کی آپس کی تفریقیں اور زیادہ پھیلا دی ہوں، اس کے ذہن میں عالمگیر اخوت کا یہ تصور نہ کبھی آسکتا ہے، نہ آیا تھا۔
غرض اس وقت مسلم معاشرے میں اگر کوئی گروہ سب سے زیادہ کارِ تبلیغ میں مصروف تھا تو وہ صوفیا تھے،

جن کے وسائل سب سے زیادہ محدود تھے اور جو گروہ اس کام میں سب سے پیچھے تھا وہ حکومت کے ارکان تھے جنھیں اس کے سب سے زیادہ مواقع حاصل تھے۔ سلاطین اور امرا میں سے جتنے بھی اچھے اور باشرع لوگ گزرے ہیں ان کی نیکی اور تقویٰ ذاتی تھا۔ اسی لئے بالعموم ہند کے غیر باشندے بھی انہیں زیادہ سے زیادہ عادل اور رعایا پرور بادشاہ سمجھتے تھے نہ یہ کہ پورے نظامِ اسلامی کے بارے میں کوئی بہت اچھی رائے قائم کریں۔ سلاطین و امرا کی عام لوگوں سے بے تعلقی اسی سے ظاہر ہے کہ انھوں نے فارسی کو نہ صرف سرکاری زبان رکھا بلکہ محلات کی گفتگو بھی آخر تک اسی زبان میں ہوتی رہی۔ یہ صحیح ہے کہ اس وقت تک کوئی مقامی زبان اس قابل نہ ہوئی تھی کہ اسے فارسی سے بدل لیا جائے لیکن آخر اسی زمانے میں صوفیائے کرام بھی تھے، جو اس دقت کے باوجود مقامی باشندوں کو انہی کی زبان میں وعظ و تلقین شروع کر چکے تھے، اور اس طرح ایک نئی زبان کی تشکیل میں حصہ لے رہے تھے۔ یہ کام حکومت اگر چاہتی تو ہزار گنا وسیع تر پیمانے پر کر سکتی تھی۔

بہرحال، اردو ادب و زبان دونوں کی ابتدا فالِ نیک کے طور پر اسلامی عناصر سے ہوئی، اور نثر و نظم دونوں میں اولیت کا جہاں تک سراغ ملتا ہے، یہی رجحان کارفرما رہا۔ اسی کا تبرک سمجھ لیجئے کہ تب سے آج تک ان گنت ذہنی و فکری کروٹیں اس ملک کے باشندوں نے بدلیں، مگر کبھی ایسا نہ ہوا کہ یہ عنصر تھوڑا بہت، خالص یا غیر خالص اردو میں شامل نہ رہا ہو۔ آیئے اب ذرا جائزہ لیکر دیکھیں کہ آیا اردو میں اسلامی عناصر کا تناسب کسی خاص ضابطے کے ماتحت گھٹا بڑھا کیا ہے یا اس میں کوئی اصول کارفرما نہیں۔

غالباً ہر زبان کی طرح اردو کا قدیم ترین باقاعدہ ادب بھی نظم ہی کی شکل میں محفوظ ملتا ہے۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ نظم کا آہنگ نثر سے زیادہ پُرکشش ہونے کی بنا پر اس کی حفاظت پر لوگوں کو آمادہ کرتا ہے۔ اور عام نثر کے روزمرہ کے فقرے اس لائق نہیں ہوتے کہ لکھ کر محفوظ کر لئے جائیں، تاوقتیکہ ان میں کوئی خاص اہمیت اور سنجیدگی نہ ہو، جو آ ہی نہیں سکتی تاوقتیکہ زبان ایک معقول مدت تک ادبی منزل طے کر کے علمی مطالب ادا کرنے کے لائق نہ بن جائے۔ بہرحال اردو کے پہلے شیریں مقال شاعر امیر خسروؒ دہلوی مانے جاتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ ان کا کلام بیشتر تصوف کے لئے وقف ہوگا۔ مگر ان کے لئے دقت یہ تھی کہ ابھی اردو تصوف کے مسائل کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا ان کی شاعری بالعموم ہندی اور فارسی غزلیہ (ریختہ) شاعری کا ایک امتزاج ہے ورنہ پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، دو سخنے وغیرہ جو شاعرانہ جذبات کا مظہر ہونے کی بجائے ایک طرح کی دماغی ورزش کے لئے کہے گئے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی خسروؒ کی اردو شاعری کا بیشتر حصہ محض ہمارے ادب کی تعریف میں آ سکتا ہے۔ بعض صاحبوں کو شاید یہ خیال ہو کہ ان کی کچھ غزلیں مثلاً ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل، دورائے نیناں بنائے بتیاں

کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

انہی مذموم عاشقانہ مضامین کی حامل ہیں جن سے ہر زبان کا شعری ادب آلودہ ہے، اور یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے لیکن دراصل اول تو اس زمانے کے معیارِ کردار کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں ان میں غیر اخلاقی عنصر بہت مشکل سے نظر آتا ہے، کیونکہ اس طرح کی غزلوں میں اظہارِ جذبات عورت کی طرف سے اس کے "پیا" یا "پی" کو کیا گیا ہے، اور اس وقت "پی" سوائے عورت کے جائز شوہر کے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا! دوسرے، جیسا اوپر عرض کیا جا چکا، ہندی زبان بالخصوص برج بھاشا کا، جو ایک طرف سنسکرت کی اصلی وارث ہے، دوسری طرف اردو کی ارتقا کی پہلی کڑی اسی سے

جا سکتی ہے، رجحان و مذاق شعر یہی تھا کہ متصوفانہ کلام بھی 'پتی' اور 'پتنی' ہی کی زبان میں ہو۔ پس جس طرح حافظ شیرازی
مے و معشوق بول کر معرفت و ذاتِ احدیت مراد لے سکتے ہیں اسی طرح خسرو دہلوی بھی 'پی' کہہ کر پیرِ طریقت ورنہ
محبوبِ حقیقی مراد لیتے ہیں۔

خسرو کے بعد شمالی ہند میں معراج العاشقین کے مصنف ملتے ہیں اس کو رسالہ اردو کی پہلی نثری تصنیف کہا
جاتا ہے۔ اور اس کا موضوع بھی تصوف ہے۔ لہذا اس کے مخربِ اخلاق ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ البتہ مروجہ تصوف
میں جو فسادات آ گئے ہوں گے ممکن ہے اس میں بھی پائے جاتے ہوں۔ لیکن میں اہلِ باطن میں سے نہیں جو ان کی نشان دہی
کر سکوں، نہ میرا یہ موضوع ہے، اتنا ضرور کہوں گا کہ اس وقت تک کم از کم ہند کے صوفیا بڑی حد تک ان مفاسد سے پاک تھے
جنھوں نے خالص اسلامی تصوف کو غیر اسلامی تصورات و رہبانیات سے آمیز کر کے ایک نہایت گمراہ کن گورکھ دھندا بنا دیا۔

ان کے بعد اردو کا ادبی مرکز دکن منتقل ہو جاتا ہے۔ دہلی والوں نے اردو کو ادبی زبان بنانا پسند نہ کیا، البتہ دکن نے
اس کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ یہیں چند وہ شاعر اور ادیب پیدا ہوئے جو ہماری ادبی تاریخ میں، ایک عرصے تک نقادوں کو غلط فہمی
میں ڈالے رہے کہ اردو کا مولد بھی دکن ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہاں جو کچھ ادبی تخلیقات ہوئیں وہ بیشتر لذتِ کام و دہن ہی کے
لیے ہوئیں۔ اسلامی رجحانات یا تو درنِ متصوفین کے ہاں ملتے ہیں، جن کی تعداد کچھ زیادہ معقول نہیں ہے، یا شعرا کے ہاں جہاں
تہاں رسماً آ گئے ہیں۔ وہ بھی ایران یا افغانستان کی طرح۔ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اہلِ دکن نے تقلید سے بہت کام لیا ہے،
اجتہاد سے کم یا صفر۔ سیاسی طور پر وہ سلطنت دہلی سے آزاد ہو چکے تھے بے فکری و فراغت کا دور دورہ تھا، ان کے سلاطین
نے رسوائے زمانہ تمدنِ ایرانی کی بڑی حد تک نقل کی۔ اور ان کے ہاں وہ خرابیاں بھی آ گئیں جن سے ایران دوچار ہو چکا تھا۔
تعجب ہے کہ امرد پرستی جیسی لعنت نے جس طرح حافظ و سعدی جیسے بزرگوں کی شاعری میں جگہ پائی، اسی طرح ولی دکنی
جیسے پاکباز شخص کے دیوان میں بھی نفوذ کر لیا۔ بلکہ یہاں ایران سے بھی پلہ بھاری ہو گیا۔ حافظ تو صرف "نازنین پسر" یا "ترک
شیرازی" کہنے پر اکتفا کرتے ہیں، ولی اس سے ایک قدم آگے بڑھا کر اس کا نام بھی اپنی غزل کی ردیف کے طور پر باندھتے
ہیں۔ ع خوش خین بے وفا ہے امرت لال۔۔۔ !!

اس کے علاوہ عورتوں کی زبان میں جو گندی پہیلیاں غالباً تفنن طبع کے لیے یہیں کی گئی۔ اور اس مکروہ ادب کی بنیاد ایک
بادشاہ (قلی قطب شاہ) کے ہاتھوں رکھی گئی۔ البتہ مسلمانوں کے ایک فرقے (شیعہ) کا مذہبی لٹریچر ضرور کچھ نہ کچھ نظم و نثر
میں اضافے کا سبب بنا، لیکن اس کو بھی زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وقت کے دوسرے فحش عناصر سے پاک ہونے
کی بنا پر نسبتاً بہتر تھا، اس سے آگے کچھ نہیں، کیونکہ کسی ایک چھوٹے سے "مذہبی" گروہ کا مذہبی پروپگنڈا صحیح معنوں میں
اسلامی رجحانات کا حامل نہیں کہا جا سکتا۔

غرض قدیم دکنی ادب کو ہم اپنے نقطۂ نظر سے کچھ زیادہ با وقعت نہیں کہہ سکتے، اس کا زیادہ تر صرف ماہرینِ لسانیات یا مورخینِ
ادب ہی کے یہاں ہے، اور اسی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت بھی قرار دی جا سکتی ہے۔

اس سے اگلا دور اردو کو ادبی حیثیت سے پھر دہلی کی طرف لوٹاتا ہے۔ ہماری شاعری کا قدیم کلاسیکی دور یہی ہے جس کے نمایاں
افراد ہیں آبرو، حاتم، ناجی، مضمون، یکرنگ اور آرزو وغیرہ ان لوگوں کا اصل کام صرف یہ ہے کہ انھوں نے اردو کو شعر کی زبان
بنانے کی ابتدا کی۔ اور دیسی ماحول میں ایرانی آب و رنگ رچایا۔ پس جو حکم ایرانی شاعری کے بارے میں لگایا جا سکتا ہے وہی

ان کی شاعری کے لئے بھی درست اُترے گا۔ ان کے ہاں زیادہ حصہ "جائز سرمایۂ ادب" کا ہے۔ البتہ جگہ جگہ اس سرحدِ جواز سے تجاوز بھی بلا تکلف کر لیا گیا ہے۔ لیکن اس زیادتی کا مداوا غالباً یہ ہے کہ ہر شاعر کا دیوان حمد و نعت وغیرہ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ رسم زمانۂ قدیم سے چلی آرہی تھی، لیکن افسوس کہ اس کو استعمال بہت بُری طرح کیا گیا۔ ہر غیر اسلامی کام کا آغاز خدا کا نام لے کر کرنا اس کے جواز کی دلیل تو کیا بن سکے، ہو سکتا ہے کہ خدا کے غضب کو اور بھڑکا دے۔ لیکن بہر حال یہ رسم مذکورہ دور کے بعد اور بہت بعد تک رہی، اور غالباً اس کا بہت بڑا ہاتھ تھا اس تصور کے پھیلانے میں کہ شاعری اور زندگی دو متضاد چیزیں ہیں، لہٰذا ایک شخص جو نہی زندگی میں تقشف کی حد تک پاکباز ہو، اپنی شاعری میں اوباشی کی حد تک رند بھی بن سکتا ہے!

اس سے اگلا زمانہ وہ ہے جسے ہمارے ہاں اُردو شاعری کا "زریں عہد" کہتے ہیں۔ اس دور کے گل سرسبد ہیں میرؔ، سوداؔ، مظہرؔ اور دردؔ۔ ان لوگوں سے پہلے تک اُردو شاعری صرف تفنن طبع کے لئے کی جاتی تھی، ورنہ اصل زورِ کلام یہ لوگ فارسی شاعری میں دکھاتے تھے، بلکہ یہ چاروں حضرات بھی ابتدا میں فارسی شعر کہتے تھے، بعد کو اُردو میں بھی کہنے لگے، اور اُردو کو اتنا گراں مایہ اور وقیع بنا دیا کہ فارسی شاعری ہندوستان سے تقریباً مفقود ہو گئی۔ ان میں سے دردؔ کی شاعری سراپا تصوف ہے، اور تصوف کی پاکیزگیوں کے ساتھ ساتھ اس کی بعض مخصوص خرابیوں سے بھی خالی نہیں؛ مظہرؔ اگرچہ خود سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کی ایک اہم کڑی ہیں، لیکن ان کی شاعری کمتر تصوف اور بیشتر محض "پاکیزہ عشق" کی ترجمان ہے؛ میرؔ اگر ایک طرف غمِ عشق اور غمِ روزگار کا رونا رونے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تو دوسری طرف "اہلِ بیت" کی شان میں بھی سلام اور مراثی کہہ کر اپنی "عاقبت سنوارنا" چاہتے ہیں؛ اپنے غم کے اظہار میں وہ شدت سے قنوطی ہیں، حالانکہ مسلم کبھی قنوطی نہیں ہو سکتا؛ دوسری طرف مناقبِ "اہلِ بیت" میں وہ حد سے آگے بڑھ گئے ہیں کہ انہی کے ہم عقائد اور ہم مشرب سوداؔ تک نے ان کے اس طرح کے اشعار کو "کفرِ شدید" ٹھیرایا ہے! اور آخر کار سوداؔ ہیں، جو ایک طرف عام مروجہ غزل گوئی میں گلکاریاں کرتے ہیں، دوسری طرف بزرگانِ دین یا "خداوندانِ دنیا" کی تعریف میں اس قدر شدت سے مبالغہ اور جھوٹ سے کام لیتے ہیں کہ اسلام کے ماتھے پر بل پڑ جاتا ہے، اور تیسری طرف اپنے مخالفین کی تواضع اپنے اشعار میں ایسی کھلی کھلی گندی گالیوں سے کرتے ہیں کہ اخلاقِ عام بھی سر پیٹ پیٹ لیتا ہے ——؟ یہ ہے مختصر سا جائزہ ہمارے "زریں عہدِ شاعری" کے ستونوں کا —— ان میں سے اسلام کی رو سے دو (دردؔ و مظہرؔ) شاید کڑی بازپرس سے بچ سکیں، لیکن نہ معلوم باقی دونوں اپنی برأت میں اپنے کلام کے اعمال نامے سے کیا پیش کر سکیں گے! ان کے بعد ان کے باقی کمتر درجے کے ہم عصر بھی کم و بیش انھی کی سی خوبیوں یا خامیوں کے حامل ہیں۔

یہ وہ وقت ہے جب ہماری معاشرت دوراہے کے موڑ پر آ گئی ہے۔ سلطنتِ دہلی کی رہی سہی ساکھ بھی اس کی بدعنوانیوں کے باعث بگڑ چکی ہے۔ ملک میں وسیع پیمانے پر بدامنی پھیل رہی ہے، جس سے کہیں کہیں اسلام کے کچھ ناکارہ سے دوست مثلاً سلطنتِ خداداد (ٹیپو) اور روہیلے) بھی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور اس کے بنیادی دشمن بھی (یعنی انگریز)۔ اس موقع پر ہمارے ادیب بھی دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک گروہ تن آسانی کی خاطر دیسی ریاستوں کا، جہاں نسبتاً فارغ البالی سے گزر ہو سکتی ہے، رُخ کرتا ہے یا براہِ راست انگریز کی ملازمت اختیار کرتا ہے! دوسرا گروہ وقت کی خرابیوں پر تنقید اور اصلاح کی تحریک، جو شاہ ولی اللہؒ کی بابرکت اقتدا میں اُٹھ چکی ہے، بڑھ کر اپنا لیتا ہے۔ یہ دوسرا گروہ خالص اسلامی ادب کا علمبردار

ہے، اور اس کا نصب العین ہی عوام میں تبلیغ ہے، لیکن اس کی تعداد بہت کم اور ادبی کارنامے بہت تھوڑے ہیں، یہ شاہ رفیع الدینؒ شاہ عبدالقادر اور شاہ اسمٰعیل شہید رحمہم اللہ پر مشتمل ہے، ان کے تراجم قرآن کے علاوہ صحیح عقاید اسلامی وغیرہ لوگوں میں پھیلاتا ہے۔ پہلا گروہ دو حصوں میں منقسم ہو گیا ہے۔ ایک فورٹ ولیم کالج سے وابستہ مصنفین، میر امن، افسوس، نخاں، نہال چند لاہوری وغیرہ، جو انگریز نوواردوں کے لئے آسان زبان میں قصے کہانیاں لکھتا ہے، دوسرا حصہ اس سے بھی گیا گزرا ہو گیا ہے۔ یہ ایک نئے مکتب ادب کی داغ بیل ڈالتا ہے، جو معاشرے کو اور بھی زیادہ جاہلیت کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ یہ میر حسن، مصحفی، انشا، رنگین اور جرأت کی سرکردگی میں ادب کو کچھ نئی "بے قدریوں" سے ملوث کرتا ہے۔ یہ لوگ لکھنوی شاعری کے سنگ میل ہیں۔ انہی نے غزل میں لذت پسندی، فحاشی اور مصنوعی جذبات نگاری کی بنیاد رکھی۔ یہی لوگ واسوخت اور ریختی کی ایجاد کے ذمہ دار ہیں، اور انہی کی اس شاعری نے بعد کو شوق کی رسوائے زمانہ مثنویات میں عریانی داخل ہو جانے کا راستہ کھولا۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ ٹھیک وہ زمانہ اور لکھنؤ ٹھیک وہ مقام تھا جب اور جہاں اس طرح کی شاعری پھل پھول سکتی تھی۔ ہندوستان بھر میں حالات پر آشوب، لیکن لکھنؤ بے فکری اور عیش کوشی کا گہوارہ۔ خواص سے عوام تک سب ایک ہی راحت طلبی کے شکار، پھر تعجب ہوتا اگر لکھنؤ کی شاعری میں وہ رجحانات پیدا نہ ہوتے جو ہوئے۔ اس وقت کی لکھنوی شاعری میں تین رجحان کارفرما نظر آتے ہیں اور تینوں خالص جاہلی اور گمراہ کن ہیں:۔ ایک، بوالہوسانہ عشق کی شرمناک لذت پرستی، دوسرے، مبالغہ کی انتہائی رنگ آمیزی، تیسرے، خدا اور اس کے قدسی نفوس پیغمبروںؑ اور دار الجزا کا تمسخر۔ ان کے علاوہ ادبی حیثیت سے جو نقصان عظیم پہنچا وہ یہ تھا کہ ادب کو زندگی سے قطعاً بے تعلق کر دیا گیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ نہایت پاکباز صوفی مشرب حضرات شاعری میں ایسا چولا بدل لیتے ہیں کہ ناطقہ سربگریباں رہ جائے۔ میں صرف ایک، بہت ہلکی سی، مثال پر قناعت کرتا ہوں۔ امیر مینائی کا زہد و ورع، علم و تقویٰ نظر میں رکھئے اور پھر ان کا یہ شعر پڑھ کر ماتم کیجئے ؎

آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن تو دکھاؤ صاحب　　وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے!

یہ رنگ اتنا مقبول ہوا کہ دہلی بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ مومن، ذوق، داغ، ظفر، نسیم، اور ان کے لکھنوی پیشرو اور ہمعصر ناسخ، آتش، جلال، تسلیم، منیر ــــــ سرسری نظر ڈالتے ہوئے سب سے گزر جایئے، سوائے ایک آدھ جگہ کے، جہاں شاعری صرف جواز کی سرحدوں سے باہر نہیں جاتی، باقی تمام رشحات فکر ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ملتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ اس زمانہ کی "مذہبی" شاعری بھی اس مذاق سے آلودہ ہو گئی تھی۔ انیس اور دبیر کے مراثی میں زمین آسمان کے قلابے، محسن[1] کاکوروی کی نعتوں میں "معاملہ بندی" اور "داستان امیر حمزہ" کے سلسلے کی کتابوں میں "مسلمانوں" کی رنگ رلیوں کا حال ــــــ یہ سب اس دور انحطاط کا آئینہ لئے ہمارے سامنے آتے ہیں جب "شمشیر و سناں" بھی "طاؤس و رباب" بنا کر پیش کئے جاتے تھے۔

اس موقع پر میں ایک اور ہستی کا خصوصیت سے ذکر کرنا چاہتا ہوں، جو کسی مکتب فکر سے وابستہ نہیں، بلکہ خود ایک دبستان ادب ہے۔ میری مراد غالب سے ہے جس کی شخصیت کچھ اس قدر طرفہ معجون اور پیچیدہ ہے کہ اس کو کسی طرح دو ٹوک خانوں میں بانٹنا اور اس کے ذہن کے کسی حصہ کو جائز اور کسی کو باطل قرار دینا سخت مشکل ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ وہ اسلامی ادب نہیں

---

[1] مگر محسن کاکوروی کے نعتیہ کلام کا درجہ بہت بلند ہے جس کا اعتراف کرنا چاہئے! (م۔ ق)

کہلایا جاسکتا ہے، اگرچہ بعد میں چیزیں غالب نے اسلامی اسپرٹ سے ضرور محسوس کی ہیں ۔ ہے مد نظر انسانی دوستی اپنی اصلاح وغیرہ، مگر غیر اسلامی اور جائز ادب کی سرحدوں کے بیچ میں اس کا ادب گھومتا ہے ۔ ادب وقت ایک ہی چیز جائز و ناجائز دونوں قرار پا سکتی ہے، اور اس لئے ... تب کو یاد ... ہم اس پر کوئی حکم لگا کر قصہ ختم نہیں کر سکتے۔ اس ادب ایک ایسی ناگزیر برائی ہے، ایسی خطرناک ... جس کو چھوڑ کر ہم بہت بڑے نقصان ... البتہ ... ایک ایسا استثناء ہے جس کی نظم اور نثر کسی سے بھی ہم اردو ادب کو محروم نہیں کر سکتے۔

اور اب آئیے غدر ۱۸۵۷ء پر۔ پرانی تہذیب مر رہی تھی، نئی طاقتور اور ... دونوں تہذیب سے ٹکراؤ اور آخر پاش پاش ہوگئی۔ مسلمانوں کی تمدنی ساکھ ختم ہوگئی، اور اس کا ردعمل دو صورتوں میں سامنے آیا۔ ایک طرف سرسید اور ان کے رفقاء نے اصلاح معاشرہ کا بیڑا اٹھایا، دوسری طرف مٹتی ہوئی تہذیب کے آثار سینے سے لگانے والے اس کی حفاظت پر کمربستہ ہوگئے۔ غلطی دونوں طرف تھی۔ سرسید وغیرہ نے قوم کی صدیوں سے جمی رچی خرابیوں کی نشاندہی کی تو گویا دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی، اور یہ ان کا کوئی ایسا ادنیٰ کارنامہ نہ تھا۔ شاہ ولی اللّٰہی تحریک کے بچے کھچے آثار سرسید نے بذاتِ خود دیکھے تھے، اور جو کچھ ... شاہ صاحبؒ اور شاہ شہیدؒ نے کئے تھے سرسید بھی کوئی بہت دور تک اس سے آگے نہ جاسکے۔ ان بزرگوں نے تقلید جامد کے خلاف جو جہاد کیا تھا، سرسید مرحوم اس کی اصل حقیقت نہ پاسکے، اور مطلق اجتہاد پر مستعد ہوگئے۔ یہ اجتہاد خدا اور رسولؐ کی تمام حدود کے اندر رہتے ہوئے نہ تھا، جا بجا بے راہ روی آگئی تھی۔ لیکن ایک طرح سے وہ بھی اس پر مجبور تھے۔ انیسویں صدی کے ناقص سائنسی علوم کا غلبہ اور مغرب چکاچوند والی کرنوں کے سونے تک لیکر آیا تھا۔ مشرق میں یہ بھی نہ تھا۔ مغرب سے عہدہ برآ ہونے کی صورت صرف "مذہب" میں پناہ لینے کی تھی، لیکن مذہب کو مغرب ایک ڈھکوسلا سمجھتا اور اس کی (لاطائل سی) لمبی چوڑی دلیلیں دیتا تھا۔ اس کے نزدیک معیار عقل تھی، پس اس کا جواب یہی ہو سکتا تھا کہ مذہب کی "خلافِ عقل" باتوں کی عقلی توجیہ کی جائے۔ یہ پہلی غلطی تھی، اور دوسری یہ کہ حکومت انگریزی کو ظلّ اللّٰہ فی الارض مان کر اس کی اطاعت ضروری قرار دے دی گئی۔ دونوں غلطیاں کرتے وقت نیت بخیر تھی، مگر نیت کا بخیر ہونا قانون قدرت کو نہیں بدل سکتا!

دوسری طرف کے بزرگ جس چیز کو "اسلام" سمجھ کر کلیجے سے چمٹ کر بیٹھ گئے وہ دراصل اسلام اور مسلمان جاہلیت" کا مجموعہ مرکب تھا، اور یقیناً قابل ترک۔ لیکن ان لوگوں کے پاس ... بھی کچھ تھا، اس کو چھانٹ کر خالص کرنے کی ہمت تھی نہ لیاقت۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ بس کی مدافعت میں کر سکتے تھے وہ مغربیت پر وار کرنا تھا، لیکن اس کا سلیقہ بھی نہ تھا، بلکہ ہر نئی تہذیب سے واقفیت تک ناپسند تھی۔ ان حالات میں انہیں اکبر سا آدمی مل گیا، اور یقیناً اس کے وار خاصے بھرپور ثابت ہوئے۔ مگر اکبر بھی خالص اسلام کو نہیں، مشرقیت کو بچا رہے تھے! اور مسلمانوں کی جزوی اصلاح اُن کے پیش نظر تھی، انھوں نے آخر میں سنا ہے یہاں تک کہہ دیا کہ سرسید کی مخالفت انہیں نہیں کرنی چاہئے تھی!

دراصل دونوں فریق اپنے کو حق پر سمجھتے ہوئے جزوی حق سے لڑ رہے تھے۔ وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ دونوں پر خلوص مگر مبہوت تھے، ... تصورات کی تکرار سے ان کے ذہن بھی پیچیدگی اور الجھن سے خالی نہ تھے۔ البتہ سرسید اسکول کو نئی تہذیب کی حمایت نے جری کر دیا تھا، ان کے حریف دہشت زدہ تھے۔ اس اعتبار سے دونوں طرف کے ادب کو جزوی طور پر اسلامی کہا جاسکتا ہے۔ اور ان دونوں کی آویزش کا نتیجہ بھی زیادہ سے

زیادہ جائز ادب کی تخلیق کا سبب بن سکی۔ پھر بھی یہ امر ہمارے لئے باعثِ مسرت ہے کہ کم، از کم دونوں طرف سے کوئی ایسی چیز پیش نہ ہوئی جو باطل ادب کے شمار میں آسکے۔

یہاں میں سرسید کی ٹیم کے ایک فرد کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا، جسے عموماً اس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا جاتا کہ اسلام کے بارے میں سب سے زیادہ صحیح فکر و تصور رکھنے والا وہی تھا۔ یہ کون تھا؟ حالی نہیں، اگرچہ اپنے ذاتی عادات کے اعتبار سے اپنے ساتھیوں میں وہ سب سے بڑے عمل مسلمان تھے! شبلی بھی نہیں، اگرچہ علوم اسلامیہ پر ان کی نظر کی وسعت کا ان کے عہد میں کوئی جواب نہ تھا۔ یہ شخص نذیر احمد ہے جس کو اُردو داں طبقہ ایک ناول نگار یا "نرے واعظ و مولوی" کی حیثیت سے پہچانتا ہے۔ فسانۂ مبتلا میں میر تقی کے وعظ پر سی آئی ڈی کے آدمی کی گفتگو پڑھئے حیرت ہوتی ہے کہ اُس زمانے میں جب اس قسم کے تصورات کا چلن ہی نہ تھا۔ نذیر احمد کیونکر غیر اسلامی نظام کی اطاعت ناجائز سمجھتا ہے۔ مگر یہ بھی درست ہے کہ صرف سمجھنے کی حد تک۔ اس سے آگے عملاً اپنے ساتھیوں میں غالباً وہ سب سے پیچھے ہیں۔

بہرحال، ہمارا یہ دور اُردو کی تاریخ میں درحقیقت بہت شاندار گزرا ہے، اور اس نے ہمیں اپنا ادب بنانے کی بہت سی راہیں دکھائی ہیں، اور جیسا میں نے اوپر دکھایا، اسلام پسند شخص کو بھی یہ دور مایوس نہیں کرتا، کیونکہ اس میں جو کچھ بھی آمیزش شدہ اسلامی عناصر ہیں، اس سے پہلے اور بعد دور دور تک اتنے بھی ملنے دشوار ہیں۔

لیکن یہ کیفیت زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکتی تھی، جس انگریزی حکومت کی تعریف میں سرسید، حالی، نذیر احمد وغیرہ لوگ رطب اللسان تھے وہ مسلمانوں کے حق میں بالخصوص ہر طرح نامہربان ثابت ہوئی۔ سرسید کی فہمایش سے مسلمانوں نے انگریزی تعلیم بھی حاصل کی مگر اس کا کیا نتیجہ ہوا؟ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہندو کو ہر جگہ آگے بڑھایا جانے لگا، اور مسلمان کی ہر موقع پر حوصلہ شکنی کی گئی۔ کیونکہ یہی وہ لوگ تھے جن کے دماغ میں حکومت کا خمار ابھی تک بھرا تھا۔ لیکن عملی قوتیں شل ہو جانے کی وجہ سے کچھ کر دکھانے سے قاصر تھے۔ زیادہ سے زیادہ ماضی کے قصے دُہرا کر مزہ لے لینا ہی ان سے ہو سکتا تھا۔ اسی لئے ان میں عبدالحلیم شرر، محمد علی طبیب اور صادق حسین صدیقی خوب مقبول ہوئے، جنھوں نے مسلمانوں کی ماضی کا دلآویز نقشہ اپنی رنگ آمیزیوں کے ساتھ پیش کیا، جس سے مزید فریب خوردگی اور اسلام کے بارے میں مزید غلط فہمی پیدا ہوئی (یہ کہنا بھی شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ ان تاریخی ناولسٹوں کا حق جانشینی پاکستان میں بھی ایک صاحب نسیم حجازی کے نام سے ادا فرما رہے ہیں!) بہرحال ان حضرات کے ادب میں اسلامیت صرف اتنی ہے کہ انہوں نے صدرِ اوّل کے مسلمانوں کے حالات کو چٹخارہ دار بنا کر ہمارے آگے رکھ دیا ہے۔ اگرچہ اس کی پروا بہت کم کی ہے کہ ان بزرگوں کو اکثر اوقات اپنی سطح پر لا اُتارا ہے۔ اور ان کے تاریخی نیم تاریخی قصوں سے عبرت پذیری کے بجائے لذت پسندی کی تسکین کی گئی ہے اور یہی لذت پسندی آگے بڑھ کر ہمارے ادب میں رومانیت ٹیگوریت اور اسی قسم کا دوسرا قطعاً دور از کار ادب لائی جس کا مقصد سوائے آسودگیٔ نفس کے اور کچھ نہ تھا۔ یہ وبا یورپ میں بھی اس سے کچھ ہی عرصہ قبل پھیل چکی تھی، اور "ادب برائے ادب" کے نظریے کے سائے میں اُردو میں بھی آئی۔ اس نے آتے ہی ہماری پرانی قدروں کو مسخ کر دیا، اور نہ صرف یہ کہ لوگوں میں پہلے کی موجودہ فراری ذہنیت کو اس نے اور ہوا دی، اور ہمارے ادیب (خصوصاً نیاز فتحپوری، سجاد انصاری، یلدرم، اختر شیرانی وغیرہ) اور ان کے ناظرین دنیا سے ماورا ایک خیالی جنت کے مزے لینے لگے، بلکہ عام اخلاقی اور دینی تصورات کو بھی زبردست ٹھیس لگی۔ ہر پڑھا لکھا افسانوی ماحول میں قیس و زہرا و بنکر مزے لوٹنے لگا اور صنفی آوارگی کی لگام ڈھیلی ہو گئی۔

ان حالات میں اقبال جیسی ہستی کا پیدا ہو جانا بظاہر عجائبات سے معلوم ہوتا ہے، مگر دراصل وہ بھی ماحول کے ردِ عمل کی منطقی یادگار ہے۔ صرف یہی ایک ایسی ہستی ہے جس کے ابتدائی کلام کو چھوڑ کر اس کا بیشتر حصہ ہم خالص اسلامی کہہ سکتے ہیں۔ اور اگرچہ اس کے ہاں بھی فکری تضاد کی منفرد مثالیں ملتی ہیں مگر بہ حیثیت مجموعی فکری ارتقا کے بعد پختگی کی منزل تک پہونچ کر شاعری کی ایسی ہمہ گیر

یکسانی شاید چند شاعروں کو چھوڑ کر دنیا میں کہیں ملے۔ اقبال پر تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں، مختصراً اتنا کافی ہے کہ اس نے ہماری صدیوں کی بگڑی ہوئی شاعری کی طرف سے پورا کفارہ ادا کر دیا ——— یہاں میں تین جائز ادیب کے خالقوں کا ذکر بھی مناسب سمجھتا ہوں جن کا کلام خالص اسلامی نہ ہوتے ہوئے بھی ہماری روح کو بالیدگی اور پاکیزگی ابتہاج و اہتزاز عطا کرتا ہے۔ یہ تینوں جگر، فانی اور اصغر ہیں، جن میں سے فانی ہمیں عرفانِ غم کے مراحل کی سیر کراتے ہیں، اصغر عرفانِ نشاط کی، اور جگر صحت مند مسرت کی۔ اور حقیقتاً ہم ان میں سے کسی کا ایک شعر بھی[1] چھوڑ دینے پر تیار نہیں۔

اس زمانے میں نثر کے وہ شہسوار اور جلوہ گر ہوتے ہیں جن کی کوششیں بہرحال مسلمانہ ہونے کی بنا پر کسی حد تک اسلامی اور جائز کہی جاسکتی ہیں۔ عورتوں کی اصلاح کے علمبردار راشد الخیری[2] اور بگڑے ہوئے نوجوانوں اور رجعت پسند علما پر طنز کا تیر چلانے والے قاضی عبد الغفار[3] جو لیلیٰ کے خطوط کے ذریعے اپنی زندگی ہی میں کلاسیکی بن گئے ہیں۔ دونوں صاحب طرز ہیں اور یکساں اہم۔ بلکہ بیجا نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ بعد کے آنے والے ترقی پسندوں نے ان سے بہت کچھ لیا اور سیکھا۔

آخری اور منظم با مقصد تحریک ترقی پسندوں کی ہے جس میں اسلامی اقدار کا تلاش کرنا بے سود ہے۔ ان کے بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ اس کے اعادے کی حاجت نہیں۔ لیکن کم از کم پاکستان میں یہ بھی دم توڑ چکی ہے، اور اس کے ردِ عمل کے طور پر وہ تحریک اُٹھ چکی ہے جس سے ہم آپ وابستہ ہوتے ہوئے اس صحبت میں جمع ہوئے ہیں۔ اس کے افراد ادبی حیثیت سے کوئی مقام ابھی تک نہ پا سکے ہیں، لیکن یہی امید ہمارے لئے کافی ہے کہ ہم آئندہ کے عظیم ترادیبوں کو نئی راہ سجھا کر اپنا احسان مند بنا کر خدا کے حضور سرخرو ہوسکیں۔

---

[1] حالانکہ مضمون نگار نے جو الزامات میرؔ، دردؔ، اور نواب مرزا شوقؔ کے شعر پر لگائے ہیں وہی الزامات ان شاعروں کے بعض شعروں پر بھی عاید ہوتے ہیں ——— (م۔ق)

[2،3] فاضل مقالہ نگار شاید "ادب" صرف افسانہ نگاری اور ناول نویسی کو سمجھتے ہیں ورنہ اُردو ادیبوں اور انشاپردازوں کے سلسلہ میں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی جیسے بلند پایہ نثر نگاروں کا ذکر نہ کرنا بہت بڑی بھول ہے ——— (مدیر)۔

حسن ریاض

اصلاح کیسے ہو؟

تجاویز، طریقے اور تدابیر!

عام خیال یہ ہے کہ "اگر ارکان و عمائد حکومت کی اصلاح ہو جائے تو تمام معاشرے کی اصلاح ہو جائے لہذا تمام توجہ حکومت کی اصلاح کی طرف ہونی چاہیئے" ارکان حکومت کی اصلاح اس لئے آسان سمجھی جا رہی ہے کہ وہ چند نفوس ہوتے ہیں اور عوام کی اصلاح دشوار اور دیر طلب، کیونکہ وہ بہت ہوتے ہیں۔

اس قول کے مطابق اصلاح میں آسانی اور دشواری کی بنیاد تعداد ہے۔ کیا یہ تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ تھوڑی تعداد کی اصلاح آسانی سے ہوتی ہے اور بڑی تعداد کی مشکل سے؟ اس کے لئے اصلاحی تحریکات کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیئے ان میں سب سے پہلی اور سب سے زیادہ طاقتور پیغمبروں کی تحریکات ہیں اور ان کے بعد اقوام کے سیاسی اور معاشرتی رہنماؤں کی۔ نوح، ہود، صالح، شعیب، ابراہیم، یونس، ادریس، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام نے اپنی قوموں کی اصلاح کی کوشش کا اپنی مثال سے، حکمت و موعظت سے، اور پیغمبرانہ معجزات سے۔ بادشاہوں امراء اور عمائد قوم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ انھوں نے پیغمبروں کا سخت مقابلہ کیا۔ مگر عوام متاثر ہوئے۔ انہی میں سے پیغمبروں کے حامی اور مددگار نکلے اور انہی میں سے مومن اور مسلمان پیدا ہوئے، جنھوں نے تبلیغ حق میں سختیاں جھیلیں۔ خود اسلام کی دعوت بھی سب سے پہلے عوام نے قبول کی۔ سردار اس وقت دائرۂ اسلام میں آئے جب فتوحات شروع ہو گئیں، اسلام کے غلبے کا یقین ہو گیا، اور بالعموم فتح مکہ کے بعد

دو سیاسی انقلاب بھی ہیں جو مثال میں پیش کئے جا سکتے ہیں اور حال میں واقع ہوئے ہیں ——— ایک فرانس کا، دوسرا روس کا۔ دونوں ملکوں میں پہلے یہی کوشش کی گئی کہ حاکموں کی اصلاح ہو جائے اور ناکامی ہوئی۔ بالآخر عوام سے تخاطب کیا گیا اور کامیابی ہوئی۔

یہ بات صحیح نہیں ہے کہ تھوڑی تعداد کی اصلاح آسان ہے اور بڑی تعداد کی مشکل۔ ایک آدمی کی اصلاح دشوار ہے اگر وہ اصلاح کو اپنے لئے مضر سمجھے، دس کروڑ آدمیوں کی اصلاح آسان ہے اگر وہ اسے اپنے لئے مفید سمجھیں۔ وہ جو ایک یا دس سو یا ہزار، یعنی خواص ہوتے ہیں وہ ناسمجھ نہیں ہوتے۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ اچھا کیا ہے اور برا کیا چنانچہ اس دور کے جمہوری ممالک کی مجالس واضعان قانون کی کارروائیوں کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ وہی پارٹی جو اپنے زمانے اقتدار میں نہایت جابر ہوتی ہے جس وقت معزول ہو کر حزب مخالف بنتی ہے تو فوراً عوام کی مصائب کے درد سے بے قرار ہو جاتی ہے اور سب باتیں اس کی زبان پر آنے لگتی ہیں جو پیغمبروں اور مصلحین کے مواعظ کی جان ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ صاحب اقتدار لوگ بری حرکتیں نادانستگی سے کرتے ہیں، بلکہ وہ اپنے نفس کے تقاضوں سے مجبور ہوتے

ہیں اور طاقت کے زور میں اس کی باگیں اور ڈھیلی کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خود طاقت اور اختیار[1] کا یہ خاصہ ہے کہ اس سے زعم، تکبر، نفس پروری، اور خود غرضی پیدا ہوتی ہے۔ صالح ترین انسان بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ سوائے پیغمبروں[2] کے معصوم کوئی نہیں ہوتا۔ لہذا اہلِ حکومت پر روک ٹوک ہونی چاہیئے خواہ وہ کوئی ہوں۔ یہ روک ٹوک جتنی زیادہ کڑی اور علم و فراست کے ساتھ ہوگی حکومت اتنی ہی زیادہ اچھی ہوگی۔

یہ خیال کہ حکومت کے ذریعے سے عوام اور معاشرے کی اصلاح کا کام بہت جلد ہو سکتا ہے، کیونکہ اس کے پاس وسائل ہوتے ہیں، اس کی غمازی کر رہا ہے کہ وہ لوگ جو اصلاح کے طالب ہیں لوگوں کی ہر ضرورت کے لئے اختیارِ حکومت پر تکیہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو ایسی سرپرست اور مائی باپ حکومت چاہیئے جو معاشرے کی تمام ضروریات کی کفیل ہو، اس کی سربراہ کار ہو، اسکی رہنما ہو، اس کے لئے اسبابِ زندگی کا انصرام کرے، اس کی تہذیب و تربیت کرے۔ پھر حکومت کے مقابلہ میں طاقت اور اختیار کا دعوٰے کون کرے گا؟ حکومت کو بے راہ ہونے سے کون روکے گا؟ کیا یہی اپاہج، دست نگر، اور حکومت کے احسانات سے دبے ہوئے عوام؟

اپنے وجود کی بقا کے لئے جدوجہد کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ جو حکومت برسرِ اقتدار ہوگی وہ دوام اپنی جگہ قایم رہنے کی کوشش کرے گی۔ اگر اس نے دیانت کے ساتھ خدمت بھی کی تو وہ کم از کم اتنا انتظام ضرور کرے گی کہ عوام کبھی اتنے طاقتور نہ ہوں کہ اس کو معزول کر سکیں۔ جو ایک یا دو شخص حکومت میں زیادہ طاقتور ہوں گے وہ اپنی آئندہ نسلوں کے لئے مسندِ اختیار کو محفوظ اور مستقل بھی ضرور کرنا چاہیں گے۔ انہیں ایسا ہی بیٹا زیادہ اہل نظر آئے گا۔ مسلمانوں میں یہ ایک مرتبہ ہو چکا ہے اور ایسوں کے ہاتھ سے ہوا جو اصلاح یافتہ تھے اور صالح تھے اُس وقت جو عام مسلمانوں کے ہاتھ سے اختیار گیا تو پھر واپس نہ آیا۔ یہی اگر دوسری دفعہ بھی ہوا تو دائمی محرومی یقینی ہے۔

اچھے[3] حاکم ہوں یا بُرے، دونوں عوام کو اپنا حریف سمجھتے ہیں اور دونوں ان کو کمزور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

[1-2] اگر کسی کو طاقت اختیار اور اقتدار حاصل ہو، اور اُس کے دل میں خدا کا خوف بھی ہو، وہ اللہ اور بندوں کے فرایض بھی پہچانتا ہو، اور وہ اختیار کو یہ سمجھ کر استعمال کرتا ہو کہ حقیقی حاکمیت اور اصل اقتدار و اختیار تو اللہ تعالیٰ کو زیبا ہے، میں تو اُس کی نمایندگی کا فریضہ انجام دے رہا ہوں، اور میری ایک ایک حرکت پر بازپرس بھی ہوگی ——— میں ملک و ملت کا مخدوم نہیں خادم ہوں، اس لئے کہ :—

سروری در دینِ ما خدمت گری ست (اقبال)

تو پھر اس ذہنیت اور مزاج کا صاحبِ اختیار شخص دنیا کے لئے رحمت ثابت ہوگا، خلفاء راشدین اور حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی زندگیوں کو ہم اس کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں ——— یقیناً پیغمبروں کے سوا کوئی معصوم نہیں ہوتا، مگر اس کے یہ معنیٰ بھی نہیں ہیں کہ ہر صاحبِ اختیار آدمی کو معصوم نہ ہونے کی بنا پر حجاج اور چنگیز سمجھ لیا جائے

نے نے صنما! میانِ دلہا فرق است ——— (مدیر)

[3] اچھے حاکم عوام کو اپنا حریف ہرگز نہیں سمجھ سکتے، اور جو کوئی عوام کو اپنا حریف سمجھتا ہے وہ اچھا حاکم ہی نہیں ہے، فاضل مضمون نگار جب "اچھا حاکم" کہتے ہیں تو اُن کے ذہن میں شاید وہ بادشاہ ہوتے ہیں جو تاریخ میں نیک نام ہیں ——— مگر اسلام کے یہاں "اچھے حاکم" کا معیار صدیقؓ و فاروقؓ کی زندگیاں ہیں ——— (مدیر)

فرق صرف یہ رہتا ہے کہ اچھے حاکم اس قدر خدمت کرتے ہیں کہ عوام آرام طلب بن کر خود اعتمادی سے محروم ہو جاتے ہیں، اور بُرے حاکم جبر، تعدی، اور ذلت آمیز برتاؤ سے ان کی ہمتیں پست کر دیتے ہیں۔

میری قطعی یہ رائے ہے کہ اسلام ایسا معاشرہ چاہتا ہے جو اپنے امور کے انصرام کا خود کفیل ہو۔ ـــــ حکومت کا بھی۔ اور یہ کفالت بیچارگی اور بے شعوری کے ساتھ نہیں، جس طرح کہ ہر ملک کے عوام کرتے ہیں، بلکہ شعور، ارادے، اور اختیار کے ساتھ ہو۔ یعنی اس طرح کہ ان میں اسے واپس لینے کی قدرت ہو اور اس قدرت کا انہیں احساس ہو۔ اسلامی سوسائٹی میں حکومت کی حیثیت ایک ادارہ کا ملہ کی ہونی چاہیئے، اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔

یقیناً کروڑوں آدمیوں کی اصلاح کرنا، ان میں شعور پیدا کرنا اور انہیں کُلی اختیار کا طاقتور محافظ بنانا بڑا مشکل کام ہے مگر چند ذی اختیار آدمیوں کو صرف پند و نصیحت سے صالح بنا دینا نا ممکن ہے، خواہ ان کی تعداد کتنی ہی تھوڑی ہو۔ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ اپنے نفع کی طرف دوڑتا ہے۔ کارل مارکس، اینجل، اور لینن نے مزدوروں کو آواز دی کہ تمام اخلاقی بندشوں سے آزاد کر کے ہم تم ہی کو اپنا آقا بنا دیں گے، اور تم ہی کو اپنا روزی رساں، وہ ان کی طرف دوڑ پڑے اور دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ یہ کروڑوں ہیں اور ان میں آسانی سے تبلیغ ہو رہی ہے۔ زارِ روس ایک قوم واحد تھا اس کو یہ متاثر نہ کر سکے ـــ یہ دعوت زارِ روس کے مقاصد کے خلاف تھی۔

حکومت اور اختیار میں بڑی ہی بڑی لذت ہے، کُن کہا اور ہو گیا۔ یہ منصب خدائی کا ایک بڑا شعبہ ہے۔ ایک مرتبہ اس کی لذت سے آشنا ہونے کے بعد انسان کبھی اس سے دست بردار نہیں ہونا چاہتا۔ پھر اس اختیار کے ذریعے بے اندازہ ذاتی منافع بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ ساری دنیا میں عمال و حکام کی اکثریت ذات کے لئے، خاندان کے لئے، دوستوں کے لئے، طبقے کے لئے، اپنی پارٹی کے لئے اختیار کے زور سے منافع حاصل کرتی ہے ـــــ بالعموم ناجائز۔ یہ کیسے منظور کر سکتے ہیں کہ حاکم کا مرتبہ چھوڑ کر ملک اور قوم کے خادم کی حیثیت اختیار کریں اور عوام کو اتنا طاقتور ہونے دیں کہ وہ ان سے محاسبہ کریں، اور جب چاہیں انہیں بدل دیں۔ یہ ان کے مقاصد کے خلاف ہوتا ہے کہ اصلاح قبول کریں لہٰذا یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہوگی کہ اہل حکومت میں وعظ و تبلیغ سے وہ تبدیلی پیدا ہو، کہ ہیئت حاکمہ صالح ہو جائے اور اس کی وساطت سے معاشرے کی اصلاح ہو۔ بعض لوگ یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ حکومت کو بدل دیا جائے اور صالح آدمیوں کے ہاتھوں میں اختیار دیا جائے۔ مگر یہ تدبیر بھی ناقص ہے۔ سوائے خلفائے راشدین کے مرتبے کے لوگوں کے اور کسی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ بالکل بے غرضی اور بے نفسی کے ساتھ مخلوق یا مسلمانوں کے فائدے کے خدمت اور قرآن و سنت کے مطابق ان کے کردار کی تعمیر کریں گے۔ اگر واقعی مسلمانوں کی بگڑی ہوئی سوسائٹی میں سے کچھ صالح لوگ نکل بھی آئیں،

جس کی بالکل توقع نہیں ہے، تو مسندِ اختیار ان کو خراب کر دے گی۔

"ہم یہ کب کہتے ہیں کہ ہر متقی حاکم سر سے پیر تک اور دل سے نگاہ تک ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) بن جائے گا، غرض کرنا یہ ہے کہ اُس کی زندگی میں ان بزرگوں کی سیرت سے زیادہ سے زیادہ مماثلت ہوگی اور ہونی چاہیئے اور اسی کو ہم "اچھا حاکم" کہتے ہیں! خلفائے راشدین تقویٰ، نیکی اور فراست میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر ہرگز نہیں تھے مگر اُن میں حضور کی سیرت مقدسہ کی جھلکیاں پائی جاتی تھیں اس لئے اختیار ملنے پر انھوں نے دنیا کو بگاڑنے کے بجائے سنوارا اور فساد و شر کی جگہ امن و سلامتی کو پھیلایا ——— یہ تصور بھی صحیح نہیں ہے کہ سخاوت میں کوئی حاتم طائی اگر نہیں بن سکتا تو پھر دنیا میں اہلِ سخاوت سے بالکل مایوس ہو جائیں اور سخاوت کی کسی سے توقع ہی نہ رکھیں اور یہ فیصلہ کر لیں کہ جسے دولت ملے گی وہ یقیناً قارون ہی ہوگا ——— یہ عجب منطق ہے کہ یا تو آدمی فرشتہ بن جائے ورنہ پھر وہ شیطان ہی ہوگا، کیا دونوں انتہاؤں کے درمیان درجات اور مقامات نہیں ہیں ——— حضرت عمر بن عبدالعزیز بالکل ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) نہیں تھے مگر اُن سے ملتے جلتے تھے اس لئے اُن کا وجود معاشرے کے لئے برکت ثابت ہوا۔

مسلمانوں کی سوسائٹی یقیناً بہت زیادہ بگڑی ہوئی ہے مگر یہ سمجھ لینا بھی ایک طرح کی زیادتی اور یاس و قنوطیت کی انتہا ہے کہ مسلمانوں کی پوری سوسائٹی میں "کچھ صالح لوگ" بھی نہیں نکل سکتے، ایسا ہرگز نہیں ہے، "ملت" مریض ہی مگر اتنی بانجھ نہیں ہے کہ اُس کے بطن سے صالح افراد کا پیدا ہونا بالکل بند ہو گیا ہو اور مسلمانوں میں تھوڑے بہت "صالح افراد" کا وجود بھی ناپید ہو۔ یہ بھی ایک طرح کا وہم ہے کہ ملت میں "صالح لوگ" نکل بھی آئے تو "مسندِ اختیار" اُن کو خراب کر دے گی، "صالح افراد" تو "مسندِ اختیار" کو بھی صالح اور مطہر بنا دیں گے اور وہ گندگیاں جو بُرے حاکموں کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہیں دُور ہو جائیں گی۔

اختیار، دولت، مال و متاع ان میں کوئی چیز فی نفسہٖ بُری نہیں ہے، "برائی" اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب اُن کو غلط طریقہ پر استعمال کیا جاتا ہے، ایک آجکل کے سرمایہ دار ہیں جو کم بخت یا تو بخل و دناءت میں "شائیلاک" ہیں یا پھر تعیش پسندی میں جمشید و شداد ہیں، ایک عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور عثمانؓ ابن عفان بھی سرمایہ دار تھے کہ مال و دولت اُن کے تقویٰ کو متاثر نہ کر سکے، اگر صدیقؓ و فاروقؓ سے ملتے جلتے "حاکم" اور عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور حضرت عثمانؓ جیسے سرمایہ دار ہوں تو منصبِ اختیار اور مال و دولت دنیا کے لئے زحمت نہیں رحمت ثابت ہوں ——— فاضل مضمون نگار کا یہ کہنا کہ "صالح لوگوں کو مسندِ اختیار خراب کر دیگی" ایک طرح کا راہبانہ تصور ہے، اس کے تو یہی معنی ہوئے کہ "اختیار و اقتدار" بُرے حاکموں اور غیر صالح لوگوں کی میراث بن کر رہ جائے گا، اس لئے کہ صالح افراد" اس ڈر سے کہ کہیں "مسندِ اختیار اُن کو خراب نہ کر دے" اختیار سے کنارہ کشی اختیار کر لیں گے، لہٰذا اقتدار کی کرسیوں اور اختیار کی مسندوں پر غیر صالح حاکم ہی سدا براجمان

یہ حدیث اپنی جگہ بیشک صحیح ہے کہ "جو کوئی کسی عہدے کی خود خواہش کرے اُسے عہدہ نہ دو" .. اور یہ اس لئے فرمایا گیا ہے کہ اُس شخص کے دل میں عہدے اور منصب کی ہوس موجود ہے لہٰذا اس ذہنیت کا آدمی عہدے کو لذت سمجھ کر قبول کریگا اور اُس سے فائدہ اٹھائے گا ——— اور یہ بھی درست ہے کہ اہلِ تقویٰ احساسِ ذمہ داری، خشیتِ الٰہی اور آخرت کی بازپرس کے خوف سے "عہدے" اور "اختیار" قبول کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے، مگر اس کی بھی دو نوعیتیں ہیں حضرت امام ابو حنیفہؒ نے جو "قاضی القضاۃ" کے عہدے کے قبول کرنے سے انکار فرما دیا تھا اُس کا میرے خیال میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ امام موصوف اُس حکومت کی مشین کا پرزہ بننا نہیں چاہتے تھے جو خلافتِ راشدہ کے منہاج پر قائم نہ تھی اور جس میں ملوکیت کا دور دورہ تھا ——— لیکن اس کے برخلاف حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور علی (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) نے جن بزرگوں کو حاکم بنا کر بھیجا اور کوئی عہدہ پیش کیا تو اسے قبول کر لیا گیا کہ اسلامی حکومت میں کسی "عہدے" کو قبول کر کے آدمی کتاب و سنت

اگر اختیار، اقتدار اور حکومت "برائی" کا نام ہے تو پھر حضرت حسینؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت نفسِ زکیہ جیسے بزرگوں کی جدوجہد اور سرفروشانہ کوششوں کے بارے میں کیا حکم لگایا جائے گا ؟ (مدیر)

پھر ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا ساری خرابیاں محض انہی کی وجہ سے ہیں جن پر گورنمنٹ مشتمل ہے، یعنی وزراء؟ ایسا نہیں ہے۔ وزارت پالیسی معین کرتی ہے اور زیادہ سے زیادہ ہر شعبہ (Department) کا وزیر اپنے شعبہ کی بہت ہی اہم معاملات میں آخری فیصلہ دیتا ہے۔ اصل کام سیکریٹیریٹ میں ہوتا ہے، اضلاع میں ہوتا ہے، تحصیلوں میں ہوتا ہے، تھانوں میں ہوتا ہے اور ایسے خاص دفاتر میں ہوتا ہے جیسے رینٹ کنٹرول کا دفتر، پرمٹ کا دفتر، لائسنس کا دفتر، ایسے ہی اور بہت سے با اختیار ادارے ہیں۔ ساری دنیا کا یہی معمول ہے۔ اگر یہ سب صالح نہ ہوں، یا ان کی تربیت ان اصولوں اور نظریات کے مطابق نہ ہوئی ہو جو کسی دولت نے اپنے معین کئے ہوں، تب کیا ہوگا؟ کیا گورنمنٹ جو دس بارہ وزیروں پر مشتمل ہوتی ہے ان سے اسٹیٹ کے تصورات کے مطابق کام لے سکے گی؟ ان سیکریٹریوں، افسروں اور ماتحت عملے کی تعداد پورے ملک میں لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ گورنمنٹ کو بدل دیا جائے ان کو دفعتاً کیونکر بدلا جائے گا۔ لازماً دفعتاً سارا کام بند ہو جائے گا ان سب کی نگرانی کے لئے کوئی خاص محکمہ قائم کیا جائے؟ اس محکمہ کے لئے آدمی کہاں سے آئیں گے؟ یا حکومت کے عملے میں سے چھانٹے جائیں گے یا اسی سوسائٹی سے آئیں گے جس میں سے تمام عیب دار سیکریٹری، اہلکار اور عمال آئے ہوں گے۔ لازماً سوسائٹی کے تمام عیوب ان میں بھی موجود ہوں گے اور یہ بھی وہی کریں گے جو وہ کرتے ہوں گے جن کی نگرانی کے لئے انہیں مقرر کیا جائے گا۔

مثال کے طور پر اس وقت پاکستان میں قریب قریب تمام عمال و اہلکار وہی ہیں، جو انگریزوں کی حکومت میں تھے بس مسلمان ہیں ہو گیا ہوا، اس زمانے میں ان کا مزاج، اخلاق، نقطۂ نظر بالکل وہی تھا جو برطانوی حکومت کے عمال اور اہلکاروں کا ہونا چاہیئے تھا۔ ان کو اسی کی تربیت دی گئی تھی۔ اس زمانے میں انگریزوں کے مقاصد کی تکمیل کے لئے انہیں کسی اور کے ساتھ نہیں، خود مسلمانوں کے ساتھ کسی ایسی زیادتی اور سختی سے باک نہیں تھا جو دینی اخوت اور وطنی مروت کے خلاف ہو۔ اجتماعی مقاصد میں یہ قومی راہ سے ہمیشہ الگ اور انگریز حاکموں کے ساتھ رہے۔ اب انگریز نہیں ہے لیکن اب بجائے اس کے یہ خود اپنے تئیں حاکم سمجھنے لگے ہیں اور اسی تمرد اور تکبر سے اپنے ہم قوموں کے ساتھ پیش آتے ہیں جس کے یہ انگریزوں کے زمانے میں عادی ہو گئے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت انگریز کی بازپرس کا انہیں خوف رہتا تھا، اب وہ بھی نہیں ہے۔ انھوں نے کہاں پڑھا ہے اور انہیں کس نے سکھایا ہے کہ آزاد جمہوری ملک میں عوام حاکم ہوتے ہیں اور اسلامی جمہوری ملک میں اس تصور کے ساتھ انصرام امور مملکت کیا جاتا ہے کہ ملک کا مالک اللہ ہے اور اس کی طرف سے نیابتاً اختیار حاکمیت برتنے کے مجاز جمہور مسلمین ہیں، حکومت ان کا نیابتی نظام عاملہ ہے، اور اس نظام کی وساطت سے تمام عمال اور اہلکار عوام کے ملازم ہیں، جو اس پر مامور ہیں کہ انکسار کے ساتھ ان کی خدمت کریں۔ گورنمنٹ[1] کو ہزار بار بدلیئے اور ان کو اپنی حال میں رہنے دیجئے خالص اولیا اللہ کی گورنمنٹ بھی ان کے مقابلہ میں عاجز رہے گی اور اس کی پالیسی کا نفاذ یہ اس کے مقاصد کے خلاف کرتے رہیں گے۔

پھر حکومت ہی کو کیوں کر بدلا جائے گا؟ حکومت کیا محض کسی پارٹی کی فرمائش سے تبدیل ہو جاتی ہے؟ اس کے لئے بھی عوام ہی سے اپیل کرنی پڑتی ہے، عوام کی تنظیم کی جاتی ہے، ان کی قوتوں کو بروئے کار لایا جاتا ہے، انہیں مقابلے اور جنگ کے لئے تیار کیا جاتا ہے اور انہیں کی مدد سے ہر قسم کی جنگ اور جد و جہد کی جاتی ہے، آئینی بھی اور غیر آئینی بھی۔ مقابلہ

---

[1] گورنمنٹ اور حکومت کی پالیسی کی تبدیلی کا لطیف عمال حکومت پر بھی اثر پڑتا ہے اور اوپر سے لیکر نیچے تک چھوٹے بڑے، چپراسی، کلرک اور عہدیدار سب اس تبدیلی اور انقلاب کا اثر قبول کرتے ہیں —— ہم نے دیکھا ہے کہ کسی محکمہ میں کوئی دیانت دار حاکم آگیا ہو ہے۔ تو اس محکمہ میں رشوت اگرچہ بالکل بند نہیں ہوئی مگر اس میں نمایاں کمی ضرور ہو گئی ہے —— (مدیر)

۔۔۔ور جنگ کس سے؟ اسی حکومت سے جس کے پیچھے ہی تمام قومی وسائل ہوتے ہیں، تبلیغ کے لئے "ریڈیو بھی" جس کی دو دن کی تبلیغ ایک ہزار واعظوں کی تقریروں سے زیادہ موثر ہوتی ہے" لالچ دینے کے لئے خزانے ہوتے ہیں، عہدے ہوتے ہیں، طرح طرح کی مراعات دینے کی استطاعت ہوتی ہے، ڈرانے اور دھمکانے کے لئے پولیس، فوج، جیل ہوتے ہیں، ٹھیکے توڑنے اور جائیدادیں ضبط کرنے کے اختیارات ہوتے ہیں۔

بہر حال بے غرض مصلحین کو یا کسی ایسی پارٹی کو جو خود اقتدار کی طالب ہو اس سے مفر نہیں ہے کہ عوام میں تبلیغ کرے اور انہیں اپنا ہم خیال بنائے۔ بلا عوام کی پوری مدد کے نہ کوئی حکومت کو تبدیل کر سکتا ہے نہ اس کی اصلاح کر سکتا ہے اور دونوں صورتوں میں یہ کام بغیر حکومت کے وسائل کے ہی کرنا پڑتا ہے۔ البتہ طالب اختیار پارٹی کے لئے بعض دشواریاں زیادہ ہیں۔

جب حکومت کو تبدیل کرنے کی نیت سے کوئی تحریک شروع کی جاتی ہے، اور بانیانِ تحریک کے مدنظر یہ ہوتا ہے کہ اختیار حکومت پر خود قابض ہو جائیں تو تحریک کا اخلاقی اور اصلاحی پہلو ماند پڑ جاتا ہے۔ اغراض درمیان میں آجاتی ہیں۔ لہذا عوام کی اور ان لوگوں کی جن کا عوام میں اثر ہو، تائید حاصل کرنے کے لئے ان کو بھی عوام کے مذاق کے مطابق لالچ دینا پڑتا ہے اور ترغیب دینی پڑے گی، لوگوں کو مشتعل کرنے کے لئے حکومت کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کرنا پڑے گا۔ ایسے تمام لوگوں کو ساتھ لینا پڑے گا جو کسی طرح کا اثر

---

(۲) حکومت کے بدلنے کے لئے جو تحریکیں ملک میں اُٹھ رہی ہوں پہلے اُن تحریکوں کے اغراض و مقاصد اور اُن کے کارکنوں کی زندگیوں کو دیکھنا ہے کہ وہ کیسی ہیں؟ حکومت کے بدلنے کی ہر تحریک" کو ایک جیسا سمجھ لینا فکر و نظر کی غلطی ہے! احزاب مخالف opposition parties کو اور اُن کے لیڈروں اور رہنماؤں کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھنے کی ضرورت ہے! مثال کے طور پر پاکستان میں کئی جماعتیں حکومت میں تبدیلی چاہتی ہیں عوامی لیگ ہے کمیونسٹ ہیں اور جماعت اسلامی ہے! کیا یہ تینوں جماعتیں ایک ہی جیسی ہیں اور صرف اس بنا پر کہ وہ حکومت میں انقلاب چاہتی ہیں، اُن کو ایک ہی جیسا سمجھ لیا جائے گا، اور کیا ابوالاعلیٰ مودودی، امین حسن اصلاحی، شہید سہروردی، شوکت حیات، نواب ممدوٹ اور میاں افتخار الدین اپنے افکار اور زندگیوں کے اعتبار سے کوئی امتیاز اور فرق نہیں رکھتے؟ دیکھنا اور جانچنا یہ ہے کہ کونسی جماعت کس مقصد کے لئے حکومت میں انقلاب چاہتی ہے؟ اُس کے کارکن کس طرح کی زندگیاں رکھتے ہیں ——— اس کے بعد ہی اُس تحریک کی افادیت اور عدم افادیت پر حکم لگایا جا سکے گا؟

اب رہا "کسی تحریک کے اخلاقی اور اصلاحی پہلو کے ماند پڑنے کا" سوال تو پنجاب اور سرحد کے الیکشن میں اس کا تجربہ ہو چکا ہے کہ اللہ کے فضل سے جماعتِ اسلامی کی تحریک کا اخلاقی پہلو ماند پڑنے کے بجائے اور روشن اور نمایاں تر ہو گیا! اب رہا جھوٹا پروپیگنڈا اور حکومت کی مخالفت میں ناجائز ذرائع کا استعمال، تو ایک وہ جماعت جو کتاب و سنت اور اخلاق و صالحیت کی بنیاد پر انقلاب چاہتی ہے، ان برائیوں سے یقیناً پرہیز کرے گی، یہ باتیں تو وہ جماعتیں اور پارٹیاں کیا کرتی ہیں، جن کے یہاں کوئی اخلاقی پروگرام نہیں ہوتا، پنجاب اور سرحد کے الیکشن میں مسلم لیگ نے یہی تمام حربے استعمال کئے، جماعتِ اسلامی کو بدنام کرنے کے لئے بعض علماء سے ساز باز کی اور فتووں کے ذریعہ جماعتِ اسلامی کی "بے دینی" کو خوب اُچھالا گیا، اور یہ واقعہ بھی سیاست کی تاریخ میں یادگار رہے گا کہ بعض مقامات پر مسلم لیگ نے "طوائفوں" تک کو استعمال کیا، تو ہمارے دوست حسن ریاض صاحب مسلم لیگ کے معیار اخلاق کو دیکھ کر ہر جماعت کے بارے میں رائے قائم نہ کریں کہ ہر جماعت قریب قریب ایسی ہی ہو گی ——— (مدیر)

دیکھتے ہیں اور حکومت کے مخالف ہیں۔ لڑائی میں کسی کو ہوش نہیں رہتا کہ حق و انصاف اور انجام کار پر نظر رکھے۔ ایسی جنگ میں اگر فتح بھی حاصل ہو جائے تو اختیار ہاتھ میں آنے کے بعد نہ خود طالب اختیار پارٹی کا وہ اخلاقی معیار باقی رہیگا جو آغاز جنگ سے پہلے تھا اور نہ اس کے لئے لوگوں کو مطمئن کرنا آسان ہوگا اور بالخصوص گروہوں اور طبقوں کے سرغناؤں کو بے اختیاری اور غیر ذمہ داری کے زمانے کے وعدوں کو کوئی چشم زدن میں پورا نہیں کر سکتا۔ جنگ کے زمانے سے بگڑے ہوئے عوام کو کوئی فوراً اطاعت پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد بھی اگر طالب اقتدار مصلحین صالح ہی رہیں تو وہ حکومت کے وسائل کے اندر ہی تو اصلاح کے کام شروع کریں گے۔ مخالفین فنا نہیں ہو جائیں گے۔ وہ کہیں نہ کہیں حریف پارٹی کی حیثیت سے موجود رہیں گے۔ اس وقت ان کا پروپیگنڈا یہ ہوگا کہ اصلاح مقصود نہیں ہے وعدے پورے کرنے سے گریز کا بہانہ ہے۔ مشتعل عوام کے لئے یہ ایک دل نشین اپیل ہوگی۔ پھر مخالف پارٹی کی طرف سے اصلاح کے دعوے کے ساتھ ترغیبیں اور وعدے شروع ہوں گے اور یہ بڑے شاندار ہوں گے۔ مختصر یہ ہے کہ جنگ اور فساد کا ایک سلسلہ شروع ہو جائے گا جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ انگلستان میں صرف نام بدل گئے ہیں ورنہ صدیاں گزر گئیں "وہگ" اور "ٹوری" پارٹیوں کا مقابلہ اب تک ختم نہیں ہوا۔ لہذا جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ راہ راست برسر اقتدار پارٹی پر حملہ اصلاح کا مختصر اور آسان راستہ ہے وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ یہ مشکل ہے، اس قدر طویل ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا، اور معاشرے کی اصلاح کے لئے بالکل ناکارہ ہے۔

معاشرے کی اصلاح کیلئے کیوں ناکارہ ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ میرے خیال میں حکومت کے فرائض یہ ہیں:— خارجی دشمنوں سے اسٹیٹ کی فرد کو محفوظ رکھے، غیر ممالک میں تجارتی اور سیاسی حقوق و مفاد کی حفاظت کرے، ملی قانون کے مطابق اندرون ملک میں امن و انتظام قائم رکھے، انصاف کے ساتھ اجتماعی امور کا انصرام کرے، مثلاً تعلیم، حفظانِ صحت، رسل و رسائل، نقل و حمل، بازار کے نرخوں کا تعین، محصولات کی تحصیل اور ان کا صحیح مصرف، ملک کے معاشی وسائل کی ترقی، ان کی منصفانہ تقسیم، اس کا اہتمام کہ کوئی شخص محروم معاش نہ رہے اور کوئی شخص جو قانون کی خلاف ورزی کرے سزا سے نہ بچے۔

ان فرائض کی انجام دہی کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ حاکم وہ ایک ہو یا نیابتی نظام خود اپنی مرضی سے اپنے فرائض معین کرے اور انہیں اپنے طریقے پر انجام دے اور عوام میں یہ شعور نہ ہو کہ وہ اپنی اجتماعی مرضی کا تعین کرے، نظم کے ساتھ اسے ظاہر کرے، جتائے، اور حکومت کو اس کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کرے۔ ایسی اسٹیٹ (دولت) اپنی ظاہر صورت کے اعتبار سے جمہوری بھی ہو سکتی ہے مگر واقعی وہ مطلق العنان ہوتی ہے، خواہ وہ جابر ہو یا پدرانہ یا مشفقانہ۔ ایسی دولت کے شہری بے شعور، امور عامہ میں نابالغ، اور حکومت کے ہاتھ میں ایسے لاچار ہوتے ہیں جیسے مردہ بدست زندہ۔ اچھے لوگ حاکم ہوئے انہوں نے حمایت کی، برے ہوئے انہوں نے ظلم کیا۔ بے شعور عوام ایک کو کوستے ہیں اور دوسرے کو دعائیں دیتے ہیں۔ عملاً نہ اچھے نظام کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ برے نظام کی مخالفت اگر کبھی یہ حادثہ پیش آجاتا ہے کہ خارجی دشمن کے حملے سے یا اندرونی خلفشار سے نظام حکومت درہم برہم ہو جائے تو یہ لوگ اپنی آزادی اور اختیار کی حفاظت نہیں کر سکتے اور ہر نئے جابر کی غلامی قبول کرنے کے لئے مجبور رہتے ہیں۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ عوام ذی شعور، منظم، اپنی مرضی سے واقف اور اس کے نفاذ پر قادر ہوں۔ ایسے معاشرے

میں حکومت محض اس کا ایک نظام عاملہ ہوتی ہے جس کا کام یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی منشاء کے مطابق ان کی اجتماعی مرضی کی تعمیل کرے۔ اس کو معاشرے کی زندگی میں صرف اتنا دخل ہو سکتا ہے جتنا اس کی حیات کے لئے اجتماعی عمل سے ضروری ہو۔ حقیقی معنی میں وہ جمہوری حکومت یہی ہے جس کی تمنا کرنی چاہئے۔ یہ نہ عوام کی ولی اور سرپرست ہو سکتی ہے، نہ معلم ہو سکتی ہے، نہ لیڈر ہو سکتی ہے۔ یہ اپنے لئے تمام قوت سوسائٹی سے حاصل کرنے پر مجبور ہوگی۔ بس اسٹیٹ کی یہی ایک قسم ہے جس میں اختیار حاکمہ اہل حکومت کی دست برد سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

قرآن میں اوامر و نواہی کے جتنے احکام ہیں ان سب کا تعلق براہ راست افراد سے ہے اور سزا و جزا کا سزاوار [illegible] بھی افراد ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ صاف صاف کہا گیا ہے کہ ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھائے گا۔ اس سلسلے میں [illegible] یا حکومت سے کوئی تخاطب نہیں ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اللہ کے نزدیک ہر فرد اپنی اصلاح کا ذمہ دار ہے۔ البتہ یہ کہا گیا ہے کہ مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں مصروف رہے۔ (ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر) بس صرف یہ کہا گیا ہے اس سے یہ ہرگز مترشح نہیں ہوتا کہ جماعت سے حکومت[1] مراد ہے، اور بادشاہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ گویا اسلام میں ایک طرف خود افراد اس کے ذمہ دار ہیں کہ وہ برائیوں سے بچیں، نیکیاں اختیار کریں، دوسروں کو نیکیوں کا حکم دیں اور برائیوں سے روکیں اور دوسری طرف اجتماعی طور پر پوری مسلم سوسائٹی اس پر مامور ہے کہ وہ اپنے اندر سے ایک ایسی جماعت پیدا کرے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں مصروف رہے اور پوری سوسائٹی کی اخلاقی سطح کو قرآن و سنت کے معیار کے مطابق بلند رکھے۔

بیشک حکومت ہے، امارت بھی ہے، نظام بھی ہے، مگر اس کا کام یہ ہے کہ تربیت یافتہ اور اصلاح یافتہ سوسائٹی اس کے لئے، جو فرائض اور ذمہ داریاں متعین کر دے، انہیں پورا کرے۔ اس مقصد کے لئے حکومت اختیارات بھی برتے گی، اطاعت کا مطالبہ بھی کرے گی، اور وہ پورا کیا جانا چاہئے۔

اسلامی سوسائٹی کی تنظیم میں اس کا سختی سے اہتمام ہونا چاہئے کہ جس حد تک افراد کو اپنے ذاتی کردار کی اصلاح اور معاشرے کی اصلاح کا ذمہ دار بنایا گیا ہے اس کا احساس ان میں قوت کے ساتھ بیدار [illegible] یہ ذمہ داریاں پوری کرنے کی قابل ہوں اور انہیں واقعی پورا کریں۔ مسلمانوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے ایک جماعت[2] بھی موجود رہے۔ یہ جماعت یا پارٹی

---

۱ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بنیاد پر جو جماعت اور معاشرت قائم فرمائی تھی، اُسی جماعت سے اسلامی حکومت کے قیام و انصرام کا کام بھی لیا، اور رسول اللہ قرآن کے منشاء کو ہم سے بہتر جانتے تھے ——— (مدیر)

۲ یعنی وہ "جماعت" بس وعظ کہتی رہے، اور کچھ نہ کرے اور وعظ کہہ کر وہ مطمئن ہو جائے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اس نے انجام دے دیا ——— اگر کسی حکومت میں "معروف" کی جگہ "منکر" کا رواج ہو اور خدا کے کچھ نیک بندے "منکر" کو مٹانا اور معروف کو قائم کرنا چاہیں تو متقین اور مبلغین کی وہ جماعت جس کا ذکر مضمون نگار نے کیا ہے، اُن لوگوں کا اس اندیشہ کے سبب ساتھ نہ دے کہ یہ تو سب کے سب حکومت حاصل کرنے کی ہوس میں مبتلا ہیں، اس انقلاب سے ان کا مقصد ہی یہ ہے کہ "اختیار" ان کے قبضہ میں آ جائے اور "اختیار" جس کے قبضہ میں آ گیا، یوں سمجھو کہ وہ "غیر صالح" بن گیا تو بھکشوؤں اور راہبوں کی ایسی جماعت بدھ مت اور جینی مذہبوں کے لئے مفید ہو تو ہو مگر اسلام کے لئے مفید نہیں ہو سکتی، اُس اسلام کے لئے جس کے ہیرو علیؓ، سعد بن وقاصؓ، ابو عبیدہؓ اور خالد بن ولیدؓ ہیں، جن کے بازوئے شجاعت نے باطل حکومتوں کے پرخچے اڑا دئے، اور جن کے مجاہدانہ کارناموں نے [illegible] کے دین کو غالب کر دیا ——— (مدیر)

کی حیثیت سے کبھی حکومت کی ہوس نہ کرے۔

میرے خیال میں ایسی جماعت کی ضرورت اس لئے جتائی گئی ہے کہ مسلم سوسائٹی میں ہمیشہ اہلِ تقویٰ کا ایک ایسا گروہ موجود رہے جو ملت کے دل و دماغ کا کام کرے۔ اگر کبھی اختلال واقع ہو اور نظام درہم برہم ہو جائے تو یہ جماعت سوسائٹی کو سنبھال لے۔ گویا اس طرح سوسائٹی کی اصلاح کا انتظام سوسائٹی کے اندر ہی کر دیا گیا ہے۔

تمام خرابیوں کی بنیاد انسان کی یہ فطرت ہے کہ اگر اس کے ہاتھ میں اختیار آ جائے تو وہ اسے اپنے اور اپنے جانشینوں کے لئے مستقل کرنا اور بڑھانا چاہتا ہے۔ اس کی یہی خواہش حکومت کو خراب کرتی ہے اور اسی سے حکومت اور سوسائٹی کے مقاصد اور مفاد میں تضاد پیدا ہوتا ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں ہے مگر ایک اور وہ نہایت موثر اور قطعی ہے —— ذی شعور، منظم اور اپنے حقوق و اجتماعی مقاصد کے سخت بدگمانی کے ساتھ نگرانی عوام۔ اہلِ اختیار کے ذاتی اخلاقی محاسن پر بھی اعتماد کر کے اس نگرانی سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔ اسلام کے قرنِ اوّل میں خواص موجود تھے لیکن اُس تھوڑی سی فرصت میں جو خلفائے راشدین کو ملی عوام کی تربیت اور تنظیم نہیں ہو سکی تھی اسی وجہ سے خلافت کی جگہ ملوکیت قایم ہو گئی۔

کون دیوانہ حاکم ہو گا، وہ فرد ہو یا پارٹی، جو روک ٹوک کرنے کے لئے اپنے خلاف پہرہ دار مقرر کرے، ان کی تربیت و تنظیم کرے، اور قوت حاصل کرنے میں ان کی مدد کرے۔ دنیا میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ کسی ذی اقتدار حاکم یا حکومت نے عوام کو اس کی تربیت دی ہو، اس کی تنظیم کی ہو اور اس کے لئے آزاد کر دیا ہو کہ وہ اپنا اختیار حاکمیت برتے۔ خلفائے راشدین کے بعد مسلمانوں میں بھی یہ نہیں ہوا حالانکہ بعض بڑے خدا ترس حاکم پیدا ہوئے۔ یہ ہوتا ہی نہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا یہ ہمیشہ لوگوں ہی کے ذمہ رہے گا کہ وہ اپنے منصب حاکمیت یا خلافت حاکمیت کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی قابلیت پیدا کریں۔ جس وقت وہ ایسے بن جائیں گے تو سوسائٹی میں عدل قایم ہو جائے گا، سوسائٹی کی زندگی میں حکومت کی مداخلت کم سے کم رہ جائے گی، اور اس کی جو حکومت ہوگی وہ نہایت فرض شناس، عوام کے تعاون کے ساتھ، تمام اجتماعی فرائض انجام دینے کے لئے بالکل یکسو، لہٰذا اس قدر طاقتور ہوگی کہ روئے زمین پر اس کا کوئی مدمقابل نہ ہوگا۔

یہ اسلامی معمول کے خلاف ہے کہ کوئی شخص اپنے لئے کسی منصب یا ذمہ داری کے عہدے کی تمنا کرے۔ یہ ملت کا حق قرار دیا گیا ہے کہ وہ جسے چاہے نامزد اور منتخب کرے۔ چنانچہ خلفائے راشدین میں سے کسی نے اپنے لئے مسندِ خلافت کا دعویٰ نہیں کیا۔ انھوں نے اسے قبول کر کے صرف ملت کے اہل الرائے گروہ کی فرمائش پوری کی۔ یہی اس کی بین اور قطعی دلیل ہے۔

۱؎ یہی تو چاہا جا رہا ہے کہ اُن چند "خدا ترس مسلمان بادشاہوں اور حاکموں" کی زندگیوں کو اُسوہ نہ بنایا جائے بلکہ خلافت علیٰ منہاج النبوت قایم کی جائے، جیسی خلافت کہ چاروں خلفاء کے دور میں قایم تھی —— اگر لائق مقالہ نگار کے کہنے کے مطابق ایسا ہونا ناممکن ہے، ایسا ہو ہی نہیں سکتا تو پھر مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ قرآن، حدیث، اور اسلامی تاریخ کو تہ کر کے رکھ دیں اور یہ جو قرآن احدیث میں جہاد فی سبیل اللہ، امر بالمعروف نہی عن المنکر اور اللہ کے دین کے غلبہ کی تعلیم دی گئی ہے اور یہ جو فرمایا گیا ہے کہ جب تم کسی برائی کو دیکھو تو ہاتھ سے مٹا دو، (اس کی قدرت نہ ہو) تو اُس کے خلاف زبان سے اعلان کرو، یا کم سے کم دل میں بُرا جانو۔ مگر یہ ایمان کا آخری اور پست ترین درجہ ہے) —— تو اللہ اور رسولؐ نے یہ (نعوذ باللہ) "شاعری" فرمائی ہے یہ باتیں بس دورِ رسالت اور عہدِ صحابہ تک مخصوص تھیں پھر ان کا ہونا ممکن ہی نہیں ہے —— یہ عجیب استدلال اور سوچنے کا نرالا طریقہ ہے —— (مدیر)

کہ حکومت کے اچھے برے ہونے کی پہلی ذمہ داری ملکوں پر نہیں بلکہ ان پر ہے جنہیں اس کا مجاز قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے میں سے بہترین آدمیوں کو امارت کے لئے اور مجلس شوریٰ کی رکنیت کے لئے نامزد اور منتخب کریں۔ لہٰذا ملت ہر اعتبار سے حکومت کے مقابلے میں افضل ہوئی یہ اصلاح و تربیت کے مقابلے میں اپنے سے کمتر کی محتاج کیوں ہو؟

حقیقت یہ ہے کہ جتنی اچھی باتیں ہیں وہ عموماً انسان کے ضمیر کو مرغوب ہیں۔ یہ تو صرف نفسانیت کے دخل سے ہوتا ہے کہ وہ محاسن کو ترک کر کے معائب اختیار کرتا ہے۔ ان مغربی انتخابات میں بھی جو آج کل بہت مقبول ہیں یہی ضابطہ ہے کہ کوئی دوسرا شخص کسی کے لئے یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ وہ امیدواری کی حیثیت سے ایلکشن میں کھڑا ہو اور کوئی تیسرا شخص اس تجویز کی تائید کرتا ہے۔ شخصی امیدواری کے اعلانات اور منشوروں میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ "مجھے بعض دوستوں نے یا اہل الرائے لوگوں نے مجبور کیا کہ میں امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہو جاؤں" مگر یہ نہایت ریاکاری کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ خود امیدوار اپنے دوستوں اور ہمدردوں سے خواہش کرتا ہے کہ وہ اسے نامزد کریں اور اس کی تائید کریں۔ وزارتوں اور ذمہ داری کے دوسرے بڑے عہدوں کے لئے بھی یہ معیوب سمجھا جاتا ہے کہ کوئی شخص خود اپنے تقرر کے لئے درخواست کرے۔ یہ بھی ایک رسم ہی رہ گئی ہے۔ اس کی تہ میں جو اخلاقی تقاضے تھے وہ بھول میں پڑ گئے ہیں یا مہمل ہو گئے ہیں۔ اس لئے خفیہ طور پر خواہش اور سعی کرنے میں کسی کو باک نہیں ہے۔ تاہم اس مغربی معمول سے بھی اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ قومی اختیار اور ذمہ داری کے لئے اپنی طرف سے خواہش معیوب بات ہے اور یہ عوام ہی کا حق ہے کہ اپنے لئے نمائندے اور حاکم پسند کریں۔

اسی ضرورت سے کہ لوگوں میں اپنے صحیح حاکم اور مشیر منتخب کرنے کی صلاحیت پیدا ہو مغرب میں جمہوریت کی یہ اہم اور ضروری شرط قرار دی گئی ہے کہ عوام تعلیم یافتہ اور باخبر ہوں۔ چنانچہ مغربی جمہوریتوں میں ابتدائی تعلیم کا بڑا اہتمام ہے مگر اس تعلیم میں اخلاق کو قطعی خیال نہیں ہے۔ رائے عامہ کی تربیت کی ذمہ داری اخبارات اور سیاسی پارٹیوں پر ہے۔ اخبارات بھی پارٹیوں ہی کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا امور مملکت میں مغربی جمہوریتوں کے عوام کی تربیت کسی نہ کسی پارٹی کے سیاسی میلانات کے مطابق ہوتی اور ہر پارٹی اپنا اقتدار قایم کرنے کے لئے جو باتیں لوگوں تک پہونچانا چاہے وہی ان تک پہونچ سکتی ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ اس حد تک اپنی سمجھ سے کام لے سکتے ہیں کہ کنسرویٹو، لبرل، لیبر، سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹیوں کے درمیان انتخاب کرلیں کہ ان کے لئے ان میں کونسی بہتر ہے۔ معاملات میں ان کی کوئی اپنی بصیرت نہیں ہوتی، خالص عوامی مقاصد سے وہ بے خبر رہتے ہیں اور خود اپنی اخلاقی ذمہ داریوں اور تقاضوں کا انہیں کوئی علم نہیں ہوتا۔

اخلاقی تقاضوں اور ملی مقاصد سے واقفیت کی صرف یہ صورت ہے کہ عوام میں ان کی وسعت کے ساتھ تعلیم ہو اور سوسائٹی میں ایک ایسی جماعت موجود ہے جو ملت کی اخلاقی اقدار کی بقا کو اپنا وظیفہ تصور کرے مگر اپنے لئے کسی منصب کی طالب نہ ہو چونکہ یہ جماعت خود معاشرہ کا ایک جزو ہوگی اور اس کی کوئی اپنی اغراض نہ ہوں گی اس لئے بہ تقاضائے طبیعت اپنی روش پر یہ لوگوں کی تربیت کرے گی جو اجتماعی طور پر ملت کے لئے مفید ہے۔

یہ نہایت واہی خیال ہے کہ عوام کی اصلاح حکومت کے اقتدار و وسائل کے ذریعے ہو۔ یہ بالکل روسی، نازی اور فاشی تصور ہے۔ ملت کے ساتھ اس سے بڑھ کر اور کوئی دشمنی نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگوں کو دائمی غلامی، لاچاری اور بے بسی میں مبتلا کرنے کا نہایت مہلک منصوبہ ہے۔ صحیح راہ یہ ہے کہ حکومت کے اثرات سے بالکل آزاد ہو کر اسلامی تصورات لوگوں کے ذہن نشین کئے جائیں ان پر عمل کا ان میں شوق پیدا کیا جائے۔ انسان کے تحفظ کا خود انہی کو مدعی بنا دیا جائے۔ کیا مسلمانوں ہی کی تاریخ میں اس کی مثال موجود نہیں ہے کہ جب تعلیم براہ راست حکومت کی سرپرستی میں آئی تو ایسے عالم پیدا ہوئے جنہوں نے حکمرانوں کی تائید میں قرآن و سنت کے خلاف فتوے دئے اور علمائے حق کے لئے سخت مصائب پیدا کر دیئے

تعلیم حکومت کے اثرات سے آزاد ہو، اخبارات آزاد ہوں، ریڈیو آزاد ہو، رائے عامہ کی تنظیم اور اظہار رائے کے

سنہ جی بہت درست ارشاد ہوا، حکومت کے اقتدار و وسائل کو جو کوئی عوام کی اصلاح کے لئے استعمال کرنے کا مشورہ دیتا ہے وہ نہایت ہی بے عقل اور نا سمجھ ہے ——— اور کیا عجب ہے کہ اس نے دشمنوں سے ساز باز بھی کر رکھی ہو اور اس طرح وہ ملک میں انارکی اور بدنظمی پھیلانا چاہتا ہو، حکومت اگر عوام میں فسق و فجور پھیلا رہی ہو تو اس کی اور داد دینی چاہئے بلکہ ارباب حکومت کے حضور قصیدے اور سپاسنامے پیش کرنے چاہئیں حکومت کا کام تو یہ ہے کہ کوئی شراب کی دکان، جوئے کا اسٹال، سٹہ کا کاروبار، آوارگی کا اڈہ قائم کرنا چاہتا ہو تو اس کی اجازت دے دے، اب یہ عوام کا کام ہے کہ وہ اتنے بلند کردار ہو جائیں کہ شراب نہ پئیں جوا نہ کھیلیں، سٹہ بازی نہ کریں، آوارگی سے بچتے رہیں، حکومت کو عوام کی اصلاح سے کیا غرض؟ اگر عوام کی اصلاح حکومت چاہے گی تو اس طرح وہ ملک و ملت کے ساتھ دشمنی کرے گی! اور لوگ دائمی غلامی اور ابدی لاچاری میں مبتلا ہو جائیں گے

ـــ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے!

یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کسی جہاز کے ملاح، جہاز کو جانتے بوجھتے کسی خطرناک طوفان یا بھنور میں جا کر پھنسا دیں اور مسافروں سے کہیں کہ ہمارا فرض تو بس جہاز کو چلانے جانا ہے، طوفان اور گرداب کے خطروں سے بچانا ہمارا کام نہیں یہ تو مسافروں کی اپنی ہمت اور طاقت پر منحصر ہے کہ طاقت ہو تو ہاتھ پاؤں مار کر طوفان سے نکل جائیں ورنہ ڈوب جائیں ـــ (مدیر)

سنہ فاضل مضمون نگار کے ذہن میں لفظ "حکومت" آتے ہی روس، انگلستان، امریکہ، اٹلی، اور سلطان ابن سعود کی حکومتیں آ جاتی ہیں، اس لئے وہ "حکومت" سے بیزار ہیں، اور حکومت اور عوام میں بہت زیادہ تفاوت فرق، اور دوری تسلیم کرتے ہیں، ان کے نزدیک "اختیار" "اقتدار" اور حکومت ایک "برائی" کا نام ہے جو حکومت و اختیار سے علیٰحدہ ہو ہی نہیں سکتی، اور اس "برائی" (حکومت) کو وہ باقی رکھنا بھی چاہتے ہیں اور ارباب اقتدار پر اصلاح عوام کی ذمہ داری تک ڈالنا پسند نہیں بس عوام میں ایک جماعت ان کو نیک بنانے کی کوشش کرتی رہے، اس لئے وہ چند محکمے (تعلیمات، ریڈیو وغیرہ) حکومت سے لیکر عوام کو دیدینا چاہتے ہیں ـــــ کاش مقالہ نگار کے ذہن سے یہ بات نکل جائے کہ اختیار اور حکومت فی نفسہ بری چیزیں نہیں ہیں، ان کو سچائی، دیانت اور عدل کے ساتھ استعمال کیا جائے تو یہ عین رحمت اور سراپا خیر ثابت ہوں ـــ اور "اسلامی حکومت" خیر و رحمت ہی ہے، اسلامی حکومت میں تعلیمات اور ریڈیو کو حکومت کے اثر سے علیٰحدہ کر کے عوام کو دیدینا، ایک انتشار کا باعث ہو جائے گا، ہم تو اسلامی حکومت ہی سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ اس کا محکمہ تعلیمات اور ریڈیو عوام کی بہتری کیلئے زیادہ سے زیادہ مفید ثابت ہوگا ـــ جس طرح اس کے دوسرے محکموں اور شعبوں سے ہم اسی قسم کی اچھی امید رکھتے

تمام وسائل آزاد ہوں۔

بے شک اس دور میں جمہوریت بڑی مقبول ہوئی ہے، مگر لوگوں کو اس سے جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ محض اس کی مرہم ہیں، مقاصد بالکل نہیں حکومت میں کلیت یا ہمہ گیری (Totalitarianism) کا رجحان بڑی قوت سے ترقی کر رہا ہے اور کلیت دراصل آمریت ہے خواہ اس کا برتنے والا ادارہ جمہوریت کی تمام شرائط ہی کے ساتھ صورت پذیر ہوا ہو۔ اس میں تعلیم، ریڈیو اور پریس بالکل حکومت کے تابع ہیں۔ نازی جرمنی اور فاشسٹ اٹلی میں بھی یہی تھا جمہوریتیں کلیت کہہ کر اس پر طعن بھی کرتی ہیں اور اسی کلیت کی نقل بھی کر رہی ہیں۔ جنگ عظیم ثانی کے آغاز سے انتہا تک انگلستان جیسی آزاد جمہوریت پچاس فی صدی کلیت بن گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری دنیا میں نئی نسلیں وہی خیالات افکار اور تصورات لیکر نکل رہی ہیں جو اہل اقتدار پارٹیوں، گروہوں اور طبقوں کے لئے مفید ہیں۔ عوام کے ذہن، فکر اور جذبات پر حکومتوں کا بالکل کنٹرول ہے۔ یہ کیا آزادی اور جمہوریت ہے!

یقیناً ملت کی تمام ذہنی اور مادی تعمیر و تنظیم میں حکومت کے نظام اور وسائل سے مدد ملنی چاہئیے مگر خادمانہ اطاعت، انکسار اور بے غرضی کے ساتھ، محض معاشرے کے فائدے کے لئے اس کا تعین کرنا کہ معاشرے کا فائدہ کس چیز میں ہے رائے عامہ کا کام ہے۔ حکومت بالکل نمایندگان ملت یعنی مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کے تابع ہو، مجلس شوریٰ جمہور ملت کے تابع اور جمہور ملت ان صلحا کی رہنمائی میں ہوں، جو بالکل بے غرضی کے ساتھ اللہ کے واسطے قرآن و سنت کے مطابق ملت کی رہنمائی اپنا فریضہ سمجھیں۔

اس میں کوئی مضایقہ نہیں ہے کہ لوگ انہی[1] صلحا میں سے (پارلیمنٹ کے لئے) اپنے نمایندے منتخب کریں۔ انہی میں سے کسی کو صدر جمہوریت منتخب کریں۔ یہ گورنمنٹ کے ارکان بھی ہو سکتے اور صوبوں کے گورنر بھی۔ لیکن پارٹی کی حیثیت سے اس جماعت کو نہ کبھی اپنی تنظیم کرنی چاہئیے اور نہ ان منصبوں کی تمنا۔ نیز یہ کہ وہ جماعت جسے ملت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی محض اللہ واسطے خدمت انجام دینی ہے وہ اس کے باوجود بھی موجود رہے کہ حکومت کے تمام ادارے اہل تقویٰ سے معمور ہوں۔ ایسی حکومت کی نگرانی بھی اسی سختی سے ہونی چاہئیے جیسی کسی بداخلاق حکومت کی۔ امور عالیہ میں نگرانی سے غفلت اور شخصیتوں پر اعتماد نہایت خطرناک ہے۔ صرف وہ قوم اپنی آزادی اور مقاصد کی حفاظت کر سکتی ہے جو اس معاملے میں کسی کا اعتبار نہ کرے۔ اپنے حقوق سے بے پروا، اپنے مقاصد سے بے خبر اور اپنے فرایض سے ناواقف قوم کا وہی حشر ہوتا ہے جو عمر بن عبدالعزیز جیسے متقی خلیفہ کے بعد مسلمانوں کا ہوا۔ ان کے جانشین نے ٹھیک چالیس روز کے بعد ان کے تمام ضوابط و معمولات منسوخ کر کے وہی پرانا مردانی طرز حکومت اختیار

---

[1] سوال یہ ہے کہ پارلیمنٹ کی انتخابی جدوجہد میں "صلحاء" کے لئے آخر کوئی نہ کوئی جماعت دوڑ دھوپ ضرور کرے گی۔ ——— تو جو جماعت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے گی اُس کے بارے میں مقالہ نگار کے قول کے مطابق یہ اندیشہ پیدا ہو جائے گا کہ یہ جماعت حکومت کی ہوس رکھتی ہے اور "صلحاء" کے نام پر وہ جماعت خود ہی برسر اقتدار آنا چاہتی ہے ——— تو آخر کیا کیا جائے! مضمون نگار اصلاح اور انقلاب بھی چاہتے ہیں، اور اُس کی جو صورت تجویز فرماتے ہیں اُس میں عجیب طرح کا تضاد پایا جاتا ہے ——— (مدیر)

کر لیا اور مسلمان اس کا کچھ نہ کر سکے۔ وہ لاچاروں کا ایک مجمع تھے جنھوں نے صرف طاقت اور اقتدار کے سامنے سر جھکانا سیکھا تھا۔ لیکن فرانسیسی جو تربیت یافتہ جمہور ہیں ہٹلر کے جبر سے نہ دبے۔ وہ سخت دردناک عذابوں اور موت کے مقابلے میں جمہوریت کی حفاظت کے لئے کھڑے ہو گئے۔ آزادی کی حفاظت کی سرحد یہاں نہیں ہے کہ حاکموں کو اس میں مداخلت کرنے سے روکا جائے بلکہ یہاں ہے کہ حکومت کیسی ہی ہو اسے اتنی قوت حاصل نہ ہو کہ وہ ملت کی آزادی پر دست درازی کرے۔

مدیر "فاران" کی طرف سے :-

اس مقالہ پر جہاں جہاں ضرورت سمجھی گئی فردی نوٹ دیدئیے گئے، اب اس کا فیصلہ ناظرین کے ہاتھ میں ہے کہ کس نے کیا کہا؟ اور کیسا کہا؟ ——— لائق مضمون نگار نے یہ مقالہ جذبۂ اصلاح کے تحت لکھا ہے جس کے بعض حصوں کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، موصوف ایک کہنہ اخبار نویس ہیں، صحافت و انشاء کے میدان میں ربع صدی سے بھی زیادہ عرصہ وہ گزار چکے ہیں، روزنامہ "منشور" دہلی کی صحافتی خدمات جس کے وہ مدیر اعلیٰ تھے بھلائی نہیں جا سکتیں، پاکستان بننے کے بعد روزنامہ "ڈان" (اردو) کی زمام ادارت اُن کو سونپی گئی۔

جناب حسن ریاض صاحب اُن لوگوں میں سے ہیں جو مسلم لیگ میں اس جذبہ کے ساتھ شریک ہوئے تھے کہ پاکستان بننے کے بعد وہاں اسلام کا غلبہ ہوگا، اور پاکستان کی حکومت کتاب و سنت کی مقدس بنیادوں پر قائم ہوگی، مگر اُن کی یہ توقعات پوری نہ ہو سکیں، انھوں نے دیکھ لیا کہ مسلم لیگ کے جن لیڈروں نے اسلام، اللہ، رسولؐ اور قرآن کے نام پر "پاکستان" حاصل کیا تھا، پاکستان بننے کے بعد وہ اپنے وعدوں کو نہ نباہ سکے ——— معلوم ہوتا ہے کہ اس چیز نے حسن ریاض صاحب کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے اور اُن کے دل میں یہ بات جاں گزیں ہو گئی ہے کہ "حکومت" اور "اختیار" ہی فی نفسہٖ بُری چیز ہے، یہ جس کے ہاتھ میں آتا ہے اُسے خراب کر دیتا ہے، حالاں کہ معاملہ اس کے برعکس ہے، مسلم لیگی رہنما جیسے پاکستان بننے سے پہلے تھے، پاکستان بننے کے بعد بھی ویسے ہی رہے، اُن کے پاس "اسلام زندہ باد" اور "قرآنی حکومت" کے پُرشور نعرے ضرور تھے مگر اسلام سے صحیح وابستگی اور اسلام کو سر بلند کرنے کی وہ تڑپ نہ تھی جس کا جلسوں اور کانفرنسوں میں اظہار کیا جاتا تھا۔

ان رہنماؤں کو اپنی عاقبت سنوارنے اور اسلام اور قوم کی خدمت اور فلاح و بہبود کا کتنا زرّیں موقع ملا تھا، یہ چاہتے تو آج پاکستان ایک مثالی حکومت ہوتا، دوسری حکومتیں اُسے دیکھ دیکھ کر متاثر ہوتیں کہ اسلامی حکومت ایسی ہوتی ہے! مگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہی نہ ہو سکا، یہ نخل بار آور ہی نہیں ہوا، یہ بادل پیاسوں کو ترسا ترسا کر گزر گیا، مینہ کی ایک پھوار بھی نہیں برسی ——— تو فاضل مقالہ نگار مسلم لیگی لیڈروں کی زندگیوں کو دیکھ کر جو یہ رائے قائم کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کی بگڑی ہوئی سوسائٹی میں صالح لوگ نکل ہی نہیں سکتے ——— یہ اُن کا اندازہ مبالغہ آمیز ہے اور اُن کی اُمید کے خلاف جو باتیں ظہور میں آئی ہیں اُس نے اُن کو "قنوطیت" میں مبتلا کر دیا ہے۔

صاحبِ موصوف کا یہ خیال کہ بس معاشرے کی اصلاح کا کام ہوتا رہے، حکومت سے کچھ نہ کہا جائے کم سے کم پاکستان کی حد تک درست نہیں ہے، الفاظ چاہے بالکل یہ نہ ہوں مگر مضمون کی اسپرٹ یہی ہے ——— ہم

معاشرے کی اصلاح کے خدا نخواستہ منکر نہیں ہیں، عوام کے ذہن و فکر کی اسلامی انداز پر تربیت بہت ضروری ہے جس قوم کے عوام اور جس حکومت کی رعایا ہی سرے سے بگڑی ہوئی ہو، وہاں اچھے سے اچھے اصول بھی عملاً بے اثر ثابت ہوں گے!

ہم جو حکومتِ پاکستان میں خالص اسلامی بنیادوں پر انقلاب چاہتے ہیں اُس کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ حکومت کے وسائل کو عوام کی تربیت و اصلاح کے لئے زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے، ایسے قوانین نافذ ہوں جن میں فسق و فجور کی باتیں جُرم سمجھی جاتی ہوں، حکومت کے ٹھاٹ باٹ پر جو فضول خرچی ہوتی ہے اُسے ناگزیر حدود تک باقی رکھا جائے اور پیسہ کی زیادہ سے زیادہ بچت کر کے اُسے ناداروں، مفلسوں، بے روزگاروں، اپاہجوں اور بے وسیلہ بوڑھوں پر صرف کیا جائے!

ریڈیو کا ایک دن کا پروگرام جو کر سکتا ہے، وہ کام سیکڑوں واعظوں کی تقریریں بھی نہیں کر سکتیں اسی طرح ہزاروں مولویوں کے مواعظِ حسنہ "ستہ" کو بند نہیں کر سکتے مگر حکومت کے قانون کی دو سطریں "ستہ" کو بند کر سکتی ہیں، اسی طرح دوسری برائیوں اور فواحش و منکرات کا عالم ہے! عوام کی اصلاح میں عوام کی جماعتی اور انفرادی کوششوں سے اگر بیس سال صرف ہوں گے تو حکومت کی کوشش سے یہ کام سال دو سال میں ہو سکتا ہے۔

عوام کی اخلاقی اور معاشرتی اصلاح یقیناً بہت ضروری چیز ہے، حکومت کے علاوہ یہ کام عوام کی جماعتوں اور افراد کو بھی کرتے رہنا چاہئے ——— مگر برائیاں صرف پند و نصیحت سے نہیں مٹ سکتیں، ان کو قوت کے ساتھ مٹایا جائے گا تو مٹیں گی، خطاکاروں پر احتساب نہ ہوگا تو صرف زبانی نصیحتوں اور وعظوں سے وہ ماننے والے نہیں، جب حکومت اپنے لگائے ہوئے تمام ٹیکس قانون کے زور سے وصول کرتی ہے، تو "زکوٰۃ" کے لئے بھی حکومت کو قوت استعمال کرنی چاہئے، پند و نصائح اور زکوٰۃ کی افادیت پر وعظ کافی نہیں ہیں!

پاکستان کی صورت یہ ہے کہ یہاں خدا کے فضل سے "ملوکیت" نہیں ہے کہ بیٹے کو باپ کا لازماً جانشین ہونا چاہئے اگر یہاں "بادشاہت" ہوتی تو تشدد کے ذریعہ انقلاب لانے کی ضرورت تھی، یہاں جمہوری طرزِ حکومت نافذ ہے، اس لئے پاکستان میں کسی خونیں انقلاب کی کوشش کرنا، نہایت خطرناک کھیل ہے، جس سے خود پاکستان کو شدید نقصان پہونچے گا، اس طرز پر سوچنا ہی نہیں چاہئے!

یہاں پاکستان میں حکومت کو آئینی ذرائع سے تبدیل کیا جا سکتا ہے اور اس انقلاب کی یہی صورت ہے کہ عوام کو اس مہم کے لئے تیار کیا جائے کہ وہ اختیارات ان لوگوں کو سونپیں جو پاکستان میں "اسلام" کو نافذ کرنا چاہتے ہوں اور جن کی زندگیاں اسلام سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوں ——— اس مہم کے لئے جو جماعت کام کر رہی ہو، اُس پر یہ الزام لگانا ایک طرح کا ظلم ہے کہ یہ جماعت ہوسِ اقتدار میں مبتلا ہے! اس طرح تو اصلاح کی جو کوشش بھی کی جائے گی اُس کو "ہوس" یا "ذاتی اغراض" سے متہم کیا جا سکتا ہے۔

حکومت، اقتدار اور اختیار کو "شجرِ ممنوعہ" سمجھ کر اُس سے دُور دُور رہنا، اور یہ سمجھ لینا

کہ یہ "دنیا داری" کا کام ہے جو غیر متقی لوگوں ہی کو زیب دیتا ہے، اہلِ تقویٰ کو اس سے کیا سروکار کہ حکومت کن ہاتھوں میں ہے؟ وہاں کا دستور کیسا ہے اور کونسا قانون چل رہا ہے؟ یہ تصور "راہبانہ" تصور ہے، جو اسلام کے مزاج سے ہرگز میل نہیں کھاتا، یہ بات بھی تقویٰ کے حدود میں داخل ہے بلکہ عین تقویٰ ہے کہ دُنیا میں اللہ کی تشریعی حاکمیت کے لئے جدوجہد کی جائے، اللہ کا قانون نافذ کیا جائے، بُرائیوں کو روکا اور بھلائیوں کو پھیلایا جائے، جو اہلِ تقویٰ کافرانہ حکومت اور غیر اسلامی قانون و اقتدار کے سایہ میں زندگی بسر کر کے مطمئن رہتے ہیں اور وہ اپنے اندر اللہ کی حکومت قایم کرنے کا کوئی داعیہ ہی نہیں رکھتے، اُن کے "تقویٰ" کو مخاطب کر کے "اسلام" چیختا ہے

"مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ"

امتیاز علی خاں عرشی
(رام پور)

اُردو کا پشتو سے رشتہ

ہماری بول چال میں کچھ کہاوتیں ایسی بھی ہیں جو پشتو کی کہاوتوں سے ملتی جلتی ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ "گھوڑے کی لات گھوڑا ہی سہتا ہے" اس موقع پر افغانی بولتے ہیں، "دَ آس لَتَہ آس سَہلے شی" یہ پشتو الفاظ ہمارے الفاظ کا لفظی ترجمہ ہیں۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ "گھوڑے کے نعل لگ رہے تھے، مینڈکی نے بھی ٹانگ اٹھادی" پشتو میں اس کی جگہ کہا جاتا ہے، "آسُونو تہ نَعلُونَہ وَھَل، چُندُخے ہَم پِښے وَرتہ نیولی"۔ یہ لفظ بھی ہماری کہاوت کا "پشتو ترجمہ" ہیں۔ ایک اور کہاوت ہے کہ "آسمان کا تھوکا گریبان میں آتا ہے"۔ افغانی اس موقع پر کہا کرتے ہیں "آسمان تہ مَہ تُوکَا، پہ خپل مَخ بہ دِ پریوزی"۔ اس پشتو کہاوت میں اسی قدر فرق پڑگیا ہے کہ "گریبان" کی جگہ "منہ" نے لے لی ہے، ورنہ یہ بھی بعینہ اردو کہاوت ہے۔

ذیل میں کچھ اور ملتی جلتی کہاوتیں ملاحظہ فرمائیے:۔

اردو	پشتو
لاٹھی مارے پانی جدا نہیں ہوتا	اوبہ پہ ڈانگ نہ بیلیږی
جگہ وہی گرم ہوتی ہے جہاں آگ جلتی ہے	زکہ ھغہ سوزی چہ اور بلیږی
لوہا تپے نہیں تو بڑھے کیسے	اوسپنہ چہ تودہ شی، نو پہ اوږدہ شی
دیکھو اونٹ کس کل بیٹھتا ہے	گورہ چہ اوښ پہ کوم اړخ کښینی
اونٹ رے اونٹ، تیری کونسی کل سیدھی ہے؟	اوښ اوښ، ځہ دِ سم شو بلتی نو څہ؟
بیکاری سے بیگار بھلی ہوتی ہے	لہ وزگاری نہ بیگار ښہ دَی
تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے	ټرق لہ دواړو لاسو خیژی
گدھا کیا جانے خوید کی خوراک	خر خوید پہ خوراک څہ پوهیږی
پہلے جان، پیچھے جہان	اول جان، پسے جہان
اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں	ړوند د خدایہ څہ غواړی، دوہ سترگی
سو سنار کی، ایک لوہار کی	سترگی پہ تېرو نہ دو غیبږی

[1] پشتو کا یہ حرف (ښ) بعض علاقوں میں "ش" اور بعض میں "خ" کی طرح بولا جاتا ہے۔ پشتو اور پختو پر، پشتوں اور پختوں کے اختلاف کی وجہ یہی حرف ہے۔

[2] پشتو کا یہ حرف (ږ) "ژ" کا ہم آواز ہے۔

[3] پشتو کا یہ حرف (ځ) "ث" کا ہم آواز ہے۔

جو گرجتے ہیں، سو برستے نہیں
جو زیادہ گرجتے ہیں، وہ کم برستے ہیں
بہت سے قصائیوں میں گائے مردار ہو جاتی ہے
کنوئیں کی مٹی کنوئیں ہی کو لگ جاتی ہے
خدا گنجے کو ناخن نہ دے، جو سر کھجائے
اپنے گھر میں بلی بھی شیر ہوتی ہے
ٹوٹا ہاتھ گلے کو آتا ہے
مردہ بھی بول اٹھا
غریب ملا کی اذان بھی کوئی نہیں سنتا
جیسی مائی، ویسی جائی
یہ منہ کا نوالہ نہیں ہے
گوشت سے ناخن جدا نہیں ہوتا

چہ غوبزی، نہ وریبزی
چہ ډیر غوبزی، ہغہ کم وریبزی
پہ ډیر قصابانو کښں غوا مردارشی
د کوهی خاورہ پہ کوهی لگی
گنجی د خدای نوکی نہ دی کړه، د سر بیخ بہ ایاسی
پیشو ہم پخپل کور کښں ہزدی دی
لاس چہ مات شی، غاړی تہ ځی
مړی ہم پہ قصی شو
د خوار ملا پہ بانگ څوک کلمہ ہم نہ تیروی
لکہ مور ہسی لور
د خولی لوړی خو نہ دہ
ادړی او نوک نہ سرہ جدا کیبزی

یہ اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سی کہاوتیں ایسی ملتی ہیں جو زیادہ سے زیادہ ایک دو لفظوں کے فرق کے ساتھ اردو اور پشتو دونوں میں بولی جاتی ہیں۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اصل میں یہ کہاوتیں کس زبان کا مال ہیں۔ جواب میں آئندہ باتوں میں سے کوئی ایک کہی جا سکتی ہے:۔

(الف) یہ کہاوتیں اردو اور پشتو دونوں میں ہندی، فارسی یا عربی سے آئی ہیں!

(ب) یہ کہاوتیں پشتو میں اردو سے آگئی ہیں!

(ج) یہ کہاوتیں اردو میں پشتو سے آئی ہیں!

ماہرین علم الالسنہ کے نزدیک یہ تینوں صورتیں مسئلۂ زیر بحث کے حل کی حیثیت سے پیش کی جا سکتی ہیں، اس لئے کہ پشتو بھی ان سب زبانوں کی خوشہ چیں ہے جن سے اردو نے کسب فیض کیا ہے۔ مگر عام طور پر آخری جواب سے ہمارے ادیبوں کے کان آشنا نہیں، وہ اپنی کتابوں میں اس کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کرتے کہ اردو زبان پر پشتو کا بھی کچھ اثر ہے۔ چنانچہ خانِ آرزو سے مکرمی حامد حسن صاحب قادری تک کسی مورخ زبان نے اس کا اعتراف نہیں کیا کہ افغانوں نے (جو محمود غزنوی کے وقت سے سوریوں تک مستقل حاکمانہ اقتدار کے مالک رہے ہیں، اور اس کے بعد آج تک ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ملازمت، تجارت اور تعلیم کی راہ سے ملک کے کونے کونے میں پہونچتے اور اپنی پوری پوری زندگیاں گزارتے رہے ہیں) ہندوستان کی اس کھچڑی (اردو) میں پشتو کے دو چار دانے (الفاظ) بھی ملا دئے ہیں۔ حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ کسی قوم کا اتنے دنوں تک کسی ملک میں رہنا بسنا اور اہل ملک کا اس کی زبان سے دو چار لفظ بھی نہ لینا قطعی محال ہے۔ انگریز کے دن ہمارے یہاں رہا، لیکن سیکڑوں لفظ خواص نہیں عوام کی زبان میں چھوڑ کر چلا گیا۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ پشتو اس قدر تی

قانون کے اثر سے مستثنیٰ رہ سکتی۔ چنانچہ تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اُردو میں بہت سے لفظ پشتو سے آئے ہیں، جیسا کہ میں مثالاً چند الفاظ کا ابھی ذکر کروں گا۔

رہی پہلی صورت، یعنی ان کہاوتوں کا اُردو اور پشتو دونوں میں داخلہ فارسی یا عربی کی راہ سے ہوا ہو، تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی اور فارسی نے پشتو کو بھی اُسی طرح فیض یاب کیا ہے۔ جس طرح اردو کو۔ مگر ان کہاوتوں کے بارے میں میری تحقیق یہ ہے کہ ان الفاظ و معانی کے ساتھ مذکورہ بالا دونوں زبانوں میں ان کا استعمال نہیں ملتا۔ اور اگر ان میں سے کوئی موجود بھی ہو، تو اُس کا قلیل الاستعمال ہونا اس کا ثبوت ہوگا کہ اُردو میں اُس کا داخلہ عربی یا فارسی کی راہ سے نہیں ہوا، ورنہ وہ اتنی عام پسند نہ ہوتی۔ اس لئے کہ عربی تو یہاں کے عوام سے سدا بیگانہ رہی۔ فارسی بھی عوام تک بہت کم پہونچی، صرف اوسط درجے کے اشخاص تک بار یابی پا سکی۔ پٹھان چونکہ یہاں کے ہر طبقے میں گھلے ملے رہے، اس لئے اُن کی زبان بھی ہر جگہ پہونچی اور خصوصیت کے ساتھ عوام میں خوب پھلی پھولی۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان کہاوتوں کو پشتو کی راہ سے آیا ہوا نہ مانیں، اور خواہ مخواہ عربی یا فارسی سے ان کا رشتہ جوڑ دیں۔

جہاں تک تیسری صورت کا تعلق ہے، تو میں کسی طرح باور نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص بھی یہ کہنا پسند کرے گا کہ گنگا الٹی بہنے لگی اور اُلٹے بانس بریلی کو جانے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی عہد میں اُردو زبان صوبہ سرحد کی تعلیمی زبان بن گئی تھی، اور آج بھی وہاں اس ذریعے سے لکھنا پڑھنا سکھایا جا رہا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ کسی طرح نہیں نکل سکتا کہ پشتو اور اردو کے سیکڑوں مشترک الفاظ، محاورات اور کہاوتیں انگریزوں کے دور میں اُردو کی وساطت سے پشتو میں پہونچے ہیں۔ کیونکہ ہم ان کو انگریزوں سے بہت پہلے سے پا رہے ہیں اور اگر کچھ لفظ ایسے بھی نکل آئیں، تو اس سے بقیہ سیکڑوں الفاظ کا مسئلہ تو حل نہیں ہو جاتا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ ماوراء سرحد کے قبائل اُردو اور انگریزی اثر میں بہت کم رہے ہیں، اور ان کی زبان میں اُردو الفاظ کا وجود ثابت کرنے کے مقابلے میں یہ زیادہ معقول بات ہے کہ اُن کے الفاظ کا اُردو میں داخلہ تسلیم کر لیا جائے۔

پشتو الفاظ اپنے معانی مزید وضاحت کی خاطر میں آپ کے سامنے کچھ ایسے لفظ رکھتا ہوں، جن کے متعلق آپ یہ نہ کہہ سکیں گے کہ یہ لفظ عربی، فارسی، ہندی یا اُردو ہیں۔

(۱) " اَلَمْ غَلَمْ " ہمارا مشہور مرکب لفظ ہے۔ پلاٹس نے اسے فارسی بتایا ہے۔ مگر ہر فارسی داں جانتا ہے کہ جو فارسی مسعود سعد سلمان کے وقت سے غالب تک اس ملک میں مروج رہی ہے، اُس کے کسی نثر نگار یا ناظم کے یہاں تو اس کا پتہ چلتا نہیں۔ پھر یہ کہاں کی اور کس زمانے کی فارسی ہے۔

اُردو لغات میں اسے ہندوستانی پیداوار قرار دیا گیا ہے۔ مگر یہ قابل تسلیم اس لئے نہیں کہ کرنل راورٹی نے لغت پشتو میں اس کا ذکر کیا ہے اور یہ تصریح کی ہے کہ اصلاً یہ لفظ ترکی ہے، لیکن پشتو میں معمولی بات اور شرارت کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ میں نے ایک افغانی سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جب پشتو میں " الم غلم شہ " کہتے ہیں، تو مطلب ہوتا ہے کہ فلاں چیز گڑبڑ ہو گئی، یا گم ہو گئی۔

اب آپ ہی بتائیے کہ ہندوستانی " اَلَمْ غَلَمْ " کو پشتو " اَلَمْ غَلَمْ " مانا جائے یا صرف ظن و تخمین کی بنا پر اسے فارسی تسلیم کر لیا جائے۔

(۲) "آبا" مسلمان گھروں میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو ہندو گھرانوں میں "پتا" کی ہے۔ اُردو اہلِ لغت اسے "آب" عربی کا تھند بناتے ہیں۔ اس میں تو شک نہیں کہ یہ لفظ عربی ہی سے بگڑ کر بنا ہے، مگر یہ درست نہیں کہ یہ بناؤ ہندستان کے اندر واقع ہوا۔ دراصل پشتو میں "آبا" بدون تشدید باپ کے لئے بولا جاتا تھا۔ جب افغانی وارد ہندوستان ہوئے اور یہاں شادی بیاہ کر کے رہنے لگے، تو اُن کے بچوں نے اپنے باپوں کو "آبا" کہا۔ اہلِ ہند نے اس لفظ کو سُن کر اپنے بچوں سے اسی طرح اپنے آپ کو "با" کہلوایا جس طرح انگریزی اثر سے ہندوستانیوں نے اپنے بچوں کو "پاپا" کہنا سکھایا تھا۔ رفتہ رفتہ "آبا" نے "ابّا" کی شکل اختیار کر لی۔

(۳) "اُوئی" یا "اُوئی" زنانہ بول چال کا مشہور لفظ ہے۔ ہمارے اہلِ لغت اسے ہندی خیال کرتے ہیں۔ لیکن یہ ہندی ہوتا تو ہندو عورتیں بھی "اوئی" کہا کرتیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ پشتو میں اس کا ہم معنی ایک لفظ ہے "ہوئی" صرف اتنا فرق ہے کہ مستورات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، مرد اور عورتیں سب اسے بولتے ہیں۔ میری رائے میں اُردو "اوئی" اسی پشتو "ہوئی" سے بنا ہے۔

(۴) "بچونگڑا" بازاری محاورے میں بچے کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ بھی پشتو کے لفظ "بچونگڑے" کی ہندستانی شکل ہے۔ اتنا فرق ہے کہ وہاں یہ "بچہ" کی تصغیر تھی، یہاں تصغیر نے تحقیر کا چولا بدل لیا۔ رہا پشتو کی یائی مجہول کا "الف" سے بدل جانا، تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ پشتو کے اور بھی بہت سے لفظ ہندوستان میں اس لفظی تغیر کے قبول کرنے پر مجبور ہوئے ہیں، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

(۵) "بگولو" (بہ ہر دو واوِ مجہول) انشاء اللہ خاں کے زمانے میں دلی کے اندر گالی تھی، اور کسی کو گالی دینا ہوتی تو کہا جاتا "بگولوے، یا بگولووالے، یا بگولو کے بچے"۔ ہمارے لغت نویسوں کو اس لفظ کے حسب نسب کا کچھ پتا نہیں چلا۔ حالانکہ یہ بھی خیمٹ پشتو ہے۔ افغانی اُس عورت کو جو ڈراؤنا بھیس بدل کر بچوں کو ڈراتی ہے "بگولئی" کہتے ہیں۔ مستورات رام پور، جو بیشتر افغانی الاصل ہیں، اس "بگولئی" کا تلفظ "بگولو" کرتی ہیں، مطلب وہی پشتو والا ہوا کرتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انشا کا لکھا ہوا لفظ "بگولو" یہی پشتو کا لفظ ہے جو معمولی سے لفظی و معنوی تغیر کے ساتھ مروج ہو گیا تھا۔

(۶) "پونیش" اور "پونسا" پہلے دیہات اور شہر دونوں میں اور اب صرف دیہات میں بولے جاتے ہیں۔ کرنل آرادرائی اور پلاٹس کی رائے میں یہ ہندی ہیں اور سنسکرت کے لفظ "پُنش" سے بنے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پشتو میں "پوش" کے معنی وہی "ہشو بچو" ہیں، جو ہمارے لفظ "پونیش" کے ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسے خواہ مخواہ سنسکرت کے لفظ "پُنشی" سے جوڑا دیا جائے۔

(۷) "قزاق" کو اُردو اہلِ لغت فارسی "تراق" کا تھند کہتے ہیں۔ حالانکہ ہندی لہجے میں "ق" اور "خ" کا پایا جانا خود کسی بیرونی اثر ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے، پشتو میں ایسے بہت سے الفاظ موجود ہیں جن میں "ق" اور "خ" کے

۱؎ نفس اللغہ ۵۷ ۲؎ دریائے لطافت ۱۲۶ ۳؎ اس لفظ کی "ی" اور ہمزہ کا ایسا ملا جلا تلفظ کیا جاتا ہے، جیسے "گھڑ جئی" یا "مئی" میں اہلِ ہند کرتے ہیں۔

ساتھ "ٹ" اور "ڈ" اور "ڑ" پائے جاتے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ میں مذکورہٗ بالا لفظ "تڑاق" بھی شامل ہے، چنانچہ پشتو میں "تڑاق، تڑاق تڑاق" اور ان کے مرکب مصادر بولے جاتے ہیں۔ پھر کیوں نہ اسے پشتو کی راہ سے آیا ہوا تسلیم کیا جائے۔

(۸) "کَڑخُل" حقارت کا کلمہ ہے، جو غصّے میں مخاطب کی تحقیر کے لئے بولا کرتی ہیں۔ اس کی ہندی اصل کا بھی پتہ نہیں چلتا اور اس بنا پر اہل لغت اُردو کہہ کر خموش ہو جاتے ہیں، حالانکہ یہ پشتو لفظ "کَڑخَر" کی دوسری شکل ہے۔ "خر" تو وہی فارسی گدھا ہے۔ "ڑ" پشتو میں کلمۂ تحقیر ہے۔ مستوراتِ رام پور "کَڑخَیل" کہہ کر اپنا دل ٹھنڈا کیا کرتی ہیں۔ اس سے، نیز "ڑ" اور "خ" کے اجتماع سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ہم نے اس لفظ کو افغانوں سے سیکھا ہے۔

(۹) "تُس تُس" پشتو میں تُھس، کند ذہن اور سُست کو کہتے ہیں۔ اُردو کا مشہور محاورہ "ٹس سے مس نہ ہونا" اسی سے بنا ہے۔ اور ایک اور مرکب لفظ "تُسر مُسر" بھی اسی سے بنا ہے، جس کے معنی پلاٹس کے بقول "پس و پیش" کے ہیں۔ کیونکہ کند ذہن اور تُھس آدمی میں قوت فیصلہ کی کمی پس و پیش کا باعث ہوا کرتی ہے۔

(۱۰) "چغل خور" کو ہمارے لغت نویس ہندی عوام کی بولی بتاتے اور اس جگہ "چغل" بولنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ یہ مشورہ درست ہے یا نہیں اس سے قطع نظر کر کے مجھے یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ "چغل خور" ہندی عوام نے پشتو بولنے والوں سے سیکھا ہے اور "چغلی" بھی انھیں سے حاصل کیا ہے۔ اس بنا پر مذکورہ لفظوں کو فارسی "چغل" کی ہندوستانی تحریف قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔

(۱۱) "رُوہیلا" تو صاف پشتو ہے اور لفظ "رُوہیلے" سے بنا ہے۔ افغانستان کا ایک علاقہ "روہ" کہلاتا ہے، جس کی طرف "یلے" کے اضافے سے یہ نسبت کی جاتی ہے۔ اہل ہند نے اسے معمولی تغیر کے ساتھ قبول کر لیا۔

(۱۲) "سَرمُغزن" اُردوئے معلیٰ کا لفظ ہے اور بیگماتِ لکھنؤ تک یہ لفظ پہونچا ہے۔ بعض لغت نویسوں نے اسے فارسی مرکب لفظ "سرمغزن" کا مخفف قرار دیا ہے۔ لیکن خود فارسی میں اس مرکب لفظ کا استعمال نظر نہیں آتا۔ پشتو میں البتہ اسی ظاہر و باطن کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ پشتو زبان سے اُردو میں اس کا داخلہ ہوا ہے۔

(۱۳) "غُرفش" کو نور اللغات میں فارسی "غُرِش" کا مہند بتایا ہے۔ یہی رائے مولانا آزاد دہلوی نے آبِ حیات میں ظاہر کی ہے۔ پلاٹس اسے فارسی "گُرُوش" یا "گُرِیش" کا مہند قرار دیتا ہے۔ بظاہر پلاٹس کی رائے صحیح نظر آتی ہے، لیکن جب معنی پر غور کیا جاتا ہے، تو اندازہ ہوتا ہے کہ "غرفش" اور "گروش" میں کوئی رشتہ نہیں۔ کیونکہ "غرفش" کے معنی ہیں شور و شر اور "گردش"، ایمان و اُنس کا مترادف ہے۔

در اصل یہ لفظ پشتو سے آیا ہے، جہاں اس کی دو شکلیں مروج ہیں، ایک تو یہی اور دوسری "غُرپش"۔ ہمارے یہاں پہلی صورت نے قبولِ عام حاصل کر لیا۔ دوسری نامانوس رہی۔ معنی بہر حال وہی شور و شر ہیں۔

(۱۴) "غُل غپاڑا" بھی پشتو سے بنا ہے، اس لئے کہ "غپ" پشتو میں کتے کے بھونکنے کو کہتے ہیں اور "غپہار" اسی کی جمع ہے۔ یہی جمع "غپاڑ" بن کر لفظ "غل" سے میل کھا گئی ہے۔

(۱۵) "کُرک" "مرغی وہ کہلاتی ہے، جو انڈے دینا چھوڑ دے اور ہر وقت بھولی سوجی کسی کونے میں بیٹھی

رہے۔ چونکہ یہ ہر وقت کڑکڑ کی آواز نکالتی رہتی ہے، اس لئے اس کی آواز کو "کڑکڑ" اور اس آواز نکالنے کے فعل کو "کڑکڑانا" کہتے ہیں۔

ایرانی "کڑک" کی جگہ "کرک" بولتے ہیں۔ اسی سے بعض اہل لغت نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہندیوں نے ایرانی "ر" کو ہندی "ڑ" سے بدل ڈالا ہے۔

میری دانست میں یہ لفظ بھی پشتو ہی سے آیا ہے، کیوں کہ اہل افغانستان "کڑک" مرغی کو "کڑک" اور اُس کی آواز کو "کڑکڑی" اور اس فعل کو "کڑکڑکول" کہتے ہیں۔ رہا یہ مسئلہ کہ یہ اصلاً پشتو ہے، یا ایرانی "کرک" نے پشتو میں اپنی ہیئت تبدیل کی ہے، تو یہ دونوں باتیں ممکن ہیں۔ لیکن اس سے میری رائے پر کوئی مخالف اثر نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ اس کی سنسکرتی اصل کا غیر متعین ہونا اور پشتو میں اسی شکل میں موجود ہونا ظاہر کرتا ہے کہ یہ ہندوستان کی زبان میں پشتو کی راہ سے داخل ہوا ہے۔

(۱۶) "کالا کلوٹا" سیاہ فام آدمی کہلاتا ہے۔ اس مرکب کا دوسرا جز پشتو ہے۔ صرف اتنا فرق پڑ گیا ہے کہ افغانی "کلوٹ" بواؤ معروف مرد کے لئے اور "کلوٹہ" عورت کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اہل ہند نے اپنے اصول تذکیر و تانیث کے تحت مرد کے لئے "کلوٹا" اور عورت کے واسطے "کلوٹی" بولنا پسند کیا۔

(۱۷) "مٹر گشت" بیکار گھومنے پھرنے کو کہتے ہیں۔ اس کی ترکیب بھی ہمارے لغت نویسوں کو عرصے سے پریشان کئے ہوئے ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ "مَتُّر" پشتو میں نادان اور احمق کو کہتے ہیں۔ بیکار اور بے مقصد پھرنا انھیں حضرات کا کام ہو سکتا ہے۔ اس لئے افغانیوں نے ہرزہ گردی کے لئے "مترگشت" بنایا ہوگا۔ اہل ہند نے اسے "مٹر گشت" کر لیا۔

(۱۸) "نخالص[1]" ہندوستانی عوام کا مشہور لفظ ہے۔ اُردو لغت نویس اسے عوام ہند کی غلطی بتاتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ لفظ اس طرح اور انھیں معنی کے ساتھ خالص پشتو ہے۔ اور افغانیوں کی وساطت سے ہماری زبان میں آیا ہے۔

(۱۹) "ھاڑے کھانا" کو پلاٹس نے ہندی بتایا ہے اور منت وسماجت یا خوشامد درآمد کرنا معنی قرار دیئے ہیں۔ مستورات رامپور اس موقع پر "ھاڑے ھاڑے کرنا" بولتی ہیں۔ پشتو میں یہی محاورہ اس معنی میں "ھاڑے ھاڑے کول" کی شکل میں موجود ہے۔ اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ اہل ہند نے اس محاورے کو پشتو سے اخذ کیا ہے۔

(۲۰) "ہجولی" کو ہمارے لغت نویس فارسی "ہمزولی" کا ہند بتاتے ہیں۔ اور "ہمزولی" کے متعلق صاحب بہار عجم نے یہ لکھا ہے کہ "معنی ترکیبی آں بر فقیر مولف ہیچ معلوم نیست"۔ واقعہ یہ ہے کہ پشتو کے لفظ "ہمزولیٰ" بیائے مجہول کے معنی ہم سن مرد اور "ہمزولئی" کے معنی ہم سن عورت ہیں۔ اس لفظ کو ہندیوں نے بہ تغیر حرف و حرکت "ہجولی" بنا لیا ہے۔ چنانچہ وارستہ کی "مصطلحات الشعرا" کے مطبوعہ نسخے کے حواشی پر بہار عجم کا

---

[1] سارا مضمون ہی معلومات آفریں ہے مگر خاص طور سے یہ لفظ اہل تحقیق اور زبان دانوں کے لئے حیرت اور بیاں تہی مسرت کا سبب ہوگا ۔۔۔ (م۔ق)

خلاصہ کسی نے درج کیا ہے، اُس میں لفظ "ہمزدلی" کے متعلق تصریح کر دی گئی ہے کہ یہ پشتو ہے۔

تذکیر و تانیث

پشتو کے اثرات الفاظ کے لین دین تک ہی محدود نہیں رہے، بلکہ اُردو زبان کے لفظوں کی جنسیت بھی پشتو اصولِ جنسیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ قواعدِ اُردو کے مرتب عموماً پشتو سے ناواقف تھے، اس لئے وہ اِس رمز کو کیسے پاتے نیز اُنھیں یہ خیال بھی اس رُخ پر غور وخوض سے مانع رہا ہوگا کہ پٹھان ایک جاہل قوم کا نام ہے۔ اُن کی زبان بھلا اُردو جیسی زبان کے وجود میں آنے کا ذریعہ کس طرح بن سکتی ہے۔ اگر بہ نظرِ انصاف دیکھا جائے تو یہ حضرات کسی نہ کسی حد تک ایسا سمجھنے پر مجبور بھی تھے، اس لئے کہ پہلے کئی سو برس تک مغلوں نے اور پھر ستر برس تک انگریزوں نے اپنی اپنی ملکی مصلحتوں کے ماتحت پٹھانوں کو بدنام کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور بھی صرف کیا تھا۔

لیکن یہ سیاسی مصلحتیں وقت کے ساتھ بدل چکیں۔ اب ہمیں خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے یہ دیکھنا چاہیئے کہ پشتو کے اصولِ جنسیت کا ہماری زبان پر کیا اثر پڑا ہے۔

پشتو کا قاعدہ یہ ہے کہ جو لفظ "ا" "ہ" "ت" "و" یا "ی" پر ختم ہو وہ مؤنث ہے اور باقی سب الفاظ مذکر۔ اس قاعدے کو پیش نظر رکھ کر مولانا عبدالحق صاحب کی قواعدِ اُردو کی بحث تذکیر و تانیث کو دیکھئے اور اُن کے پیش کئے ہوئے مستثنیات کو پشتو کے مذکورہ قاعدے کے ماتحت رکھتے چلے جائیے۔ نتیجہ آپ کو حیرت میں ڈال دے گا۔

بلکہ دکنی ادب کے مطالعہ کے بعد تو میں یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ آپ جتنا ماضی کی طرف پلٹتے جائیں گے، پشتو اثر زیادہ نمایاں ہوتا چلا جائے گا۔ مثلاً عربی کے تمام وہ الفاظ جو "تفعیل" کے وزن پر آتے ہیں سوائے ایک "تعویذ" کے اُردو میں مؤنث بولے جاتے ہیں۔ لیکن آپ محمد قلی قطب شاہ اور ابن نشاطی وغیرہ کا کلام پڑھیں، تو شاید بلا استثنا پشتو کے مطابق آپ ان لفظوں کو مذکر استعمال ہوتا دیکھیں گے۔ اسی طرح آج ہم طاقت وغیرہ اُن عربی لفظوں کو جو تائے مصدری پر ختم ہوتے ہیں، مؤنث بولتے ہیں۔ لیکن دکنی شاعروں نے اس قسم کے سب لفظوں کو اور میر تقی میر وغیرہ شمالی ادیبوں نے بعض کو مذکر باندھا ہے۔ آواز کو بالاتفاق مؤنث بولا جاتا ہے۔ لیکن رام پور اور رچھالا واڑ میں ہر کرد اسے مذکر بولتا ہے۔ یہی تذکیر دکن کے قدیم شاعروں کے یہاں بھی موجود ہے، اور ولی تک نے اسے مذکر ہی لکھا ہے جو پشتو کے بالکل مطابق ہے۔

یہ اور اس قسم کی دوسری بہت سی مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ اُردو پر پشتو کا اثر بہت دور رس ہے اور اس قابل ہے کہ اس سے صرفِ نظر نہ کیا جائے۔

عوام کی بول چال

ہندوستانی عوام کی بول چال پر آپ نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ سیکڑوں عربی اور فارسی کے لفظ اُن کی زبان سے ادا ہوتے ہیں، مگر ان میں سے اکثر کی اصلی شکل بگڑ گئی ہے۔ عام طور پر ہمارے ماہرینِ زبان یہ سمجھتے ہیں کہ مذکورہ تغیرات ہندی لہجے کی پیداوار ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اُن کا خیال درست ہو۔ مگر جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ انھیں بگڑی ہوئی شکلوں میں یہ سب لفظ پشتو کے اندر بھی پائے جاتے ہیں، تو یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ یہ تغیرات ہندوستان میں پہلے واقع ہوئے

یا افغانستان میں، اور ہندوستان میں ہوئے تو یہاں سے کیسے وہاں گئے۔

جہاں تک تاریخی تقاضوں کا تعلق ہے صرف یہی ایک رائے زیادہ قابل قبول نظر آتی ہے کہ ان تغیرات کو اصلاً افغانستان میں وقوع پذیر تسلیم کیا جائے، اس لئے کہ مسلمانوں کے عہد میں بھی ہندوستان افغانوں سے بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ اور چونکہ افغانی زندگی کے ہر شعبے اور یہاں کے ہر طبقے میں گھلے ملے رہے ہیں، اس لئے ایرانیوں یا مغلوں سے کہیں زیادہ ملک کے عوام پر ان کا اثر بھی رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں افغانیوں کی آبادی زیادہ رہی ہے، وہاں ان بگڑے ہوئے لفظوں کا استعمال بھی زیادہ ہے۔

مثالاً چند لفظ ملاحظہ فرمائیے :۔

اَسان ، اَدْرَک ، اَچْوِیہ ، بندوخ ، پلیت ، نلاو ، چادر ، دوال ، سقاوہ ، سُنبل ، طاخ ، کالموت ، گریوان ، مَشال ، ماشوم ، کُم ، نشہ ، دخت ، وِیران ۔

اُردو لغات میں ان لفظوں کو ہندوستان کا مال قرار دیا جاتا ہے۔ میری رائے میں بہتر طریق کار یہ ہے کہ انھیں اصلاً افغانی بتایا جائے۔ آپ خود غور فرمائیے کہ انگریزی "لینٹرن" نے اُردو میں "لالٹین" کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اب کوئی افغانی ہم سے یہ لفظ سیکھ کر افغانستان جائے اور وہاں یہ لفظ رواج پا جائے تو کیا وہاں کے لغت نویس کے لئے یہ بات مناسب ہوگی کہ اس لفظ کو پشتو بتلائے۔

چونکہ افغانی اس ملک کے ہر ہر صوبے پر حکمران رہے ہیں، اس لئے اُردو ہی نہیں، پنجابی، بنگالی، گجراتی، سندھی، مرہٹی سب زبانوں میں پشتو کے قرار واقعی اثر کا پتا چلایا جاسکتا ہے، اگر ان زبانوں کے اہل لغت پشتو سے واقفیت بہم پہونچا کر خالص محققانہ انداز سے اپنے الفاظ کا جائزہ لینے پر آمادہ ہو جائیں[1]۔

[1] اس مضمون نے اُردو کی "ہمہ گیری" اور "جامعیت" کے لئے ایک اور ثبوت فراہم کردیا اُردو میں "بین الاقوامی زبان" بننے کی صلاحیت شروع ہی سے موجود ہے، اور یہ زبان

ع تمتع زہر گوشۂ یافتم

کی زندہ مثال ہے مگر اس کو کیا کیجئے

ع طبع دشمن پہ مگر پھر بھی گراں ہے اُردو

(مدیر)

ضیاء الدین احمد برنی

"مجھے اختلاف ہے"

غالب خوش قسمت ہے کہ اس کے اُردو دیوان کی متعدد شرحیں مختلف زمانوں میں لکھی گئی ہیں۔ ان شرحوں میں طباطبائی، شوکت میرٹھی اور حسرت موہانی کی شرحیں تو قدیم ہیں، باقی نسبتاً جدید۔ حسرت نے اپنی شرح کے دیباچہ میں ان سب شارحین کا شکریہ ادا کیا ہے اور رائے دی ہے کہ "طباطبائی کی شرح تمام شرحوں سے بہتر ہے۔" بعد کے شارحین میں آسی، وسہا، سعید اور بیخود قابلِ ذکر ہیں۔ بیخود نے غالب کے تمام اشعار کی شرح لکھی ہے اور اشعار کا مطلب دوسرے شارحین کے مقابلہ میں صاف و سادہ الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنی شرح لکھتے وقت ان کے سامنے سب شرحیں موجود تھیں اس لئے کہ طباطبائی دیوان غالب کے پہلے شعر کو "بے معنی" قرار دیتے ہیں اور بیخود لکھتے ہیں کہ "اس شعر کو بے معنی کہنا انصاف کا خون کرنا ہے۔"

آج کی گفتگو اسی پہلے شعر کی شرح کے متعلق ہوگی۔ وہ شعر یہ ہے:-

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

سعید اس شعر کا مطلب لکھتے وقت رقم طراز ہیں:- "انسان کی بے بود ہستی اور کشاکشِ حیات کا نقشہ الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔ حاصلِ شعر کا یہ ہے کہ ہستی خواہ کسی چیز کی بھی ہو، باعثِ تکلیف و رنج ہے حتیٰ کہ تصویر تک بھی جو کہ صرف ایک ہستیِ محض ہے، بزبانِ حال فریاد کر رہی ہے کہ مجھ کو ہست کر کے کیوں رنجِ ہستی میں مبتلا کیا۔"

آسی و سہا بھی اسی ڈگر پہ گئے ہیں اور لکھتے ہیں:- "اصل سے جدا ہونے کے بعد اضطراری کیفیت کا پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ نے جب نیستاں سے جدا ہوتی ہے تو اس میں فریاد کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب تصویر کاغذ پر بنائی جاتی ہے تو وہ اپنے کاغذی لباس کی بدولت نقاش کی شوخیِ تخلیق کی زبانِ حال سے فریاد کرنے لگتی ہے۔"

بیخود کی نظر میں "ہر پیکر تصویر" سے جملہ حیوانات، جمادات اور نباتات مراد ہے اور یہ ساری چیزیں فنا ہونے والی ہیں۔ "جب موجوداتِ عالم کا یہ حال ہو تو نقشِ ہستی کا اپنی بے ثباتی پر فریادی ہونا شاعر کے تخیل بلند اور غیر معمولی جدت کا ثبوت کامل ہے۔"

طباطبائی فرماتے ہیں:- "کاغذی پیرہن پہننے کا رواج نہ کہیں دیکھا ہے اور نہ کہیں سنا ہے۔ ۔ ۔ ۔ مصنف کی غرض یہ تھی کہ نقشِ تصویر فریادی ہے ہستیِ بے اعتبار اور بے توقیر کا اور یہی سبب ہے کاغذی پیرہن ہونے کا۔ شعر میں ہستی کے لفظ کی گنجایش نہ ہو سکی۔ ۔ ۔ قافیہ مزاحم تھا اور اس نے ہستی کے بدلے شوخیِ تحریر کہہ دیا۔ شعر بے معنی ہے۔"

ان شرحوں کو دیکھنے کے بعد میرے خیال میں اگر کوئی شخص غالب کے حقیقی مفہوم تک کچھ کچھ پہونچ سکا ہے تو وہ بیخود ہیں۔ باقی سب نے جن میں حسرت موہانی بھی شامل ہیں، ہستی کو "موجبِ آزار" کہہ کر مفہوم پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ حسرت نے لکھا ہے کہ "مجھکو ہست کر کے کیوں مبتلائے رنجِ ہستی کیا۔" حسرت کا یہ مفہوم بقول ان کے "خود منشئ

سے ماخوذ ہے جہاں غالباً خود غالب نے اس شعر کا مطلب بیان کیا ہے۔

مجھے ان تمام شرحوں سے اختلاف ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تخیل کی جس بلندی پر غالب پہونچ چکا تھا، شارحین میں سے کسی کی بھی اُس تک رسائی نہیں ہو سکی۔ اس مختصر سی صحبت میں میں اپنی فہم کے مطابق اس شعر کی تشریح کروں گا:- آپ نے دیکھا ہو گا کہ بالعموم تمام دیوان حمد سے شروع ہوتے ہیں، لیکن غالب نے اپنے دیوان کو بظاہر حمد کے شعر سے شروع نہیں کیا۔ اُن کی اُپج متقاضی تھی کہ وہ اپنے دیوان کے شروع میں حمد تو لکھیں لیکن اس کا پیرایہ ایسا ہو جو اپنی ندرت کے لحاظ سے اچھوتا اور دوسروں سے بالکل مختلف ہو۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو چیزیں خدا نے مخلوق کی ہیں (اور میرا اشارہ جملہ حیوانات، جمادات اور نباتات کی طرف ہے) وہ خدا کی لافانی ہستی کی شوخیٔ تحریر کا بیّن ثبوت ہیں اگرچہ وہ خود عارضی اور فانی ہیں۔ اس اعتبار سے اس شعر کو حمد کا شعر بھی قرار دیا جا سکتا ہے اگرچہ اس کا اسلوب اور اندازِ بیان عام روِش سے بےحد مختلف ہے۔

اس کے علاوہ شاعر یہ بھی کہتا ہے کہ یہ جو نقش ہے وہ خدا کے حضور میں فریادی ہے کہ تو نے مجھے اپنی طرح کیوں نہ لازوال کیا۔ اسی مفہوم کی جھلک اقبال کے یہاں بھی موجود ہے۔ شلاً کہیں اقبال اس امر پر ملال کا اظہار کرتا ہے کہ انسان کو لافانی نہیں بنایا گیا اور کہیں یہ کہتا ہے کہ اگر موت سے مراد بالکلیہ فنا ہے تو پھر اس کے یہ معنی ہیں کہ خدائے قادر و برتر نے اتنی خوبصورت چیز کو خلق کرنے کے بعد اسے اپنے ہاتھ سے تباہ و برباد کر دیا۔ اسی قسم کے جذبہ کا اظہار غالب نے بھی کیا ہے مگر لطیف تر پیرایہ میں۔ میرے خیال میں وہ اس پر ماتم کناں نہیں کہ ہستی بجائے خود موجب ملال و آزار ہے۔ نہیں وہ ایسا نہیں سمجھتا بلکہ اسے شوخیٔ تحریر یعنی شوخیٔ تخلیق کہہ کر صرف اس بات پر ماتم کرتا ہو کہ ہائے اسے ابدیت کیوں نہ بخشی گئی۔ وہ یہ دیکھ کر ملول اور بےچین ہو جاتا ہے کہ موت ہر گھڑی ہستی کی تاک میں لگی رہتی ہے وہ نقش کو اگرچہ شوخیٔ تخلیق سے تعبیر کرتا ہے تاہم ساتھ ہی وہ اس امر کو حیات کا ایک نہایت المناک واقعہ سمجھتا ہے کہ موت اس کا ایک جزو لاینفک ہے اور اس سے کسی طرح مفر نہیں۔

بہرحال مجھے جملہ شارحین سے اس شعر کے مفہوم کے بارے میں سخت اختلاف ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی اس اختلافِ رائے کو حق بجانب قرار دیں گے۔

ف مگر قرآن صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ ہر جاندار کو ایک دن موت آ کر رہے گی، فنا کی دست بُرد سے کوئی متنفس بچ نہیں سکتا، اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر شے ہلاکت آمادہ اور فنا ہونے والی ہے ——— مگر یہ "فنا" دوامی اور مستقل نہیں ہے یہ نہیں ہے کہ آدمی پیدا ہوا، کھایا پیا، زندہ رہا اور مر گیا، پھر نہ کوئی زندگی ہے اور نہ کسی قسم کی پوچھ گچھ ہے! یہ سراسر جاہلانہ تصور اور کافرانہ تصورِ حیات ہے، اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے واسطے سے انسانوں پر اس حقیقت کو منکشف فرمایا کہ تمہیں مرنے کے بعد پھر زندگی عطا ہوگی، اور اللہ کے حضور تمہیں جانا ہوگا، جہاں تمہارے اعمال کی جانچ پڑتال کی جائے گی، اعمال ہی کے وزن اور بُرائی بھلائی کی کیفیت کے اعتبار سے جزا ملے گی ——— یوم حساب اور آخرت کی زندگی کا عقیدہ ایمان کی روح اور اسلام کی جان ہے!

شعراء اپنے ہونے یا نہ ہونے کا چاہے شکوہ کریں، یا فلسفی غم منائیں، بہرحال اللہ کی مشیت پر کوئی حرف نہیں آ سکتا، اُس نے زندگی اور موت، ہستی و نیستی اور عدم و وجود کا جو قانون مقرر فرمایا ہے، وہی ٹھیک بلکہ عین عدل ہے ——— (مدیر)

مذاق العیشی فیروزپوری

"حضورِ ساقی"

لبِ مُطرب پہ نغماتِ شکستِ چنگ" اے ساقی
جنوں حیراں ہے اے ساقی خرد بے ڈھنگ اے ساقی

بجائے شکرِ نعمت کے ہیں شکوے لب پہ مستوں کے
ہوئے جاتے ہیں سازِ دل "غلط آہنگ" اے ساقی

ہے بزمِ میکدہ محتاجِ اذنِ نغمگی شاید
بہت نیچے سُروں میں ہے نوائے چنگ اے ساقی

اکیلا ہی ترانے گا رہا ہوں تیری عظمت کے
کوئی بھی اب نہیں ہے میرا ہم آہنگ اے ساقی

وہی بے نور دن ہیں اور وہی بے سوز راتیں ہیں
طلسمِ روز و شب کے ہیں وہی نیرنگ اے ساقی

دلوں میں بے یقینی اور لبوں پر نام ہے تیرا
بہت ہی عام ہے پر "شیوۂ افرنگ" اے ساقی

گل و لالہ خس و خاشاک کی مانند بکھرے ہیں
چمن ہے ایک تصویرِ شکستِ رنگ اے ساقی

بہار آتی ہے لیکن چاک دامانی نہیں ہوتی
کہاں ہیں وہ ترے مستانِ شوخ و شنگ اے ساقی

اُسی اک چشمِ میگوں کے ہیں پھر سے منتظر میکش
کہ جس سے دور ہو جائے دلوں کا زنگ اے ساقی

مرے ماحول کو رنگینیاں بخشی تھیں فطرت نے
مگر وہ بھی ہوا جاتا ہے اب بے رنگ اے ساقی

یہ فطرت کا اشارہ دیکھئے کیا رنگ لاتا ہے
اڑا جاتا ہے رنگِ بادۂ گلرنگ اے ساقی

زمانہ ان پہ ہنستا ہے یہ تجھ پر جان دیتے ہیں
ترے مستانِ بے پروائے نام و ننگ اے ساقی

منظر کلیمی نے محسوس کیا!:—

کسی کی گرم نگاہی جو ہے نگاہوں میں
تڑپ رہے ہیں شرارے سے سرد آہوں میں

ابھی ہے دور بہت دور ہے سوادِ جنوں
بھٹک رہے ہیں مسافر خرد کی راہوں میں

کہاں گئے وہ حقیقت شناسِ عشق و وفا
نہ مدرسوں میں ملے اور نہ خانقاہوں میں

نہ جانے آ گئے کس شوخ کے اشاروں سے
ہوس پرست محبت کی بارگاہوں میں

الٹ ہی جائے گا خود میری زندگی کا ورق
نگاہیں ڈال کے دیکھو میری نگاہوں میں

قدم بڑھا تو سہی جذبۂ یقیں کے ساتھ
تمام پھول بچھے ہیں طلب کی راہوں میں

عبدالمجید حیرت غلوی

"آئینۂ حیرت"

کچھ وہی جانے جو بے آرام ہے　　زندگی کس کشمکش کا نام ہے

شاید آزادی اسی کا نام ہے　　ہر طرف اک شورِ بے ہنگام ہے

کیا قیامت ہے کہ ہر چھوٹا بڑا　　شکوہ سنجِ گردشِ ایام ہے

وہ فراوانی تو مے کی ہو چکی　　اب تو بس گردش میں خالی جام ہے

محفل آرائی وہاں مخصوص تھی　　لوگ یہ سمجھے کہ اذنِ عام ہے

ایک ہنگامی ضرورت تھی کہ تھی　　اب غریبوں سے انہیں کیا کام ہے

آستانے پر پڑا رہنے دیا　　یہ بھی ساقی کا بڑا انعام ہے

انتہا غم ہی کی شاید کچھ نہیں　　ورنہ ہر آغاز کا انجام ہے

کیوں نہ حیرت سے رہیں دامن کشاں
جانتے ہیں بندۂ بے دام ہے

"حسنِ نظر"

نظر سہوری

طلوعِ صبح سے اندیشۂ شبِ غم ہے　　سحر میں رات کی پرچھائیوں کا عالم ہے

شروعِ عشق ہی سے دل ہے تلخیٔ غم ہے　　یہ وہ چراغ ہے جو شام ہی سے مدھم ہے

دل و نگاہ میں جو ارتباطِ باہم ہے　　یہ ایک رشتۂ نازک ازل سے محکم ہے

یہ کیا کہا؟ دلِ برباد کا تمہیں غم ہے　　اب اعتمادِ محبت کی زندگی کم ہے

ترا جمال ہے، میرا ہی حسنِ خوش نظری　　مری نگاہ مرے سامنے مجسم ہے

یہ کس کے ہاتھ، پسِ پردۂ بہار اٹھے　　نگاہِ شوق میں انگڑائیوں کا عالم ہے

مرا وجود ز سر تا قدم نظر ہی نظر　　ترا جمال کہ اک جلوۂ مجسم ہے

پہونچ سکا نہ کوئی کارواں سرِ منزل
یہ رہبری بھی کسی رہزنی سے کیا کم ہے

از محمد خالد فاروقی

ٹوٹی ہوئی ناؤ!

بوڑھا اسرائیلی چلغوزے پھانکتے ہوئے گہرے مطالعہ میں مصروف تھا اُس کے قریب ہی ادھیڑ عمر کی ایک خاتون اُون صاف کرتے ہوئے جماہیاں لینے لگی آتش دان میں کوئلے چٹخ رہے تھے باہر سرد ہوا کے تیز جھونکوں کی سائیں سائیں نے بھیانک تاریکی کو اور بھی ڈراؤنا بنا دیا تھا، ایک نوعمر خاتون کسی دلچسپ ناول میں اس طرح ڈوبی ہوئی تھی کہ قریب ہی شطرنج کی بازی میں منہمک دو نوجوانوں کی بے ساختہ آوازیں ذرا بھی اُس کی توجہ کو اپنی طرف نہ پھیر سکیں بوڑھا اسرائیلی بدستور کسی تاریخی دستاویز کے مطالعہ میں مصروف تھا آتش دان میں کوئلے چٹخ رہے تھے سرد ہوا کے جھونکے دیوانہ وار درختوں سے اُلجھ رہے تھے، بوڑھا اسرائیلی پڑھتے پڑھتے اب تکان محسوس کرنے لگا اُس نے ایک جماہی لی گردن پیچھے کی طرف جھکا دی اور کتاب اپنے سینہ پر اُلٹ کر رکھ دی پھر اُس نے گردن اُٹھائی اور کچھ بڑبڑانے لگا، ہزار سال ۔ ۔ ۔ ہزار سال ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پورے ہزار سال

تینوں چاروں جو اپنی دلچسپیوں سے اُکتا گئے تھے اُس کے اطراف سمٹ آئے۔

چاچا۔ چاچا کمسن لڑکی نے بے صبری سے پوچھا ایک ہزار سال اُوہ ایک ہزار سال جیسے آج وہ آپ کو کوئی نئی کہانی سنانے والا ہو۔

ہاں ایک ہزار سال پورے ایک ہزار سال بیت چکے ہیں جب یہ جزیرہ ایک کھنڈر کے سوا کچھ نہیں تھا۔

کیا ہم اس پر یقین کر سکتے ہیں کہ تہذیب و تمدن کے اس جگمگاتے شہر کی جگہ کبھی کوئی ویرانہ ہو چھریرے بدن والے ۔ ۔ ۔ نوجوان نے تعجب سے کہا ــــــ بوڑھے اسرائیلی نے قہوہ کی پیالی رکھتے ہوئے سلسلہ کلام جوڑ دیا ہماری تاریخ کا وہ دور میری آنکھوں کے سامنے تصویر کی طرح کھنچا ہوا ہے جبکہ ہمیں ہمارے سرسبز مرغزاروں، لہلہاتے کھیتوں، اور زرخیز وادیوں، بھرے بازاروں اور سکون و عافیت کے ٹھکانوں سے نکال دیا گیا۔ ہمارے بچوں کو پھٹے پرانے کپڑے پہنائے گئے ہماری نوخیز حسین لڑکیوں کو غصب کر لیا گیا اور برسات کی ایک تاریک رات میں جبکہ سمندر کا طوفان اپنے پورے شباب پر تھا ایک ایسے جہاز پر ہمیں سوار کر دیا گیا جس کے پتوار ٹوٹے ہوئے تھے جس کے بادبان پھٹے ہوئے تھے جس کا نہ کوئی ملاح تھا اور نہ منزل لنگر کھول دیا گیا اور جہاز سمندر کی پہاڑ جیسی موجوں' ہواؤں کے سخت تھپیڑوں اور موسلا دھار بارش میں تاریکی کے اتھاہ اور بے کنار سمندر میں گم ہو گیا اور یہ سب کچھ ہمارے ساتھ صرف اس لئے کیا گیا کہ ہم نے اعلان کر دیا تھا کہ وقت کے نمرودوں، فرعونوں اور شدادوں کے پیچھے نہیں چلیں گے اور اپنے میں سے ایک ایسے نوجوان کو قیادت کے لئے چُن لیا جس کے گلے میں پھٹا ہوا کرتا پڑا ہوا تھا جو بھیڑوں کے گلّے چراتا اور اُون جمع کرتا تھا لیکن اُس کے بال سنہرے تھے اس کی آنکھوں میں چمک تھی اُس کے بازو قوی تھے، اُس کا سینہ چوڑا تھا اُس کی پیشانی روشن تھی اُس کا دھانہ تنگ تھا، اُس میں جوش تھا، متانت تھی ثبات تھا اُس نے ہم گرتے ہوؤں کو سنبھالا وہ نہ اپنے دل سے سوچتا تھا نہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا اُس کی آنکھوں میں چمک اُس کے دل میں روشنی اُسی سے تھی جس سے اندھیری رات میں چمکنے والے تاروں نے نور مستعار لیا تھا۔

اُس نے وقت کے فرعونوں کے پیچھے چلنے سے انکار کر دیا اور وہ بالکل اکیلا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اقتدار کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کنیسہ کے راہبوں نے دریچے بند کر لئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وقت کے مصلحت کوش بوڑھے کونوں میں جا دُبکے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن جھیل پر دن بھر مچھلیاں پکڑنے والے نوجوان مچھیروں نے اُس کی آواز پر لبیک کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر یہ چنگاری شہر کی دانش گاہوں میں جا پہونچی علم کے پیاسے حق کے متلاشی نوجوانوں نے لبیک کر اُس آواز کو لیا اپنے دل کی گہرائیوں اور دماغ کے گوشوں میں جگہ دی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر وقت کے فرعونوں کو شہر کے ہر گھر میں خطروں کی پرچھائیاں سی نظر آنے لگی وہ ہر ذرہ کو شک وشبہ اور بدگمانی کی نگاہ سے دیکھنے لگے کشمکش بڑھتی گئی آخر ایک ایک کو جمع کر کے سمندر کی بے رحم موجوں کے حوالے کر دیا گیا پھر جشن ہوا شاہراہوں پر عورتوں اور مردوں کے جلوس نکلے محلوں میں شراب پی گئی رقص وسرود کی مجلسیں آراستہ ہوئیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھٹے ہوئے بادبان والا ٹوٹے ہوئے پتوار والا بے منزل جہاز جس کا کوئی ناخدا نہیں گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کسی ان جانی سمت میں بڑھتا رہا پیچھے بیٹھے رہ عورتیں سسکتی رہیں لیکن بچے نوجوان کسی ان دیکھی طاقت کے بھروسے پر اک نئی صبح کے منتظر تھے رات آخر ہوئی سمندر ایسا ساکن ہوا کہ جیسے اُس میں کوئی جان ہی نہ تھی، صبح کا ستارہ طلوع ہوا اور ٹوٹا پھوٹا جہاز منزل پر پہونچ چکا تھا اُس کے بادبانوں میں کوئی ہوا بھر رہا تھا اُس کے پتوار چپکے چپکے کوئی چلا رہا تھا اُس کا کوئی ان دیکھا ملّاح رات کی تاریکی میں اُسے منزل کی طرف بڑھاتا رہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صبح مسکرائی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تاریکی ختم ہوئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فرعون کی بیڑیاں کٹیں بچے کھل کھلا اُٹھے عورتوں کے مرجھائے ہوئے چہرے پھول بن گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نوجوانوں کے چہرے چمک اُٹھے ان کے سینے یقین سے بھر گئے۔ اُن کے دل بول رہے تھے کہ اس گڈریے کی آنکھوں میں چمک سچی ہے، اُس کے دل میں روشنی سچی ہے۔ اُس کی پیشانی پر چمکنے والا ستارہ سچا ہے۔

آتش دان میں کوئلے بجھنے لگے سرد ہواؤں کی سائیں سائیں ختم ہو گئی بوڑھے اسرائیلی کی سفید وسیاہ ڈاڑھی میں آنسوؤں کے قطرے جھلملانے لگے نوعمر خاتون کی آنکھیں نمناک ہو گئیں ——— چھریرے بدن والا نوجوان لینے لگے کو گرم کوٹ کے کالر میں بھینچتے ہوئے کھڑا ہو گیا اُس کی نمناک آنکھوں میں ایک عجیب چمک پیدا ہو گئی، جیسے کسی نے اُس کے سوتے ہوئے دل کو جھنجوڑ دیا ہو اس کی دبی ہوئی تمنائیں اور مری ہوئی آرزوئیں جاگ اُٹھیں، اُس کے گھٹے ہوئے جذبات اُٹھ آئے اُس کی آواز بھرا گئی۔ وہ سوچنے لگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ کہنے لگا کیا ہم میں کوئی گڈریا نہیں جس کے گلے میں بیٹھا کرتا ہو جو بھیڑیں چراتا ا در اُدن جمع کرتا ہو، کیا ہم میں نوجوان مچھیرے نہیں جو جھیل پر دن بھر مچھلیاں پکڑتے ہوں، کیا ہمارے کالج اور یونیورسٹیاں دانش وروں سے خالی ہیں آج نمرودوں نے نیا لباس زیب کیا۔ آج فرعونوں نے نئی پوشاک پہن لی، کیا آج ہم میں کوئی نہیں جو ان کے جامے کو چاک کرے ان کے جسم کو ننگا کرے۔

بوڑھا اسرائیلی زیر لب کہنے لگا کوئی نہیں بیٹے! کوئی نہیں

ثاقب نے پوچھا بابا کیا شمال میں کوہ آلام سے لے کر جنوب میں ساحل ماتن تک پھیلے ہوئے شہر میں ایک بھی نہیں جو اس راہ پہ چلے پھر بتاؤ اس کا انجام کیا ہے۔

اس رات کے بعد ثاقب نے کبھی شطرنج نہیں کھیلی وہ کلب بھی نہیں گیا اُس کے احباب اُس سے کٹ گئے، گھر والوں نے اُس سے اپنا ناتا نہ رکھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دن گزر گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مہینے گزر گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سال گزر گئے اس

نے کوہ آلام کے اس کونے سے ساحل مآمن کے اُس کونے تک گوشہ گوشہ چھان مارا وہ کارخانوں اور کھیتوں میں گیا اُس نے مزدوروں اور کسانوں کو پکارا وہ کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں گیا اُس نے طالب علموں اور پروفیسروں کو دعوت دی، وہ خانقاہوں اور عبادت گاہوں میں پہونچا صُوفیوں اور زاہدوں کو جھنجوڑا، وہ ایوانوں اور کوٹھیوں میں داخل ہوا اُس نے وزیروں اور لیڈروں کو غیرت دلائی اُس نے تجارت گاہوں اور صنعت گاہوں کی خاک چھانی تاجروں اور صناعوں میں تلاش کیا وہ علمار اور امرار کے درباروں پر حاضر ہوا اُن میں سے ایک ایک کو ٹٹولا۔

دن گزر گئے ... مہینے گزر گئے .. سال گزر گئے اور بوڑھے اسرائیلی کی آواز اُس کے کانوں میں گو نجنے لگی "کوئی نہیں بیٹے کوئی نہیں" کتنی شفقت اور مایوسی تھی اس آواز میں اب اس قتل گاہ میں اُسے کسی نیم بسمل کی اُمید نہ تھی۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اس بستی میں کوئی گڈریا نہیں جس کے گلے میں پھنسا ہوا کُرتا ہو جو بھیڑیں چَراتا اور دن جمع کرتا ہو۔ کوئی نوجوان مچھیرا نہیں جو جھیل پر مچھلیاں پکڑتا ہو کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں کوئی حق کا متلاشی علم کا پیاسا دانش ور نہیں جو کسی ان دیکھی ذات کی کارفرمائی کو تسلیم کرکے اُس کا دم بھرے۔ اب وہ کوہ آلام کے دامن سے ساحلِ مآمن کی طرف چل پڑا ایک حسرت بھری نظر ڈالتے ہوئے ایک یاس و ترحم آمیز نگاہ ڈالتے ہوئے وہ دیکھتا گیا کوہ آلام سے ساحل مآمن تک دیکھتا گیا۔۔ .. .. باپ کا بیٹی کے ساتھ کھوٹ پن، بیوی کی شوہر کے ساتھ غداری، بھائیوں کا آپس میں فساد، نوکر کی آقا سے بے وفائی، طاقتور کا کمزور پر ظلم وزیروں اور لیڈروں کی عیاشی، باشندوں کے افلاس و فلاکت، نوجوانوں کی بے حیائی، دوشیزاؤں کی عصمت فروشی، علمار کا مکر وریا، زاہدوں کا دنیا سے ساز باز، وہ ساحلِ مآمن کی طرف بڑھتا رہا اُس کے پیچھے کوہ آلام کے دھانے سے دھوئیں کے سیاہ بادل نکل کر فضاً میں چھاتے رہے اور لاوا اُگلتا رہا سمندر کا طوفان اپنے شباب پر تھا اور تاریکی بڑھ رہی تھی ساحل مآمن پر ایک پھٹے ہوئے بادبان والی کشتی جس کے پتوار ٹوٹے ہوئے تھے کسی کی منتظر موجوں سے جھکولے کھا رہی تھی، ثاقب نے ایک حسرت آمیز نظر جزیرۂ مآمن پر ڈالی اور موجوں نے کشتی کو سمندر کی اتھاہ تاریکی میں دھکیل دیا، کوہ آلام نے ایک آتشین بادل اُگلا اور ہر طرف سے آتشین لاوا شہر کی طرف بڑھنے لگا، تیز ہواؤں کے دوش پر شعلوں نے مآمن کو گھیر لیا سمندر کے درمیان جزیرۂ مآمن صرف ایک شعلہ بنا ہوا تھا۔ ... ... کشتی کے پھٹے ہوئے بادبانوں میں کوئی ہوا بھر رہا تھا اور کشتی کے ٹوٹے ہوئے پتوار کوئی چپکے چپکے چلا رہا تھا کوئی اَن دیکھا ملاح مالک تاریکی میں کشتی کو راہ پر لگا رہا تھا پہاڑ جیسی موجوں اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کشتی صبح کے اُفق پر کسی نئے ستارے کی تلاش میں چلی جا رہی تھی ——— !

آدمی قرآن کی روح سے پوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا جب تک کہ عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لئے قرآن آیا ہے، یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں یہ دنیا کے عام تصورِ مذہب کے مطابق ایک مذہبی کتاب بھی نہیں ہے کہ مدرسے اور خانقاہ میں اس کے سارے رموز حل کرلئے جائیں جیسا کہ اس مقدمہ کے آغاز میں بتایا جاچکا ہے یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے، اس نے آتے ہی ایک خاموش اور ایک نیک نہاد انسان کو گوشۂ عزلت سے نکال کر خدا سے پھری ہوئی دنیا کے مقابلہ میں لاکھڑا کیا، باطل کے خلاف اس سے آواز اٹھوائی اور وقت کے علمبردارانِ کفر و فسق و ضلالت سے اس کو لڑوا دیا۔ گھر گھر سے ایک ایک سعید روح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعیٔ حق کے جھنڈے کے تلے ان سب کو اکٹھا کر دیا۔ گوشے گوشے سے ایک ایک فتنہ جُو اور فساد پرور کو بھڑکا کر اٹھایا اور حامیانِ حق سے ان کی جنگ کرائی، ایک فردِ واحد کی پکار سے اپنا کام شروع کر کے خلافتِ الٰہیہ کے قیام تک پورے تیس سال یہی ایک کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی اور حق و باطل کی اس طویل جاں گسل کشمکش کے دوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلے پر اسی نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بتائے، اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاعِ کفر و دین اور معرکۂ اسلام و جاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کشمکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں۔ اسے تو پوری طرح آپ اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کر دیں اور جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اسی طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں، تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے جو نزولِ قرآن کے وقت پیش آئے تھے، مکے، حبش اور طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے اور بدر و احد سے لیکر حنین اور تبوک تک کے مراحل آپ کے سامنے آئیں گے، ابوجہل اور ابولہب سے بھی آپ کا واسطہ پڑے گا، منافقین یہود بھی آپ کو ملیں گے اور سابقین اولین سے لیکر مولفۃ القلوب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ بھی لیں گے اور برت بھی لیں گے۔ یہ ایک اور قسم کا "سلوک" ہے جس کو میں "سلوکِ قرآنی" کہتا ہوں۔ اس سلوک کی شان یہ ہے کہ اس کی جس جس منزل سے آپ گزرتے جائیں گے، قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود سامنے آکر آپ کو بتاتی چلی جائیں گی کہ وہ اسی منزل میں اُتری تھیں اور یہ ہدایت لے کر آئی تھیں۔ اس وقت یہ تو ممکن ہے کہ لغت اور نحو اور معانی و بیان کے کچھ نکات سالک کی نگاہ سے چھپے رہ جائیں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن اپنی روح کو اس کے سامنے بے نقاب کرنے سے بخل برت جائے۔

(تفہیم القرآن۔ ۔ ۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

ہماری نظر میں

حیاتِ اشرف

"حیاتِ اشرف" از:- غلام محمد بی۔ اے (عثمانیہ) ضخامت ۳۶۰ صفحے، مجلد چکنا سفید کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، قیمت تین روپے بارہ آنے، ملنے کا پتہ:- کاروانِ ادب، کلیم پریس بلڈنگ، نزد شومارکیٹ لارنس روڈ، کراچی

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی ذات جامع کمالات تھی، اُن کی زبان و قلم نے ساری عمر دین کی خدمت انجام دی اور ہمارے درمیان دس بیس نہیں سیکڑوں ایسی کتابیں چھوڑیں جن سے دین کا فہم، دنیا سے بچنے کی تڑپ اور خشیتِ الٰہی کا جذبہ اور خدمتِ اسلام کا داعیہ پیدا ہوتا ہے! مولانا تھانوی نے بہت سے گم کردہ راہوں کو صراطِ مستقیم دکھائی اور نہ جانے کتنے زنگ آلود قلوب پر صیقل کی! مولانا موصوف صرف عالم ہی نہ تھے بلکہ ایک اچھے مربی بھی تھے اور افراد کی تربیت کے نفسیاتی نازک نکتے اللہ تعالیٰ نے اُن کو سمجھا دیے تھے!

"اشرف السوانح" کے بعد مولانا عبدالباری ندوی نے کئی کتابیں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار اور حالات پر لکھی ہیں، علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کے مضامین بھی اس سلسلہ کی ایک سنہری کڑیاں ہیں ——— اب جناب غلام محمد صاحب بھی اس سعادت میں شریک ہوئے ہیں اور بڑے سلیقہ کے ساتھ حکیم الامت کے حالات مرتب فرمائے ہیں، اُن کے قلم میں بھی خاصی روانی اور شگفتگی ہے اور کہیں کہیں نازک مسائل کو بہت سلجھا کر بیان کیا ہے جو ادب کے موجودہ دورِ ژولیدگی میں بس غنیمت ہے!

اس کتاب سے پہلی بار یہ بات معلوم ہوئی کہ حضرت مولانا تھانوی تبلیغ دین کے لئے انگلستان جانے کا عزم رکھتے تھے، اور اس مقصد کے لئے ایک انگریزی داں رفیق کو بھی آپ نے منتخب فرمالیا تھا کہ اتنے میں حبیب[1] احمد صاحب تھانوی کا انتقال ہوگیا، اور یہ ارادہ عملی جامہ نہ پہن سکا۔

صفحہ (۲۰۵) پر مولانا تھانوی کے ارشادات کا ایک اقتباس دیا ہے:-

"میری نظر "ملکات" پر ہوتی ہے، "افعال" پر نہیں ہوتی کیوں کہ افعال تو ارادہ بدلنے پر ایک منٹ میں درست ہو سکتے ہیں لیکن ملکات کی اصلاح ہونا برسوں میں بھی مشکل ہے۔۔۔"

ان جملوں میں نفسیات کی کس قدر نازک ترجمانی فرمائی گئی ہے!

(صفحہ ۱۳) "یہ وہ مے نہیں جو ایک بار لگنے پر عمر بھر چھوٹ سکے" "منہ لگنے پر" لکھنا چاہئے تھا، محاورہ یہی ہے، داغ کا مشہور مصرعہ ہے:-

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

---

[1] جن کی دعوت پر حضرت مولانا تھانوی رح نے انگلستان جانے کا ارادہ فرمایا تھا۔

(صفحہ ۵۵) "ایک دن دفعۃً جی میں آیا کہ آج آپ کو میں دھوکہ دوں گا اور یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ فلاں آیت میں دھوکہ دوں گا" ——— قاری عبد الرحمٰن کی اصطلاح میں "دھوکہ دینا یا متشابہ لگنا" بولتے ہیں۔ ——— صفحہ (۳۹) "سبب اوپر والی منزل پر شاگرد و استاد مشق کرتے تو ادنے ہوئے تو وہ ہرو کے لئے پہچاننا مشکل ہو جاتا کہ استاد کون ہے اور شاگرد کون؟" یہاں "دہرو" کے مقابلہ میں "نو وارد" زیادہ مناسب تھا!

بعض کتابت کی غلطیاں ایسی رہ گئی ہیں جو نہ رہنی چاہیئے تھیں مثلاً صفحہ (۸۵) پر "حرارت غریزی" کو "حرارت عزیزی" ——— صفحہ (۷۹) پر "شدید حالی" کو "شدید حال" اور صفحہ (۱۸۴) پر "مبتر" کو "ممبر" لکھا گیا ہے۔

کتاب کا وہ حصہ جس میں حضرت مولانا تھانوی کے مخصوص واردات قلب کے غلبہ اور جذب و حال کا ذکر ہے، اگر نہ ہوتا تو عوام مسلمان کسی "فائدہ" سے محروم نہ رہ جاتے، بلکہ اس کے پڑھنے سے نقصان کا امکان ہے، مولانا تھانوی رحمۃ کے جذب و حال میں تو خلوص تھا مگر "غلبہ حال" کے نام پر متصوفین لوگوں کو دھوکا بھی دے سکتے ہیں اور دیتے رہتے ہیں! اس قسم کے تصورات میں عوام مسلمانوں کو الجھانے کی ضرورت نہیں، اس قسم کے تذکرے نہ کئے جائیں تو اچھا ہے اور اگر ان کا ذکر اگر ضروری ہو تو پھر بڑے احتیاط کی ضرورت ہے ——— صفحہ (۱۲۳ اور ۲۴۷) پر لکھا ہے :-

"اسی طرح ایک موقعہ پر شاہ سلیمان پھلواروی تشریف لائے تھے، ان سے بھی کانپور والوں نے عرض کی کہ وہ حکیم الامت کو لب کشائی پر آمادہ کریں تو انھوں نے عجیب جواب دیا۔ .. فرمایا ——— "اگر ایسی حالت میں اس شخص سے وعظ کہلوایا تو بس منبر پر بیٹھتے ہی اس کے منہ سے یہی لفظ نکلے گا وہ "انا الحق" ہوگا ایسی حالت میں اصرار ہرگز مناسب نہیں"

یہ جملے اپنے اندر کس قدر خطرہ رکھتے ہیں!

صفحہ (۱۱۶) "ایک اور مقام پر جہاں ایک اہل نظر موجود تھے (مولانا تھانوی نے) صبح کی نماز پڑھائی تو ایک صاحب نے کہا کہ موسیقی کے قاعدہ سے آپ کی قرأت میں بھیرویں کی کیفیت تھی جو صبح کی ایک سہانی راگنی کا نام ہے"

مصنف عقیدت کے جوش میں اس واقعہ کو نقل کر گئے ہیں، جو ہمارے نزدیک قابل گرفت چیز ہے کہ تجوید و ترتیل میں لحن یا غنا اور موسیقی کے قریب پہونچ جانا مستحسن نہیں!

صفحہ "۱۴۳" ——— "علم سلوک و تصوف در حقیقت شریعت کا نام ہے" یہ "حیات اشرف" کے مصنف کا قول ہے، اور سلوک و تصوف کے بہت بڑے رمز شناس حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد ہے کہ :-

"طریقت و حقیقت جو ولایت سے وابستہ ہیں، خادمان شریعت ہیں ... "

حسین ابن منصور حلاج کے بارے میں خود حضرت حکیم الامت کا یہ قول نقل کیا ہے :-

"ایسی سخت سزا اور سنگین مصیبت کو اس درجہ صبر و استقلال کے ساتھ اور خندہ پیشانی سے تحمل کرنا نہ کسی زاہد خشک سے ممکن ہے نہ کسی ساحر و زندیق سے اور عین اس حالت میں نشۂ توحید سے سرشار ہو کر محبت و عشق الٰہی کا ایسا درد انگیز اظہار کرنا کہ مشائخ وقت بھی نعرۂ "الواحد افراد الواحد لہٗ" سن کر رقت پذیر ہو گئے اور اس درد انگیز حالت میں شبلی رح جیسے امام طریقت کے سوالات کا جواب دینا

ابن منصور کی شانِ یکتائی کو ظاہر کرتا ہے، زمانہ کی نگاہ نے اس کا نظارہ بہت کم کیا ہوگا ——— پہلے حقیقت یہ ہے کہ ابن منصور کا واقعہ قتل اور سانحہ ہوش ربا ہی ان کے سچے صوفی، عاشق فانی محبوب سبحانی اور صاحب استقلال لاثانی ہونے کی بڑی دلیل ہے۔ ۔۔ ۔۔ " (صفحہ ۲۳۰)

حضرت حکیم الامت کا علم و تقویٰ ہمارے سر آنکھوں پر مگر آن کے اس " ... " کی نہ صرف یہ کہ ... نہیں کرتے بلکہ اُس سے برآت کا اظہار کرتے ہیں، خانقاہی سلوک اور تصوف کے دامن پر " انا الحق " کی حمایت اور ستائش ایک بدنما داغ ہے، ایک طرف کتاب و سنت کے اتباع کا وہ پُر شور دعویٰ اور دوسری طرف حسین ابن منصور حلاج اور اُس کے " انا الحق " کی تاویل، توجیہ بلکہ مدح و تائید اس تضاد کو آخر کیا سمجھا جائے!

ہمارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس سیرت اور اُس کے بعد صحابہ کرام اور تابعین علماء کے آثار و باقیات نمونہ کے لئے بہت کافی ہیں، وہاں اس قسم کے " شطحیات " کی جھلک بھی نہیں ملتی ——— افسوس ہے کہ " تصوف " اسی قسم کے " غوامض و اسرار " کے سبب بدنام ہے، کوئی ٹوکتا ہے تو فرمایا جاتا ہے کہ تم خدا کے مقبول بندوں پر طنز کرتے ہو! مگر ہم جیسے عامی اور خشک لوگ وہی کہیں گے جو حضرت امام احمد بن حنبل نے فرمایا تھا۔ ۔۔ ۔۔ کہ

" اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت کے علاوہ کوئی اور چیز مجھ نہیں بھلا سکتی!"

" حیاتِ اشرف " کا زیادہ کامیاب حصہ وہ ہے جس میں حضرت حکیم الامت کی تصانیف پر اجمالی تبصرہ کیا گیا ہے، اس موضوع کو اور زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے!

ذکرِ غالب

" ذکرِ غالب " از مالک رام ایم۔ اے، ضخامت ۲۳۲ صفحات، قیمت دو روپے آٹھ آنے ——— ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار، دہلی

غالب پر غلام رسول مہر اور شیخ محمد اکرام نے کوئی شک نہیں کہ بڑے معرکہ کی کتابیں لکھی ہیں، مگر جناب مالک رام ایم۔ اے کی یہ کتاب ——— ذکرِ غالب ——— بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے غالب کی شخصیت پر ایک اہم دستاویز اور قابلِ قدر تذکرہ بلکہ تاریخی منشور کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس ایک کتاب کے لئے فاضل مصنف نے ہزاروں صفحے پڑھے ہیں اور برسوں تحقیق کی ہے جب کہیں جاکر " ذکر غالب " وجود میں آئی ہے!

کتاب شروع سے آخر تک انتہائی دلچسپ ہے ——— اتنی دلچسپ جی میں آتا ہے کہ ایک ہی نشست میں ختم کر کے دم لیجئے، زبان انتہائی سادہ، سلیس بلکہ دل نشین ہے، واقعات میں نہ تو اتنا زیادہ پھیلاؤ ہے کہ طبیعت ملول ہو جائے اور نہ اس قدر اختصار ہے کہ دل گھٹنے لگے، پھر واقعات و شواہد سے لائق تذکرہ نگار نے جو نتائج نکالے ہیں، وہ اُس کی اصابتِ فکر کی شہادت دیتے ہیں۔

غدر کے بعد کتب خانوں کی تباہی کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:-

" جب غدر ہوا اور ان دونوں کے گھر لٹے تو کتب خانے بھی ورق ورق ہوگئے" (صفحہ ۱۸۱)

" کتب خانہ " کے ساتھ " ورق ورق ہوگئے " نے جملے کے زور و بست، واقعیت اور اُس کی تاثیر میں کتنا اضافہ

مشاعروں میں غالب کی شعر خوانی کے سلسلہ میں لکھا ہے :-

"وہ (مرزا غالب) داد دینے والوں کا شکریہ نہایت متانت بلکہ کسی حد تک تمکنت سے ادا کرتے ان کے رویّہ سے یُوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنا جائز حق سمجھتے ہیں اور داد دینے والا اُن پر کوئی احسان نہیں کر رہا۔۔۔" (صفحہ ۱۷۹، ۱۸۰)

ان چند جملوں میں مصنف نے وہ بات کہہ دی، جو شاید چند صفحوں میں بھی اس سے بہتر انداز میں دہرا نہ کہہ سکتا غالب کو تاریخی قطعوں سے بڑی اُلجھن ہوتی تھی، "ذکرِ غالب" سے یہ بات پہلی بار معلوم ہوئی :-

"شاعری کی ایک صنف سے وہ بہت گھبراتے تھے، ان کے کلام میں تاریخیں ملتی ہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ ان کی طبیعت کو فنِ تاریخ دستماسے کوئی مناسبت نہیں تھی[1] وہ اُسے دُونِ مرتبۂ شاعری سمجھتے تھے، عام طور پر دوسروں کے دئے ہوئے مادّے نظم کر دیا کرتے تھے، جہاں دو چار اُن کے کلام میں بے تکلف مادہ تاریخ ملتا ہے یہی سمجھنا چاہیئے کہ یہ کسی اور کا بتایا ہوا ہے ——" (صفحہ ۱۸۰)

غالب سُنی تھے یا شیعہ یہ بات ایک معمہ بنی ہوئی ہے، مالک رام صاحب نے اس معمہ کو حل فرمایا ہے:-

یہ بیانات پڑھنے کے بعد ممکن نہیں کہ کوئی شخص انہیں اہلِ سنت گروہ میں شمار کر سکے، رہا یہ سوال کہ اگر وہ شیعہ ہی تھے تو کس طرح کے۔ تو اس سوال کے جواب میں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آتی، انھوں نے خود لکھا ہے کہ باقی صحابہ رسولؐ کا مقام حضرت علیؓ کے مقابلہ میں وہی ہے جو ستاروں کا بدر کے مقابلے میں ۔۔۔ گویا وہ حضرت علیؓ کو دوسرے صحابہ پر فضیلت دیتے ہیں یعنے دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اُن کی شیعیت کا امتیازی نشان تبرّا نہیں بلکہ تولّا ہے، وہ دوسرے صحابہ پر تبرّا نہیں کرتے بلکہ حضرت علیؓ سے اپنے تولّا اور محبت کا اظہار کرتے ہیں، یعنی اثنا عشری تفضیلی شیعی ہیں۔" (صفحہ ۱۸۸، ۱۸۹)

غالب کی زبان اور اسلوبِ بیان پر لائق مصنف نے کتنے اچھے پیرایہ میں اظہارِ رائے کیا ہے :-

"لوگ میرزا کی زبان اور اسلوبِ بیان پر اعتراض کرتے ہیں، اگرچہ ان میں سے بیشتر خود معترض کی عدم واقفیت پر مبنی ہوتے ہیں، تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان میں سے بعض واقعی درست ہیں لیکن اس میں میرزا کا کیا قصور! انھوں نے اُردو کی محدود وسعت میں وہ خیالات ادا کرنیکی کوشش کی جو اُن سے پہلے ہمارے یہاں موجود نہیں تھے، نتیجہ غیر متوقع نہیں تھا —— اگر آپ کسی بڑے تن و توش کے آدمی کو تنگ کپڑے پہنانے لگیں گے تو لازمًا کہیں سے کپڑا مسک جائے گا اور کہیں سے اُس کے ٹانکے کھل جائیں گے، غالب جو خیالات پیش کر رہے تھے اُن کے لئے ہماری زبان میں الفاظ یا ترکیبیں موجود ہی نہیں تھیں پس انھوں نے کچھ فارسی سے مستعار لیا کچھ خود گڑھا اور اہلِ نظر کے

---

[1] راقم الحروف کی طبیعت کو بھی تاریخی قطعوں سے کبھی لگاؤ نہیں رہا، ساری عمر میں صرف ایک تاریخی قطعہ کہا ہے سو وہ بھی مہاراجہ سرکشن بہادر صدر اعظم کے اصرار سے، حیدرآباد دکن کے جوبلی ہال کا سنِ تعمیر اس قطعہ سے نکلتا ہے —— کبھی کبھار اس فن (تاریخ گوئی) میں اپنی خامی اور تہی مائگی کا ملال بھی ہوتا تھا مگر غالب کے اس واقعہ کو پڑھ کر وہ ملال جاتا رہا (ماہر القادری)

سامنے حاضر کر دیا، کوئی دوسرا اُن کی جگہ ہوتا تو کبھی اتنی جرأت ہی نہ کر پاتا ــــ (صفحہ ۲۲۷، ۲۲۸)

"ایران سے درفش کاویانی ہمیشہ کے لئے سرنگوں ہوگیا" (صفحہ ۱۰) ـــ "یہاں ٹھیک استعمال نہیں ہوا" "میں" کا محل تھا ــــ صفحہ (۱۴) پر قوقان بیگ خاں کو غالب کا "پردادا" لکھا ہے اور صفحہ (۱۵) پر اُن کے والد میرزا عبداللہ بیگ خاں کا والد یعنی غالب کا "دادا" لکھا ہے ـــ (صفحہ ۳۶) "مگر اب زندگی کا پہلا سا خود کشانہ ہنجار موقوف ہوگیا" ـ "خودکشانہ ہنجار" نامانوس ترکیب ہے! (صفحہ ۴۸) "چونکہ کلکتے کے لوگ زیادہ ترقتیل کے شاگرد تھے اس لئے غالب نے یہی سوچا کہ دریا میں رہ کر مگر سے بیر عقلمندی کا طریقہ نہیں" ضرب المثل اصل میں یوں ہے ـــ "دریا میں رہ کر، مگر مچھ سے بیر" اور ضرب المثل میں لفظوں کی ردوبدل اور کمی بیشی جائز نہیں!

(صفحہ ۹۰) "۱۸۴۲ء میں میرزا کو دہلی کالج میں فارسی کی مدرسی کا عہدہ پیش کیا گیا لیکن انھوں نے اپنی تنک مزاجی کے باعث اسے منظور کرنے سے انکار کر دیا" ـــ یہاں "تنک مزاجی" کا نہیں بلکہ "خودداری" یا اسی قبیل کے کسی لفظ کا محل تھا ــــ (صفحہ ۹۹) "غدر کے دوران میں غالب کے رویہ کی پڑتال ہو رہی تھی" "جانچ پڑتال" بولا جاتا ہے، لفظ "پڑتال" مفرد، حساب کی "چیکنگ" CHACKING ہے "یا مزدوروں اور قیدیوں کی تعداد شماری کے لئے بولا جاتا ہے اور پٹواری جب کھیتوں میں جاکر فصل کی نوعیت وغیرہ کا معاینہ کرتے ہیں تو اُسے بھی "پڑتال" کہتے ہیں ــــ "صفحہ (۱۹۷) "وہ شراب نوشی کو بُرا نہیں سمجھتے تھے یا انھیں اُس پر فخر نہ تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اُس سے پشیمان تھے" "اُس پر پشیمان تھے" کہنا چاہیئے تھا یعنی غالب اپنی شراب نوشی پر پشیمان تھے شراب سے یا شراب نوشی سے پشیمان نہ تھے،" سے "کا یہ محل ہوتا ہے:-

"بھائی! میں کل حسب وعدہ تمھارے یہاں نہ آسکا میں تم سے پشیمان ہوں۔ ..."

کئی جگہ "سنبھالنے" کا املا "سمبھالا" نظر آیا، اور وجدان کو کھٹکا ــــ "سفارش" کو ہر جگہ "سپارش" لکھا ہے جو فارسی میں چاہے اسی طرح لکھا اور بولا جاتا ہو مگر اُردو میں "سپارش" کا تلفظ اور اُس کا املا دونوں گوش و نگاہ پر گراں گزرتے ہیں۔

"نواب احمد خاں نے سپارش کی اور میرزا نصر اللہ بیگ خاں چار سو سواروں کے ایک دستے کے رسالدار ہوگئے ان کی ذات کے لئے سترہ سو روپیہ ماہانہ اور رسالے کی تنخواہ کے لئے اکبر آباد کے مضافات میں ریاست بھرت پور سے متصل لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی کے دو زرخیز پرگنے سونکھ اور سونسا عین حیات جاگیر میں عطا ہوئے (صفحہ ۲۱)

یہ اب سے ڈیڑھ سو سال قبل کا ذکر ہے، اُس وقت ہر چیز کی بے حد ارزانی تھی اس لئے اب کے مقابلہ میں تنخواہیں بہت تھوڑی ہوتی تھیں، اس حساب سے فوج کے ایک رسالدار کی تنخواہ سترہ سو روپیہ ماہوار، مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے، جبکہ سترہ سو ہمارے اس زمانہ میں بھی فوج کے میجر تک کو نہیں ملتے[1]

غالب کا مشہور شعر ہے:-

---

[1] مصنف نے یہ غالب کے ایک خط کے حوالہ (اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۹ بنام منشی حبیب اللہ ذکا) سے لکھا ہے (م-ق)

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

لیکن "ذکرِ غالب" میں جو قطعہ درج ہے، اس میں غالب نے اپنے "مرزباں زادہ" ہونے پر فخر کیا ہے اور صاف لفظوں میں کہا ہے کہ ہمارا آبائی پیشہ زراعت ہے

فنِ آبائے ما کشاورزیست — مرزباں زادۂ سمرقندیم

آخر اس "تضاد" کو کیا سمجھا جائے، شاید یہ کہ غالب کے آباؤ اجداد کاشتکار بھی تھے اور ساتھ ہی شمشیر زن بھی!

کھیت کی کسی کیاری میں ضرورت سے زیادہ پانی بھر جائے تو گاؤں والے کہتے ہیں

"کیاری کا پانی ابھر گیا"

اسی طرح بہت زیادہ کھانا کھانے سے جو قبض ہو کر پیٹ پھول جاتا ہے، تو اس طرح بولتے ہیں:—

"میرا پیٹ ابھر گیا۔ ۔ ۔"

"سیر" ہونے کے معنیٰ میں بھی "ابھرنا" بولا جاتا ہے، ہم اسے اب تک خالص دیہاتی لفظ سمجھتے تھے، اس لئے کہ شہر کے رہنے والوں کی زبانی یہ لفظ ہم نے نہیں سنا ـــــــ مگر غالب نے اس لفظ کو ٹھیک انہی معنیٰ میں استعمال کیا ہے:— "اتنے آم کھاتا تھا، پیٹ ابھر جاتا تھا۔ ۔ ۔" (صفحہ ۱۹۳)

صفحہ (۱۰۰) پر مرزا غالب کے ایک مکتوب (بنام ہرگوپال تفتہ) کا یہ اقتباس ملتا ہے:—

"وہ صاحب کھچڑی کھائی دن بہلائے، کپڑے پھاٹے گھر کو آئے۔ ۔ ۔"

حالانکہ ضرب المثل اس طرح ہے:—

"ٹکڑے کھائے دن بہلائے، کپڑے پھاٹے گھر کو آئے"

اگر غالب نے "کھچڑی" سے کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے تو ضرب المثل میں یہ تصرف گوارا کیا جا سکتا ہے، ورنہ نہیں!

"ذکرِ غالب" بہرحال اردو زبان میں قابلِ قدر اضافہ ہے، اور ہر حیثیت سے اس کتاب کی افادیت مسلّم ہے، ہم جناب مالک رام ایم۔اے کی خدمت میں اس کامیاب تصنیف پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

کوثر و تسنیم "کوثر و تسنیم" از:— آلم مظفر نگری، ضخامت ۲۲۴ صفحات، مجلد، رنگین گردپوش، شاعر اور مقدمہ نگار کی تصویروں کے ساتھ! کتابت و طباعت دیدہ زیب، قیمت چار روپیہ، ملنے کا پتہ:— دار الاشاعت فردوس منزل، مظفر نگر (یو۔پی) بھارت!

حضرت آلم مظفر نگری کا پہلا مجموعۂ کلام "سلسبیل" کئی سال پہلے شائع ہو چکا ہے، اب یہ دوسرا مجموعۂ کلام ـــ "کوثر و تسنیم" ـــ منظرِ عام پر آیا ہے، جناب سجاد علی قادری الہ آبادی (ایم۔اے) نے اس پر مقدمہ لکھا ہے، جس میں شاعر کے مختصر حالاتِ زندگی بھی آ گئے ہیں! آلم صاحب کافی پڑھے لکھے شاعر ہیں، فارسی اور عربی پر عبور رکھتے ہیں یہاں تک کہ علمِ نجوم بھی آپ نے سیکھا ہے! عروض میں بھی مہارت حاصل ہے، اس لئے اُن کا کلام قدرتی طور پر فنی اغلاط سے پاک ہے!

مقدمہ کا یہ جملہ:— "۔ ۔ ۔ اور تسلیم و رضا کی کوئی بھی ایسی منزل نہیں جہاں آپ نے قدم نہ مارا ہو" (صفحہ ۱۳)

دمرف یہ کہ کمزور بلکہ غیر ادیبانہ ہے، "قدم نہ مارا ہو" نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔

جناب آثم مظفر نگری کے کلام میں مجاز و حقیقت کا خوشگوار امتزاج پایا جاتا ہے، اُن کی شاعری کی نمایاں خصوصیت اُس کا "شکوہ" ہے ——— ان شعروں کو پڑھئے اور لطف اُٹھائیے :—

بے پرو بال پڑا ہوں پسِ دیوارِ قفس ۔ یوں بھی آزاد نہ ہو کوئی گرفتارِ قفس

جنوں طرازِ چمن کون ہے خدا جانے ۔ یہ پھول ہیں کہ شگفتہ مزاج دیوانے

شبِ فراق کو جس آنکھ نے نزدیکھا ہو ۔ وہ صبحِ وصل کے جلووں سے آشنا کیا ہو

عشق کو مشورۂ عقل سے کیا نسبت ہے ۔ کارِ آساں کو خدا کے لئے مشکل نہ بنا

بحرِ الفت میں کہاں ٹھیرتی کشتیِ حیات ۔ موج سے موج تو بنتی رہی ساحل نہ بنا

نکھرے گا اور رنگِ گل و یاسمن ابھی ۔ ہے منتظر کسی کی بہارِ چمن ابھی

تجھے آئے گا نہ کبھی نظر پسِ پردہ کون ہے جلوہ گر
تری ہر نگاہ ٹھہر گئی ہے کمالِ نقش و نگار پر

اسے جانے دے اپنی دُھن میں وہ جس راہ جاتا ہو ۔ دچھیڑ اے شورشِ بانگِ درا گم کردہ منزل کو

سالکِ راہِ خودی اس بھید سے واقف نہیں ۔ بیخودی کی راہ میں بھی اک مقامِ ہوش ہے

روح بھی درمیاں سے ہٹ جائے ۔ اُن سے اک راز کہہ رہا ہوں میں

اے شمع بتا، وفا کس سے تو ے گی ۔ تا صبح تو پروانۂ محفل نہ رہے گا

شوخی تو اُن کی دیکھئے جب دل کی خاک سے ۔ کاشن نہ بن سکا تو بیاباں بنا دیا

ہو دل کہ روح نہیں اعتبار کے قابل ۔ ہمارا کوئی محبت میں رازداں نہ بنے

ایک سادہ سی حقیقت کو سُنانے کیلئے ۔ رنگ بھرتے ہیں اضافے مرے افسانے میں

سنبھال جُراَتِ نظارہ اب سنبھال مجھے ۔ کہ دے رہا ہے کوئی دعوتِ جمال مجھے

کمالِ گرم نگاہی تو اُن کا دیکھ لیا ۔ شکستِ شیشۂ دل کا نہیں خیال مجھے

دوسرا رُخ :— انقلابِ صد جنوں پرور مذاقِ دل میں آ ۔ محشرِ طوفاں سکوتِ دامنِ ساحل میں آ (صفحہ ۱)

اوّل تو "انقلابِ صد جنوں پرور" ہی میں بڑا تکلف پایا جاتا ہے ——— پھر "مذاقِ دل میں آ" قافیہ کی پابندی کے سبب کہا گیا ہے، ورنہ کسی چیز کا "مذاق میں آنا" یا "مذاقِ دل میں" آنا اُردو میں نہیں بولتے۔

ہے کیا افراط کیا تفریط کیا حدِ توسط ہے ۔ ہر اک منزل پہ لازم ہے خطِ تحدید اے ساقی (صفحہ ۲)

پورا شعر ہی سراپا "آورد" ہے، "حدِ اوسط" کی جگہ "حدِ توسط" اور مصرعہ ثانی میں "خطِ تحدید" نے شعر کو اور بے مزہ کر دیا۔

سلام اے باعثِ تکوینِ قصرِ چرخِ مینائی ۔ جبیں گھستا ہے تیرے در پہ مُرغِ طورِ سینائی (صفحہ ۲۰)

"مُرغِ طورِ سینا" کا "جبیں گھسنا"، کتنا عجیب لگتا ہے" "پرندوں" کی "جبیں سائی" آج تک نہ دیکھی نہ سُنی۔

ہے بڑی دولت جہاں میں قوتِ علم و عمل ۔ رخ کو ملتا ہے اس سے استعدادِ برمحل (صفحہ ۲۸)

اول تو "روح کو اقتدار ملنا ہی" محلِ نظر ہے، پھر "اقتدار بر محل" میں "بر محل" زاید ہے،

وہ ہوئی جھنکار پیدا تارِ سازِ عشق میں　　　روح میں نغمے بکھر جانے کا موسم آگیا (صفحہ ۴۲)

"روح میں نغمے کا یا کسی چیز کا بکھر جانا" بالکل غلط بلکہ بے معنی ہے! روح دل و دماغ کی طرح اپنے اندر جوف، مکانیت اور گھیر نہیں رکھتی!

عرشِ حیاتِ عشق کا اخترِ شعلہ گیں ہے تو　　　ساز نوائے درد پر نغمۂ آتشیں ہے تو (صفحہ ۴۶) ــــ

نظم "پروانہ") "حیاتِ عشق" کا "عرش" آخر کیا بات ہوئی، اُس پر مستزاد "اخترِ شعلہ گیں"! اس قدر پختہ مشق کے بعد یہ "نو مشقوں" کا سا انداز! حیرت ہے۔

ــہ　تیرا جمالِ سوز ہے تارِ دل میں روشنی نہیں　(صفحہ ۷۴)

"تارِ دل" کے آخری حروف دب رہے ہیں،

غالبؔ جس نظم کا عنوان ہے اُس کا ایک شعر ہے :-

رازِ سربستہ ہے اک تیرا طلسمِ شاعری　　　جدتِ تخئیل میں مشکل ہے تیری ہمسری (صفحہ ۶۴)

"اک" ناگوار تعقید ہے! پھر غالبؔ کی شاعری کو طلسم اور اُس طلسم کو بھی "رازِ سربستہ" کہنا ایک طرح کی ہجوِ ملیح ہے! شاعر کو دانائے راز یا واقفِ اسرار تو کہہ سکتے ہیں مگر اس کی شاعری کو "رازِ سربستہ" کہنے کے یہ معنیٰ ہیں کہ وہ انتہائی پیچیدہ، گنجلک اور نہ سمجھ میں آنے والی ہے، شعر کی تعریف تو اُس کے سلجھاؤ میں ہے چاہے وہ معنی کے اعتبار سے کتنا ہی بلند اور عمیق کیوں نہ ہو۔

کہہ رہی تھی یوں ہمارے چیل یا فخرِ غرور　　　مجھ سا مرغانِ چمن میں کون ہے مولائے فن (صفحہ ۸۶)

"مولائے فن" کی جگہ "دانائے فن" کہنا چاہئیے تھا۔

مقیدہے صداقت انتظامِ وحشت آگیں میں　　　بہاریں گھر گئی ہیں اقتدارِ دستِ گلچیں میں

"انتظامِ وحشت آگیں" سے خود وجدان کو وحشت ہونے لگی، افسوس ہے کہ اس قسم کی نامانوس ترکیبیں آثمؔ صاحب کے کلام میں جگہ جگہ ملتی ہیں ـــــ جن سے سیمابؔ اسکول پر حرف آتا ہے ـــ

تنزل گیر جب ہوتا ہے عالم زندگانی کا　　　صدائے درد بن جاتا ہے نغمہ سازِ ہستی کا

"تنزل گیر" بھلا نہیں لگتا "زوال آمادہ" کا محل تھا۔

دیکھتا ہوں کہ کمی شورشِ پنہاں میں نہیں　　　خاک بھی سلسلۂ چاکِ گریباں میں نہیں (صفحہ ۱۰۱)

دونوں مصرعوں میں بہ ظاہر ربط نہیں معلوم ہوتا۔ "دو لخت" سے ہیں! اگر اس کے یہ معنیٰ لئے جائیں کہ گریبان چاک چاک ہوتے گئے، اس پر بھی شورشِ پنہاں میں کمی نہیں ہوئی ـــــــ تو پھر "خاک" یہاں اُکھڑا اُکھڑا سا لگتا ہے اور اس لفظ سے مفہوم کی صحیح ترجمانی نہیں ہوتی ـــ

بزم گہ مجاز میں کب ہے درود کا خیال　　　عمر گزر گئی تمام آپ کے انتظار میں (صفحہ ۱۰۲)

"درود" اگر کتابت کی غلطی نہیں ہے، تو اس ایک لفظ کے سبب سارا شعر بے مزہ بلکہ مہمل ہو گیا! "بزم" کو "بزم گاہ" ممکن ہے بعض فارسی شعراء استعمال کرتے ہوں مگر احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ "بزم" کے ساتھ "گاہ" نہ بولا جائے۔

یہ کون سے پتنگ کے جلنے کا سوگ ہے ہر شمع بزمِ حسن چراغِ سحر ہے آج (صفحہ ۱۹۲)[۵]

یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے شاعر نے "پتنگ" نہیں "پتنگے" کہا ہوگا ــــ ورنہ "پتنگ" کا شمع سے کیا تعلق ہے، وہ تو اُڑائی جاتی

آپ تو دا فون کو دل کے دیکھ کے چپ ہوگئی پھر تو تنقید جوابِ باغ رضواں کیجئے (صفحہ ۲۰۱)

اس قسم کے "آمدد" کے شعر کو چھانٹ دینا چاہیے تھا۔

بے نیازی تھرتھرا اٹھی مزاجِ حسن میں دل نے جس دم بارگاہِ عشق میں سجدا کیا (صفحہ ۲۰۳)

آخر یہ بات کیا ہوئی؟ شاعر کہنا کیا چاہتا ہے؟ "بے نیازی کا تھرتھرانا" یہ کیا اندازِ بیان ہے! اور یہاں تھرتھری سے کس کیفیت کا اظہار

ساقی نگاہِ لطف کے سب ہی اُمیدوار ہیں دورِ شرابِ لالہ فام جام بہ جام چاہیے (صفحہ ۲۱۱)

دوسرا مصرع خاصہ شگفتہ ہے مگر مصرع اولیٰ میں "ساقی" کے "ی" دب جانے سے شعر کی شگفتگی مجروح ہوگئی۔

یہ قفس کی زندگی کا ہے پیامِ غائبانہ جسے بلبلیں سمجھتی ہیں بہار کا ترانہ (صفحہ ۲۱۶)

ترانۂ بہار کو "قفس کی زندگی کا پیامِ غائبانہ" کہنا، اسی قبیل کی بات ہے کہ :-

گلشن کو باغ میں جانے نہ دینا کہ ناحق خون پروانہ کا ہوگا

ہوائے شعلہ نوازِ محفل کی جنبشوں میں تڑپنے والے (صفحہ ۲۱۸)

"ہوائے شعلہ نوازِ محفل" ــــ توبہ! آخر کیا ترکیب ہے! پھر "جنبشوں میں تڑپنا" اور بھی زیادہ عجیب ہے!

صبر لازم ہے ابھی اے تشنہ کامانِ سرور غم کی باری آئے گی شیشے کے پیالے کے بعد (صفحہ ۱۹۷)

اور ہمیں اس وقت شادؔ عظیم آبادی کا ایک شعر یاد آرہا ہے :-

کہاں سے لاؤں صبرِ حضرتِ ایوبؑ اے ساقی! خم آئے گا، صراحی آئے گی تب جام آئے گا

جنابِ آلمؔ غزل کی طرح نظم گوئی پر بھی قدرت رکھتے ہیں، اُن کی نظمیں زیادہ تر اصلاحی اور اخلاقی ہیں، اس بند

یہ اثر تھا رے اندازِ رجز خوانی میں شعلے اٹھتے ہوئے آتے تھے نظر پانی میں

فقر کی شان بھی قائم تھی جہاں بانی میں جوہرِ عجز نہاں تھا مری سلطانی میں

آج دنیا مری اُمید کی آباد نہیں
یوں کبھی اور بھی اُجڑی تھی مجھے یاد نہیں

اقبال نے داغؔ کا مرثیہ اس انداز سے کہا تھا :-

ہو بہو کھینچے گا حسن و عشق کی تصویر کون اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون؟

آلمؔ نے بھی سیمابؔ کے مرثیہ میں اپنی طبیعت کا کافی زور دکھایا ہے ــــ کہتے ہیں

کون چمکائے گا اب رُخسارِ صبحِ لالہ فام کون سلجھائے گا دستِ فکر سے گیسوئے شام (صفحہ ۱۱۵)

آلمؔ کے یہاں کہیں کہیں ناسخؔ کا رنگ بھی جھلکتا ہے، اور اس قماش کے :-

نگاہِ ناز کا جلوہ کہاں ہے آنکھ کے تل میں ملا رکھا ہے آبِ خضر کو زہرِ ہلاہل میں (صفحہ ۱۵۸)

اشعار بھی موجود ہیں ــــ انھوں نے فارسی غزلیں بھی کہی ہیں اور قدرتِ بیان کا ثبوت دیا ہے! کاش موصوف اپنے مجموعۂ کلام پر ایک تنقیدی

۵؎ "پتنگ" مذکر اور مؤنث دونوں طرح مستعمل ہے۔

جلد ۴ ــــ شمارہ ۴

ماہنامہ

فاران

جولائی سنہ ۱۹۵۲ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپے (پاکستانی) ــــ فی پرچہ ۸ آنے
۸ روپے (ہندستانی) ــــ فی پرچہ ۱۱ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران

کیمبل اسٹریٹ

کراچی نمبر ۱

نظم و ترتیب

صفحہ

حصۂ نظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

چند بہت ضروری باتیں ہم ایک ہی فرصت میں کہ دینا چاہتے ہیں، اور تنہا ہم ہی نہیں چاہتے، خود اُن مسائل کا یہی تقاضا ہے، اس لئے اس شمارے کے نقشِ اول نے ایکبار "نقوش" کی صورت اختیار کر لی ہے

ہاں، اہلِ "بزم" ہے کوئی نقادِ سوزِ عشق
لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے

کیا عجب ہے کہ ان لکیروں میں دوات کی سیاہی کے ساتھ اُمت کے خونِ جگر کی دو چار بوندیں بھی شامل ہو گئی ہوں ؟

انگریز کے دورِ غلامی میں ہم مسلمانوں کی دینی غیرت کا یہ عالم تھا کہ کسی غیر مسلم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں سوءِ ادبی یا گستاخی کی جرات نہ ہوتی تھی اور کوئی مفسد سیاہ باطن اور بے ضمیر ایسا کر گزرتا تھا تو اُس کا "راجپال" جیسا حشر ہوتا تھا، اور اب جبکہ ہمارے پاس حکومت ہے، فوج ہے، طاقت اور اختیار ہے ہماری بے دست و پائی کا یہ عالم ہے کہ رسوائے عالم "فلم انڈیا" کا بے ادب ایڈیٹر — بابو راؤ پٹیل حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی شان میں کھلے خزانے گستاخی کرتا ہے اور دہلی کی ہندو مہاسبھا اس حرکتِ شنیع پر مبارک پیش کرتی ہے مگر ہماری غیرت کو ٹھیس نہیں لگتی اور ہم تماشائی بن کر سب کچھ دیکھ رہے ہیں!

دوسری اذیت کوش خبر یہ آئی ہے کہ امریکہ کے کسی رسالہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرضی تصویر شائع ہوئی ہے —— ہم حکومت پاکستان سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا اُس نے ہندوستان اور امریکہ کی حکومتوں کو اس سلسلہ میں کوئی احتجاجی یادداشت بھیجی؟ اگر بھیجی ہے تو اس کے نتائج سے عوام کو مطلع کیا جائے اور اگر

نہیں بھیجی تو پاکستان کی اسلامی حکومت سے ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ احتجاج کے لئے اس سے زیادہ نازک موقع اور کیا ہو سکتا ہے؟

حکومتِ پاکستان نے جب مسائل کی نزاکت کو محسوس کیا ہے تو اُس نے انگریز قوم اور انگلستان کی حکومت کی ناخوشی کا خیال کئے بغیر لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر فردِ جرم لگانے سے بھی گریز نہیں کیا اور کلکتہ میں جو بنگال کو متحد کرنے کے لئے جدوجہد ہو رہی ہے اور اسکیمیں بن رہی تھیں، تو اُس وقت پاکستانی حکومت نے بھارت گورنمنٹ سے شدید احتجاج کیا تھا؟ کیا ناموسِ رسولؐ کا مسئلہ ان مسائل سے کم اہمیت رکھتا ہے؟ ہم اُن ہوائی جہازوں، بحری بیڑوں، بری فوجوں اور طاقت و اقتدار کو آخر کیا سمجھیں جو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی شان میں گستاخی ہوتی دیکھتے ہیں اور حرکت میں نہیں آتے!

سلطان عبدالحمید خاں —— خلیفہ ترکی —— مسلمانوں کی تاریخ کے ایک بدنام فرمانروا ہیں کہ ہم تک تواتر کے ساتھ یہ روایت ہوئی ہے کہ فرانس میں کسی تھیٹر یکل کمپنی نے ایک ایسے تماشے کا اہتمام کیا ... حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا "کردار" بھی پیش کیا جانے والا تھا، سلطان عبدالحمید خاں ... کو جب ... ملی تو انھوں نے تلوار کو نیام سے نکال کر میز پر رکھ دیا اور فرانسیسی حکومت کے پاس احتجاج بھیجا کہ اگر اس ... روکا گیا، تو پھر "تلوار" اس کا فیصلہ کرے گی، چنانچہ حکومتِ فرانس نے اُس ڈرامہ کو ... کی بارگاہ میں معذرت کی! یہ واقعہ فراست، عبرت، بصیرت اور جرأت کے بہت کچھ داعیات اپنے اندر رکھتا ہے بشرطیکہ ان کو محسوس کیا جائے!

ہم یہ نہیں کہتے کہ امریکہ اور ہندوستان کے خلاف یکایک اعلانِ جنگ کر دیا جائے، مقصد عرض کرنے کا یہ ہے کہ اس سلسلہ میں جو موثر سے موثر صورت ممکن ہو سکتی ہو وہ اختیار کی جائے! اور احتجاج اور احتجاج میں فرق ہوتا ہے، ایک "احتجاج" ہمدردی، لجاجت اور نیازمندی کی سی کیفیت ہوتی ہے اور ایک "احتجاج" میں سرفروشانہ اسپرٹ بولتی ہوئی ہوتی ہے، اور یہاں اسی کا محل ہے، حکومتوں کو بتا دینا چاہیئے کہ ادنیٰ سی ادنیٰ توہینِ رسولؐ بھی برداشت نہیں کی جا سکتی، اگر اس سلسلہ کو نہ روکا گیا، تو حکومتِ پاکستان انتہائی حد تک جانے کے لئے تیار ہے!

بھارت کے مہاسبھائیوں کو ہم جتا دینا چاہتے ہیں کہ وہ بہت ہی خوفناک کھیل کھیل رہے ہیں، اقتدار اور حکومت ہم مسلمانوں کو بھی ملا ہے، ہم بھی انگریز کی غلامی سے آزاد ہوئے ہیں، لیکن کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہم نے ہندوؤں کے کسی مذہبی پیشوا کی شان میں کوئی بے ادبی کی بات کہی ہو، ایسی اوچھی باتوں سے ہمارے مذہب نے ہمیں روکا ہے! اور ہم سمجھتے ہیں کہ اصل ہندو مذہب میں بھی دوسرے مذہب کے پیشواؤں کی توہین کی اجازت نہ ہوگی —— جو حکومت کے نشہ میں سرشار ہو کر مہاسبھائی جن اوچھے ہتھیاروں اور ذلیل حرکتوں پر اتر آئے ہیں، وہ کسی شریف قوم کو ہرگز ہرگز زیب نہیں دیتیں!

حالات سدا آج ہی کی طرح نہ رہیں گے، ظلم کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے، پاپ کا گھڑا بھرتے ہی ڈوب جایا کرتا ہے اور ایت چار کی ناؤ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتی، تاریخ میں یہ واقعات محفوظ ہیں اور سورج کی آنکھ گواہ ہے کہ ابولہب، عتبہ، شیبہ اور ابوجہل —— جنھوں نے رسول اللہؐ کی توہین کی تھی —— خاک و خون ہی میں دم توڑتے ہوئے دیکھے گئے! انسانیت کے محسنِ اعظمؐ کی توہین کر کے کوئی قوم پھل نہیں پا سکتی اور یہ وہ جرم ہے جس کو نہ خدا بخشتا ہے

اور نہ مسلمان معاف کر سکتے ہیں!

سول اینڈ ملٹری گزٹ کے "فقیہ" (؟) ایڈیٹر نے "شراب" کے سلسلہ میں جن خیالات کو پیش کیا ہے، اور شریعت اور تاریخ اسلام کی جس واقفیت کا ثبوت دیا ہے وہ کوئی راز نہیں ہے، ہر بات منظرِ عام پر آچکی ہے! ان مضامین کو ہم نے پڑھا اور ہم حیران رہ گئے کہ اس پاکستان میں "اسلام" کی اس انداز سے نمایندگی کرنے والے بھی پائے جاتے ہیں، جن کو نہ اسلام کے وقار کا پاس ہے، نہ اسلامی شریعت کی اسپرٹ کی خبر ہے اور نہ قرآن حدیث اور اسلامی تاریخ سے آگاہی ہے، جو اپنے مخصوص تصورات و افکار رکھتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ انھیں کو عینِ اسلام "سمجھا جائے" اور جو کوئی اُن پر تنقید کرتا ہے وہ تنگ نظر "ملّا" ہے اور "ملّا"، بہر حال گردن زدنی ہے کہ وہ فتنہ و فساد ہی پھیلانا جانتا ہے اور اُس سے خیر کی توقع ہی رکھنا حماقت ہے!

یہ کیسی بے دانشی بلکہ ظلم ہے کہ لوگ نئے نئے فتنے خود کھڑے کرتے ہیں اور دوسروں پر اُلٹی تہمتیں دھرتے ہیں، یعنی وہ جو کچھ جی میں آئے، بکے اور لکھے جائیں مگر کوئی دوسرا زبان کھولے تو وہ جاہل ہے، تنگ نظر ہے، ملّا ہے۔

وہ حکومتِ پاکستان جس نے فتنہ و فساد کے خطرے اور "پبلک سیفٹی" میں خلل اندازی کے اندیشہ کے سبب کچھ لوگ مقدمہ چلائے بغیر جیلوں میں نظر بند کر رکھے ہیں، اُس سے ہم دریافت کرتے ہیں کہ اُس نے سول اینڈ ملٹری گزٹ (کراچی) کے ایڈیٹر سے ان مضامین پر کوئی ہلکی سے ہلکی باز پرس بھی کی! کیا یہ مضامین عوام کے اخلاق کو بلند کرنے والے تھے؟ کیا ان مضامین میں وہ "اسپرٹ" نہیں پائی جاتی جو عوام کی فکر و توجہ کو اُس راہ پر ڈال سکتی ہے، جہاں پاکیزگی اور نیکوکاری کا تصور دُھندلا پڑ جائے اور بُرائیوں اور گناہوں کے لئے "گنجایش" پیدا ہو جائے۔

زبان و قلم کی آزادی کا ہم سے بڑھ کر شاید ہی کوئی دوسرا مویّد ہو مگر بد لگامی اور آزادی میں فرق ہے، کل کوئی یہ بھی لکھ سکتا ہے کہ اسلام میں "زنا" بیشک حرام ہے مگر اسلام نے زناکاری کے اڈوں پر کوئی پابندی نہیں لگائی، اور اہلِ قلم کی ذہانت اس کے لئے کچھ دلیلیں بھی تراش سکتی ہے اور تاریخی ثبوت بھی فراہم کر سکتی ہے، کہنے والوں نے صریحاً جھوٹی باتیں کہی ہیں اور اُن کے لئے دلیلیں بھی پیش کی ہیں!

جس ذہنیت کا مظاہرہ سول اینڈ ملٹری گزٹ کے صفحات پر کیا گیا ہے، وہ اپنے پیچھے مخصوص افکار رکھتی ہے، اُس کا ایک "پس منظر" ہے! اور اس "پس منظر" میں عورتوں کی بے حجابی، مرد و زن کا بے باکانہ اختلاط، کلب گھر کی قماربازی، گھوڑ دوڑ کی شرطیں، رقص و سرود کے جلسے اور "آرٹ" کے نام پر ہر طرح کی بے حیائی شامل ہے! جس طرح چور کسی مکان میں کنکری پھینک کر یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ کوئی جاگ تو نہیں رہا ہے، اور جب اُس کنکری پر کوئی گھر والا نہیں چونکتا تو گھر کا سارا مال، اسباب وہ باندھ کر لے جاتے ہیں ——— تو ان "مضامین" کے ذریعہ مسلمانوں کی غیرت کا اندازہ لگایا گیا ہے کہ وہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے، اگر سو رہی ہے اور ان خیالات پر کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں ہوتی تو پھر غیرت و حمیت کی بچی کھچی متاع کی بھی خیر نہیں آئینی ملازم " کی آڑ میں ایک ایک اسلامی شعار کو نشانہ بنایا جائے گا اور ایک ایک دینی روایت کی ہنسی اڑائی جائے گی ——— یہاں تک کہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات اُتر جائے کہ اس ترقی کے دور میں اسلام کے ہیرو صدیق و فاروق و عثمان و علی (رضی اللہ عنہم) نہیں رضا شاہ پہلوی اور مصطفےٰ کمال ہو سکتے ہیں!

ایک مسلمان جس کے دل میں، اسلام اور اُس کے احکام کا ذرا سا بھی احترام ہے، جو کتاب و سنت سے تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتا ہو، اُس کے زبان و قلم سے ایسی بات نکل ہی نہیں سکتی جس سے کسی ایسی چیز کی تجارت، اشاعت اور مقبولیت کو ذرا سی بھی مدد ملتی ہو، جس کو اسلام نے ناجائز اور "رجس من عمل الشیطان" قرار دیا ہے، سوچنے کا یہ انداز ہی جاہلانہ اور غیر اسلامی ہے، تاریخی نکتہ آفرینیوں اور فلسفیانہ موشگافیوں کے لئے اور بہت سے میدان پڑے ہیں، غریب اسلام کو اس ذہانت اور زورِ قلم کا نشانہ کیوں بنایا جاتا ہے؟

عوام مسلمانوں کو اس قسم کے "مصلحین" سے باخبر اور ہوشیار رہنا چاہئے کہ کون کس بھیس میں نمودار ہوتا ہے! دین میں یہ دراندازیاں چشم پوشی کے قابل نہیں ہیں!

مسلمانوں کے تمام فرقے اس پر متفق ہیں کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر نبوت ختم ہوگئی اور اب قیامت تک کوئی نبی پیدا نہ ہوگا، قرآنِ پاک، احادیثِ رسول اور خود اُمت کا ساڑھے تیرہ سو سالہ اجماع اس پر شاہد ہے! اُمتِ مسلمہ پر کیسے کیسے نازک وقت آئے ہیں، عقاید و اعمال کے خود مسلمانوں میں کیسے کیسے شدید فتنے اُٹھے ہیں، دینِ اسلام کو کس کس مظلومیت کے دور سے گزرنا پڑا ہے ——— ان حالات میں دین کی تجدید و احیاء کے لئے حضرت امام ابن تیمیہ، حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ جیسے مُصلحِ اُمت پیدا ہوئے جنھوں نے دین کو زندہ کیا اور جن کے تجدیدی کاموں کی بدولت اسلام کو غلبہ نصیب ہوا اور گمراہیوں اور بدعتوں کا زور ٹوٹ گیا، ان میں سے کسی بزرگ نے کسی قسم کی ——— ظلی یا بروزی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا اس لئے کہ یہ نفوسِ قدسیہ دین میں فتنہ پیدا کرنے اور اُمت کو متفرق کرنے کے لئے نہیں بلکہ دین کی خدمت کے لئے آئے تھے، اُن کا فریضہ انتشار نہیں اجتماع تھا، ان کی ڈیوٹی ہی یہ تھی کہ ملت کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو مجتمع کر دیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم کو ان بزرگوں نے چراغِ ہدایت جانا اور کتاب اللہ کے بعد سنتِ نبوی ہی کو معیارِ حق و صداقت سمجھا!

ایک طرف مجددین اور صلحاءِ اُمت کی یہ روش ——— اور دوسری طرف اُنیسویں صدی عیسوی کے وسط میں "مرزا غلام احمد" نام کا ایک شخص پنجاب میں پیدا ہوتا ہے، جو اپنی "نبوت" کا ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتا ہے اور اپنے متبعین اور ماننے والوں کے سوا دوسرے مسلمان کو کافر اور خارج از دین کہتا ہے، کچھ لوگ دینِ اسلام سے ارتداد اختیار کر کے اُس "مدعی نبوت" کے ساتھ ہو لیتے ہیں، اور محمد رسول اللہ کی اُمت کے توڑ پر ایک دوسری (قادیانی) امت "ظہور میں" آجاتی ہے! یہ انگریزی حکومت کی قہرمانی کا دور ہے، اس زمانہ کے نبی اور مامور من اللہ مصلح کی سب سے بڑی صفت یہ ہونی چاہئے تھی کہ وہ انگریزی حکومت کی مخالفت میں اپنی تمام قوتیں صرف کر دیتا، مگر اس کے برخلاف مرزا غلام احمد کو ہم انگریزی حکومت کا مدح خواں پاتے ہیں، ملکہ وکٹوریہ کی شان میں قصیدہ خوانی کی جاتی ہے اور انگریز کی وفاداری اور نیاز مندی کی تلقین فرمائی جاتی ہے!

مسلمانوں کے تمام فرقے متفقہ طور پر اس "مدعی نبوت" کے دعوے کی تردید کرتے ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتیوں میں ایک عام برہمی پائی جاتی ہے، مگر انگریز کی پشت پناہی، طرفداری اور سرپرستی اس برہمی کے لئے سپر بن جاتی ہے، ایسا "نیاز مندی" اور اتنی "وفادار امت" ہر حکومت کو کہاں میسر آتی ہے!

عیسائیت کی خوشی کے بارے ہی چھیں کھلی جا رہی ہیں کہ محمد عربی (فداہ ابی و امی) کی نبوت کی مخالفت اور آپ کی اُمت کی دشمنی میں صلیبی جنگیں جو کام انجام نہ دے سکی تھیں، وہ کام "قادیان کے "نبی" (؟) نے انجام دے دیا ۔۔ ـــــــ یہاں تک کہ "قادیانی امت" کا یہ پودا انگریز کے سایہ عاطفت میں پروان چڑھا بلکہ برگ و بار لایا۔

مسلمانوں کے تمام فرقوں کا اعلان تھا کہ، وہ لوگ جو مرزا غلام احمد کو نبی مانتے ہیں، ہم میں سے نہیں ہیں، یہ ایک بالکل جداگانہ فرقہ ہے، اُمت "نبوت" سے بنتی ہے، جب مرزا غلام احمد "نبی" ٹھیرے تو اُن کے ماننے والے محمد رسول اللہ کی اُمت میں کس طرح شمار کئے جا سکتے ہیں، مگر انگریز کی پالیسی یہ تھی کہ قادیانیوں کو مسلمانوں کا ایک فرقہ سمجھا جائے، چنانچہ انگریز نے اسی اسکیم کے تحت چودھری ظفر اللہ خاں کو حکومت ہند کی کابینہ میں شامل کر لیا، اور اس نے اس کیلئے فضا پیدا کر دی لوگ ایسا سمجھنے لگیں کہ چودھری صاحب کو ایک "مسلمان وزیر" کی حیثیت سے کابینہ میں شامل کیا گیا ہے! انگریز "اصولی" مسلمانوں پہنچانے کے طریقوں میں مہارت رکھتا تھا، اور اپنے اس "فرض" سے آج بھی غافل نہیں ہو

انگریز شخصیتوں کے گرانے اور چڑھانے کے فن میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا، اس نے لوگوں کے ذہن و فکر کو مرعوب کر دیا کہ چودھری ظفر اللہ خاں "قانون" اور "دستور" کے معاملات میں اپنا جواب نہیں رکھتے! چنانچہ اسی مرعوبیت کا نتیجہ تھا کہ پاکستان اور ہندوستان کی سرحدوں کے تصفیہ کے لئے جو "باؤنڈری کمیشن" مقرر ہوا، اس میں سر ظفر اللہ خاں (بالقابہ) پاکستان کی نمایندگی اور وکالت کرتے نظر آتے ہیں! سر ریڈ کلف کے سامنے جب یہ مسئلہ پیش تھا تو پاکستان کے متعہد وزیر اعظم جناب لیاقت علی خاں مرحوم سے اُن کے ایک رفیق کار نے کہا تھا کہ ضلع گورداسپور جس میں "قادیان" واقع ہے، پاکستان میں نہیں رہ سکتا۔ یہ بظاہر ایک نہایت ہی بعید از قیاس پیش گوئی تھی مگر اس کو کیا کیجئے کہ یہ پیش گوئی ایک حقیقت بن کر رہی ضلع گورداسپور کی بعض تحصیلوں میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہونے کے باوجود اس ضلع کو پاکستان سے علیحدہ ہو جانا پڑا ـــــــ اور ہو جانا نہیں پڑا، ایسا کر دیا گیا لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندؤں کو خوش کرنا چاہتے تھے اور چلتے چلاتے مسلمانوں کو نقصان پہونچانا مقصود تھا، اور پاکستان کی طرف سے وکالت خود انگریزوں کے نیاز مند چودھری ظفر اللہ خاں فرما رہے تھے لہٰذا وہی نتیجہ ظہور میں آیا جس کی اس قسم کی "نمایندگی" سے امید ہو سکتی تھی!

"ریڈ کلف ایوارڈ" سے لیکر اب تک جتنے معاملات میں چودھری ظفر اللہ خاں صاحب نے نمایندگی کی ہے، ان میں سے کوئی معاملہ بھی سلجھتا تو کیا اور اُلجھتا اور بگڑتا ہی چلا جا رہا ہے، فلسطین کے مسئلہ میں اُن کی تقریروں کی بڑی دھوم تھی، کہا یہ گیا تھا کہ چودھری صاحب نے اتنی اتنی دیر تک تقریریں کیں کہ مجلس اقوام کے گزشتہ ریکارڈ کو توڑ دیا، مگر فلسطین تقسیم ہو کر رہا اور تمام دنیا کے مسلمانوں کے علی الرغم یہودیوں کی حکومت بنوا دی گئی!

کشمیر کا مسئلہ بھی ہمارے سامنے ہے، اس مسئلہ میں بھی پاکستان کو اسی "نمایندگی" کی "برکات" (؟) حاصل ہیں جس نمایندگی نے "ریڈ کلف ایوارڈ" میں اُس کو نہایت کاری زخم پہونچایا تھا۔ کمیشن پر کمیشن آتے چلے جا رہے ہیں لیکن یہ گتھی نہیں سلجھ رہی ہے، سلجھے کس طرح؟ اس کو اُلجھایا گیا ہے۔ جتنی تاخیر ہو رہی ہے اُسی قدر بھارت کی پوزیشن مضبوط اور پاکستان کا موقف کمزور ہوتا جا رہا ہے!

یہ بھی ہماری وزارت خارجہ کا کارنامہ ہے کہ افغانستان سے ہمارے تعلقات ناخوشگوار اور کشیدہ ہیں!

افغانستان جس سے ہمیں مساعدت کی توقع تھی، اور بجا توقع تھی، وہ ہماری مخالفت پر آمادہ ہے، اس کشیدگی کا آخر کون ذمہ دار ہے؟ اور افغانستان ہی پر کیا موقوف ہے ہمیں تو کوئی مغربی طاقت اپنی طرفدار نظر نہیں آتی انگلستان اور امریکہ جس جس طرح سے بھارت کی دل دہی کی کوشش کرتے رہتے ہیں وہ کوئی راز نہیں ہے، سب جانتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے؟

خارجی معاملات روز بروز اُلجھتے چلے جا رہے ہیں اور جب تک وزارت خارجہ پر چوہدری ظفر اللہ خاں بہادر مسلط ہیں، خارجی مسائل پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہی ہوتے رہیں گے، پاکستان بڑے خطرے میں گھرا ہوا ہے، اس دام ہم رنگِ زمیں کے حلقوں کو مضبوط تر بنایا جا رہا ہے۔

اوپر کہا جا چکا ہے، اور ہم نے اپنی طرف سے نہیں کہا مرزا غلام احمد قادیانی کی کتابیں اس پر گواہ ہیں کہ مرزا صاحب کی نبوت کا آغاز ہی انگریز کی وفاداری اور نیازمندی سے ہوا ہے، اس "فرقہ" کو برطانیہ اور نصرانیوں کی سلامرپستی حاصل رہی ہے اور آج بھی لندن اور واشنگٹن سے لیکر ربوہ تک یہ جال پھیلا ہوا ہے ——— چرچل اور ٹرومین کی ہدایات، مرزا بشیر الدین محمود خلیفہ قادیان کی "برکت" اور "دعائیں" اور چوہدری ظفر اللہ کی "دستوری قابلیت" اور "سیاسی بصیرت" اسی اتحاد اور گٹھ بندھن نے پاکستان کے خارجی مسایل کو عجیب چیز بنا دیا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ پاکستان "اسلام" کے نام پر بنا ہے اُس اسلام کے نام پر جس کے آخری نبی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے نبوت کو ختم فرما دیا یہاں جو دستور بنے گا یا بن رہا ہے، اور جسے عوام مسلمان قبول کریں گے اُس کی بنیاد کتاب و سنت ہوگی، اور سنت سے مراد مرزا غلام احمد قادیانی کے قول و فعل نہیں بلکہ حضرت سیدنا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال مراد ہیں، تو ایک قادیانی اُس مملکت سے کس طرح خوش ہو سکتا ہے اور اس کی سربلندی کیلئے جد و جہد کر سکتا ہے جس کا دستور اُس کے پیشوا کی "نبوت" کی قطعاً نفی کرتا ہو!

مرزا غلام احمد کو نبی ماننے والا شخص ہندو، عیسائی، یہودی، بودھ، پارسی اور جینی کو نہیں، محمد رسول اللہ (ہماری جانیں آپ پر قربان ہوں) کے اُمتیوں کو اپنا اصلی "حریف" سمجھتا ہے، قادیانی اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلمان ان کو کافر سمجھتے ہیں، اور وہ قادیانی جماعت مسلمانوں کا کوئی فرقہ نہیں ہے، وہ ایک الگ "اُمت" ہے، جس کے نبی "مرزا غلام احمد" ہیں، اس لئے اُن کے "صحابہ" "ام المومنین" "امیر المومنین اور "خلفاء" بھی دوسرے ہی افراد ہیں ——— ان عقاید کی موجودگی میں چوہدری ظفر اللہ خاں سے پاکستان کی فلاح و سربلندی کیلئے جد و جہد کرنے کی توقع رکھنا ہی حماقت ہے، اُن کی ذات سے پاکستان کو نقصان تو البتہ پہونچ سکتا ہے اور پہونچ رہا ہے مگر فائدہ نہیں پہونچ سکتا!

چوہدری ظفر اللہ خاں صاحب وزارت خارجہ کے علاوہ قادیانی مذہب کی تبلیغ کا فرض بھی انجام دیتے ہیں اس طرح غریب پاکستان دوگونہ عذاب میں مبتلا ہے، جو وہ مہینوں ممالک غیر میں جا کر رہتے ہیں تو اس سیر و سیاحت و نقل و حرکت کا بہت بڑا حصہ قادیانیت کی تبلیغ میں صرف ہوتا ہے ——— ہم کہتے ہیں کہ ایک قادیانی کی حیثیت سے جو کچھ وہ کرتے ہیں درست کرتے ہیں، اُن کو اپنے مذہب اور اپنے نبی سے عشق ہے، اُن کو ایک وفادار اور مخلص

قادیانی ـــــ مرزائی ـــــ یا احمدی کی حیثیت سے ہی کچھ کرنا چاہیئے تھا ـــــ پاکستان کے گورنر جنرل، وزیر اعظم یا کابینہ کے احکام کو مرزا بشیر الدین محمود خلیفہ قادیان کے احکام پر وہ ترجیح کس طرح دے سکتے ہیں نہیں دے سکتے، یہ اُن کے مذہب، ایمان اور آخرت کے بننے بگڑنے کا معاملہ ہے!

یہ وہ شواہد، حقائق اور واقعات ہیں جن کی بُنیاد پر ہم حکومت پاکستان سے پُر زور مطالبہ کرتے ہیں کہ چوہدری ظفر اللہ خاں کو جلد از جلد وزارتِ خارجہ کے عہدے سے سبکدوش کر دیا جائے، اس معاملہ میں جتنی تاخیر ہوگی اُتنی ہی مضرتیں بڑھتی اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی چلی جائیں گی!

یہ بھی محض پروپیگنڈا ہے کہ چوہدری صاحب "قانون و دستور" کے ماہر ہیں، اگر یہ بات اپنی جگہ درست بھی ہو تو ہم ایسی قانونی مہارت اور دستوری قابلیت کو لیکر کیا کریں جس نے پاکستان کی سیاست خارجہ میں مشکلات پیدا کر دی ہوں اور جس نے ہمارے معاملات کو سنوارنے کے بجائے اور بگاڑ دیا ہو، اس عذاب کو سہتے سہتے پانچ سال ہوگئے، بہت تجربے کر کے دیکھ لئے، اب تو اس سے قوم اور ملک کو چھٹکارا مل جانا چاہیئے!

یہ درست ہے کہ چوہدری ظفر اللہ خاں برطانیہ اور امریکہ کے "محبوب" ہیں مگر اس محبوبیت کے لئے کیا ہم اپنا خسارہ کریں، آخر ہم کب تک برطانیہ اور امریکہ کی نازبرداریاں کرتے رہیں گے، ہمیں جرأت کے ساتھ قدم اٹھانے کی ضرورت ہے، اس عالم جد وجہد میں "نیاز مندی" اور احساس کمتری سے کام نہیں چلتا، یہاں وہ "کمزور" ہی زندہ رہ سکتے ہیں جو اپنے سے "قوی تر" سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکیں۔

یہ پاکستان کے مسلم عوام کا مطالبہ ہے، یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک اُمتی کے دل کی آواز ہے، اس مطالبہ کو "احتجاج" کی حد تک پہونچنے سے پہلے ہی حکومتِ پاکستان کو اپنا فرض پہچاننا چاہیئے اسلام اور پاکستان کا مفاد ہر شخصیت کے مفاد سے بلند ہے!

"دستور" بنائیے!

ماہ جون ۵۲ء کے شمارے میں ہم وہ آٹھ نکات پیش کر چکے ہیں، جن کی روشنی میں دستور ساز اسمبلی پاکستان سے ۱۹۵۲ء کے ختم ہونے تک دستور بنانے کا مطالبہ کیا گیا ہے؟

دستور ساز اسمبلی تک ہم پاکستان کے عوام مسلمانوں کی یہ آواز پہونچا دینا چاہتے ہیں کہ دستور کی تسوید و ترتیب میں اب مزید تاخیر ہرگز گوارا نہیں کی جا سکتی!

یقین ہے دستور ساز اسمبلی اپنے فرض کی تکمیل میں تساہل سے کام نہ لے گی، پاکستان دستور ساز اسمبلی سے ہم تلافی مافات کی قوی توقع رکھتے ہیں!

بابر کرلے در رکا
۲۲ ...

ترجمہ: طاسین
رفیق دارالعروبہ

دین اور سوسائٹی

مسیحیت اور اسلام میں

زیر نظر مضمون، مصر کے مشہور اہل قلم سید قطب کی کتاب العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام (اسلام میں اجتماعی عدل) کے پہلے باب کا ترجمہ ہے۔ محرم سنہ ۷۱ھ کے ترجمان القرآن میں استاذ مکرم مولانا مسعود عالم ندوی نے اس کتاب پر تفصیلی تبصرہ فرمایا ہے۔ زیر نظر ترجمہ سے بھی کتاب کی اہمیت اور اس کے موضوع کی افادیت کا ایک سرسری اندازہ ہو سکتا ہے۔ مترجم

معاش و اقتصاد کی دنیا میں کبھی ایسا نہیں دیکھا گیا، کہ کسی شخص کے پاس مال جمع ہو، لیکن اس کے باوجود وہ اس سے آنکھیں بند کرکے، قرض کے لئے ہاتھ پھیلائے۔ نہ کسی ایسی حکومت کا تصور کیا جاسکتا ہے، جو اپنے خزانوں کو دیکھے بغیر اور بے جانچے بغیر کہ اس کے ہاں خام مال کی کیا مقدار ہے اور وہ خود کیا کچھ پیدا کر سکتی ہے، باہر سے دھڑا دھڑ مال درآمد کرتی جائے۔ انسانی زندگی میں جب مادی مال و اسباب کا یہ حال ہے، کہ ان کا اندازہ لگایا جاتا اور نہیں دیکھی بھالا جاتا ہے، تو جائے غور ہے، کہ کیا ہمارا روحانی سرمایہ، اور عقل و فکر کی متاع ہی ایسی چیزیں ہیں کہ ان کا جائزہ نہ لیا جائے؟ اور کیا قلب و ضمیر کی مقدس وراثتیں ہی اس قابل ہیں کہ ہماری بے توجہی کا شکار ہو کر رہ جائیں؟

مصر، بلکہ پورے عالم اسلام میں آج ہمارا یہ حال ہو گیا ہے، کہ ہم سمندر پار کے طریقوں کو اپناتے ہیں، اور ان کے اصول مستعار لیتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں اور طریقوں کی درآمد سے قبل، اس کی ضرورت تک محسوس نہیں کرتے کہ اپنے روح و ضمیر کے سرمایہ کو بھی دیکھیں، اور اپنی عقل و فکر کی متاع کا بھی جائزہ لیں۔

ہم اپنی سوسائٹی کو دیکھتے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ زوال کی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اپنے اجتماعی طور طریقوں کو جانچتے ہیں، اور یہ پاتے ہیں کہ عدل و انصاف سے انھیں کوئی علاقہ نہیں۔ اس کے بعد فوراً ہماری نظریں یورپ، امریکہ اور روس کی طرف اٹھتی ہیں، اور وہیں سے ہماری امیدیں بندھتی ہیں۔ چاہتے ہیں کہ اپنی معاشی ضرورتوں کے سامان کی طرح، ان مشکلات کا حل بھی وہیں سے پائیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ سامان کی درآمد سے قبل ہم اپنے پرانے ذخیروں کو دیکھتے ہیں، بازار میں موجود چیزوں کا جائزہ لیتے ہیں اور اس کا اندازہ کرتے ہیں کہ خود ہم کیا کچھ پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن اصول و قوانین اور طور طریقوں کی درآمد سے قبل، ہم اس ساری دیکھ بھال اور احتیاط کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ جمہوریت، سوشلزم اور کمیونزم کے ان اصولوں کو اپنانے کے لئے، ہم بڑی آسانی

کے ساتھ اپنی ساری روحانی وراثتوں اور فکری اصولوں کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ ہمارے اپنے اصول و نظریات میں، مشکلات کا جو حل ہم پا سکتے ہیں، ان سب کو یک قلم نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اور ان باہر سے درآمد کردہ اصولوں پر تکیہ کرتے ہیں۔ خواہ ہمارے طور طریقے، ہمارے ظروف و حالات، ہماری تاریخ اور ہماری زندگی کی فکری و مادی بنیادیں ان سمندر پار ملکوں کے حالات سے کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔

ہم اسلام کو "حکومت کے دین" کی حیثیت دیتے ہیں، اور اگر اسلام کے حامی و داعی کی حیثیت سے پیش نہ بھی ہوں، تو کم از کم ذاتی طور پر اپنے مسلمان ہونے کے مدعی ہیں۔ لیکن ہماری عملی زندگی میں ہمارے دین کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ زندگی کے عملی میدان سے اس کا رشتہ کاٹ کر، ہم اسے روحانیت کے گوشۂ عافیت میں محدود کر دیتے ہیں۔ عملی زندگی کے بارے میں اس کے پاس کوئی فیصلہ نہیں۔ دنیا کے مسائل میں اس کا کوئی دخل نہیں۔ اور اس کی مشکلات کا اس کے پاس کوئی حل نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دین خدا اور بندہ کے ذاتی تعلق کا نام ہے اور بس۔ رہی لوگوں کے آپس کے تعلقات، سوسائٹی کے مسائل، زندگی کی مشکلات، نظام حکومت اور مالی پالیسی، تو نہ دین کا ان سے تعلق، نہ انھیں دین سے واسطہ۔ یہ تو ہوا ان لوگوں کا موقف جو دین کے یکسر منکر نہیں ہیں۔ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ایک اور گروہ ہے، جو صاف صاف کہتا ہے کہ یہ کیا دین، و مذہب کی رٹ لگائے جا رہے ہو۔ مذہب تو ایک افیون ہے، جس کو سرمایہ داروں اور ارباب اقتدار نے محنت پیشہ طبقوں اور محروم و بیکس عوام کو بیوقوف بنانے کے لئے اپنا آلۂ کار بنا لیا ہے۔

کہاں اسلام کا مزاج، اس کی تاریخ اور یہ عجیب و غریب نظریات!

حقیقت یہ ہے کہ یہ نظریات بھی اور دوسری چیزوں کی طرح سمندر پار ہی سے "درآمد کردہ ہیں"

دین اور دنیا کی تفریق کا یہ قصہ اسلامی مشرق کا پیدا کردہ نہیں۔ اسلام اور اس کی تعلیمات سے اسے قطعاً کوئی علاقہ ہی نہیں۔ مذہب کی "افیونیت" کی یہ داستان بھی اس دین کی پیداوار نہیں، نہ اس کی طبیعت سے یہ میل کھاتی ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ یہ سب طوطوں کی رٹ ہے یا مداری کی ڈگڈگی پر بندر کا ناچ۔ ہم نے کبھی کوشش نہیں کی کہ ان نظریات کی اصل اور بنیاد کو دیکھیں اور یہ معلوم کریں کہ یہ کہاں سے پیدا ہوئے ہیں اور کن حالات میں پیدا ہوئے ہیں۔ آج کی صحبت میں ہم اسی کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

مسیحیت، رومی شہنشاہیت کے سایہ میں پروان چڑھی اور ایسے وقت میں پروان چڑھی، جبکہ یہودیت اپنی قوت حیات کھو بیٹھی تھی، اور چند بے جان رسموں اور بے روح اور خالی خولی مظاہروں کو مجموعہ بن کر رہ گئی تھی۔ رومی شہنشاہیت کے اپنے مشہور قوانین تھے، جو آج تک جدید یورپ کے تمام قوانین کا سرچشمہ مانے جاتے ہیں۔ اس کی سوسائٹی کے اپنے خاص اصول اور طریقے تھے، جس پر وہ چل رہی تھی۔ اس طرح مسیحیت کو اس کی ضرورت نہیں پڑی، اور نہ یہ اس کے بس کی بات تھی، کہ مضبوط بنیادوں پر قائم روما کی اس سلطنت کے لئے، یا اس کی اس تربیت یافتہ سوسائٹی کے لئے قوانین اور طریقے مقرر کرے۔ اسے ضرورت تھی تو اس بات کی اور اس کے بس میں بھی تھا تو صرف اس قدر کہ روحانی شائستگی اور پاکیزگی کے وعظ کہے، یہودیت کی بے جان رسموں اور خالی خولی مظاہروں پر تنقید

کرے اور اسرائیل کے بے روح ڈھانچے میں پھر سے زندگی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔
مسیح علیہ السلام صرف روحانی پاکیزگی، قلبی رافت اور عفت وزہد کے داعی بن کر آئے تھے۔ اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی زندگی کے لئے انھوں نے بس ضمناً ہی کچھ اشارے کئے ہیں۔ ان کے مختلف اقوال وافعال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دین کے علمبردار کاہنوں اور کاتبوں کے تقلیدی بندھنوں اور قوانین کے قائل نہیں تھے اس لئے کہ یہ سب ظاہری اعمال تھے، اور ان کا کام باطن اور روحانیت سے متعلق تھا۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ نے اپنے شاگردوں کے لئے بنی اسرائیل کے سبت کا دن جائز قرار دیا تھا ہر وہ چیز جو منہ میں جائے حلال تھی، اسلئے کہ وہ ناپاک نہیں کرتی، بلکہ منہ سے جو دھوکہ جھوٹ اور فسق کی باتیں نکلتی ہیں، وہی آدمی کو ناپاک کرتی ہیں۔
یہودیوں کے روزہ کے دنوں میں افطار مباح قرار دیا تھا۔ ایک جرم کا اعتراف کرنے والی زانیہ آپ کے سامنے پیش ہوئی تو آپ نے اسے سنگسار نہیں کیا، بلکہ فرمایا کہ موسیٰؑ کی شریعت کے مطابق جو سنگسار کرنے والے ہوں گے وہ بھی گناہ سے خالی نہیں۔ ان کا ارشاد ہے :۔
" تم سن چکے ہو کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں، کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مار دے، دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کرکے تیرا کرتہ لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے۔ اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے، اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔" (انجیل متی ب ۵ - ۳۸ تا ۴۱)
یہی روح ہے جو حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک اور ارشاد میں نظر آتی ہے فرمایا :۔
" تم سُن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ خون نہ کرنا اور جو کوئی خون کرے گا، وہ عدالت کی سزا کے لائق ہوگا۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنے بھائی پر غصے ہوگا وہ عدالت کی سزا کے لائق ہوگا۔ اور جو کوئی اپنے بھائی کو پاگل کہے گا وہ صدر عدالت کی سزا کے لائق ہوگا۔ اور جو کوئی اس کو احمق کہے گا وہ آتش جہنم کا سزاوار ہوگا۔ پس اگر تو قربان گاہ پر اپنی نذر گزرانتا ہو اور وہاں تجھے یاد آئے کہ میرے بھائی کو مجھ سے شکایت ہے تو وہیں قربان گاہ کے آگے اپنی نذر چھوڑ دے اور جاکر پہلے اپنے بھائی سے ملاپ کر۔ تب آکر اپنی نذر گزران۔ جب تک تو اپنے مدعی کے ساتھ راہ میں ہے، اس سے جلد صلح کرے۔" (انجیل متی - ب ۵ - ۲۱ تا ۲۵)
پھر آگے چل کر فرماتے ہیں :۔
" تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ زنا نہ کرنا لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جس کسی نے بُری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ کی، وہ اپنے دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا۔ پس اگر داہنی آنکھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اسے نکال کر اپنے پاس سے پھینک دے۔ کیونکہ تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ تیرے اعضاء میں سے ایک جاتا رہے، اور تیرا سارا بدن جہنم میں نہ ڈالا جائے۔" (انجیل متی - ب ۵ - ۲۷ تا ۳۰)
اور یہ بھی ارشاد فرمایا :۔
" پھر تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ جھوٹی قسم نہ کھانا، بلکہ اپنی قسمیں خداوند کے لئے پوری کرنا۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ بالکل قسم نہ کھانا۔ نہ تو آسمان کی، کیونکہ وہ خدا کا تخت ہے، نہ زمین کی کیونکہ وہ اس

کے پاؤں کی چوکی ہے، نہ یروشلیم کی کیوں کہ وہ بزرگ بادشاہ کا شہر ہے۔ نہ اپنے سر کی قسم کھا کیوں کہ تو ایک بال کو بھی سفید یا کالا نہیں کر سکتا۔ بلکہ تمہارا کلام ہاں ہاں یا نہیں نہیں ہو۔ کیوں کہ جو اس سے زیادہ ہے، وہ بدی سے ہے" (انجیل متی۔ باب ۵۔ ۳۳ تا ۳۷)

یہی وجہ ہے کہ مسیحیت نے "قیصر کا قیصر کو دیا اور اللہ کا اللہ کو" اور اپنی پوری توجہ روحانی پاکیزگی اور شائستگی کی طرف مرکوز کر دی۔ اور اپنے آپ کو اس بنیاد پر ڈھالا کہ "دین اللہ اور بندہ کا ذاتی معاملہ ہے" اور "قانون فرد اور حکومت کا رشتہ"۔

مسیحیت کے رومی شہنشاہیت کے سائے میں پروان چڑھنے، اور یہودی مذہب کے بعد کے دقفہ میں آنے کا یہ ایک منطقی نتیجہ تھا۔

مسیحیت، روحانی پاکیزگی اور مادیات سے بے تعلقی میں، اس آخری انتہا کو پہونچ گئی جس سے آگے کوئی منزل نہیں۔ انسان کی روحانی زندگی کے اس شعبہ میں اس نے وہ کام انجام دئے، جو کوئی مذہب انجام دے سکتا تھا۔ قلب و ضمیر کی دنیا اس کی ساری توجہات کا مرکز تھی۔ سوسائٹی اور اس کا انتظام اس نے حکومت کو سونپ دیا کہ وہ اپنے ارضی قوانین کے ذریعہ اس ظاہری دنیا کا کام جیسا چاہے سنبھال لے۔ اور روحانی رفعت و بلندی، قلب و ضمیر کی صفائی و پاکیزگی، جذبات کو قابو میں رکھنے، ضرورتوں سے بلند ہونے، اور عالم مثال و خیال کی مقدس خواہشات کو اپنا ہدف مقصود بنانے میں اس نے کوششوں کا حق ادا کر دیا۔ یہ ایک منطقی نتیجہ تھا مسیحیت کے ایک خاص ماحول میں پروان چڑھنے کا اور طبعی تقاضا تھا۔ اسرائیلی قوم کی ضرورتوں کا جس میں عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے، اور جو روما کی بڑی شہنشاہیت کا ایک حصہ تھی۔ ایک نئے اور عالمگیر دین ـــ دین اسلام کے ظاہر کے ظاہر ہونے سے قبل کام کرنے کا جو مختصر سا وقفہ مسیحیت کے لئے مقدر کر دیا گیا تھا اس کے لحاظ سے یہی کچھ اسے کرنا بھی چاہئے تھا۔

اس کے بعد اللہ نے چاہا کہ مسیحیت اپنی پوری روحانی رفعت و پاکیزگی اور مادیات سے بے تعلقی کے ساتھ سمندروں کو عبور کر کے یورپ کو بھی اپنی جولان گاہ بنائے۔ وہاں اس نے یونان کی بت پرست اور مادی تہذیب کے وارث رومیوں کو پایا۔ ایسے ہی یورپ کے طول و عرض میں کچھ اور قومیں پائیں، جن میں وحشت اور بربریت ابھی تازہ تازہ تھی۔ جن کے گروہ کے گروہ زمین میں خونریزی کرتے پھرتے تھے۔ یہ لوگ انتہائی قسی القلب، تنگ دل اور بخیل تھے۔ ناممکن تھا کہ ان کے درمیان رہنے والا کوئی شخص راحت و آرام اور سکون و اطمینان کا مزا تک چکھے، یا ایک لحہ کے لئے اپنی تہذیب ہی اُبھار کے۔ نہ اس کی توقع کی جا سکتی تھی، کہ وہ زندگی کی ان واقعی حقیقتوں سے صرف نظر کر کے مسیحیت کے اعلیٰ روحانی نظریات کی طرف توجہ کریں گے اور یہ جان سکیں گے کہ :-

"جو تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے، دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتہ لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے"

ان قوموں نے جب دیکھا کہ زندگی کے میدان میں دین کا کوئی مصرف نہیں، تو انہوں نے کہا، کہ دین تو بس خدا اور بندہ کے ذاتی تعلق کا نام ہے۔ کوئی ہرج نہیں ہوگا اگر کلیسا میں اسے رشتہ استوار رکھیں

کی آنکھیں کھل رہی ہیں، اس کے احساسات بیدار ہو رہے ہیں، اور یہ چیز اس کے اقتدار کے لئے کھلا چیلنج ہے، وہ اس کے لئے تیار نہیں تھا کہ نئی فکر اور نئے علوم کے اس تیز دھارے کے مقابلہ میں آسانی کے ساتھ اپنا اقتدار گنوا بیٹھے ـــــ اس نے ہر قیمت پر اس نئی رو کو آگے بڑھنے سے روکنے کی ٹھان لی۔ جرأت مندانہ اظہار خیال کے گنہگاروں کے منہ بند کر دیئے۔ پرانے اور از کار رفتہ نظریات کے بندھنوں سے آزاد ہو کر کسی کو سوچنے تک نہیں دیا گیا۔ یہی دن ہے کہ کلیسا اور حریت فکر کے درمیان مستقل دشمنی اور گہری عداوت کا بیج بویا گیا۔ کلیسا نے جب مسیحیت کے مزاج کے علی الرغم چاہا کہ اپنے آپ کو صرف "مذہب" تک محدود نہ رکھے، اور نظام پاپائی کے بر خلاف صرف آخرت کے بارے میں فیصلہ دینے پر قناعت نہ کی، تو زمین و افلاک کے بارے میں اس کے نظریات باقاعدہ تحقیق و مطالعہ اور تجربات سے حاصل ہونے والے نظریات سے متصادم ہونے لگے۔ چونکہ تجربہ اور واقعات سے علم کی تائید ہوتی تھی اور علم کی مسلسل کامیابیوں نے اس نئے ذریعہ علم میں کسی قسم کا شک نہیں رہنے دیا تھا۔ اس لئے علماء و مفکرین کی کئی نسلیں ایسی پیدا ہوتی گئیں، جو کلیسا کو سخت نفرت و حقارت کی نظروں سے دیکھتی تھیں۔ اور مذہب اور مذہبی لوگوں کے خلاف ان کے دل ہی دل میں ایک آگ سلگ رہی تھی۔

بس یہیں سے یورپی اقوام کی زندگی میں دین اور علم اور کلیسا اور حریت فکر کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی۔

دنیا اسی طرح آگے بڑھتی گئی، اور جدید علم نے برگ و بار پیدا کئے، صنعتی دنیا میں اس سے وہ چیز پیدا ہوئی جسے "پیداوار کثیر" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر سرمایہ کی افراط ہو گئی۔ اب میدان میں دو نئی قوتیں برسر پیکار تھیں۔ ایک طرف سرمایہ داروں کا لشکر تھا۔ اور دوسری طرف مزدوروں کا گروہ! حقیقی اقتدار حکومت کے ہاتھوں سے نکل کر اب سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں آگیا تھا۔ جب کلیسا نے دیکھا کہ حقیقی اقتدار سے ساز باز کئے بغیر چارہ نہیں ہے تو وہ سرمایہ داروں کے لشکر سے جا ملا اور اس پلڑے میں اپنا وزن ڈال دیا۔

ظلم ہوگا، اگر یورپ کے تمام ارباب کلیسا کو ایک ہی لکڑی سے ہانکا جائے اور سب کو مفاد پرست ٹھیرایا جائے۔ اگرچہ ان میں ایسے مرغ باد نما تھے جو ہوا کا رُخ دیکھ کر کام کرتے تھے اور قوت و اقتدار کے پلڑے میں اپنا وزن ڈال دیتے تھے۔ دین کے اثر سے ناجائز فائدہ اٹھا کر جنھوں نے محنت پیشہ عوام پر بے حسی کی نیند طاری کر رکھی تھی۔ انھیں اپنا جائز حق وصول کرنے کے لئے بھی انقلاب برپا کرنے سے باز رکھتے تھے۔ اور دنیا میں عدل و انصاف پانے سے ناامید کر کے آخرت کے اجر و ثواب کی تمناؤں میں مست رکھتے تھے۔ اور لیکن ساتھ ہی ان میں بعض ایسے بھی تھے، جو اپنی اس قسم کی دعوت میں پورے مخلص تھے۔ مسیحی عقیدہ کے لحاظ سے انھوں نے یہی کچھ سمجھا تھا۔ اس لئے کہ مسیحیت اپنی اصل کے لحاظ سے دنیا سے بیزاری اور تقشف پیدا کرتی ہے۔ اس کی طبیعت اور سرشت میں یہ بات داخل ہے کہ زندگی کے جذبہ کو دبائے۔ مادی زندگی کے اسباب سے کنارہ کش رہنا، حیاتِ ظاہری کو ہیچ سمجھنا اور آسمانی بادشاہی کی طرف نظریں لگائے رکھنا، اس کی دعوت کے چند اہم نکات ہیں۔

اسباب و محرکات جو کچھ بھی ہوں، بہر حال انقلاب و بغاوت کی آگ سے بھڑکے ہوئے محنت پیشہ طبقات نے محسوس کیا کہ دین ان کی کشمکش اور جنگ کی خواہشات کے حق میں نہیں۔ اور یہ کہ کلیسا نے دین کو محنت

پیشہ طبقات پر بے حسی کی نیند طاری کرنے کے لئے اپنا آلۂ کار بنا لیا ہے۔ انھوں نے صاف طور پر دین کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور کہا کہ :- 'مذہب عوام کے لئے افیون ہے'
اشتراکیوں کے نزدیک اشتراکیت اور دین کے درمیان کھلی ہوئی دشمنی کی یہیں سے ابتدا ہوتی ہے۔

لیکن

دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا ان حالات اور اس کے ان اثرات سے آخر کیا تعلق ہے؟ ہماری تاریخ اور اس کا پس منظر اسلام کا پس منظر اور وہ حالات جن میں کہ وہ پیدا ہوا اور بڑھا، کسی کا بھی ان حالات اور نظریات سے کوئی میل نہیں۔ اسلام ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا، جو اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتا تھا، کسی شہنشاہیت یا بادشاہت کے وہ تابع نہیں تھا۔ اور ایسی سوسائٹی میں پروان چڑھا، جسے ابھی ترقی کے منازل طے کرنے تھے، اور جو پوری طرح منظم نہیں تھی۔ اسے اس سوسائٹی کی ترقی و تنظیم کے سامان کرنے تھے، اس کے لئے قوانین اور طریقے بنانے تھے۔ اور سلوک و معاملات کی طرف توجہ کرنے کے ساتھ ساتھ، ضمیر اور روح پر بھی نگاہ رکھنی تھی۔ اپنے تمام احکام و ہدایات میں دین اور دنیا دونوں کو ساتھ ساتھ لے چلنا تھا، اور دونوں کی ضرورتوں اور حالات کا لحاظ رکھنا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک عالم نفسی کے اندر ——— جو ایک فرد کے علاوہ پوری ایک جماعت کے ضمیر میں بھی پنہاں رہتا ہے ——— عالم ارض و عالم سما دونوں کو جمع کر دیا۔ عملی جد و جہد کا جذبہ اور دینی احتساب کی حس دونوں کو زندگی کے اندر ایسے سمو دیا، کہ اگرچہ مظاہر کے اعتبار سے دونوں میں فرق معلوم ہو لیکن جوہری طور پر دونوں کی ایک حیثیت ہو گئی۔

جس اسلام کی یہ تاریخ اور جس کا یہ پیغام ہو، ممکن نہیں کہ وہ عملی اور واقعی زندگی سے الگ تھلگ، انسان کے ضمیر و وجدان میں پناہ گزیں ہو جائے۔ یا کسی دنیوی اقتدار کے ڈر سے، اپنے دائرہ عمل کو تنگ کر لینے پر مجبور ہو جائے۔ وہ پوری طرح خود مختار اور اپنا آپ مالک ہے۔ انسان کی پوری زندگی ——— اپنے تمام روحانی و مادی اور دینی و دنیوی شعبوں سمیت ——— اس کا میدان عمل ہے۔

سوسائٹی سے کٹ کر اور معاملات زندگی سے کنارہ کش رہ کر، دین دین ہی نہیں رہ سکتا۔ ایسے مسلمان مسلمان نہیں جو اپنے اجتماعی، قانونی اور مالی معاملات میں اسلام سے فیصلہ نہ چاہیں۔ اور نہ ایسی سوسائٹی اسلامی سوسائٹی ہے جس کے قوانین اور طریقوں میں اصلاحی احکام و اصول کا کوئی دخل نہ ہو۔ اور اسلام کی حیثیت اس میں بس شعائر و عبادات کی ہو۔

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیماً ۔ (النساء - ۶۵)

(سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ تجھ کو ہی منصف جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے پھر نہ پاویں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلے سے اور قبول کریں خوشی سے)

وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا (الحشر - ۷)

(اور جو دے تم کو رسول سو لے لو اور جس سے منع کرے سو چھوڑ دو)

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاؤلٰئک ھم الکافرون (المائدہ - ۴۴)

"اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے اتارا سو وہی لوگ ہیں کافر"

جو بات اس دین کے طریقے اور اصول کو واضح اور متعین کر دیتی ہے - وہ یہ ہے کہ یہ دین ایک وحدت ہے جس کی تقسیم نہیں کی جا سکتی، اور جس کا تجزیہ ناممکن ہے - اس کے عبادات و معاملات، قوانین و ہدایات اور شعائر و رسوم اپنے مزاج اور اصول و مقصد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے جُدا نہیں - نماز جو عبادت کے خاص اور اہم شعائر میں سے ہے اگر اس میں ایک طرف اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ فرد و جماعت کی ساری توجہ ایک اللہ کی طرف رہے، سب کی گردنیں اسی کے آگے جھکیں، سب کا ایک ہی تیزہ ہو اور کسی کج تقلید کی بات کہاں کہ پھر سب اسی کی طرف رُخ کئے رہیں، تو دوسری طرف اس میں مساوات کا بھی ایک سبق ہے، سب اُن ایک اللہ کے بندے ہیں، اور اس کے آگے سب مساوی المرتبہ ہیں - یہی نہیں بلکہ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت بھی جو اسلامی اعتقادیات کا ایک اہم جز ہے بندوں کو ایک اللہ کے سوا ہر قسم کی بندگی سے فکر و ضمیر کو آزاد رکھنے کا سبق دیتی ہے - فکر و ضمیر کی یہی آزادی ہے جو ایک صالح اور برگزیدہ سوسائٹی کو بروئے کار لانے کا اہم اور بنیادی قدم ہے جس میں محمود و ایاز ایک ہی صف میں نظر آتے ہیں۔

بہر حال ایک تحقیق کرنے والے کو اس بارے میں کوئی شک نہیں رہ سکتا کہ سوسائٹی کے بارے میں اسلام کی فکر اس کے شعائر و عبادات اور قوانین و اصول دونوں سے صاف صاف واضح اور عیاں ہے - اور یہ اس کی وہ بنیادی اور قوی و مدلل فکر ہے، جو اس کے تمام گوشوں میں پھیلی ہوئی ہے - اگر کسی زمانے میں کسی ایسی کوشش کا ہمیں سراغ ملتا ہے کہ دین کے صرف انفرادی شعبے ہی پر ساری توجہات مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں اور اجتماعی زندگی کو اس سے یا اس کو اجتماعی زندگی سے بے تعلق کر دیا گیا تھا تو یہ ایسا کرنے والوں کی غلطی تھی، ورنہ اس سے دین پر کوئی حرف نہیں آ سکتا۔

اسلام کے بارے میں ہم یہ کوئی نئی بات نہیں پیش کر رہے ہیں، نہ یہ کوئی نئی تاویل ہے جو ہم نے اختیار کی ہے - بلکہ خود اسلام نے اپنے نقطۂ نظر کی اسی طرح وضاحت کی ہے، اس کے پیغمبر برادر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ان کے مخلص اصحاب اور اس کے منبع سے قریبی لوگوں نے اس کو اسی طرح سمجھا ہے - قرآن میں آتا ہے:-

یا ایھا الذین آمنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الیٰ ذکر اللہ وذروا البیع ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون - فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ (الجمعہ ۹ و ۱۰)

(اے ایمان والو جب اذان ہو نماز کی جمعہ کے دن تو دوڑو اللہ کی یاد کو، اور چھوڑ دو خرید و فروخت، یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم کو سمجھ ہے - پھر جب تمام ہو چکے نماز تو پھیل پڑو زمین میں اور ڈھونڈو فضل اللہ کا اور بھی روزی تلاش کرو)

ہم میں سے ہر ایک شخص جانتا ہے کہ فرض نمازیں دن میں کتنا وقت چاہتی ہیں، اور کتنا وقت کام کاج کے لئے بچ رہتا ہے - انسانی زندگی میں نماز کا وقت بہت محدود وقت ہے، اس کے بعد جتنا کچھ وقت بچ رہتا ہے،

اور سارے کا سارا سوسائٹی کے دوسرے کاموں اور زندگی کے دوسرے معاملات کے لئے ہے۔ ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

وجعلنا الليل لباساً وجعلنا النهار معاشاً　　(النبا ۱۰-۱۱)

(اور بنایا رات کو اوڑھنا اور بنایا دن کمائی کرنے کو)

اس لئے کہ دن کا اکثر حصہ معاش میں صرف ہوتا ہے، نہ کہ فرض عبادات میں۔

اسلام صرف شعائر و رسوم کی بجاآوری کو عبادت شمار نہیں کرتا، بلکہ زندگی کی ہر جد و جہد ــــ جب تک وہ خیر و صلاح اور ادائے فرض کے حدود میں رہے ــــ عبادت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک شخص گزرا۔ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلب رزق کے سلسلے میں اس کی جاں فشانی دیکھی، اور کہنے لگے:- یا رسول اللہ، کیا بہتر ہوتا کہ اس کی یہ جد و جہد اللہ کی راہ میں ہوتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

"اگر وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش و پرداخت کے لئے نکلا ہے، تو اس کا یہ نکلنا اللہ کی راہ میں ہے، اگر وہ اپنے ضعیف ماں باپ کی خاطر نکلا ہے، تو بھی اس کا یہ نکلنا اللہ کی راہ میں ہے۔ اگر وہ اپنے نفس کو مانگنے کے عار سے بچانے کے لئے نکلا ہے تو بھی اس کا یہ نکلنا اللہ کی راہ میں ہے۔ لیکن اگر اس کی یہ ساری جد و جہد تفاخر و ریا کے لئے ہو تو اس کی یہ کوششیں شیطان کی راہ میں ہوئیں"

ذیل کے دو واقعات سے تو اسلام کی روح پوری وضاحت اور قطعیت کے ساتھ سامنے آتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کس طرح سمجھا تھا۔

حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک سفر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ ہم میں سے بعض روزہ دار تھے اور بعض بے روزہ دار۔ گرمی سے تپتے دن میں ہم نے ایک منزل پر قیام کیا۔ اکثر ایسے تھے جنھوں نے کپڑا تان کر سایہ کر لیا تھا، اور بعض ایسے تھے جو اپنے ہاتھوں سے دھوپ کا بچاؤ کر رہے تھے۔ اس گرمی اور دھوپ میں روزہ دار بے ہوش ہو ہو کر گر پڑے اور بے روزہ داروں نے خیمے نصب کئے اور سواریوں کو پانی پلایا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ آج کے دن بے روزہ داروں نے ہی سارا اجر لے لیا۔

دوسرا واقعہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بہت عبادت کرنے والے شخص کا ذکر کیا گیا۔ پوچھا اس کی کفالت کون کرتا ہے۔ لوگوں نے کہا اس کا بھائی۔ فرمایا:- اس کا بھائی اس سے زیادہ عبادت گزار ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے، جو دین کی حقیقت سے سب سے زیادہ باخبر تھے کچھ نماز روزہ کے استخفاف کے طور پر یہ نہیں فرمایا۔ بلکہ یہی دین کی روح ہے جو انہوں نے پائی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دین جب اپنے عقیدہ کے لئے کچھ کرتا ہے تو دراصل زندگی کے لئے کرتا ہے۔ اس نے عقیدہ کو زندگی کے ہم معنیٰ کر دیا ہے۔ وہ اس کا قائل نہیں کہ عقیدہ قلب و ضمیر کی روحانی تنہائیوں میں چھپا رہے۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے بھی دین کی حقیقت اسی طرح سمجھی ہے۔ انھوں نے ایک شخص کو دیکھا جو عبادت میں پژمردگی اور مردنی کا اظہار کر رہا تھا۔ آپ نے اسے درّے لگائے اور فرمایا:- خدا تجھے غارت

کرے، ہمارے دین کو مردہ نہ بنا۔

اسی طرح ایک اور موقع پر ایک گروہ نے آپ کے سامنے گواہی دی تو فرمایا:- کسی ایسے شخص کو لے آ جو تجھ کو جانتا ہو۔ وہ ایک دوسرے شخص کو لیتا آیا جس نے اس کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا تو اس کا قریبی پڑوسی ہے اور اس کی نشست و برخاست سے واقفیت رکھتا ہے۔ کہا، نہیں۔ پھر پوچھا، کیا کبھی سفر میں اس کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے جس کی وجہ سے اس کے اخلاق کی خوبی تجھ پر ظاہر ہوئی ہو؟ کہا نہیں۔ پوچھا، تو پھر کیا کبھی کوئی رقمی لین دین ہوا ہے جس سے اس کی دیانت اور ورع ظاہر ہوا ہو۔ کہا، نہیں۔ پھر فرمایا غالباً تو نے اسے بس مسجد میں نماز گزارتے، قرآن پڑھتے کبھی سر اٹھاتے اور جھکاتے ہوئے دیکھا ہے۔ کہا ہاں۔ فرمایا۔ چلا جا، تو اسے نہیں جانتا۔ اور اس شخص سے کہا، جا! کسی جاننے والے کو لے کر آ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کی طرح دین کی حقیقت اور عبادات و معاملات اور عقیدہ و ایمان کے بارے میں اس کی رائے کو صحیح طور پر پیش کرتا ہے:

وابتغ فیما آتاک اللہ الدار الآخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا (القصص)

(اور جو تجھ کو اللہ نے دیا ہے اس سے کما لے پچھلا گھر اور نہ بھول اپنا حصہ دنیا سے)

اعمل لدنیاک کأنک تعیش ابداً، واعمل لآخرتک کأنک تموت غداً (او کما قال)

دنیا کے لئے کچھ کر تو ایسے جیسے کہ تو ہمیشہ رہنے والا ہے اور آخرت کے لئے کر تو ایسے جیسے کہ تو کل ہی مرنے والا ہے۔

من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ وان لم یستطع فبلسانہ وان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان - (او کما قال۔ الحدیث)

(تم میں سے جو کوئی کسی منکر کو دیکھے، تو اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے، اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے روکے، اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو دل سے اسے برا سمجھے، اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔)

ولولا دفع اللہ الناس بعضہم ببعض لفسدت الارض ولکن اللہ ذو فضل علی العلمین۔ (البقرہ: ۲۵۱)

(اور اگر نہ ہوتا دفع کرا دینا اللہ کا، ایک کو دوسرے سے تو خراب ہو جاتا ملک، لیکن اللہ بہت مہربان ہے جہان کے لوگوں پر۔)

ولولا دفع اللہ الناس بعضہم ببعض لہدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیہا اسم اللہ کثیراً۔ (الحج: ۴۰)

(اور اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو ایک کو دوسرے سے تو ڈھائے جاتے تکیے اور مدرسے اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں نام پڑھا جاتا ہے اللہ کا بہت۔)

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین (البقرہ)

(اور لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو لڑتے ہیں تم سے، اور کسی پر زیادتی مت کرو، بے شک اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے زیادتی کرنے والوں کو۔)

ليس البر ان تولوا وجوهكم قبل المشرق والمغرب ولكن البر من آمن بالله واليوم الآخر والملائكة والكتاب والنبيين وآتى المال على حبه ذوي القربى واليتامى والمساكين وابن السبيل والسائلين وفي الرقاب واقام الصلوٰة وآتى الزكوٰة والموفون بعهدهم اذا عاهدوا والصابرين في البأساء والضراء وحين البأس ۔ ۔ ۔ ۔ (البقرة: ۱۷۷)

(نیکی یہی نہیں کہ منہ کر دیا مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف، بلکہ بڑی نیکی تو یہ ہے جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور قیامت پر اور فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور پیغمبروں پر، اور دے مال اس کی محبت پر رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور مانگنے والوں کو، اور گردنیں چھڑانے میں، اور قائم رکھے نماز اور دیا کرے زکوٰۃ، اور پورا کرنے والے اپنے اقرار کو جب عہد کریں، اور صبر کرنے والے سختی میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت۔)

عمل اور اعتقاد میں اسلام کی یہی اصل ہے۔ اس لحاظ سے اسلام میں مسیحیت کے ابتدائی ادوار کی طرح دین اور دنیا اور عقیدہ و اجتماع کی کوئی تفریق نہیں۔

اسلام میں کہانت اور پاپائی نہیں ہے، نہ خلق اور خالق کے درمیان کوئی واسطہ فرض کیا گیا ہے۔ ہر مسلمان خشکی و تری کے کسی مقام پر بھی، کاہن یا قسیس کی مدد کے بغیر اکیلے اپنے رب سے تعلق پیدا کر سکتا ہے۔ اسلامی فرماں روا کی قوت و شوکت پاپائیت یا آسمان سے حاصل کی ہوئی نہیں ہوتی، بلکہ وہ اسلامی جماعت سے قوت حاصل کرتا ہے۔ اس کے احکام کا مبدأ و ماخذ دینی قوانین ہوتے ہیں۔ جس کے سمجھنے اور حالات پر منطبق کرنے کا سب کو برابر کا حق حاصل ہے۔ سب مساوی حیثیت سے اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اپنے مسائل کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ مذہبی افراد٭ کو بھی مسلمانوں پر کسی قسم کا کوئی خاص اقتدار حاصل نہیں۔ فرماں روا بھی سوائے دینی اصولوں سے ماخوذ قانونوں کی تنفیذ کے کسی اور قسم کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ آخرت میں تو سب کو خدا کے پاس جانا ہے، اور اس کے آگے پیش ہونا ہے۔

وكلهم آتيه يوم القيامة فردا۔

پس مذہبی٭ افراد اور ارباب حکومت کے درمیان لوگوں کی جان و مال پر اپنا اقتدار جتانے کی کوئی کشمکش نہیں۔ یہاں مالی اور معنوی مفادات اور مصلحتیں ہیں جو آپس میں ٹکرائیں، اور نہ یہاں روحانی اور دنیوی اقتدار کی تقسیمیں ہیں جن پر تنازعہ پیدا ہونے کا امکان ہو، جیسا کہ اباطرہ اور پاپاؤں کے درمیان پیدا ہوا تھا۔

اسلام علم کا دشمن نہیں، نہ علماء کو وہ ہیٹا جانتا ہے۔ بلکہ وہ تو علم کو ایک مقدس فریضہ گردانتا ہے جس کا شمار دینی طاعات و عبادات میں ہے۔

طلب العلم فريضة على كل مسلم ومسلمة (الحديث)

(علم کا طلب کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے)

٭ 'مذہبی افراد' ترجمہ ہے 'رجال الدین' کا۔ یہ اصطلاح جو مسلمانوں میں عام ہو کر رہ گئی ہے، دراصل دین و دنیا کی تفریق کے مغربی تصور کا شاخسانہ ہے۔

اطلبوا العلم ولو فی الصین (الحدیث)

(علم طلب کرو، خواہ وہ چین میں ہو)

من سلک سبیلا یطلب فیہ علماً سھل اللہ لہ طریقا الی الجنۃ (الحدیث)

(جس نے علم کی طلب میں راستہ طے کیا، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کی راہ آسان کردیگا۔)

تاریخ اسلامی میں ارباب علم و دانش پر ایک سوچے سمجھے پروگرام کے مطابق ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے کی ایسی شرمناک حرکت کا سراغ نہیں ملتا، جیسے پچھلے دور مسیحیت میں تفتیش کے محکموں نے روا رکھا تھا۔ بعض موقعوں پر لوگوں کو ان کے افکار و نظریات کی وجہ سے سزائیں دی گئی ہیں تو اس کی مثالیں شاذ ہیں، اور ان کا تعلق مستثنیات سے ہے۔ ان میں بالعموم مختلف سیاسی حالات کا دخل رہا ہے اور پس پردہ پارٹی بندی اور فرقہ پرستی کے جذبات کام کرتے رہے ہیں۔ بہرحال ان معدودے چند واقعات کا اسلامی زندگی میں کوئی نمایاں مقام نہیں، اور پھر یہ حرکتیں ایسے لوگوں کے ہاتھوں سرزد ہوئی ہیں جنھیں اسلام فہم دین کا علم بردار نہیں مانتا، اور ان کی ان حرکتوں سے اپنی بیزاری اور بے تعلقی کا اظہار کرتا ہے۔ یہی اسلام کا طبعی تقاضا بھی تھا اس لئے کہ خوارق و معجزات پر اعتماد کرنے کی بجائے، کائنات میں پھیلی ہوئی نشانیاں اور اسباب زندگی کے مشاہدے اور ان میں تأمل و تفکر کے اصول پر اس کا دارومدار ہے۔

ان فی خلق السموات والارض، واختلاف اللیل والنہار، والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس، وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتہا وبث فیہا من کل دابۃ وتصریف الریاح، والسحاب المسخر بین السماء والارض لآیات لقوم یعقلون (البقرہ: ۱۶۴)

(بیشک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں، اور رات اور دن کے بدلتے رہنے میں اور کشتیوں میں جو کہ لیکر چلتی ہیں دریا لوگوں کے کام کی چیزیں، اور پانی میں جس کو اتارا اللہ نے آسمان سے پھر جلایا اس سے زمین کو اس کے مرگئے پیچھے اور پھیلائے اس میں سب قسم کے جانور، اور ہواؤں کے بدلنے میں، اور بادل میں جو کہ تابعدار ہے اس کے حکم کا درمیان آسمان و زمین کے، بے شک ان سب چیزوں میں نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لئے۔)

یخرج الحی من المیت ویخرج المیت من الحی ویحی الارض بعد موتہا وکذلک تخرجون۔ ومن آیاتہ ان خلقکم من تراب ثم اذا انتم بشر تنتشرون۔ ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیہا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ ان فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون۔ ومن آیاتہ خلق السموات والارض واختلاف السنتکم والوانکم ان فی ذلک لآیات للعالمین۔ ومن آیاتہ منامکم باللیل والنہار، وابتغاؤکم من فضلہ ان فی ذلک لآیات لقوم یسمعون۔ ومن آیاتہ یریکم البرق خوفاً وطمعاً وینزل من السماء ماءً فیحیی بہ الارض بعد موتہا ان فی ذلک لآیات لقوم یعقلون۔ (الروم: ۱۹ - ۲۴)

(نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے، اور مردہ کو زندہ سے، اور زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مرنے کے پیچھے، اور اسی طرح تم نکالے جاؤ گے۔ اور اس کی نشانیوں سے ہے یہ کہ تم کو بنایا مٹی سے، پھر اب تم انسان ہو زمین میں پھیلے پڑے۔

اور اس کی نشانیوں سے ہے یہ بنا دیے تمہارے واسطے تمہاری قسم سے جوڑے کہ چین سے رہو ان کے پاس اور رکھا تمہارے بیچ میں پیار اور مہربانی، البتہ اس میں بہت پتے کی باتیں ہیں ان کے لئے جو دھیان کرتے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں سے ہے آسمان اور زمین کا بنانا اور طرح طرح کی بولیاں تمہاری اور رنگ، اس میں بہت نشانیاں ہیں سوچنے والوں کو۔ اور اس کی نشانیوں سے ہے تمہارا سونا رات اور دن میں اور تلاش کرنا اس کے فضل سے، اس میں بہت پتے ہیں ان کو جو سنتے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں ہے کہ دکھاتا ہے تم کو بجلی ڈر اور امید کے لئے، اور اتارتا ہے آسمان سے پانی پھر زندہ کرتا ہے اس سے زمین کو مرگئے پیچھے، اس میں بہت پتے ہیں ان کے لئے جو سوچتے (ہیں)

یہ اس لئے بھی اسلام کا طبعی تقاضا تھا کہ اسلام تقویٰ اور علم کو لازم و ملزوم قرار دیتا ہے اور علم کو اللہ کی معرفت اور خشیت کا ذریعہ بتاتا ہے۔

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (فاطر: ۲۸)

(اللہ سے ڈرتے وہی ہیں اس کے بندوں میں جو علم رکھتے ہیں)

وہ علماء کو جہلاء سے بلند درجہ دیتا ہے۔

قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون (الزمر: ۹)

(تو کہہ کیا برابر ہوسکتے ہیں جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے)

ان فضل العالم علی العابد، کفضل القمر لیلۃ البدر علی الکواکب (او کما قال الحدیث)

(عالم کو عبادت گزار پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسی چودھویں رات کے چاند کو تمام ستاروں پر)

پس اسلام کے مزاج اور اس کی تاریخ کے لحاظ سے دین اور علم کے درمیان ایسی کوئی نزاع برپا ہوئی، نہ ہوسکتی ہے، جیسی کہ یورپ کے دور نشاۃ ثانیہ میں کلیسا اور آزاد خیال علماء اور اہل فکر کے درمیان تھی۔

اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تاریخ اسلامی کے بعض ادوار میں مذہبی افراد نے ارباب اقتدار اور امراء ثروت کے پہلو بہ پہلو دین کو محنت پیشہ اور نادار طبقات پر بے حسی کی نیند طاری کرنے کا ذریعہ بنایا تھا۔ لیکن دین کی حقیقی روح ان کے اس موقف سے ابا کرتی ہے، اور اسے ان کے ان اعمال سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ اسلام ایسے لوگوں کو جنھوں نے اس طرح تھوڑے مول کے عوض آیات الٰہی کو بیچا، عذاب سخت کی وعید سناتا ہے۔ اس کے مقابلے میں، تاریخ اسلام میں ہم ایسے حاملان دین کے نمونے بھی پاتے ہیں جنھیں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت اظہار حق سے باز نہ رکھ سکی۔ جنھوں نے فقراء و عوام، اور اللہ کے حقوق کے لئے افراد، حکومت اور مالداروں سے ٹکر لی۔ اصحاب حقوق کو ادائے حقوق کی طرف متوجہ کیا۔ نتیجۃً وہ حکام کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔ بعض موقعوں پر انہیں جلاوطن بھی کیا گیا اور سخت آزمائش میں ڈالا گیا۔

پس ہم ایک وجہ بھی ایسی نہیں پاتے ـــــ نہ اسلام کے مخصوص مزاج کے اعتبار سے، نہ اس کے تاریخی حالات کے اعتبار سے ـــــ کہ جس کی بنا پر اسے سوسائٹی سے الگ کیا جانا پڑے۔ یورپ میں مسیحیت کے خاص اسباب و حالات تھے جنھوں نے اسے دنیا کے عام نظم سے علیحدہ کرکے روحانیات کے گوشے میں مقید کردیا تھا اور اس کا دائرۂ عمل قلب و ضمیر کی پاکی و صفائی کی حد تک محدود ہوگیا تھا۔ دنیا کے نظم و انتظام، اور سوسائٹی کے دیگر امور کی باگ ڈور دنیوی

قوانین کے ہاتھ میں دے دی گئی تھی- لیکن اسلام کو تو ایسے حالات سے دوچار ہونا نہیں پڑا-

اسی طرح اسلام اور عدل اجتماعی کے درمیان بھی عداوت و دشمنی کا وجود فرض کرنے کے لئے ہمارے ہاں کوئی بنیاد نہیں- اس کے حالات ویسے نہیں تھے جیسے یورپ کے تھے، جس کی وجہ سے مذہب اور کمیونزم کے درمیان گہری عداوت کی بنیاد پڑ گئی- اسلام نے عدل اجتماعی کے اصول و قواعد کی تعیین کر دی ہے- مالداروں کے مال میں فقراء کے حقوق مقرر کر دیئے ہیں- نظم حکومت اور معاشیات کے سلسلے میں اس کی ایک عادلانہ پالیسی ہے اسے اس کی قطعاً ضرورت نہیں کہ احساسات اور جذبات کو مردہ کرے، اور لوگوں کو کہے کہ زمین پر اپنے حقوق سے دستبردار ہو جاؤ تو آسمان میں تمہیں اس کا اجر ملے گا- بلکہ اس کے برخلاف، کسی دباؤ کے زیر اثر اپنے حقوق سے دستبردار ہونے والوں کو عذاب آخرت سے ڈراتا ہے اور انہیں "اپنی جانوں پر ظلم کرنے والوں" سے موسوم کرتا ہے-

ان الذین توفاهم الملائکة ظالمی انفسهم قالوا فیم کنتم قالوا کنا مستضعفین فی الارض، قالوا الم تکن ارض الله واسعة فتهاجروا فیها، فاولئک مأواهم جهنم، وساءت مصیراً- (النساء: ۹۷)

(وہ لوگ کہ جن کی جان نکالتے ہیں فرشتے، اس حالت میں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں، کہتے ہیں ان سے کیا نہ تھی زمین اللہ کی کشادہ، جو چلے جاتے وطن چھوڑ کر وہاں- سو ایسوں کا ٹھکانہ ہے دوزخ اور وہ بہت بری جگہ ہے)

انہیں اپنا حق وصول کرنے کے لئے جنگ و قتال تک پر اکساتا ہے- حدیث میں آتا ہے: من قتل دون مظلمته فهو شهید (جو اپنے ظلم کے دفاع میں مارا جائے وہ شہید ہے)

اگر یورپ اپنے حالات کی وجہ سے دین کو اپنی روزمرہ زندگی کے معاملات سے خارج کرنے پر مجبور تھا، تو ہم ایسے مجبور نہیں ہیں، کہ اس کی تقلید کریں- اگر کمیونزم مزدوروں کے حقوق کی ضمانت کے لئے مذہب سے لڑائی مول لینے پر مجبور تھا، تو ہمیں تو اس کی ضرورت نہیں ہے-

---

لیکن یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اسلام نے تاریخ کے ایک خاص دور میں جو نظام قائم کیا تھا، وہ دوسرے ادوار کے لئے بھی موزوں اور مفید ہے؟ اس میں نمو و ارتقا کے ایسے عناصر ہیں جس کی وجہ سے اسے ہر دور پر منطبق کیا جا سکتا ہے، خواہ اس دور کے حالات اور اس کی تہذیبی بنیادیں اس دور کے حالات اور تہذیبی بنیادوں سے کم و بیش مختلف ہی کیوں نہ ہوں، جس میں اسلام پیدا ہوا تھا؟

یہ ایک اصولی سوال ہے- لیکن اس مقام پر ہم اس کا تفصیلی جواب دینے سے قاصر ہیں- آئندہ چل کر اسلامی نظام، اس کے اصول و قواعد اور عملی زندگی میں اس کی تطبیقات پیش کرنے کے بعد، ہم اس پر تفصیلی بحث کریں گے- فی الحال مختصر طور پر اتنا عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ اسلام نے اپنے اندر ایسے تاریخی حالات اور اس سے پیدا شدہ اجتماعی، اقتصادی اور فکری تبدیلیوں کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی ہے- اس کا نظام ان تمام پیدا ہونے والے مسائل کو محیط ہے- اس نے عام اصول و قواعد پیش کر دیئے ہیں، اس کے حدود متعین کر دیئے ہیں، اور جزوی تطبیقات کو زمانہ کے حالات اور ضرورتوں پر چھوڑ دیا ہے، جو ان عام اصول

وقت اور عادت کے حدود میں ہوں گی۔ اس نے جو دو تفصیلات پیش کی ہیں تو صرف ان مسائل میں جن کی حکمتیں غیر متغیر ہیں، اور جو ہر جان اور ہر زمانہ میں مفید مقصد ہوتے ہیں ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ یہ بات دین کے ہر جان میں موزوں اور مناسب ہونے کی قطعی ضمانت ہے۔ اور اس بات کی واضح دلیل ہے کہ زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں نشوو ارتقاء کی استعداد موجود ہے۔

فقہاء اسلام نے تطبیق و قیاس اور تفریع احکام میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ جن میں سے اکثر، ہماری رائے میں روحِ اسلام کے موافق ہیں، اور بہت کم ایسے مسائل ہیں، جن میں مقامی حالات کا اثر غالب ہے، جس کی وجہ سے وہ اس روح سے کم و بیش دور ہو گئے ہیں۔ تاہم مجموعی طور پر یہ فقہی کوششیں اسلام دین کو اس قابل بناتی ہیں، کہ وہ سوسائٹی کی تمام ضروریات پوری کر سکیں۔ پھر ایک طویل عرصے کے لئے یہ کوششیں رک گئیں اور اس دوران میں فقہ اسلامی کا ارتقا بھی رک گیا۔ اب اس صدی کے آغاز سے کچھ زندگی کے آثار نظر آنے شروع ہو گئے ہیں۔

ہمارے حالات کا یہ کوئی علاج نہیں معلوم ہوتا کہ ہم اپنے اجتماعی دین کو عبادات کے گوشے میں مقید کر دیں اور دنیوی قانون کے لئے دست نگر ہوں تو فرانسیسی قانون کے یا اپنی سوسائٹی کا نظام بنائیں تو کمیونزم کے نظریات پر، اور غیروں کی طرف اس طرح لپکنے سے پہلے اس کی ضرورت تک محسوس نہ کریں کہ اسلام کے ان قوانین کو بھی آزمائیں جو حوالۂ طاق نسیاں ہو کر رہ گئے ہیں، اور جس پر پہلی اسلامی سوسائٹی کی تعمیر ہوئی تھی۔ یا کم از کم ایسا ہی ہو چکا ہو کہ کوشش کے بعد ان قوانین کو موجودہ حالات کے مناسب نہ سمجھا گیا ہو۔

یہ حقیقت دین سے کھلا ہوا جہل یا عقلی و نفسی تن آسانی اور سہل انگاری نہیں تو اور کیا ہے کہ اپنے قدیم علمی و تہذیبی سرمایہ کا جائزہ لینے کی بجائے، مضحکہ خیز طور پر دین و دنیا کی تفریق میں یورپی نظریہ کی تقلید کرنے لگ جائیں حالانکہ وہاں، ان کے دین کا مزاج اس تفریق کا متقاضی تھا، اور یہاں اسلام کا مزاج اس سے اِبا کرتا ہے۔ وہاں دین اور علم و حکومت کے درمیان، خاص تاریخی اسباب کی بنا پر، جس کا ہم نے گزشتہ صفحات میں ذکر کیا ہے، ایک کشمکش سی تھی۔ لیکن یہاں اسلامی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم فکری، روحانی اور اجتماعی طور پر دنیا سے بالکل بیگانہ رہنے کی دعوت دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایسی بیگانگی اور گوشہ گیری کا قائل نہیں۔ اس کا پیغام تو ساری دنیا کے لئے ہے۔ ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ اس بے معنی اور بے موقع تقلید سے پہلے، جس کے ہماری قومی زندگی میں کوئی تاریخی اسباب نہیں، بلکہ جس میں ہماری شخصیت ہی باقی نہیں رہتی، اور ہم دوسروں کے خیمہ بردار ہو کر رہ جاتے ہیں، اپنے سرمایہ کا بھی جائزہ لیں، اپنی میراث کو بھی دیکھیں، اس کے عام اصولوں کو معلوم کریں، اور اندازہ کریں کہ موجودہ حالات میں کس حد تک باقی رہ سکتے اور کام کر سکتے ہیں۔ ہمارا دین ہمیں ہمیشہ آگے کی صفوں میں دیکھنا چاہتا ہے، نہ یہ کہ کسی کے خیمہ بردار کی حیثیت سے۔

(کنتم خیر امۃ اخرجت للناس)

اپنا جائزہ لینے کے بعد ہم نے پایا ہے، کہ ہمارے ہاں وہ آبِ حیات ہے جس سے ہم اس حیران

وسرگشتہ، مصیبتوں کی ماری اور امن وامان کی پیاسی دنیا کی پیاس بجھا سکتے اور اسے امن وچین سے ہمکنار کرسکتے ہیں، جسے بے روح وبے جان مادی تہذیب نے پچھلی ربع صدی کے قلیل عرصہ میں دو عالم گیر جنگوں میں جھونک دیا۔ اور جو نتائج کا شعور کئے بغیر ابھی تیسری جنگ کی طرف قدم بڑھا رہی ہے، حالانکہ یہ تیسری جنگ اس پوری تہذیب ہی کے لئے ہلاکت کا سامان ہوگی۔

ظفر احسان نظامی

امنِ عالم کا واحد راستہ!

یہ بحرانی دور جس سے ہم گزر رہے ہیں عجیب متضاد خصوصیات کا حامل ہے۔ ایک طرف تو ہمیں انسان کی عظیم صلاحیتوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں پوری کائنات اس کے سامنے دست بستہ کھڑی ہو اور دنیا کا ایک ایک ذرہ اس کے اشارۂ چشم و ابرو پر حرکت کر رہا ہے اور دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں فطرت کی مسخر کی ہوئی یہ عظیم قوتیں خود نسل انسانی کی ہلاکت و تباہی کے لئے آزادانہ استعمال کی جا رہی ہیں۔ ایک طرف اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسان نے جوہری توانائی کو مسخر کر کے ایسا کارنامہ انجام دیا ہو جس پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہو تو دوسری طرف اسی توانائی کا مصرف یہ نکالا جا رہا ہو کہ ناگاساکی اور ہیروشیما کے لاکھوں انسانوں کو آن کی آن میں بھون ڈالا جائے مادی ترقی اور اخلاقی انحطاط نے جو عدم توازن پیدا کر دیا ہے اس کی وجہ سے دنیا آج ایک خاموش آتش فشاں بن چکی ہو جس سے نہ معلوم کب جنگ کا لاوا پھوٹ پڑے۔ مستقبل کی ہولناکیوں کے تصور سے ہر سوچنے سمجھنے والے انسان کا دل کانپ کانپ اٹھتا ہے، بالخصوص اس لئے کہ اپنے سارے سرمایۂ علم و دانش اور صدیوں کی مسلسل کاوش اور جاں کاہی سے حاصل شدہ سائنٹفک قوتوں کے باوجود انسان بے حد درماندہ اور بے بس ہے، اقبال کے ان الفاظ میں کتنی صداقت ہو:۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا   زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا!

اور یہی وہ احساسات ہیں جس نے T. S. ELIOT کو بھی یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ:۔

[1]
All our knowledge brings us nearer to our ignorance
All our ignorance brings us nearer to death.
But nearer to death no nearer to God.
Where is the life we have lost in living!
Where is the wisdom we have lost in knowledge!
Where is the knowledge we have lost in information!
The cycle of Heavens in twenty centuries ——
Brings us farther from God & nearer to death

---

[1] ہماری تمام معلومات ہمیں اپنے جہل سے قریب تر کرتی جا رہی ہیں
ہمارا سارا جہل ہمیں موت سے نزدیک تر کرتا جا رہا ہے
موت سے نزدیک، خدا سے نزدیک نہیں
وہ زندگی کہاں ہے جو ہم نے جیتے رہنے (یعنی دنیا کے کاروبار اور اس کے ہنگاموں میں) گنوا دی
وہ عقل کہاں ہے جو ہم نے علم حاصل کرنے میں ضائع کی ہے
وہ علم کہاں ہے جو ہم نے معلومات فراہم کرنے میں کھو دیا ہے
بیس صدی کی گردشیں فلک نے ہمیں خدا سے دور اور موت سے
قریب تر کر دیا ہے!!

لیکن اپنی سائنٹفک اور ٹیکنیکل ترقیوں کے نشے میں سرشار یورپ، اپنی تہذیب کے ہلاکت آفرین عناصر سے آنکھیں بند کئے، آگے بڑھا چلا جارہا تھا کہ پہلی جنگ عظیم ایک سیلِ عذاب کی طرح آکر اس کے غرور کے فلک بوس محلوں کو پیوندِ خاک کرگئی۔ اس صدمے سے ابھی یورپ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ پھر فضاؤں سے انسانی خون کی بارش ہونے لگی اور لکھوکھا انسانوں کے لاشے زمین پر تڑپنے لگے، سہاگ اجڑنے لگے گودیں سونی ہونے لگیں، عیش وعشرت سے جگمگاتے ہوئے شبستان شہر خموشاں میں تبدیل ہونے لگے، اور آج بھی جبکہ اس آگ کو فرو ہوئے چھ سال سے زیادہ ہوچکے ہیں، انسانیت کے اہم ترین مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ کس طرح اپنے وجود کو برقرار رکھے اور نسلِ انسانی کو جنگوں کی قیامت خیزیوں سے نجات دلائے!

اس مسئلے کا ایک حل تو وہ ہے جس کا محسوس اور مادی پیکر ہمیں یو-این-او (U.N.O.) کی شکل میں نظر آتا ہے یہ وہ تنظیم ہے جو مرحوم لیگ آف نیشنز کے طرز پر قایم کی گئی ہے۔ اس طرز فکر کے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اگر مختلف قومیں اپنے طرزِ عمل کو "بین الاقوامی اخلاق" کا پابند بنالیں، دوسرے قوموں کے جائز حقوق کا پاس رکھیں اور دنیا کے مشترک سماجی اور ثقافتی مسایل میں زیادہ مل جل کر اور زیادہ تعاون سے کام کریں اور ایک دوسرے کی مشکلات میں ہاتھ بٹانے لگیں تو دنیا کو امن کی روٹھی ہوئی بہار واپس مل سکتی ہے!

لیکن اس فکر میں جو بنیادی خامی ہے وہ یہ کہ یو-این-او کے طرز کی تنظیمیں ان بڑی بڑی قوموں کو جو محض اپنے مفاد کی خاطر دوسری قوموں کے حقوق پر ڈاکے ڈالتی ہیں، جو کمزور قوموں پر اپنا تسلط قایم کرنے اور ان کے معاشی وسائل کی لوٹ کھسوٹ میں مصروف رہتی ہیں اور جنھوں نے دوسری قوموں کی گردن میں آج بھی امپریلزم کا بھاری طوق ڈال رکھا ہے، وہ کسی طرح اس پر آمادہ نہیں ہوسکتیں کہ اپنے طرزِ عمل کو اخلاقی حدود کا پابند بنالیں اور اس قسم کی تنظیم (اگر وہ فی الواقع امن وانصاف کے قیام کی خواہاں ہو) تو بھی اس کے پاس اتنی قوت نہیں ہوتی کہ وہ ان کے سروں پر بہ جبر اپنے فیصلے کو تھوپ سکے اور انہیں اس پر مجبور کردے کہ وہ عدل وانصاف کا خون نہ کریں، یہ اس لئے ہے کہ اس تنظیم میں شامل ہونے والی قومیں اپنی مطلق العنانی Sovereignty سے دست بردار نہیں ہوتیں، بلکہ Internationalism کے لفظ میں ہی علیحدہ علیحدہ مطلق العنان قومی ریاستوں Sovereign National States کا وجود مضمر ہے، "انٹرنیشنلزم" کے بعد بھی اصل قوت انھیں قومی ریاستوں کے ہاتھ میں رہتی ہے!

علاوہ ازیں مادہ پرستانہ نظریۂ زندگی کے غلبے کی وجہ سے جس کے چنگل میں آج مشرق ومغرب ایک ایک کرکے پھنس گئے ہیں، زندگی کے عملی معاملات کی باگ ڈور اخلاق کے ہاتھ سے نکل چکی ہے ——— اب رہنمائی کے لئے صرف خود غرضانہ خواہشات، قومی مفاد کے تقاضے اور مفاد پرستی کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ اگر یہ قومیں کسی حد تک انصاف سے کام لیتی ہیں، تو وہ اس لئے نہیں کہ یہ کھلے دل سے ان اصولوں کا احترام کرتی ہیں، بلکہ اس لئے کہ خود ان کی "مصلحت" Expediency کا تقاضا یہی ہے۔ ان لوگوں نے انتہائی بے شرمی کے ساتھ سیاست کاری کے ان اصولوں کو اپنے سینے سے لگالیا ہے جو میکیاولی نے پیش کئے تھے ـــ اس لئے جہاں قومی اغراض کے حصول کی خاطر یہ ضروری ہو کہ مصلحت کا نقاب الٹ دیا جائے اور کھل کر دوسروں کے حقوق پر دست درازی کی جائے یا انصاف کا خون کیا جائے تو اس وقت یہ اس بیسویں صدی میں بھی مصر کی آزادی کو اپنے پیروں سے روندتے ہیں اور ٹیونس کے ابنائے وطن کے سینوں کو محض حریت پسندی

کے جرم میں اپنی گولیوں سے چھلنی کرنے میں انھیں کوئی شرم نہیں محسوس ہوتی۔
یو۔ این۔ او میں انھیں اغراض پرست قوموں نے غلبہ پایا ہے اور اس کا پانچ چھ سالہ کارنامہ ہماری سامنے ہے۔ جس کی بناء پر ہر ہوش مند انسان بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے۔ کہ یہ تنظیم چند خاص قوموں کے سامراجی اغراض کی تکمیل کا آلۂ کار بنی ہوئی ہے ورنہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ کوریا میں تو فوراً ہی فوجیں بھیجدی جائیں اور جب کشمیر کے لاکھوں انسان غلامی کے بوجھ تلے دبے ہوئے کراہ رہے ہوں تو یو۔ این۔ او صرف دفعہ بیٹھی رہے اور "تقریری مقابلے" منعقد کراتی رہے؟ اور اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ انصاف کے تمام اصولوں کو روند کر پوری عرب دنیا کے سینے میں ایک یہودی ریاست کا خنجر پیوست کر دے اور اس کو نہ صرف امریکہ اور برطانیہ کی بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ روس کی بھی تائید حاصل ہو؟ اور اس کی کیا وجہ ہے کہ جب برعظیم ہند و پاکستان میں لاکھوں بےگناہوں کا خون بہایا جا رہا ہو اور جب بچوں کو آگ میں بھونا اور نیزوں کی نوک پر اچھالا جا رہا ہو، اس وقت وہ دم بخود بیٹھی رہے اور جب حیدرآباد کے لاکھوں انسانوں کو ذبح کیا جا رہا ہو تو اس کے منہ سے اُف تک نہ نکلے؟ اور پھر اسکی کیا وجہ ہے کہ مراکش کے مظلوم انسانوں کی فریاد کو بھی سننے سے انکار کر دیا جائے جبکہ وہ صرف اپنی قومی آزادی کا حق طلب کر رہے ہوں؟ —— دراصل یو۔ این۔ او، جیسی تنظیموں سے اس کے علاوہ اور کوئی مقصد حل نہیں ہو سکتا کہ اچھے اچھے مباحثے منعقد ہوتے رہیں اور بعض سامراجی قوتوں کو اپنی صیادی کے لئے ایک نغز فریب جال مل جائے!

اس کے بعد معکر جن کا، ایک دوسرا گروہ ہے جو ایک عالمگیر انسانی سماج اور ایک جہانی ریاست کے قیام کا آرزومند ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل ذکر مفکر EMERY REVES ہے جس نے اپنی عظیم تصنیف ANATOMY OF WORLD PEACE کے ذریعہ سوچنے سمجھنے والے طبقے کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ ڈالا ہے۔

ریوز REVES کے نزدیک دنیا کے مسائل پر غور کرنے کے سلسلے میں ابھی تک ایک بنیادی خامی پائی جاتی رہی ہے، جن کے دور کئے بغیر ان مسائل کی گتھی کو کبھی نہیں سلجھایا جا سکتا۔ اس کے نزدیک دنیا کے بدلتے ہوئے حالات اس بات کے متقضی ہیں کہ اب انسان "قومی" زاویۂ نگاہ کو چھوڑ کر خالص "آفاقی" cosmopolitan اور انسانی زاویۂ نگاہ اختیار کرلے۔ اس کے نزدیک دنیا کے تمام مصائب کی جڑ اور بس کی گانٹھ اور سرچشمۂ فساد قوم پرستی nationalism ہے۔ اس نے کمیونزم اور سرمایہ داری کی مخالفت بھی اسی نقطۂ نظر سے کی ہے کہ یہ انسانیت کو اس لعنت —— نیشنلزم —— کی طرف لے جاتے ہیں۔

اپنی کتاب میں وہ INTER-NATIONALISM کی بھی شدت سے مخالفت کرتا ہے اور UNIVERSALISM کا داعی بن کر ایک ایسے جہانی ریاست - world state کا قیام چاہتا ہے جو تمام موجودہ آزاد قومی ریاستوں کے وفاق FEDERATION کے بعد قایم کی جائے۔ یہ ایک ایسی ریاست ہوگی جس میں قوموں کی متعلق الحنانی کے لئے کوئی مقام نہ ہوگا، بلکہ ساری قاہرانہ قوت اس وفاق کے پاس ہوگی۔ اس نے امریکہ کی ریاستوں[1] کے باہمی نزاعات کو بطور دلیل پیش کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جب کبھی دو سے

---

[1] امریکہ میں ریاستوں کی اب وہی حیثیت ہے جو ہمارے یہاں صوبوں کی ہے۔ اس سے پہلے البتہ وہ آزاد ریاستیں تھیں اور ان پر صحیح طور پر STATE کے لفظ کا اطلاق ہو سکتا تھا۔

زیادہ آزاد ریاستیں Autonomous States موجود رہی ہیں، تو ان میں برابر نزاع اور کشمکش صرف اسی وقت ختم ہوئی ہے جب ان ریاستوں نے اپنی آزادی سے دست بردار ہو کر اپنے کو ایک وفاق سے ملحق کر لیا ہے۔ اور اسی دلیل سے اس نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جب دنیا میں صرف ایک ہی "قوت" Authority باقی رہ جائے گی تو اس بات کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو گا کہ خوں ریزیاں ہوں۔

اس جہانی ریاست کا تصور کتنا ہی خوش آیند اور حسین کیوں نہ ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ آخر یہ "جنت ارضی" عالم وجود میں کیسے آئے گی؟ کس طرح دنیا کی سامراجی قوموں کو اس پر رضامند کیا جا سکے گا کہ وہ اپنی خود غرضیوں کو ترک کر کے اور اپنے ناجائز مفاد اور استحصال کا گلا گھونٹ کر، ایک بین الاقوامی وفاق میں اپنے کو ضم کر دیں؟

دنیا کی بڑی قوتیں کبھی بھی اس پر راضی نہیں ہو سکتیں کہ اپنی خود مختاری سے دست بردار ہو جائیں الا یہ کہ اس کے بعد بھی ان کے سامراجی عزائم کی تکمیل کے مواقع باقی رہیں۔

اس عالم گیر وفاق میں اگر ہم نمایندگی کی بنیاد آبادی کو تسلیم کر لیں تو آخر برطانیہ کس طرح اس پر رضامند ہو سکے گا کہ وہ اپنی پوزیشن کو گرا کر برما یا لنکا کی سطح تک لے آئے؟ اور اگر نمایندگی کا اصول یہ ہو کہ ہر ریاست خواہ اس کی آبادی اور اس کے اثرات کچھ ہوں، اس وفاق میں مساوی المرتبہ متصور ہو گی، تو اس صورت میں روس اور امریکہ اس ایثار پر کیسے تیار ہو سکتے ہیں کہ وہ سوئٹزرلینڈ کے برابر اپنی پوزیشن پر مطمئن اور قانع ہو جائیں؟ اور اگر ان قوموں کی قوت کے پیش نظر ان کو کچھ مراعات دی جاتی ہیں تو اس سے وہ مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے جس کے پیش نظر جہانی ریاست کے قیام کی تجویز سوچی جا رہی ہے، کیوں کہ اس طرح وہی ناانصافیاں ایک نئے نقاب کے ساتھ موجود رہیں گی جن کی وجہ سے امن عالم کے پارہ پارہ ہو جانے کا خدشہ پیدا ہو چلا ہے۔

ایمری ریوز Reeves کی یہ دلیل کہ کسی علاقے پر ایک مرکزی قوت central authority کا وجود اس بات کی قوی ضمانت ہے کہ نزاعات دب جائیں گی اور وسیع پیمانے پر خوں ریزیاں نہ ہو سکیں گی، بدیہی طور پر غلط ہے۔ خود چین کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہاں جب ظلم اور ستم سہتے سہتے عوام تنگ آ گئے تو انھوں نے اس بے انصافی کو ختم کرنے کے لئے علم بغاوت بلند کر دیا کیوں کہ انھیں اس ظلم کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینکنے کی اس کے علاوہ اور کوئی شکل نظر نہ آتی تھی کہ تشدد اور خوں ریزی کے ذریعہ "آقاؤں کے جبوں کی طناب" توڑ ڈالی جائے۔ چین میں اگرچہ صرف ایک ہی مرکزی حکومت تھی لیکن پھر بھی چین کے لوگ جانتے ہیں کہ انہیں اس ظلم کو ختم کرنے کی جدوجہد میں خون کی کتنی ندیاں بہانی پڑی ہیں۔ اگر مجوزہ عالم گیر وفاق میں بھی یہی بے انصافیاں موجود رہیں تو محض یہ بات کہ قوت قاہرہ صرف ایک مرکز پر جمع ہو گئی ہے، concentrated کبھی بھی نقض امن کے امکانات کو ختم نہیں کر سکتی اور اس جہانی ریاست میں بھی، اس قسم کی خانہ جنگی رونما ہو سکتی ہے جس طرح چین میں ہو چکی ہے۔

لیکن تجربے کی اس خامی کے باوجود ہم یہ بات کھلے دل سے تسلیم کرتے ہیں کہ قوم پرستی دنیا کے لئے ایک بہت بڑی لعنت ہے۔ کیوں کہ "قوم پرستی" صرف یہی نہیں کہ اپنے قوم کی محبت سکھاتی ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ "قومی مفاد" کو ایک بت بنا دیتی ہے جس کی قربان گاہ پر اخلاقی اصولوں کو بھینٹ چڑھا دینا لازمی ہو جاتا ہے اور اس کی پوری عمارت قومی مستقبل ... [illegible] پر کھڑی ہوتی ہے جوزف ... Joseph

نے بہت صحیح بات کہی ہے :-

. . . . ہر قوم دوسری قوم کے نقصان پر پھلنے پھولنے کی کوشش کرتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوموں کے درمیان رقابت، شبہات، خوف اور نفرت کے جذبات پرورش پاتے ہیں۔ معیشت کے میدان میں بین الاقوامی مسابقت سے لیکر کھلے میدان میں فوجی تصادم تک سیدھا راستہ جاتا ہے۔ اور یہ بہت قریب کا راستہ ہے :

یہ نظریات بلاشبہ ایک قوم کے افراد کو دوسری تمام قوموں کے لئے درندہ بنا دیتے ہیں اور اس سے Misanthropy (انسانیت سے نفرت) اور قوم و وطن سے فطری حدود پھاند جانے والی محبت Chauvinism کو پروان چڑھانے کا موقع ملتا ہے، لیکن نیشنلزم کا جذبہ صرف اس وقت فنا ہو سکتا ہے جب کوئی قوی تر داعیہ اور کوئی مضبوط تر جذبہ آکر اس کا گلا گھونٹ دے۔ مگر ڈیوز اور دوسرے مفکر ایسا کوئی جذبہ انسان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں پیدا کر سکے۔ انسانیت کا تصور جسے Auguste Comte وغیرہ پیش کر چکے ہیں، اس میں اتنی جان موجود نہیں کہ پوری انسانیت کے ذہن کو محدود اور تنگ ہونے سے روک سکے اور اس کو بلند اور برتر تقاضوں کی تکمیل کی جانب راغب کر سکے۔

اشتراکی نقطۂ نگاہ

اس کے بعد مسئلہ امن اور جنگ پر وہ تجزیہ پیش کیا جاتا ہے جو اشتراکی نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کرتا ہے۔ اشتراکی حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی میں اصل فیصلہ کن اہمیت خیالات اور افکار اور اخلاقی نظریات اور سیاسی نظام کو حاصل نہیں بلکہ اصل اہمیت اور فیصلہ کن اہمیت معاشی حالات کو حاصل ہے۔ ایک سماج کی تشکیل میں اصل فیصلہ کن چیز اس عہد کا معاشی نظام ہی ہوا کرتا ہے اور یہی معاشی نظام فلسفہ اور مذہب اور اخلاقی تصورات اور سیاسی زندگی کی صورت گری کرتا ہے۔

ان لوگوں کے نزدیک جنگ کے اصل اسباب بھی اس غلط معاشی نظام میں پنہاں ہیں جو آج دنیا میں رائج ہے۔ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام، جس نے اگرچہ تاریخ کے ایک خاص عہد میں سوسائٹی کو ارتقا کی شاہراہ پر جادہ پیما کر دیا تھا، اب اپنی افادیت کھو کر پیش پا افتادہ اور کرم خوردہ ہو گیا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد ہی ایک طبقے پر دوسرے طبقے کے تسلط اور ناجائز انتفاع اور لوٹ کھسوٹ پر ہے۔ یہ نظام سوسائٹی کی دولت کو چند ہاتھوں میں مرتکز کرتا ہے، یہ عوام الناس کو ضروریات زندگی سے محروم اور فقر و فاقہ میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ نظام قانونی ڈاکہ زنی پر مبنی ہے اور اس کا نتیجہ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ "بورژوا" طبقہ مزدوروں اور محنت کشوں کا خون چوستا رہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کے اندر عجیب و غریب تضاد نظر آتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ ناکارہ ہو چکا ہے اور بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ سرمایہ دارانہ نظام فراوانی اور کثرت پیداوار کے باوجود افلاس اور بھوک پیدا کرتا ہے۔ اس نظام کی ایک عجیب غریب خصوصیت وہ ہے جسے Over Production کثرت پیداوار سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس عجیب و غریب حالت کی تشریح کارلائل نے اپنے مخصوص انداز میں یوں کی ہے کہ ایک طرف بیس لاکھ انسان ایسے موجود ہیں جن کی پیٹھیں قمیص نہ ہونے کی وجہ سے ننگی ہیں اور دوسری طرف بازار

میں بیسیوں لاکھ قیمتیں پڑی ہوئی ہیں، کیوں کہ ان کے خریدار موجود نہیں!

پھر سرمایہ دارانہ نظام نفع اندوز طبقات کو ضروریات زندگی کے ذخیرے جمع کرکے رکھنے کا اختیار دیتا ہے تاکہ وہ ان کی قیمتیں چڑھا سکیں، اور اس کا اختیار بھی دیتا ہے کہ وہ کپاس کی ہزاروں گانٹھیں جلا ڈالیں، قہوہ اور نارنگی کو سمندر میں ڈبودیں اور غلہ کو تباہ کرڈالیں ـــــ جبکہ دنیا کے مفلوک الحال مزدور اور غریب طبقے بھوک سے تڑپ رہے ہوں اور سردی سے کانپ رہے ہوں!

پھر سرمایہ دارانہ نظام پر بحران مدوجزر کی طرح آتے ہیں۔ اس نظام میں بار بار Boom and Depression یعنی گرم بازاری اور سرد بازاری کے چکر آتے رہتے ہیں جن کی وجہ سے بے شمار خاندان اُجڑ جاتے ہیں اور لاتعداد انسان بے روزگاری کی بھیانک تکالیف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سرمایہ دار اپنے ملک کے محنت کش طبقات سے استحصال کے بعد اس بات پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ پسماندہ ملکوں کی خام اشیاء اور وہاں کی سستی محنت کو استعمال کریں اور اپنے Finance Capital کی کھپت کے لئے غیر ترقی یافتہ ممالک پر قبضہ کریں۔ اسی کی وجہ سے نوآبادیاتی نظام وجود میں آتا ہے اور اسی کی وجہ سے مختلف قوموں کے باہمی رقابت کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔

کمیونسٹوں کا کہنا یہ ہے کہ اب سرمایہ داری امپیریلزم کے دور میں داخل ہو گئی ہے اور اب اس نظام کی مشین اس قدر زنگ آلود ہو گئی ہے کہ بار بار اس میں "انسانی خون" ڈال کر اسے کام کرنے کے لائق بنانا پڑتا ہے۔ یہی وہ ضرورت ہے جس کی وجہ سے نسل پرست NAZISM اور FASCISM جیسے نظام ہائے حیات پیدا ہوئے، جو جنگ کی قصیدہ خوانی کرتے رہتے ہیں اور اسے انسانیت کے لئے ایک نعمت قرار دیتے ہیں۔

اس طرح کمیونسٹوں کا خیال ہے کہ جنگ کے اصل اسباب "معاشی" ہیں، ان کے نزدیک یہ معاشی حالات ہی ہیں جن سے بین الاقوامی نزاعات پیدا ہوتی ہیں اور جب تک یہ درست نہ ہو جائیں اس وقت تک دنیا میں امن اور خوش حالی قایم نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے جنگ کو ختم کرنے کا ذریعہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ تمام مظلوم طبقات سرمایہ دارانہ نظام کے قصر کو گرا کر اس پر ایک نئے سماج کی عمارت تعمیر کریں، خود امن کانفرنس منعقدہ پیرس میں پروفیسر فنڈرک نے کہا تھا کہ

"دنیا کے مزدور ایک ہو کر معاشی بنیادوں پر لڑیں تب یہ فساد و طغیان ختم ہو سکتا ہے"۔

اور اس جدوجہد کا جو نقشہ کمیونسٹ مفکرین کے سامنے ہے وہ ایک خونیں انقلاب کا ہے۔ کمیونسٹوں کے نزدیک انقلاب تشدد آمیز ذرائع کو استعمال کئے بغیر آ ہی نہیں سکتا۔ اس کی وضاحت بالخصوص لینن کی تحریروں میں جابجا ملتی ہے۔

کمیونسٹوں کا تجزیہ صرف ایک حد تک صحیح ہے، لیکن اس تجزیے میں بھی ایک رخنہ موجود ہے۔ اس تجزیے میں معاشی عوامل کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیدی گئی ہے اور دوسرے عوامل مثلاً

اخلاقی اور سیاسی عوامل کی اہمیت پوری طرح محسوس نہیں کی گئی ہے۔ اور ایک پیچیدہ اور اُلجھے ہوئے مسئلے کو "فارمولا" کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کمیونسٹ حضرات اس واضح حقیقت کا بھی انکار کرتے ہیں کہ معاشی نظام ان تصورات کا پیدا کردہ ہوتا ہے اور ان سے متاثر ہوتا ہے جو کائنات، زندگی اور اس نوع کے بعض دوسرے بنیادی مسائل کی بابت معاشرے میں جاگزیں ہوتے ہیں۔

کمیونسٹوں کا ایک اور غلط مفروضہ یہ ہے کہ انسانی زندگی میں جو بگاڑ پیدا ہوا ہے اس کی بنیادی وجہ صرف وہ غلط خارجی اجتماعی ماحول External social environment ہے جس میں انسان پیدا ہوتا یا بڑھتا ہے، لہٰذا اگر اس ماحول کو بدل دیا جائے تو انسان کا اخلاق "لازماً" بلند سطح ہو جائے گا۔ اس لئے کمیونسٹوں کے نزدیک افراد کے اخلاقی اصلاح کی کوشش کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ Reinhold Niebuhr نے اس سلسلے میں بڑی عمدہ بات کہی ہے:-

"مارکسیوں کا یہ مفروضہ غلط ہے کہ ناانصافی کی وجہ صرف ایک غلط اجتماعی نظام میں پنہاں ہے اور یہ کہ سرمایہ داری کے انہدام کے بعد انسانوں میں۔ تو اپنے ابنائے نوع سے ناجائز نفع اندوزی اور استحصال کی خواہش بھی باقی رہ جائے گی اور ان کے پاس اس کی قوت ہی باقی رہ جائے گی۔ دوسرے الفاظ میں ان کے ذہن میں انسانی فطرت کا ایک رومانی تصور جاگزیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ان لوگوں کی نگاہیں اس کھلی ہوئی حقیقت کا بھی ادراک نہیں کر پاتیں کہ اگر سوسائٹی میں معاشی مساوات پیدا ہو بھی جائے تو بھی اس کام کے لئے سیاسی قوت کا ہونا ناگزیر ہے۔ اس سیاسی قوت کی تقسیم غیر مساوی ہو سکتی ہے جس سے بے انصافی کے لئے دروازے کھل جائیں گے"

سچی بات یہ ہے کہ جب تک خود انسان کے طریق فکر و نظر، اس کی اقدار، اس کے معیار ترک و اختیار اور بہ حیثیت مجموعی اس کے اخلاقی رویہ میں تبدیلی رونما نہ ہو، اس وقت تک خواہ کوئی نظام مسلط کر دیا جائے لیکن انسان کی انتفاع پسندانہ ذہنیت کے باقی رہنے سے خود غرضیاں نئی نقاب اوڑھ کر آتی رہیں گی۔

اقبالؔ کا یہ شعر کتنا صحیح ہے ؎

اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات   بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں

یہ خامی صرف کمیونزم میں ہی نہیں ہے بلکہ اس کا شکار عہد حاضر کی تمام تحریکیں ہیں۔ حیرت تو یہ ہے کہ ان مفکرین کے ذہن میں یہ بات بھی نہیں آتی کہ انسان اگر ایک طرف اپنے خارجی زندگی کے اثرات قبول کرتا ہے تو دوسری طرف خود خارجی زندگی کو متاثر بھی کرتا ہے۔ یہ بات سراسر مہمل ہے کہ وہ محض اپنے ماحول کی پیداوار ہے کیوں کہ اگر یہ مان لیا جائے تو پھر سرمایہ داروں کے مظالم پر ان کو برا بھلا کہنا ایک سراسر لغو اور احمقانہ بات ہوگی۔

ہم کو اس سے انکار نہیں کہ انسان پر اُس کا اجتماعی ماحول برابر اثر ڈالتا رہتا ہے، لیکن ہمارے نزدیک انقلاب اور اصلاح کی سوتیں جب تک خود انسان کی داخلی زندگی میں نہ پھوٹیں اور جب تک خود انسان کے دل میں احساس ذمہ داری اور احترام انسانیت اور بلند اخلاقی اقدار سے محبت نہ پیدا ہو جائے اس وقت تک محض معاشی یا سیاسی زندگی کی ہیئت میں کچھ تغیرات پیدا کرنے سے کوئی پائدار اور مفید نتیجہ نہیں برآمد ہو سکتا —— کیونکہ دنیا کو آج صرف

ایک "نظامِ نو" کی ضرورت نہیں بلکہ وہ ایک آدمِ نو کی بھی سخت ضرورت مند ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی نہیں کہ مکان کے در و بام بدل جائیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ "مکین" کا بدلا جانا بھی ضروری ہے!

ایک جگہ اپنے مضمون میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے بھی اس خیال کی پرزور تردید کی ہے کہ محض معاشی انقلاب کسی صالح تغیر کا ضامن ہو سکتا ہے اور روس کے حالات بھی اس بات پر گواہ ہیں کہ یہ نظام کوئی "نیا انسان" نہ پیدا کر سکا، آندرے ژید Andre Gide نے روس کے حالات پر جو تبصرہ لکھا ہے اس میں اس نے بھی اسی پہلو کو نمایاں کیا ہے۔

کمیونزم کے ذریعے امن کا قیام خاص طور پر اس لئے بھی نہیں ہو سکتا کہ اس کی بنیاد طبقاتی جنگ اور تفریقِ انسانیت پر ہے۔ کمیونزم اپنے ساتھ تشدد پسندانہ جذبات اور چڑچڑے پن کا ایک ہجوم لیکر آتا ہے۔ وہ ایک انتقامی رجحان کا مظہر ہے، اس کے ہاتھ میں ڈاکٹر کا نشتر نہیں بلکہ قصاب کا چھرا ہے —— وہ چاہتا ہے کہ پہلے سوسائٹی کو دو طبقات میں منقسم ہونے کا احساس دلائے، پھر اس احساس کو نفرت میں تبدیل کرتا جائے، پھر ان کو آپس میں دست و گریباں کر دے، کوئی کمیونسٹ انقلاب شدید خوں ریزی کے بغیر آ ہی نہیں سکتا کیوں کہ کمیونزم کا مزاج ہی یہ ہے، اور روسی انقلاب تو بلاشبہ تاریخ کا سب سے زیادہ خوں ریز اور ہلاکت آفریں انقلاب ہے —— —— Mr. Joad کے اندازے کے مطابق اس انقلاب میں تقریباً انیس بیس لاکھ افراد ہلاک ہوئے، بیس لاکھ کو سخت سزائیں دی گئیں اور پچاس لاکھ افراد ملک بدر کئے گئے —— چین میں جو اشتراکی انقلاب آیا ہے اس میں بھی کافی وسیع پیمانے پر انسانوں کا خون بہایا گیا ہے تفصیلات میں پڑے بغیر ہم محض نمونہ کے طور پر یہ واقعہ درج کریں گے کہ صرف صوبہ کینٹن کے نائب گورنر کے پیش کردہ اعداد و شمار کے مطابق اکتوبر ۱۹۵۰ء سے اگست ۱۹۵۱ء (دس مہینے کے عرصہ میں) اس صوبے میں ۲۸۳۳۲ "انقلاب دشمن" افراد موت کے گھاٹ اتار دئے گئے۔ اس موقعہ پر برٹرنڈ رسل کا ایک انتہائی حکیمانہ جملہ یاد آ رہا ہے جو اس نے اپنی Roads to Freedom میں لکھا ہے:-

"There is no alchemy by which a universal harmony can be produced out of hatred."

اس کے علاوہ ہمارے نزدیک کمیونزم، دوسرے مادہ پرستانہ اور بے خدا نظام ہائے حیات کی طرح، انسانیت کو کوئی ایسا خارجی ضابطۂ اخلاق نہیں دے سکتا جو تمام انسانوں کے نزدیک یکساں قابلِ اتباع ہو۔

ایسے ضابطۂ اخلاق کا موجود ہونا ہمارے نزدیک ناگزیر ہے، مختلف قوموں کو ان کی مرضی پر نہیں چھوڑا جا سکتا، کیونکہ اس صورت میں وہ اپنے مفاد اور اغراض کی پیروی میں اندھی ہو کر جادۂ اعتدال سے دور جا پڑتی ہیں۔ اس کے علاوہ جب تک مختلف قوموں کے درمیان کچھ اصول متفق علیہ نہ ہوں گے، اس وقت تک ان میں باہمی اعتماد نہیں پیدا ہو سکتا۔ [اس مسئلے پر The Challenge of Our Age میں بڑے تفصیل سے اور بہت سائنٹفک انداز میں بحث کی گئی ہے] اور یہی بے اعتمادی آج بھی اسلحہ سازی کے جنون میں قوموں کو مبتلا کئے ہوئے ہے!

انسان آج بھی اس بات کا اتنا ہی شدید ضرورت مند ہے کہ کوئی بالاتر ہستی اس کی رہنمائی کرے اور اس کے لئے اٹل اصول و ضوابط دے اور جو اس کی سرگرمیوں کے لئے ایسے حدود فراہم کرے کہ وہ جادۂ انصاف سے

ہٹ نہ سکے یہ بات کہ انسان نے ذہنی ترقی کی بڑی کوئی وزن نہیں رکھتی کیوں کہ اس بیسویں صدی میں بھی دنیا کی انتہائی ترقی یافتہ اور روشن خیال قوموں میں ہٹلر اور مسولینی جیسے منتشر رہنماؤں کے نظریات سے مسحور ہو کر اور ان کے وجد آفریں نعروں سے متاثر ہو کر انتہائی بربریت کا ثبوت دے سکتی ہیں۔

کسی متعین اور متفق علیہ ضابطۂ اخلاق کی عدم موجودگی کی وجہ سے انسان کی [illegible] پسندی کو ایک غیر محدود میدان مل گیا ہے —— اسی لئے یہ بات ناگزیر ہے کہ ایک مافوق الفطرت اور مافوق [illegible] ہستی کے دئے ہوئے ضابطۂ اخلاق کو قبول کر لیا جائے اور انسان خود اپنی حاکمیت اور قانون سازی کے اختیار سے دست بردار ہو کر اپنی باگ کسی الہامی ہدایت کے سپرد کر دے۔

ابھی تک ہم مغرب کی جن تحریکوں کا مطالبہ کرتے آئے ہیں، ان کو امن قائم کرنے کے سلسلے میں جو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ :-

انھوں نے انسان کی باطنی اصلاح اور داخلی انقلاب اور اس کے اخلاقی شعور کو بیدار کرنے کی اہمیت کو نظر انداز کیا اور کوئی ایسا خارجی ضابطۂ اخلاق (objective moral code) فراہم نہ کیا تمام انسان جس کا ماخذ انسان کی خواہشات، میلانات تعصبات یا گروہی، قومی اور نسلی اغراض کے بجائے کسی ایسی ہستی کی مرضی ہو جو ان عیوب سے پاک اور منزہ ہو——

انھیں وجوہ کی بنا پر ہر انصاف پسند انسان کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ امن عالم کے قیام کے سلسلہ میں اسلام ایک عظیم پارٹ ادا کر سکتا ہے۔

سب سے پہلے اسلام انسان کے دل میں اس حقیقت کا ادراک پیدا کرتا ہے —— اور اس کے لئے وہ آفاق و انفس کے بے شمار دلائل دیتا ہے —— کہ اس کی تخلیق ایک حکیم اور قادر مطلق نے کی ہے۔ اس کی زندگی کا ایک مقصد ہے اور وہ اس زندگی کو گزار کر اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے جائے گا اور اس کے سامنے پورا کارنامۂ زندگی پیش کریگا، جس کی بنیاد پر اسے ابدی راحت سے نوازے جانے یا کبھی نہ ختم ہونے والی کلفتوں اور اذیتوں کی سزا دئے جانے کا فیصلہ ہوگا۔ اسلام اس بات پر بھی پورا زور استدلال صرف کر دیتا ہے کہ انسان کی زندگی یہیں اسی عالم آب و گل میں ختم ہو کر نہ رہ جائے گی بلکہ کسی نے اگر ایک ذرہ برابر برائی کی ہے تو وہ اس کو دیکھ لے گا اور اگر ایک ذرہ برابر نیکی کی ہے تو وہ اس کو بھی دیکھ لے گا، کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو یہ پوری زندگی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے یا Prof. Joad کے الفاظ میں a vulgar joke wagging across the mysteries ...

اسلام نے اس مضبوط بنیاد پر انسانی سیرت و کردار کی تعمیر کی ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے علاوہ اخلاق کی تعمیر کا کوئی اور مضبوط محرک ہو ہی نہیں سکتا۔ یہی وہ جذبہ ہے جو انسان کو قوت کے نشے میں بہکنے نہیں دیتا اور اس میں اتنی عالی ظرفی پیدا کرتا ہے کہ وہ معمولی سے معمولی انسان کی تنقید کو بھی سن سکے اور اس میں اتنا احساس ذمہ داری پیدا کر دیتا ہے کہ انسان اس خوف سے کانپ کانپ اٹھتا ہے کہ مبادا اس کی حدودِ مملکت میں بسنے والا کوئی انسان تکلیف میں ہو،

اس کے بعد اسلام انسانی خون کا احترام کرنا سکھاتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ اگر کسی نے ایک جان کو بھی ناحق قتل

کیا تو گویا اس نے پوری نوع انسانی کو تہ تیغ کر ڈالا۔ من قتل نفساً بغیر نفسٍ او فسادٍ فی الارض فکانما قتل الناس جمیعاً (بنی اسرائیل)

اس کے بعد اسلام انسان کو یہ بتاتا ہے کہ یہ پوری نسل انسانی ایک آدمؑ سے پیدا ہوئی ہے، جو مٹی سے بنائے گئے تھے، نیز یہ کہ اللہ نے انسانوں کو جو مختلف قبیلوں اور قوموں اور نسلوں میں بانٹ دیا ہے اس کی غایت اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس طرح وہ ایک دوسرے سے شناخت کئے جا سکیں، یہ تقسیم اس لئے نہیں ہے کہ ایک قوم یا نسل دوسری نسل یا قوم کو ادنیٰ اور برتر تصور کرنے لگے یا اپنے اوپر "تہذیب آموزی" [illegible] [illegible] کا بوجھ خواہ مخواہ محسوس کرنے لگے۔ اس نے نسلی اور قومی امتیازات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی دنیا کو یہ پیغام دیا کہ کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، کیونکہ انسان کا اصل سرمایۂ افتخار اور اس کی انسانیت کا اصل جوہر رنگ کی سپیدی و سیاہی یا کسی خاص خطے میں بسنے میں مضمر نہیں بلکہ اس بات پر منحصر ہے کہ اس کا دل خوفِ خدا سے معمور ہے یا نہیں اور اس کی زندگی میں نکوکاری اور راستی کا نور موجود ہے یا نہیں!

[illegible] نے نسل پرستی کی کمر توڑ دی اور اس کی تلوار کو کند کر دیا، آنحضور صلعم نے پوری قوت سے اعلان کر دیا کہ:-

"میں گواہی دیتا ہوں کہ تمام انسان بھائی بھائی ہیں"

اور

"پوری نسلِ انسانی خدا کے کنبے کی مانند ہے"

آپ کا پیغام نوع انسانی کے نام یہ تھا:-

کونوا عباد اللہ اخواناً (اللہ کے بندے اور
آپس میں بھائی بن کے رہو)

پھر اسلام نے ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات دیا جو زندگی کے تمام شعبوں میں ہمارے لئے راہِ عمل کو متعین کر دیتا ہے اور انسان کی فکر و عمل کے لئے ایسے حدود فراہم کرتا ہے جن میں اپنے کو محدود رکھنے سے انسانیت کا مجموعی مفاد مجروح نہیں ہوتا [illegible] انسان کی مفاد پرستی کو کھلی چھٹی نہیں مل جاتی۔ اس طرح اسلام انسانیت کے لئے وہ خارجی ضابطۂ اخلاقی ethical moral code فراہم کر دیتا ہے جس کے نہ ہونے کے سبب (جیسا کہ [illegible]) خواہش و مفاد کا تصادم رونما ہوتا رہتا ہے اور دنیا جنگ و تباہی کی آگ میں جھونک دی جاتی ہے ..... پھر یہ کہ اس پورے نظام زندگی کی بنیاد کسی انسان کی عقل اور کسی قوم کی مرضی پر نہیں ہے، لہٰذا اس میں اس بات کی پوری پوری گنجائش موجود ہے کہ اسے پوری انسانیت قبول کر لے اور یہ دنیا کے نئے نظام کی اساس قرار پا جائے ..... خصوصاً ایک ایسی دنیا کے لئے تو یہ اور بھی زیادہ قابل قبول ہے جو سرمایہ داری اور کمیونزم جیسے متضاد [illegible] سے تنگ آ رہی ہو اور ایک معتدل اور متوازن ضابطے کی سخت حاجت مند ہو!

[illegible] اسلام انسانیت کے لئے وحدتِ الٰہ اور وحدتِ نسلِ آدم کی بنیاد فراہم کرنے کے علاوہ ایک مشترک [illegible] بھی کہ پوری نسلِ انسانی کے اتحاد کے امکانات کو اور بھی قوی کر دیتا ہے ..... لیکن

اسلام کا کارنامہ صرف اسی حد تک محدود نہیں، بلکہ اسلام اس سے ایک قدم آگے [illegible] مخصوص
پارٹی (امتِ مسلمہ) کی تشکیل کرتا ہے اور اس کا مقصد ہی یہ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے محدود قسم کے [illegible] ہو کر
پوری انسانیت کی خدمت بجا لاتی رہے (کنتم خیر امۃ اخرجت للناس) [illegible]
مامور کرتا ہے کہ وہ برائیوں کو دبانے اور نیکیوں کو پروان چڑھانے میں اپنی ساری توانائی [illegible]
اور "شہداء علی الناس" کے منصبِ بلند پر سرفراز کر کے اس کے ابرِ کرم سے [illegible]
اور اس کو پہاڑی کا وہ چراغ بنا دیتا ہے جس سے ہر گم کردہ راہ کو ہدایت کی روشنی حاصل ہوتی رہے [illegible] امت کا
مقصدِ وجود ہی یہ ہے کہ وہ دنیا سے ظلم و ستم کا استیصال کرے اور انصاف کو قائم کر دے (لیقوم الناس بالقسط) اور
ہر مظلوم کو ظلم و ستم سے چھٹکارا دلانے کے لئے اس وقت تک مسلسل جہاد کرتی رہے، جب تک کہ فتنہ و فساد [illegible]
نہ ہو جائے اور انسانوں کی آقائی اور خداوندی کے تمام طوق و سلاسل کٹ نہ جائیں (وقاتلوھم حتی لا تکون
فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ)۔

اگر دنیا میں یہ حق پسند اور حق پرست جماعت اپنے مشن کو پورا کرنے میں پوری طرح [illegible] اس کے
ہاتھ میں قوتِ اقتدار بھی رہے (جس کے حصول کے لئے اس کو ابھارا گیا ہے) تو اس کی [illegible] دلوں
کا دل دہلا دینے کے لئے کافی اور امنِ عالم کی مضبوط ترین ضمانت ہے! [illegible] جب تک [illegible] وقت
موجود نہ ہوگی جو محض خدا کی خوشنودی کے لئے جیتی اور مرتی ہو اور جو پوری دنیا سے برائیوں کا [illegible]
اور خون کی پرواہ نہ کرتی ہو، اس وقت تک خواہ امنِ عالم کے لئے دستخطوں کی ہزارہا مہمیں چلائی جائیں اور [illegible]
جیسی لاکھوں تنظیمیں وجود میں آ جائیں لیکن ابنِ آدم کی مظلومی کا دور کبھی ختم نہ ہو سکے گا اور کمزور اور زیر دست برابر پیسے
جاتے رہیں گے ——— آج بھی ظلم و ستم کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی دنیا ان خدا پرست مجاہدین کی راہ تک رہی ہے
جن کے حوصلوں میں بلندی، جن کے ارادوں میں استقامت ہو اور جن کے کردار نیکی اور تقویٰ کے سانچے میں ڈھلے ہوئے
ہوں جن کی زندگی کا مقصد برائیوں کو مٹانا اور بھلائیوں کو پھیلانا ہو، جو خدا کے سوا اور کسی طاقت سے نہ ڈرتے ہوں، جن
کے نفسِ گرم سے صداقت کی خوشبو آتی ہو، جو ظالموں کے حق میں فولاد سے زیادہ سخت اور مظلوموں کے لئے حریر و دیبا
سے بڑھ کر نرم ہوں ——— کراہتی ہوئی انسانیت مردِ مومن کو آواز دے رہی ہے، پکار رہی ہے [illegible] ہے ——

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

شوق کمندی

اذانِ بُت کدہ

سوزِ دل ناتمام ہے اب تک
دل ہوس کا غلام ہے اب تک

راج ہر سمت ہے دورنگی کا
یہ بھی کیا عہد ہے فرنگی کا

زلف و رخسار کی نمایش ہے
ہر نفس معصیت کی سازش ہے

دل اسیرِ نگارِ شوخ و شنگ
گوش رہنِ صدائے ساز و چنگ

صبحِ روشن پہ ظلمتوں کا راج
موجِ طوفاں پہ بلبلے کا تاج

بُت ہیں پوشیدہ آستینوں میں
پستیاں ہیں فلک نشینوں میں

ذوق آسائشوں کے طالب ہیں
خواب بیداریوں پہ غالب ہیں

معصیت کوش پاکبازوں میں
دل گناہوں میں سر نمازوں میں

ولولے جلترنگ میں گم ہیں
روز و شب راگ رنگ میں گم ہیں

چاک دل کون ہو بہاروں میں
نوجواں کھو گئے نظاروں میں

جرأتیں ہیں نہ جوشِ ایمانی
خود فروشی کا نام قربانی

لب پہ مُہریں، ضمیر پر تالے
اُجلے اُجلے لباس دل کالے

جھوٹ، لالچ، فریب، عیاری
عام حرص و ہوس کی بیماری

ہائے فکر و نظر کی رسوائی
جو بھی انداز ہے کلیسائی

زہر ہر آن پی رہے ہیں لوگ
پھر بھی افسوس جی رہے ہیں لوگ

سازشیں بھی ہیں اور بغاوت بھی
ایک سے ایک کو عداوت بھی

خار ہر سمت رہگزاروں میں
نور باقی نہیں ستاروں میں

کون طوفاں کے رُخ کو موڑے گا
کون ٹوٹے دلوں کو جوڑے گا

جذبِ مستی سے کام لے گا کون؟
بتکدوں میں اذان دے گا کون؟

بیت الشعر

بہار کوٹی

کانٹوں سے پُر ہو شاخِ گُلِ آشیاں ہی کیوں نہ ہو — غم ناگزیر ہے غمِ جاناں ہی کیوں نہ ہو
دامانِ نازدور نہیں دستِ شوق سے — وہ پر سبیلِ خوابِ پریشاں ہی کیوں نہ ہو
تکمیلِ آرزو کو پڑی ہے تمام عمر — کچھ دیر شغلِ چاکِ گریباں ہی کیوں نہ ہو
دورِ نگاہِ مست سے کب تک چلے گا کام — ساغر نہیں تو گردشِ دوراں ہی کیوں نہ ہو
ساحل کی فکر کر نہ سفینے کی آرزو — موجوں سے کھیل شورشِ طوفاں ہی کیوں نہ ہو
دل ناصبور ہے سو احُسن ناصبور — راس آ نا شرط ہے غمِ جاناں ہی کیوں نہ ہو
بے کیفیوں نے بخش دیا کیفِ لازوال — اب زحمتِ نوازشِ پنہاں ہی کیوں نہ ہو
بنتے ہیں آفتاب اُمیدوں کی جوت سے — بجھنے نہ پائے شمعِ شبستاں ہی کیوں نہ ہو

دُنیا ہے دے گی طعنۂ سعیِ سکوں بہار
لازم ہے احتیاطِ گریباں ہی کیوں نہ ہو

راغب مرادآبادی

ترے ستم پہ کرم کا گماں بھی ہوتا ہے — کہ یہ سلسلۂ امتحاں بھی ہوتا ہے
وہ دل کہ جس کی نزاکت پہ بوئے گل بھی ہو بار — امینِ دولتِ دردِ نہاں بھی ہوتا ہے
عتابِ دوست یقیناً عتاب ہے لیکن — کبھی کبھی یہی آرامِ جاں بھی ہوتا ہے
سمجھ گئے وہ نگاہوں سے مدعا دل کا — سکوت دلکشِ حُسنِ بیاں بھی ہوتا ہے

خلوص حد سے گزر کر کبھی کبھی راغب
حریفِ رابطۂ دوستاں بھی ہوتا ہے

[illegible]ت ابل اجمیری

نہ گھبرا شبِ ہجر کی تیرگی سے — سحر بھی نمودار ہوگی اسی سے
کبھی دشمنی سے کبھی دوستی سے — بہر حال نسبت رہی ہے مجھی سے
یہ عالم ہے ان کی نظر کا ابھی سے — کہ جیسے ملے اجنبی اجنبی سے
میں آدابِ محفل سے واقف ہوں ساقی — تری آبرو ہے میری تشنگی سے
جسے غم کی دولت میسر نہیں ہے — وہ محروم ہے لذتِ زندگی سے
بنانے پڑے سیکڑوں آستانے — میں اُکتا گیا تھا تری بندگی سے
مجھے اپنی راتوں کی ظلمت ہے پیاری — ستاروں کی بخشی ہوئی روشنی سے

غزلیں

آثم مظفرنگری

یہ نہ کہئیے سعیِ پیہم کا کوئی حاصل نہیں — کیا مسافر کے لئے صبحِ سرِ منزل نہیں
اے شناورِ غفلت یک لمحہ سے بھی ہوشیار — دامنِ ہر موجِ طوفاں دامنِ ساحل نہیں
درسِ آموز ہر نظارۂ بزمِ جہاں — اک حقیقت ہے فریبِ جلوۂ باطل نہیں
اضطرابِ درد کی موجوں کو ہیں دابے ہوئے — ہم تری محفل میں بسمل ہو کے بھی بسمل نہیں
ہر حدِ فانوس سے پروانہ اور آگے بڑھے — گرمِ رفتار وفائے غم کی یہ منزل نہیں
عقل کی نیرنگیوں سے کمیل لیجئے دواسو — ذہن آوارہ شناسائے مزاجِ دل نہیں

اے آثم تائیدِ عزمِ نوجواں سے وقت پر
غالب آجانا ہر اک مشکل پہ کچھ مشکل نہیں

ابوالمجاہد زاہد

اگر یہی ناخدائیاں ہیں، تو ناخداؤں کو کیا کریں گے — ہواؤں کے رُخ پہ آخر اپنے سفینے کب تک بہا کریں گے
خبر نہ تھی عہدِ فصلِ گل میں نئے شگوفے کھلا کریں گے — لہو پلایا ہے جن کو اپنا وہ پھول ہم پر ہنسا کریں گے
نظامِ انسانیت کو مل کر نہ جب تک انساں بپا کریں گے — یوں ہی یہ ہوتی رہیں گی جنگیں یوں ہی فتنے اٹھا کریں گے
یہی ہے اہلِ حرم کی خوئے زمانہ سازی و خود فریبی — تو دیر والوں کی بے ضمیری پہ ہم کہاں تک ہنسا کریں گے
ہے خود نمائی، خدا نمائی، ہے خود شناسی خدا شناسی — جو اپنا دیدار کر نہ پائے، خدا کا دیدار کیا کریں گے
خدا پہ ہے اعتماد ہم کو خدا ڈبوئے کہ پار اتارے — جنہیں بھروسہ ہو ناخدا پر وہ "ناخدا ناخدا" کریں گے

یہی ہے خوئے جفا تو زاہد! وہ دن بھی نزدیک آرہے ہیں
جب ان کی محفل میں، میں نہ ہوں گا، مگر مرا تذکرہ کریں گے

مطہر فدا قریشی ...... (زیرِ طبع مجموعہ "پہلی کرن" کے چند منتخب اشعار)

مذاقِ عشق کو اپنے کہیں رُسوا نہ کر لینا — بنامِ حق پرستی خود کو ہی سجدا نہ کر لینا
وہ آکر پھول برسائیں گے تیری خلوتِ غم میں — مگر اُن سے کہیں تو بجلیاں پیدا نہ کر لینا
اے حُسنِ جفا پیشہ اب اپنی خبر لینا — چھوٹا مرے ہاتھوں سے دامانِ شکیبائی
فطرت نے خود آپ اپنی حیرت کا کیا ساماں — دیکھ ترے ہاتھوں میں آئینۂ یکتائی

ڈاکٹر اختر

روشنی شمع کی جاتی ہے جہاں تک سرِ بزم — آگ ہی آگ بھڑک اُٹھتی ہے پروانوں میں
جن میں جلتا ہے لہو سوختہ ساماں کا — آگ لگ جائے گی اک دن انہیں ایوانوں میں

روس میں جا کر کیا دیکھا؟

مشاہدات، تاثرات، اور محسوسات!

مسٹر حاتم علوی ایک معروف شخصیت کے حامل ہیں، دنیا کے مختلف ممالک اور حکومتوں میں وہ پاکستان کی نمائندگی کر چکے ہیں، انڈونیشیا کو پاکستان سے جو خیر سگالی کا وفد گیا تھا اُس کی قیادت موصوف ہی کو سونپی گئی تھی، حال ہی میں ماسکو میں جو بین الاقوامی اقتصادی کانفرنس ہوئی تھی اور اُس کے مباحث میں حصہ لینے کے لئے پاکستان سے جو وفد گیا تھا، اُس میں بھی صاحب ممدوح شریک تھے۔

روس سے پاکستان واپس آنے کے بعد مسٹر حاتم علوی نے انسٹیٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیرس (INSTITUTE OF INTERNATIONAL AFFAIRS) میں ۱۹ر مئی ۵۲ء کو ایک تقریر کی تھی، اخبارات میں اس تقریر کے بعض حصوں کے اقتباسات آچکے ہیں، لہٰذا ہم نے ان کو اعادہ و تکرار کے پیش نظر حذف کر دیا ہے، پریس نے موصوف کی تقریر کا وہ حصہ چھاپا ہے اُس نے اپنی نگاہ میں ضروری خیال کیا، اور ہم اُن حصوں کا ترجمہ شائع کر رہے ہیں جو اب تک پریس کی معرفت منظر عام پر نہیں آئے اور ہمارے خیال میں عوام تک ان کا پہونچنا ضروری ہے! جو صاحب پوری تقریر پڑھنا چاہیں وہ "PAKISTAN HORIZON" میں اس تقریر کو پڑھ سکتے ہیں۔

تقریر کا وقت محدود تھا، اس لئے فاضل مقرر اپنے تمام مشاہدات اور تاثرات بیان نہ کر سکے، ہم نے روس کے بارے میں موصوف سے بہت سی باتیں دریافت کیں، اور اُن کے جوابات سُن کر ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ مسٹر مبارک ساغر اور میاں افتخار الدین نے جس روس کو جنت بتایا ہے اُس جنت میں نہ جانے کتنے دوزخ سموئے ہوئے ہیں! ——— شہری آزادی کا یہ عالم ہے کہ کوئی روسی کسی غیر روسی کو اپنا پتہ نہیں دے سکتا اور وہ ایسا کرنے میں آزاد نہیں ہے، چنانچہ حکومت کی طرف سے جو عورت گائیڈ کی حیثیت سے مسٹر حاتم علوی کی رہنمائی کے لئے مقرر تھی اُس نے موصوف کو اپنا ایڈریس دینے سے صاف انکار کر دیا ——— صاحب موصوف ٹالسٹائی کا مکان دیکھنے کے لئے جب پیادہ پا روانہ ہوئے تو ماسکو کے ایک ایسے محلے سے بھی اُن کا گزر ہوا جہاں غلاظت کے انبار لگے تھے ——— ماسکو کے ایک عام شہری کے مکان کو اُنھوں نے جا کر دیکھا تو دو بہت ہی چھوٹے چھوٹے کمروں میں ضروریات کے اسباب کے علاوہ بتّیس نفر اُس میں رہتے تھے، ایک بہت اونچا پلنگ تھا جس کی تین منزلیں تھیں، اور اسی پلنگ پر اور نیچے یہ لوگ لیٹ کر رات بسر

لیے ہر ۳۰ آدمیوں کے اس فلیٹ میں بس ایک برتن تھا، اور غسل خانہ تھا ہی نہیں!

پہلے سے بھی ہم اس حقیقت سے باخبر تھے اور ہم کیا باخبر تھے ساری دنیا اس بات کو جانتی ہے کہ سوویٹ روس کی بنیاد نہ صرف یہ کہ خدا کے انکار بلکہ خدا اور مذہب کی دشمنی پر رکھی ہوئی ہے، اس تقریر کے پڑھنے سے یہ چیز واضح تر ہو گئی۔ کوئی مانے یا نہ مانے مگر یہ حقیقت ہے کہ "اشتراکیت" جس ملک میں آئے گی، اس ملک میں چاہے چند نماز پڑھنے والے مسلمان اور پوجا پاٹ کرنے والے لوگ باقی رہ جائیں مگر مذہب کی اسپرٹ وہاں باقی نہیں رہ سکتی، دین سے بیزاری "کمیونزم" کا لازمی نتیجہ ہے! کمیونزم کو اگر خدا اور مذہب سے بیزاری کا حق حاصل ہے تو ہمیں بھی "کمیونزم" سے بیزاری کا حق حاصل ہونا چاہئے، کمیونسٹ ایک ایسے نظام کو دنیا پر مسلط کر دینا چاہتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ الحاد و انکار اور خدا سے بیزاری ہے، اور ہم اس نظام کے مبلغ اور علمبردار ہیں جس کی بنیاد ہی اخلاق، تقویٰ اور خدا پرستی پر رکھی ہوئی ہے۔ بس اسی نقطہ سے کمیونزم اور اسلام کے درمیان کشمکش شروع ہو جاتی ہے ——— یہاں ہم اس حقیقت کا بھی اظہار کر دینا چاہتے ہیں کہ ہر وہ نظامِ حکومت چاہے وہ امریکہ ہو یا برطانیہ، روس ہو یا چین، اگر اس میں اللہ تعالیٰ کو تشریعی طور پر "اقتدارِ اعلیٰ" نہیں تسلیم کیا گیا ہے، تو اس سے ہم اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں ہماری دوستی اور مخالفت اور موافقت اور بیزاری کا معیار اللہ تعالیٰ کی رضا اور حق پرستی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

مسٹر حاتم علوی کی تقریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوویٹ روس کی عظیم الشان صنعتی ترقی کے باوجود روسیوں کے معیارِ زندگی میں جو پستی پائی جاتی ہے اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ملک کی پیداوار اور آمدنی جنگی صنعتوں کی نذر کی جا رہی ہے ——— یعنی روس جو "امن امن" (PEACE) کا حلق کی پوری قوت کے ساتھ نعرہ بلند کر رہا ہے، یہ سب فریب ہے، سوویٹ روس میں اندر ہی اندر عظیم الشان پیمانہ پر جنگی تیاریاں ہو رہی ہیں، اور ایک دن آئے گا کہ "امن" ہی کے تحفظ کے نام پر خود روس "امن شکنی" اور جنگی معرکہ آرائی کی پہل کرے گا! ہٹلر نے بھی یہی کیا تھا کہ جرمنی کی آمدنی اور پیداوار کا زیادہ سے زیادہ حصہ جنگی تیاریوں میں لگا دیا تھا۔ یہاں تک یہ "تیاریاں" اپنی نکاسی اور استعمال ہونے کی راہ ڈھونڈنے پر مجبور ہو گئیں چنانچہ دوسری "جنگِ عظیم" کی مصیبت میں دنیا کو مبتلا ہونا پڑا۔

انسان کسی نہ کسی کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ضرور ہے، تو روس جس نے خدا کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا ہے، وہ لینن اور اسٹالن کے مجسموں کے آگے سر جھکا رہا ہے، جو لوگ خدا کی بندگی پر "غلامی" کی پھبتی چست کرتے ہیں، اللہ کی شان دیکھئے کہ ان کو لینن اور اسٹالن کی بندگی کرنی پڑ رہی ہے ——— دنیا کو خوب سوچ کر فیصلہ کرنا چاہئے کہ ان "بندگیوں" میں سے کونسی بندگی معزز اور بلند تر ہے! اپنے ہی جیسے مجبور اور فنا ہو جانے والوں انسانوں کی بندگی یا اس خالقِ کائنات اور رب السموات والارض کی بندگی کہ جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور جس کی قدرت پورے نظامِ کائنات کا احاطہ کئے ہوئے ہے!

اب تک روس کے متعلق بعض انکشافات کو امریکہ اور انگریز کا پروپیگنڈا کہہ کر پھبتیوں میں اڑا دیا جاتا تھا ——— مگر یہاں پاکستان کے ایک معزز شہری کا آنکھوں دیکھا حال آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے! (مدیر)

روس کی صنعتی ترقی کے سلسلے میں جو کچھ ابھی عرض کیا جا چکا ہے اس کے پیش نظر یہ سوال بجا طور کیا جا سکتا ہے کہ کیا واقعی روس ایک جنت ارضی ہے جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہیں، یا یوں کہئے کہ وہاں کے ایک عام شہری کا معیار زندگی کیا ہے؟ یہ کوئی آسان سوال نہیں جس کا جواب لازما ایک ہی ہو، بلکہ اس میں کہنے سننے کی بہت کچھ گنجائش موجود ہے لیکن اس کے باوجود میرے خیال میں یہ بات سبھی تسلیم کر لیں گے کہ روس کا معیار زندگی مغربی یوروپین ممالک کے معیار زندگی کے مقابلے میں پست ہے۔ میں نے اس مسئلے پر کئی روسیوں سے استفسار کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی جواب نہ پا سکا۔ ماسکو کی اقتصادی کانفرنس کے ایرانی مندوبین کے ساتھ جو خشکی کے راستے سے ماسکو پہونچے تھے اُن کے مرتب کردہ نوٹ اور اُن معلومات، کا جو جنوبی روس کے بارے میں اُن کے پاس تھیں، اپنے نوٹ سے تقابلی مطالعہ کر کے میں سرِدست اس نتیجہ پر پہونچا ہوں:—

کہ روس کا عام معیارِ زندگی کسی طرح پاکستان کے معیارِ زندگی سے بلند نہیں۔

اس نتیجے کی صحت کا اندازہ لگانے کے لئے میں نے پاکستانی مندوبین میں سے اپنے ایک دوست سے، جن کی روس سے عقیدت اس ملک سے ان کی معلومات کے مقابلے میں ہمیشہ بڑھتی رہی ہے، اس مسئلہ کو چھیڑا۔ انھوں نے فرمایا کہ "پاکستان کے ان ہزاروں انسانوں کو دیکھو جن کے جسم چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے ہیں، اور یہاں کوئی ایک متنفس بھی ایسا نظر نہیں آتا جس کے پاس اُوَرکوٹ موجود نہ ہو" میرے دوست کی دونوں باتیں سراسر درست تھیں، لیکن اس کے باوجود میں نے جو نتیجہ نکالا ہے اس کی صحت پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جب ہم ماسکو پہونچے تو اس وقت درجہ حرارت صفر سے ۲۰ درجہ نیچے تھا اور اس شدید سردی کے زمانے میں اُوَرکوٹ کے بغیر انسانوں کا زندہ رہنا ہی ناممکن ہے۔ خود ہمارے ملک کے شمالی قطعے میں پوری کی پوری آبادی کے پاس شدید سردی کی صعوبتوں سے بچنے کے لئے کافی گرم لباس موجود رہتا ہے، لیکن اس کی وجہ سے ہمارا یہ نتیجہ نکال لینا کسی طرح درست نہ ہوگا کہ ہمارے قبائلیوں کا معیارِ زندگی پاکستان کے دارالخلافہ کے رہنے والوں کے مقابلہ میں جو پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس نظر آتے ہیں، بلند ہے، اگرچہ یہ بات ہم سب لوگوں کے لئے انتہائی شرم کا موجب ہے کہ قیام پاکستان کے پانچ سال بعد بھی دارالخلافہ پاکستان میں بسنے والے بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو بہت مختصر لباس پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

پاکستان اور روس میں کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ آمدنی کا تناسب بالکل یکساں ہے، پاکستان میں ایک سکریٹری کی تنخواہ چار ہزار روپے ہے جو کہ ایک چپراسی کی تنخواہ کا پچاس گنا ہے، اور اس کے مقابلہ میں روس میں کم سے کم تنخواہ ۵۰۰ روبل اور زیادہ سے زیادہ تنخواہ ۲۵ ہزار روبل ماہانہ ہے، جو کہ ... ... وہاں کے متعدد آدمیوں کو ملتی ہے۔

پاکستان میں پچھتر روپیوں کی قوت خرید روس کے ۵۰۰ روبلز کی قوت خرید سے زیادہ ہے (اگرچہ شرحِ تبادلہ کے حساب سے ایک روبل چودہ آنے کے برابر ہے) لیکن چونکہ روس کی معاشی زندگی منصوبہ بندی اور ریاستی کنٹرول کے اصولوں پر چل رہی ہے لہٰذا روٹی اور مکان کے کرایہ پر مقابلتاً کم رقم صرف ہوتی ہے مجھے ایک جوڑی جوتہ کی انتہائی ضرورت محسوس ہو رہی تھی لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس کی قیمت ۴۵۰ روپے ہے تو میں نے اپنے ذہن کو قناعت کی خوبیوں کی طرف مائل کیا اور جوتا خریدنے کے

بجائے صرف ایک فیتے خریدنے پر اکتفا کی جس کی قیمت دُو روپے تھی ـــــــ لیکن روس میں ایک عام مزدور کو تین قسم کی مراعات حاصل ہیں اوّل تو مفت ابتدائی اور ثانوی تعلیم (اور یونیورسٹی کی تعلیم بھی تقریباً مفت ہی ہے) دوسرے مفت طبّی امداد اور تیسرے ضعیف العمری میں معمولی سی پنشن ـــــ اور جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں پاکستان کے مزدور کو بھی جلد ہی یہ مراعات حاصل ہونے والی ہیں ـــــ اگر ہم اپنے وزراء کرام کے شائع شدہ بیانات پر اعتماد کرسکیں!

روس کی عظیم صنعتی ترقی اور روسیوں کے معیار زندگی کی اس پستی میں جو زبردست تضاد پایا جاتا ہے، اس کے لئے ہر متجسس آدمی کا ذہن ضرور جواب چاہتا ہے، میرا اپنا خیال ہے کہ ہر چیز زیادہ مقدار میں جنگی صنعتوں کی نذر کردی جاتی ہے، جو فوج کے تینوں بازوؤں کے اضافے میں کام آتی رہتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ چیز دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ روس کی لوہے اور فولاد کی پیداوار برطانیہ، فرانس اور بلجیم کی مجموعی پیداوار سے ۲۰ فی صدی زیادہ ہے۔

اگر کوئی شخص یہ سوچ رہا ہو کہ اپنے کاروبار کی وجہ سے میں لوہے اور فولاد کی طرف زیادہ متوجہ ہو کر اس مقالے کو بوجھل بنائے دے رہا ہوں تو اس کا علاج بس یہی ہے کہ میں آپ کو اپنے ساتھ ماسکو کے "چڑیا گھر" لے چلوں جہاں میں نے ایک خوشگوار صبح گزاری ہے! میں نے اپنی ساری عمر چڑیا گھر کے پڑوس میں بسر کی ہے اور اس کے بہت سے مکینوں سے مجھے خاص ربط رہا ہے! لہٰذا دُنیا کے دوسرے حصہ میں بسنے والے ہم جنسوں تک ان کا پیغام تہنیت پہونچانے میں مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے!

دُنیا کے مختلف حصّوں کی سیر و سیاحت کے دوران میں چڑیا گھروں کو میں خاص طور پر دیکھتا ہوں اور اگر موقع ملے تو کئی بار دیکھتا ہوں، یہی میں نے ماسکو میں بھی کیا، اس میں بچّوں کے لئے ایک تھیٹر اور تماشا دکھانے والے جانوروں کیلئے ایک تربیتی اسکول تھا۔ میں نے وہاں ایک لومڑے، نیولے اور پہاڑی کوّے کو تماشا دکھاتے ہوئے دیکھا ـــ اس تماشہ کے دوران میں ان کی ٹریننگ کرنے والی ایک خاتون ان کی تربیت کے طریقوں کی وضاحت کرتی جارہی تھی۔ اس نے یہ بتایا کہ جس دن یہ جانور پیدا ہوتے ہیں اسی دن ہم ان کو حاصل کرکے ان کو اس طرز پر ڈھالتے ہیں کہ یہ ہمارے احکام کی بے چون و چرا پیروی کرنے لگیں۔ ہم ان کے پیٹ کے تقاضے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور پوری تربیت میں ان کی اسی احتیاج کو پیش نظر رکھتے ہیں ـــــــ اس کی باتوں کو سُنکر مجھے دفعتاً محسوس ہوا کہ گویا اس چڑیا گھر کے حدود دور تک پھیلتے چلے جارہے ہیں!

روس کی مذہبی حالت

اب میں ایک اہم موضوع یعنی روس کی مذہبی حالت کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ کمیونزم بنیادی طور پر ہر قسم کے مذہبی عقیدہ و عمل سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے جیسا کہ ان اقتباسات سے ظاہر ہوگا جو میں پیش کر رہا ہوں اور جو کمیونسٹوں کے مستند ترین مآخذ سے لئے گئے ہیں۔

۱- مارل مارکس اپنی کتاب "Critique of Hegel's Philosophy of Law" میں لکھتا ہے:- مذہب کچلی اور روندی ہوئی مخلوق کی ایک دبی دبی کراہ اور عوام کے لئے ایک افیون کی مانند ہے۔ مذہب کو جو عوام کے لئے مسرت کا سراب فراہم کرتا ہے، مٹانا ان کی حقیقی مسرت کے حصول کے لئے ناگزیر ہے۔

۲- لینن، جو تاریخ کا عظیم ترین انقلابی انسان اور کمیونزم کا صرف داعی اور مبلّغ ہی نہیں بلکہ جس کی مساعی سے کمیونزم دُنیا میں عملاً رائج ہوا، اس نے مذہب کے مسئلہ پر کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی بلکہ دو ٹوک باتیں کی ہیں میکسم گورکی کو ایک خط لکھتے ہوئے (جو "SELECTED WORKS" جلد گیارہ صفحہ ۶۷۵ مطبوعہ ماسکو میں چھپا ہے)

وہ لکھتا ہے:-

"ہر مذہبی تصور، خدا کا ہر تصور حتیٰ کہ خدا کے تصور کے ساتھ تفریح و تفنن بھی ایک ناقابل بیان بُرائی ... انتہائی خطرناک قسم کی ... ... نہایت گھناؤنی متعدی مرض ہے۔ گندے کام، تشدد اور جبرو تشدد اور جسمانی چھوت اس سے کہیں کم خطرناک ہیں جتنا کہ خدا کے بارے میں قائم کردہ روحانی تخیلات جن کو انتہائی دل فریب اور حسین نظریات کا جامہ پہنا دیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہمارے پروپیگنڈے میں الحاد کا پروپیگنڈا ایک لازمی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔"

لینن کی وفات ۱۹۲۴ء میں ہوئی تھی اور یہ سوال بے محل نہ ہوگا کہ کیا اس اٹھائیس سال کے عرصہ میں کمیونزم، کمیونسٹ پارٹی یا کمیونسٹوں کی ریاست ——— روس نے اپنی پالیسی میں کوئی بنیادی تغیر و تبدیل کر لیا ہے؟ اس کا جواب حاصل کرنے کے لئے میں نے حسب ذیل مطبوعات کا مطالعہ کیا تھا؟:-

۱—سویٹ ملٹنٹ اتھیسٹ لیگ (روسی نوجوانوں کی انجمن الحاد) کا ترجمان ANTIRELIGIONIZK

۲—سویٹ ملٹنٹ اتھیسٹ لیگ کی ایک کتاب BEZONLINK جو خدا کے انکار کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔

۳—روسی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا پندرہ روزہ سیاسی اور نظریاتی ترجمان "بالشیوک" BOLSHEVIK

۴—سویٹ یونین کی ینگ کمیونسٹ لیگ (انجمن نوجوانان کمیونزم) کا سرکاری روزنامہ KOMSOOSKAYA PRAVADA

۵—انجمن نوجوانان کمیونزم کا ایک اور جریدہ young communial worker

۶—مذکورہ بالا انجمن کا ایک اور پندرہ روزہ جریدہ Moldoi Bolshevik

۷—روس کے محکمہ تعلیم کا ماہنامہ Narodnoe obrazovanie

۸—روس کی انجمن برائے اشاعت علوم سیاسیات وسائنس کا مجلہ Nauka-i-Zhizn

۹—مصنفین روس کی یونین کا ماہنامہ NOVY MIR (نئی دنیا)

۱۰—روس کی ٹریڈ یونینوں کی مرکزی کمیٹی کا روزنامہ TRUD

۱۱—محکمہ تعلیم اور ٹریڈ یونینوں کی مرکزی کمیٹی کا سہ روزہ ترجمان Uchitolskaya Gazeta

میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ میں ان میں سے جگہ جگہ سے اقتباسات پیش کروں اور نہ میرے خیال میں آپ مجھ سے اس کی توقع رکھتے ہیں لیکن ان سب کے مجموعی مطالعہ نے میرے ذہن میں اس امر کے بارے میں کوئی شبہ نہیں چھوڑا کہ روسی انقلاب کے داعی اور مبلغ معمولی قسم کے لوگ نہ تھے اور انہیں کی تعلیمات کے تانے بانے سے اشتراکی نظام حیات کا ملبوس تیار ہوا ہے۔

ہم لوگوں نے ماسکو کی ایک مسجد میں، جو چھوٹی مگر روسی مسلمانوں سے بھری ہوئی تھی، نماز جمعہ ادا کی اور گرجے میں بھی گئے جہاں پختہ عقیدہ کے عیسائی مراسم عبادت ادا کر رہے تھے۔ مجھ سے ان چیزوں کے بارے میں بھی استفسار کیا

جاسکتا ہے اور اس "مکمل مذہبی آزادی" کے بارے میں بھی سوال ہو سکتا ہے۔ جو میرے ایک ساتھی کو روس میں نظر آئی تھی۔

در اصل مذہب کے بارے میں روس کے رویہ میں جو تبدیلی یا نرمی نظر آتی ہے وہ مصلحت پر مبنی ہے اور محض ایک عارضی چیز ہے اور اسے کمیونسٹ حکمراں بھی تسلیم کرتے ہیں۔ آج سے بہت پہلے ۱۹۰۹ء میں ہی لینن جیسے عظیم کمیونسٹ نے کچھ ہدایات مرتب کی تھیں (جو اس کے Selected works جلد ۹ میں نظر آئیں گی) میں اس کے مقالے "مزدوروں کی تحریک کا مذہب کی جانب رویہ" سے ایک اقتباس پیش کروں گا:-

"فرض کیجئے کہ کسی ضلع یا کسی خاص صنعت کے مزدور گہرا طبقاتی شعور رکھنے والے کمیونسٹ (جو کہ بہر حال لازماً ملحد ہوں گے) اور قدرے غیر ترقی یافتہ مزدوروں میں بٹے ہوئے ہوں، جو دیہاتی علاقوں اور کاشتکار طبقہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ابھی خدا پر عقیدہ رکھتے ہوں گرجوں میں جاتے ہوں اور مقامی پادریوں کے زیر اثر ہوں، جنھوں نے فرض کیجئے کہ ایک عیسائی مزدور یونین قائم کر رکھی ہو۔

اب فرض کیجئے کہ اس علاقہ میں جو معاشی جدوجہد ہو رہی ہے وہ ہڑتال کی منزل تک جا پہونچتی ہے۔ اب یہ ایک مارکسی کا فرض ہے کہ وہ اس ہڑتال کی کامیابی کو ہر چیز پر مقدم رکھے اور ان کے درمیان کسی قسم کے اختلاف کے ابھرنے میں شدت سے مزاحم ہو۔

ان حالات میں الحاد کا پروپیگنڈا نہ صرف یہ کہ غیر ضروری بلکہ مضر ہوگا۔ یہ بات اس لئے نہیں کہی جارہی کہ اس طرح سے غیر ترقی یافتہ عناصر کی تحریک سے دور ہو جانے یا الکشن میں کسی نشست کے ہار جانے کا خطرہ ہے، بلکہ یہ بات طبقاتی کشمکش کی ارتقاء کے نقطۂ نگاہ سے کہی جارہی ہے کیونکہ موجودہ سرمایہ دارانہ سوسائٹی میں عیسائی مزدوروں کو کمیونزم اور الحاد کی آغوش میں لانے کے لئے طبقاتی کشمکش کا طریقہ الحاد کی کھلم کھلا تبلیغ کے مقابلہ میں سو گنا زیادہ موثر ہے۔

ان حالات میں جو شخص الحاد کا پروپیگنڈا کرے گا وہ در اصل پادریوں کے ہاتھ میں کھیل رہا ہوگا جن کی عین خواہش ہی یہ ہوتی ہے کہ مزدوروں میں تقسیم اس نقطۂ نگاہ سے نہ ہو کہ کس نے ہڑتال میں شرکت کی اور کس نے نہیں کی، بلکہ اس نقطۂ نگاہ سے ہو کہ کون خدا کے بارے میں کیا تصور رکھتا ہے۔

ایک مارکسی کو لازماً مادیت کا قائل یعنی مذہب کا دشمن ہونا چاہئے لیکن اس کیلئے جدلی مادیت کا قایل ہونا بھی لازمی اور ضروری چیز ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مذہب کے خلاف اس کی جنگ مجرد نظریاتی اور غیر متنوع پروپیگنڈے پر مبنی نہ ہو بلکہ اس کی بنیاد طبقاتی کشمکش کو ہونا چاہئے جو اس وقت دنیا میں عملاً جاری ہے۔

اسی کی روشنی میں ہر موقعہ پر مذہب کے بارے میں کمیونسٹوں کو اپنا طرز عمل متعین کرنا چاہئے۔ ۔ ۔ ۔ ہمیں نہ صرف یہ کہ ان مزدوروں کو کمیونسٹ پارٹی کے اندر گوارا کرنا چاہئے جو خدا پر عقیدہ رکھتے ہوں بلکہ قصداً ان کو پارٹی میں بھرتی کرنے کی کوشش کرنی چاہئے تاکہ ہم انکی تربیت اپنے پروگرام کی اسپرٹ کے مطابق کر سکیں اور ان کو اپنے پروگرام کے برخلاف جدوجہد کرنے سے روک سکیں"

روس نے مذہب کو مٹا دیا ہو تو مٹا دیا ہو لیکن ایمان، جذبۂ عبودیت اور اس کے مراسم ابھی تک زندہ اور موجود ہیں۔ ہفتہ میں چار بار ہزار ہا ہزار روسی لینن کے مقبرے کی زیارت کرنے جاتے ہیں اور وہاں جا کر اپنے لیڈر کو (جس کی لاش

آج تک محفوظ ہے) اپنا خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ان واقعات کو دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ ان میں اور ہمارے اپنے ملک کے ان لوگوں میں کیا فرق ہے جو بزرگوں کے مزارات پر حاضر ہوتے ہیں۔

صرف ماسکو میں ہی اسٹالن کے کم و بیش دس ہزار مجسمے موجود ہیں عام مقامات پر اسٹالن کے تمام بڑے بڑے مجسموں پر جس طرح عقیدت کے پھول چڑھائے جاتے ہیں اس سے آدمی کو عیسائیوں کے گرجوں اور ہندوؤں کے مندروں کی پوجا اور طریق عبادت یاد آنے لگتا ہے۔

جہاں تک ایمانیات و معتقدات کا تعلق ہے وہ اپنے پورے شان و شوکت کے ساتھ کمیونزم اور بالشوزم کے عقاید کی شکل میں موجود ہیں جس کے اپنے پیغمبر بھی ہیں —— لینن اور اسٹالن!

(ظفر اسحاق انصاری نے ترجمہ کیا)

ماہر القادری

افسانہ

ابن رشد و حداثی

یہ دفتر کا ہے کو ہے اچھی خاصی محل سرائے ہے، دروازوں پر ریشمین پردے ہوا سے سرسرا رہے ہیں "۔۔۔ بلکہ گنگنا رہے ہیں، بہت ہی دھیمے سُروں میں! ایرانی قالین کے بیل بوٹے تو دیکھئے جیسے سچ مچ پھول کھلے ہیں اور سبزہ لہک رہا ہے ـــــ اور میز کتنی شاندار ہے، توبہ! توبہ! "میز" نہیں "ٹیبل" کہئے ٹیبل! میز تو ہم جیسے چھٹ بھیوں کے یہاں ہوتی ہے! اس ٹیبل کی درازوں میں رنگا رنگ کے کاغذات رکھے ہیں ـــــ کسی نیاز مند کا خطِ غلامی ـــــ کسی اُمیدوار کا نوشتۂ قسمت ـــــ کسی بہت بڑی اسکیم کا خاکہ ـــــ کسی عہدیدار کی شکایتوں کی فائل ـــــ کسی کی ترقی کا پروانہ ـــــ اور دعوتوں کی یادداشت بھی، لنچ، ڈنر اور ایٹ ہوم کی تاریخ وار تفصیل کہ کب جانا ہے اور کس کے یہاں جانا ہے!

او ہو! اس کمرے کا ردّی دان کتنا خوبصورت ہے ـــــ یہاں بدصورت ہے کونسی چیز! پیسہ میں بڑی طاقت ہے بھیا! خوبصورتی اور سلیقہ آپ ہی آپ کھنچا چلا آتا ہے! بے ڈھنگا پن تو مفلسوں کے یہاں ملتا ہے، بڑے آدمیوں کے گھروں سے لیکر دفتر تک خوبی ہی خوبی اور زیبائی ہی زیبائی نظر آتی ہے! اس ردّی دان میں کاغذ کے پُرزے بھی پڑے ہوئے ہیں ـــــ یہ "بھی" کا غیر ضروری استعمال آپ کے منہ سے کچھ اچھا نہیں لگا، ارے میاں! ردی دان کاغذ کے پُرزوں کے لئے ہی بنایا جاتا ہے اس کا یہی مصرف ہے! مگر ہاں! اس ردّی کی ٹوکری کے پُرزوں میں کوئی کوئی ایسا کاغذ بھی ہے جس کے حروف لکھنے والے کے آنسوؤں میں بھیگے ہوئے ہیں ـــــ مگر بھائی! اوّل تو

؎ رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

دوسرے ساری دنیا پریشان اور ایک مخلوق ہے کہ بدحال ہے، کس کس کے آنسو پونچھے جائیں اور کس کس کے زخم پر پھاہا رکھا جائے۔۔۔ مگر۔۔ حضرتِ عمر فاروقؓ تو۔۔۔؟ بس بس! خاموش! جو لفظ زبان سے نکل چکے ہیں اُن کو بھی واپس بھیجنے کی کوشش کرو، یہ مقام ادب اور بارگاہ ناز ہے! یہاں اس انداز پر سوچنا ہی بہت بڑی گستاخی ہے! کیا زندگی سے تنگ آگئے ہو، ایسی باتیں کر کے بیٹھے بٹھائے شامت مول لینے کا ارادہ ہے! غبارے میں اتنی ہوا نہ بھرو کہ ٹوٹ جائے!

آنے والے آتے اور جاتے رہے۔۔۔ مگر اس طرح کہ :-

؎ جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اتنے میں ایک صاحب تشریف لائے، چپراسیوں نے دوڑ کر دفتر کے دروازہ کا پردہ اُٹھا دیا، جیسے ان کا انتظار کیا جا رہا تھا! اُن کے اندر جاتے ہی کمرے کے دروازے بند کر دئے گئے، اوپر کے روشن دان اور نیچے کی ایک کھڑکی البتہ، وہ کھلی رہی۔۔

ان کی باتیں ؎ کرانا کاتبیں را ہم خبر نیست! جنگ کی اسکیمیں بھی اس قدر رازداری کے ساتھ شاید تیار

نہیں کی جاتیں ـــــ مگر صاحب! دیوار ہم گوش دارد! ایک چپراسی کو کسی ضرورت سے گھنٹی بجا کر اندر بلایا گیا، اور اُس نے سُن لیا'۔ ۔ ۔ ۔

ـــــ ابن رشد وجدانی۔ ۔ ۔ "یہ نام بہت خوب رہے گا۔ ۔ ۔ بس مولانا! کام شروع فرما ہی دیجئے! بہت بڑے معرکہ کو سر کرنا ہے۔

ـــــ جی حضور! کل ہی سے! شاید ایک مضمون تو رات ہی میں تیار ہو جائے گا! چالیس سال قلم کے گھوڑے اسی میدان میں دوڑائے ہیں، جناب والا مطمئن رہیں!

ابن رشد وجدانی صاحب کمرے سے شاداں و فرحاں نکلے جیسے منہ مانگی مراد لے کر آئے ہیں بلکہ ضرورت سے بڑھ چڑھ کر اور توقع سے کہیں زیادہ ان کو نوازا گیا ہے، نیچے آکر موٹر رکشا میں بیٹھے، رکشا والے نے پیر کو جنبش دی، اور ذرا سی دیر میں یہ جا وہ جا۔

ہوٹل میں پہونچ کر وجدانی صاحب نے شیروانی اُتار دی، اور آرام کرسی پر دراز ہو گئے، چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا جیسے وہ کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں، وہ آپ ہی آپ باتیں کرنے لگے، عینک کی کمانی کو بار بار انگلیوں میں پکڑتے اور لٹکا دیتے۔

ـــــ مگر یہ تو ضمیر فروشی ہے (اندر سے آواز آئی) ۔ ۔ کیسی نادانوں کی سی باتیں کرتے ہو، ضمیر کو تم نے کوئی مولی گاجر سمجھ رکھا ہے کہ جس نے چاہا خرید لی، ضمیر اس طرح نہیں بکا کرتا! (نفس نے کہا) مگر یہ بات دیانت کے تو خلاف ہے (ضمیر نے پکارا) اول تو یہی بات مشتبہ ہے کہ ایسا کرنا دیانت کے خلاف ہے بھی یا نہیں، پھر بھائی! ایسا کرنے میں تھوڑی بہت بد دیانتی بھی ہو گئی تو اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے، بس ایک شرک معاف نہیں ہوتا باقی ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے (نفس نے تابڑ توڑ جواب دیا) اور توبہ کرنے سے پہلے موت آ گئی تو۔ ۔ ۔ (ضمیر فوراً بولا) وہمیوں کی سی باتیں نہ کرو۔ ۔ ۔ دو ہزار روپے ماہوار تھوڑے نہیں ہوتے۔ ۔ ۔ آئی ہوئی لچھمی کو نہ ٹھکراؤ۔ ۔ دو ہزار ۔ ۔ ۔ بیس جگہ سو سو۔ ۔ ۔ ایک سال کے ہوئے چوبیس ہزار۔ ۔ ۔ اس کے علاوہ کچھ اور نوازشیں بھی ہوں گی، اور ـــــ اتنے میں ہوٹل کا خانساماں چائے کی ٹرے لیکر آ گیا۔ ۔ ۔ اور چائے دانی کی ٹکوزی اُتار کر چمچے سے چائے کو چلایا ہی جا رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ حضور۔ ۔ ۔ ہیں۔ ۔ ۔ حضور (مسرت آمیز گھبراہٹ کے ساتھ)! جی! ضرور حاضر ہوں گا، کھانے سے آدھ گھنٹہ قبل ہی آ جاؤں گا۔ ۔ ۔ بہت اچھا۔ ۔ ۔ جو حکم۔ ۔ ۔ !

کام جاری ہو گیا ـــــ ادھر مہینہ ہوا، اور سو سو کے بیس ہرے ہرے نوٹ حاضر! اس پر سے کچھ اور نوازشیں بھی! چاندی ہی چاندی تھی! اور کام کچھ نہیں، مہینہ میں دو چار مضمون "کسی" کی مخالفت میں لکھنے پڑتے تھے، ہاں! یہ ضرور تھا کہ اس طرح ضمیر کی قربانی دینی پڑتی تھی۔ ۔ ۔ مگر ان داموں یہ سودا زیادہ مہنگا تو نہ تھا، اس دنیا میں تو روپیہ دو روپیہ پر لوگ ایمان بیچ دیتے ہیں۔ ۔ ۔ اور پھر حجاج ابن یوسف، ابن علقمی، میر عالم، میر جعفر اور میر صادق مسلمان ہی تھے، کوئی کافر نہ تھے، سبھی طرح کے لوگ مسلمانوں میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ۔ ۔ شہنشاہ اکبر کی نبوت کی تصدیق مسلمانوں نے ہی کی تھی۔ ۔ ۔ مصطفےٰ کمال پاشا کے قتل کا بیڑا کسی "مسٹر ایڈورڈ" یا "مہاشہ ماتادین" نے نہیں "مصطفےٰ صغیر"

ہی نے اٹھایا تھا۔ . . . اخوان المسلمون کے رہنما سید حسن البنا کو ایک کلمہ گو نوجوان ہی کی گولی نے خاک و خون میں تڑپایا تھا —— بیچارے "ابن رشد وجدانی" کے ساتھ بھی دنیوی ضرورتیں لگی ہوئی تھیں! بیوی بچے تھے، عزیز و اقارب تھے، اپنی ترقی اور خوشحالی کون نہیں چاہتا،

دن گزرے، ہفتے اور مہینے گزرے، پورا ایک سال بیت گیا، زمانہ بڑا گریز پا واقع ہوا ہے! وہ پیہ اپنا کام کر رہا تھا، ابن رشد وجدانی صاحب کے مضامین، اخبارات میں دھڑا دھڑ نکل رہے تھے، اپنے نام سے بھی اور دوسرے فرضی ناموں سے بھی!

ایک سال کے بعد پھر اُسی کارگاہِ نظم و سیاست میں ابن رشد وجدانی صاحب کو جاتے ہوئے دیکھا گیا، وہی در و بام وہی ماحول، وہی پردے، وہی صوفے اور کرسیاں، البتہ ڈاڑھی والے بوڑھے اردلی کی جگہ ایک لمبا تڑنگا آدمی آ گیا ہے، ڈاڑھی ایک دم صفاچٹ . . . مگر مونچھیں عاشق کی شبِ جدائی کی طرح سیاہ بھی اور لمبی بھی! مونچھیں خم کھائی ہوئی نوکیں، سیاہ رنگت، کیودی آنکھیں، چیچک کے داغ، یہ اردلی جب تن کر کھڑا ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جلاد کھڑا ہوا ہے۔ . . سرکار دربار کا رعب داب قایم رکھنے کیلئے ایسے ہی بادقار اور ہیبت ناک اردلیوں، چپراسیوں اور دربانوں کی ضرورت ہے!

دفتر کے دروازے کا پردہ جب اُس اردلی نے اٹھایا ہے تو وجدانی صاحب نے قدرے جھجکتے ہوئے قدم رکھا ——

- اور دونوں طرف سے رسمی آداب و سلام کے بعد گفتگو ہونے لگی —— . . .

—— مولانا! آپ نے تو بیڑا اٹھایا تھا کہ ان "لوگوں" کی ساری جد و جہد کو خاک میں ملا کر رکھ دوں گا اور سال کے اندر ساری فضا بدل جائے گی، مگر وہ "تحریک" تو اور زور پکڑ رہی ہے، لوگ اُدھر کھچے چلے جا رہے ہیں۔

—— حضور! انسان کا کام کوشش کرنے کا ہے، خاکسار نے اپنے کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی! عنوان بدل بدل کر کیسے معرکے کے مضامین لکھے ہیں، کیا کیا منطقی دلائل پیش کئے ہیں، "سیکولر حکومت" کی تعریف —— مذہبی حکومت کی برائی —— اور یہ بھی کہ سیاست اور دین دو جدا جدا چیزیں ہیں —— متقی اور دیندار لوگوں کو سیاست سے جو دنیاداری کا کام ہے، دور رہنا چاہیے . . پھر مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے مذہبی اختلافات کو کس کس نفسیاتی انداز سے اس کمترین نے اُجاگر کیا ہے اور اُن ناشدنی کم بختوں کے خلاف عوام کے دلوں میں کس کس نہج سے شبہات اور بدگمانیاں پیدا کی ہیں . . . . مگر . . . .

—— مگر . . . لیکن . . . ان معذرتوں اور اس قسم کی گریز سے کیا ہوتا ہے، صاف اقرار کیجئے کہ آپ ناکام رہے، آپ کا ہر حربہ بیکار ثابت ہوا، جیت فریق مخالف ہی کی رہی، ہم نے تو لوگوں سے یہ کہا تھا کہ آپ کے قلم میں وہ زور اور وہ طاقت ہے کہ تحریر و استدلال کے میدان میں آپ کے مقابل کوئی ٹھیر نہیں سکتا . . . —

—— حضور! ؎ وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے . . .

—— ارے! یہ آپ نے کیا کہہ دیا —— اس! اتنی مرعوبیت! تو پھر آپ کیا کر سکیں گے . . .

—— سرکار! بدحواسی میں یہ مصرعہ زبان سے نکل گیا . . . میری عادت ہے کہ کبھی کبھار بے موقع شعر پڑھ دیا کرتا ہوں،

پورے ایک گھنٹہ تک اسی قسم کی گفتگو رہتی ہے، وحدانی صاحب معذرتوں پر معذرتیں پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔۔ مگر اُدھر کا پارہ اتنا اونچا چڑھ گیا ہے کہ درجۂ اعتدال تک آنا مشکل ہو گیا ہے ——— آخری جملہ :۔

"آپ کو ایک آخری موقع اور دیا جاتا ہے۔۔۔" اور وحدانی صاحب اس جملے کے ایک ایک لفظ کی کسک کو لئے ہوئے رخصت ہوتے ہیں، راستہ بھر یہی الفاظ کانوں میں گونجتے رہے۔۔۔ ہوٹل میں جا کر پلنگ پر دراز ہو گئے، ان کے اعصاب تکان سی محسوس کر رہے تھے، چہرہ کا رنگ اُڑا اُڑا سا تھا، اسی عالم میں نیند آ گئی

وہ سوتے میں بڑبڑاتے جاتے تھے۔۔۔ "آپ کو ایک آخری موقع اور دیا جاتا ہے۔۔۔ آخری موقع" اور مکھیاں وحدانی صاحب کے ہونٹوں پر بیٹھ بیٹھ کر اُڑ جاتی تھیں۔۔۔ آج اُن کی نیند ہارے ہوئے جواری کی سی نیند تھی!

رُوحِ انتخاب

تاریخ کے ہر دور میں زندگی کے بنیادی تصور میں افراط و تفریط موجود رہی ہے، کسی نے اصلاحِ نفس اور روحانیت کو اس درجہ اہمیت دی کہ دُنیا کے کاروبار کو حقیر اور ناپاک سمجھ کر ٹھکرا دیا اور زندگی کی بیرونی سطح کی نقش گیری میں اتنا منہمک ہوا کہ روح و نفس کے تقاضوں کو پامال کر دیا، پہلے گروہ نے اپنے خود ساختہ مسلک کو رہبانیت اور یوگ سے موسوم کیا اور اس نشہ آور تصورِ زندگی کو جب مسلمانوں کے ایک طبقہ نے اپنایا تو یہاں آکر اُس نے غلط تصوف کا لبادہ اوڑھ لیا، یعنی اس جامد و ساکن نظریہ زندگی کے لئے بالکل غلط طور پر فقر اور تصوف کی مقدس اصطلاحیں استعمال ہونے لگیں، حالانکہ اس کو فقرِ صدیق رضؓ اور فقرِ بوذر رضؓ سے دور کی نسبت بھی نہ تھی، یہ سراپا حرکت و سعی اور جہد و عمل ہے اور وہ حقائقِ ہستی سے فرار اور سکون پرستی کا دوسرا نام ہے۔

سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی
(مولانا حیدر زماں صدیقی مرحوم)

جہاں تک عزت کا تعلق ہے، وہ آپ کے اپنے ہاتھ ہے، جب تک آپ خود اپنی نگاہوں میں ذلیل نہ ہوں گے، ماحول [illegible] مسخر کر کے آپ کو ذلیل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا، لہٰذا آپ دین کے اتباع میں اپنے آپ کو معزز محسوس [illegible] اگر ہوں اسے ملا اور مولوی کی پھبتیاں کسے گا تو یہی آپ دیکھیں گے یہ پھبتیاں خود معزز ہو کے رہ جائیں گی! [illegible] ان پھبتیوں کی زد پر ہیں، لیکن چونکہ ہم اپنے اندر احساسِ کہتری نہیں رکھتے اس لئے ان پھبتیوں، پھبتی [illegible] خود بخود ختم ہو رہا ہے اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ الفاظ بالکل دوسرا مفہوم دیں گے۔

(نعیم صدیقی)

اس وقت مسلمانوں کیلئے دینی اعتبار سے دو خطرے سب سے بڑے ہیں، پہلا خطرہ لادینی جمہوریت ہے جس کی تعلیم یہ ہے کہ ملک کے معاملات کا تعلق مذہب اور خدا سے نہ ہونا چاہئے مذہب ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے، سماجی معاملات کی بنیاد خود انسان کے بنائے ہوئے قانون پر ہونا چاہئے، اسلام کے نزدیک یہی بات فساد کی جڑ ہے، اسلام پوری زندگی کا دین ہے اسلام کے زندہ رہنے کیلئے ضروری ہے کہ پوری زندگی اسلام کے حوالے کی جائے —— دوسرا خطرہ اشتراکیت کا ہے، اشتراکیت کی بنیاد خدا کے انکار پر ہے، اشتراکیت کے نزدیک آخرت کا تصور، اللہ کی ہدایات کی تلاش، اخلاق اور انسانیت کی تعلیم سب دھوکا ہے وہ مذہب کی تمام تحریکوں کو سرمایہ داروں کا ڈھکوسلا سمجھتے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ سوائے پیٹ کے انسان کے سامنے اور کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں، جو کچھ ہے اسی پیٹ کی خاطر ہے۔

یہ دونوں باتیں، اسلام کے بالکل خلاف ہیں زندگی کے جس معاملہ میں آپ لادینی جمہوریت یا اشتراکیت میں سے کوئی چیز بھی قبول کریں گے وہاں اسلام نہ ہوگا، اور جس حصہ میں اسلام ہوگا، وہاں ان دونوں میں سے کوئی نہ ٹھیر سکے گا۔ کچھ لوگ مسلمانوں کو اس دھوکے میں رکھ رہے ہیں، کہ وہ چاہے لادینی جمہوریت کے نام لیوا رہیں یا اشتراکیت کے علم بردار بن جائیں ان کے دین کو کوئی خطرہ نہیں ایسے لوگ یا تو خود دھوکے میں ہیں یا پھر جان بوجھ کر مسلمانوں کو دھوکا دے رہے ہیں۔　　(ابو سلیم محمد عبدالحی (رام پور))

ہماری نظر میں

المسلمون

ماہنامہ "المسلمون" ۳۲ شارع المنیل بالروضۃ القاهرۃ، مصر۔ بدل اشتراک مصری علاوہ محصول ڈاک۔ صفحات ۹۶، کاغذ، طباعت نہایت عمدہ۔

ماہنامہ "المسلمون" ماہ ربیع الاول ۱۳۷۱ھ سے جناب سعید رمضان کی ادارت میں قاہرہ سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ اسلامی طرز فکر کا یہ ایک ہی رسالہ ہے جو اس وقت مصر سے شائع ہو رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سید رشید رضا مرحوم کے "المنار" کے بعد مصر میں ایک علمی و دینی رسالہ کی جگہ خالی تھی جو خالص علمی رنگ میں مسلمانوں پر اسلام پیش کرے۔ اسی ضرورت کو محسوس کر کے آج سے چار سال پیشتر مرحوم حسن البناء شہید نے ماہنامہ "الشہاب" جاری کیا تھا، جس نے مصر بلکہ پورے عالم اسلامی کے علمی و دینی حلقوں میں نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا اور ان لوگوں کی نظر میں بھی "اخوان" اور ان کی دعوت کی طرف سے بدگمان تھیں، جو اخوان کی دعوت کو پرانے طرز کی ایک مذہبی تبلیغ سمجھ کر اسے کسی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ "الشہاب" نے سب سے پہلی دفعہ مصر میں اسلام کو بطور ایک مکمل نظام زندگی کے پیش کیا اور دنیا کے موجودہ مسائل اور مشکلات کو اسلامی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی۔ پھر "الشہاب" کی ظاہری شکل و صورت طباعت اور کاغذ دوسرے اونچے علمی و ادبی رسالوں سے کم نہ تھا۔ لیکن افسوس کہ "الشہاب" کے کل پانچ ہی پرچے شائع ہو سکے تھے کہ مصر کے اندرونی سیاسی مسائل کچھ اس طرح پلٹے کہ "الشہاب" کی اشاعت جاری نہ رکھی جا سکی۔ پھر اس کے بعد اخوان کی تحریک خلاف قانون قرار دی گئی، حسن البناء کی شہادت ہوئی اور وہ کچھ ہوا، جسے دنیا جانتی ہے۔

اب جب کہ اخوان پر سختیوں کا دور ختم ہوا اور وہ ابتلاء و محن کے بعد از سر نو میدان میں آ گئے، تو قدرتی طور پر "الشہاب" کی تمنا کا خیال بھی دلوں میں چٹکیاں لینے لگا۔ ہمارے محترم دوست سعید رمضان (جو "الشہاب" میں حسن البناء مرحوم کے دست راست اور منیجنگ ایڈیٹر تھے) ابھی دو سال کی جبری جلاوطنی کے بعد مصر واپس ہوئے، اور "الشہاب" ہی کے طرز پر "المسلمون" کے نام سے ایک نئے رسالہ کا اجراء کیا جس پر ہم اس وقت تبصرہ کر رہے ہیں، اور جسے نام کے سوا ہر چیز میں "الشہاب" کا مثنیٰ کہا جا سکتا ہے۔

المسلمون کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے نہ صرف مصر بلکہ پورے دنیائے اسلام کے اسلامی طرز پر لکھنے والوں کو ایک جگہ جمع کر لیا ہے، خالص اسلامی طرز پر سوچنے اور لکھنے والوں کا یہ مجموعہ ہمیں اس وقت "المسلمون" کے سوا کہیں اور نظر نہیں آتا۔ چنانچہ اس کے مستقل اور نمایاں لکھنے والوں میں جناب حسن ہضیبی، استاذ بہی الخولی، شیخ محمد ابو زہرہ، ڈاکٹر مصطفیٰ حسنی السباعی، استاذ محمود محمد شاکر، شیخ محمد مصطفیٰ الزرقاء، استاذ محب الدین الخطیب، استاذ محمد یوسف موسیٰ، استاذ سید قطب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جناب حسن ہضیبی (اخوان المسلمون کے موجودہ مرشد عام) کا شمار مصر کے چند ممتاز ماہرین قانون میں ہوتا ہے۔ ان کا مضمون "ھذا القرآن" (یہ قرآن) "المسلمون" کی دو قسطوں میں شائع ہوا ہے، جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ

قرآن پر تدبر کیسے کیا جائے اور اس سے ہدایت کیسے حاصل کی جائے؟ یہ مضمون اگرچہ علمی اعتبار سے بہت زیادہ ٹھوس نہیں ہے، لیکن عام پڑھنے والوں کیلئے کافی حد تک مفید ہے۔

استاذ بہی الخولی مصر میں اخوان کے چند نمایاں لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ان کی کتاب "تذکرۃ الدعاۃ" اپنے موضوع کی عمدہ کتاب ہے۔ المسلمون[1] میں انہوں نے "قصص القرآن" کے عنوان سے لکھنا شروع کیا ہے۔ اب تک کے پرچوں میں انھوں نے صرف آدم علیہ السلام کے واقعہ کے تحت انسان کی پیدائش، اس کی فطرت اور مقصد زندگی پر بحث کی ہے۔

شیخ محمد ابوزہرہ جامعۃ فؤاد الاول کے کلیۃ الحقوق (لا کالج) میں اسلامی شریعت کے پروفیسر ہیں۔ اسلامی قانون اور جدید یورپی قوانین پر ان کی گہری اور محققانہ نظر ہے۔ ائمہ اربعہ پر ان کی چار مشہور کتابیں حال ہی میں شائع ہوئی ہیں، جن میں انھوں نے دراصل مذاہب اربعہ کی فقہ، طریق استخراج و استنباط پر بحث کی ہے۔ اب تک المسلمون میں ان کے دو مضمون — "شریعۃ القرآن دلیل علی انہ من عند اللہ" اور "الوحدۃ الاسلامیۃ" شائع ہوئے ہیں، جن میں پہلا مضمون کا ترجمہ جناب ظ۔ یٰسین صاحب کے قلم سے "فاران" میں شائع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ حسنی السباعی شام میں اخوان کے مشہور لیڈر ہیں۔ عام طور پر لوگ انھیں ان کی سیاسی زندگی سے جانتے ہیں، لیکن ان کی اصل قدیم تربیت خالص علمی و دینی ماحول میں ہوئی ہے اور وہ اپنی طالب علمی ہی کے زمانہ سے علمی موضوعوں پر لکھتے رہے ہیں اور اب بھی لکھتے ہیں۔ حدیث پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ اب تک "السُنَّۃ" کے نام سے ان کا ایک مضمون المسلمون میں برابر شائع ہو رہا ہے جس میں انھوں نے حدیث سے متعلق ہر پہلو سے بحث کی ہے جو بے حد مفید ہے۔

استاذ محمود محمد شاکر مصر کے ان چند لوگوں میں سے ہیں، جنھیں اسلامی فکر کے ساتھ ساتھ زبان و ادب پر پوری قدرت حاصل ہے۔ ان کی تحریر میں وہ البیلا پن ہے جس سے اس زمانہ کے مشہور مسلمان مجدد ادب مصطفیٰ صادق الرافعی مرحوم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ "کیوں نہ ہو خود رافعی کو بھی ان پر ناز تھا۔"

شیخ محمد مصطفیٰ الزرقاء جامعہ سوریہ کے کلیۃ الحقوق میں اسلامی شریعت کے پروفیسر ہیں، اُن کی تعلیم قدیم طرز پر ہوئی ہے لیکن اسلامی قانون کے ساتھ ساتھ موجودہ قانون سازی پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ "المسلمون" میں ان کا مضمون قرآن اور حدیث کے اسلوب کے مابین فرق کے تحت شائع ہوا ہے، جو نہایت عالمانہ اور محققانہ ہے۔ قدیم و جدید قانون کی واقفیت کے اعتبار سے شیخ محمد مصطفیٰ الزرقاء اور مصر کے شیخ محمد ابو زہرہ ایک درجہ میں آتے ہیں۔

استاذ محب الدین الخطیب ان لوگوں میں سے ہیں، جنھیں علم کے ہر پہلو سے جامع کہا جا سکتا ہے۔ تاریخ، ادب، قانون، قرآن اور حدیث پر ان کی محققانہ نظر ہے اور شاید اس وقت عربی دنیا میں ان کے علم کے دو چار ہی لوگ ہوں۔ ان کا ہفتہ وار اخبار "الفتح" مسلسل بیس سال تک بڑی کامیابی کے ساتھ چلتا رہا ہے جس میں پورے عالم اسلام کی ترجمانی ہوتی تھی۔ اس وقت دنیائے اسلام میں جو بہت سے نئے مسلمان ادیب نظر آ رہے ہیں، ان میں سے بہت سوں نے اپنے لکھنے کی ابتدا "الفتح" ہی سے کی تھی۔ مثلاً مصطفیٰ حسنی السباعی، عمر بہاء الامیری، مولانا مسعود عالم ندوی، خود مرحوم حسن البناء نے اپنا پہلا مضمون اسی میں

---

[1] ابھی تک ہمارے پاس "المسلمون" کے کل چار پرچے پہونچے ہیں۔ پہلا، تیسرا، چوتھا اور پانچواں۔ دوسرا پرچہ راستہ میں ضائع ہو گیا اور چھٹے پرچہ کا آج کل میں انتظار ہے۔

لکھا تھا اور اس کے بعد مسلسل لکھا کرتے تھے۔

استاذ محمد یوسف موسیٰ جامعہ فواد الاول کے کلیۃ الحقوق میں اسلامی شریعت کے نائب پروفیسر ہیں، ان کے تین مضمون "الاسلام وحریۃ والنسانیۃ" "فی الفقہ الاسلامی" اور "الوحدۃ الانسانیۃ" المسلمون میں شائع ہوئے ہیں، جو نہایت عالمانہ ہیں۔

استاذ سید قطب مصر کے نئے لکھنے والوں میں سے ہیں اور ان کا شمار مصر کے جدید ادیبوں میں ہوتا ہے، اور وہ ہر حلقہ میں معروف ہیں، انکی اصل تعلیم جدید طرز پر ہوئی ہے اور ابھی امریکہ میں دو سال گزار کر آئے ہیں، لیکن ادھر کچھ عرصے سے وہ دینی موضوعات پر لکھنے لگے ہیں اور خوب لکھنے لگے ہیں۔ اخوان کی دعوت سے حال ہی میں متاثر ہوئے ہیں۔

ان کے علاوہ مراکش کے مشہور سیاسی لیڈر محمد علال الفاسی بھی المسلمون میں مراکش کے سیاسی حالات پر لکھ رہے ہیں۔ محمد علال الفاسی مراکش کے سیاسی لیڈر ہونے کے علاوہ بلند پایہ شاعر اور ادیب بھی ہیں۔ انکی ابتدائی تعلیم قدیم طرز پر ہوئی ہے اور وہ جامعۃ القرویین کے باقاعدہ فارغ التحصیل ہیں۔

اسی طرح زمین کی ملکیت، اور کاشت کے متعلق جناب محمود ابو السعود کا ایک محققانہ مضمون المسلمون میں شائع ہو رہا ہے۔ محمود ابو السعود دراصل مصری ہیں اور اس وقت پاکستان کے اسٹیٹ بنک میں مستشار اقتصادی (ECONOMIC ADVISOR) ہیں۔

ہندوستان سے مولانا سید ابو الحسن علی ندوی صاحب بھی المسلمون میں لکھتے ہیں۔ مولانا مودودی کے بعض مضامین کا ترجمہ المسلمون کے بعض پرچوں میں شائع ہوا ہے۔ آئندہ سے "سود" کے ابواب کا مسلسل ترجمہ شائع کرنے کا ارادہ ہے، پہلی قسط بھیج دی گئی ہے۔

الجزائر کی جمعیۃ العلماء المسلمین کے صدر علامہ محمد البشیر الابراہیمی نے بھی المسلمون میں لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ اب تک ان کا ایک مضمون "یا مصر" کے نام سے المسلمون میں شائع ہوا ہے جو دراصل "البصائر" کے مصر نمبر سے نقل کیا گیا ہے۔

الغرض جہاں تک اتنی علمی شخصیتوں کے یکجا جمع کرنے کا تعلق ہے، المسلمون اپنی نظیر آپ ہے۔ خود سعید رمضان کو تو غالباً اپنی جماعتی دوروں میں مشغولیت کی وجہ سے لکھنے کا وقت نہیں ملتا ہوگا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اب تک وہ المسلمون میں اپنی ڈائری کے چند اوراق ہی شائع کر سکے ہیں، لیکن عالم اسلام کی سیاحت کی وجہ سے ان کے تعلقات ہر جگہ قائم ہو گئے ہیں۔ مصر کے نوجوانوں میں وہ پہلے بھی محبوب تھے اور ان کے لیڈر سمجھے جاتے ہیں، اب حسن البناء مرحوم کے خاندان سے تعلق ہو جانے کی وجہ سے ان کی شخصیت اور نمایاں ہو گئی ہے، اگرچہ وہ اخوان کی مجلس شوریٰ کے رکن نہیں ہیں، لیکن اخوان کے مرشد عام جناب حسن الہضیبی انہیں اپنے جماعتی دوروں میں ہر جگہ اپنے ساتھ رکھتے ہیں

لیکن یہی چیز جو "المسلمون" کی بڑی خصوصیت ہے، اس میں ایک بڑے نقص کا سبب بھی بن گئی ہے۔ لکھنے والے بہت ہیں اور رسالہ محدود ہے، اور وہ بھی ماہانہ، اس لئے تقریباً ہر مضمون کئی کئی قسطوں میں بانٹنا پڑتا ہے۔ جس سے اس مضمون کی افادیت میں بھی کمی آجاتی ہے اور پڑھنے والے بھی بار بار "باقی ہے" "باقی پھر" سے تنگ آجاتے ہیں، اس باب میں، المسلمون اور فاران[1] ایک دوسرے کی عین ضد واقع ہوئے ہیں۔

المسلمون کے آخر میں "فی انحاء العالم الاسلامی" کے نام سے دنیائے اسلام کی خبروں کا خلاصہ مختصر تبصرے کے ساتھ ہوتا ہے، وہ اگرچہ ان لوگوں کے لئے زیادہ مفید نہیں ہے جو دنیائے اسلام کے واقعات پر خود نظر رکھتے ہیں، لیکن جو لوگ مہینہ بھر کی خبروں کو سرسری طور پر ایک نظر میں دیکھنا چاہیں، ان کے لئے یہ باب کافی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ (م – ع)

---

[1] یعنی "فاران" میں اب تک کوئی مضمون قسط وار شائع نہیں ہوا۔

نفسیات کے زاویے

"نفسیات کے زاویے" از:- پروفیسر شمس الحسن حسن بریلوی، ضخامت ۴۰۰ صفحات مجلد رنگین گردپوش کے ساتھ قیمت پانچ روپے (پاکستانی) سوا چھ روپے (ہندستانی) ملنے کا پتہ :-

محرابِ ادب، کراچی !

"نفسیات پر" یہ ایک معلومات آفریں اور دلچسپ کتاب ہے جسے "محراب ادب" کراچی نے، کتابت و طباعت کے خاصے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے یہ کتاب طلباء کے لئے لکھی گئی ہو مگر عوام و خواص سبھی کے لئے کام کی چیز ہے، مصنف کی احتیاط و دیانت کا یہ عالم ہے کہ ہر فصل اور ہر باب (chap (er) کے بعد اُن کتابوں کا جن سے استفادہ کیا گیا ہے، حوالہ بھی دیدیا ہے۔ — کتاب کی فنی اور علمی اہمیت کا اندازہ اس اقتباس سے کیا جا سکتا ہے :-

"علم ہی ہمارے کام کی سمت کو متعین کرتا ہے اگر علم نہ ہو تو ہماری یہ قوتیں بھٹک جائیں، اور غلط راستہ پر پڑ جائیں، مثلاً ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق ہو جو اس کا مصرف نہیں جانتا الیسی صورت میں اس کے سامنے سے شیر دھاڑتا ہوا نکلتا ہو تو اب بجائے بندوق ریکے اس کی جبلت یا جذبہ فرار رہنے کا زور جائے گا، برخلاف اس کے اگر یہی بندوق شکاری کے ہاتھ میں ہو تو بجائے فرار کے مقابل جبلت کو تہییج ہوگا اور وہ اُس کو شکار کرنے کی کوشش کریگا اس سے ثابت ہوا کہ علم ہمارے افعال اور ہماری جبلتوں کے رُخ بدل دیتا ہے (صفحہ ۱۵۴)

(۵۵) "پیار و محبت" "پیار" اُردو اور "محبت" عربی ہے اس لئے واو عطف کا لانا درست نہیں، اور روزمرہ بھی یہی ہے کہ عطف کے بغیر "پیار محبت" بولا جائے ———— (۱۶۹) - "PAIN AND PLEASURE" کا ترجمہ "حظ و کرب" کیا ہے ——— اس ترجمہ پر مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے درمیان عرصہ ہوا کہ بڑی معرکہ آرائی رہی ہے اور حق و انصاف یہ ہے کہ مولانا آزاد کی رائے زیادہ صحیح ہے کہ "حظ و کرب" کے مقابلہ میں "لذت و الم" زیادہ جامع ترجمہ ہے۔ ———— (۲۸۳) "سے اختیاراً انگلیاں توڑنے لگتا" غالباً مصنف کی یہاں مراد "انگلیاں چٹخانے" سے ہے ———— (صفحہ ۲۵۳)

"والدین اور اولیاء کو یہ بات یاد رکھنی چاہئیے" فقہی اعتبار سے "ولی" (GUARDIANS) کی جمع "اولیاء" صحیح استعمال ہوئی ہے، لیکن بہر حال بہتر تھا کہ "اولیاء" کی جگہ "سرپرستوں" لکھا جاتا) ——— (صفحہ ۲۷۴) "ہمارے اسلاف یقیناً سربلندی حاصل کر سکیں گے اور اخلاف کا نام اُن سے روشن ہوگا" کتابت کی غلطی کے سبب "اخلاف" کی جگہ "اسلاف" اور "اسلاف" کی بجائے "اخلاف" چھپ گیا۔

آخر میں انگریزی اصطلاحات کی فرہنگ درج ہے بہر حال پروفیسر شمس الحسن صاحب نے اُردو ادب میں ایک مفید کتاب کا اضافہ کیا ہے۔

مسدس رنگین

"مسدس رنگین" مرتبہ :- تحسین سروری ضخامت ۴۰ صفحات، قیمت آٹھ آنے، ملنے کا پتہ :- ادارہ ترقی ادب، کلیم پریس بلڈنگ فارنس روڈ، کراچی !

میر سعادت یار خاں رنگین اس پایہ کے شاعر اور اس قدر دلچسپ انسان تھے کہ انشاء اللہ خاں انشا جیسے ذہین اور نکتہ سنج شاعر کا جی ان کی صحبت میں بہلتا تھا،

عجب رنگینیاں ہوتی تھیں تب باتوں میں اے انشا
ہم مل بیٹھتے تھے جب سعادت یار خاں اور ہم

انہی سعادت یار خاں رنگین کی مثنوی (دلشش جہت رنگیں) کو جناب تحسین سروری نے ایڈٹ کیا ہے اور اُس پر فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے! رنگین کی یہ مثنوی ـــــــ سحر البیان، گلزار نسیم اور زہر عشق کے پایہ کی تو نہیں ہے مگر اُس میں روانی اور سلاست ہے، اور جہاں کہیں ایسے شعر آ گئے ہیں،

آہ کیجئے تو آن جاتی ہے　　　جو نہ کیجئے تو جان جاتی ہے

تو لطف پیدا ہو گیا ہے۔

قانونِ محکم

"قانون محکم" از:- تاباں راشدی جمالی القادری، مجسم ۴۸ صفحے، مجلد قیمت ایک روپیہ چار آنہ
ملنے کا پتہ:- مکتبہ قادریہ نمبر ۲۳ خانقاہ شریف لین کلکتہ ۱۲!

اس کتاب میں حضرت امام غزالی علیہ الرحمۃ پر اس انداز میں خردہ گیری اور نکتہ چینی کی گئی ہے کہ جسے پڑھ کر تکلیف ہوتی ہے:- ـــــــ (۳۳) ان (غزالی) کا کارنامہ "علم کلام" کے چند نئے اصولوں اور چند تصانیف کے علاوہ کچھ نہیں جن میں "احیاء العلوم" بھی شامل ہے اور یہی وہ الہامی کتاب ہے کہ جسے امام صاحب کی دماغی کاوشوں کا ناکام نتیجہ خیال کرتا ہوں اور خصوصاً ان کے فلسفہ و ریا و حسد سے ذاتی بغض و عناد اور شیطانی وساوس کی بو پاتا ہوں ۔۔۔ (صفحہ ۳۸) "ریا، خفی کی شکلوں پر جب غور کرتا ہوں تو امام صاحب کی فریب بیانیوں پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ۔۔۔ "حضرت امام غزالیؒ انسان تھے فرشتہ نہ تھے، اُن کے قلم سے لغزشیں بھی ہوئی ہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اُن کے مرتبہ کے چند ہی علماء اسلامی تاریخ میں پائے جاتے ہیں، علامہ اقبال نے سب کچھ پڑھ کر کہا تھا ـــ فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی ـــــــ اور سید شاہ ماجد علی عرف عنایت مولی متخلص بہ تاباں راشدی جمالی القادری' وہ کہتے ہیں جو ابھی اوپر درج کیا گیا ہے، ہر کہ و مہ کو امام غزالی پر طنز و تعریض زیب نہیں دیتی' ہر شخص کو اپنے حدود پہچانتے چاہئیں۔

صفحہ ۸ "پر "سیار" کو "میعار" "فلسفی" کی جمع "فلسفا" (۳۱) "مبلغ علم" کو "مبلّغ علم" (صفحہ ۴۸) اور ایک جگہ "افادی" اور "غیر افادی" کو "آفادی" اور "غیر آفادی" لکھا ہے! آخر کس کس غلطی کو بیچارے کاتب کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے!

حضرت امام غزالیؒ کے بعض فلسفیانہ تصورات اور تصوف آمیز معتقدات پر بیشک گفتگو کی جاسکتی ہے مگر مصنف نے جو پیرایہ اختیار کیا ہے وہ مناسب نہیں! غزالی کی مدح و تنقید کے لئے شبلی نعمانی کا قلم درکار ہے!
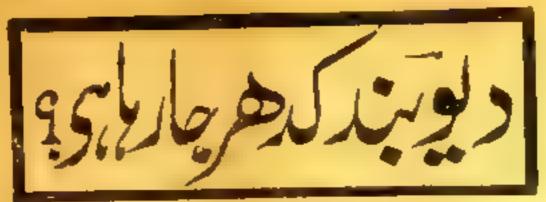
اس مہینہ کا "فاران" ترتیب دیا جا رہا تھا کہ سید نور علی صاحب کا حسب ذیل مکتوب اسی دوران میں گورکھپور سے وصول ہوا:—

"... ... ... اس وقت میں یک جگہ اشتراکی تحریک کے مقابلہ کے لئے سرگرداں تھا جماعت کی کتابیں اور اس وقت تک نہیں آئی تھیں اور اشتراکی دوستوں کی دوڑ دھوپ ایک چبھن معلوم ہو رہی تھی، چنانچہ "فاران" کا بنڈل آتے ہی میں نے چھڑا لیا، بڑا کارساز ہے وہ حکیم و دانا جس کے قبضہ میں ہماری جان ہے کہ مضمون "نقشِ اوّل" اور "کائنات گواہی دیتی ہے"، اس موقع کے لحاظ سے بالکل موزوں تھے، چنانچہ کتابوں کے بجائے رسالہ ہی کو میں نے اللہ کے بھروسہ پر تقسیم کر دیا، مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ اپنے تو خیر، غیر بھی "نقشِ اوّل" کے معترف ہوئے رہے، دو روز بعد کتابیں آ گئیں اور پھر کتابوں کو تقسیم کیا کچھ سیدھے لوگ جو غلطی سے اشتراکی کیمپ میں آ گئے تھے اسلام کا صحیح تصوّر پاتے ہی پھر اپنے مرکز کی طرف لوٹ آئے، لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ایک عالم جو دیوبند کے فارغ ہیں، انھیں اس موقع پر لوگوں کو بتانے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جماعت (اسلامی) کا عقیدہ غلط ہے، ان کی کتابیں لوگوں کو گمراہ کر دیتی ہیں لہٰذا ان کتابوں کو نہ پڑھو، اور اس چیز کے لئے جمعہ کا دن خطبہ سے قبل کا وقت مقرر کیا گیا تاکہ بیک وقت یہ صلائے عام سنا دی جائے، یہ سب کچھ میرے سامنے ہی ہوا، لیکن امیر جماعتِ ہند کا حکم خاموشی مانع رہا کہ میں مولانا محترم سے پوچھتا کہ حضرت! کون کون سی کتابیں مطالعہ فرمائی ہیں اگر واقعی اعتراض کی بات ہے تو کتاب میں نشان لگا دیجئے ——— سال بھر سے اشتراکیت کی تبلیغ ہو رہی ہے لیکن نہ ہمارے عالم دین ہی کو سوجھا کہ ایک لفظ اس کی مخالفت میں کہیں یا اُمرے سے لوگوں کو متنبہ کریں اور نہ تبلیغی جماعت والوں نے کوئی آواز اٹھائی لیکن آج ہر ایک کو میری مخالفت ضروری ہو گئی اگرچہ عام لوگوں پر کوئی اثر ان حضرات کا نہیں ہوا لیکن اشتراکی دوستوں کو ایک ہتھیار ہاتھ آ گیا کہ جب آپ لوگ خود لڑتے ہیں تو بھلا ہم آپکی بات کیا سنیں۔ ... ..."

یہ خط نہیں ایک "تعزیت نامہ" اور ایک نوحہ اور مرثیہ ہے، اسے پڑھ کر دل کو جتنی اذیت ہوئی اُس کا حال یا ہم جانتے ہیں یا ہمارا خدا جانتا ہے!

دیوبند کے اکابر سے جن کے احترام سے ابھی تک ہمارے دل کے گوشے معمور ہیں، بصد ادب و نیاز دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ خدمتِ دین کی یہ آخر کیا نہج اور مدافعتِ حق کا یہ کونسا انداز ہے؟ انھوں نے کبھی یہ سوچنے اور سمجھنے کی زحمت گوارا کی ہے کہ وہ کس راستے پر جا رہے ہیں؟ اور کس "گمراہی" (؟) کے خلاف جہاد کرنے کے زعم میں وہ گرفتار ہیں؟ اور یہ جو دیوبند میں "مودودیت" کی اسکیم چلائی جا رہی ہے اس سے کیا واقعی دین سربلند ہو رہا ہے؟

کیا اگلے اہلِ علم میں فقہی اختلافات نہیں رہے، کیا وحدت الوجود اور شیخ محی الدین اکبر کے تصوف آمیز نظریوں پر حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ جیسے بزرگوں نے تنقید نہیں کی تو اس قسم کی تنقید و تعریض اور اس نزاع کے اختلافات کے سبب ان بزرگوں کے ملفوظات، اقوال، ملفوظات اور دین کی جدوجہد کو علماء سلف نے کیا (معاذ اللہ) "فتنہ"، "بن"، اور "گمراہی" قرار دیا ہے؟

اگر کوئی شخص جماعتِ اسلامی کے لٹریچر سے متاثر ہو کر کمیونزم اور الحاد کی آغوش سے نکل کر اسلام کی طرف آ رہا ہو، تو اُس وقت جماعتِ اسلامی کی تائید و معاونت ——— تردید و مخالفت ——— یا سکوت ان میں سے کونسی چیز "دین" کے لئے مفید ہے؟ کیا جماعتِ اسلامی واقعی گمراہی کی اُس حد پر پہونچی ہوئی ہے کہ اس کے لٹریچر اور اس کی کوششوں سے اہلِ شرک و بدعت، اہلِ زندقہ و الحاد اور مغرب زدہ نوجوان اگر اسلام اور اخلاق کی طرف مائل ہوں تو جماعتِ اسلامی سے قبول کئے ہوئے تاثر کی گمراہی، اور مغرب زدگی شرک و بدعت اور زندقہ و الحاد کی گمراہی دونوں ایک جیسی ہیں؟

دیوبند کی موجودہ روش اُس کے شاندار ماضی سے ہمیں مختلف نظر آتی ہے، اور اگر اُس پر اسی قسم کے مُفتیانِ کرام کا قبضہ رہا تو دیوبند اور بریلی ایک ہی سطح پر آ جائیں گے اور یہ ایک بہت بڑا "حزنیہ" ہوگا جس کے آثار اب نمایاں تر ہوتے جا رہے ہیں!

حضرت قاسم العلوم دیوبند کے نامور پوتے بلکہ صحیح جانشین اور اُن کے علوم کے وارث جناب قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند سے ہم اصلاحِ حال اور خیر و فلاح کی توقع رکھتے ہیں، قاری صاحب موصوف اگر "جراَت" سے کام لیں تو دیوبند کی موجودہ روش بدل سکتی ہے، "جُراَت" کا لفظ ہم نے دانستہ استعمال کیا ہے، اس لئے کہ بھارت میں جو حکومت ہے اُس کے اعتبار سے یہ سمجھ لینا کہ دیوبند کسی خاص بزرگ کے "سایۂ عاطفت" ہی میں زندہ رہ سکتا ہے، اس تصور کا مقابلہ "جراَتِ بے باک" ہی کر سکتی ہے!

مفتیوں کے غیر محتاط فتوے "دیوبند" کی زندگی کا ثبوت نہیں ہیں، دیوبند کی زندگی "اعلاءِ کلمۃ الحق" سے وابستہ ہے چاہے اُس کا سالانہ بجٹ کتنا ہی قلیل اور اُس کے طلباء اور مدرسین کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو جائے ——— رہا "جماعتِ اسلامی" کا معاملہ تو اس جماعتِ حق نے مسلمانوں کے دلوں میں اللہ کے دین کو پورے کا پورا قایم کرنے کی جو لگن پیدا کر دی ہے وہ ان مخالفتوں سے کم نہیں ہو سکتی!

سید انور علی صاحب نے گورکھپور میں صبر و ضبط کا جو مثالی مظاہرہ کیا ہے اُس سے ہم توقع رکھتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی کے ارکان پتھروں کے جواب میں اپنے مخالفین کی ہدایت کے لئے ہی دُعا کرتے رہیں گے!

فاران
ماہر القادری

،، قدرت نے ہمیں صنعتی ترقی کے ذرائع عطا کئے ہیں اور ہمیں عہد کرنا ہے کہ ہم ان کو بہترین مناسب کام میں لگائیں تاکہ پاکستان طاقتور اور خوشحال ملک بنے ،،

قائد اعظم
محمد علی جناح

میں سرمایہ داروں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ آگے بڑھیں ، اور صنعتوں کے قیام میں حکومت کی طرح حصہ لیں ،،

الحاج خواجہ ناظم الدین
وزیر اعظم

پین اسلامک اسٹیم شپ کمپنی لمیٹڈ

کے حصص میں اپنا سرمایہ لگائیے

اور اس طرح سے قوم کی خدمت کیجئے اور ساتھ ہی منافع بھی کمائیے۔

منظور شدہ سرمایہ ------- سات کروڑ روپیہ

جاری شدہ سرمایہ ------- ایک کروڑ روپیہ

کمپنی کے حصص ابھی تک پوری قیمت پر بک رہے ہیں

فی حصہ صرف ۱۰۰ روپیہ

کمپنی کا بیڑہ

سفینہ عرب ——— وزنی ——— ۸۴۸۷ ٹن
(مسافر و مال بردار)

سفینہ مراد ——— وزنی ——— ۸۰۱۰ ٹن
(مسافر و مال بردار)

سفینہ طارق ——— وزنی ——— ۳۳۲۳ ٹن
(مال بردار)

سفینہ ملت ——— وزنی ——— ۸۱۳۹ ٹن
(مسافر و مال بردار)

پراسپکٹس اور حصص کے فارم اور مطبوعہ لٹریچر کے لئے لکھئے :-

پین اسلامک اسٹیم شپ کمپنی لمیٹڈ

ادریس چیمبرس ، سووڈ اسٹریٹ ، کراچی-۲

جلد ۴ —— شمارہ ۶

ماہنامہ

فاران

ستمبر ۱۹۵۲ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپے (پاکستانی) —— فی پرچہ ۸ آنے

۸ روپے (ہندستانی) —— فی پرچہ ۱۱ آنے

دفتر فاران
کیمبل اسٹریٹ
کراچی ۱

نظم و ترتیب

صفحہ

حصۂ نظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

تقسیم ہند کے مطالبہ اور پاکستان کی تحریک کی پشت پر اگر "اسلام" کا نعرہ نہ ہوتا تو یہ تحریک مسلمانوں کی دوسری سیاسی اور قومی تحریکوں کی طرح بس ایک وقتی ہنگامہ بن کر رہ جاتی! یہ ایک عالم آشکارا حقیقت ہے کہ ہندوستان کے مسلمان مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر اسلام اور صرف اسلام کے نام پر جمع ہوئے تھے۔

مسلمان اپنی تمام بے عملی اور شکست کوششوں کے باوجود اسلام کا فروغ چاہتے ہیں خدا اور دین کا نام آتے ہی ان کی گردن جھک جاتی ہے اور رسول اللہ کا نام نامی اور ذکر گرامی اُن کے دلوں کو گرما دیتا ہے۔! مسلم لیگی رہنما مسلمانوں کے جذبات سے اور ان کی نفسیات سے اچھی طرح باخبر تھے، اس لئے انھوں نے اپنی تقریروں میں خدا کا، رسول کا، دین کا، قرآن و شریعت کا نام لے لے کر مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کیں، اُن سے کہا گیا کہ "پاکستان" میں اسلام کو فروغ ہوگا اور اس خطۂ پاک میں مسلمان اسلامی طرز پر زندگی بسر کر سکیں گے ——— ان وعدوں اور نعروں نے مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے پروانوں کی طرح اکٹھا کر دیا، کیا عقیدت تھی، کیا جوش تھا اور کس قدر جذبات میں گرمی تھی، دراصل مسلمانوں کی تحریک میں اسلام ہی کی محبت کارفرما تھی! ہندوستانی مسلمان اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ پاکستان بنتے ہی، اسلام کی بہار رفتہ پھر سے لوٹ آئے گی، اللہ کا قانون چلے گا، رسول کی سنت زندہ ہوگی، جو قرآن صرف نمازوں میں بولتا ہوا سنائی دیتا ہے وہ اب دستور و قانون اور سیاست و معیشت کی زبان سے بولے گا! اس گئے گزرے زمانے میں جبکہ اخلاق و آبادی سے لوگ راہِ فرار اختیار کر رہے ہیں پاکستان دنیا کے لئے ایک مثالی حکومت ہوگی، خلافتِ راشدہ کی یاد پھر سے تازہ ہو جائے گی اور دنیا کے اندھیروں کو یہیں سے روشنی ملے گی۔

مُسلم لیگ کے لیڈروں کی زندگیاں عام طور پر مذہبی زندگیاں نہ تھیں، مگر مسلمانوں نے اسلام کی سربلندی کی خاطر اُن
کی رہنمائی اور قیادت کو نہ کہ صرف گوارا کیا بلکہ اُن کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ اُن کا بس چلتا تو وہ دن رات اپنے لیڈروں کے
"زندہ باد" ہی کے نعرے لگاتے رہتے، دُوسری طرف اسی جوش میں اُنھوں نے اُن علماءِ دین کو بے عزّت کیا جن کی پاکبازی
کی قسم کھائی جا سکتی ہے! پوری قوم پر وارفتگی اور نشہ سا طاری تھا! ایک جوش تھا جو سینوں میں موجزن تھا، ایک طوفان تھا
جس کی موجیں بلند سے بلند تر ہوتی چلی جارہی تھیں اور یہ تمام معرکہ آرائی صرف اسلام کے دم قدم سے تھی ؛

وہ جو نعرہ لگایا جاتا تھا کہ :-

"لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان"

سو ہندوستان سچ مچ بٹ کر اور پاکستان بن کر رہا ———— مگر پاکستان یوں ہی نہیں بن گیا اس کے لئے ہزاروں بستیاں
ویران ہوئیں، نہ جانے کتنی دینی درسگاہوں اور خانقاہوں کو بے چراغ ہونا پڑا، ہزاروں سہاگ اُجڑے، لاتعداد مسلمان
خواتین کی آبروریزیاں ہوئیں عصمتیں لُٹیں، قرآن کے نسخے اور حدیث و فقہ کی بے شمار کتابیں نذرِ آتش ہوئیں، خاندانوں
کے خاندانوں کا صفایا، مسلمانوں کی بستیاں اس طرح اُجاڑی گئیں جیسے وہاں پہلے کوئی آدمی بستا ہی نہ تھا، قیامت تو ایسی ہی
ہولناک قیامت جس کی نظیر اگلی اور پچھلی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی، خاک و خون میں تڑپنے والوں کی تعداد کا کوئی اندازہ
نہیں کیا جاسکتا، یتیموں اور بیواؤں کا شمار ممکن نہیں! صرف ایک دریائے راوی میں حق پرستوں کا اتنا خون شامل ہے
کہ اگر اُس کی موجوں کو نچوڑا جائے تو شہیدوں کے خون سے ایک "معاون دریا" جاری ہوجائے ؛

اس قیامت خیز تباہی کو مسلمانوں نے گوارا کیا، ان روح فرسا زخموں کو وہ سہہ گئے ——— صرف اس اُمید پر کہ
"پاکستان" ان سب کی تلافی کردے گا، پاکستان کے اسلامی حکومت بننے کی توقع پر اُنھوں نے اپنا سب کچھ لُٹا دیا، جن آنکھوں
نے مسلمانوں کے سروں سے موجِ خون گزرتے ہوئے دیکھی تھی وہ اس اُمید میں تھیں کہ ایک دن پاکستان میں اسلام کا تبسم
بھی ہم دیکھ لیں گی !

مگر —— نہ پوچھیے کہ پاکستان بننے کے بعد اُن اُمیدوں کا کس کس طرح خون ہوا، کیسی کیسی خلافِ توقع باتیں ظہور میں آئیں، خدا
اور رسولؐ اور قرآن اور شریعت کی دُہائیاں دے دے کر جو وعدے کئے گئے تھے وہ طاقِ نسیاں کی زینت کے کام آئے، جیسے اس قسم کا
کوئی وعدہ ہی نہیں کیا گیا تھا، غالباً یہ فرض کرلیا گیا کہ مسلمانوں کا حافظہ کمزور ہوتا ہے، وہ باتیں کسی کو یاد رہی ہوں گی اور
یاد بھی ہوں تو یہ مظلوم، بے سہارا، ستم رسیدہ اور زخم خوردہ مسلمان "اختیار و اقتدار" کے خلاف آواز اُٹھانے کی ہمت کہاں کرتے ہیں

لیکن پاکستان کے عوام مسلمانوں نے چند مہینے تو صبر کیا کہ اربابِ اقتدار اب کچھ کرتے ہیں اور اب علماء سے وفا ہوتے ہیں مگر
جب اُنھوں نے دیکھا کہ یہاں تو ارادے ہی کچھ اور ہیں سیاست و اقتدار کی بساط ہی اور انداز سے جمائی جارہی ہے —— تو پھر عوام
میں بے چینی پیدا ہوگئی، دلوں کی باتیں زبانوں تک آنے لگیں یہاں تک کہ عوام مسلمانوں کے اس اضطراب کے تیور دیکھ کر،

دستور ساز اسمبلی نے "قرارداد مقاصد" منظور کر دی!

اس پر مسرت و مبارکباد کا شور اٹھا، امیدوں میں جان سی پڑ گئی، پاکستان کے طول و عرض میں خوشی کی لہر سی دوڑ گئی کہ وہ "حقیقت منتظر" اب کوئی دم میں آنکھوں کے سامنے آنے والی ہے! لوگ محسوس کر رہے تھے کہ "قرارداد مقاصد" حقیقت میں وہ موڑ ہے جہاں سے پاکستان اپنی حقیقی منزل مقصود کی طرف مڑ جائے گا، اتنے ذمہ دار اور اس قدر باوقار شخصیتیں بھلا ایسے وعدے سے کہیں پھر سکتی ہیں اور پھر یہ کوئی خاموش عہد و پیمان اور خفیہ معاہدہ بھی نہیں ہے کہ کسی نے جانا، کسی نے نہ جانا، اس وعدہ (قرارداد مقاصد) کی گونج تو ساری دنیا میں سنائی دی ہے۔

کیا کیا امیدیں تھیں، کیسی کیسی خوش خیالیاں تھیں، کیا کیا آس لگائے بیٹھے تھے لیکن آہ! کہ یہ بھی لفظوں کی بازی گری ہی نکلی! "قرارداد مقاصد" کو پاس ہوئے کئی سال گزر گئے مگر اس سلسلہ میں کام کی رفتار انتہائی سست اور بہت زیادہ دھیمی رہی ہے۔

"قرارداد مقاصد" کے منظور ہونے کے بعد پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کو اپنی پوری طاقت اسی کام میں صرف کر دینی چاہئے تھی، اس کے کرنے کا تقاضا ہی یہ تھا مگر افسوس ہے کہ اس سے غفلت برتی گئی، حقیقت میں یہ وہ مجرمانہ غفلت ہے کہ اگر کسی سرکاری ملازم سے ظہور میں آئے تو اسے ملازمت سے برطرف کر دیا جائے۔

ہوتا یہ ہے کہ قوم کو بہلانے کے لئے کبھی کبھار کوئی دستوری سوال نامہ اخباروں میں چھپ جاتا ہے، اور کبھی یہ اطلاع ملتی ہے کہ "بنیادی اصولوں کی کمیٹی کے ارکان جمع ہوئے تھے ——— اور اب جبکہ بے شمار خطوط اور سیکڑوں تار دستور سازی کے سلسلہ میں حکومت کے پاس پہونچ چکے ہیں اور ہر طرف سے اسی مطالبہ کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں تو اب یہ اطلاع شائع ہوئی ہے کہ دستور کی بنیادی رپورٹ پیش کی جانیوالی ہے، احتجاج کے بغیر حکومت کی شنوائی کی بھی پیدا نہیں ہوتی ——— عرض کرنا یہ ہے کہ دستور سازی کا کام جو محنت چاہتا ہے اس کے لئے تو دن رات ایک کر دینے چاہئے تھے، اور یہ فرض تو "عبادت" کی طرح انجام دینا تھا، مسلمانوں کی کسی جماعت کے لئے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسلامی دستور کی تسوید و تدوین اس کے ہاتھوں انجام کو پہونچے!

"قرارداد مقاصد" میں اسلامی معاشرت اور دینی ماحول پیدا کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا، اس کے لئے کسی قانون اور دستور بننے کے انتظار کی ضرورت ہی نہ تھی، اسلام جن اچھائیوں (معروف) کو پھیلانا چاہتا ہے وہ سب کو معلوم ہیں اور جن برائیوں (منکر) کو مٹانا چاہتا ہے ان کا بھی ہر مسلمان کو علم ہے، مگر واقعات شاہد ہیں اور صورت حالات اس کی گواہ ہے کہ ہمارے ارباب اقتدار کی روش اس باب میں عجیب و غریب ہی ہے، انہوں نے معاشرت کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے ایک قدم بھی نہیں اٹھایا۔

جس پاکستان میں اسلامی معاشرت کی تجدید و احیاء کا وعدہ فرمایا گیا تھا وہاں موسیقی کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں، بلبل ... کے رقص و نغمہ کے جلسے اور رنگ و رامش کے مظاہرے ہوتے رہے ہیں، شہنشاہ ایران کو مسلمان

عورتوں سے سلامی دلوائی جاتی ہے، مسز روزولٹ صاحبہ سات سمندر پار سے دعوت دے کر بلوائی جاتی ہیں اور ان کے اعزاز میں جو جلوس ترتیب دیا جاتا ہے، اس میں مسلمان لڑکیوں کو اوپن کاروں میں بٹھا کر سر بازار پھرایا جاتا ہے۔

جو مملکت خدا اور رسولؐ کے نام پر وجود میں آئی ہے وہاں نہ شراب پر کوئی پابندی ہے اور نہ سود پر کوئی احتساب ہے۔ وہاں ریس کورس اور کلب گھروں میں ڈنکے کی چوٹ جوا ہوتا ہے اور خود مسلم لیگ کی نگرانی میں قمار بازی کے سٹال لگتے ہیں ——— پاکستان کے لئے ایک بہت بڑی لعنت "اپوا" (A. P. W. A) ہے جس کا کام ہی یہ ہے کہ یہاں عورتوں میں بے حجابی کا ذوق پیدا ہو، وہ بناؤ سنگھار کر کے محفلوں اور پارٹیوں کی زینت بنیں، یہ "اپوا" وہ منحوس و شوم ادارہ ہے جو پاکستانی عورتوں میں مغربی تہذیب کو پھیلا رہا ہے، اور سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ حکومت کی پشت پناہی اسے حاصل ہے، اگر ان "لیڈرات" اور "مستانتوں" کے ہاتھوں میں پاکستانی عورتوں کی زمامِ قیادت رہی تو پھر وہ لڑکیاں جن کی زندگیوں میں فاطمہؓ اور رابعہ بصری کی مقدس سیرتیں جھلکنی چاہیئے تھیں ایکٹریسیں بن کر رہیں گی!

غضب خدا کا ہمارے کانوں تک یہ دل خراش اطلاعیں بھی پہونچی ہیں کہ ڈاڑھی رکھنے اور شراب کی پارٹی میں چندہ نہ دینے کے جرم میں سرکاری ملازموں کو برطرف کیا گیا ہے ——— دوسرے ملکوں میں پاکستان کی اسلامی حکومت کے جو سفارت خانے ہیں ان میں مہمانانِ عزیز کی تواضع جام و مینا اور بادہ و صہبا سے کی جاتی ہے۔ اس طرح ممالکِ غیر میں پاکستان اور اسلام رسوا ہو رہا ہے، حالانکہ پاکستان اسلام کو سر بلند کرنے کے لئے حاصل کیا گیا تھا، ہمارے سفارت خانے روس، امریکہ، انگلستان اور دوسرے ملکوں کے قنصل خانوں سے ممتاز ہونے چاہیئے تھے، اس طرح کہ پیرس اور لندن میں ہمارے سفارت خانوں کو دیکھ کر وہاں کے لوگ محسوس کرتے کہ فسق و فجور کی ان بستیوں اور پاپ کے ان اندھیروں میں بس یہی وہ ایوان ہیں جہاں نیکی اور پاکبازی کے چراغ روشن ہیں، ہمارے سفارت خانے اسلام کی خاموش تبلیغ کا ذریعہ بن سکتے تھے مگر تبلیغ تو ایک طرف رہی ان کے وجود سے اسلامی روایات کی الٹی توہین ہو رہی ہے۔

پاکستان میں غذا کی طرف سے بڑا اطمینان تھا، مگر اب یہ اطمینان بھی خطرے سے دوچار ہے، آخر ہزاروں ٹن غلہ کہاں ناپید ہو گیا، آٹے میں ملاوٹ کون کر رہا ہے؟ دوسرے ملکوں سے غلہ کی بھیک کیوں مانگنی پڑ رہی ہے؟ ایک خرابی ہو تو صبر کر لیا جائے یہاں تو اوپر سے نیچے تک تمام حالات بگڑتے چلے جا رہے ہیں سرمایہ داروں اور تاجروں سے رشوت لیکر تجارت کے راز بتا دیئے جاتے ہیں، ہمارے سکہ کی قیمت دوسرے ملکوں میں بتدریج گرتی چلی جا رہی ہے، پاکستان کی تجارتی ساکھ کو صدمہ پہونچنے کا قوی خطرہ ہے!

صوبہ پرستی کی وبا دفتروں میں آگ کی طرح پھیل رہی ہے جس نے افسروں اور ماتحتوں کے مابین اشتراکِ عمل کی اس اسپرٹ کو متاثر کر دیا ہے جو ضامن ہوتی ہے دفتروں کے ڈسپلن اور نظم و نسق کے بقا اور قیام کی! ایک عہدیدار کی "جانب داری" دوسرے عہدیدار کو اسی طرح کی جانب داری (partiality) پر اکساتی ہے، اس عمل اور ردِ عمل کے جو برے نتائج ہونے چاہئیں وہ سامنے آ رہے ہیں، مشرقی بنگال میں اردو دشمنی کا جو مظاہرہ ہوا ہے وہ صوبہ پرستی کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

مہاجرین کے مسئلہ میں حکومت جس سرد مہری سے کام لے رہی ہے اس کے تصور سے انتہائی تکلیف ہوتی ہے، قیادت

کا یہ دور تھا کہ ہمارے رہنما بلقان، سمرنا اور طرابلس کے مظلوم مسلمانوں کی امداد کے لئے در در چندہ مانگتے پھرتے تھے، یہ اسلامی اخوت کا جوش تھا، کس قدر شدتِ احساس تھی اور آج یہ عالم بھی ان آنکھوں نے دیکھ لیا کہ جن کی قربانیوں کے طفیل میں پاکستان بنا ہے، وہ دانہ دانہ کے لئے محتاج ہیں اور بیچاروں کو سر چھپانے کے لئے جگہ بھی نہیں ملتی، گویا ہندستان سے "انسان" نہیں کیڑے مکوڑے رینگتے ہوئے چلے آئے ہیں اور کیڑوں مکوڑوں کے لئے مکانوں کی کیا ضرورت ہے۔

اخباروں میں اسکیموں اور منصوبہ بندیوں کی تفصیلات البتہ نظر آتی رہتی ہیں کہ یہ ہوگا وہ ہوگا، فلاں کام کے لئے اتنے کروڑ روپیہ محفوظ کر دیا گیا ہے، اُس اسکیم کے لئے ماہرین کی کمیٹی مقرر کر دی گئی ہے، اور اخباروں میں آئے دن فوٹو چھپتے رہتے ہیں کہ قائد اعظم اور قائد ملت کے مزاروں پر باہر کے آئے ہوئے سفیر اور نمائندے پھول چڑھا رہے ہیں اور کوئی سرکاری عہدیدار بھی وہاں ایستادہ ہیں تو حکومت پاکستان نے مقبروں کی مجاورت کی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے اور اس کو بہت بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

پاکستان کا سینہ ان زخموں سے لالہ زار بنا ہی ہوا تھا کہ اب دوسری طرح کے دشنہ و خنجر بھی مصروفِ جراحت کاری ہیں، کوئی اہل قلم جن کو گراں القدر مشاہرہ ملتا ہے کسی "ادارہ" کے کام پر مامور ہیں اور اُن کی ماموری کے بعد ہی سے "ابو رشید وجدانی" اور "ملک محمد افضل" کے ناموں سے اخباروں اور رسالوں میں مضامین دیکھنے میں آ رہے ہیں، ان مضامین کے ذریعہ "اقامتِ دین" کی تحریک اور اُس کے لئے جدوجہد کرنے والوں کے خلاف طرح طرح کی بدگمانیاں پھیلائی جاتی ہیں، "دین و سیاست" کی تفریق ان مضامین کی خصوصیت ہوتی ہے، یعنی یہ کہ علماء کرام نیکی اور پاکبازی کے موضوع پر بس وعظ کہتے رہیں، سیاست میں نہ پڑیں، "اختیار و اقتدار" کی حفاظت اور اُس کی "قیصریت" کو برقرار رکھنے کے لئے یہ عجیب ڈھنگ اختیار کیا گیا ہے —— دوسری طرف سول ملٹری گزٹ اور روزنامہ "ڈان" نے "ملّازم" کی آڑ لیکر اسلامی روایات پر مشق ستم شروع کر دی ہے، اسکیم یہ ہے کہ دستور ساز اسمبلی نے "قرار داد مقاصد" کو منظور کر کے جس غلطی کا ارتکاب کیا ہے اُس کی پوری پوری تلافی کی جائے، ملّاؤں کے "اسلام" سے لوگوں کو نفرت دلا کر، مصطفےٰ کمال اتاترک اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین (مصری) کے "اسلام" کی طرف عوام مسلمانوں کو بلایا جائے اور لوگوں کے دلوں میں یہ بات اُتار دی جائے کہ چودہ سو سال پہلے کا اسلام اب نہیں چل سکتا، یہ تو تہذیب و ترقی کا دور ہے، اب تو "ماڈرن اسلام" چلے گا، "سول" اور "ڈان" کے اس مغرب زدہ "اسلام" کی پُشت پناہی کے لئے مصر کے وہ قوم پرست اخبار موجود ہیں جن کی نگاہ میں "اہرامِ مصر" کعبۃ اللہ سے زیادہ محترم اور مقدس ہیں کہ وہ اُن کے وطن اور قوم کی تاریخی عظمت کی یادگار ہیں اور وہ "نیم زادیاں" بھی "سول" اور "ڈان" کی ہم نوائی کے لئے تیار ہیں، جو مصر کے وزیر تعلیم کے بنگلے کے سامنے احتجاج کرتے ہوئے برہنہ ہو کر ناچی تھیں۔

حکومتِ پاکستان کے بعض سکریٹری صاحبان جن کے ذہن و فکر اور قلب و دماغ میں "مغرب زدگی" رچی ہوئی ہے جن کو نماز روزے سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے، جو دولت رکھنے کے باوجود نہ زکوٰۃ دیتے ہیں اور نہ حج کرتے ہیں، پاکستان میں خالص اسلامی نظام نہیں چاہتے، اُن کا طرزِ عمل خاص طور سے اسلامی نظام کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے، "قرار داد مقاصد" کی

اسپرٹ اور اُس کے تقاضوں سے ان حضرات کا سلوک ہمدردانہ نہیں بلکہ بیگانوں کا سا ہے۔

ایک طرف ابو رشید وجدانی اور ملک محمد افضل جیسے نقاب پوش "صحیفوں" کی قلمی سازش اپنا کام کر رہی ہے دوسری طرف یہ سُننے میں آرہا ہے کہ "نگار" کے ایڈیٹر جناب نیاز فتحپوری پاکستان میں تشریف لا رہے ہیں "گفت و شنید" (؟) ہو رہی ہے، ابو رشید وجدانی اور ملک محمد افضل جس فرنٹ پر مصروفِ کار ہیں اُس کو مزید کمک درکار ہے ——— پہلے یہ افواہ دب گئی تھی مگر اب اس کے چرچے ہیں، خدا کرے یہ خبر غلط ہو، کیں ایڈیٹر "نگار" کو ماننے والے اس بات کو نہیں جانتے کہ کارلائل، گبن، نُسڈل اور ستیارتھ پرکاش کے مُصنّف سے اسلام کو وہ نقصان نہیں پہونچا جو نقصان اس شخص کے قلم سے پہونچا ہے۔

اِنتباہ!

پاکستان کے اربابِ اقتدار اپنے ہیں کوئی غیر نہیں ہیں اور اپنوں پر تنقید کرتے ہوئے دل کو دُکھ ہوتا ہے، یہ ناگوار فرض خدا جانتا ہے کہ ہمیں دل پر جبر کرکے ادا کرنا پڑتا ہے ہم اُس تنقید سے خدا کی ہزار بار پناہ مانگتے ہیں جس کی غرض صرف ہنگامہ آرائی ہو، حکومتوں میں انتشار پھیلانے اور وہاں کے نظم ونسق درہم برہم کرنے کیلئے اربابِ اقتدار کو بدنام کرنا "کمیونسٹوں" کا شیوہ ہے، ہم تو اس ذہنیت کے سب سے بڑے مخالف ہیں، ہم ان عتیاہ و ذمہ داری کے ساتھ اربابِ حکومت کو ٹوکتے ہیں کہ اپنے ایک ایک لفظ کا ہمیں خدا کے یہاں جواب دینا ہے اور حکومت کے قانون واحتساب کی نگاہ سے ہماری کوئی غلطی چھپی رہ سکتی ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی نگاہ سے دل کی کوئی چوری اور فکر ونگاہ کی کوئی غلطی نہیں چھپ سکتی!

ہم نے اوپر جو کچھ کہا ہے اگر اُس میں کوئی ایک بات بھی غلط اور خلافِ واقعہ ہے تو ہمیں اُس سے آگاہ کر دیا جائے، ہماری غلطی ہم پر واضح ہو جائے گی تو اُس کے اعتراف میں ہم جھجک محسوس نہ کریں گے!

جو پاکستان "اسلام" کے نام پر بنا تھا اور جس کو بنے ہوئے بھی ایک دو برس نہیں پُورے پانچ سال ہو چکے مقام شرم و افسوس ہے کہ اُس پاکستان میں ابھی تک غیر اسلامی قوانین چل رہے ہیں، انگریز جس دستور کے تحت حکومت کے نظم ونسق کو چلاتا تھا وہی کافرانہ دستور پاکستان پر مُسلط ہے پس قوم و ملک کے عوام کا یہ مطالبہ بالکل منصفانہ اور سراسر آئینی اور واجبی ہے کہ دستور ساز اسمبلی کو ۱۹۵۲ء کے ختم ہونے تک کتاب وسنت کی بنیاد پر دستور بنا دینا چاہئے اس کام میں اب مزید تاخیر گوارا نہیں کی جا سکتی، اگر اب بھی پہلے کی طرح غفلت اور ٹال مٹول سے کام لیا گیا تو دستور ساز اسمبلی کے ارکان اپنے اعتماد کو بالکل کھو دیں گے، اور جن افراد پر قوم کا اعتماد باقی نہ رہے، وہ ایک سیکنڈ کے لئے بھی اختیار و ذمہ داری کے منصب پر نہیں رہ سکتے، اگر پاک دستوریہ کے ارکان ہوش مندی سے کام لیں اور اپنے فرائض کو پہچانیں تو اس کشمکش کی نوبت نہ آئے کہ غفلت و نااہلی کے سبب قوم اُن کے ہاتھوں سے اس ذمہ داری کو چھین لے۔!

اربابِ اقتدار کی خدمت میں ہم تین گزارشیں کرنا چاہتے ہیں :-

(۱) اسلامی نظامِ حکومت چلانے کے لئے جس سیرت وکردار اور عزیمت کے افراد درکار ہیں، وہ اُس کے مطابق اپنے کو بنا لیں،

اگر وہ اپنے کو بدل دیں تو ہم اُن کی رکابیں تھام کر چلیں گے۔ اور وہ ہمیں اپنا مطیع اور فرمانبردار پائیں گے۔ اس طرح وہ تاریخ میں اپنے نیک نام اور اچھی شہرتیں چھوڑ جائیں گے ـــــ ۔حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی مثال ہمارے سامنے ہے، جنھوں نے شاہانہ انداز پر پنا بچپن اور جوانی بسر کی تھی مگر جب زمامِ حکومت ہاتھ میں آئی تو وہ بالکل بدل گئے اور دنیا نے ایک بار پھر عمر فاروق رض کی خلافت کا سماں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ۔ ۔ ۔ پاکستان میں "ہز اکسلنسی" اور "آنریبل" قسم کے ارباب کار نہیں عمر ابن عبدالعزیز جیسی سیرتوں کے "اولی الامر" درکار ہیں۔

(۲) اگر ہمارے اربابِ اقتدار اپنے کو بدلنا نہیں چاہتے یا بدلنے کی قدرت ہی نہیں رکھتے تو پھر انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وہ رضی رضا کے ساتھ اپنے سے بہتر اور صالح افراد کے لئے جگہ خالی کر دیں!

(۳) اگر یہ دونوں باتیں بھی منظور نہ ہوں تو پھر ہم اُن کو آگاہ کئے دیتے ہیں کہ اُن کی کرسیاں زیادہ دن تک برقرار نہ رہ سکیں گی، اُن کو ہٹ جانا پڑے گا، قوم کے مطالبہ کو کوئی قوت ٹھکرا نہیں سکتی، "اقتدار" اور "عوام" کے درمیان جب بھی کشمکش[۵] کی نوبت آئی ہے تو جیت "عوام" ہی کی ہوئی ہے! اور یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے کہ پاکستان کے عوام حق و راستی پر ہیں اور وہ اُس نظامِ حکومت کے حامی ہیں، جس کی خوبی و صداقت پر اللہ کی خوشنودی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی پسندیدگی کی مُہریں ثبت ہیں۔

ہمیں اپنی ذات سے کوئی دشمنی نہیں ہے، اپنی عافیت، راحت اور آرام و آسائش دوسروں کی طرح ہمیں بھی عزیز ہے، ہم اس بات کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ "حق گوئی" ہمارے لئے بڑی سے بڑی مصیبت اور پریشانی کا سبب بن سکتی ہے مگر ہم کیا کریں ہمارے ایمان کا، اسلام کا، پاکستان کی سلامتی اور عوام کے فلاح و بہبود کا یہی تقاضا ہے کہ خرابیاں دیکھ کر خاموش نہ رہیں چاہے کلمۂ حق کے لئے سخت سے سخت آزمائش ہی سے کیوں نہ گزرنا پڑے! ہم اپنی دنیا بنانے کے لئے اپنی آخرت نہیں بگاڑ سکتے،

ہم دُعا کرتے ہیں اور ناظرین سے اس دُعا پر "آمین" کی توقع رکھتے ہیں کہ اگر آزمائش کا موقع آئے تو ہمیں مالکؒ و حنبلؒ (رحمہما اللہ تعالیٰ) جیسی استقامت نصیب ہو!

ماہر القادری
۲۲ اگست ۱۹۵۲ء

---

[۵] اور ہم جب کبھی "انقلاب" اور "کشمکش" جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو اُس کا ان کمیونسٹوں کی توڑ پھوڑ کی اسکیموں پر ہرگز قیاس نہ کرنا چاہیئے، پاکستان میں پورے ضبط و نظم کے ساتھ آئینی انقلاب کے لئے جدوجہد ہی مفید اور کامیاب ہو سکتی ہے۔

(م - ق)

سید حسام الدین راشدی

ابو علی ابن سینا کی تصانیف

(یہ مقالہ تھیوسوفیکل ہال کراچی میں خود مضمون نگار نے پڑھ کر سنایا)

مسلمانوں میں جتنے نامور علماء اور ماہرین فن گزرے ہیں ان میں ابو علی ابن سینا کا نام سر فہرست نظر آتا ہے۔ اس جامعیت کے چند ہی مشاہیر مسلمانوں میں پیدا ہوئے ہیں۔

ابن سینا ۳۷۰ھ میں پیدا ہوا تھا جس کو آج پورے ایک ہزار سال ہوتے ہیں، اسی بنا پر اسلامی ممالک میں اس کا جشن ہزار سالہ منایا گیا، اور اس تقریب میں مشرق اور مغرب کے مشاہیر اہل علم نے حصہ لیا اور ابن سینا کی زندگی اور اس کے کارناموں پر مقالات پیش کئے اس سلسلہ میں آج یہ جلسہ بھی اس نامور فاضل کی یادگار منانے کے لئے منعقد کیا گیا ہے۔

مجھ جیسے کم علم کج بیان اور ہیچمدان سے بھی اس موضوع پر ایک مقالہ پڑھنے کی فرمایش کی گئی، اور آج سے صرف تین روز پیشتر میرے عزیز دوست ڈاکٹر عباس ہمدانی نے مجھ اس ادا اور انداز سے کہا کہ میں باوجود بے حد مصروفیت کے انکار نہ کر سکا، یہ میرے لئے فخر و مسرت کا سبب ہے کہ میں بھی ابو علی سینا جیسے فاضل اجل پر لکھنے والوں کے اس بین الاقوامی سلسلہ میں شریک ہو رہا ہوں لیکن حضرات آپ بخوبی اندازہ فرما سکتے ہیں کہ اس مختصر وقفہ میں ابو علی سینا پر مفصل اور کسی پایہ کا بھی مضمون لکھنا کم از کم میرے بس کی بات نہیں، تاہم ایک بہت ہی مختصر سا مضمون اس باکمال شخصیت کے تصانیف پر آپ حضرات کے سامنے پیش کرنے کی جرات اور جسارت کر رہا ہوں، اگر آپ جیسے اہل نظر اور اہل قلم بزرگوں کے معیار پر پورا نہ اترے تو میرے بزرگو! میری علمی کم مایگی اور وقت کی کوتاہی اس کی ذمہ دار ہے، اُمید ہے کہ آپ اپنی کشادہ قلبی اور وسیع النظری کے طفیل مجھے معاف فرمائیں گے۔

ابو علی ابن سینا کے نام سے مجھے بہت ہی کم عمری میں واقفیت ہو گئی تھی، میرے دادا مرحوم اور والد مرحوم دونوں اپنے زمانے کے جید طبیب تھے۔ انھیں کی زبانی سب سے پہلے شیخ الرئیس ابو علی سینا کا میں نے نام سُنا، جب کبھی کوئی طبی مسئلہ ان بزرگوں کے درمیان آجاتا تھا تو میرے بڑے بھائی علی محمد راشدی سے کہا جاتا تھا کہ اندر سے فلاں فلاں کتابیں لے آؤ، حضرات آپ جانتے ہیں، سگ باش برادر خورد مباش وہ بڑے میں چھوٹا، وہ ۸ عدد ضخیم کتابیں مجھ پر لاد دیتے جنھیں میں زنانہ سے مردانہ میں لے آتا تھا، اور جب ان بزرگوں کے قریب آتا تو وہ پانچ کتابیں خود لے لیتے اور ایک میرے سر پر رہنے دیتے، گویا یہ ظاہر نہ ہونے پائے کہ یہ بوجھ وہ میرے اوپر لاد کر لے آئے ہیں، بہرحال جب یہ کتابیں آجاتیں تو پھر شیخ الرئیس ابو علی سینا کے تذکرے شروع ہو جاتے، اس وقت یہی خیال گزرتا تھا کہ یہ بھی حکیم اجمل خاں کے خاندان کا کوئی بہت بڑا حکیم ہے، اور حضرات یہ ۸ عدد کتابوں کا پشتارا جو مجھ پر لاد کر لایا جاتا تھا، اکسیر اعظم کی چار جلدوں اور قانون کی دو جلدوں پر مشتمل تھا جن بزرگوں نے

ان کتابوں کی ضخامت دیکھی ہو گی وہی میری مشقت کا بخوبی اندازہ فرما سکتے ہیں،

یہ دور بھی گزر گیا، جب میں کچھ پڑھنے لکھنے لگا تو ایک کتاب "مجربات بوعلی سینا" کے نام سے اُردو زبان میں نظر سے گزری جس میں نِیاد، ضعف اور جنسی امراض کے نسخے، کچھ عملیات اور تسخیر حُب کے چٹکلے لکھے ہوئے میں نے پائے، اس کتاب کے دیکھنے کے بعد کچھ اچھی رائے مصنف کے بارے میں قایم نہیں ہوئی، اور خیال یہ ہوا کہ یہ بھی کوئی "مراد آباد میں مردہ زندہ ہو گیا" یا "اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہو گا" قسم کا کوئی بازاری اور شعبدہ باز حکیم ہو گا،

زمانہ گزرتا چلا گیا، حضرات یہ بچپنے اور کم عمری کے خیالات تھے، جب ذرا مطالعہ وسیع ہوا، اور تاریخ سیر، اور تذکرہ کی کتابیں نظر کے سامنے آئیں، اور شیخ کی سوانح پڑھی تو خیالات کی دنیا ہی یکسر بدل گئی، معلوم ہوا کہ یہ تو اسلامی دنیا کا سب سے بڑا فلسفی، جید عالم، اور سائنسداں تھا، رفتہ رفتہ کم عمری کے وہ خیالات مٹ گئے، بلکہ سچ پوچھئے تو اُس کے علم و فضل کی دل پر ایک دھاک بیٹھ گئی،

حضرات ابن سینا کے حالات اس کی علمی تصانیف، تحقیقات اور فنی کمالات پر مشرق اور مغرب میں اس کثرت سے لکھا گیا ہے کہ اس کی زندگی کے کسی ایک پہلو پر پورا مقالہ لکھنے کے لئے کافی محنت اور وقت درکار ہے، اس لئے اس مختصر وقت میں میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس کی علمی تصانیف کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کروں تاکہ مختلف علوم و فنون میں اس کی مہارت اور دستگاہ کا اندازہ ہو سکے، اور اس کے علمی و فنی کمالات کی ایک جھلک نظر آجائے،

ابو علی حسین بن عبداللہ، ابن سینا، شیخ الرئیس معلم ثانی کے علم و فضل کی وسعت ان موضوعات سے ظاہر ہے جس پر اس نے قلم اُٹھایا ہے کوئی علم و فن ایسا نہیں ہے جس میں اس نے دسترس حاصل نہ کی ہو، چنانچہ الٰہیات، مابعد الطبیعات، نفسیات، منطق، فلسفہ، طب، کیمیا، طبیعیات، ریاضیات، فلکیات، لغت، شعر، وغیرہ پر اس کی بے شمار تصانیف موجود ہیں جن کے مخطوطات یورپ اور ایشیا کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں، اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کی تمام تصانیف فلسفہ اور حکمت کے دائرے میں محدود ہیں، اور ان علوم و فنون پر مشتمل ہیں جو فلسفۂ نظری کی مشہور اقسام کے تحت آجاتی ہیں، خود شیخ نے اپنے رسالہ "تقسیم العلوم" میں اس طرح علوم کی تقسیم کی وضاحت فرمائی ہے:-

(۱) فلسفۂ عامہ :-

حکمت ، لغت ، شعر

(۲) فلسفۂ نظری :-

(ا) علوم طبعیہ ، طبیعیات ، علم النفس ، طب ، کیمیا ،

(ب) علوم ریاضیہ ، موسیقی ، فلکیات ،

(ج) الٰہیات ، مابعد الطبیعیات ، تفسیر ، تصوف ،

(۳) فلسفۂ عملیہ :-

اخلاق ، تدبیر منزل ، سیاست ، نبوت ،

(۴) متفرقات :-

مختلف مباحث،

بروکلمان نے اپنی کتاب گشتشتے میں شیخ کی تصانیف کو صرف پانچ فنون میں محدود کر دیا ہے، لیکن اس کے لئے ایسا کرنا ناگزیر تھا، کیوں کہ وہ دنیا بھر کی عربی کتابوں کی فہرست دے رہا تھا اس لئے اس تقسیم کی وضاحت اس کے لئے ناممکن تھی،

یورپ میں سولھویں صدی سے لیکر اب تک ابن سینا پر کافی لٹریچر جمع ہو گیا ہے، اور صرف اس کے حالات، تصانیف، اور علمی تحصیلات اور فنی کمالات، آراء اور نظریات پر تقریباً ۲۱۰ کتبیں یورپ کی مختلف زبانوں، لاطینی، جرمنی، فرینچ، اطالوی اور انگریزی وغیرہ میں لکھی گئی ہیں، طب میں اس کی مشہور کتاب "القانون" کا لاطینی ترجمہ جیرارڈ کریمونی نے ۱۱۸۷ء میں شائع کیا، اصل کتاب کا متن، روما سے ۱۵۹۳ء میں چھپا، یورپین مورخین سائنس کا بیان ہے کہ تقریباً چار صدیوں تک سالرنو (Salamo) اور پیڈوا (Padma) کی یونی ورسٹیوں میں طب میں ابن سینا کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، اسلامی ممالک خصوصاً مصر، شام، اور استنبول میں اس کی مشہور اور امہات تصانیف میں سے شفا، نجات، اشارات اور قانون مدتوں ہوئے کہ چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، اور اہل مشرق و مغرب نے ان سے کافی استفادہ کیا ہے، ان بڑی کتابوں کے علاوہ اس کے بے شمار چھوٹے چھوٹے رسائل کے کئی مجموعے مصر اور ہندوستان میں شائع ہو چکے ہیں، یہ مجموعے ۵۰ سے زائد رسائل پر مشتمل ہیں، قانون جیسی ضخیم کتاب کئی بار ہندوستان میں چھپ چکی ہے، نیز اس کا اردو ترجمہ بھی برسوں تک بازاروں میں بکتا رہا ہے، ابن سینا کے حالات اور اس کی تصانیف کے عربی مآخذ میں قدیم و جدید کتابیں ملا کر ۳۰ کے قریب ہیں، اس کی تصانیف کے خلاصے اور ان پر شرحیں اور حواشی لکھے گئے ہیں ان کی تعداد ان گنت ہے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مسلمان مشاہیر میں شاید ہی کسی صاحب علم و فضل کو ابن سینا جیسا قبول عام حاصل ہوا ہو، اور اس کے متعلق اس قدر وسیع لٹریچر دنیا کی مختلف زبانوں میں موجود ہو،

قفطی نے شیخ کی تصانیف کی تعداد ۴۵ بتائی ہے جس میں ۲۱ بڑی کتابیں اور ۲۴ چھوٹے رسائل ہیں، بروکلمان نے اپنی فہرست کتب میں ان کی تعداد ۹۹ دی ہے جن کی فن وار تقسیم یوں کی ہے،

(۱) الٰہیات اور مابعد الطبیعیات پر ۶۸ کتابیں۔

(۲) فلکیات اور فلسفۂ عامہ میں ۱۱ کتابیں۔

(۳) طب میں ۱۶

(۴) اور شعر میں ۴

لیکن جدید تحقیقات کی رو سے نہ قفطی کا ۴۵ عدد صحیح ہے اور نہ بروکلمان کی ۹۹ کی تعداد مکمل ہے، بلکہ شیخ کی تصانیف جو اب تک دنیا کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں، ان کی تعداد ۲۷۶ ہے،

یہاں میں علم وفن کے اعتبار سے اس کی تصانیف کی تعداد پیش کرتا ہوں، جس سے اندازہ ہوگا کہ ہر موضوع پر ابن سینا نے کتنی کتابیں لکھیں ہیں، :—

(۱) حکمت ۲۴ کتابیں
(۲) منطق ۲۱ کتابیں
(۳) لغت ۳ کتابیں
(۴) طبیعیات ۲۵ کتابیں
(۵) شعر اس کے عربی فارسی اشعار کے مجموعے استنبول کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں،
(۶) علم النفس ۳۴ کتابیں
(۷) علم الطب ۴۴ کتابیں
(۸) کیمیا ۹ کتابیں
(۹) ریاضیات ۱۴ کتابیں
(۱۰) مابعد الطبیعیات ۳۱ کتابیں
(۱۱) تفسیر القرآن ۹ کتابیں
(۱۲) تصوف ۳۱ کتابیں
(۱۳) اخلاق، تدبیر منزل، سیاست، نبوۃ ۱۱ کتابیں
(۱۴) رسائل شخصیہ ۴ کتابیں
(۱۵) متفرقات ۷ کتابیں

کوئی شخص اگر یہ خیال کرے کہ شیخ کو بڑی فراغت حاصل تھی اور تمام ضروری آرام و آسائش کا سامان اس کے لئے مہیا تھا اور اسے سوائے کتابیں لکھنے کے اور کوئی کام نہیں تھا، تو یہ غلط ہے، واقعہ یہ ہے کہ شیخ کو زندگی بھر ایک جگہ بیٹھنا نصیب نہیں ہوا، بیشتر اوقات میں بے سر و سامانی کی حالت میں، ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگنا پڑا، بعض اوقات، بیدون رئیسوں اور درباریوں سے اپنی جان بچانے کے لئے ادھر اُدھر چھپنا پڑا، مگر ان مضطرب حالات میں بھی وہ تصنیف و تالیف کے کام سے غافل نہیں رہا، چنانچہ ابتدا میں اس نے ۵ سال سے ۲۲ سال کی عمر تک بخارا میں قیام کیا، اس مدت میں اس نے "حکمۃ العروضیہ" "الحاصل والمحصول" اور "البر والاثم" تین کتابیں لکھیں پھر جب بخارا سے خوارزم گرگانج، نسا، اور ابی ورد اور وہاں سے طوس، سمنکان اور جاجرم ہوتے ہوئے جرجان پہونچا، تو اقامت جرجان کے زمانے میں اس نے منطق میں "المختصر الاوسط" لکھی، اور کتاب "المبدأ والمعاد" "کتاب الارصاد الکلیہ" تصنیف کیں اسی زمانے میں اس نے کئی اور کتابیں بھی

لکھیں، جب میں کتاب "القانون" کا ابتدائی حصہ "مجسطی" کا اختصار، اور کئی چھوٹی کتابیں اور رسائل ہیں، رے میں مدت
اختیار کی تو کتاب "المعاد" لکھی، ہمدان کے قیام میں جبکہ وہ امیر شمس الدولہ کا وزیر ہوگیا تھا، اس نے "طبیعیات الشفا" کے نام
سے کتاب "القانون" کا پہلا حصہ تصنیف کیا، اور "الٰہیات الشفاء" اور "منطق الشفاء" کا ایک جزو لکھی، پھر جب قلعہ فردجان
میں چار مہینہ تک قید رہا تو اس اثنا میں "کتاب الھدایہ" "حی بن یقظان" اور "القولنج" کے نام کی کتابیں لکھ
ڈالیں، اصفہان میں امیر علاء الدولہ کے پاس رہا تو اس زمانہ میں اس نے "الکتاب العلائی" اور "القانون" کے علاوہ
"کتاب الشفاء" "المجسطی" "الارثماطیقی" اور "الموسیقی" پر تقسیم کی، آخر عمر میں اس نے "الانصاف" لکھی
اور ہمدان میں ۴۲۸ھ ہجری میں وفات پائی،

ظاہر ہے کہ اس طرح سفر میں، نہایت بے اطمینانی اور بعض دفعہ بے سروسامانی کی حالت میں اس قسم کی خالص علمی تصانیف
کا لکھنا کس قدر دشوار بلکہ محال ہے، اس سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ شیخ کا دماغ تمام علوم وفنون کا مخزن تھا، اور وہ ہر وقت
ہر حالت میں علمی وفنی مسائل پر غور وخوض میں مصروف رہتا تھا، اور جہاں بھی ذرا سا موقعہ ملا، وہ ان مسائل کو قلمبند کرتا تھا،

یہ شیخ کی خوش قسمتی تھی کہ اسے ابوعبید عبدالواحد بن محمد الجوزجانی جیسا ذہین شاگرد اور رفیق مل گیا، جس نے نہ صرف
اس کی خودنوشت سوانح عمری کی تکمیل کی بلکہ اس کی اکثر کتابیں اور رسائل مرتب کئے، ایرانی فاضل محمد بن عبدالوہاب قزوینی کی تحقیق کے
مطابق شیخ سے اس کی ملاقات ۱۰۱۲ء عیسوی میں ہوئی، جبکہ شیخ کی عمر صرف ۳۲ برس کی تھی، یہ اسی شاگرد کا طفیل ہے کہ آج ہم ابن سینا
کے حالات اور تصانیف سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں، ورنہ شیخ کی لاابالی اور بے پروا طبیعت کی وجہ سے ہم اس کے تصانیف کی اتنی
بڑی نعمت اور علمی دولت سے محروم ہو جاتے، اسی ایک فاضل کی قلمی محنت اور کوشش کی بدولت، شیخ کی تصانیف تلف ہونے سے
بچ گئیں، کیونکہ اس کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابوں کے نسخے لوگوں کو دے دیا کرتا تھا جس کی کوئی نقل اس کے پاس نہیں
رہتی تھی، اس نے نہ صرف اپنی ملاقات کے زمانے سے لے کر شیخ کی وفات تک زندگی کے حالات قلمبند کئے بلکہ اس کی اہم ترین فارسی کتاب
"دانش نامہ علائی" کو مکمل کر دیا، اور اس کی تمام چھوٹی بڑی تصانیف کو جمع کیا جو اس نے اپنی زندگی میں بے پروائی سے ادھر ادھر منتشر
کر دی تھیں، اور لوگوں کو دے ڈالی تھیں؛

جب شیخ ہمدان کے فرمانروا، علاء الدولہ کے دربار میں وزارت عظمیٰ کے جلیل القدر عہدے پر پہونچا، تو اس نے امور سلطنت اور
سیاسیات میں پڑنے کے باوجود اپنی علمی تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھا، ان دنوں میں وہ ہمیشہ صبح ہونے سے پیشتر اٹھ کر "کتاب الشفا"
کے دو صفحے روزانہ لکھ لیا کرتا تھا، علی الصباح اس کے شاگرد اور احباب اس کے پاس آجاتے تھے، صبح کی نماز تک وہ ان کو درس دیا کرتا تھا،
پھر نماز کے بعد امور سلطنت کی طرف توجہ دیتا، جب وہ رئیس کے دربار یا ایوان حکومت کی طرف چلتا تو دادخواہوں اور ملاقاتیوں کا ایک
جم غفیر اس کے ساتھ ہوتا تھا، کبھی کبھی اس کی تعداد دو ہزار تک بھی پہونچ جاتی تھی، وہاں پہونچ کر وہ لوگوں کے مقدمات فیصل کرتا،
غیر ملکی سفیروں سے ملاقات کرتا، اور دادخواہوں کا انصاف کرتا تھا، دوپہر کا کھانا بھی وہ اپنے دفتر میں ہی کھا لیتا تھا، اور وہیں قیلولہ

بھی کرتا تھا، پھر بیدار ہو کر رئیس کے پاس جاتا، مغرب کے وقت اپنے گھر واپس آتا اور پچھلی رات تک عیش و تفریح میں مصروف رہتا،

اسی کثرتِ کار اور شب بیداریوں نے اس کی صحت کو بگاڑ دیا، اور سخت ترین قولنج کے درد میں مبتلا ہو گیا آخر میں قولنج نے سرطانِ معدہ کی صورت اختیار کر لی، اور ۵۸ برس کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا، ان حالات اور اس پروگرام کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ ۱۶-۱۷ برس کی عمر سے لیکر ۵۸ برس کی عمر تک یعنی صرف ۴۲ برس میں اس نے کثرتِ اشغال، درباری مصروفیتوں، اور متواتر سفر میں رہنے کے باوجود، اس کثرت سے اور علوم کے اتنے کثیر اور دقیق شعبوں پر کس طرح کتابیں تصنیف کر ڈالیں، اگر اس نے لمبی زندگی پائی ہوتی، تو نہ جانے علوم اور فنون کی اور کتنی بڑی دولت سے ہمارے دامنوں کو مالا مال کر جاتا،

حضرات! ابن سینا خود اپنی ذات سے ایک "انجمن" تھا، علم و ادب کی انجمن اور فضل و کمال کی محفل! اُس کی فلسفیانہ اور سائنسی تحقیقات نے تجربہ اور تحقیق کی دُنیا میں ایک نیا باب کھول دیا، یورپ نے اُس کے خرمن سے بہت کچھ خوشہ چینی کی ہے!

ابن سینا نے علم و حکمت اور فضل و معارف کے جو خزانے چھوڑے ہیں وہ اس کی علم دوستی، وسعتِ مطالعہ، عمیق تفکر، اور بلند خیالی کے شاہد ہیں، علم و فن کے مستقبل کا کوئی دور اُس کی تصانیف کے استفادہ سے بے نیاز نہیں رہ سکتا!

سلہ اسی لئے تو اقبالؒ نے کہاہے :-

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم
دستِ رومیؒ پردۂ محمل گرفت

اس شعر میں حکیم الامت اور شاعرِ مشرق نے ابن سینا اور مولانا رومؒ کے معتقدات اور نظریوں کے علاوہ اُن دونوں کے کردار کے فرق کو واضح کیا ہے　(مُدیر)

ابوالخطیب

اسلامی افسانہ

اور

اس کا سماجی پس منظر

دوسری عالم گیر جنگ کے ابتدا میں "مہذب اقوام" اپنے رائج الوقت سماجی نظام سے نہ صرف یہ کہ دل برداشتہ ہوئیں بلکہ یہ احساس بھی ان میں شدت اختیار کرتا رہا کہ ہمارا موجودہ نظام زندگی غیر فطری اور مضرت رساں ہی نہیں بلکہ یہ مستقل انسان کشی کی طرف بھی لے جا رہا ہے ہر صدی کے آغاز یا وسط میں ایک ہیبت ناک جنگ! بھلا یہ کوئی زندگی ہے!

ان "مہذب اقوام" کے دانش وروں کو بھی ان حالات کے ساتھ ساتھ یہ بھی نظر آیا کہ یہ سائنسی عہد جس میں ہم جی رہے ہیں شک و ریب کا عہد ہے، سیاسیات، اقتصادیات، عمرانیات (اور اس سے پیدا شدہ تمام اخلاقی نظریے) تہذیب و تمدن الغرض وہ تمام سماجی علوم و فنون اس عہد کے مسائل کے سلجھانے میں قطعی ناکام رہے ہیں اور انسان آج اپنی زندگی کو ڈانواڈول حالت میں پا رہا ہے۔

مذہب سے کنارہ کشی کے بعد فلسفہ نے بھی آج کے انسان کو کوئی راہ نہیں دکھائی، سوسائٹی کے سوچنے سمجھنے والے افراد اس فلسفہ کو چند بے جان اور مریض لکیروں سے زیادہ کچھ نہیں پاتے۔

پائیدار سماجی عدل کا قیام جو زمانے کی اخلاقی اور سیاسی ضرورت تھی دوسری عالم گیر جنگ کے بعد بھی پس پشت ڈال کر ایک تیسری جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں ——— اور آج جب کہ تیسری خونیں معرکہ آرائی کا آغاز ہونے والا ہے۔ انسان پیچ و پیچ میں پڑ گیا ہے کہ وہ کدھر جائے، کیا کرے ——— لیکن یہ مطالبہ ہماری دنیا کی ایک بڑی اکثریت کے اس رجحان میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے کہ کیوں نہ پھر سارے اجتماعی اداروں کی باگ ڈور مذہب کے سپرد کر دی جائے تاکہ اس آنے والی عالم گیر ہلاکت سے اس دنیا کو بچایا جا سکے اپنے لئے اپنی آئندہ نسلوں کے لئے!

یہ رجحان دنیا میں مختلف حیثیتوں سے ابھر رہا ہے۔ لیکن مسلم ممالک میں اس رجحان نے ایک ہمہ گیر سماجی تحریک کی صورت اختیار کر لی ہے۔[1]

---

[1] اس کی واضح مثال عرب ممالک میں "اخوان المسلمون" پاکستان میں "جماعت اسلامی" اور جزائر انڈونیشیا میں "مسجومی" پارٹی ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ مغرب پرست طبقہ یا کمیونسٹ حضرات اس اُبھرتی ہوئی عوامی اسلامی تحریک کو رجعت پسندانہ ملائیت سے تعبیر کر کے کسی مغربی طرز کے انقلاب کے لئے زمین ہموار کرتے رہیں لیکن اس حقیقت سے وہ انکار نہیں کر سکتے کہ احیائے دین کی اس آواز پر ہماری دنیا کی اچھی خاصی آبادی ـ یک بہ یک ہو کر میدان میں نکل آئی ہے مشرقِ وسطیٰ، جزائر انڈونیشیا، پاکستان ــــــ سب کے سب اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں دیکھئے مشرق سے اب سورج پھر کب نکلتا ہے!

تحریکِ اسلامی کی ہمہ گیری

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا یہ تحریک صرف چند اصلاحات (Reforms) کو لیکر عالم وجود میں نہیں آئی بلکہ اس کا مقصد ابتداہی سے پورے سماجی اداروں پر غلبہ حاصل کرنا ہے تاکہ اس اتحاد اور یک رنگی سے سماج منظم ہو کر کسی اعلیٰ شعوری مقصد کی طرف بڑھ سکے اور دنیا پھر ایک بار اسلام کے سماجی اثرات کو دیکھ سکے کہ اس نے کس قسم کے انسان پیدا کئے۔

اس نظریاتی یک رنگی کی ضرورت تمام اجتماعی علوم وفنون اور سماج کے سارے اداروں میں یوں بھی محسوس کی جاتی ہے کہ یہ سب ایک "کل" کے عناصرِ ترکیبی ہیں ان سب کی روح اور مزاج وہ ہو جو کل کا ہے تاکہ معاشرتی زندگی میں کسی قسم کا انتشار نہ پھیل سکے۔

پاکستان میں تحریکِ ادبِ اسلامی

ہماری نوزائیدہ مملکت میں ادبِ اسلامی کی تحریک اسی کوشش کی ایک کڑی ہے ہمارے ملک میں جہاں جہاں سیاست، معیشت، تہذیب وتمدن علوم وفنون کو مسلمان بنانے اور ([illegible]) کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں وہاں ادب میں بھی ان رجحانات کو پرورش کیا جارہا ہے۔

پاکستان میں اس ادبی تحریک سے متعدد ماہنامے متاثر ہیں اور جب کبھی حکومتِ وقت کا عتاب یا کسی معاشی مجبوری کا دباؤ بڑھ جاتا ہے تو ملک کے چھوٹے موٹے دوکاندار، طالب علم، مزدور ــــــ دور دیہاتوں میں رہنے والے کسان اور دفتری کلرک پے تھوڑے تھوڑے پیسوں سے انہیں پھر حیات بخشدیتے ہیں اور یہ عوامی ادب انہیں کی گود میں پرورش پارہا ہے یہ تمام جریدے ملک کے کسی خاص طبقے سے متعلق نہیں بلکہ ہر ماہ ہزاروں کی تعداد میں ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک لوگوں کو منتظر رکھتے ہیں ایسے پس ماندہ ملک میں جہاں تعلیم کا معیار چار یا پانچ فی صدی سے زائد نہ ہو۔

یہ نوخیز ادبی تحریک ابھی اپنے ابتدائی دور سے گزر رہی ہے خدا کے فضل سے اس میں حُسنِ بیان سے زیادہ جذب حقیقت کی فراوانی ہے لب ولہجے میں رزمیت ہے اس لئے تشبیہ اور استعاروں پر وہی کیفیت طاری ہے مختصر یہ کہ آرٹ کا احساس اس درجہ کمال کو نہیں پہونچا کہ حُسنِ مسرت کو چھو سکے اور پھر اردو افسانے سے اس تحریک کو کیا ملا؟ اس لئے کہ ہماری اردو افسانہ نگاری تو اب تک چند "نظریوں" کی بازگشت ہے جو "بھوک" اور "لذتیت" کے اردگرد گھومتی ہے۔

سماجی اور سیاسی پس منظر

لیکن یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ اس میں صنفی اوصاف اور تنوع کیوں نہیں

اس کے کیا اسباب ہیں ؟،

جیسے میں نے ابھی عرض کیا کہ اُردو کا جدید افسانہ (بیشتر) مواد اور ہیئت کے اعتبار سے کسی اخلاقی اور اصولی تحریک کے لئے مفید نہیں کہ اُس کا اثر قبول کیا جا سکے۔

اگر ادب کو زندگی کا ترجمان قرار دیا جائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے گروہ، جماعت یا قوم کے اجتماعی کردار، اس کے خصائل، رجحانات اور آداب معاشرت کا لحاظ رکھے کیونکہ اجتماعی زندگی انھی عناصر سے عبارت ہے، لیکن اس اصول کے پیش نظر جب ہم اپنی ادبیات کے شعری اور افسانوی سرمایہ پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ بیشتر اپنے اجتماعی خصائل اور مسائل سے خالی نظر آتا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد سماجی اور سیاسی تحریکوں کے اثرات جس قسم کا شعری اور افسانوی ادب پروان چڑھا وہ ایسے جوشیلے انقلابی ادھ پکے مغرب پرست فن کاروں اور جنسی لنارکسٹوں کی آماجگاہ بنا رہا جو سوچنے اور سمجھنے سے زیادہ بولنا، کہنا اور لکھنا چاہتے ہیں اس لئے ایک موہوم منزل تک پہونچنے کے لئے ان اقدار کو ڈھانا شروع کیا جو مسلم قوم کے تصور حیات میں بنیادی حیثیت رکھتی تھیں، بے انصافی، اقتصادی بدحالی، اور سرمایہ دارانہ بربریت پر لکھنے بیٹھے تو دین کی اس مشترک قدروں کو بھی اکھاڑ پھینکا جو اپنی جگہ خود روشنی کا مینار تھیں۔

اخلاق، حیا، ضبط نفس ان کے یہاں اضافی قدریں ٹھہریں جیسے زمانہ ادلتا بدلتا رہتا ہے، شاعری میں خدا کی ارتھی نکال کر بیچ چوراہے پر پھونک دی۔

لیکن قوم نے اس ذہنی ہم آہنگی سے کیا اثر لیا اس کا اندازہ قیام پاکستان کے بعد ان کتابوں اور رسائل کی اشاعت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے، آج ہمارے ملک میں اس تحریک سے متعلق کوئی ایسا پرچہ نہیں ہے جسے مقبولیت عام حاصل ہو، اور ہر وہ شخص جو مسلم قوم کے احساسات اور رجحانات سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ اس قماش کی تحریکوں کے ساتھ مسلمان کیا سلوک کرے گا اس ادب کے ذریعہ جس آواز کو اُٹھایا گیا وہ ہماری اپنی آواز نہیں تھی وہ اُن لوگوں کی آواز تھی، جو نہ تو اسلامی تعلیمات سے واقف تھے اور نہ جن کے دل میں ملت اور اسلام کا درد تھا۔

۱۹۴۷ء کا بحرانی دور بھلا کہیں بھلایا جا سکتا ہے، مسلم قوم جب لُٹ پٹ کر خطۂ پاک میں آئی تو اُس کی زندگی اطمینان سے پوری طرح آشنا ہی نہیں ہو پائی، یہاں بھی خدشات تھے، خطرے تھے اور طرح طرح کی مصیبتیں اور کلفتیں تھیں! یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ یہ ملک "اسلامی روایات کی پرورش کی خاطر حاصل کیا گیا اور قوم کے پاس یہی جذبۂ دینی بچ رہا جس پر فرنگیت کا کچھ زور نہ چل سکا خدا کا شکر ہے کہ ساری پامالیوں اور حرماں نصیبیوں کے باوجود یہ "جذبہ" اپنے بہتر اور شاندار مستقبل کا یقین لائے ہوئے ہے! اور ضمیر کہتا ہے کہ

زمانہ اور بھی بدلے گا ایک بار ابھی[1]

---

[1] ن،م، راشد کی ایک نظم میں یہ تصور ملتا ہے،

لیکن ان صفات کے باوجود اس جذباتی قوم کے قول و فعل میں بڑا تضاد ہے، جو انہیں اپنے شاہوں اور ان کے ہوا خواہوں سے ورثہ میں ملا ہے
حصول مملکت کے بعد بھی قوم مادی مشکلات میں گرفتار ہے غیر اسلامی نظریات تو قبول کرنا نہیں چاہتی مگر اپنے نظریۂ حیات کے لئے
تنگی محسوس کرتی ہے، اس قوم کا ایک مختصر مخصوص طبقہ (جو مغرب پرست ہے) اپنی بقا کے لئے اس ملک میں (Colonial
Capatalism) کو بیرونی سرمایہ کی مدد سے جاری اور ساری رکھنا چاہتا ہے جو طبقہ حکمران ہے وہ اپنے دائمی اقتدار
کے لئے ہر طرح کے جتن کر رہا ہے۔[1]

یہ ظلم و زیادتی نہیں ختم ہوتی بلکہ یہ بچے کھچے بڑے بڑے جاگیردار اسلام کے نام پر اپنے "استحصال بالمکر" کا پٹہ لکھوانا چاہتے
ہیں اور یہاں کی کثیر زراعت پیشہ آبادی کو اپنی موروثی ملکیت سمجھتے ہیں اور دوسری طرف یہ داغ دھبوں کی طرح پھیلے ہوئے
رجواڑے ابھی تک ظِل اللہ بنے ہوئے ہیں اور اس بے اطمینانی میں مزید اضافہ یہ کر ان مریض مغربی اثرات کو یہاں پھیلایا جا رہا ہے جو خود یورپ کے
زوال کے اسباب میں سے ہیں اس ذیل میں اور کیا کیا پیش کیا جائے بیماری، بیکاری، جہالت، نیشنل ازم کا پروپیگنڈہ لیکن ان ساری
مشکلات کے باوجود مسلمان کا سخت جاں جذبۂ دینی ان سارے طوفانوں کا مقابلہ کر رہا ہے، اور ابھی تک اسلام کے اقتدار کو اپنی نجات
کا واحد ذریعہ تصور کرتا ہے۔

سوچئے اس سماجی کشمکش میں ایک سچا عوامی اخلاقی ادب کیا کچھ پیش کر سکتا ہے۔ اگر ادب کو زندگی کی تفسیر تسلیم کیا جائے تو اس
صورت حال سے اتفاق کئے بغیر وہ فریضہ کیسے ادا ہو سکتا ہے۔ اگر ادب کو تنقید حیات قرار دیا جائے تو ان ناسوروں سے کیسے چشم پوشی کیجا سکتی ہے؟

یہ کشمکش ایک برساتی جھرنے کی طرح زور سے بہہ رہی ہے اور اس کے آس پاس کی آوازیں سنائی نہیں دیتیں لیکن یہ حالت صرف اس قوم
سے مخصوص نہیں جو قوم اس کشمکش سے گزرے گی اس کے ادب و فن کو انہیں مراحل سے گزرنا پڑے گا لیکن اس مقام پر ان تمام حقائق کے اعتراف
کے باوجود ادب اسلامی کی تحریک پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اس ہنگامہ زندگی کے ان گنت موضوعات سے نظر بچا کر صرف انہی تعلقوں
پر اپنی توجہ صرف کی جو اسے تحریک اسلامی کی سیاسی قدروں سے (یعنی میرا مطلب یہاں یہ نہیں ہے کہ تحریک اسلامی کی سیاسی قدروں کو ادب کے سانچے
میں نہ ڈھالا جاتا بلکہ میرا مطلب یہاں یہ ہے کہ ادب کا موضوع سیاسیات سے زیادہ گہرا اور پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ہم اپنے سماج کے ہر ادارے اس
کے مشاغل، فرد اور جماعت کا تعلق، ان کے مختلف مسائل کو پیش کر سکتے ہیں اور ان پر تنقید کر کے سیدھا راستہ دکھا سکتے ہیں۔ اگر ان سیاسی قدروں
کو اپنانے کے ساتھ ساتھ سماج کی دوسری قدروں سے بھی واقفیت پیدا کرتے چلتے تو اتنا وسیع خلا محسوس نہ ہوتا جتنا آج کیا جا رہا ہے،

کوئی سیاسی تحریک اپنی ہمہ گیر مصروفیات کی بنا پر سماج کے ان تمام مسائل کو لیکر نہیں چل سکتی کیونکہ اس کے لئے یہ نا ممکن ہے۔ وہ تو
چند اہم بڑے بڑے مسائل کو لیکر اٹھتی ہے اور دوسرے ضمنی مسائل کو ان سے منسلک تصور کر لیتی ہے یعنی فلاں بڑے بڑے مسائل حل ہو جائیں گے
تو یہ چھوٹے چھوٹے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے، لیکن ایک مقصدی ادب اس تشنگی کو ضرور بجھا سکتا ہے وہ زندگی کے ہر مسئلہ پر قلم اٹھاتا
ہے ـــــ اور ایسے ایسے مسائل کو چھوتا ہے کہ عام لوگ جن کو دیکھتے ہوئے یوں ہی گزر جاتے ہیں اور انھیں کوئی احساس نہیں ہوتا

[1] اس کا واضح ثبوت پنجاب و سرحد کے الیکشن اور ان قوانین سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے حال ہی میں پاس کئے ہیں!

لیکن جب انہیں چیزوں کو ادب کے ذریعے ان تک پہونچایا جاتا ہے تو وہ یا تو چیخ اٹھتے ہیں یا تعجب کرنے لگ جاتے ہیں اور اُن کا احساس بیدار ہو جاتا ہے اس صورت کے پیشِ نظر کسی فلاکت زدہ اور گرے سماج میں چومکھی لڑائی کے لئے "ادب بہت بڑی خدمت انجام دے سکتا ہے -------- اور وہ اس طرح کہ سماج کے ہر نقص کو افراد کے سامنے لایا جائے اور سماج میں جو بیدار قوتیں ہیں انہیں متعارف کرایا جائے ------ اس سے فرد میں ہمت، الیقین اور کام کرنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

تیسرا سبب تحریک میں کمی کا یہ نظر آتا ہے کہ اس کی باگ ڈور ابھی ایسے مخلص نوخیز مبلغوں کے ہاتھوں میں ہے جو ایک باشعور اور واقفِ فن ادیب سے زیادہ واعظ اور محتسب ہیں، اس لئے اُن کی تحریروں میں ادب کی وہ داخلی اور خارجی رنگا رنگی رچی ہوئی نہیں ہے، جس سے "اظہار" (Expression) اور بیان میں نکھار، دل آویزی اور بوقلمونی پیدا ہوتی ہے!

آج یہ سوال بھی بار بار ذہن میں اٹھتا ہے کہ ادب میں جب ان قدروں کو روشناس کرایا جائے تو اس کی ہیئت الہیاتی ہو یا حیاتی یا عمرانی، آخر کون سے اجتماعی علوم کی اصطلاحات سے اپنے مفہوم اور منشا کو ظاہر کیا جائے!

لیکن ان اصطلاحوں کو اختیار کرنے سے بیشتر یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ مزید غلط فہمیاں پیدا نہ ہو جائیں لوگ وہی سمجھیں جو کہ دسنت کا مقصود ہے، کیونکہ اس قسم کے اندیشے دوسرے سماجی علوم میں پیدا ہو چکے ہیں۔ اور عمرانیات (Sociology) میں انہیں اصطلاحوں کے چکر نے بڑی پیچیدگی پیدا کر دی ہے جسے ابھی تک سلجھایا نہیں جا سکا۔

آج کی صنعتی زندگی میں ادب صحافت کا ایک ایسا تحریری واسطہ ہے جس کے استعمال سے سماج کے ہر طبقے کو ہموار کیا جا سکتا ہے کالج کے طالب علم، مل کے مزدور، کسان چھوٹے موٹے دوکاندار اپنے فرصت کے بیشتر لمحات ادب صحافت کے مطالعہ میں صرف کرتے ہیں۔

رہا ادیب اور ادیب کا تاریخی آدرش کردار تو وہ سماج کے بدلتے مطالبوں سے خود بخود متوازن ہو رہا ہے اب ادیب اس دنیا میں خود کو صرف کسی شمع کا پروانہ، یا کسی چمن میں پھول کا بھنورا ہی نہیں سمجھتا بلکہ وہ خود کو سوسائٹی کا ذمہ دار فرد بھی تصور کرتا ہے اسے اپنی سوسائٹی کی پستی کا احساس بھی ہے اور نئی صحت مند زندگی کے ارمان بھی۔

جن دو اسباب کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا، وہ زیادہ اچھے "تخلیقات" کو وجود میں لا سکے، ارادہ کا خلوص اور عزم کی تقدیس اپنی جگہ مسلّم! مگر ان کے اظہار کے پیرایہ میں خامی باقی رہی!

بہرحال ابتدا میں ان اثرات نے "تخلیقات" میں یکسانی ضرور پیدا کر دی! ہر اسلامی افسانہ نگار جوشِ تبلیغ میں اکثر و بیشتر اپنی کہانی (یا افسانہ) کے کرداروں سے کلمۂ حق پڑھا کر مشرف باسلام کراتا ہے، یا پھر وہ اُن کو "تائب" بنا کر چھوڑتا ہے!

ان کی یہ تخلیقات اپنے پچھلے موروثی قصوں اور داستانوں کے کرداروں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں، ان کے ہیرو بھی ظلم کرتے کرتے تھک کر بعد میں توبہ کر لیتے ہیں یا ظلم و گناہ کو اچانک چھوڑ دیتے ہیں اور بقیہ زندگی نیکوکاری میں گزارتے ہیں یا پھر فنکار کسی سانحہ سے دوچار کرا کے انہیں ہلاک کرا دیتے ہیں یا اُس وقت بھی ایک تجربہ "تھا اور آج بھی ہے کیوں کہ زندگی کسی لگے بندھے منطقی اور افسانوی اصول کی پابند نہیں ہے اور ہماری سوسائٹی میں اکثر ایسا نہیں ہوتا، جس کو ان ادیبوں نے ابتدا میں پیش کیا ------ جیسے میں نے

پہلے عرض کیا یہ یکسانی اسلامی ادیبوں میں پہلے عام تھی لیکن اب اس کا احساس فن کاروں کو ہو گیا ہے، اور یہ "یکسانی" رفتہ رفتہ تنوع اور رنگا رنگی سے بدلتی جا رہی ہے ..... نعیم صدیقی، جیلانی بی اے، ماہر القادری، محمود فاروقی، اسعد گیلانی، منظر حسین، رشید احمد، احمد اسحاق وغیرہ اس راہ میں بڑے نمایاں نظر آتے ہیں اور یہ مختلف سماجی مسائل پر قلم اٹھا رہے ہیں۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلامی افسانہ کی اس تکنیک سے اردو ادب میں صحت مند اضافہ بھی ہوا کہ جس حد تک پرچوں نے اپنی ساری توجہ صرف کی اُس کی عکاسی میں ایسے حقائق کو سامنے لائے جن کو دیکھ کر اس ملک کے بہی خواہ چیخ اٹھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے، پاکستان اور مسلمان کدھر جا رہے ہیں؟ مگر بعض اسلامی ادیب ان کرداروں کی صورت گری میں اپنا اس اسلامی اخلاقی معیار کا پورا لحاظ نہ رکھ سکے جس کا اسلام متقاضی ہے اور اسلام کا ممتاز وصف ہے!

اسلامی افسانہ ان سارے مراحل سے گزرتا ہوا حقیقت سے زیادہ قریب ہو رہا ہے لیکن اس امید افزا تبدیلی کے ساتھ اسلامی فن کاروں سے یہ بھی کہنا ہے کہ وہ "افکار" کو مصور کے رنگوں کی طرح استعمال کریں ــــــ حسن، دلکشی اور تنوع یہ ہیں ادب و انشا کی وہ خصوصیات جن سے ادب جاندار، حسین اور مقبول بن سکتا ہے!

جنسی انارکی اور کمیونسٹ ترقی پسندی نے بہت سی اخلاقی قدروں کو یہ کہہ کر کہ یہ پرانی ہیں اور نئی آنے والی زندگی میں ان کی کوئی ضرورت نہیں ــــــ منوں مٹی کے نیچے دبا دیا تھا، لیکن ہمارے مسلم عوام نے ان جوشیلے انقلابیوں کی باتوں پر توجہ نہیں کی اور وہ ان اخلاقی اور تہذیبی قدروں کو اپنے سینے سے لگا کر اس اسلامی انقلاب کا راستہ دیکھنے لگے، جس کا وہ برسوں سے انتظار کر رہے تھے ــــــ

ــــــ اب اسلامی ادیبوں کا یہ فرض اور اُن کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان مقدس امانتوں کو لیکر اپنے ادب میں سموئیں!

ہمیں ایسے ادب کی ضرورت ہرگز ہرگز نہیں ہے جو مار دھاڑ اور توڑ پھوڑ سکھاتا ہو ــــــ تعمیر اور اصلاح یہ ہے ہمارے اسلامی ادب کا مقصد! حق العباد اور حق اللہ دونوں ساتھ ساتھ چلیں، دوسروں کے لئے راحت کے اسباب مہیا کرنا ہماری عبادت ہو، یہاں تک کہ سوسائٹی کو "خیر و تقویٰ" پر پھر ایک بار اعتبار آ جائے۔

اسلامی ادب کا تاریخی رول

آج کے حالات میں اسلامی ادب اپنے وقت کی بڑی تاریخی ضرورت کو پورا کر رہا ہے جو اردو ادب کے دوسرے اسکول اس انداز پر نہ کر سکے، ہماری قوم کے لکھے پڑھے متوسط طبقہ میں مشرق و مغرب، مادیت اور روحانیت کی جو کشمکش برپا ہے اس کی بڑی سچی تصویر ان فن کاروں نے کھینچ دی ہے، احمد اسحاق کا "چراغ بجھ گیا"، اور رشید احمد کے "انٹرویو" کو ہم اس سلسلہ میں پیش کر سکتے ہیں!

اسلامی افسانے کے اس قبیل کے کرداروں کے مطالعہ سے ہم بخوبی اپنے پڑھے لکھے طبقے کے اخلاق، معاشرتی تعلقات، رجحانات اور ارادوں سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں کہ وہ کس طرح اپنی روایات کو چھوڑ کر اس طرف جانا چاہتے ہیں جہاں مادی آسائشیں ہیں ــــــ رنگ رلیاں ہیں لیکن اس ارمانوں بھری جدوجہد میں ان کا کیا حال ہو گیا ہے اس حالت اور کیفیت کو بڑے سلیقے سے ان فن کاروں نے اجاگر کیا ہے!

کوئی مہذب رشوت لیتے لیتے اتنا پھل پھول گیا ہے کہ یہ مالِ غنیمت چھپائے نہیں چھپتا اس کو مختلف مدوں میں صرف کرتا ہے، نئی بیوی کے غرارے، ساریاں، کار، بسیں جب سب سے روپیہ بچتا ہے تو ایک خوبصورت مسجد بنواتا ہے اور خود کو مسجد کی نگرانی کے لئے بھی پیش کر دیتا ہے، نماز صرف صبح کی پڑھتا ہے، آفس جانے سے پیشتر!

نئی زندگی کی تمنا اور حوصلے تو اس طبقہ میں بہت ہیں لیکن خود غرضانہ نقطۂ نظر نے انھیں بند تالاب کے پانی کی طرح ایک گڑھے میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ ان میں سے اکثر اپنی اغراض کے لئے یا اپنے لواحقین کی ضرورتوں کے پیش نظر جد و جہد کرتے ہیں قومی اور ملکی مسائل سے ان کو تو دلچسپی نہیں ——— اور نہ یہ لینا چاہتے ہیں۔ اس طبقے کے اس کردار کو دیکھ کر ذہن میں عجیب خلجان پیدا ہوتا ہے کہ یہ انسانی تاریخ میں کونسا پارٹ ادا کرنا چاہتا ہے ——— الغرض ان نئی زندگی کے شیدائیوں کا کوئی مقصد نہیں، کوئی مستقبل نہیں انھیں تو صرف ایک دُھن ہے وہ یہ کہ پرانے بندھن ٹوٹیں زیادہ سے زیادہ "لذتیت" میسر آئے وہ پرانے بندھن صرف اس لئے توڑنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ پرانے ہیں ——— اسی طرح جیسے پرانے کوٹ اور جوتے وغیرہ! اپنے یہاں کے رسم و رواج سے ان کی طبیعت سیر ہو چکی ہے اور بلکہ اکتا چکی ہے، جیسے ایک قسم کا کھانا کھاتے کھاتے اور ایک ہی وضع کا لباس پہنتے پہنتے طبیعت اکتا جائے، ماحول کے تقاضے، عقل یا اصول ان میں سے کوئی بھی ان کا معیار نہیں سوائے لذتیت کے! ان کا فلسفہ اس نقطۂ نظر کے ارد گرد گھومتا نظر آتا ہے کہ:—

بابر! بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست!

ان افسانوں میں ہمیں یہ بھی ملتا ہے کہ جب وہ اس نئی زندگی میں داخل ہوئے تو ان پر کیا گزری، کسی کو آزادیٔ نسواں کے سلسلہ میں اپنی بیوی یا بیٹی کے بگڑ جانے کا غم ہے، کسی کے پاس اس نئی زندگی کے رکھ رکھاؤ کے لئے اتنے پیسے نہیں جو وہ گھریلو ضروریات اور بیوی کے "شوقِ آرائش" کو پورا کر سکے!

اسلامی افسانہ اسی کشمکش کا ترجمان اور آئینہ دار ہے، نئے نئے لکھنے والے منظرِ عام پر آ رہے ہیں، فکر و نظر بدل رہے ہیں، ذہن و خیال میں انقلاب آ رہا ہے ——— ان شاء اللہ وہ دن دور نہیں ہے کہ اسلامی افسانوں کے آگے اشتراکی اور رومان آفریں افسانوں کا چراغ نہ جل سکے گا!

ترجمہ:- مہدی علی صدیقی

تہذیب مغرب نے عورت کو کیا دیا؟

[اس سوال کا جواب آپ کو اس مضمون میں ملے گا، کسی "ملّا" کی زبان سے نہیں، مغربی مفکرین کی زبان اور قلم سے! یہ وہ ارباب فکر ہیں جنھوں نے مشاہدہ اور تجربہ کے بعد پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے!

پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں عورتوں کی بے حجابی بے باکی اور آزادی بڑھتی جارہی ہے اگر اس بے اعتدالی کو سختی کے ساتھ جلد سے جلد نہ روکا گیا تو پھر کراچی اور لاہور اک دن پیرس اور لندن بن کر رہیں گے ـــــ پاکستانی عوام فیصلہ کریں کہ وہ اپنے گھروں کو "چکلہ" بنانا چاہتے ہیں یا حرم سرا! ـــــ]

(م - ق)

آجکل کی اسلامی دنیا میں نام نہاد "حریت و ترقی پسند" مغربی تعلیم یافتہ گروہ نے عورتوں کی شخصی آزادی کے لئے ایک ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ ان کے تصور میں مغرب نے ترقی کی دوڑ اس لئے جیت لی کہ عورت کی آزادی بلا چون وچرا قبول کر لی گئی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ مغربی اقوام نے ہر شعبۂ زندگی میں اپنی خواتین کو مردوں سے مسابقت کا موقعہ دیا۔ اس دلیل کو ایک اور طرح قوت دی جاتی ہے، کہا جاتا ہے کہ جب تک مغربی اقوام نے عورتوں کی آزادی کو تسلیم نہیں کر لیا وہ شاہراہ ترقی پر گامزن نہ ہو سکیں۔ ان دلائل کو پیش کر کے یہ دعویٰ ہونے لگا کہ جس وقت تک اسلامی ممالک عورتوں کے اصول کو اس حد تک قبول نہیں کرتے کہ وہ اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنا پورا اور برابر کا حصّہ نہ لینے لگیں اُس وقت تک ملت اسلامیہ ترقی کے آثار تک سے محروم رہے گی، ـــــ آیئے ذرا دیکھیں کہ مغربی مفکرین فلسفی، مورخین، سائنسداں، درحقیقت یہی رائے رکھتے ہیں یا کچھ اور ـــــ

فرانس کے مشہور سرجن الگزس کیرل (ALEXIX CARREL) جنھیں حال ہی میں نوبل پرائز ملا ہے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف (MAN THE UNKNOWN) میں لکھتے ہیں، مرد اور عورت میں جو فطری فرق اور اختلافات

ہیں وہ اُس سے کہیں زیادہ بنیادی ہیں جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ دونوں کے عضلات کی ساخت بالکل مختلف ہے اور عورت کے رحمی غدودے جو مائع پیدا ہوتے ہیں وہ اُس کے ہر جزوِ بدن میں سرایت کر جاتے ہیں اور اُسکی فطرت کو متاثر کر دیتے ہیں۔ اُس کے جسم کے ہر خلیہ پر اُس کے صنف کی گویا مُہر ثبت ہوتی ہے۔ یہ قول نہ صرف اُس کے ہر عضو کے لئے بلکہ بطورِ خاص اُس کے پورے اعصابی نظام کیلئے حرف بحرف صحیح ہے۔" اسی وجہ سے کیرل کی رائے میں مناسب ہے کہ عورت اپنی صلاحیتیں اپنی فطرت کے مطابق پرورش کرے نہ یہ کہ محض مردوں کی نقالی کو معراج بنائے۔ ڈاکٹر کیرل کے تجربے میں عورت کی جسمانی اور دماغی نشو ونما ایک یا دو بچے پیدا ہونے کے بعد پایۂ تکمیل کو پہونچتی ہے۔ ان کے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ رحم میں جنین کے وجود سے بڑے ضروری اور دور رس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ آسولڈ شوارز Oswald Schwarz اپنی کتاب Psychology of Sex میں لکھتے ہیں۔ "نسوانی جسم کا بہت بڑا حصہ حمل اور متعلقاتِ حمل کے لئے وضع کیا گیا ہے اور اگر کوئی عورت اپنے جسمانی اور دماغی نظام کی اس تکمیل سے محروم رہ جائے تو اُس کی زندگی خشک اور تلخ رہ جاتی ہے۔ لیکن ماں بننے کے بعد اس میں ایک نیا روحانی حسن جگمگا اٹھتا ہے۔" اسی مصنف نے ایک دوسری جگہ لکھا ہے "اس سے انکار ممکن نہیں کہ مرد اور عورت کی شخصیتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور یہ ہونا بھی چاہیئے۔ کیونکہ ہر جنس ایک علیحدہ اور مستقل وجود رکھتی ہے۔ نظامِ جسمانی میں یہ فرق جنسی وظائف حمل اور ولادت کے معمولات سے ہویدا ہے۔ انسانی جسم کا ہر عضو اپنا صحیح وظیفہ پورا کرنا چاہتا ہے اور اگر اُسے روک دیا جائے تو پورے نظام کا توازن درہم برہم ہو جاتا ہے۔ یوں کہیئے کہ عورت کے لئے بچہ ہونا ضروری ہے۔ اس لئے نہیں کہ یہ کوئی بیرونی اخلاقی تقاضا یا فقط ماں بننے کی خواہش ہے بلکہ اس طرح کہ اُس کا پورا حیاتی نظام بچہ پیدا کرنے کے لئے وضع ہوا ہے اور اگر یہ مقصد پورا نہ ہو تو اس کا ردِ عمل عورت کی پوری شخصیت کو متاثر کر ڈالتا ہے۔" ہم پھر ڈاکٹر کیرل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اُنھوں نے بتلایا ہے "ابھی عام طور پر اس کا احساس بہت ناکافی ہے کہ عورت کے لئے ماں بننے کا وظیفہ کتنا ناگزیر ہے۔ اس فریضہ کی ادائی اس کی مکمل حیاتی ارتقا کیلئے لازمی ہے۔ اس لئے عورت کو ماں بننے سے اجتناب کی ترغیب دینا مہمل ہے۔ لڑکیوں کو کسی صورت میں لڑکوں جیسی ذہنی اور جسمانی تربیت نہ دی جانی چاہیئے۔ ماہرینِ تعلیم کو ہمیشہ لڑکوں اور لڑکیوں کی عضویاتی اور دماغی خصوصیتوں اور وظائف کا فرق ملحوظ رکھنا چاہیئے تاکہ دنیا میں تہذیب و ترقی کی بنیادیں مستحکم تر ہوتی جائیں۔"

زمانہ حال کے ایک اور مفکر انتونی۔ ایم۔ لوڈوچی نے عورت کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کا نام Woman، a Vindication ہے۔ اُس نے لکھا ہے "بہ نسبت پہلے کے اب یہ بطورِ خاص ضروری ہے کہ عورت کے لئے ازدواجی زندگی کا مقصدِ حیات قرار دی جائے۔ اور والدین کو جتا دیا جائے کہ اسی غرض کے لئے اُنھیں اپنی لڑکیوں کی تربیت کرنا ہے۔" لوڈوچی کا کہنا ہے کہ اس کے سوا "عورت کی زندگی کا کوئی اور مقصد پست تر ہی متصور ہو سکتا ہے۔ اور جو لوگ نوجوان لڑکیوں کی خود پسندی اور فریب خوردگی سے فائدہ اُٹھا کر اُنھیں باور کراتے ہیں کہ اُن کے لئے ماں بننے کے برابر یا اس سے بہتر کوئی اور وظیفہ حیات بھی ہے وہ نہ صرف عورت بلکہ نسلِ انسانی کے کھلے دشمن ہیں۔" ایک اور مقام پر لوڈوچی کا لہجہ اور سخت ہو گیا ہے۔ وہ کہتا ہے "عورت زندگی اور اس کے ساتھ بقائے نسل کی مہم میں کتنی مستغرق رہتی ہے ہمارا روز کا مشاہدہ ہے۔ پھر ہم اُن لوگوں کو، جو اُس پر زبردستی کے نئے 'فرائض

عائد کرتے ہیں، جو خود تہذیب نو کی گتھیوں کو تو سلجھا نہیں سکتے مگر عورت کو نئی زندگی کے فریب میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں جو اس سے گھر بار شوہر اور اولاد کی راحت چھین کر تنہا اور بے برگ و ثمر زندگی گزارنے پر ابھارتے ہیں کیوں بالکل فریبی اور جھوٹا نہ کہیں۔

اب فرانسیسی تہذیب کی مہذب خواتین کا احوال سنئے۔ ڈاکٹر سلیون (Dr. Sullevan) نے اپنی کتاب (Alcohlism) میں شراب نوشی کے وجوہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے: "عورتوں کو صنعتی اداروں میں کام پر لگانے سے، اگر وہ شادی شدہ ہیں تو ان کی گھر گرہستی برباد ہو جاتی ہے اور اگر وہ کنواری ہیں تو انہیں خانہ داری کا کوئی عملی سلیقہ نہیں آسکتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آجکل نچلے درمیانی گھرانے کی ایک بیوی امور خانہ داری میں اتنی بے شعور، بدسلیقہ اور فضول خرچ ہوتی ہے کہ اس کا شوہر تنگ آ کر گھر کی بدمزگیوں کی تلافی یار باشی اور شراب خوری سے کرنے لگتا ہے۔" آخر میں ڈاکٹر سلیون اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ وہ تمام ملازمتیں اور پیشے جو آجکل عورتوں کو گھریلو مصروفیتوں سے روکتے ہیں شراب نوشی کے اضافے میں معاون ہیں اور اس طرح شراب نوشی پوری نسل کی صحت کو متاثر کر سکتی ہے۔

ایک اور مغربی دانشمند ول ڈیورانٹ Will Durant کا خیال ہے کہ عورتوں کا صنعتی ملازمتوں کی طرف رجحان، گھریلو زندگی کے انحطاط کا پیش خیمہ ہے خود اس کے الفاظ سنئے: "رفتہ رفتہ عورت کے معروف فرائض اس سے چھوٹتے گئے یہاں تک کہ گھر کے اندر کوئی سامان دلبستگی نہ رہا اور عورت بیکار دن گزارنے لگی مصروفیت اور زندگی کی دلکشیاں ختم ہوئیں۔ انسانوں نے گھر کو خدا حافظ کہا اور وہ روایتی گوشۂ عافیت جو دس ہزار سال سے مرکز امن و راحت بنا ہوا تھا، ایک نسل دیکھتے دیکھتے برباد ہو گیا۔"

مغرب کے دوسرے مفکر بھی عورتوں کی اس نام نہاد آزادی کے نتائج سے بے خبر نہیں معلوم ہوتے۔ جی۔ آر۔ اسکاٹ History of Prostitution میں لکھتے ہیں "دنیا کی تاریخ میں پہلے سے بدرجہا تعداد میں زیادہ آجکل یورپ اور امریکہ کے ہر شہر میں آپ کو معزز گھرانوں کی سیکڑوں لڑکیاں ملیں گی جو مختلف وجوہ جواز کی آڑ لیکر جنسی لذت اور آسودگی کی تلاش میں مردوں سے دو قدم آگے بڑھ کر ملنے کو تیار ہوں یہ ہیں تہذیب حاضر کی "غیر پیشہ ور بیسوائیں"۔" اس کی تائید پروفیسر سورنسن Prof. Sorensan نے اپنی تصنیف LOVE AND MARRIAGE میں کی ہے "آجکل طبقہ متوسط کی وہ لڑکیاں جو پوشاک اور سنگھار کی اداؤں سے جنسی جذبات کو ابھار کر مردوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، پیشہ ور عصمت فروشوں کا ہاتھ بٹا رہی ہیں، تعداد میں بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ چنانچہ کھلے اور آخری خط تک نیچے گریبان، غازے سے گلگوں رخسار، رنگین ناخن، گلرنگ ہونٹ، جو دس سال قبل پیشہ ور عورت کا نشان سمجھے جاتے تھے آجکل شریف لڑکیوں کی مستقل زینت قرار پا گئے ہیں۔ یوں سمجھئے جیسے ایک شریف دوشیزہ نے اپنی جنسی کشش میں اضافے کے لئے پیشہ ور بیسوا کی بیاض سے نسخہ چرا لیا ہو۔" اور بیداز جی آر اسکاٹ نے فاش کیا کہ "آج کل نوخیز لڑکیاں شادی کے متعلق اس وقت تک سنجیدگی سے غور نہیں کرتیں جب تک وہ اس طرح "عیش" نہ کر لیں جس طرح کچھ زمانہ قبل رواج نے مردوں کو اپنے "تجاہل عارفانہ" سے اجازت دے رکھی تھی۔ نتیجہ یہ کہ ازدواج کو کسی خوشگوار مستقبل کے لئے اٹھا رکھا جاتا ہے اور تمام تر توجہ جنسی مہمات سے لطف اندوزی پر مرکوز رہتی ہے۔ کنوارے پن کو جہالت

کا نام لے کر مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ آجکل کی دوشیزہ کا مطمح نظر محض عیش کوشی ہے جس کے لئے وہ ناچ گھروں، شبستانوں، شراب خانوں، رین بسیروں میں ایسے نوجوانوں کے ساتھ ماری ماری پھرتی ہے جسے اُس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس طرح وہ متواتر اور بالقصد اپنے دن رات ایسے ماحول میں گزارتی ہے جو اس کے جنسی جذبے کو چھیڑتے اور اُبھارتے رہیں اور بالآخر ناجائز مواصلت پر منتج ہوں۔"

آرنلڈ جے، ٹوئن بی (ARNOLD J. TOYNBEE) عصر حاضر کا سب سے موقر مورخ ہے۔ اُسکی کتاب مطالعہ تاریخ ایک عہد آفرین تصنیف ہے ٹوئن بی کا ایک مضمون مارچ ۱۹۴۹ء کے میں چھپا ہے۔ وہ لکھتا ہے اپنے موجودہ عالمی مسائل کو مادہ پرستانہ اصولوں پر حل کرنے کی جو کوششیں ہم نے حال میں کیں وہ ناکام رہیں اور ہمارے منصوبے، مضحکے ثابت ہوئے، ہم کہتے ہیں کہ ہم نے جسمانی مشقت بچانے کی مساعی میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور سیکڑوں مشینیں ایجاد کیں۔ اور یہ صحیح بھی ہے۔ لیکن اس کا ایک عجیب و غریب نتیجہ یہ ہوا کہ آج کل عورت کی مشقتوں میں اضافہ ہی نظر آتا ہے۔ امریکہ میں گھر والیوں کو ملازم نہیں ملتے، نہ وہ گھر کے کام کو پورا وقت دے سکتی ہیں۔ گویا ان پر دوہری محنت پڑتی ہے۔ ایک گھر کا کام کاج، دوسرے دفتر یا کارخانے کا کاروبار۔ انگلستان میں بھی جنگ کے زمانہ میں عورتوں کا یہی حال تھا۔ موجودہ تہذیب کے لئے یہ کوئی اچھی علامت نہیں۔ تاریخ کے ادوار میں ہر تباہی کا زمانہ وہی تھا جب عورت گھر سے بے تعلق تھی پانچویں صدی یونان میں جب تہذیب قدیم اپنے عروج پر تھی عورت گھر کی ملکہ تھی۔ لیکن عہد سکندر کے بعد جب کہ شہری جمہوریتیں ختم ہو رہی تھیں عورتوں کی آزادی کی تحریک بالکل اسی نوبت پر تھی جیسی آج ہے۔

اتنے زبردست مفکرین کی ان آراء کو پڑھ کر ہمیں آسولڈ شوارز oswal shawarz سے متفق ہونا پڑتا ہے کہ "اگر عورتیں مردوں سے مقابلے کی خواہشمند ہیں تو وہ ایک ناممکن چیز کو ممکن بنانا چاہتی ہیں اور یہ بالکل ناممکن ہے۔ کیوں کہ یہ خلاف اصول فطرت ہے اور خلاف اصول تاریخ۔"

(انگریزی کے جریدہ "یقین" yaqeen "کراچی سے ترجمہ کیا گیا)

ماہر القادری

انکارِ حدیث

دین کا سب سے بڑا فتنہ

رسالہ "طلوعِ اسلام" کے ترتیب دینے والے کوئی "محمد یونس صاحب" ہیں جن کا نام رسالہ کی لوح پر لکھا ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ "طلوعِ اسلام" کے کرتا دھرتا جناب غلام محمد صاحب پرویز ہیں جو حکومت پاکستان میں ڈپٹی سکرٹری کے عہدے پر فائز ہیں! پرویز صاحب ایک عرصے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث "کے انکار و مخالفت کی مہم چلا رہے ہیں اس کام سے جو وقت بچتا ہے وہ "اقامتِ دین" کے لئے جدوجہد کرنے والوں کی مخالفت، طنز و تشنیع اور اُن کے خلاف طرح طرح کے شبہات پھیلانے میں صرف ہوتا ہے، پہلا کام اُن کے مزعومہ "عقائد" کے لحاظ سے ضروری ہے، اور دوسری "ڈیوٹی" وہ اس لئے انجام دے رہے ہیں کہ اُن کو اپنے خداوندِ نعمت کا بہرحال حق نمک ادا کرنا ہے، "جماعتِ اسلامی" کی مخالفت سرکار دربار میں ترقی اور قربت کا سبب بن سکتی ہے، اور بہت سے لوگوں کے لئے بن رہی ہے، نہ جانے کس کس کو روزی "جماعتِ اسلامی" کی مخالفت ہی کے طفیل میں مل رہی ہے۔

جولائی (۱۹۵۲ء) کا طلوعِ اسلام ہمارے سامنے ہے اس کے "اداریہ" (لمعات) میں اس بات کی شکایت کی گئی ہے کہ منکرینِ حدیث کی مخالفت میں ایک ہنگامہ برپا ہے ــــــ یہ عجیب و غریب قسم کی شکایت ہے، لوگ خود فتنے کھڑے کرتے ہیں اور دوسروں پر ظلوم اور گریہ مسکین بن کر اُلٹی تہمتیں دھرتے ہیں کہ ہمارے خلاف یہ ہو رہا ہے، وہ ہو رہا ہے، "منبر و محراب دشنام طرازیوں کی نشرگاہ بنے ہوئے ہیں" ... ... "

تو یہ "منکرینِ حدیث" شاید اس اُمید میں تھے اور یہ توقعات قائم کئے ہوئے تھے کہ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ارشادات کی ہنسی اڑائیں گے، اُن کے "دینی حجت" ہونے کا انکار کریں گے، محدثین کو بدنام کرنے اور اُن کی ثقاہت کو مشکوک بنانے کے لئے طرح طرح کی بدگمانیاں پھیلائیں گے تو "منبر و محراب" سے تحسین و تبریک کے زمزمے بلند ہوں گے اور مدرسہ و خانقاہ سے "مرحبا" اور "احسنت" کی صدائیں آئیں گی اور عوام مسلمان ان "دشمنانِ حدیث" کی خدمت میں سپاسنامے پیش کریں گے کہ اس تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال کی مدت میں اسلام کو صحیح طور پر آپ نے سمجھا ہے، اب تک تو دینِ اسلام پر "عجمیت" غالب تھی اس عجمی طلسم کو آپ کے "دینی افکار" نے توڑا ہے اور اسلام تو اب نکھر کر سامنے آیا ہے، اور ہاں قبلہ! قرنِ اول سے لیکر اب تک جو یہ لاکھوں محدثین فقہاء، ائمہ اور علماء پیدا ہوتے رہے ہیں یہ سب کے سب دین سے نا واقف تھے اور انہوں نے اسی غلط اندیشی کے سبب ایک ایسی چیز (حدیث نبوی) کو دین میں حجت بنا لیا تھا جو تاریخی قصوں سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی، ہندستان میں اس راز کو عبداللہ چکڑالوی

نے سب سے پہلے سمجھا تھا پھر اُس کا انکشاف جناب اسلم جیراج پوری پر ہوا، یہاں تک کہ یہ علم سینہ بہ سینہ پرویز صاحب کو منتقل ہو گیا ——

—— یہ منکرینِ حدیث فتنۂ انکارِ حدیث کے جواب میں مسلمانوں سے اسی قسم کی منقبت آمیز تائید چاہتے تھے، مگر وہ تائید کی جگہ تردید اور موافقت کے بجائے مخالفت کا رنگ دیکھ کر بدحواس ہوئے جاتے ہیں اور دلوں کا زہر قلم سے ٹپک رہا ہے، وہ تو ان لوگوں کا بس نہیں چلا، اگر ان کو اختیار مل جائے تو تفسیر، احادیث اور فقہ کی تمام کتابوں کو دریا برد کر دیں کہ "قرآن" کے علاوہ یہ جو کچھ ہے، در حقیقت یک "عجمی سازش" تھی، مگر یہاں یہ اعتراض وارد کیا جا سکتا ہے کہ جب تفسیر، حدیث اور فقہ کی تمام کتابیں ناپید ہو جائیں گی تو پھر "قرآن" کی تشریح و توضیح کے سلسلہ میں مسلمان اپنی مشکلات کا حل تلاش کرنے کے لئے آخر کہاں جائیں گے؟ جی! کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے، اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اسلم جیراج پوری اور غلام محمد پرویز موجود ہیں، خود اُن سے پوچھئے، اُن کے مضامین اور کتابوں سے استفادہ کیجئے، دین اور قرآن کو ان سے بہتر آج تک سمجھا ہی نہیں گیا، چاک کر دیجئے تفسیر ابن کثیر کو اور جلا ڈالئے بیضاوی اور اتقان کو، "معارف القرآن" میں سب کچھ موجود ہے!

جس چیز کو پرویز صاحب "تاریخ" بتاتے ہیں اُسی تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہؐ کی احادیث پر عمل کیا اور اُن کو دین میں "حجت قطعی" سمجھا ہے اس کی دس بیس نہیں سیکڑوں بلکہ ہزاروں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، تابعین اور تبع تابعین سے لیکر ائمۂ علماء، صلحاء اور فقہاء تک سب نے ہر دور میں حدیثِ رسول کو حجت مانا ہے اور کتاب اللہ کے بعد حضورؐ کی سنت ہی کو دین کی اساس قرار دیا ہے، یہ افسانہ و حکایت نہیں، حقیقت ہے، ایسا واقعہ جس کے ہزاروں اوراق شاہد ہیں!

اور یہ جو "طلوعِ اسلام" میں حدیثِ نبوی کی تدوین اور دین میں حدیث کے حجت ماننے کو قرآن کے خلاف "عجمی سازش" سے تعبیر کیا گیا ہے تو یہ اتنی بڑی گالی ہے جو شاید آج تک ائمۂ محدثین اور علماء کو نہیں دی گئیں، ایسی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کے دل میں نہ خدا کا خوف ہو، نہ آخرت کے محاسبہ کا ڈر ہو اور نہ وہ اربابِ علم اور صالحینِ اُمت کے حدود و احترام کو جانتا پہچانتا ہو۔ "طلوعِ اسلام" کے مُریدوں سے ہم عرض کریں گے کہ وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ذرا سوچیں کہ اُن کے "پیر و مرشد" مولانا اسلم جیراج پوری کی شان میں اگر اسی قسم کے الفاظ استعمال کئے جائیں تو کیا وہ برداشت کر سکیں گے؟ کیا اس سے اُن کے دل کو اذیت نہ ہوگی؟ تو جو تہمتیں محدثین، فقہاء اور علماء اُمت پر "طلوعِ اسلام" میں لگائی جاتی ہیں، اور جو رکیک باتیں ان نیک انسانوں سے منسوب کی جاتی ہیں، کیا عوام مسلمانوں کے دل اُنہیں پڑھ کر اذیت نہ محسوس کرتے ہوں گے، "حمایتِ قرآن" کے نام پر مسلمانوں کے سینوں پر یہ تیر افگنی اور جراحت کاری "منکرینِ حدیث" کا محبوب شغل اور پسندیدہ ترین کارنامہ ہے، اس پر دوسری طرف سے کچھ کہا جاتا ہے تو اپنی مظلومیت دکھا کر اُلٹی شکایت کی جاتی ہے کہ "منبر و محراب سے ہمیں گالیاں دی جا رہی ہیں" ہائے وہ مظلوم، جس کے ہاتھوں سے دوسروں کا خون ٹپک رہا ہو! ظلم کا وہ حسین شباب ہوتا ہے جب کوئی ظالم "مظلوم" بن کر سامنے آتا ہے۔

صحابہ کرام کے عہدِ مقدس سے لے کر اس ہمارے دور تک کیسے کیسے صلحاء، کس قدر پاکباز علماء گزرے ہیں جو خدا کے خوف سے روتے تھے، اللہ اور بندوں کے حقوق کا انتہائی خیال رکھتے تھے، جو اپنے فائدہ کے لئے ذرا سا جھوٹ بھی بولنا گوارا نہ کرتے تھے، کیا ان بزرگوں

کے بارے میں کسی مسلمان کے دل میں یہ خطرہ گزر سکتا ہے کہ انھوں نے احادیث کے مجموعے مدون کرکے اور حدیث رسولؐ کو دین میں حجت مان کر "قرآن" کے خلاف سازش کی تھی؟ اور ان لوگوں کی یہ کوشش تھی کہ "قرآن" سے مسلمان غافل ہو جائیں (معاذ اللہ ۔ ۔ ۔ ۔ اس تصور سے ہزار بار خدا کی پناہ) حضرت امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبل (اللہ کی ان پر رحمتیں ہوں) جنھوں نے حق گوئی کی پاداش میں پیٹھوں پر کوڑے کھائے ہیں، قید و بند کی تکلیفیں اٹھائی ہیں، کوئی خوف جن کو مرعوب اور کوئی بڑے سے بڑا لالچ جن کو رام نہ کر سکا، کیا یہ کسی طرح عقل میں آسکتا ہے کہ ان سعید روحوں نے رسول اللہؐ کی احادیث "قرآن" کے توڑ پر جمع کی تھیں اور احادیث کو عام کرنے سے (معاذ اللہ) اُن کی یہ غرض تھی کہ قرآن کی آواز دب کر رہ جائے! اور "طلوعِ اسلام" میں قرآن پاک کی یہ آیت:-

قال الذین کفروا لا تسمعوا لھذا القرآن والغوا فیہ لعلکم تغلبون ؕ

منکرینِ قرآن[1] کہتے ہیں کہ اس قرآن کو مت سنو اس میں شور مچاؤ شاید تم (اس طریق سے) غالب آجاؤ!

جو نقل کی گئی ہے کیا اس کا انطباق "محدثینِ کرام" پر ہو سکتا ہے؟

آخر جہلِ مرکب کے ان "ابالیوں" کو ہو کیا گیا ہے کہ خود نادانی اور انتہائی بے دانشی اور ناسمجھی کی باتیں کرتے ہیں اور ساری دُنیا کو بے وقوف سمجھتے ہیں، دعویٰ اپنی ہمہ دانی کا، دانش و بصیرت، حکمت اور تنویرِ فکر کا! اور باتیں بالکل جاہلوں اور ادب ناآشناسوں کی سی! ــــــــ اس موقعہ پر ہم سے کہا جا سکتا ہے کہ تم خود سخت تنقید پر اتر آئے، ہمیں اس کا اعتراف ہے، لیکن کیا کیا جائے ہم بھی آخر جذبات اور غیرت و حمیت رکھتے ہیں، جب ہمارے "اکابر" پر تہمتیں جوڑی جائیں گی اُن کو "قرآن" کے خلاف سازش کرنے والا کہا جائے گا، تو پھر کس طرح ہم خاموش رہ سکتے ہیں، ہم پتھر کے بنے ہوئے نہیں ہیں اور نہ ہمارے سینوں میں دل کی جگہ کانچ کے ٹکڑے رکھے ہوئے ہیں۔

ہر مسلمان کا بے شک یہ ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، اس لئے حضرت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے جو قرآن ہم تک پہونچا ہے اس میں ایک شوشہ بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہوا، مگر وہ شخص جو نہ تو اسلام پر یقین رکھتا ہے اور نہ قرآن اور رسول کو مانتا ہے وہ اُس آیہ کریمہ سے جس میں حفاظتِ قرآن کا اللہ تعالیٰ نے خود وعدہ فرمایا ہے مطمئن تو نہیں ہو سکتا، وہ تو اُس سلسلہ اور اُن واسطوں کو جانچے گا اور پرکھے گا جن واسطوں سے قرآن ہم تک پہونچا ہے، تو جو نفوسِ قدسیہ ہر دور میں "حاملینِ قرآن" رہے ہیں، اُن کے بارے میں "طلوعِ اسلام" کے یہ کہہ دینے سے کہ ان محدثین اور علماء و فقہاء نے قرآن کے خلاف "عجمی سازش" کر رکھی تھی، خود "قرآن" کی اصلیت پر حرف آتا ہے، یعنی جن ہاتھوں، زبانوں اور سینوں میں قرآن رہا ہے، جب وہ قرآن کے مخالف تھے اور قرآن کے توڑ پر کسی دوسری چیز (احادیثِ رسولؐ) کو فروغ دینا چاہتے تھے، تو پھر اُن سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ انھوں نے قرآن کو جوں کا

[1] یہ ترجمہ "طلوعِ اسلام" میں اسی طرح درج ہے! (م ۔ ق)

رہنما دیا ہو اور اللہ کے کلام میں ردو بدل نہ کی ہو ——— "منکرین حدیث" کی یہ "جدتِ فکر" اور "ندرتِ خیال" خود قرآن کے حق میں کتنی ظالمانہ ہے،

رسالہ "طلوعِ اسلام" (ماہ جون ۱۹۵۲ء) کے پانچویں صفحہ پر لکھا ہے :—

"منکرِ حدیث کے لفظی معنی ہیں "حدیث کا انکار کرنے والا" ہم پوچھتے ہیں کہ کیا کوئی شخص دنیا میں ایسا بھی ہو جو حدیث کے وجود کا انکار کرے ؟ خود طلوعِ اسلام کے پاس حدیث کی کتابوں کی بڑی بڑی ضخیم جلدیں موجود ہیں جن کے اقتباسات اس میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں، کیا اس کے بعد کوئی سلیم العقل انسان ایسا کہہ سکتا ہے کہ طلوعِ اسلام حدیثوں کے وجود کا منکر ہے"

اس استدلال پر زروجواہر نچھاور کیجئے اور اس طرزِ فکر کے قربان ہو ہو جائیے، یہی وہ "فکر و بصیرت" ہے جو خیر سے امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ پر طنز کرتی ہے ——— یعنی "طلوعِ اسلام" کے دفتر میں چونکہ حدیث کی کتابوں کی بڑی بڑی ضخیم جلدیں موجود ہیں لہذا طلوعِ اسلام والے "منکرینِ حدیث" نہیں ہیں، ہم نیاز مندوں کی اس باب میں یہ گزارش ہے کہ اس دلیل کی بنا پر اسلام، قرآن اور حدیث و فقہ کے سب سے بڑے ماننے والے تو نول کشور پریس لکھنؤ کے پروپرائٹر، منیجر اور کارکن ہونے چاہئیں کہ قرآن، حدیث اور فقہ کی کتابوں کے گودام کے گودام اُن کے یہاں بھرے ہوئے ہیں!

یہ کس نافہم نے کہا تھا کہ "طلوعِ اسلام" والے حدیث کے وجود ہی کے سرے سے منکر ہیں، اُن کو "منکرینِ حدیث" اس لئے کہا جاتا ہے کہ تشریعی طور پر دین میں حدیث کو وہ حجت نہیں مانتے، حدیثِ نبویؐ کا دین میں حجت نہ ماننا ہی اُس کا انکار ہے ——— کیا قرآن پاک کے وجود سے کفار کو انکار ہے، ہزاروں غیر مسلموں کے یہاں قرآن کے نسخے موجود ہیں، تو کیا صرف قرآن کی جلدیں اپنے یہاں رکھنے کے سبب اُن کو قرآن کا ماننے والا کہا جائے گا، اور احادیثِ رسولؐ کے بعض اقتباسات کو محض "تاریخ" سمجھ کر زبان سے دُہرا دینا یا قلم سے لکھ دینا بھی اُس کے ماننے پر سند نہیں ہو سکتا، جس طرح بہت سے کافر "قرآن" کی آیتوں کے حوالے اپنی کتابوں میں درج کر دیتے ہیں، مگر چونکہ قرآن کو وہ الہامی صحیفہ اور کلامِ الٰہی نہیں سمجھتے اس لئے وہ "منکرینِ قرآن" ہیں حدیث کا منکر وہ ہے جو حدیث کو دینی حجت نہیں سمجھتا چاہے وہ اُس کی تاریخی اہمیت کا قائل ہو! اسی لئے ہم مولانا اسلم صاحب جیراجپوری اور اُن کے ہم خیال لوگوں کو "منکرینِ حدیث" کہتے ہیں، اور ایسا کہنے میں ہم حق بجانب ہیں۔

رسالہ "طلوعِ اسلام" کا ایک تضاد تو عجیب و غریب ہے، اُس کے سرورق پر علامہ اقبالؔ کی تصویر ہوتی ہے، اور جس ماہنامہ کا سرورق اقبالؔ کی تصویر سے مُزیّن ہوتا ہے اُس کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو مجروح کیا جاتا ہے، حالانکہ اقبالؔ کے دیکھنے اور اُن کی صحبتوں میں شریک ہونے والے ابھی زندہ ہیں اُن سے ہم نے دریافت کیا تو سب نے بالاتفاق یہی کہا کہ اقبالؔ تو احادیثِ رسولؐ کے اُسی طرح قائل تھے جس طرح تمام مسلمان قائل ہیں، انتہا یہ ہے کہ اقبالؔ نے وصیت نامہ میں اپنے نورِ نظر جاوید کو دین و شریعت میں سلف کے طریقہ پر چلنے کی تلقین کی تھی، اور یہ وہی "اسلاف" ہیں جو سب کے سب رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی احادیث کے دین میں حجت ہونے کے قائل تھے۔
علامہ اقبال جن کا یہ عقیدہ تھا:۔

نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن !

اور جو قرآن سے غیر معمولی شغف رکھتے تھے، "احادیثِ رسول" کو دین میں حجت سمجھتے تھے، اور انھوں نے احادیث کا کبھی استخفاف نہیں کیا، اور قرآن سے اُن کا شغف اور حدیثِ رسولؐ سے اُن کی وابستگی دونوں ساتھ ساتھ چلتے تھے، جس طرح خدا کی اطاعت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں کوئی تضاد نہیں ہے اور نہ وہ ایک دوسرے کے حریف ہیں، اسی طرح کلام اللہ (قرآن) اور کلام رسول (حدیث) بھی ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں۔

اور یہ جو "طلوعِ اسلام" میں احادیث کو قرآن کریم کے معیار پر جانچنے اور پرکھنے کے بعد اُن کے نکھارنے کا مشورہ دیا گیا ہے تو اس سلسلہ میں ہماری یہ گزارش ہے کہ پچھلے علماء نے اس پر بہت کچھ کام کیا ہے، "موضوعات" پر کتابیں موجود ہیں جن احادیث میں اسناد و طرق کے اعتبار سے "کمزوریاں" پائی جاتی ہیں وہ بھی ظاہر کر دی گئی ہیں، پھر بھی جو اہلِ علم قرآن اور احادیث میں گہری بصیرت رکھتے ہیں وہ حدیثوں کے نکھارنے کا کام آج بھی کر سکتے ہیں، سعی و جستجو کا دروازہ بند نہیں ہے ——— مگر احادیث کے نکھارنے کا یہ کام ہو بھی جائے تو اُس کے بعد بھی "طلوعِ اسلام" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان منتخب اور نکھری ہوئی "احادیث" کو دین میں حجت اور سند ماننے کے لئے تیار نہیں ہے، اُن کو وہ "تاریخ کے گراں بہا سرمایہ" سے زیادہ وقعت نہ دے گا!

طلوعِ اسلام میں حضورؐ کی احادیث کو بار بار "تاریخ" سے جو تعبیر کیا جاتا ہے یہ بھی انتہائی جہالت اور بے دانشی کی بات ہے، فنِ تاریخ جو دنیا میں پایا جاتا ہے کیا اُس میں روایت کرنے والوں کی ثقاہت کو اُسی طرح جانچا جاتا ہے جس طرح احادیث کے راویوں کی ثقاہت کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے، کیا احادیث کی کتابیں "فنِ تاریخ" کے اصول اور اسلوب پر مرتب کی گئی ہیں ——— احادیث کا فن "اسماء الرجال" خود اس بات کی دلیل ہے کہ "احادیث" علمِ تاریخ سے اس قدر ممتاز اور بلند ہیں کہ ان دونوں کو ایک ہی سطح پر نہیں لایا جا سکتا، جو کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "احادیث" کو تاریخ کہتا ہے، وہ یا تو تاریخ کے فن سے ناواقف ہے، یا پھر وہ جان بوجھ کر "حدیث" کی اہمیت کو مجروح کرنا چاہتا ہے اور قولِ رسولؐ کو تاریخی کہانی (اساطیر) سمجھتا ہے!

جب حضورؐ فرماتے ہیں "ایسا کرو" اور "ایسا نہ کرو" اس کی آخر کیا حیثیت ہے، کیا یہ تاریخ ہے؟ اور اس کی وہی حیثیت ہے جو سکندر، قسطنطین، بحر ماجینت، اکبر، نپولین اور پرنس بسمارک کی سوانح حیات اور اقوال و افعال کی ہے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی مسلمان اس قسم کا تصور بھی نہیں کر سکتا، ایسا رکیک خیال اُس کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا ——— یہ جو احادیث میں ملتا ہے "ایسا کرو" اور "ایسا نہ کرو" ان احکام و نواہی کو کیا ہم صرف "تاریخ" سمجھ کر گزر جائیں، کیا رسولؐ دوسرے مشاہیر کی طرح تاریخ کا بس ایک "ہیرو" ہوتا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا، جو لوگ اس قسم کے

خیالات رکھتے ہیں، وہ حقیقت میں منصب نبوت ہی سے واقف نہیں ہیں، وہ نہیں جانتے کہ رسالت سے کیا فرائض وابستہ ہیں، قرآن ان فرائض کو بتاتا ہے، اور دو ٹوک انداز میں بتاتا ہے!۔

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم آیٰتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ![3]

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف "بلاغ" اور پیغام کا پہونچانا نہیں تھا، بلکہ حضور ان ذمہ داریوں کے ساتھ مبعوث فرمائے گئے تھے:۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی آیتوں (قرآن) کی تلاوت (۲) اللہ کی کتاب کی تعلیم ——— اور تعلیم میں قرآن کی تشریح اور تفسیر، عملی اور قولی دونوں شامل ہیں (۳) قرآن کی روشنی میں "حکمت" کا درس دینا (۴) مسلمانوں کا تزکیہ نفس کرنا ——— احادیث حقیقت میں مجموعہ ہیں ان فرائض کا جو رسول اللہ سے متعلق فرمائے گئے تھے، یہ تو اللہ تعالیٰ کا مزید احسان ہے کہ اس نے کتاب بھیجی تو اس کے ساتھ "معلم" کو بھی بھیجا، اللہ تعالیٰ نے ایسا کیوں کیا، صرف "کتاب" ہی کو کافی کیوں نہ سمجھا؟ تو یہ اس کی حکمت بالغہ ہے، اس نے بندوں کے حق میں اسی ترتیب اور اہتمام کو مناسب سمجھا، اور اللہ کی حکمت پر اعتراض کرنا پرلے درجہ کی نادانی ہے، اسی طرح تو پورے نظام کائنات کو تنقید و اعتراض کا نشانہ بنایا جاسکتا ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے غلّہ اور پھلوں کے پکنے کیلئے آفتاب کی حرارت کی قید کیوں لگائی اس واسطہ کی کیا ضرورت تھی؟ انسان کو پیدا کیا تو اس کے زندہ رہنے کے لئے ہوا، پانی اور غذا کو ناگزیر ضرورت کس لئے بنایا؟ ایک ایک چیز پر اس قسم کے اعتراضات وارد کئے جاسکتے ہیں ——— یہ اعتراضات اور قسم کے خطرے اُسی ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، جو "تشکیک" کے مرض میں مبتلا ہو اور جسے "یقین" کی پس یوں ہی سی ہوا لگی ہو، ایسی باتیں ارباب تحقیق کو ہرگز زیب نہیں دیتیں، یہ تو کاواک ذہنیت کی پیداوار ہیں یہی وہ اُپج، جدتِ فکر اور ذہانت ہے جو آخر کار انکار اور بے یقینی کی سرحد تک آدمی کو خراماں خراماں، اور کبھی کبھی کشاں کشاں لے جاتی ہے۔

یہ جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے "تزکیہ نفس" کے منصب پر مامور فرمایا تھا، اسی تزکیہ نفس، تطہیر قلب، تربیت فکر و نظر اور تشکیل سیرت و کردار کی تفصیل احادیث میں پائی جاتی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کو انسانیت کیلئے معیار مقرر فرمایا، یہی وہ کسوٹی ہے جس پر سیرتوں کو پرکھا جاسکتا ہے، یہ "اسوہ حسنہ"

---

[1] قرآن پاک میں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے کہ تمھیں "داروغہ" اور "نگہبان" بنا کر نہیں بھیجا گیا تمھارا کام تو "بلاغ" ہے، تو عام طور پر وہاں "کافروں" اور "مشرکوں" کے ایمان نہ لانے کا ذکر ہے! یعنی کافروں اور مشرکوں کے ایمان نہ لانے سے حضور اکرم کو بہت صدمہ ہوتا تھا اس پر اللہ تعالےٰ فرماتا تھا کہ تم پیغام پہونچانے کے کام کو کئے جاؤ، ان کے ایمان لانے اور نہ لانے کے تم ذمہ دار نہیں ہو لیکن مسلمانوں میں حضور مبلّغ ہی نہیں معلّم حکمت بھی تھے، مفسر بھی تھے اور مزکی بھی!

قرآن پاک میں مجمل اور "احادیث" میں مفصل ملتاہے، مثلاً قرآنِ کریم میں غزوۂ بدر کا اجمالی ذکر آیاہے، اس کی تفصیل حضورؐ کی احادیث ہی میں ملتی ہے، احادیث بتاتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر کے لئے انصار اور مہاجرین کو کس طرح ابھارا، منافقین نے کیا کیا ریشہ دوانیاں کیں، نوخیز نوجوانوں میں کس قدر سرفروشانہ جذبۂ جہاد پایا جاتا تھا، حضورؐ نے لشکر کو کس طرح ترتیب دیا، جنگ سے قبل رسول اللہؐ نے سجدے میں کیا دُعا کی، لڑائی میں کس نے پہل کی، طرفین میں کیا گفتگو ہوئی، کفار قریش کے کون کون سردار مارے گئے، غزوۂ بدر کی یہ تمام تفصیل قرآن سے ذرہ برابر بھی متغائر اور متصادم نہیں ہے، یہ تفصیل واقعات کو اور زیادہ کھولتی ہے اور قلب مزید انشراح اور اطمینان محسوس کرتاہے، اس تفصیل کے ضمن میں کچھ جنگی قوانین بھی آگئے ہیں، جو ہمارے لئے دینی حجت ہیں! الغرض غزوہ بدر کی تفصیلات کا جتنا سرمایہ بھی احادیث وسیر میں ملتا ہے اس

قرآنِ پاک میں "قیام صلوٰۃ" کا بار بار ذکر آیا ہے، مگر نماز قائم کس طرح کی جائے؟ اُس کا آغاز اور اختتام کس طرح ہو؟ اس کی تفصیل احادیث میں ملتی ہے، نماز کن چیزوں سے فاسد ہوجاتی ہے، نماز میں بھول چوک ہوجائے تو اس کی تلافی کی کیا صورت ہے؟ اس کا جواب احادیث کے سوا اور کہاں مل سکتاہے، ہم چیلنج کرتے ہیں کہ کوئی شخص احادیث کی مدد کے بغیر صرف قرآن کو پڑھ کر اور سمجھ کر، ایک ہی رکعت نماز پڑھ کر دکھادے، نہیں پڑھ سکتا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جس نے قرآن کو نازل فرمایا اور اس میں "قیام صلوٰۃ" کا حکم دیا اُس نے "قیام صلوٰۃ" کے عملی نمونہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مبعوث کیا اور حضورؐ نے "اقیموا الصلوٰۃ" کے حکم کی اپنے عمل سے تفسیر فرمادی کہ نماز اس طرح پڑھی جانی چاہیئے، اذان، تکبیر، رکوع، سجود، قیام، قعدہ، سلام ——— ان سب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا عمل مسلمانوں کے لئے دینی حجت ہے، اسی طرح حج، زکوٰۃ، بیع وشراء، نکاح، طلاق، وکالت، اجارہ، شفعہ، رہن، قرض، وصیت، شرط، صلح، جنگ، تجارت، مزارعت، غرض تمام مسائل میں رسول اللہؐ ہی کا قول وفعل اہل ایمان کے لئے "حجت" اور "سند" کی حیثیت رکھتاہے، ایک بار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے مجمع میں وضو کیا، سب لوگ دیکھتے رہے، جب حضرت عثمانؓ وضو کرچکے تو آپ نے فرمایا لوگو! میں نے تمہیں وضو کرکے دکھایاہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح وضو کیا کرتے تھے، دین وشریعت میں اتباع وتقلید ناگزیر ہے، احکام کی تشریح وتفسیر میں کسی نہ کسی کے قول اور فعل کو ضرور قبول کرنا پڑے گا، یہ اپنے اپنے ظرف، ذوق اور ایمان کی بات ہے کوئی دین وشریعت میں اسلم جیراج پوری اور تمنا عمادی پھلواروی کے قول کو قبول کرتاہے اور کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اور حضورؐ کے صحابہ کے "اثر" سے سند لیتا ہے۔

نماز میں کمی یا زدتی ہوجائے تو آخر مصلّی کیا کرے؟ قرآنِ پاک اس کے جواب میں خاموش ہے اور اس لئے خاموش ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ان تفصیلات کے لئے رسول اللہ کو مبعوث فرمایا تھا، اور اُن کی شان یہ تھی:-

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ!

تو "وحی ناطق" کی طرف سے جواب ملتا ہے:۔

عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلی الظہر خمساً فقیل لہ ازید فی الصلوٰۃ فقال وما ذاک قال صلیت خمساً فسجد سجدتین بعد ما سلم (صحیح البخاری)

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ سے روایت ہے کہ ایکبار، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز میں پانچ رکعتیں پڑھیں (حضورؐ سے، عرض کیا گیا کہ نماز میں کچھ زیادتی ہوگئی، آپ نے فرمایا کہ وہ کیا؟ عرض کیا گیا، حضورؐ نے پانچ رکعتیں پڑھی ہیں، تو اسپر، حضورؐ نے سلام پھیرنے کے باوجود دو سجدے کئے"!

ہم پرویز صاحب بٹالوی اور اُن کے ہم مشرب اور ہمنوا "منکرین حدیث" سے دریافت کرتے ہیں کہ ابھی ابھی جو حدیث بیان کی گئی ہے کیا یہ صرف "تاریخی واقعہ" ہے، یا اس میں کوئی "حکم" بھی پایا جاتا ہے، آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان "احکام" سے ہم کیا برتاؤ کریں، اور اُن سے یہ بھی پوچھتے ہیں کہ اس قسم کے "اقوال و اعمال" جو اپنی تفصیل میں قرآن کے عین مطابق ہیں، جن سے قرآن کا کوئی اُصول نہیں ٹوٹتا بلکہ قرآن کے احکام کی عملی تکمیل کے لئے اور سہولتیں اور آسانیاں پیدا ہوتی ہیں ——— کیا مسلمانوں کے لئے دینی حُجت نہیں بن سکتے۔

"صید البحر" کے علاوہ جو حلال جانور اللہ کا نام لیکر ذبح نہیں کیا گیا اور اپنی موت آپ مر جائے اُس کا گوشت کھانا حرام ہے، مگر اُس کی "کھال" کے لئے کیا حکم ہے؟ قرآنِ پاک میں یہ تو فرما دیا گیا ہے کہ مرے ہوئے جانور حرام ہیں لیکن اُن کی "کھال" کے بارے میں کوئی صراحت نہیں ہے، اس کی صراحت حدیثِ رسولؐ میں ملتی ہے:—

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال وجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم شاۃ میتۃ اعطیتھا مولاۃ لمیمونہ رضی اللہ عنھا من الصدقۃ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ھلا انتفعتم بجلدھا قالوا انھا میتۃ قال حرم اکلھا (بخاری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مری ہوئی بکری دیکھی جو حضرت میمونہ کی کسی لونڈی کو صدقہ میں دی گئی تھی" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم اُس کی کھال سے کیوں فائدہ نہیں اُٹھاتیں؟ لوگوں نے عرض کیا وہ تو مری ہوئی ہے، آپ نے فرمایا "حرام تو اُس کا کھانا ہے"

قرآنِ پاک میں بیع و شراء کرنے والوں کے لئے دیانت و انصاف اور تولنے میں عدل کرنے کے بُنیادی احکام دئے گئے ہیں، اس کی تفصیلات "احادیث" میں ملتی ہیں، تخمینہ سے غلہ کی خرید و فروخت یہ دراصل "سٹہ" کی ایک صورت ہے، قرآن میں یہ تفصیل نہیں ملتی، مگر "حدیث" بتاتی ہے:۔

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال رایت الذین یشترون الطعام مجازفۃً یضربون علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یبیعوہ حتی یؤوہ

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے (وہ کہتے ہیں) کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو لوگ تخمینہ سے غلہ کی خرید و فروخت کرتے تھے ان کو میں نے دیکھا کہ وہ مارے

الی رجالهم (بخاری) بیچتے تاکہ وہ جب اس کو اپنے گھروں میں لے آئیں تب بیچیں۔

پھلوں کو کس حالت میں بیچا جائے؟ جب وہ پھول یا بور کی حالت میں ہوں، یا بالکل ادھ کچے ہوں، قرآن پاک اس بارے میں خاموش ہے، مگر حامل قرآن کا نطق وحی پروردہ جواب دیتا ہے:۔

"... فاما لا فلا تتبایعوا حتی یبدو صلاح الثمر" (بخاری) (یا تو پھلوں کی بیع موقوف کردو) اور نہیں تو اس وقت تک نہ بیچو جب تک پھل کی صلاحیت نہ ظاہر ہو جائے۔

قرآنِ پاک میں حج بیت اللہ کا، عمرے کا، صفا اور مروہ کا، اور احرام وغیرہ کا ذکر آیا ہے، مگر مناسکِ حج کی تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں پائی جاتی ہے، صحابہ کرام حضورؐ کی ایک ایک حرکت کو دلوں میں، نگاہوں میں، ذہنوں میں (اور بعض صحابہ حضورؐ کے اقوال کو تحریر میں بھی) محفوظ کرنے کی ہر امکانی کوشش کرتے تھے، چنانچہ طواف، سعی، رمی، استلام، اضطباع، قربانی کا طریقہ، عرفات میں خطبہ کا پڑھنا، مزدلفہ میں قیام، منیٰ کے لئے کوچ، یہ تمام تفصیلات حضورؐ کی احادیث ہی کے ذریعہ سے ہم تک پہونچی ہیں اور ان میں سے ایک چیز بھی قرآن کے منشاء سے بال برابر ہٹی ہوئی نہیں ہے ——— اس تفصیل کو جو کوئی "تاریخ" کہتا ہے تو وہ شدید قسم کے مراق میں مبتلا ہے، یعنی یا تو اُس کی نیت میں فتور ہے اور وہ احادیث کو جان بُوجھ کر مجروح کرتا ہے، یا پھر وہ حواس باختہ ہے۔

قرآنِ پاک میں "صبر" کی کس قدر تحسین فرمائی گئی ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والوں سے اپنی معیت کا وعدہ کیا ہے ——— (ان اللہ مع الصابرین) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "تقدیر الٰہی" پر صبر کرنے کیلئے اہلِ ایمان کو اس طرح اُبھارتے ہیں:۔

عن ابی هریرة رضی الله عنه ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال یقول الله تعالیٰ ما لعبدی المؤمن عندی جزاء اذا قبضت صفیه من اهل الدنیا ثم احتسبه الا الجنة (بخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس مومن بندے کی (کوئی) محبوب شے میں نے دنیا سے اٹھالی اس کی جزا میرے یہاں بجز جنت کے اور کچھ نہیں ہے۔

اس قسم کی تمام احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "تزکیہ نفس" کے ذریعہ سے متعلق ہیں۔

ریشمیں کپڑے (مردوں کے لئے) پہننے اور سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے کی ممانعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نطقِ وحی ترجمان کے ذریعہ ہم تک پہونچی ہے:۔

عن حذیفة رضی الله عنه قال نهانا النبی

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ

سلہ پھلوں کی نصل کی اس قسم کی خرید و فروخت کے سلسلہ میں حضورؐ کی خدمت میں لوگ اپنے قضیے لیکر آتے تھے، اس پر حضورؐ نے یہ حکم صادر فرمایا!

صلی اللہ علیہ وسلم ان نشرب فی آنیۃ الذہب و الفضۃ وان ناکل فیہا وعن لبس الحریر والدیباج وان نجلس علیہ (بخاری)

وسلم نے ہمیں سونے چاندی کے برتن میں کھانے پینے اور ریشم و دیبا پہننے اور اُس پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔

تکبر اور نمود و اسراف سے بچنے اور تواضع سے پیش آنے کی قرآنِ پاک میں جو تاکید فرمائی گئی ہے، رسول اللہؐ کی یہ حدیث اُسی "اسپرٹ" کو اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہے۔

ہم نے ابھی ابھی جن احادیث کا ذکر کیا ہے، اس قسم کی سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں حدیثیں کتابوں میں ہمیں ملتی ہیں، اور ان حدیثوں اور قرآنِ کریم کی آیتوں کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے مگر جس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس احادیث سے خدا واسطے کا بیر ہو گیا ہے، اُس کی دشمنی اور عناد کو محبت اور اُنس و ربط سے بدلنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے، اور نہ ہم اس ذہنیت کے لوگوں کو مطمئن کر سکتے ہیں، ہمارے مخاطب وہ افراد ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ رسالت کی اہمیت کو جانتے ہیں اور حضورؐ کو (معاذ اللہ) ہرکارہ اور چٹھی رساں، نہیں بلکہ معلّم اور مزکی بھی سمجھتے ہیں۔

ماہ جولائی ۱۹۵۲ء کے "طلوعِ اسلام" میں یہ بھی لکھا گیا ہے:۔

"رسول اللہ کے بعد خلفائے راشدین نے بھی قرآن کی حفاظت اور نشر و اشاعت کا کافی انتظام کیا لیکن رسول اللہ کے احکام (حدیث) کا کوئی مجموعہ مرتب نہ کیا۔ ۔ ۔ بلکہ کئی ایک معاملات میں رسول اللہ کے فیصلوں کو بدل بھی دیا، کیونکہ اُس وقت کے حالات بدل چکے تھے جن کے پیشِ نظر رسول اللہ نے وہ فیصلے صادر فرمائے تھے اور اس نئے دور کے تقاضے کچھ اور تھے۔ ۔ ۔"

پہلی بات تو ہمیں یہ کہنی ہے کہ اگر خلفائے راشدینؓ نے رسول اللہ کے بعض فیصلوں کو بدل دیا تھا تو حضورؐ کے فیصلوں کا یہ بدلا جانا خود اس بات کا ثبوت ہے کہ حضورؐ کے وہ "فیصلے" خلفاءِ راشدین کے زمانہ میں محفوظ ضرور تھے، چاہے یہ فیصلے ذہنوں میں محفوظ ہوں یا کاغذوں، پتھر کی تختیوں اور اونٹ کی کھالوں پر منقوش اور مکتوب ہوں، اور یہ چیز "منکرینِ حدیث" کے اس مزعومہ دعوے کی تردید کرتی ہے کہ "رسول اللہ کی وفات کے قریب سوا سو سال بعد (۱۴۰ھ) میں امام مالکؒ نے ان روایات کو جمع کیا جو رسول اللہ کے اقوال و افعال سے متعلق لوگوں میں مشہور تھیں" (طلوعِ اسلام، جولائی صفحہ ۹۶) اگر خلفاءِ راشدین کے عہد میں یہ روایتیں (احادیث) جمع، محفوظ، مرتب، اور مشہور نہ ہوتیں تو خلفاءِ راشدین یا دوسرے اصحاب کو اس بات کا امتیاز اور احساس کس طرح ہوتا کہ فلاں فیصلہ رسول اللہ کے فیصلہ کے عین مطابق ہے، اور فلاں فیصلہ کو بدل دیا گیا ہے۔

دوسری بات ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جن کتابوں میں منکرینِ حدیث کو ایسی روایتیں ملتی ہیں کہ رسول اللہ کے فلاں فیصلہ کو خلافتِ راشدہ کے عہد میں بدل دیا گیا اُن میں وہ روایتیں بھی موجود ہیں کہ خلفاءِ راشدین نے رسول اللہ

کے فیصلہ پر مطلع ہونے کے بعد خود اپنے فیصلہ کو بدل دیا ـــــــــــ اور ہم ان ضرورت سے زیادہ ذہین حضرات سے پوچھتے ہیں کہ حدیث کی کتابوں میں سیکڑوں مثالیں تو ایسی ملتی ہیں کہ خلفاء راشدین نے حضورؐ کے فیصلوں کو "حجت" مانا ہے، اور اُن کے مقابلے میں صرف چند مثالیں ایسی ہیں جن میں (بقول طلوعِ اسلام) حضورؐ کے فیصلوں کا بدلا جانا بیان کیا جاتا ہے ـــــــــــ تو ہمیں از راہِ عقل و انصاف بتایا جائے "کثرت" اور "شواذ" دونوں (نظیروں) میں کس کو ترجیح حاصل ہے، اور "اطیعوا الرسول" کی جو نص قرآن میں وارد ہوئی ہے، اُس کے اعتبار سے ایک مسلمان کا فطری تقاضا اور طبعی رجحان کس طرف ہونا چاہئے۔

تیسری گزارش یہ ہے کہ خلفاء راشدین سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جن فیصلوں کے بدلنے کی نسبت کیگئی ہے، اُن فیصلوں کا اگر ذکر فرما دیا جاتا تو ہم اُن پر گفتگو کرتے ـــــــــــ اس لئے کہ یہ بالکل یقینی بات ہے کہ رسول اللہ کے کسی حکم یا فیصلہ کو بدلنے کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے، خلفاء راشدین نے ایسی جرأت نہیں کی ہوگی، ہاں یہ ہو سکتا ہے رسول اللہ کے فیصلہ کی تعبیر میں دو رائیں ہو گئی ہوں یا جو فیصلہ خلفائے راشدین تک پہونچا ہو اُس کو اُنھوں نے درایت و روایت کی رُو سے زیادہ قابلِ اعتماد نہ سمجھا ہو ـــــــــــ اور اس کے ماسوا خود اُن روایتوں کو بھی جانچا جائے گا جن میں خلفاء راشدین سے رسول اللہ کے فیصلوں کے بدلنے کو منسوب کیا گیا ہے، اگر جانچنے اور پرکھنے کے بعد یہ بات ثابت ہو جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعی کسی فیصلہ کو کسی خلیفۂ راشد نے بدلا ہے، تو اُمت کے لئے اُسی ذاتِ اقدس کا فیصلہ حجت ہوگا، جس کی شان میں

"ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ "

وارد ہوا ہے۔

" خدا نے بھی صرف قرآن نازل کیا اور رسول اللہ نے اُمت کو قرآن ہی دیا اور اُسی قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا" (طلوعِ اسلام)

یہ ایک شدید قسم کا مغالطہ اور بہت بڑی غلط اندیشی ہے جس میں "منکرینِ حدیث" مبتلا ہیں وہ "حدیث دشمنی" میں اس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ آفتاب کی طرح روشن حقائق سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں ـــــــــــ رسول اللہ نے اُمت کو قرآن بھی دیا اور اپنی "سنت" یعنی "اسوۂ حسنہ" بھی اُمت کے درمیان چھوڑا، یہی "اسوۂ حسنہ" جس کو اللہ تعالیٰ نے معیارِ انسانیت قرار دیا ہے، حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مقدس میں صحابہ کرام نماز، روزے، حج، زکوٰۃ اور دوسرے مسائل، معاملات اور فیصلوں میں حضورؐ ہی کی تو پیروی کرتے تھے، ہر صحابی سرکارؐ کی ایک ایک نقل و حرکت کے اتباع میں انتہائی انہماک اور کمال درجہ کے شغف سے کام لیتا تھا ـــــــــــ اس صورت میں حضورؐ نے قرآن کے ساتھ صحابہ کرام کی زندگیوں،

سیرتوں اور شخصیتوں میں اپنی "سنت" کو بھی چھوڑا، ہر صحابی رضؓ اپنی جگہ رسول اللہؐ کی چلتی پھرتی "سنت" اور حضورؐ کا بولتا ہوا "اسوۂ حسنہ" تھا!

اس کے ماسوا تاریخ وسیر کی کتابوں میں بکثرت ایسی نظیریں اور شواہد ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ کے عہد مبارک میں صحابہ کرام حضورؐ کی احادیث اپنے سینوں اور حافظوں کے علاوہ تحریروں میں بھی محفوظ رکھتے تھے۔

۱۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے حدیثوں کو لکھ کر تحریری طور پر محفوظ فرمایا، آپ کا ارشاد ہے کہ میں نے رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے اس صحیفہ (مجموعہ حدیث) اور قرآن کے سوا اور کچھ نہیں لکھا (ابوداؤد)

۲۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بھی حدیثیں لکھی تھیں (تدریب الراوی)

۳۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص رضی اللہ عنہما نے حدیثیں مدوّن شکل میں جمع کیں اور اُس مجموعہ کا نام "صادقہ" رکھا، جس میں ایک ہزار حدیثیں تھیں (اصابہ، طبقات ابن سعد وغیرہ)

۴۔ فتح مکہ کے بعد حضورؐ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا تھا، ابوشاہ یمنی صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یہ مجھکو لکھا دیجئے حضورؐ نے جواب دیا کہ "اکتبوا لابی شاہ" (بخاری، ابوداؤد)

۵۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر بن حزم رضی اللہ عنہ کو جو بحرین کے والی (گورنر) تھے "کتاب الصدقہ" لکھوائی تھی، یہ دو صفحے تھے اور اُس میں زکوٰۃ کے احکام تھے، یہ کتاب دوسرے امراء اور حکام کو بھی بھیجی گئی (مسند احمد بن حنبلؒ وغیرہ)

یہ تحریر خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحؒ نے آلِ حزم سے ۹۹ھ ہجری میں لے لی تھی (دارقطنی)

۶۔ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے ایک نسخہ حدیث مرتب کیا تھا (تہذیب التہذیب)

۷۔ سعد بن ربیع بن عمر بن ابی زہیر انصاریؓ نے حدیثیں جمع کی تھیں (اسد الغابہ)

بہر حال تاریخ وسیر سے یہ چیز ثابت ہے کہ احادیث کی تحریر اور جمع وحفاظت کا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ میں شروع ہو گیا تھا، صحابہ کرام حضورؐ کی احادیث ایک دوسرے سے روایت کرتے تھے اور دینی مسائل میں اُن کو "حجت" بناتے تھے،

"جب اُن سے (یعنی اُن لوگوں سے جو رسول اللہ کی حدیث کو دینی حجت مانتے ہیں) پوچھا جاتا ہے اگر یہ دونوں چیزیں خدا کی طرف سے وحی تھیں اور دین کا غیر متبدل حصہ تو رسول اللہ نے قرآن کی طرح وحی کے اس دوسرے حصہ کو بھی محفوظ طور پر مرتب کر کے اُمت کو کیوں نہ دیدیا۔ ۔ ۔ ۔" (طلوعِ اسلام)

اس کا جواب تو اللہ تعالیٰ سے پوچھئے اور اُس کی حکمت کاملہ کو موردِ اعتراض بنایئے، کہ اے قرآن کے نازل کرنے والے خدا! بہتر تو یہ تھا کہ تیری طرف سے "کتاب" لکھی لکھائی عرب کی کسی پہاڑی پر رکھ دی جاتی، لوگ اُسے خود پڑھتے اور اپنی سمجھ سے عمل کرتے، یہ رسولؐ کے واسطہ کی کیا ضرورت تھی، پھر رسولؐ کو بھیجا تو اس کی اطاعت کو اپنی

اطاعت کی طرح فرض قرار دیا گیا، اور یہ بھی کہا گیا کہ یہ نبی "صرف میری آیتیں ہی تمہیں پڑھ پڑھ کر نہیں سنایا کرے گا بلکہ یہ تمہیں اُس کی تعلیم بھی دے گا حکمت بھی سکھائے گا اور تمہارے قلوب کو، زندگیوں اور سیرتوں کو نکھارے گا بھی؛ پھر یہاں تک فرما دیا گیا ——

" لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ

اس کے بعد خدا سے سوال کرنا چاہئے کہ وہ " اسوۂ حسنہ " کہاں ہے ؟ جب رسول اللہ کے اُسوۂ حسنہ کو تو نے "معیارِ انسانیت" بنایا تھا تو اُسے "قرآن" کی طرح کسی کتاب میں لکھوا بھی دیا جاتا، اے وحی بھیجنے والے خدا ! یہ تیرا کیسا انتظام ہے کہ نبیؐ کے " اسوۂ حسنہ " کی اہمیت بھی جتائی جاتی ہے، اُن کی اطاعت کا حکم بھی دیا جاتا ہے مگر اُن کے " اسوۂ حسنہ " کی جمع وحفاظت اور ترتیب وتدوین کا کام اُمّت پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

ہم عرض کرتے ہیں اس میں اللہ تعالیٰ کی گہری حکمت پوشیدہ تھی کہ اُس " وحی " (قرآن) کو جسے علماء نے " متلو " کہا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود لکھوا دیں، اور " وحی غیر متلو " کی جمع وحفاظت کا کام اُمّت کو سونپ دیں اور حضورؐ جب ارشاد فرمائیں کہ " یہ کرو " اور " یہ نہ کرو " یہ " حلال " ہے اور " یہ حرام " ہے تو اُس کی حیثیت " مشورہ " کی نہیں ہوتی، وہ " حکم " ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرح واجب التعمیل ! اس لئے کہ حضورؐ دین وشریعت میں جو حکم دیتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی وحی کی بنا پر دیتے ہیں۔

اور " طلوعِ اسلام " میں یہ جو کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق صحابہ کرام کے مشورہ سے قرآنی اصولوں کے جزئی احکام مرتب فرمائے تھے اور اُن کو بدلا بھی جا سکتا ہے —— تو یہ ٹھیک وہی ذہنیت ہے جو " منکرینِ قرآن " اور مغرب زدہ طبقہ کی ہے، یہ لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ قرآن کوئی ابدی دستور نہیں ہے کہ جس میں تبدیلی ہی نہ ہو سکے، عرب کے ماحول اور وہاں کے تقاضوں کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے احکام نازل فرمائے تھے، جو حالات کے لحاظ سے بدلے جا سکتے ہیں اس لئے کہ اللہ کا دین جامد نہیں ہے، متحرک اور ترقی پسند ہے —— فرق صرف اتنا ہے کہ منکرینِ قرآن جو بات " قرآن " کے بارے میں کہتے ہیں ٹھیک وہی بات " منکرینِ حدیث " رسول اللہ کی حدیث کے متعلق کہتے ہیں ان دونوں گروہوں کا مرکزی تصوّر ایک ہے، یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں، اُن کے سوچنے کے طریقہ میں بہت کچھ یکسانی اور مماثلت پائی جاتی ہے۔

یہ غلط اندیشیاں، فکری کوتاہیاں اور ذہنی گمراہیاں اس لئے ظہور میں آ رہی ہیں کہ یہ صاحبان " منصبِ رسالت " کو نہیں پہچانتے

سہ چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو " تاریخ " سے زیادہ وقعت دینے کے لئے وہ تیار نہیں ہیں، گویا حضورؐ بھی دوسرے

مشاہیر کی طرح تاریخ کے کوئی "ہیرو" تھے (نعوذ باللہ من ذٰلک) اور پھر اس معاملہ میں وہ اس حد تک پہونچ جاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام متعین فرمائے تھے، وہ وقتی اور ہنگامی تھے، زمانہ کے حالات کے اعتبار سے اُن کو بدلا جاسکتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ حضورؐ کی نبوت کے "تشریعی منصب" کو یہ لوگ تسلیم نہیں کرتے، اور قیامت یہ ہے کہ منصب رسالت کے ساتھ یہ دُشمنی قرآن کی حمایت اور دوستی کے پردے میں کی جارہی ہے۔

اور "طلوعِ اسلام" میں یہ جو مشورہ دیا گیا ہے کہ احادیث کے مجموعوں کو قرآن کی کسوٹی پر کس کر پھر سے دیکھا جائے، تو سوال یہ ہے کہ یہ کام کس کے سُپرد کیا جائے گا؟ "منکرینِ حدیث" جو رسولؐ اللہ کی احادیث سے عناد اور دشمنی رکھتے ہیں یہ کام اُن کو ہرگز نہیں سونپا جاسکتا، احادیث کو وہ "تاریخ" کہتے ہیں اور حضورؐ کے قول وفعل کو دین میں "حُجت" نہیں سمجھتے، اس صورت میں ان لوگوں سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ احادیث کے پرکھنے اور جانچنے میں وہ انصاف کا برتاؤ کریں گے، یہ کام تو عقیدت ومحبت کے ساتھ کرنے کا ہے، اور "عقیدت ومحبت" کے الفاظ ہم نے جان کر استعمال کئے ہیں —— —— ایک مثال جو ہم پیش کر رہے ہیں وہ قرآن وحدیث کے مباحث میں پیش کرنے کے قابل نہیں ہے صرف افہام وتفہیم کے لئے یہ چیز گوارا کی جارہی ہے!

اُردو زبان کے ایک معروف شاعر کی نگاہ میں غالبؔ کے کلام کی کوئی اہمیت نہیں ہے تو اب جو غالبؔ کے کلام پر تنقیدی نگاہ ڈالتا ہے تو غالبؔ کے یہاں اُس کو اہمال اور ابہام کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا، غالبؔ کے کلام کے تمام محاسن اُس کی نگاہ سے چھپے رہتے ہیں یہاں تک کہ غالبؔ کو وہ "سارق" کہنے سے بھی گریز نہیں کرتا، دوسری طرف مولانا حالیؔ ہیں کہ جو عقیدت ومحبت کے ساتھ غالبؔ کے کلام کو پرکھتے ہیں اور اُس کے محاسن کا کھل کر اعتراف کرتے ہیں، اور ایسا کرنے میں حالیؔ نے ذرا سی بھی ناانصافی سے کام نہیں لیا۔

احادیث کو وہی شخص پرکھ سکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ نبوت کو پہچانتا ہو، جو حضورؐ کی رسالت کے تشریعی منصب کا بھی دل سے قائل ہو —— پھر یہ ضروری نکتہ بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ قرآن اور احادیث کے مطالعہ کے لئے "فنِ مطابقت" سے واقفیت بھی بہت ضروری ہے! اگر کوئی شخص قرآنِ پاک کے معنیٰ اور آیتوں کے درمیان "مطابقت" پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، تو وہ قرآن کے ساتھ عدل وانصاف کا سلوک نہیں کرسکتا اُسے بعض مقامات پر "تضاد" نظر آئے گا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں ذرہ برابر اختلاف اور تضاد نہیں ہے، یہ اُس شخص کی سمجھ کی کوتاہی اور قلتِ فکر کا نتیجہ ہے، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "احادیث" کے سمجھنے اور پرکھنے کے لئے "فنِ مطابقت" سے واقفیت ضروری ہے، بادی النظر میں بعض "احادیث" کو پڑھ کر قلب میں کھٹک سی پیدا ہوتی ہے مگر غور کرنے کے بعد وہ "کھٹک" اطمینان اور یقین سے بدل جاتی ہے!

جو لوگ قرآن سے محبت وعقیدت نہیں رکھتے بلکہ اُن کے دلوں کے اندر اللہ کے کلام سے ایک طرح کی وحشت

اور بیزاری پائی جاتی ہے تو وہ اخلاق و نیکو کاری کی تمام باتوں کو چھوڑ کر اصحابِ کہف کے واقعہ، جنت و دوزخ اور یوم قیامت جیسے مابعد الطبیعاتی حقائق کو بحث و فکر کا موضوع بناتے ہیں، چنانچہ "نگار" کے ایڈیٹر نیاز فتحپوری نے اپنے مضامین میں جنت و دوزخ کا عجیب انداز میں مذاق اُڑایا ہے، اور "مُلّا" اور "مولوی" کے پردے میں خود اللہ تعالیٰ کی تضحیک کی ہے، احادیثِ نبوی کے منکرین کی بھی قریب قریب یہی ذہنیت ہے!

"طلوعِ اسلام" نے کلمہ طیبہ (لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ) لکھا ہے اور اُس کے نیچے یہ معنیٰ درج کئے ہیں:-

"اطاعت خدا کے سوا کسی اور کی جائز نہیں، اور محمدؐ اُس کا پیغام پہونچانے والے ہیں"

یہ "طلوعِ اسلام" کا دعویٰ ہے، دیکھنا یہ ہے کہ خود قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا کہتا ہے:-

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم آیٰتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ!

اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا رسول اُن میں انکو میں کا! پڑھتا ہے اُن پر آیتیں اُس کی اور اُن کو پاک کرتا ہے (بُرائیوں سے) اور اُن کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے!

"طلوعِ اسلام" کہتا ہے کہ رسول اللہ کا کام صرف پیغام پہونچانا تھا اور کچھ نہ تھا، اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ رسولؐ اللہ کو میں نے اپنی آیتوں کی تلاوت کے علاوہ، تزکیہ نفس اور کتاب و حکمت سکھلانے کے لئے بھی بھیجا تھا۔

فلا وربک لا یومنون حتیٰ یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت و یسلموا تسلیما!

اے محمدؐ! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اُس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ اُس کو (پورے کا پورا) مان لیں!

یہ ہے وہ "منصبِ رسالت" جس کا یہ "منکرینِ حدیث" انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے دل و دماغ پر اس بنیادی عقیدہ کا کوئی نقش ہی باقی نہ رہے، رسول اللہ کے فیصلہ کو نہ ماننا خدا کے نزدیک نفیٔ ایمان کی دلیل ہو مگر منکرینِ حدیث یہی کہے جاتے ہیں کہ رسول اللہ کا کام صرف پیغام پہونچانا تھا اُن کو تشریعی منصب حاصل نہ تھا اور تھا تو وہ حضورؐ کی وفات کے بعد ختم ہو گیا، رسُول اللہ کے فیصلوں میں ردو بدل کی جا سکتی ہے کہ وہ وقتی اور اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق تھے (اس تصور سے ہم کرو ڈبار بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ توبہ)! ہم عرض کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے اللہ کے احکام کی طرح ابدی اور دوامی ہیں، اور جو کوئی اُن کو بدلے جانے کا عقیدہ رکھتا ہے، قرآن کی رُو سے وہ مومن نہیں ہے!

"طلوعِ اسلام" کہتا ہے کہ - اطاعت خدا کے سوا اور کسی کی جائز نہیں" اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ

جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اُس نے دراصل خدا کی اطاعت کی!

فان تنازعتم فی شیئٍ فردوہ الی اللہ والرسول — تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اُسے اللہ اور رسولؐ کی طرف پھیر دو!

انما المومنون الذین اٰمنوا باللہ ورسولہ واذا کانوا معہ علیٰ امرٍ جامعٍ لم یذھبوا حتیٰ یستاذنوہ! — ایمان والے وہ ہیں جو یقین لائے ہیں اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر، اور جب ہوتے ہیں اُس کے ساتھ کسی جمع ہونے کے کام میں تو چلے نہیں جاتے، جب تک اُس (رسولؐ) کی اجازت نہ لے لیں!

النبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم — نبیؐ سے لگاؤ ہے ایمان والوں کو زیادہ اپنی جان سے!

یہ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اور اللہ تعالیٰ چاہے جو کچھ فرمایا کرے، پرویز اینڈ کمپنی تو حضورؐ کو "تاریخ" کے ایک ہیرو سے زیادہ حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں ہے! (العیاذُ باللہ)

یاایھا الذین آمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجھروا لہ بالقول کجھر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم وانتم لا تشعرون۔ — اے ایمان والو! بلند نہ کرو اپنی آوازیں نبی کی آواز کے اوپر اور اُس سے تڑخ کر نہ بولو، جیسے ایک دوسرے سے تڑخ کر بولتے ہو، (ایسے کرنے سے) تمہارے اعمال برباد نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

یہ ہے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان اور عزت اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں! کہ کون و مکاں کا والی و مالک صحابہ کرام کو رسول اللہ کی محفل کے آداب سکھلاتا ہے، جس کی آواز پر آواز بلند کرنے کی پاداش میں صحابہ کرام تک کے اعمال ضائع ہو سکتے ہیں، اُسؐ کے کئے ہوئے فیصلوں اور بتائے ہوئے احکام کے بدلنے کا فتویٰ "طلوعِ اسلام" دیتا ہے!

وما آتٰکم الرسول فخذوہ ومانھٰکم عنہ فانتھوا! — اور جو دے تم کو رسولؐ سو لے لو اور جس سے منع کرے سو چھوڑ دو!

مالِ غنیمت سے لے کر اوامر و نواہی تک یہ آیت اپنے معنیٰ کے لحاظ سے محیط ہے!

"قرآن کی طرف" مسلمانوں کو دعوت اور صاحبِ قرآن اور مہبطِ وحی و کلام کے قول اور فعل سے اس قدر بیزاری ——— اُس منافقت اور گمراہی سے اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو محفوظ رکھے، اور اس فتنہ کی ہوا بھی کسی صاحبِ ایمان کو نہ چھونے پائے، جو کوئی رسول اللہ علیہ وسلم کو "مطاع" نہیں مانتا اور دین و شریعت میں حضورؐ کی اطاعت کو فرض نہیں سمجھتا اُس کا ایمان ہی ثابت نہیں ہے!

شوق (کھنڈوی)

بیداری؟

قابلِ قید و بند ٹھہری ہے ‏— اہلِ ایماں کی راست گفتاری
شیخ ہر شب ڈنر اڑاتے ہیں ‏— فاقے کرتی ہے قوم بےچاری
اِن کے اُجلے لباس پر مت جا ‏— یہ بھی ہیں کو ملوں کے بیوپاری
بھول بیٹھے حدیث و قرآں کو ‏— رقص و نغمہ کا شغل ہے جاری
مصلحت جس کا نام رکھا ہے ‏— سر سے پا تک تمام عیّاری
عارضہ لڑکیوں کو فیشن کا ‏— اور لڑکوں کو دل کی بیماری
بیویاں رقص گاہ کی زینت ‏— اور شوہر ہلاک میخواری
کفر کی ہر ادا پہ جاں صدقے ‏— لفظِ اسلام سے بھی بیزاری
دے رہے ہیں پیام بت شکنی ‏— لات و عزّا کے تھوک بیوپاری
ہر نفس مصلحت سے آلودہ! ‏— ہر قدم پر ضمیر کی خواری
دوزخوں پر گماں ہو جنّت کا ‏— اُف ری عقل و خرد کی عیاری
کتنے آتش فشاں چھپائے ہے ‏— دوستوں کی یہ نرم گفتاری
ہر طرف راج ہے دھندلکوں کا ‏— دُور تک چھا رہی ہے اندھیاری

دیکھئے اور کیا دکھاتی ہے
یہ خدا ناشناس بیداری

شاعر لکھنوی

دو غزلیں

عشق جب قید تمنا سے نکل جاتا ہے
غم کبھی دل میں کبھی آنکھ میں ڈھل جاتا ہے
ایک شے وہ بھی ہے شبِ ہجر کی منزل کہ جہاں
ہائے اس چشم توجہ کا اثر کیا کہیے
عزم رکتا ہے کہیں عقل کی زنجیروں سے

غم کو نین غم دوست میں ڈھل جاتا ہے
مے وہی رہتی ہے پیمانہ بدل جاتا ہے
عشق اپنے ہی تصور سے بہل جاتا ہے
دل دھڑکنے کا بھی انداز بدل جاتا ہے
لاکھ قیدیں ہوں جنوں ہنس کے نکل جاتا ہے

سونے والوں کو خبر تک نہیں ہوتی شاعر
وقت اس طرح دبے پاؤں نکل جاتا ہے

نظر سیہوری

کہاں تک غم سہیں گے غم رسیدہ
ہمیشہ چشم حسرت آبدیدہ
بڑا نازک تعلق ہے دلوں کا
حقیقت سے جو ہے نا آشنا دل
چھپایا ہم نے رازِ غم تو کیا ہے
نہ جانے رات کیا گزری چمن میں
شرافت بخشتی ہے خاکساری
غزل میں بندشِ مضمونِ شوخی

رہے گا دل سے دل کب تک کشیدہ
محبت اور اتنی غم رسیدہ
نہ ہو جائے کوئی خاطر کبیدہ
محبت سے رہے دامن کشیدہ
کہ سب کچھ کہہ گیا رنگِ پریدہ
سحر کے وقت تھے گل آبدیدہ
ثمر سے شاخ ہوتی ہے خمیدہ
کہ جیسے کوئی آہوئے رمیدہ

نظر کو دیکھنے والے پرکھ لے
"شنیدہ کے بود مانند دیدہ"

شفیق صدیقی جونپوری

شورِ جرس!

کہانی شمعِ محفل کی نہ گل کی داستاں سنئے
دلِ مظلوم کی فریاد، بیکس کی فغاں سنئے

اگر احساس ہے کچھ قلب میں آہِ غریباں کا
تو کیا کہتی ہے مظلوموں کی چشمِ خوں چکاں سنئے

زبانوں پر گرفت الفاظ پر قیدیں معاذ اللہ
کہاں تک اپنی محفل میں صدائے دیگراں سنئے

ضرورت اب تو ہر منزل میں ہے ایسے حُدی خواں کی
کہ اپنا ہی ترانہ کارواں در کارواں سنئے

فغانِ صبحگاہی دن کے نالے رات کی آہیں
ذرا دل تھام کر افسانۂ سوزِ نہاں سنئے

چمن اپنا ہے شاخ اپنی تو اپنا ہی ترانہ ہو
عنادل ہو کے کیوں زاغ و زغن کی بولیاں سنئے

نہیں دشوار اب تو دور کی آواز کا سُننا
کچھ اندلس کی کہانی قرطبہ کی داستاں سنئے

چمن کی ڈالیوں سے اُڑ گئے سب ہمنوا اپنے
ترستی ہو تمنا کس سے حالِ آشیاں سنئے

نظر آتا نہیں گلشن میں کوئی ہم زباں اپنا
خود اپنی داستاں کہئے خود اپنی داستاں سنئے

جہاں ہنستے تھے کل تہذیبِ یارانِ مغرب کی
اب اس محفل میں گاتی ہیں حرم کی بیبیاں سنئے

وطن کی چاندنی راتوں میں گنگا کا کنارا ہو
مگر اے ہمنفس شط العرب کی داستاں سنئے

بنارس کی سحر ہو یا اودھ کی شام رنگیں ہو
جہاں بھی وقت آجائے تو کعبہ کی اذاں سنئے

مجاہد کا ترانہ اب کہاں جمنا کے ساحل پہ
مگر کچھ گنگناتی ہے ابھی موجِ رواں سنئے

کہاں ہیں غازی انور بے کہاں ہیں شیخ سنوسیؔ
بہت جی چاہتا ہے پھر حدیثِ عاشقاں سنئے

ہمیں سے گفتگوئے معنی لولاک باقی ہے
کسی دن ہم سے تاریخِ زمین و آسماں سنئے

نہ ہو گا ضبط پر قابو تو پھر فریاد سنئے گا
ابھی تو نغمۂ خاموشیِ اشکِ رواں سنئے

صبا روضے کی جالی تھام کر کہنا مدینے میں
کہ شاہا! سرگزشتِ امتِ بے خانماں سنئے

کبھی چھایا تھا جس کا دبدبہ مشرق سے مغرب تک
کہاں تک اس حجازی قوم کی بربادیاں سنئے

زباں پر آہ، دل میں سوز، دامن چاک، سر زخمی
شفیقؔ آتا ہے فریادِ غریبِ ناتواں سنئے

دو منظر

دربارِ کسریٰ

نغمۂ بربط، صدائے چنگ و نے
شیشہ و ساغر فروغِ موجِ مے

لحظہ لحظہ گردشِ جام و سبو
پے بہ پے رقصِ بتانِ لالہ رُو

پردہ ہائے اطلس و کمخواب و زر
غیرتِ فردوس سقف و بام و در

عود و گل، فانوس و نقل و انگبیں
جنتِ شداد بر روئے زمیں

ایں طریقِ عیش با جاہ و حشم
عشرتِ جمشید زندہ در عجم

مُزدک و زردشت در فکر و نگاہ
آتشِ سوزندہ معبود و الٰہ

سطوتِ شاہی بہ ایں جاہ و وقار
آدمی را آدمی پروردگار

بارگاہِ فاروق اعظمؓ

کوزۂ گل، بوریا، نانِ جویں
یک قبا کہنہ، شکستہ آستیں

چوبِ خرما سقف را تمکین داد
سادگی ایں خانہ را تزئین داد

بر درش یک حاجب و دربان نیست
حرفِ او جز آیۂ قرآن نیست

تاجِ دیں بر سر جہاں زیرِ قدم
فاتحِ روم و فلسطین و عجم

بر زمیں بنشستہ مثلِ دیگراں
جانشینِ اسوۂ پیغمبراں

لرزہ بر اندام کفر از نامِ او
سوزِ عشقِ مصطفیٰؐ پیغامِ او

تیرگی را ہمچو صبحِ مشرق کرد
درمیانِ حق و باطل فرق کرد

ماہر القادری

ماہر القادری

"ہز ہائی نس"؟؟

یہ ایک مکان ہے ——— "مکان"؟ جی! کیا کہا "مکان" توبہ کیجئے کوئی درباری یا چوبدار سن لے تو درِ زدہ مرمت ہوگی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا "مکان" تو بھائی! غریبوں کا ہوا کرتا ہے' یہ تو کوٹھی ہے، قصر ہے، ایوان ہے! دیکھتے نہیں ہو، صدر دروازے پر چار سنتری رائفلیں کندھوں پر اُٹھائے ہوئے ٹہل رہے ہیں، کیا رعب داب ہے' کیسی مستعدی ہے، جیسے یہ لوگ محاذِ جنگ پر پہرہ دے رہے ہیں!

پائیں باغ میں کچھ لوگ چپکے چپکے باتیں کر رہے ہیں' شاید کوئی خفیہ مشورہ ہو رہا ہے! جی! یہ "ہز ہائی نس" کی بارگاہِ رفعت پناہ ہے یہاں کا ایک ایک ذرہ قابلِ احترام ہے، ذرا سی بے ادبی پر یہاں بڑے بڑوں کی عزتیں خاک میں ملادی جاتی ہیں ——— یہ لیجئے قصرِ شاہی کے ریشمیں پردے کو جنبش ہوئی، ایک شاگرد پیشہ دوڑتا ہوا باہر آیا، اور آتے ہی بولا۔ ... ... "حضور! آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔ ... ..."! اس حکم کے سنتے ہی سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، کسی نے اپنے عمامہ کے پیچوں کو درست کیا، کوئی اپنی عبا کے دامن کی سلوٹ کو درست کرنے لگا، کسی نے گریبان کے تکمہ میں گرہ لگائی، اور ایک صاحب تو چلتے ہوئے ڈاڑھی میں کنگھا کرتے جاتے تھے۔

پائیں باغ سے ہز ہائی نس کی بارگاہِ خاص بہت سے بہت سو قدم کے فاصلے پر ہوگی' ذرا سی دیر میں یہ لوگ وہاں پہونچ گئے ——— تسلیم، کورنش، آداب! اور اُدھر سے اتنی بہت سی گردنوں کے "خم" کے جواب میں "دستِ ناز" کو بس ذرا سی جنبش ہوئی! پھر انگلی کے ایک اشارے پر آن کی آن میں ملازمین قہوے کر آگئے، بلّور کی صاف شفاف پیالیوں میں قہوہ کی رنگت کتنی بھلی لگتی تھی، کتنی بڑی عزت تھی، جو بارگاہِ سلطانی سے عطا فرمائی جا رہی تھی ———

کلاہِ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید!

ایک صاحب جن کی بہت گھنی ڈاڑھی تھی اور جن کی عبا پر کلابتوں کے پھول بنے ہوئے تھے اس بارِ کرم کو نہ سنبھال سکے' قہوہ پیتے میں اُن کا ہاتھ کانپنے لگا اور قہوے کی چند بوندیں شیر کی کھال پر گر پڑیں جو ایرانی قالینوں کے آس پاس بچھی ہوئی تھی!

جاڑے کی رُت تھی برفباری ہو رہی تھی، قصرِ سلطانی میں انگیٹھیاں سُلگ رہی تھیں قہوہ کا دور ہو چکا تو ہز ہائینس کے اشارے پر تمام چوبدار، شاگرد پیشہ اور ملازم ایک ایک کرکے باہر چلے گئے، ریشمین پردے گرا دیئے گئے، اب یہاں کوئی اندر نہ آسکتا تھا، تھوڑی دیر سکوت طاری رہا، بس ایک دو بار انگیٹھیوں سے کوئلہ چٹخنے کی آواز ضرور آئی!

یہ سر پھرے لوگ آخر چاہتے کیا ہیں؟ — ہز ہائی نس نے دریافت کیا

"خدا کی حکومت"۔ ۔ ۔ سرکار! — ایک مولوی نے جواب دیا

یہ تو اچھی بات ہے، اس میں آخر بُرائی کیا ہے؟ — ہز ہائی نس فرغل کا دامن پکڑتے ہوئے بولے۔

"خدا کی حکومت کے حضورِ عالی! یہ معنیٰ ہیں کہ وہاں خدا اور رسولؐ کے حکم کے علاوہ اور کسی کا حکم نہیں چل سکتا سرکار کوئی حکم دیں گے تو اُس کی تعمیل اُس وقت تک نہ ہوگی جب تک یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ وہ حکم اللہ اور رسولؐ کے احکام کے خلاف تو نہیں ہے (بیچ میں دوسرا درباری بول اُٹھتا ہے) فدوی خانہ زاد یہ عرض کرتا ہے کہ حکومتِ الٰہی میں بادشاہوں اور والیانِ ریاست کے لئے گنجائش ہی کہاں ہے، (ہز ہائی نس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا ہے۔) حکومتِ الٰہی میں جو صدر اور سب سے بڑا حاکم ہوگا وہ کوئی قصور کرے گا تو کھلی عدالت میں اُس پر مقدمہ چلایا جاسکتا ہے، ایک معمولی آدمی اُسے ٹوک سکتا ہے کہ تم نے فلاں کام اس طرح کیوں کیا؟ (ایک ادھیڑ عمر کا شخص جس کی کنپٹی پر گہرا سا نشان ہے عرض کرتا ہے) سرکار! یہ لوگ اللہ اور رسولؐ کا نام لے کر اپنا اقتدار چاہتے ہیں یعنی حضور کو (دشمنوں کے منہ میں خاک) تخت سے اُتار کر، خود فرمانروا بن بیٹھیں اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (ہز ہائی نس، اب تک تو خاموش بُت بنے بیٹھے تھے، مگر اس درباری کی گفتگو پر تن کر بیٹھ گئے اور گرجدار آواز میں کہنے لگے :۔

—— تم نے کہی ہے ڈھنگ کی بات یاقوت خاں! میں ان شریروں کی شرارت اور فتنہ پردازی کا گلا گھونٹ دوں گا، ان کی کوششیں میری ریاست کے حدود میں سرسبز نہیں ہو سکتیں، حقیر ذرے آفتاب کے منہ آتے ہیں ذلیل گھانس کے تنکے طوفان سے ٹکرانا چاہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

ہز ہائی نس بہت دیر تک زخمی بھیڑیے کی طرح چیختے رہے، پھر پولس کے سب سے بڑے افسر کو بلایا گیا اور بہت دیر تک مشورت ہوتی رہی، پھر دربار برخاست ہوگیا۔

دردناک منظر!

اس واقعہ کو دس بارہ دن ہو چکے ہیں، اور ریاست کی مشنری پوری طرح حرکت میں آچکی ہے، اقامتِ دین کے لئے جد و جہد کرنے والوں کو طرح طرح سے ستایا جا رہا ہے، کسی کو دیس نکالا دیا گیا اور کوئی جیل خانہ میں ٹھونس دیا گیا، مگر خدا کے یہ نیک بندے ہیں کہ خندہ پیشانی کے ساتھ ہر آزمائش کا مقابلہ کر رہے ہیں، اُن کے پائے استقامت

کو ذرہ برابر جنبش نہیں ہوتی ——— فولاد کے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں یہ لوگ! نہیں یہ بات تو نہیں ہے' ان کے جسم دوسروں کی طرح مٹی ہی کے بنے ہوئے ہیں مگر ایمان کی قوت نے ان کو اس قدر بے باک، حوصلہ مند اور ثابت قدم بنا دیا ہے!

۵ — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!

یہ دیکھئے کیا ہو رہا ہے! مگر اس منظر کے دیکھنے کی تاب کس میں ہے؟ ایک حق پرست کی ڈاڑھی سر بازار نوچی جا رہی ہے، حکومت کے سپاہی اور پیادے اُسے لات گھونسوں سے مار رہے ہیں، اس کا قصور؟ خطا؟ جرم؟ آخر اس نے کیا کیا ہے؟ یہ نہ پوچھئے اس دنیا میں "حق پرستی" سب سے بڑا جُرم ہے، چوری، بدکاری، رشوت، شراب خواری، قمار بازی اور اس قسم کی تمام "بازیوں" کو معاف کیا جا سکتا ہے مگر "حق پرستی" کا جُرم معاف نہیں ہو سکتا۔

——— ہائیں! یہ کیا ستم ہے، اتنے نیک اور خدا ترس انسان کے ساتھ ایسا ظالمانہ برتاؤ! ———

——— ایک بڑھیا نے کہا

——— بڑی بی! ذرا آہستہ بولو، سرکاری آدمی سُن لیں گے تو پھر تمہاری بھی خیر نہیں ——— ایک تماشائی نے جواب دیا ——— شام ہو چلی تھی، دُھندلکا پھیلتا جا رہا تھا مگر ابھی تک خدا کے اُس مجاہد پر مشقِ ستم جاری تھی، نہ جانے کس طرف سے ایک آواز آئی۔ ۔ ۔ ۔ "

"ظلم اور اقتدار سُن رکھے! کہ فتح آخر حق ہی کی ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ "

اِدھر یہ آواز گونجی اور اُدھر مسجد سے اذان کی آواز آنے لگی!

اللہ اکبر! اللہ اکبر! ۔ ۔ ۔ "

رُوحِ انتخاب

خلیفۂ اوّلؓ ـــــــ کے ـــــــ دو خُطبے

۱- بعد حمد و ثنا ! اے لوگو ! میں بھی تمہارے جیسا ایک مسلمان ہوں، میں نہیں جانتا کہ آیا تم مجھ سے اُنھیں باتوں کی توقع رکھتے ہو جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بآسانی انجام کو پہنچا دیا کرتے تھے آپؐ کی شانِ اقدس تو یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تمام اہلِ عالم کے مقابلہ میں انتخاب فرمایا تھا، اس لئے آپؐ کو تمام آفات و شرور سے محفوظ رکھا، میں صرف پیرو ہوں عادی نہیں، اگر میں راہِ راست پر گامزن رہوں تو تم میری اتباع کرنا، اور اگر بھٹک جاؤں تو مجھے سیدھا کر دینا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے، اس امت میں کوئی ایسا نہیں جس کا ذرہ سا بھی کوئی حق آپؐ کے ذمّہ باقی ہو،

(بگوش ہوش) سنو : کہ میرا شیطان مجھے اغوا کرنے کی تاک میں لگا رہتا ہے، اگر میں اس کے اغوا میں آ جاؤں تو تم مجھ سے الگ ہو جانا، اس وقت میرا تم پر کوئی حق نہ رہے گا، تم ہر وقت موت کے زیرِ سایہ رواں دواں ہو مگر وقت اجل سے آگاہ نہیں، بہتر یہ ہے کہ زندگی جو معین و محدود ہے نیک کاموں میں بسر ہو، مگر یہ بات توفیقِ الٰہی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا تم کو کوشش کرنی چاہیئے کہ قبل اس کے کہ موت عمل کے مواقع ختم کر دے تم نیک اعمال کرو، بعض قوموں نے اپنی زندگی میں کچھ نہیں کیا، اور وہ دوسروں کو عملِ صالح کا موقعہ دیکر رخصت ہو گئیں، تم اُن جیسے نہ ہو جانا، عملِ صالح کے لئے پوری کوشش کرو، موت سے ڈرتے رہو اور نجات کے طالب بنو، موت تمہارے پیچھے پڑی ہوئی ہے اور معلوم نہیں کہ وہ اچانک کب آ جائے، اس سے ڈرتے رہو، اپنے بزرگوں، اولاد، اور بھائیوں کی موت سے عبرت حاصل کرو، زندوں کی حرص کرو، مرنے والوں سے عبرت حاصل کرو، ایک اور موقعہ پر آپؓ نے فرمایا !

۲- اللہ صرف ان اعمال کو قبول کرتا ہے جو صرف اس کے لئے کئے جائیں۔ لہٰذا تم صرف اللہ کے لئے عمل کرو، اور سمجھ لو کہ جو کام تم صرف اللہ کے لئے کروگے وہی اس کی حقیقی اطاعت ہوگی، وہی اصلی کامیابی کی طرف قدم ہوگا۔ اور وہی متاعِ خالص ہوگی جو اس دنیائے فانی میں۔ آخرتِ باقی کے لئے مہیا کروگے، جو بوقتِ ضرورت تمہارے کام آئے گی۔

اے اللہ کے بندو ! تم میں سے جو مر گئے اُن سے عبرت حاصل کرو، اور جو تم سے پہلے تھے ان کی حالت پر غور کرو کہ وہ کل کہاں تھے اور آج کہاں ہیں ـــــــ کہاں ہیں وہ جابر فرمانروا، اور کہاں ہیں وہ سورما جن کی شجاعت اور فتحمندی کی داستانیں مشہور ہیں۔ جن سے عالم میں ایک تہلکہ پڑ گیا تھا، آج وہ خاک میں مل کر خاک ہو چکے، اور ان کے متعلق افسانے رہ گئے۔ اور ظاہر ہے کہ بُرے اپنے پیچھے بُرائیاں ہی چھوڑ گئے، اور لوگوں میں ان کی بُرائیاں ہی مذکور ہیں۔

وہ بادشاہ کہاں گئے جنہوں نے زمین کو جوتا، اور آباد کیا، زادو کوس لمن الملک بجایا وہ چل بسے اور آج ان کا نام لیوا تک کوئی نہیں۔ گویا وہ کبھی منصۂ شہود پر جلوہ گر ہی نہیں ہوئے، اللہ نے انکی بداعمالیوں کی سزا میں انکو برباد کردیا، انکی لذتیں ختم ہوگئیں وہ نیست ونابود ہوگئے، انکی برائیاں باقی رہ گئیں ان کی دنیا دوسروں کے قبضے میں چلی گئی، آج ہم ان کے جانشین ہوئے اگر ہم نے انکی حالت سے عبرت حاصل کی تو ہم نجات پائیں گے، اور اگر ہم انکی بظاہر کامیاب زندگی کے دھوکے میں مبتلا ہوگئے تو ہماری بھی وہی گت ہوگی جو انکی ہوئی

وہ مہ جبیں اور جوانانِ جہاں کہاں گئے، جو اپنی جوانی پر اتراتے پھرتے تھے، وہ سب خاک میں مل کر خاک ہوگئے، اور صرف اُن کی بداعمالیاں باقی رہ گئیں،

وہ لوگ اور اپنے زمانہ کہاں روپوش ہوگئے جنہوں نے شہر بسائے ان کے گرد حصار اور فصیلیں تیار کرائیں اور دنیا بھر کے عجائبات اُن شہروں میں جمع کئے، وہ ان سب کو اپنے بعد والوں کے لئے چھوڑ کر مرکھپ گئے آج ان کے محل برباد ہیں اور وہ خود قبر کی تاریکی میں بے نام ونشاں پڑے سڑ رہے ہیں،

خود تمہاری اولاد، اور تمہارے دوست واعزہ کہاں ہیں جن کو موت آگئی اور اب ان کو اپنے اعمال کی جوابدہی کرنا پڑی ہوگی خوب غور سے سن لو! اللہ کا کوئی شریک نہیں۔ وہ اپنی مخلوقات کے ساتھ بلاسبب کے بھلائی کرتا ہے، اور بغیر اس کی اطاعت اور حکم کی اتباع کے مخلوق سے کوئی ضرر ونقصان دور نہیں ہوتا۔ تم اپنی حالت مقروض غلام کی مانند سمجھو بغیر اس کی اطاعت کے آزادی حاصل نہیں کرسکتے۔ کوئی بھلائی بھلائی نہیں جس کا نتیجہ دوزخ ہو، اور کوئی برائی برائی نہیں جس کا ثمرہ جنت ہو، (تاریخ طبری)

(ترجمہ: مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی)

مکتوب عاصم

دارالحرب راولپنڈی سے جناب محمد عاصم صاحب تحریر فرماتے ہیں: —— دو تین روز ہوئے فاران کا تازہ پرچہ ملا اس میں آسد ملتانی صاحب کا ایک مضمون "تلفظ کی غلطیاں" کے عنوان سے نظر سے گزرا۔ دوسری چیزوں کے متعلق انہوں نے جو لکھا ہے، اس کے بارے میں تو کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ البتہ عربی الفاظ کی صحت کے متعلق جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اُسے پڑھ کر سخت افسوس بلکہ تکلیف ہوئی، خصوصاً ان الفاظ کے متعلق جنہیں انھوں نے قرآن مجید سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً انہوں نے لکھا ہے سمت کا صحیح تلفظ سُمت ہے کیونکہ "کلام پاک" میں "سُمت الراس" آیا ہے۔ اگر اس کلام پاک سے مراد قرآن مجید ہی ہے، تو کم از کم ہمیں تو یہ قرآن مجید میں یہ لفظ نہیں مل سکا بلکہ ہم نے صرف اپنے حافظہ پر بھروسہ نہیں کیا، قرآن کا انڈیکس بھی دیکھا مگر پورے قرآن میں یہ لفظ نہیں آیا۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ یہ لفظ قرآن میں نہیں آیا۔ اس کا اصل تلفظ سُمت ہے یا سمت ہے؟ اس کا فیصلہ آپ جیسے اہلِ زبان ہی کرسکتے ہیں، دوسری چیز جو آسد صاحب نے عربی کے سلسلے میں لکھی ہے وہ یہ کہ قصہ کی جمع قصص غلط ہے کیونکہ قرآن مجید میں "اَحْسَنَ الْقَصَص" آیا ہے۔ اس بارے میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ قرآن کی اس آیت میں اَلْقَصَصُ قَصَّ یَقُصُّ (بیان کرنا) کا مصدر ہے نہ کہ قِصَّۃ کی جمع۔ قِصّہ اور لفظ ہے اور اس کی جمع قِصَص اگر آسد صاحب قرآن مجید کے حوالے نہ دیتے، تو شاید اس خط کے لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی، آپ اسی سے زبان عربی اور پھر قرآن مجید کی سطحی اور غیرعلمی کا اندازہ لگاسکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ رحم کرے!

ہماری نظر میں

ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین (مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا)

مصنف - مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی - بڑی تقطیع، ۲۵۴ صفحے، طباعت اچھی، کاغذ اوسط درجے کا - دوسرا ایڈیشن قاہرہ ۱۳۷۰ھ / ۱۹۵۱ء

(از مولانا مسعود عالم ندوی کے قلم سے)

یہ کتاب اُردو میں عرصہ ہوا، چھپ کر مقبول ہو چکی ہے۔ اس کا عربی ایڈیشن پہلی مرتبہ مصر کے مشہور دارالاشاعۃ لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر کی طرف سے شائع ہوا تھا (۱۳۶۹ھ / ۱۹۵۰ء) جو جلدی ہی ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ لجنہ کے کرتا دھرتا احمد امین صاحب کا اس پر ایک مختصر مقدمہ بھی تھا، جس میں انھوں نے اپنی روایتی تنگ دلی کا مظاہرہ کیا تھا۔ احمد امین کو خود اس کتاب کے مصنف علی میاں اور ہمارے بعض دوسرے احباب معقول آدمی سمجھتے ہیں، لیکن راقم کی رائے ان کے عقیدہ اور علم، دونوں کے باب میں شروع سے خراب ہے۔ ان کی کتابوں میں خاصہ زہر بھرا ہوا ہے، جسے عام طور پر لوگ محسوس نہیں کرتے، نیز وہ بسا اوقات مستشرقین کی کتابوں سے صفحوں کے صفحے نقل کر جاتے ہیں اور حوالہ نہیں دیتے۔ اسلامی تحریکوں اور اسلامی شخصیتوں کے لئے بھی ان کے دل میں زیادہ گنجائش نہیں۔ ابھی ابھی انھوں نے اپنی ایک نئی کتاب میں حسن البنا مرحوم اور اخوان المسلمون پر ناروا حملے کئے ہیں۔ اس کتاب کے مقدمے سے اس خیال کی مزید تصدیق ہوئی۔

اب یہ دوسرا ایڈیشن، ایک دوسرے ادارے کے زیر اہتمام تین مقدموں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ پہلے ازہر کے عالم اور فرانس کے سند یافتہ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ کا پیش لفظ ہے، جس میں انھوں نے کتاب کا مناسب انداز میں تعارف کرایا ہے اور دل کھول کر داد دی ہے۔ اس کے بعد مشہور اہل قلم سید قطب نے ایک دل آویز خیر مقدم کے ساتھ اسے وقت کی سب سے اچھی کتاب قرار دیا ہے۔ سید قطب اسلامی انقلاب کے داعی ہیں، اس لئے ہر وہ کتاب جو اسلام کی طرف لوٹنے کی دعوت دے، انھیں قدرتی طور پر اپیل کرتی ہے۔ مگر خانقاہ کا اسلام نہیں، وہ زندگی کے مسائل و مشاکل سے نبرد آزما ہونے والا دین چاہتے ہیں۔ سید قطب کا جوش و خروش تو قابل داد ہے۔ لیکن ان کے خیالات میں تنی انقلابی

تحریکوں کا سا ہیجان زیادہ ہے۔ اور اسلامی دعوت کے ایقان اور یکسوئی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اگر ان کے دماغ و قلم کی یہ شورش ذرا کم ہوجائے، تو وہ بڑے کام کے آدمی ہوسکتے ہیں۔ آخر میں ازہر کے عالم اور روشناس صاحبِ قلم احمد الشرباصی نے "مصنف کی ذات" کا تعارف کرایا ہے اور بڑی محبت سے ان کے حالاتِ زندگی قلم بند کئے ہیں اور ان کے مزاج کی خصوصیات واضح کی ہیں۔

کتاب کے موضوع سے تو اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کتاب اردو میں مطبوعہ موجود ہے اس لئے اس پر کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ مصنف نے کامیابی کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کی فلاح اسلام کی قیادت و رہنمائی میں ہے۔ اور مسلمانوں کو اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے۔ مگر ایک بات رہ رہ کر کھٹکتی ہے۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کے انحطاط کے اسباب پر بے لاگ بات نہیں کہی گئی اور نہ دنیا کی قیادت سنبھالنے کا صحیح نسخہ انھیں بتایا گیا ہے۔ تمناؤں کے ابھارنے اور قومی خود بینی کی غذا دینے سے کوئی قوم نہیں ابھر سکتی اور نہ ابلیس کی رائے میں صرف اس ملت مرحوم کا "خطرناک" ہونا کافی ہوسکتا ہے۔ ضرورت ہے، صاف اور بے لاگ ایجابی دعوت کی۔ مجاملت کا انحطاط پذیر دور اب ختم ہوچکا۔ اس نمایاں کمی کے علاوہ، کتاب میں ہمیں اور کوئی کوتاہی نہیں محسوس ہوئی۔ باقی ایک مصنف اور صاحبِ فکر کے ہر ہر حرف سے اتفاق کرنا تو بہت دشوار ہے۔

کتاب معیاری عربی زبان میں ہے اور نفیس مصری ٹائپ میں چھپی ہے۔ مصنف عربی کے پختہ نگار اور صاحبِ طرز انشا پرداز ہیں۔ ہمارے اس ملک میں صحیح عربی لکھنے والوں کا قحط ہے۔ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ پورے برِ صغیر ہند و پاکستان میں شستہ اور معیاری زبان لکھنے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ ان گنے چنے لکھنے والوں میں بھی علی میاں کا خاص مقام ہے۔ اور اب عربی ممالک کی سیاحت اور قیام کے بعد تو ان کا قلم اور منجھ گیا ہے۔ عبد العزیز میمن کے بعد یہ شاید دوسرے آدمی ہیں، جن کی عربی انشا پردازی نے اہلِ زبان سے اتنی داد حاصل کی ہو۔ مصنف کا یہ دور افتادہ نیاز مند، ان کی اس کامیابی پر فخر محسوس کرتا ہے۔ ذاتی طور پر راقم کو اپنے دوست سے یہ پرانی شکایت ہے کہ وہ جدید اخباری زبان کے چلتے ہوئے اور غلط محاوروں کے استعمال میں جھجک نہیں محسوس کرتے — پھر لطف کی بات یہ ہے کہ عاجز ادب و انشا میں علی میاں کے تجدد کا شاکی ہے۔ حالانکہ وہ اپنی عام زندگی میں حد درجہ متقشف اور زاہد ہیں اور یہ گنہ گار ان کے برعکس آزاد منش! ——— علہ

صحیفہ "اہلِ حدیث" کا "حدیث نمبر" — پندرہ روزہ "اہلِ حدیث" کا "حدیث نمبر" مُدیر:۔ مولانا عبد الجلیل دہلوی، نگراں:۔ مولانا عبد الغفار دہلوی، ضخامت چار سو پچاس صفحے، اس نمبر کی قیمت تین روپیہ ——— رسالہ کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ، فی کاپی چار آنے، ملنے کا پتہ:۔ صحیفہ "اہلِ حدیث" محمدی مسجد، آرٹیلری میدان ع۸، کراچی!

علہ اس کے بعد کے تبصرے "ایڈیٹر" کے قلم کے ہیں،

صحیفہ" اہل حدیث" جماعتِ اہل حدیث کا آرگن ہے جس کی بنا حضرت مولانا حافظ ابو محمد عبد الوہاب محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے رکھی تھی، اور اُن کی وفات کے بعد بھی یہ کارِ خیر جاری ہے اور یہ مجلہ اپنی روایات کو قایم رکھے ہوئے ہے!

اس کساد بازاری اور اقتصادی بحران کے زمانہ میں اتنا ضخیم نمبر نکالنا، اس بات کی دلیل ہے کہ صحیفہ" اہل حدیث" کے ترتیب دینے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی" احادیث" سے کس درجہ شغف رکھتے ھیں، اور فتنۂ انکارِ حدیث نے اُن میں کس قدر احساسِ ذمّہ داری پیدا کر دیا ہے، دین و سنت کی اس مدافعت پر اللہ تعالیٰ انکو اجر عطا فرمائے گا۔

" حدیث نمبر" میں سبھی طرح کے مضامین ہیں، بلند بھی اور پست بھی، افسوس ہے کہ مضامین کے انتخاب پر توجہ ہی نہیں دی گئی، جس نے جو لکھ کر بھیجدیا چھاپ دیا گیا! سرِورق پر مولانا عبد الوہاب صاحب مرحوم کے نام کے ساتھ " الحاج " دیکھ کر شدید حیرت ہوئی" اہلِ حدیث" حضرات کا مسلک تو ان رسمی باتوں اور اس قسم کے حشو و زواید سے بلند ہے بلکہ یہی احتیاط اُن کا طرۂ امتیاز بھی ہے، صحابۂ کرام، تابعین، تبع تابعین اور اُس کے بعد کے ادوار میں صدیوں تک ناموں کے ساتھ " حاجی " یا " الحاج " کا لقب نہیں ملتا، یہ تو بہت بعد والے عجمیوں بلکہ غالباً ہندستانی مسلمانوں کی ایجاد ہے، اگر فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد" حاجی " اور" الحاج " کا خطاب اور لقب دیا جا سکتا ہے تو پھر نماز پڑھنے والوں کے ناموں کے ساتھ" نمازی" اور زکوٰۃ دینے والے کے ناموں کے ساتھ" زکاتی" بھی لکھا اور بولا جا سکتا ہے —— پھر اہلِ عجم نے اس میں بھی ایک اور امتیاز قایم کیا کوئی بیچارہ معمولی مسلمان حج کر آیا تو اُسے" حاجی " کہنے لگے اور کسی باوقعت مسلمان کو یہ سعادت نصیب ہوگئی تو اُسے" الحاج " کا لقب دیا گیا، چنانچہ ہمارے وزیرِ اعظم جناب خواجہ ناظم الدین صاحب اسی بنا پر" حاجی" نہیں" الحاج " ہیں!

" حدیث نمبر" میں ناموزوں اور بحر و وزن سے خارج اشعار دیکھ کر، ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی" . . . "

زہے لطف و کرم الٰہی پائیں یہ رنگِ قبول[۱]	پھول ہم نے کچھ چنے ہیں اُن کی تواضع کیلئے ہیں (صفحہ ۲۹)
کوچۂ مذہب شخصی کی سہوں کیوں تنگی	چھوڑ کر ایسے لق و دق کا میدانِ حدیث
اتنی شیخی نہ کرو پڑھ کے زبانِ فرنگی	ابھی جا کر کہیں کیجئے گردانِ حدیث (صفحہ ۵۳)
مغربی تہذیب کا یہ قاعدہ ملعون ہے	عقل ہے ہر معاملہ میں پیشوا انسان کا
بس محمدؐ کی نبوت کا ہوا انکار، جب	انسان بن جاتا ہے پورا خادم شیطان کا (صفحہ ۴۶)

اس قسم کی بے تکی نظموں نے " حدیث نمبر" کی ادبی ساکھ کو بڑا نقصان پہونچایا ہے، رسالہ کے مرتبین اور منتظمین کو چاہئے تھا کہ وہ نظموں کے انتخاب کا کام کسی شاعر یا صاحبِ ذوق کے سپرد کر دیتے۔

ایک مضمون کا عنوان ہے :—

[۱] اس کو کتابت کی غلطی پر بھی محمول نہیں کیا جا سکتا، اور حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ رسالہ کے فاضل مدیر نے " افتتاحیہ" کو اس شعر پر ختم کیا ہے!

حدیثِ نبیؐ کا بلند ترین شرف ———— قیل غبی کا سخت ترین تلف

اس "عنوان" کو پڑھ کر کوئی اہلِ ذوق مشکل ہی سے ہنسی ضبط کر سکے گا ——— اس مضمون کی عبارت کا ایک اقتباس ہم یہاں درج کرتے ہیں :-

"متلاشیانِ حق کی تمنا و اصرار نے خیال جازم پیدا کر دیا کہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و عظمت کے متعلق مختصر مضمون مدلل سپرد قلم کروں، جس میں صحیح بخاری وغیرہ کتب حدیث کے سطح حقیقت سے الزاماتِ مخالفین و اعتراضاتِ منکرین حدیث و شبہاتِ معاندین کے گرد و غبار کو دور کر کے علم حدیث کے چہرے کا نکھرا ہوا رنگ اہلِ بصیرت کو نظر آ جائے اور گرم جوش و منچلے حریفوں کو طنطنۂ کوس و جلال سے آشنا کرے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (صفحہ ۵۸)

"حدیث نمبر" کے کئی مضامین میں انشا کا یہی رنگ جھلکتا ہے اور ایڈیٹر نے "کلامِ اوّل" کے عنوان سے جو "افتتاحیہ" تحریر فرمایا ہے، اُس میں بھی نگارش کا یہی عجیب و غریب انداز پایا جاتا ہے!

ہم "کھنڈر" کی جمع "کھنڈرات" ہی کو رو رہے تھے کہ "حدیث نمبر" کے صفحہ ۸۴ پر "بکواس" کی جمع "بکواسات" نظر سے گزری، اور وجدان تلملا کر رہ گیا، پورا جملہ اس طرح ہے :-

"یہ ایسی بکواسات ہیں جن کا ذکر کرنا بھی حلال نہیں۔ ۔ ۔"

"ذکر کرنا بھی جائز نہیں" یا "مناسب نہیں" لکھنا چاہئے تھا۔ "حلال" یہاں بالکل غلط استعمال ہوا ہے۔

صفحہ (۲۹۳) پر ایک جملہ کتنا غیر ادیبانہ بلکہ بازاری قسم کا ہے :-

.... سنہرے شاہی ڈنڈے ہاتھ میں لے کر یہ گاتے پھرتے ہیں

مجرد سب سے اعلیٰ ہے   نہ جورو ہے نہ سالا ہے

"منکرینِ حدیث" کے یہاں اچھے اچھے انشاپرداز موجود ہیں، جو سلیقہ کے ساتھ اظہارِ خیال کرتے ہیں، اُن کے توڑ کیلئے اُن کی ٹکر کے انشاپرداز ہونے چاہئیں، ورنہ حدیث کی حمایت میں اُن لوگوں کے مضمون چھاپ دینے سے جو سرے سے انشاپرداز ہی نہیں ہیں ——— "فتنۂ انکارِ حدیث" کو اور تقویت پہونچ جانے کا قوی اندیشہ ہے، حیرت ہے کہ لکھے پڑھے لوگ اپنی صلاحیتوں کا غلط اندازہ کرتے ہیں اور اپنے حدود نہیں پہچانتے!

احادیث کی مدافعت کے ضمن میں "ائمہ اربعہ" اور مسلکِ "تقلید" پر خاص طریقے سے "احناف" پر طنز کی گئی ہے، یہ نہ ہوتی تو اچھا تھا، اس لئے کہ "حدیث" کی حمایت وہ متفقہ محاذ ہے جس پر تمام مسلمان جمع ہیں، ایسی حالت میں "فصل" کے مقابلہ میں "وصل" کو ترجیح دینا چاہئے!

"حدیث نمبر" میں بعض مضامین کام کے بھی ہیں، لکھنے والوں نے بڑے پتہ کی باتیں کہی ہیں اور جو کچھ لکھا ہے

خلوص و محبت کے ساتھ لکھا ہے ــــــــــ ایک مضمون جس کا عنوان :-

"امام زہریؒ کا شجرہ نسب"

ہے فاضل مضمون نگار نے مولانا تمنا عمادی کے مضمون کے جواب میں لکھا ہے وہ معلومات آفریں ہے، تمنا عمادی صاحب کچھ دنوں سے حضرت امام ابن شہاب زہری کو مجروح کرنے اور اُن کی علمی حیثیت کو گرانے اور مشتبہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، انھوں نے امام الحدیث حضرت ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں یہ تحریر کیا تھا کہ وہ "بنو زہرہ" سے نہیں بلکہ "موالی بنو زہرہ" سے تھے! فاضل مضمون نگار نے خاندانی شجرہ اور نسب نامہ درج کر کے مولانا تمنا عمادی کے اس اعتراض کو غلط ثابت کیا ہے ــــــــــ جناب تمنا صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ "جاہلیت میں "شہاب" نام کا کوئی شخص ہی نہیں ملتا اور نہ صحابہ کرام میں اس نام کا کوئی صحابی نظر آتا ہے" ... مولانا عبداللہ صاحب لاپلوی نے مستند کتابوں کا حوالہ دیکر تین صحابیوں کا ذکر کیا ہے جن کے اسماء گرامی "شہاب" تھے اور "حماسہ" کا ایک شعر تک درج کر دیا ہے، جس میں "حارث بن شہاب" کا نام جاہلی شاعر ربیعہ نے اپنے شعر میں نظم کیا ہے ــــــــــ انھی مولانا تمنا عمادی کا طویل مضمون "جمع قرآن" رسالہ "طلوعِ اسلام" میں شائع ہوا ہے، اس میں امام ابن شہاب زہری پر شدید جرح اور سخت نکتہ چینی کی گئی ہے اس مضمون کا جواب تو علماء کرام دیں گے ہم تو یہ جانتے ہیں کہ جن تمنا عمادی صاحب نے ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ سے بے بنیاد اور غلط سلط باتیں منسوب کرنے سے گریز نہیں کیا، اُنھوں نے اِس مضمون میں بھی نہ جانے کیا کیا شوشے چھوڑے ہوں گے۔

"حامیان حدیث" کی خدمت میں ایک بات ہمیں عرض کرنی ہے اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "حدیث" یقیناً دین و شریعت میں "حجت" ہے اور دین کی عمارت کتاب و سنت ہی کے ستونوں پر قایم ہے، مگر "انکار حدیث" کی مخالفت کے ساتھ حدیث کی حمایت میں "غلو" مناسب نہیں ــــــــــ مواہب لدنیہ، زرقانی اور نزہۃ المجالس تو سب نیچے درجہ کی کتابیں ہیں، خود صحاح ستہ بلکہ صحیحین کی بعض احادیث پر اسناد و رواۃ اور درایت و روایت کے اعتبار سے گفتگو کی جاسکتی ہے اور اس کا امکان ہے کہ بخاری اور مسلم (رحمہما اللہ تعالیٰ) نے پوری نیک نیتی اور ممکنہ تفحص اور چھان بین کے بعد بعض ایسی حدیثوں کو اپنے مجموعہ میں شامل کر لیا ہو جن کی کمزوریاں اُن پر ظاہر نہ ہو سکیں۔

اسٹوڈنٹس وائس پندرہ روزہ "STUDENTS' VOICE" ایڈیٹر :- خورشید احمد اور ظفر اسحاق انصاری سالانہ چندہ (سولہ اشاعتوں کیلئے) صرف ایک روپیہ، ایک پرچہ کی قیمت (انگریزی) ایک آنہ، ملنے کا پتہ :- ۱۸/۱۲ بندر روڈ، کراچی ــــــــــ یہ جریدہ "اسلامی جمعیۃ الطلبہ" کے افکار و معتقدات کا ترجمان ہے اور چونکہ اسلامی جمعیۃ الطلبہ کے افکار و تصورات کا مرکز "کتاب و سنت" ہے، اس لئے "اسٹوڈنٹس وائس" کے مضامین میں اسلام اور اخلاق ہی کے جلوے نظر آتے ہیں۔

اس لذت پرست دور میں جبکہ بڑے بوڑھے حرص و ہوس کا شکار اور نفس کی لذتوں میں ڈوبے ہوئے ہیں، تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کا پاکبازی کی زندگی بسر کرنا اور اخلاق و تقویٰ کی دعوت دینا، پاکستان ہی نہیں بلکہ اسلام کے مستقبل کیلئے فال نیک ہے، وقت آرہا ہے بلکہ بہت جلد آنے والا ہے کہ اسی اخلاق عزیمت اور سیرت و کردار کے نوجوانوں کے ہاتھوں میں زمام کار ہوگی، اسلام پسند طلبہ کا یہی وہ "مقدمۃ الجیش" ہے، جو اسلامی حکومت اور نظام حق کے قیام کے لئے سب سے پہلے جاہلیت اور باطل کے مورچوں کو سر کرے گا۔

"اسٹوڈنٹس وائس" کی اشاعت میں حیرت انگیز طریقہ پر اضافہ ہو رہا ہے اس کی مانگ بڑھتی ہی جا رہی ہے، اس کے مضامین اپنے تنوع اور زبان کی سادگی و پرکاری کے سبب دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں، "اسلامی جمعیۃ الطلبہ" کو ہم اس دینی جدوجہد اور علمی و ادبی مساعی پر مبارکباد دیتے ہیں، یقین ہے کہ "اسٹوڈنٹس وائس" کی "آواز" پر ہر طرف سے "لبیک" کی صدائیں بلند ہوں گی یہاں تک کہ جاہلیت کا شور بالکل دب کر رہ جائے!

پندرہ روزہ "یقین" "یقین" (*yaqeen*) سالانہ چندہ چار روپیہ، ایک پرچہ کی قیمت (انگریزی) تین آنہ، ملنے کا پتہ:- دار التصنیف لمیٹڈ فریر روڈ، کراچی،

یہ پندرہ روزہ جریدہ دار التصنیف لمیٹڈ (کراچی) کا آرگن ہے، جو ٹائپ، اور قرطاس و طباعت کی خوبیوں کے ساتھ ہر مہینہ کی ۷، اور ۲۲ر تاریخ کو ایمان کے پھول برساتا اور یقین کی روشنی بکھیرتا ہوا منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتا ہے، "یقین" اس الحاد و انکار اور مادیت و لذتیت کے عہدِ نامسعود میں اسلامی افکار کا داعی اور اخلاق و انسانیت کا علمبردار ہے، اس مجلّہ کی سب سے بڑی خوبی اور خدمت یہ ہے کہ اس میں خود مغربی اہل فکر، مورخین، ماہرین اجتماعیات اور سائنسدانوں کی تحریروں کے وہ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، جن میں مغربی تہذیب و تمدن کی خرابیوں اور معصیت آلودگیوں پر طنز و تنقید ہوتی ہے۔

ہم "یقین" کی درازی عمر اور استحکام و بقا کی دعا کرتے ہیں، خدا کرے یہ پندرہ روزہ سے "روزانہ" ہو جائے، تاکہ "سول ملٹری" اور "ڈان" جس مغرب زدہ فکر کو پاکستان میں پھیلا رہے ہیں، اس کا ہاتھ کے ہاتھ جواب دیا جاسکے! دین و شریعت کو ان مغرب پرستوں نے "ملّا ازم" کا نام دیدیا ہے، انگریزی زبان سے شغف رکھنے والے "یقین" کو پڑھ کر دیکھیں کہ جن دین دار لوگوں کو "ملّا" کہا جاتا ہے، وہ کس قدر متنور الفکر ہیں، اور تاریخ و نفسیات، اجتماعیات اور وسعت مطالعہ میں ان "ڈاروِن زدوں" سے کسی طرح گھٹ کر نہیں ہیں!

"مشیر" افسانہ نمبر "مشیر" افسانہ نمبر مرتبہ:- عبد الغفور بیگ، ضخامت ۲۰۰ صفحات، قیمت ایک روپیہ چار آنہ، ملنے کا پتہ:- دفتر "مشیر" بندر روڈ، کراچی ۲

اس خراب ماحول میں جہاں "ادب" پر لذتیت مسلط ہے اور پورا معاشرہ اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے

فاران
ماہر القادری

جلد ۴ ــــــ شمارہ ۷

ماہنامہ

فاران

اکتوبر سنہ ۱۹۵۲ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۹ آنے

۸ روپے (ہندستانی) فی پرچہ ۱۱ آنے

دفتر فاران

کیمبل اسٹریٹ

کراچی ۱

نظم و ترتیب

حصۂ نظم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نقشِ اول

اگر نعرۂ حق بلند کرنے اور " لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ " کہنے کے ساتھ ہی کامیابی ہوجایا کرتی، تو اس کامیابی کے سب سے زیادہ مستحق انبیائے کرام علیہم السلام تھے، جو اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ محبوب، پسندیدہ اور برگزیدہ بندے تھے، " کُن " کہا اور فی الفور " سب کچھ ہوگیا " یہ صرف خالقِ کائنات ہی کی صفت ہے، بندوں کو یہ اختیار نہیں دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کسی کے ارادے اور تمنا کی پابند نہیں ہے، چاہے وہ ارادہ کتنا ہی محترم اور وہ تمنا کتنی ہی مقدس کیوں نہ ہو۔

تاریخ و سیر اور مقدس نوشتے ہمیں بتاتے ہیں کہ بعض نبیوں نے دو چار سال نہیں مدتوں تبلیغ حق کی ہے مگر حالات میں خاطر خواہ تبدیلی نہیں ہوئی، معاملہ اسی نوبت پر ختم نہیں ہوجاتا اعلاء کلمۃ الحق کے جرم میں کسی کو آرے سے چیر گیا، کسی کو کانٹوں کا تاج پہنایا گیا، اور صلیب مُرٹی کی گئی، کسی کے واسطے آتش کدے بھڑکائے گئے، بہت سوں کو نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کیا گیا مگر چشمِ آفتاب اس کی گواہ ہے کہ ان تمام آتشیں امتحانوں اور جان لیوا آزمائشوں کے ہجوم میں ان میں سے کسی ایک کا قدم بھی صراطِ مستقیم سے بال برابر ادھر سے اُدھر نہیں ہوا، پھر حق کی اس آواز کے مخاطب صرف عوام ہی نہ تھے اور نہ پیغام صومعوں، خانقاہوں اور دینی درس گاہوں تک محدود تھا، ان نفوسِ قدسیہ میں بعض نے تو اپنے دور کے سب سے بڑے باجبروت بادشاہوں کے درباروں میں جا جاکر حق کی آواز بلند کی ہے، نمرود کا دربار کوئی معمولی دربار تھا، اس شہنشاہِ مطلق العنان کے ایک ذرا سے اشارے پر گردنیں بے سر جدا کر دئے

جاتے تھے، حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے بھرے دربار میں نہ صرف یہ کہ حق کو پیش فرمایا بلکہ شہنشاہ سے "دوبدو" مجادلہ" بھی کیا، شہنشاہ کی بے سروپا دلیلوں کی محکم استدلال سے پُرزور تردید کی، نمرود جس کے سامنے لوگ سجدہ ریز ہوتے تھے، جو اپنی رعایا کا "معبود" بنا ہوا تھا اُس کو زندگی میں سب سے پہلی بار ایسے بیباک حق شناس اور حق گو سے سابقہ پڑا، اُس کے عتاب کا نہ جانے کیا عالم ہوگا مگر کوئی خوف اللہ کے خلیلؑ کو کلمۂ حق کہنے سے باز نہ رکھ سکا ——— اسی فریضہ کو حضرت سیدنا موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرعون کے دربار میں ادا فرمایا، موسیٰ کلیم اللہ یکہ و تنہا تھے، اور اُدھر بڑے نامی گرامی جادوگر تھے، کاہن تھے، درباری اور حالی موالی تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود شہنشاہ فرعون تخت شاہی پر پورے جاہ و جلال کے ساتھ متمکن تھا لیکن سچائی اس ہیبت ناک ماحول میں بھی اپنی ذمہ داری کو انجام دیتی رہی۔

خدا کا وہ محترم نبی جو حقیقت میں خلاصۂ کائنات اور فخرِ موجودات تھا جس سے بہتر انسان پر آفتاب طلوع ہی نہیں ہوا، جب وہ تشریف لایا تو پھر کسی کے آنے کی ضرورت ہی نہیں رہی، نبوت اُس کی ذات قدسی صفات پر ختم کر دی گئی اور رسالت کے عہدے ہی کو توڑ دیا گیا، اُس کی محبوبیت کا بھلا کوئی اندازہ کر سکتا ہے؟ نہیں کر سکتا اس لئے کہ اُس کا ہر وصف بے حد و بے قیاس ہے، اس ساڑھے تیرہ سو برس میں حضورؐ ختمی مرتبتؐ کے نظم و نثر میں جتنے بھی مناقب بیان کئے گئے ہیں وہ خدا کی قسم حضورؐ کی ایک ادنیٰ ادا کا بھی حقِ تحسین ادا نہیں کر سکے ——— یہ شان، یہ بلندی، اس قدر محبوبیت اور اللہ کے دربار میں اس درجہ مقبولیت مگر تہمتوں اور گالیوں سے لے کر پتھروں کی نوکوں اور تلوار کی ضرب تک وہ کونسی آزمائش اور دردناکی ہے جس سے حضورؐ دوچار نہیں ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن صبر آزما بلکہ روح فرسا حالات کی تبدیلی کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا بھی فرماتے تھے مگر ایسا نہیں ہوا کہ آپؐ نے اِدھر دُعا کی اور اُدھر آن کی آن میں تمام قریش کفر و شرک سے تائب ہو کر ایمان اور اسلام سے مشرف ہو گئے، حضورؐ کی دُعا سے بڑھ کر اور کس کی دعا مستجاب ہو سکتی ہے مگر حضورؐ نے صرف دُعا پر اکتفا نہیں فرمایا، دُعا کے ساتھ تدبیر بھی کی اور جد و جہد کو اس کی آخری منزل تک پہونچا دیا، ایک طرف محبوبیت اور مقبولیت کا یہ عالم کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کی اطاعت کو "اپنی اطاعت" فرمایا، اور دوسری طرف جد و جہد، سعی و عمل، اسباب کی دنیا اور حق و باطل کی کشمکش میں یہ منظر بھی چشمِ فلک نے دیکھا ہے کہ غزوۂ خندق میں حضورؐ کے چہرۂ اقدس اور جبینِ سعادت سے گرم گرم لہو ٹپک رہا ہے ——— فتح مکہ صرف دُعاؤں سے ظہور میں نہیں آ گئی اس کے لئے پہلے بدر و اُحد کے میدان گرم ہوئے ہیں، حق پرستوں نے سینوں پر زخم کھائے ہیں اور شہادت کے جام نوش کئے ہیں جب کہیں جا کر کفارِ قریش کا زور ٹوٹا ہے اور باطل سرنگوں ہوا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف "فتح و نصرت" کے لئے حق و باطل کی اس معرکہ آرائی میں شرکت نہیں فرمائی تھی، اگر "اُحد" جیسی ہزار شکستوں سے بھی دوچار ہونا پڑتا اور فتح و غلبہ کی نوبت ہی نہ آتی تو بھی حضورؐ تبلیغ حق اور اللہ کے دین کو برپا کرنے کی کوشش کو جاری رکھتے۔

پس جہاں بھی حق و باطل کی کشمکش جاری ہے، جاہلیت اسلام سے ٹکرا رہی ہے اور ظلم انصاف سے لڑ رہا ہے، وہاں کے حق پرست کارکنوں کو اپنی جد و جہد کا معیار فتح و کامیابی کو نہیں اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کو بنانا چاہئے، یہ تو اللہ تعالیٰ کا مزید احسان ہے کہ وہ حق پرستوں کے لئے فتح و کامیابی کے اسباب بھی مہیا کر دے مگر یہ

تو یہ ہے ـــــــ اور "وہ" تو "وہ" نہیں یہی سچ ہے ـــــــ کہ اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے جدوجہد ہی خود اپنی جگہ سب سے بڑی کامیابی ہے، اس منزل میں غبار بن کر اڑ جانا ہی فوز و سعادت ہے!

"فتح و نصرت" کی اہمیت اور اُس کی ضرورت کے ہم منکر نہیں ہیں، جنگیں ہارنے کے لئے نہیں، جیتنے کے لئے ہی کی جاتی ہیں، کامیابی کے یقین اور فتح کی اُمید کے ساتھ ہی منزل میں قدم بڑھانا چاہیے، مگر حق پرستوں کا مقصود کامیابی نہیں بلکہ صرف اللہ کی خوشنودی اور اُس کی رضا ہوتی ہے، حق کے راستہ میں چاہے فتح نصیب ہو یا شکستیں پیش آئیں، مگر جاری بہر حال اسی کام کو رکھنا ہے۔

تاریخ کا ایک غبی سے غبی طالب علم بھی اس واقعہ کو جانتا ہے کہ "خیبر" حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دست حق پرست پر فتح ہوا اور اس فتح کا سہرا شیر خدا ہی کے سر پر بندھا تھا ـــــــ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا حسینؓ ابن علیؓ کی پیشانی اس سہرے سے خالی تھی؟ حضرت حسینؓ نے کہا تھا بلکہ دعویٰ فرمایا تھا کہ یہ سر کٹ جائے گا مگر باطل کے آگے جھکے گا نہیں، ہاتھ قلم ہو سکتے ہیں لیکن ایک جابر ... کی بیعت نہیں کر سکتے، تو حسینؓ ہی کا کہا پورا ہو کر رہا، سر واقعی تن سے جدا ہو گیا مگر باطل کے سامنے خم نہیں ہوا، ہاتھ قلم ہو گئے لیکن یزید کی بیعت سے آلودہ نہیں ہوئے، مولانا محمد علی مرحوم کی قبر پر اللہ کی رحمت سدا شبنم فشانی کرتی رہے، کتنی سچی بات کہہ گئے ہیں۔

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

کیا عجب ہے کہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر یہ شعر جس وقت کہہ رہے ہوں تو تھوڑی دیر کے لئے حقیقت کے چہرے سے تمام حجابات اُٹھا دئے گئے ہوں!

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء کرام کی سُنت یہ رہی ہے کہ ان نفوس قدسیہ نے نمازیں بھی پڑھی ہیں، روزے بھی رکھے ہیں اور دعائیں بھی مانگی ہیں، مگر معاملہ اسی نوبت پر ختم نہیں ہو گیا، ان عبادات کے جلو میں سعی و عمل، جدوجہد اور عزیمت و حرکت کا قافلہ بھی رواں دواں رہا ہے، جس نے کعبہ کو تعمیر کیا تھا اور جس کے مقام عبادت کو اللہ تعالیٰ نے "مصلیٰ" بنا دیا اُس نے بت کدۂ آذر میں بت شکنی بھی کی تھی اور نمرود کی جھوٹی ربوبیت کو چیلنج بھی کیا تھا، جس کو خدا نے کوہ طور پر شرفِ تکلم سے نوازا تھا، اُس نے فرعون کے جرار لشکر سے ٹکر بھی لی تھی، اور جو رات رات بھر نماز میں کھڑا رہتا تھا، یہاں تک کہ پائے مبارک ورم کر آتے تھے، اُس مقدس ترین انسان نے بدر و حنین میں فوجوں کی قیادت بھی کی ہے، مگر مسلمان صرف تسبیح و صلوٰۃ اور رکوع و سجود ہی میں گم ہو کر رہ جاتے تو عرب و عجم میں اسلام کا غلبہ کس طرح نصیب ہوتا، اور مجاہدینِ اسلام اگر حوصلے سے کام نہ لیتے تو قیصر و کسریٰ کے تخت نہ جانے کب تک بچھے رہتے، مدائن کے دروازے کون کھولتا اور مصر کی فصیلوں پر اسلام کا پرچم کس طرح لہراتا۔

پس نماز کو قائم کرنے والے اللہ کے پورے دین کو قائم کرنے کے فریضہ کو بھی محسوس کریں، یہ سیاست اور دنیا داری کی بات نہیں ہے بلکہ یہ بھی دین ہی کا کام ہے، مسلمان کی غیرت اسے برداشت کیسے کر سکتی ہے کہ دنیا کے قانون دانوں اور دستور سازوں کے بنائے ہوئے دستور اور قوانین تو چلتے رہیں مگر اللہ کا قانون معطل پڑا رہے، یہ مجرمانہ غفلت ہے، کمزوری ہے ارادے کی بھی اور ایمان کی بھی!

عتیق فکری

قرآن غیروں کی نظروں میں!

انسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے کیا کیا کوششیں ہو رہی ہیں اور کیسی کیسی اسکیمیں تیار کی جا رہی ہیں مگر مسائل سلجھنے کے بجائے اور اُلجھتے جا رہے ہیں، ایک شدید کشمکش ہے جو مشرق کے اِس سرے سے لیکر مغرب کے آخری کونے تک جاری ہے، ساری دنیا ذہن و فکر کے شدید بحران میں مبتلا ہے، سائنس کی ترقیوں کی کوئی انتہا نہیں ہے مگر انسانیت پست تر ہوتی چلی جا رہی ہے

جہل خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

ہم پوری بصیرت کے ساتھ کہتے ہیں کہ فکر و عمل کی زمام جب تک صالح، خدا شناسوں اور نیکو کاروں کو نہ سونپی جائے گی اُس وقت تک خدا کی زمین فساد و طغیان سے محفوظ نہیں رہ سکتی اور یا انتشار دور نہیں ہو سکتا!

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مسلمانوں کے زوال سے انسانی معاشرے کو بہت نقصان پہونچا!

مسلمانوں کا سسلی اور سپین سے اخراج اور زوال یورپ کے لئے بہت کچھ باعثِ انتشار ثابت ہوا، مسلمانوں کے صحت مند افکار اور زندگی بخش معتقدات یورپ پر برابر اپنا اثر ڈالتے رہے، جس سے یورپ کی سوشل لائف اور تمدنی طریق کار میں کافی تبدیلی ہو گئی تھی!

مسلمانوں کو یورپ سے کیوں نکلنا پڑا؟ یہ ایک اندوہ ناک داستان ہے جس کے چھیڑنے کا یہ محل نہیں ہے، بہر حال یہ تو بدیہی بات ہے کہ کوئی قوم مغلوب ہی اُس وقت ہوتی ہے جب اُس میں کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں، تو مسلمان یورپ کی سرزمین سے اپنی کمزوری کے سبب نکلے، پہلے انھوں نے سسلی کو چھوڑا اور پھر اسپین اور دوسرے مقامات سے اُن کو دیس نکالا ملا، یورپ سے مسلمانوں کے نکلتے ہی وہاں کے افکار و معتقدات کو زبردست دھچکا لگا، بعض لوگ دہریت کا شکار ہو گئے اور بعض کے نزدیک خدا کا وجود ایک ابہام اور معمہ بن کر رہ گیا۔

آخر کار اس تضاد نے یورپ کے انسانوں کو ایک نئے انقلاب کے دوراہے پر لا کھڑا کیا، اس انقلاب میں کیا ہوا؟ اس تفصیل کے لئے وقت درکار ہے، رفتہ رفتہ ذہنی انتشار اور بھی بڑھتا گیا، معاشی ناہمواری، طبقاتی کشمکش اور سرمایہ داری نے پوری قوت کے ساتھ پر پُرزے نکالے، مشینوں نے مزدور کی ہستی کو ختم کر کے رکھ دیا،

مارکس اسی تضاد کی پیداوار تھا، جو صرف نان و شکم کا ہو کر رہ گیا، اس یہودی نے وہ فتنہ اُٹھایا کہ آج اسلام کے سوا، ساری دنیا اس فتنہ سے کانپ رہی ہے!

یہ اسلامی تہذیب و تمدن اور اخلاق و معاشرت کے اُصول تھے جس نے یورپ اور ہندوستان وغیرہ ملکوں کے غیر فطری معاشرتی اور عمرانی اُصولوں پر اثر ڈال کر ایک حد تک ان کی اصلاح کی اور آج یہ قومیں دنیا میں اس قابل ہیں کہ انہیں قابلِ تذکرہ سمجھا جائے۔ ورنہ ہندوستان اور یورپ کی جو حالت تھی، وہ کسی تاریخ کے طالب علم سے چھپی ہوئی نہیں ہے، یہ کوئی مبالغہ آرائی یا حکایت و فسانہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ اسلامی اُصولوں نے غیر مسلم قوموں پر جو اثرات چھوڑے ہیں اس کی جھلک اُن میں صاف نظر آتی ہے۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ اسلامی اصولوں میں اتنی قوت اور جاذبیت کیوں تھی اور وہ اُصول کیسے تھے اُن کا تعلق بنی نوعِ انسان کے فطری تقاضوں سے کتنا قریب اور ہم آہنگ تھا اس کا اگر سراغ لگانا ہو تو قرآن کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ ۔۔ ۔۔ اور پھر اُن تمام اصولوں کو جانچنا ہوگا کہ کیا واقعی یہ اصول انسان کے مطابق فطرت تقاضوں کو پورا کرنے اور بنی نوع انسان کی فکری اور عملی قوتوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ یہ بحث خود ایک مستقل موضوع کی محتاج ہے، ہم یہاں یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ دنیا میں قرآن کس طرح پھیلا؟ اس ضمن میں قرآنی تراجم کا بھی اجمالی ذکر آئے گا اور اشاعتِ قرآن کی مختصر سی تاریخ سے قارئین روشناس ہو جائیں گے۔

رسول اللہ صلی علیہ وسلم ہی کے مُبارک عہد میں حفاظِ قرآن غیر اسلامی ممالک میں پھیل چکے تھے لنکا سے لیکر اسپین کی وادیوں تک پہلی صدی ہجری میں قرآن کتابی شکل میں اپنے قاریوں کے ساتھ پہونچ چکا تھا اور حق کا پیام ذوق و شوق کے ساتھ سُنا جاتا تھا، مسلمان بادشاہوں نے بھی اپنی تمام غفلتوں کے باوجود اشاعتِ قرآن میں پوری قوت صرف کی ولید بن عبدالملک کے عہدِ حکومت میں قرآن اسپین۔ ۔۔ چینی ترکستان افریقہ ہندوستان وغیرہ ملکوں میں پہونچ چکا تھا اِسی طرح سوڈان اور مڈغاسکر سے قرآن بورنیو تک پہونچا اور جاوا سماترا کے بسنے والے بھی قرآن سے روشناس ہوئے، ۔۔۔ سسلی اور اسپین وغیرہ ملکوں میں جب دارالعلوم قایم ہوئے تو یورپ والوں نے اسلامی تعلیمات کے اثرات قبول کئے، ۔۔ یہاں تک کہ لوتھر جیسا انقلابی انسان انھی اسلامی درسگاہوں سے فیض یاب ہو کر قرآن کو جرمنی کی طرف لے گیا اور وہاں پر اُس نے لاطینی ترجمہ کی مدد سے جو مترجم قرآن اُس کے پاس تھا جرمنی زبان میں ترجمہ کیا۔ ۔۔ اور قرآن کی تعلیم سے متاثر ہو کر پروٹسٹنٹ فرقہ کو زندگی بخشی، اور تثلیث کی مخالفت کی اور پاپائے روم سے کفر کا فتویٰ اپنے حق میں حاصل کیا۔ قرآن کے ترجمے یورپ کی تمام زبانوں میں بارھویں صدی میں شروع ہو گئے تھے۔ ۔۔ خود گوئٹے جیسا مفکر اِس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ قرآن کے مطالعے نے مجھے فاؤسٹ (ڈرامہ) لکھنے پر مجبور کیا اور اِس ڈرامہ کے لکھتے وقت قرآن اور حضور اکرمؐ کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا۔ ۔۔ ۔۔ قرآن ہی کے مطالعہ کی بدولت اُس نے تعدادِ ازدواج کی حمایت کی اسی مفکر نے قرآنی تعلیم پر گفتگو کرتے ہوئے ایکرمن صاحب سے کہا تم دیکھتے ہو کہ اس قرآن کی تعلیم کو کبھی ناکامی کا منہ دیکھنا نہیں پڑا اپنے تمام نظام ہائے تعلیم سمیت ہم کوشش کریں تو اس تعلیم سے آگے نہیں بڑھ سکتے اور عمومی نظر سے دیکھا جائے تو اس تعلیم سے تجاوز کرنے کی کسی شخص میں طاقت نہیں!

اسی طرح مشرقی یورپ میں قرآن ترکوں کی بدولت پہونچا۔۔ ۳۵۰ھ میں چینی ترکستان میں قرآن کی اشاعت زوروں

پرستی وہاں کا بادشاہ بغراخاں قرآن کو ہر وقت سینے سے لگائے رکھتا تھا، اُس نے اسلام قبول کر کے اپنا نام عبدالکریم ستوق خاں رکھا۔ . . . اس علاقہ میں عرب تاجروں نے بھی خوب قرآن کی اشاعت کی، بلغاریہ میں قرآن کی اشاعت پہلے تاجروں کے ذریعہ ہوئی اور وہاں کے لوگ بھی تاجروں کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے جب خلیفہ مقتدر باللہ کو اس بات کا پتہ چلا تو ایک سفیر جو عالم بھی تھا بلغاریہ روانہ کیا تاکہ جو روسی اسلام لائے ہیں، انہیں اسلامی تعلیم دی جائے یہاں تک کہ کچھ عرصہ کے بعد شاہ بلغاریہ بھی مسلمان ہو گیا احمد ابن فضلان کا بیان ہے کہ جب ہم ۱۲ محرم ۳۱۵ھ میں بلغاریہ پہونچے تو وہاں کا بادشاہ اور اُمرا قرآن مجید سننے کے لئے حاضر ہوئے۔ . . . اسی طرح کریمیا اور باکو میں بھی قرآن اپنی نورانی تعلیم کا معجزہ دکھا کے رہا۔ . . . اور ۱۸۷۱ء میں قرآن چار جلدوں میں تفسیر کے ساتھ شائع ہوا، یہ تفسیر اگرچہ معاندانہ رنگ میں لکھی گئی تھی، مگر قرآن کا نور ان مصنوعی حجابوں میں نہ چھپ سکا، اور لاکھوں روسی مسلمان ہو گئے، ملکہ کیتھرائن کو اسلام سے بیر تھا لیکن اُس کی اسلام دُشمنی کے باوجود روس میں اسلام کا دھارا رُک نہ سکا، مختصر یہ کہ ۱۸۳۱ء سے لیکر آج تک ہر ملکی زبان میں قرآن کے ترجمے اور تفسیریں ہوئیں اور انشاءاللہ ہوتی رہیں گی۔ یہی قرآن کا معجزہ ہے بعض دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ غیر مسلموں نے غلط ترجمے کئے مگر لوگوں نے اُن ترجموں کو پڑھ کر اسلام قبول کر لیا۔ . . . یہ سب کیا تھا اس کا صرف ایک ہی جامع جواب ہے کہ قرآنی اصول عین فطرت انسانی کے مطابق ہیں۔ . . . جن کا اثر لوگوں پر ہوا اور ہمیشہ ہوتا رہے گا، کیونکہ یہی وہ نسخۂ کیمیا ہے جو مس خام کو پیچ مچ کندن بنا دیتا ہے۔

یورپ کے محققین اور مفکرین نے قرآن کو پڑھ کر کیا تاثر قبول کیا، اُس کے اقتباسات ہم یہاں پیش کرتے ہیں:۔

ڈاکٹر مورتیس فرانس کے نامور اہل قلم مستشرق اور عربی علوم کے ماہر جنہوں نے فرانس گورنمنٹ کے ایما سے قرآن کریم کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ . . . اپنے ایک مضمون میں جو "لا مدول فرانسیسی رومان" میں شائع ہوا۔ . . . ریناشش نامی مترجم قرآن کے لغو اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ . . .

قرآن کیا ہے؟ قرآن کی اگر کوئی تعریف ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ جس میں کسی طرح کا نقص نہ نکل سکتا ہو تو وہ اُس کی فصاحت و بلاغت ہے۔ وہ عظیم الشان فضیلت جس پر چالیس کروڑ انسان فخر کر رہے ہیں وہ یہی ہے کہ مقاصد کی خوبی اور مطالب کی خوش اسلوبی کے اعتبار سے یہ کتاب تمام آسمانی کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قدرت کی ازلی عنایت نے انسان کے لئے جو کتابیں تیار کی ہیں اُن سب میں قرآن بہترین کتاب ہے اس کے نغمے انسان کے خیر و فلاح کے متعلق فلاسفر یونان کے نغموں سے بڑھ کر ہیں اس میں ارض و سماء کے خالق کی حمد و ثنا بھری ہوئی ہے خدا کی عظمت سے اس کا ایک ایک حرف لبریز ہے جس نے یہ سب کچھ خلق کیا ہے۔ اور اُس کی استعداد کے مطابق رہنمائی کی ہے پھر لکھتے ہیں:۔

قرآن علماء کے لئے ایک علمی کتاب۔ . . . شائقین لغت کے لئے ذخیرۂ لغت۔ . . . شعراء[1] کے لئے عروض کا مجموعہ اور قوانین و شرائع کا ایک عام انسائیکلوپیڈیا ہے۔ . . . تمام آسمانی کتابوں میں جو حضرت داؤدؑ کے

[1] ڈاکٹر مورتیس نے قرآن کی یہ تعریف محبت اور عقیدت ہی کے ساتھ کی ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ قرآن خود اس (شاعری کی) نسبت کی نفی کرتا ہے (م۔ق)

زمانہ سے جان تالموتس کے عہد تک نازل ہوئیں کسی ایک نے اس کی ایک چھوٹی سی آیت کا مقابلہ نہیں کیا۔۔۔ پھر ایک اور مقام پر لکھتے ہیں اس لئے قرآن کی دو نمایاں حیثیتیں ہیں۔۔۔ اور ان دونوں حیثیتوں سے وہ تمام آسمانی کتابوں پر قابل ترجیح ہے، پہلی حیثیت یہ ہے کہ اس کے انتساب کی صحت میں کوئی شک وشبہ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ پیغمبر عربی سے اس کی نسبت صحیح نہیں ہے (حالانکہ توریت اور انجیل میں اس بات کی گنجایش ہے) دوسری حیثیت یہ ہے کہ قرآن کو مسلمان عربی زبان کی حفاظت وصحت کا مرجع سمجھتے ہیں اور اپنے مذہبی اصول کی تطبیق کا ماخذ جانتے ہیں۔۔ پھر لکھتے ہیں اگر رہنا مشن نے اپنی غلطیوں کی صحت کر دی تو خیالات کو روشن کرنے اور تاریکی کو مٹانے میں اِس کتاب کے ذریعہ بڑی مدد مل سکتی ہے۔۔۔

اِسی طرح ڈاکٹر موریس ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

کوئی چیز عیسائیانِ روم کو اس ضلالت وغوایت کی خندق سے جس میں وہ گرے ہوئے تھے نہیں نکال سکتی تھی بجز اس آواز کے جو سرزمین عرب میں غارِ حرا سے آئی۔۔۔ اعلاءِ کلمۃ الحق جس سے یونانی انکار کرتے جاتے تھے اسی آواز نے دنیا میں اعلان کیا اور ایسا عملی پیرایہ اختیار کیا کہ جس سے بہتر ممکن نہ تھا۔ ۔ اور ایسا سیدھا راستہ اور پاک وصاف مذہب دنیا کو سکھایا جس میں بقول فاضل محمدؐ ڈرتی گینس، پاکؐ پانی ہے نہ تبرک نہ موت نہ بیکٹر ذ سینٹ ۔۔۔ اور نہ ایسے مسائل اس میں ہیں کہ بغیر عمل کے ایمان موثر ہو۔۔۔ یہ ڈاکٹر موریس کے تاثرات تھے اب ہم ایک جلیل القدر محقق ریورنڈ آر میکسویل کنگ کی تقریر کا خلاصہ درج کرتے ہیں جو انھوں نے ۷ اربروری ۱۹۰۹ء کو قدیم پرسبی ٹرین چرچ نیو ٹونارڈ ذ میں کی تھی فرماتے ہیں۔۔۔

اسلام کی آسمانی کتاب قرآن ہے۔۔۔ جو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ نبوت کے الہامات کا مجموعہ ہے اِس میں نہ صرف مذہب اسلام کے اصول وقوانین مندرج ہیں بلکہ اخلاقی تعلیم روزمرہ کے کاروبار کے متعلق ہدایات اور قانون بھی ہیں اِس لحاظ سے مسلمانوں کو عیسائیت پر فوقیت ہے کہ اسلام کی مذہبی تعلیم اور قانون علیحدہ چیز نہیں ہیں۔ قرآن نے یہودیوں عیسائیوں زرتشتیوں کے مذہب پر پُوری پوری روشنی ڈالی ہے۔ جس طرح خدا نے یہودیوں کی زبور سے اور عیسائیوں کی انجیل سے رہنمائی کی ہے اسی طرح مسلمانوں کو صراطِ مستقیم دکھائی۔۔۔ مذہب اسلام کی بنا جمہوریت پر ہے وہ تمام بنی نوع انسان کو برابر سمجھتا ہے۔۔۔ اور انسانی روح کو ذات پاک سے بھی پیوست کرتا ہے جس سے وہ پہلے بھی گہرا تعلق رکھتی تھی۔۔۔ نیز جو اس کا اصلی منبع ہے اسلام کی جمہوری تعلیم میں ایک حصہ عورتوں کے متعلق ہے قرآن میں جہاں بھی عورتوں کا ذکر آیا ہے تعظیمی الفاظ استعمال کئے ہیں ماں سے محبت رکھنے اور اس کی تعظیم کرنے اور بیوی کے ساتھ محبت وشفقت کرنے پر پورا پورا زور دیا گیا ہے۔۔۔ پیروانِ اسلام کا حُسنِ اخلاق قابل تعریف ہے ان کا طرز عمل خدا کے احکام کے تابع ہے۔۔۔ تسلیم ورضا یعنی اپنے تمام امور خدا کے سپرد کر دینا مسلمانوں کی مذہبی زندگی کی ایک شرط ہے ۔۔۔ آگے چل کر فرماتے ہیں جو مذہب رضاء الٰہی پر راضی رہنے کی ایسی عمدہ تعلیم دے اس کے پیرو یقیناً صداقت

ؔ۱ عیسائیوں میں، اصطباغ، وغیرہ کی جو رسمیں ہیں اُن کا فاضل مصنف نے ذکر کیا ہے (م۔ق)

دوست اور انصاف پسند اور عہد کے پکے ہوں گے ۔ ۔ ۔ یہ سب کچھ قرآن سے ثابت ہو سکتا ہے اگر ہم اس کے خلاف ثابت کرنا چاہیں تو ہماری اپنی عقل ہی انکار کرے گی۔

قونصل جنرل جاپان مقیم مصر نے بندر سعید کی مسجد میں قرآن کا درس سننے کے بعد علماء کرام کے روبرو جو بیان دیا وہ اپنے اندر ایک عجیب جامعیت رکھتا ہے۔:—

اگر مسلمانان شرق و غرب احکام قرآن کی مضبوطی سے پابندی کریں اور ان پر پورا پورا عمل کریں ۔ ۔ ۔ تو یہ لازمی اور لابدی ہے کہ وہ سیاسیات اور تمام امور اجتماعی کے اندر بہت بڑی فوقیت حاصل کریں۔ کیونکہ میرا یقین ہے کہ قرآن سیاست ہائے قدیم و جدید کے خزانوں کا گنجینہ ہے اور کتب مقدسہ میں جامعیت کے لحاظ سے یگانہ اور اپنی مثال آپ ہے ۔ ۔ ۔ قرآن کریم کے ترجمے مجھ تک پہونچے ہیں اور ایک انگریزی ترجمہ اس وقت بھی میرے پاس ہے اور میں اس کے مطالعہ میں مصروف ہوں۔ اسی مقدس کتاب کی حکمت بالغہ اور تنظیم عالیہ کے مطالعہ سے میں دریائے حیرت میں ڈوب جایا کرتا ہوں ۔ ۔ ۔ میں مسلمانوں کی اس غفلت پر سخت متعجب رہتا ہوں کہ وہ امور دینی کا اہتمام اور اصول اسلامی پر عمل کما حقہ نہیں کرتے ۔ ۔ ۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر مسلمان صدق و خلوص کے ساتھ احکام اور اصول اسلام کی پابندی کریں تو یہ قوم لازماً ترقی کی انتہائی منزل تک پہنچ جائے ——— اسی طرح پارسی جماعت کے مقتدر لیڈر سر فیروز شاہ ایم۔ اے ایڈیٹر جام جم اپنی مشہور تصنیف "مذہب کی روشنی" میں لکھتے ہیں:—

قرآن مسلمانوں کی ایک مذہبی کتاب ہے اس کتاب کو جو عزت احترام کا درجہ حاصل ہے وہ شاید کسی کتاب کو حاصل نہیں ۔ ۔ ۔ یہ ایسے وقت میں دنیا کے سامنے پیش کی گئی جب ہر طرف ایک ہولناک تاریکی چھائی ہوئی تھی اور چاروں طرف ظلم و ستم کا طوفان برپا تھا۔ عرب جہاں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا ہوئے اور جہاں اس کتاب کی سب سے پہلے اشاعت ہوئی ساری دنیا سے زیادہ خراب حالت میں تھا وہاں کوئی باضابطہ حکومت نہ تھی اس جگہ کے باشندے درندوں کی طرح معمولی باتوں پر لڑتے تھے اور یہ لڑائیاں صدیوں تک جاری رہتی تھیں۔ بت پرستی اور ڈاکہ زنی عرب کے باشندوں کا دلچسپ شغل تھا اور ان کی فطرت اس قدر مردہ ہو گئی تھی کہ وہ سیاہ کاریوں پر ناز کرتے تھے۔ یورپ جسے آج اپنی ترقی پر بڑا ناز ہے وہ بھی نہایت ذلیل حالت میں تھا اس کے گوشہ گوشہ میں جہالت کی حکمرانی تھی۔ اور اخلاقی قوانین درہم برہم ہو گئے تھے۔ اور وہاں نسلِ انسانی کا کوئی شرف باقی نہیں تھا۔ ان حالات میں ہدایت کا سورج چمکا۔ حضرت محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن کو دنیا کے سامنے پیش کیا اس کی عام فہم تعلیم نے دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا اور انصاف و تہذیب کی روشنی پھیل گئی۔

یورپ کا ایک مشہور ادیب ڈاکٹر سی آئم بنگ اپنی مشہور تصنیف دی لائف آف ہولی قرآن میں لکھتا ہے:—

۔ ۔ ۔ اگر یہ مقدس کلام خالق ارض و سماء کی طرف منسوب نہ ہوتا تو اس کی آواز میں تاثیر نہ ہوتی اور یہ ہزاروں انسانوں کی اصلاح نہ کر سکتا لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کلام نے دنیا کی کایا پلٹ دی اور اس نے وحشی درندوں کو انسان کامل بنا دیا تو ہم اس کی صداقت پر یقین کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔

مشہور فلاسفر محقق جارج ہارگس اپنی تصنیف۔ اے لیکچر آن اسلام (A Lecture on Islam) میں لکھتے ہیں:۔

"میں اس بات پر حیران ہوں کہ ایک اُمّی رسولؐ نے جو ظاہری علوم سے ناآشنا تھا۔ قرآن جیسا مکمل ضابطۂ ہدایت دنیا کے سامنے کیوں کر پیش کیا۔ یہ قانون بے شبہ خدا کی طرف سے ہے اس کی یہ خصوصیت ہی لائق توجہ ہے کہ یہ قانونِ ہدایت تقریباً ساڑھے تیرہ سو سال سے بالکل اپنی اصلی شان کے ساتھ موجود ہے کیا یہ اس کے خدا کی طرف سے ہونے کی روشن دلیل نہیں ہے۔"

رُوس کا جلیل القدر اور مشہور عالم فلسفی کاؤنٹ لیوٹالسٹائی اپنی کتاب لائف آف ریلیجن (Life of Religion) میں لکھتا ہے۔

"قرآن مسلمانوں کی ایک مذہبی کتاب ہے جس کی نسبت اُن کا خیال ہے کہ اس کو خدا نے نازل کیا ہے یہ کتاب عالمِ انسانی کی رہنمائی کے لئے بہترین راہبر ہے اس میں تہذیب ہے شائستگی ہے تمدن ہے معاشرت ہے اور اخلاقی اصلاح کے لئے ہدایت ہے۔ اگر صرف یہ کتاب دنیا کے سامنے ہوتی اور کوئی ریفارمر (مصلح) پیدا نہ ہوتا تو یہ عالمِ انسانی کے لئے کافی تھی ان فائدوں کے ساتھ جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ یہ کتاب ایسے وقت میں دنیا کے سامنے پیش کی گئی جب کہ ہر طرف آتشِ فساد کے شرارے بلند تھے خونخواری اور ڈاکہ زنی کی تحریک جاری تھی حق باتوں سے بالکل پرہیز کیا جاتا تھا اور اس کتاب نے ان گمراہیوں کا خاتمہ کر دیا تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔"

مسٹر لین پول جیسا محقق ومورخ اسپین کے مسلمانوں کی حیرت انگیز ترقیوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"جب اسلام قرآن کی نورانی مشعل لیکر دنیا کی ظلمت گاہ کو منور کر رہا تھا یورپ جہالت۔ اصنام و توہم پرستی تعصب اور باہمی اختلافات میں مبتلا تھا۔ لیکن دسویں صدی اس کی تاریخ میں ایک نئے انقلاب کی بنا ڈالنے والی تھی"۔ ۔۔۔ "اب وہ زمانہ نہیں رہا تھا۔ کہ یورپ قرآن سے ناآشنا رہتا۔ اس کی تعلیم آہستہ آہستہ اہلِ مغرب کے دلوں سے زنگِ جہالت دور کر رہی تھی قرآن کے مطالعہ کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو اسلام کے اخلاق کا کبھی نہ مٹنے والا نقش اُن کے دلوں پر قائم ہو گیا۔ اور دوسری طرف پاپائے روم کی جابرانہ حکومت اور اقتدار کے استیصال کا جذبہ دل میں پیدا ہو گیا۔ سرفروشوں کی کوشش دولت روما کو نہ صرف سرنگوں کرکے رہی بلکہ آزاد فرقہ قائم ہو گیا۔ جس کا بانی لوتھر تھا۔ لوتھر نے اطالیہ کے جامعۃ السلام میں تعلیم پائی تھی۔ جہاں عربی فلسفہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔"

نپولین بونا پارٹ لکھتا ہے:۔

"میری یہ خواہش ہے کہ دنیا پر قرآن پاک کے اُصول قانین کے مطابق حکومت کی جائے۔۔ ۔ اس لئے کہ صرف اسی میں بنی نوع انسان کی حقیقی فلاح وبہبودی مضمر ہے" (دیکھو مسلم ریویو جنوری ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۲)

اب ہم اپنے مقالہ کو جارج برنارڈشا کی تصنیف (GETTING MARRIED) کے ایک طویل اقتباس پر ختم کرتے ہیں جس سے قرآن اور اسلام کی عظمت اور اُس کی معجزانہ تعلیم کا پتا چلتا ہے۔

"اب سے ایک سو سال بعد یا اس سے بھی پہلے انگلستان خاص طور پر اور مغربی دنیا عام طور پر مشرف باسلام ہو جائیگی اس لئے کہ اسلام میں ہر قسم کی ترقی کے جذب کرنے کی بے پناہ قوت موجود ہے۔ انسان ارتقائی ترقی کی جس قدر بلندیوں تک پہنچ جائے

وہ اسلام کو ہر جگہ اپنے ساتھ موجود پائے گا۔ اسلام نے شخصی حقوق کی جس قدر محافظت کی ہے۔ دنیا کی کوئی تہذیب، کوئی مذہب اور کوئی قانون اس کی برابری نہیں کر سکتا دنیا حقیقی اور عملی اخوت سے خالی ہے لیکن اسلام کا دستر خوان اس نعمت سے بھرپور ہے ایک کہتا ہے میں انگریز ہوں۔ دوسرا کہتا ہے میں فرانسیسی ہوں۔ تیسرا کہتا ہے میں جرمن ہوں لیکن مسلمان دنیا کے کسی ملک میں آباد ہو۔۔ وہ اپنے کو صرف مسلمان کہتا ہے۔ اور ثابت کر دیتا ہے کہ وہ وطنیت کی حدود سے بالاتر ہے۔ اسلام ہر فرد بشر کو قانونی طور پر آزادی اور جائداد کی ملکیت کا حق دیتا ہے۔ سوشلزم کا وہ عظیم الشان تخیل جسے یورپ نے آج سمجھا ہے۔ اسلام کی عملی زندگی میں تیرہ سو برس سے نافذ ہے۔ سرمایہ داری انسان کے لئے خوفناک لعنت ہے لیکن اگر اسلامی تعلیمات پر عمل کیا جائے تو یہ مصیبت پیدا ہی نہیں ہوتی۔

برنارڈ شا جب سیاحت عالم کے دوران میں ۱۴ر جنوری ۱۹۳۳ء کو بمبئی میں وارد ہوئے تو اخبار لائٹ (لاہور) کے نمایندہ نے آپ سے ملاقات کی اور اس پیشین گوئی کی وضاحت چاہی تو برنارڈ شا نے جواب دیا

میں ہمیشہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین کو بہت بلند سمجھتا رہا ہوں اس لئے کہ اس میں حیرت انگیز روح زندگی پائی جاتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ صرف یہی ایک مذہب ہے جس میں زندگی کے ہر لحظہ بدلنے والے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور اسی طرح یہ دین ہر دور میں جاذب توجہ بن سکتا ہے دنیا کو بلاشبہ مجھ جیسی بڑی شخصیتوں کی پیشن گوئیوں کو خاص اہمیت دینی چاہیئے۔ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین کی نسبت پیشین گوئی کر چکا ہوں کہ اس کو یورپ کی آئندہ نسل قبول کرے گی۔ بلکہ موجودہ نسل کے نزدیک بھی یہ مقبول ہونا شروع ہو گیا ہے۔ قرون وسطیٰ کے اہل کلیسا نے اپنی جہالت یا تعصب کے باعث دین اسلام کو نہایت برے رنگ میں پیش کیا۔ انہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شخصیت اور ان کے مذہب سے نفرت کرنے کی تعلیم دی گئی تھی۔ ان کی رائے میں یہ سب کچھ فریب تھا (نعوذ باللہ) میں نے مطالعہ کیا ہے کہ آپ بڑے بلند پایہ انسان تھے اور میری رائے میں انہیں انسانیت کا نجات دہندہ کہنا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان جیسا انسان دنیائے حاضر کا ڈکٹیٹر بن جاتا تو اس کے پیچیدہ مسائل کو ایسے طریقے پر حل کر دیتا۔ کہ کائنات انسانیت سطلوبہ امن اور راحت کی دولت سے مالا مال ہو جاتی۔ ۔ ۔ پھر فرمایا صرف انیسویں صدی میں کارلائل گوئٹے اور گبن جیسے دیانتدار بالغ نظروں نے مذہب اسلام کی حقیقی اہمیت کو محسوس کیا، اور اس مذہب کے متعلق یورپ کے نقطۂ نگاہ میں خوش آیند تغیر پیدا ہوا۔ بیسویں صدی کا یورپ بہت ترقی کر گیا ہے اور اسے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مذہب کے ساتھ شیفتگی پیدا ہو رہی ہے امید ہے کہ آئندہ صدی میں یورپ اور آگے نکل جائے گا۔ اور اپنے پیچیدہ مسائل کے حل میں مذہب اسلام کی افادی حیثیت کا اور بھی قائل ہو جائے گا، میری پیشین گوئی پر اس نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالنی چاہیئے۔ اس وقت بھی میرے بعض ہم وطن اور یورپ کے بعض اصحاب مذہب اسلام کے دائرے میں داخل ہو چکے ہیں اور کہنا چاہیے کہ یورپ میں اسلام کی حلقہ بگوشی کا کام شروع ہو گیا ہے۔"

اسلام اور قرآن اپنی صداقت اور حقانیت کی گواہی کے لئے کسی کے ذرا سے بھی محتاج نہیں ہیں، سورج کو ساری دنیا تاریک کہتی رہے، تو بھی اس کی ایک کرن کی روشنی کو بھی نہیں جھٹلایا جا سکتا، اور اسلام تو ماہتاب و آفتاب سے بہت زیادہ روشن اور تابناک ہے، غیر مسلم مشاہیر اہل قلم اور ارباب فکر کی تحریروں اور تقریروں کے اقتباسات

اس لئے دئے گئے ہیں کہ خود مسلمانوں میں کچھ ایسے "ضرورت سے زیادہ ذہین" (؟) افراد پائے جاتے ہیں، یوں سمجھئے کہ پیدا ہو گئے ہیں جو قرآن اور اسلام کے بارے میں طرح طرح کے شبہات کا اظہار کرتے رہتے ہیں، کیا عجب ہے کہ یہ مضمون اُن کے اطمینان کا سبب بن جائے اور مغربی افکار کی مرعوبیت اُن کے ذہن سے نکل جائے۔

جو مسلمان قرآن کو صرف تبرک سمجھ کر پڑھتے ہیں اُن کو چاہئے کہ وہ اپنی زندگیوں میں قرآنی اخلاق کی جھلک پیدا کریں، یہی وہ مقدس کتاب، آسمانی منشور اور ربانی دستور ہے، جسے لیکر مسلمان تمام دنیا پر چھا گئے تھے اور اس آفتاب عالمتاب کے آگے پھر کسی دوسرے نظام فکر کا چراغ جل نہ سکا اور آج بھی مسلمانوں کو اسی نسخہ کیمیا سے زندگی مل سکتی ہے، کیونکہ

نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن!

ماہر القادری

سینما

تہذیبِ حاضر کی خطرناک جادوگری

اب سے چند سال پہلے کی بات ہے، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس خیال کا اظہار فرمایا تھا کہ سینما سے مفید کام لیا جا سکتا ہے الفاظ ٹھیک طور پر میرے ذہن میں محفوظ نہیں رہے مگر مفہوم قریب قریب یہی تھا، اس کے بعد سہ روزہ "کوثر" میں اس موضوع پر مختلف حضرات کے مضامین شائع ہوئے اور خوب خوب گرماگرم بحثیں رہیں، میں نے "سینما" کی شدت سے مخالفت کی اور اپنی بساط اور فہم و علم کے مطابق دلیلیں بھی پیش کیں، یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جرم "حق گوئی" کی سزا بھگت رہے تھے اور ملتان جیل میں نظر بند تھے۔

یہ بحث پھر بند ہو گئی، لوگ شاید اسے بھول بھی گئے۔۔۔ مگر اگست کے "ترجمان القرآن" میں رسائل و مسائل کے تحت ایک طالب علم کے خط کا جواب دیتے ہوئے مولانا مودودی تحریر فرماتے ہیں:۔

"میں اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ یہ خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ سینما بجائے خود جائز ہے البتہ اس کا ناجائز استعمال اس کو ناجائز کر دیتا ہے، سینما کے پردے پر جو تصویر نظر آتی ہے وہ دراصل تصویر نہیں پرچھائیں ہے، جس طرح آئینہ میں نظر آیا کرتی ہے اس لئے وہ حرام نہیں، رہا وہ عکس جو فلم کے اندر ہوتا ہے تو وہ جب تک کہ کاغذ پر چھاپ نہ لیا جائے نہ اس پر تصویر کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ وہ ان کاموں میں سے کسی کام کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے جن سے باز رہنے ہی کی خاطر شریعت میں تصویر کو حرام کیا گیا ہے، ان وجوہ سے میرے نزدیک سینما بجائے خود مباح ہے۔۔۔۔"

دین و شریعت میں اتباع کے مستحق خدا اور رسولؐ ہیں، باقی ہر پیروی اور ہر تقلید اسی اتباع کے تحت ہے، مولانا مودودی کی تحریروں نے خاص طور سے ہمارے اندر اس جذبہ کو ابھارا ہے کہ اگر کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا قول بھی خدا اور رسولؐ کے حکم یا دین و شریعت کے مزاج سے مطابقت کرتا ہوا نظر نہ آئے تو پوری جرأت اور دلیری کے ساتھ اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہئے۔

یہ مضمون اسی جذبہ کے تحت لکھا جا رہا ہے کہ جس بات کو میں حق سمجھتا ہوں اس کا کھل کر اظہار کر دوں، اسلامی شریعت کی تاریخ بتاتی ہے کہ حدود احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اصاغر نے اکابر کی رائے سے اختلاف کیا ہے، شاگردوں نے استادوں پر، اور مریدوں نے پیروں پر جرح و تنقید کی ہے، حضرت مولانا نصیر الدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے

پیر و مرشد حضرت سلطان الاولیا نظام الدین محبوب الٰہی قدس سرہٗ العزیز سے انتہائی عقیدت تھی مگر "سماع" کے مسئلہ میں وہ اپنے پیرو مرشد کی اتباع نہ کرتے تھے، سماع شروع ہوتے ہی محفل سے اُٹھ جاتے — اس قسم کی حریت فکر مسلمانوں کا امتیازی وصف رہا ہے!

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اسی مضمون میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے:-

"ایسا معاشرتی فلم بنانا سخت مشکل ہے جس میں عورت کا سرے سے کوئی پارٹ نہ ہو اب اگر عورت کا پارٹ رکھا جائے تو اُس کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں ایک یہ کہ اُس میں عورت ہی ایکٹر ہو، دوسرے یہ کہ اُس میں مرد کو عورت کا پارٹ دیا جائے، شرعاً ان میں سے کوئی بھی جائز نہیں ہے ۔ ۔ ۔"

اس کے بعد مولانا موصوف نے "ایکٹنگ" کے بارے میں گفتگو کی ہے اور اُسے غیر مستحسن بتایا ہے جو اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ مولانا مودودی "فلم" کی اخلاقی مضرتوں کا شدید احساس رکھتے ہیں اور یہ دلیل ہے اُن کی سلامتی طبع، دینی بصیرت اور غیرت ایمانی کی! مولانا ممدوح کی ان تصریحات نے "سینما" کی تین چوتھائی (¾) اباحت کی تو خود ہی نفی کر دی، مابہ النزاع چیز صرف یہ رہ جاتی ہے کہ "فلم" تصویر کی تعریف میں داخل ہے یا نہیں؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "تصویر کشی" کی جو ممانعت فرمائی ہے، مولانا مودودی اُس کی کوئی تاویل نہیں کرتے اور "تصویر" کو جائز نہیں سمجھتے، پھر اللہ تعالیٰ کا مزید فضل یہ ہے کہ بعض علمائے مصر کی طرح وہ "فوٹو" (P H O T O) اور تصویر (P I C T U R E) میں کوئی فرق نہیں کرتے، اس چیز نے ہماری "بحث" کو اور زیادہ آسان بنا دیا گفتگو صرف اس بات پر ہوتی رہ جاتی ہے کہ "فلم" کی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس پر فوٹو اور تصویر کا اطلاق ہو سکتا ہے؟

اس موضوع پر گفتگو کرنے سے قبل چاہتا ہوں کہ چند نفسیاتی اشارے بھی لگے ہاتھوں کرتا چلوں؛ ان سے افہام و تفہیم میں بھی مدد ملے گی اور اس بحث کا "پس منظر" بھی شاید سامنے آ جائے گا۔

ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو دیدہ و دانستہ حقائق کی غلط تعبیریں کرتے ہیں اور اپنے ذاتی نظریوں کا دین و شریعت کے ساتھ پیوند جوڑنا چاہتے ہیں اور اس میں خود اُن کے نفس کی "لذتیت" بھی شریک کار ہوتی ہے، مثلاً جو لوگ تصویر، رقص و سرود، بت تراشی اور اداکاری (A C T I N G) کو "اسلامی آرٹ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، وہ حقیقت میں اسی لذتِ نفس کے مریض ہیں اور ساتھ ہی مغرب کے "آرٹ" کی مرعوبیت اُن پر چھائی ہوئی ہے —— مولانا مودودی کے ذہن و فکر پر اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان تصورات کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی!

مگر ۔ ۔ ۔ بعض اوقات ایسی صورت پیش آتی ہے کہ ایک طرف تو شریعت کا کوئی حکم اور تقاضا ہوتا ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کا مفاد یا خود اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے کوئی مفید پہلو پیش نظر ہوتا ہے، اور یہ "پہلو" پوری نیک نیتی کے ساتھ شریعت کے کسی "تقاضے" پر غالب آ جاتا ہے یہاں یہی صورت پیش آ رہی ہے —— دوسری چیز یہ ہے کہ بعض علمائے اپنی نا واقفیت، یا شدتِ احتیاط کے سبب نماز اور جمعہ کے خطبہ میں "لاؤڈ اسپیکر" کے استعمال کو کردہ سمجھا اور کسی کسی نے تو "ریڈیو" کو آلہ مزامیر ہی فرض کر لیا، علماء کے اس طرز عمل کی تنگی اور اُن کے غیر معمولی تقشف کو دیکھ کر، مولانا مودودی کے ذہن و فکر پر یہ ردعمل ہوا کہ اس "تنگی" میں "وسعت" پیدا کی جائے اور "فلم" اسی جذبۂ "توسع" کی حد میں آ گیا —— یہ نفسیاتی تجزیہ، صرف قیاس پر مبنی ہے نہ جانے اس کا

کتنا حصہ درست اور واقعی ہے، اور کتنا صرف میرے قیاس کی تخلیق ہے۔

فلم کیا ہے؟

شریعت کا یہ اصول ہر حالت میں پیشِ نظر رہنا چاہئیے کہ جس چیز کو شریعت "ناجائز" بتاتی ہے، اس چیز کی چاہے زمانہ کی ترقی و انقلاب کے ہاتھوں "ہیئت" کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے مگر اس میں "شر" کا عنصر ضرور باقی رہے گا اور اس پر قیاس اُسی "مضرت" کا ہوگا، جس کی بنا پر شئے مذکور کو ناجائز کہا گیا ہے۔

بنکوں، انشورنس کمپنیوں اور دوسرے تجارتی امور میں جو آج "سود" (INTEREST) کی مختلف شکلیں پیدا ہو گئی ہیں اور اُن کے بڑے مہذب اور خوشنما نام رکھ دئے گئے ہیں، وہ سب اس لئے ناجائز ہیں کہ اُن پر کسی نہ کسی درجہ میں جا کر بہرحال "ربوا" کا اطلاق ہوتا ہے ——— یہ گھوڑ دوڑ کی شرط جو آج مستقل "آرٹ" بلکہ BUSINESS بن گئی ہے یہ کلب گھر کی قماربازیاں اور انعامی معمے یہ سب "میسر (جوئے) کی تعریف میں اس لئے آتے ہیں کہ اُن میں وہی اسپرٹ پائی جاتی ہے جس کے سبب "قماربازی" کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

مصر کے جن علماء نے "فوٹو" اور "تصویر" میں فرق کیا انھوں نے "فوٹو" کے لئے یہی وجہ جواز پیش کی کہ وہ عکس ہے جیسے پانی میں یا آئینہ میں صورت کا عکس نظر آتا ہے ——— تو حقیقت میں انھوں نے اُس "اسپرٹ" کو نظر انداز کر دیا جس کے سبب "تصویر" کو ناجائز کہا گیا ہے!

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو "فلم اسٹوڈیو" میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا مگر مجھ گنہگار نے "نگارخانوں" کی سیر کی ہے، جس طرح کیمرے کے ذریعہ "فوٹو" لیا جاتا ہے بالکل اُسی طرح "فلمی تصویریں" بنائی جاتی ہیں، بس فرق یہ ہے کہ "فلمی کیمرے" زیادہ بڑے، زیادہ حساس اور بعض باتوں میں عام کیمروں سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتے ہیں، تو جب کیمرے کے ذریعہ فوٹو[1] کھنچوانا جائز نہیں ہے اور فوٹو پر "تصویر" یا "تصویر کشی" ہی کا اطلاق ہوتا ہے ——— تو پھر وہ "فوٹو" صرف "فلم" اور "سینما" کا نام رکھ دینے سے کس طرح جائز ہو جائے گا۔

"فلم" کا "PROCESS" ہی یہ ہے کہ متحرک کیمرے کے ذریعہ پہلے "فوٹو" لئے جاتے ہیں، اداکار جو کچھ بولتا ہے اُس کی بھی ساتھ ہی ساتھ "صدا بندی" ہوتی رہتی ہے، پھر وہ "فوٹو" لیبارٹری میں مختلف مراحل[2] سے گزر کر "فلم" کی صورت اختیار کرتے ہیں "فلم" جسے کہتے ہیں وہ تقریباً دو انچ چوڑی پٹی پر ہوتا ہے، فلم کی یہ پٹی (Coil) کئی کئی سو فیٹ کی ہوتی ہے، جب "فلم" دکھانا ہوتا ہے، تو پردے کے بالمقابل اس ریل (Reel) کو لگا دیتے ہیں اور برقی مشین کے ذریعہ فلم کے پردے پر اُس کا عکس پڑتا ہے اور تصویریں مجسّم، منعکس اور متحرک ہونے لگتی ہیں۔

فلم جس پٹی (TAPE) پر ہوتا ہے، وہ دراصل فوٹو کا "negative" ہوتا ہے، اور اُس پر بہت ہی دھندلا سا عکس تو ضرور دکھائی دیتا ہے مگر "فوٹو" نظر نہیں آتے! بالکل اسی طرح

---

[1] جاندار کا فوٹو

[2] فوٹو کا دھونا، پرنٹنگ، ایڈیٹنگ ۔۔۔ وغیرہ ——!

جس طرح عام فوٹوؤں کے "NEGATIVE" تصویریں تیار ہوتی ہیں ۔۔۔۔۔۔ میرا مقصد عرض کرنے کا یہ ہے کہ "فلم" کی اصل اور بنیاد ہی "فوٹو" ہے اور "فوٹو" ناجائز ہے، تو "فلم" چاہے جس طرح بھی منعکس ہوتا ہو، بہر حال وہ جائز نہیں ہے، اس لئے کہ وہ "فوٹو" سے بنتا ہے۔

میں اپنی کہی ہوئی بات کو پھر دہراتا ہوں ــــــــ "فلم" کی بنیاد "فوٹو" ہے اور "فوٹو" شریعت میں جائز نہیں ہے، اس لئے "فلم" بھی اس تعریف میں آجاتا ہے! "تصویر" جب ناجائز قرار دی گئی تھی تو وہ ایک ساکت اور جامد چیز تھی، اور اب "فلم" میں تصویر بولتی ہے، حرکت کرتی اور چلتی پھرتی ہے، لہٰذا اس کی مضرت "فوٹو" کی ترقی کے ساتھ اور زیادہ بڑھ گئی ہے ــــــــ "فلم" نے "تصویر" کی مضرت اور برائیوں کو معراج کمال پر پہونچا دیا ہے، بنا بریں صورت میں سوال "رخصت" کا نہیں اور "شدت" کا ہے!

ہاں، جن چیزوں (درخت، مکانات اور مناظر وغیرہ) کی "تصویر" کے کھینچنے کی ممانعت شریعت میں وارد نہیں ہوئی، اُن کے "فلم" بھی بنائے جا سکتے ہیں اور جس طرح "تشریح الابدان" کے سلسلہ میں جسم اور اس کے اعضا کی "تصویر" سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اسی طرح "فلم" کو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے، یا مثلاً فوجی یا کسی دوسری فنی تربیت کے سلسلہ میں کوئی ایسا مقام آئے جہاں "فلم" کے بغیر تربیت[1] بالکل ادھوری رہتی ہو اور "فلم" سے کام لینا ناگزیر ہو، تو اس صورت میں "فلم" سے اس خاص ضرورت کے پورا کرنے کیلئے استفادہ کیا جا سکتا ہے، ایسی صورت میں "ناگزیر" اور "مفید" کے فرق کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے، یعنی فنی تربیت و تعلیم کے لئے "فلم" ناگزیر تو نہیں ہے مگر "مفید" ضرور ہے، تو پھر "افادیت" اور "بہتر تربیت" کی خاطر "فلم" کے استعمال کی اجازت نہ دی جائے گی جس طرح "شراب" کو صحت درست رکھنے اور بہتر بنانے کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

یہ نکتہ ہر ضرورت کے وقت پیش نظر رہنا چاہئے کہ خدا اور رسول نے جس چیز کو ناپسند فرمایا ہے، وہ ملت کے لئے بلکہ عام انسانی معاشرے کے لئے سبب خیر نہیں بن سکتی، آج حالات نے عورت کی "بے پردگی"[2] کو کتنا ضروری بنا دیا ہے مگر اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے "بے پردگی" سے جو برائیاں پھیل رہی ہیں، وہ سب پر ظاہر ہیں۔

آخر میں مجھے ایک بار پھر اس چیز کی صراحت کرنی ہے کہ فلمی پردے پر جو چیز دکھائی دیتی ہے وہ بے شک "عکس" ہوتا ہے مگر اس عکس کو شفاف پانی اور آئینے کے "عکس" پر قیاس کرنا درست نہیں ہے کیونکہ وہ "عکس" اس "فوٹو" کا ہوتا ہے جس کی شریعت میں ممانعت آئی ہے، یعنی سینما کی بنا ہی "فاسد" ہے اور "فساد" خیر و صلاح کی ضد ہے۔

اس سلسلہ میں، ایک مثال اور عرض کرتا ہوں جس سے مسئلہ کی ایک دوسری نوعیت بھی واضح ہو جائے گی، بچیوں کی تعلیم کے لئے ایک تربیت گاہ قائم ہے، جس میں پردے کی پوری پابندی کے ساتھ صنعت و حرفت اور قرآن و حدیث کی تعلیم دی جاتی ہے ــــــــ اب اس تربیت گاہ کی "فلم" لی جاتی ہے، تفریح نظارہ کے لئے نہیں بلکہ لوگوں میں تعلیم کا شوق پیدا

[1] اور وہ تربیت بھی بذاتِ خود "ناگزیر" ہو۔
[2] اگرچہ بضرورت بھی ممنوع ہے۔

کرنے کے لئے ـــــــ اب یہ "فلم" عوام کو دکھائی جاتی ہے، تو اُستانیوں اور لڑکیوں کے چہرے، اُن کا چلنا پھرنا، اور اُن کے اعضاءِ بدن کی حرکت جب نامحرم مردوں کے سامنے آئے گی تو اُس میں فائدہ کم اور خطرات زیادہ ہیں! یہی صورت اُس وقت پیدا ہوگی جب عورتیں اُن فلموں کو دیکھیں گی جن میں مردوں کو کام کرتے، چلتے پھرتے، اور اُٹھتے بیٹھتے دکھایا جائیگا، "فلم"[1] تنگاہ کے اس فتنہ کو بہت زیادہ تقویت دیتی ہے جس کی شریعت میں سخت ممانعت آئی ہے!

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اصابتِ فکر "ضرب المثل" بن چکی ہے، اللہ تعالیٰ نے اُن کو دینی بصیرت اور غیرتِ ایمانی سے نوازا ہے ـــــــ مجھے یقین ہے کہ اگر میری دلیلوں نے مولانا موصوف کو مطمئن کر دیا تو وہ اپنی رائے پر اصرار نہ فرمائیں گے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق پر چلنے کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطاء فرمائے (آمین)

[1] "فلم" کو میں مونث اور مذکر دونوں طرح بولتا اور لکھتا ہوں (م۔ ق)

مہدی علی صدیقی

تیل!

قدیم زمانے میں مصر والوں نے ریت کے چٹیل میدان میں ایک بڑا سا دھبہ دیکھا۔ کسی منچلے نے اس دھبے کی مٹی کو نچوڑا۔ ایک سیّال گرپانی سے زیادہ گاڑھا مادہ ہاتھ آیا۔ مصریوں کو سخت تعجب تھا کہ آخر یہ کیسا پانی ہے۔ تجربہ کی بنیاد تجسس ہے اسی جذبے نے اُکسایا تو یہ پتہ چلا کہ اس مائع میں جلنے کی خصوصیت ہے۔ یہی تھی تیل کی دریافت۔

نئی دنیا میں بھی سُرخ ہندستانیوں نے تیل کے اُبلتے چشمے دیکھے اور جب اس مادے سے آگ جلانے میں مدد لی تو سب کو اچنبھا ہوا کہ سیّال سے ایسا عجوبہ دیکھا تھا نہ سُنا۔ بہت عرصہ بعد سفید فام قوموں نے دُنیا کے ہر کونے میں تیل کو ڈھونڈھ نکالا۔ یہ قسمت کے دھنی اور دُھن کے پکے زمین کی ساخت، اور چٹانوں کی بناوٹ دیکھتے، جاہل مقامی باشندوں سے زمین کھدواتے اور تیل برآمد ہو جاتا۔ اس غیب دانی پر مقامی باشندے ہکا بکا رہ جاتے۔

یہ قصے پُرانے ہو گئے۔ اب تو زمین کو بڑی گہرائی تک کھودنے کے ہزاروں آلات اور تیل کی دریافت کے نئے طریقے دریافت ہو چکے ہیں۔ سیکڑوں میل لانبے نلوں کے ذریعے تیل چشموں سے صفائی کے کارخانوں تک منتقل ہوتا ہے۔ مغربی ایران، عراق، شام، لبنان، روس کے جنوبی میدان، شمالی امریکہ کی وسطی ریاستوں میں اس قسم کے نلوں کا جال بچھتا جا رہا ہے۔ کچا تیل نِکل (NICKLE) یا سفید فولاد کی بڑی بڑی قرابنیوں میں گرم اور پھر مقطّر کیا جاتا ہے۔ دور سے یہ قرنبیق میناروں کی مانند نظر آتی ہیں۔ مقطّر کرنا ایک طویل عمل ہے۔ اس کے مختلف مدارج پر موٹروں، لاریوں، ہوائی جہازوں کے لئے پیٹرول بسوں اور مکانکی آلات زراعت کے لئے ڈیزل تیل، انگریزی لمپوں کیلئے پیرافن تیار ہوتا ہے۔ یہ چیزیں نکالنے کے بعد قرنبیق کے باقی ماندہ گاڑھے مادے سے مختلف کیفیت کے مشینوں کو چکنانے والے تیل علیحدہ کرلئے جاتے ہیں۔ سلائی کی مشینوں کے لئے ہلکا زرد تیل، موٹروں اور ہوائی جہازوں کے لئے چکنانے کا کسی قدر گاڑھا سُنہرا تیل اور صنعتی مشینوں، گرنیوں (MILLS) اور جنگی گاڑیوں کے لئے سُرخ زیادہ گاڑھے تیل تیار ہوتے ہیں۔

جو تیل موٹروں میں ڈالا جاتا ہے، سائنس دانوں نے، اُسے ترشوں (ACIDS) اور ادویہ کی مدد سے صاف کرنا شروع کیا۔ لیجئے اب سُنہرا رنگ غائب ہو گیا اور بو بھی جاتی رہی۔ اس میں مختلف رنگ اور خوشبوئیں ملا کر بالوں کے لئے قسم قسم کے تیل اور چہروں کے واسطے موم روغن بننے لگے۔ ان روغنوں میں پانی کی آمیزش سے تھوڑا سا کیمیاوی تغیر ہوا تو بالوں کے لئے طرح طرح کی کریمیں (CREAMS) تیار ہو گئیں۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ شفاخانوں کو بھی چکنا کرنے والے تیلوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن اگر ان میں بدبو اور بدمزگی ہو تو کون پینے کو تیار ہوگا۔ تیل کے ماہروں نے یہاں بھی ہاتھ بٹایا۔ پہلے سے زیادہ تیز ترشے (ACIDS) اور زیادہ تیز صاف کرنے والی دوائیں استعمال کر کے تیل کا ایک محلول تیار کیا گیا۔ پھر اسے مقطّر کر کے، الکحل سے دھویا گیا۔ آخر کار بے رنگ، بے مزہ، اور بدبو سے پاک، صاف شفاف پیرافن (PARAFFIN)

حاصل ہوا جسے ریفائنری بلاتکلف استعمال کرنے لگے - ان کیمیاوی تجربوں کے بعد جب تیل مقطر اور علیحدہ کر لیا جاتا تو ایک لس دار، چکٹ چیز بچ جاتی - سائنس دانوں نے اس کے استعمال کے بھی طریقے نکال لئے - اسے پکا کر چھانا اور پھر جالیا - اب موم بن گیا جو کئی طرح استعمال ہوتا ہے - خالص موم کھانے کی چیزوں کو بند کرنے یا کاغذ لپیٹنے میں کام آتا ہے، دوسرے درجے کے موم پرست پودینہ اور شکر کا آمیزہ (MIXTURE) لگا کر چوسنے کے لئے "گم" بناتے ہیں - تیسرے درجے کا موم رنگ ملا کر موم بتیاں بنانے میں استعمال ہوتا ہے - ان اقسام کے کمتر درجے کے موم سے پالشیں بنائی جاتی ہیں یا سمندری تار برقی کے تاروں کو محفوظ کرنے کے لئے ان کے غلافوں پر چڑھا دیا جاتا ہے - اس قدر اشیا حاصل کرنے کے بعد بھی جو پسماندہ اجزا (RESIDUARY) رہ جاتے ہیں وہ سمندری جہازوں میں بطور ایندھن کام دیتے ہیں -

یہ قصہ یہیں ختم ہو جاتا اگر جنگ کی ضروریات نے انسانوں کو اور تحقیقات پر مجبور نہ کر دیا ہوتا - دوسری جنگ عظیم میں جاپان نے آناً فاناً ربر پیدا کرنے والے بڑے ممالک پر قبضہ کر لیا اور ربر کے بڑے بڑے ذخیرے اتحادیوں کے ہاتھ سے نکل گئے - ہوائی جہاز، موٹریں، جنگی گاڑیاں اور سیکڑوں آلات بالکل بیکار ہو جاتے اگر ربڑ کی قائم مقامی کے لئے کوئی چیز ایجاد نہ ہو جاتی - ایک مرتبہ پھر وہی پرانا خادم جو پہلے سے ہی ہوائی جہازوں، موٹروں اور جنگی گاڑیوں کو چلا رہا تھا کام آیا - پہلے اسے بڑی زبردست بھٹیوں میں بہت اونچے درجہ حرارت تک گرم کیا گیا، پھر اس میں ہائیڈروجن گیس سخت دباؤ کی حالت میں داخل کی گئی، آخر میں چند اور کیمیاوی اجزا کی آمیزش ہوئی - اس طرح تیل ہی سے ایک نئی دولت ہاتھ آئی یعنی مصنوعی ربر - جنگ سے پہلے ہی جرمنی نے مصنوعی ربر کی ایجاد سے فائدہ اٹھا کر خاصہ ذخیرہ تیار کر لیا تھا! اتحادیوں کو اپنے طور پر ربر کی کمی کا مسئلہ حل کرنا پڑا - یوں تیل جنگ کی دو بنیادی ضروریات کی اساس ثابت ہوا -

تیل سے ربر (RUBBER) بنانے کے لئے ایک بدبودار، بھوری سبزی مائل چربی رہ گئی، جس کے رکھنے اٹھانے کا معاملہ بجائے خود ایک مشکل مسئلہ بن گیا - اول اول اسے گڑھوں میں دفن کر دیتے یا بھٹیوں میں جلا ڈالتے - لیکن جس قدر زیادہ ربر بننے لگی یہ "پس ماندہ شے" کا معاملہ اہمیت اختیار کرتا جاتا - بالآخر پھر سائنس دانوں کو مدد کے لئے بلانا پڑا - انھوں نے اس چربی کو پانی میں گھولا چھانا، اور دواؤں سے صاف کیا - کچھ دواؤں اور رنگ اور خوشبو کی آمیزش کی - لیجئے "رقیق صابن" نے جنم لیا جو کئی پیشوں اور حرفتوں میں کام آتا ہے - لیکن اب بھی ادویہ اور تیل کے تیل کا ایک گاڑھا آمیزہ (MIXTURE) باقی بچا - اس کا کوئی مصرف سمجھ میں نہ آتا - مگر واہ رے انسان، تو نے اس گندگی کو بھی دواؤں، حرارت، اور دباؤ کی امداد لیکر رقیق مادے سے منجمد مسالے کی شکل دے دی، اور اس طرح "پلاسٹک" (PLASTIC) کا معجزہ ظہور میں آیا جس کی آج ہزار شکلیں ہیں اور ہزار مصرف!

ایک لفظ ——— جون سنہ ۵۲ء میں "کوثر و تسنیم" پر جو تبصرہ کیا گیا تھا تو اس میں ہم نے "پتنگ" پروانہ کے معنی میں نادرست بتایا تھا، ہمارے پاس اس سلسلہ میں بعض ارباب ذوق کے خطوط آئے ہیں جن میں انھوں نے اشعار کے حوالوں سے لکھا ہے کہ بعض قدیم شعرا نے "پتنگ" "پروانہ" کے معنی میں استعمال کیا ہے ——— بہرحال اب اس لفظ کی حیثیت "متروک" کی ہے، اور "پتنگ" اور "پتنگے" میں فرق کرنا چاہیے ——— (مدیر فاران)

ماہر القادری

میں خاموش نہیں رہ سکتا؟

ٹھیک طور پر سنہ کا تعین تو نہیں کر سکتا، مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ اب سے تقریباً پچیس سال قبل مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریر پہلی بار میری نظر سے گزری، اور دل و دماغ پر اپنا نقش چھوڑ گئی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے مولانا موصوف کے مضامین کو میں ہمیشہ شوق و دلچسپی ہی نہیں بلکہ عقیدت کے ساتھ پڑھتا رہا ہوں، شاید ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مولانا ممدوح کا کوئی مضمون یا ان کی تحریر کا کوئی اقتباس کسی اخبار یا رسالہ میں نظر آیا ہو، اور میں نے اُسے بے پڑھے چھوڑ دیا ہو، اُن کے بعض شہ پارے نہ صرف یہ کہ بار بار خود پڑھے ہیں بلکہ دوسروں کو پڑھ پڑھ کر سنائے ہیں!

میں کھلے دل سے اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریروں سے میں نے ایک طالب علم کی طرح استفادہ کیا ہے، میرے ادبی شعور کی تربیت میں مولانا موصوف کی شوخیٔ تحریر بھی شریک کار رہی ہے اور یہ معاملہ صرف ادب و انشاء ہی تک محدود نہیں رہا، اُن کے مضامین سے دینی بصیرت بھی حاصل ہوئی ہے، اور ان کی بعض تحریروں نے ذہن و فکر کی اُلجھنوں کو بھی دور کیا ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن نگرامی مرحوم کی بیوہ سے مناکحت اور پھر علیحدگی کے سلسلہ میں ماہنامہ "نگار" کے ایڈیٹر نے جو فتنہ کھڑا کیا تھا، میں اس زمانہ میں حیدرآباد دکن میں تھا، میرا دل کہتا تھا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی سے جو باتیں منسوب کی جا رہی ہیں وہ شرارت آمیز ہیں، "حقوق اللہ" کا پہچاننے والا "حقوق العباد" کے معاملہ میں ظلم و زیادتی کی اتنی نیچی سطح تک نہیں اُتر سکتا، چنانچہ مولانا موصوف کی حمایت میں لوگوں سے کیسے کیسے مچیٹے رہے ہیں، اور بحث و مناظرہ کے کتنے تلخ و تند ہنگاموں میں مولانا کے اس نیاز مند و عقیدت کیش نے حصہ لیا ہے، یہ باتیں اس لئے بیان نہیں کی جا رہی ہیں کہ خدانخواستہ مولانا پر احسان جتانا مقصود ہے، میں نے مولانا ممدوح کی مدافعت میں جو کچھ کیا، وہ حق سمجھ کر کیا کہ ایک مظلوم مسلمان کی حمایت اور مدافعت بہت بڑی نیکی ہے، اور ایک مسلمان کی مظلومیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ اُس کی ذات بے سر و پا تہمتوں اور غلط الزامات کی آماجگاہ بنا دی جائے!

یہ وہ دور تھا جب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں کے بعض اقتباسات "صدق"[1] میں درج ہوا کرتے تھے اور مولانا عبدالماجد اُن کو "متکلم اسلام" کے لقب سے یاد فرماتے تھے، اور ہم نیازمندوں کو خوشی ہوتی تھی کہ دو اہل قلم، اہلِ فکر اور اہلِ علم دین کی تبلیغ میں ایک دوسرے کی مساعدت فرما رہے ہیں ——— مگر یہ یک رنگی زیادہ

[1] ہفتہ وار "سچ" کی جگہ "صدق" کب جاری ہوا، یہ مجھے یاد نہیں آ رہا ہے (م - ق)

دنوں تک قائم نہ رہ سکی، یعنی مولانا مودودی پر کچھ طنزیں اور چبھتے ہوئے جملے بھی "صدق" میں نظر آنے لگے، یہ "لے" پھر بڑھتی ہی چلی گئی، طنز و تنقید کے یہ چھینٹے رُکے نہیں بلکہ وہ اور دھواں دھار ہوتے رہے، یہ رنگ دیکھ کر میں نے (غالباً سنہ ۱۹۳۷ء میں) مولانا عبدالماجد دریابادی کو بہت طویل خط لکھا، اور عرض کیا کہ "صدق" میں مولانا مودودی پر طنز آمیز شذروں کو دیکھ کر دشمنوں کو ہنسنے کا موقع مل رہا ہے اور جن دین سے بیگانوں اور مغرب زدوں کو ہم آپ کی اور مولانا مودودی کی تحریریں دکھایا کرتے تھے اُن کو ان خلافی تحریروں کا آخر کیا جواب دیں؟ . . . . . لہٰذا اس سلسلہ کو جاری رکھنے کے مقابلہ میں بند کر دینے میں دین کی بھلائی ہے ؎ ـــــ اس پر مولانا عبدالماجد دریابادی نے ایک کارڈ جواب میں لکھا، جس میں دو سطریں تھیں، اُن کے یہ الفاظ اب تک یاد ہیں:-

"آپ کے خیالات سے بالکل اتفاق نہیں، مگر آپ کو تبلیغ کا اجر ملے گی"

جب تک میں حیدرآباد میں رہا، اور حیدرآباد چھوڑنے کے بعد بمبئی اور دہلی میں بھی "صدق" کے مطالعہ کی سعادت حاصل کرتا رہا، ایک بار مشاعروں کی ایسی بھرمار رہی کہ مسلسل سفر کرنا پڑا، اُدھر مدراس میں مشاعرہ پڑھا تو تیسرے دن بمبئی میں کسی ادبی جلسہ میں شرکت کی، دوسرا ہفتہ ناگپور اور رائے پور میں بسر ہوا، دو ڈھائی مہینہ "صدق" پڑھنے کو نہیں ملا، مگر پھر حیدرآباد دکن جانا جو ہوا تو اپنے کرم فرما اور شفیق محب نواب تراب یار جنگ بہادر مرحوم کے یہاں "صدق" کے تمام پرچے مل گئے، ہفتہ وار "سچ" کے فائل بھی نواب صاحب مرحوم کی عنایت سے پڑھنے کو ملے!

"صدق" میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پر طنز تیز تر ہوتی جا رہی تھی، میرا دل بار بار چاہا کہ ان تحریروں کا جواب دیا جائے مگر ارادہ کر کے رہ گیا، نہ لکھنے ہی میں دین اور ملت کی بہتری سمجھی کہ اس طرح اختلافات کی خلیج اور وسیع ہو جائے گی ـــــ زمانہ گزرتا چلا گیا اور زمانہ کا کام ہی گزرنا اور دوڑتے چلے جانا ہے، یہ کسی کے ٹھیرائے ٹھیرتا کب ہے، پلک جھپکاتے جُگ بیت جاتے ہیں، ان آنکھوں نے مسلم لیگ اور کانگریس کی کشمکش کا دور دیکھا، کیا کیا ہنگامے اور کیسی اُکھاڑ پچھاڑ رہی ہے، یہاں تک کہ سنہ ۴۷ء میں ہندوستان بٹ گیا اور پاکستان بن گیا۔

تقسیم ہند کے بعد جو باتیں دیکھنے میں آئیں اُن کا سان گمان بھی نہ تھا، اگر خود میرا گاؤں اور اُس کا مضافاتی علاقہ "محشرستان" نہ بن جاتا، تو میں وطن چھوڑ کر گھر سے بے گھر کاہے کو ہوتا، کاش! دل کی چوٹیں دکھائی جا سکتیں، جب ہندوستان کی زمین تنگ کر دی گئی ہے تب ہم یہاں آئے ہیں، اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی فرمائے گا کہ یہ ہجرت تھی یا فرار تھا۔

پاکستان آنے کے بعد بھی مولانا عبدالماجد کی تحریریں نظر سے گزرتی رہیں، پھر سنہ ۴۹ء میں خود میں نے "فاران" جاری کیا اور "صدق" تبادلہ میں آنے لگا، پاکستان بننے کے بعد مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے خلاف مولانا موصوف کی تحریروں کے جواب میں صفحے کے صفحے لکھ سکتا تھا مگر میں نے دل پر جبر کر کے اس سے گریز کیا ـــــ لیکن "صدق" میں اس مخالفت کی لے یہاں تک بڑھی کہ صوفی نذیر احمد کے "شطحیات" اور "مجذوبانہ ذکاہات" تو ایک

؎ پندرہ سولہ سال کی بات ہے، خط کا مضمون ذہن میں کس طرح محفوظ رہ سکتا ہے، اور اب تو پہلا سا حافظہ بھی نہیں رہا، میں نے اپنے اُس نیاز نامہ کا خلاصہ یہاں درج کر دیا ہے!

طرف رہے، قرآن و حدیث پر پھبتیاں کسنے والے نیاز فتحپوری کی تحریر کا ایک اقتباس تک "صدق" میں درج کر دیا گیا'
جس دن جماعتِ اسلامی اور مودودی صاحب کی مخالفت میں "نگار" کا یہ اقتباس "صدق" میں نظر سے گزرا اس دن بڑی
اذیت ہوئی اور مولانا عبدالماجد دریابادی سے جو عقیدت تھی اس کو پہلی بار ٹھیس لگی اور میں پہروں سوچتا رہا کہ اس
مخالفت کا کیا سو فی صدی حصہ خلوص اور احقاقِ حق ہی پر مبنی ہے؟ ایک حساس قلب کو سب سے بڑا دکھ اس وقت
ہوتا ہے جب اس کے کسی "حسنِ ظن" کو ٹھیس لگتی ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی سے "مسلک خارجیت" منسوب کرنے کا "شرف" سب سے پہلے مولانا عبدالماجد
دریابادی ہی نے حاصل کیا ہے ——— مولانا موصوف کی اس غلط روش کے خلاف بہت کچھ لکھ سکتا تھا
مگر نہیں لکھا صرف ایک بار آن کی کتاب "سفر نامہ حجاز" پر تنقید کرتے ہوئے فٹ نوٹ میں چند سطریں لکھنے کا البتہ
میں گنہگار ہوں ——— مگر اس جرم کی سزا کا حال بھی سن لیجئے میرے اس تبصرہ کے دس بارہ دن بعد منیجر صاحب
"صدق" کی طرف سے ایک خط وصول ہوا، کہ جن اخباروں و رسالوں سے "صدق" کا تبادلہ ہے ان پر نظر ثانی کی گئی، "صدق"
اب آپ کے یہاں تبادلہ میں نہ آیا کرے گا، میں نے فوراً جواب دیا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے افادات سے ہم محروم رہنا
نہیں چاہتے، رسالہ جاری رکھا جائے، چندہ عنقریب آپ کی خدمت میں پہونچے گا، اور "فاران" کا تبادلہ بند نہیں ہوگا یہ بدستور
حاضر ہوتا رہے گا ——— اس خط کے آخر میں یہ چند الفاظ بھی میں نے لکھ دیئے تھے کہ مولانا دریابادی کی کتاب پر ریویو
اور اس "فٹ نوٹ" کے بعد "صدق" کے تبادلہ کا بند کیا جانا قابلِ غور ہے ——— چنانچہ سالانہ چندہ بھجوا دیا گیا اور
"صدق" ایک خریدار کی حیثیت سے میرے پاس آ رہا ہے اور میں اسے اب بھی پورے شوق اور دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔

جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کی مخالفت بہرحال گوارا کی ہی جا رہی تھی' یہ تلخ جام پے بہ پے پینے پڑ رہے تھے ———
——— مگر اس دوران میں "صدق" کے کالموں میں قادیانیوں کی لاہوری جماعت اور خاص طور سے مولوی محمد علی لاہوری ایم۔ اے
کی تعریفیں آنے لگیں، اس سے اور زیادہ دکھ ہوا، خیال تھا کہ یہ سلسلہ رک جائے گا مگر رکنے کے بجائے اور تیز تر ہو گیا، اور اب
"قادیانیوں" کی مدافعت اور حمایت شروع ہو گئی!

میں نے اسی دوران میں مولانا موصوف کو ایک خط لکھا تھا کہ قادیانیوں کے معاملہ میں جو آپ کے قلب میں وسعت
پیدا ہو گئی ہے، خدا کرے تنگی سے بدل جائے' اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کو نبی مان کر
کلمہ گوئی کا سارا کریڈٹ (C R E D I T) ہی ختم ہو جاتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی اس معاملہ میں سکوت بھی اختیار فرما سکتے تھے مگر "سکوت" اور "صرفِ نظر" تو
کجا انھوں نے قادیانیوں کی طرف سے مدافعت کو اپنا شعار بنا لیا ہے، اس گمراہ فرقہ کی حمایت اور مدافعت میں یک
نہ ایک شوشہ چھوڑتے ہی رہتے ہیں، اور ان کی روش سے ایسا ظاہر ہوتا ہے جیسے کہ قادیانیوں کی مدافعت کو وہ
تمام امتِ مسلمہ کی طرف سے "فرض کفایہ" سمجھ کر ادا کر رہے ہیں۔ ساری امتِ مسلمہ اور مسلمانوں کے تمام فرقے ایک
طرف اور "مدیر صدق" ایک طرف ہیں پورے "جماعِ امت" کے مقابلہ میں وہ تنہا رجز خوانی کر رہے ہیں' قادیانی
اپنے سوا تمام مسلمانوں (غیر قادیانیوں) کو کافر سمجھتے ہیں' تو ان سے وہ کچھ نہیں کہتے، اپنے قلم کا سارا زور وہ اس پر
صرف کر رہے ہیں کہ مسلمان مرزا غلام احمد کے امتیوں کو "مسلمان" سمجھیں اور ان کی تکفیر نہ کریں، اس معاملہ

میں قادیانیوں کی حمایت کا درد مولانا دریابادی کے پیٹ میں رہ رہ کر اُٹھتا ہے وہ اُسے کسی طرح ضبط ہی نہیں کر سکتے۔

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ جماعتِ اسلامی کو میں حق پر سمجھتا ہوں اُس کی مخالفت سے مجھے دُکھ ہوتا ہے مگر اس کے باوجود مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس جماعت کی جو شدید مخالفت کی تو اُس پر میں نے چند سطروں سے زاید کچھ نہیں لکھا اس لئے کہ جماعتِ اسلامی کی مخالفت اور موافقت "کفر و اسلام" کا مسئلہ نہیں ہے، اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو گالیاں دینے کے بعد بھی کوئی مسلمان دین کے دائرے سے خارج نہیں ہو جاتا، مگر ختمِ نبوت کا مسئلہ "ایمان" کا مسئلہ ہے، محمدؐ ابن عبداللہ (ہماری جانیں حضورؐ پر قربان ہوں) پر نبوت ختم کر دی گئی، اب قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا، جو کوئی "نبوت" کا دعویٰ کرے گا، وہ جھوٹا، دو کذاب سمجھا جائے گا ——— یہ فروعی اور ضمنی نہیں بنیادی عقیدہ ہے ایسا عقیدہ جس کے بغیر "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا اقرار مکمل ہی نہیں ہوتا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی ذات سے مجھے جو عقیدت رہی ہے اُس کا اظہار میں شروع میں کر چکا ہوں، مگر اُن سے عقیدت اسی لئے تو تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس دین کو لائے تھے اُس کی وہ تبلیغ و اشاعت کا فرض انجام دیتے ہیں، لیکن جب محمدؐ رسول اللہ کے ایک حریف (غلام احمد) کی اُمت کی مدافعت کی ذمہ داری انھوں نے اپنے سر لے لی ہے تو پھر یہ "عقیدت" مجروح ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی، قیامت کے دن مجھ سے "صدق" کے ایڈیٹر کی عقیدت اور محبت کے بارے میں نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت اور محبت کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ اس عقیدت کو تو نے کس طرح نباہا ؟ مولانا عبدالماجد دریابادی اگر قادیانیوں کی مدافعت کے جذبہ کو ضبط نہیں کر سکتے تو میں بھی اپنے "آقا و مولا"[1] حضور ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ایک حریف اور اُس کے متبعین کی مخالفت کے جذبہ کو ضبط نہیں کر سکتا، میں صاف صاف کہتا ہوں کہ جب مرزا غلام احمد کے نام ساتھ "حضرت" "مسیح موعود" یا "بروزی" اور "ظلی" "نبی" لکھا ہوا دیکھتا ہوں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے، اگر ہندوستان میں عیسائیوں کی جگہ مسلمانوں کی حکومت ہوتی تو اس کذاب کو قتل کر دیا جاتا۔

میں نے بہت کچھ غور کیا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی جیسا شخص جو قرآن کا مفسر اور دین کا مبلغ ہے اور حکیم الامت مولانا اشرف تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جس کی تربیتِ فکر و نظر کی ہے، قادیانیوں کی مدافعت اور حمایت میں سرگرم کار کیوں ہے؟ کیا دُنیا کا کوئی لالچ اس کا محرک ہے؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے، تو کیا اُن کے معتقدات اور دینی اشتغال و اعمال بدل چکے ہیں؟ نہیں ایسا بھی نہیں ہوا، وہ اب بھی اشراق و تہجد کی نمازیں پڑھتا ہے اور اُس کی رات کا کافی حصہ تسبیح و تہلیل اور ذکر و شغل میں گزرتا ہے ——— پھر کیا ہے ؟ "نفسیات" ! اور یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے مضامین اور تحریروں سے اُن کی نفسیات کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور اس مطالعہ کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ ہے! سینما کو وہ خود

[1] اس پر کہا جا سکتا ہے کہ حضورؐ جس طرح "ماہر" کے "آقا و مولا" ہیں اُسی طرح "عبدالماجد" کے بھی آقا و مولا ہیں، جی ہاں! ہیں، اور ضرور ہیں! مگر فرق یہ ہے کہ مولانا دریابادی اپنے "آقا و مولا" کے حریف کا ذب نبی اور اُس کی اُمت کے لئے اپنے دل کے اندر گنجائش رکھتے ہیں اور ماہر کے قلب میں اس گروہ کے خلاف نفرت کا شدید جذبہ پایا جاتا ہے!

بُرا سمجھتے ہیں اور اُس کی مضرتوں کا اظہار اپنے اخبار میں کرتے رہتے ہیں مگر ایک باوجود "فلم" دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے تھے اور اُس پر جو انہیں ٹوکا گیا تھا اور اپنے اس فعل کے جواز میں اُنھوں نے جو جو دلیلیں دی تھیں وہ اُن کی ذہنی کیفیت کی آئینہ دار ہیں، اس سلسلہ میں وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تک کی مثال لے آئے ——— یہی صورت جماعت اسلامی کی مخالفت میں پیش آرہی ہے کہ "ضد" ہے جو شدید سے شدید تر ہوتی جارہی ہے ——— "قادیانیوں" کے مسئلہ میں بھی اُن کی "ضدی طبیعت" طرح طرح کے گل کھلا رہی ہے!

"ضد" اگر اپنے حدود میں رہے تو زیادہ خطرناک نہیں ہوتی، لیکن اس کی شدت آدمی کو "کبر" اور غلط قسم کی خود اعتمادی اور خود رائی میں مبتلا کردیتی ہے، وہ اپنی بات کی پچ کیلئے روشن سے روشن دلیل ملنے سے انکار کرسکتا ہے، ورضدی طبیعت کے لوگوں نے ایسا کیا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات قبول حق کے معاملہ میں یہ عادت شدت اختیار کرکے "حجاب" بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مرض سے ہر صاحب ایمان کو محفوظ رکھے۔

حضرت مولانا تھانویؒ کے ارشادات!

قادیانیوں کی لاہوری جماعت جو مرزا غلام احمد قادیانی کو "نبی" نہیں "مجدد" مانتی ہے، اس جماعت کے اکابر مثلاً خواجہ کمال الدین اور مولوی محمد علی لاہوری کی دینی خدمات کو مولانا عبدالماجد دریابادی نے بہت سراہا ہے، حالانکہ ایک نبوت کے دعویدار کو "مجدد" کہنا اپنی جگہ خود کفر ہے اور "نبی" ماننے والوں تک کفر سے زیادہ[1] خطرناک اور پُرپیچ بھی! اور یہ قادیانیوں کی لاہوری جماعت "کفر" کے ساتھ ساتھ شدید قسم کی کذب بیانی میں بھی مبتلا ہے! مرزا غلام احمد کو مرے ہوئے کوئی سو دو سو سال نہیں ہوئے، اس شخص کے دیکھنے والے ابھی تک زندہ ہیں، اُس کی متعدد کتابیں موجود ہیں، جن میں مرزائے قادیان نے ڈنکے کی چوٹ کھلم کھلا "نبوت" کا دعویٰ کیا ہے، مگر یہ لاہوری جماعت کہتی ہے کہ مرزا (بجائی) نے نبوت کا نہیں بلکہ مجددیت کا دعویٰ کیا تھا

عجیب "حُسنِ اتفاق" ہے کہ ابھی چند روز ہوئے خود مولانا عبدالماجد دریابادی کی کتاب "حکیم الامت" دفتر "فاران" میں تبصرہ کیلئے وصول ہوئی، اس کتاب کے صفحہ ۵۲ پر خود مولانا صاحب موصوف کے ایک خط کا اقتباس درج ہے، جو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیجا گیا تھا:-

"ایک تراشہ "پیغام صلح" کا ملفوف ہے، یہ لاہور کی قادیانی جماعت کا پرچہ ہے، یہ لوگ ٹھیٹھ قادیانیوں کے مقابلہ میں بہت غنیمت ہیں۔ . . . . . ."

مولانا دریابادی کے اس استفسار کے جواب میں حضرت مولانا تھانویؒ نے تحریر فرمایا:—

" میں اس میں موافقت کرنے سے اس لئے معذور ہوں کہ اُن کے ضرر کو معتقدین نبوت مرزا کے ضرر سے اشد سمجھتا ہوں، کیونکہ وہ لوگ جب نبی کہتے ہیں سب کو نفرت ہوجاتی ہے اور خوفناک رہتے ہیں اور یہ لوگ جب نبوت کی نفی اور ولایت کا اثبات کرتے ہیں تو نفرت نہیں ہوتی اور اشتیاق ہوتا ہے اُس کی کتابیں دیکھنے کا، پھر دیکھ کر گمراہ ہوتے ہیں۔ . . . . " (صفحہ ۲۵۳)

---

[1] مثلاً کوئی مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی کو "نبی" تو نہ مانے مگر اُن کو "مجدد" کہے تو یہ کفر نہیں تو اور کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ مولانا تھانوی ؒ کی قبر کو اپنی رحمت کے پھولوں میں چھپا دے، اُن سے ایسے ہی حکیمانہ جواب کی توقع تھی، اس جواب میں نفسیات کی کتنی صحیح ترجمانی کی گئی ہے، یہ بات نہ ہوتی تو دنیا انھیں "حکیم الامت" کیوں کہتی۔

پھر اسی کتاب کے صفحہ ۲۹۰ پر مولانا دریا بادی کا ایک اور استفسار ہمیں ملتا ہے جو "قادیانیوں" سے متعلق نہیں ہے مگر اس سے ایک اُصول معلوم ہوتا ہے:۔

"اگر سب گمراہ فرقے یوں ہی خارج از اسلام کئے جاتے رہے تو مسلمان رہ ہی کتنے جائیں گے۔

(عبدالماجد دریابادی)

حکیم الامت ؒ اس کا جواب دیتے ہیں:۔

"اس کا ذمہ دار کون ہے، کیا خدا ناکردہ اگر کسی مقام میں بہ کثرت لوگ مرتد ہو جائیں اور تھوڑے ہی مسلمان رہ جائیں تو کیا اس مصلحت سے اُن مرتدین کو بھی کافر نہ کہا جائے گا؟"

مولانا دریابادی کا ایک اور مکتوب صفحہ ۳۰۵ پر ملتا ہے:۔

"اس اثناء میں غالی قادیانیوں کا ترجمہ پارہ اول ہاتھ آگیا، اپنے عجائب کے لحاظ سے زعفران زار ہے "و بالآخرۃ ہم یوقنون" کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہ "الآخرۃ" من قبلک" کے مقابل ہے یعنی "المتقین" وہ لوگ ہیں جو وحی محمدی سے قبل والی وحی پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور وحی محمدی کے بعد والی وحی پر بھی ایقان رکھتے ہیں وغیر ذلک مولوی محمد علی لاہوری کے ترجمہ میں اس درجہ کی لغویت کوئی نہیں، اصلی عیب اس میں وہی نیچریت کا ہے"

اس کے جواب میں مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے صرف ایک جملہ لکھ کر سب کچھ کہہ دیا۔

"ایک کانا، ایک اندھا، عیب دار سب ہیں"

صفحہ ۲۰۹ پر سوال اور جواب دونوں درج ہیں:۔

مولانا دریابادی:——— فتنہ قادیان کے سلسلہ میں ایک مسئلہ محض اپنی تشفی قلب کے لئے دریافت کرنا چاہتا ہوں، وہ لوگ یہ کہتے ہیں، ہم پر جو الزام اجراء نبوت کا عائد کیا ہے، تو اجراء نبوت کے تو اہلِ سنت بھی قائل ہیں، یعنی ظہور مسیح آخر الزماں کو مانتے ہی ہیں، اب گفتگو تعین شخصی میں رہ جاتی ہے، یعنی علامات و آثار مسیحیت کا مصداق آیا فلاں شخص ہے یا نہیں، تو اس میں اجتہاد کی بڑی گنجائش ہے، اس پر مختصراً کچھ ارشاد فرمایا جائے۔

حضرت مولانا تھانوی ؒ:——— اس[1] کا دعویٰ صرف مسیح کے ساتھ خاص نہیں، جس میں شبہ مذکورہ فی السوال کی گنجائش ہو، وہ تو مسیح، غیر مسیح سب کے لئے نبوت کو ممکن کہتا ہے اُس کے رسائل میں اس کی تصریح ہے، پھر مسیح میں بھی بقائے نبوت سابقہ (چونکہ موصوف کا کمال ذاتی ہے جو بعد عطا کے سلب نہیں ہوتا بدون ظہور آثار خاصہ تشریع وغیرہ جیسا خود عالم برزخ میں یہ کمال سب حضرات کے ذوات میں باقی ہے) عطاء نبوت کو مستلزم نہیں اور منافی ختم نبوت کے عطائے نبوت ہے، جس کا وہ اپنی ذات کے لئے مدعی ہے کیونکہ یہ پہلے موجود نہ تھا تاکہ اس نبوت

---

[1] حضرت مولانا تھانوی "مرزا غلام احمد" کو "صاحب" ... "واجب" نہیں لکھتے بلکہ ہر جگہ "اُس" کی ضمیر لاتے ہیں جو دلیل ہے اُن کی غیرت ایمانی کی!

کو سابقہ کہا جاسکے، نہ کہ بقا بہ شانِ مذکور ——— اور یہ بالکل ظاہر ہے"

"قادیانیت الملعون کے جھوٹے نبی کے بارے میں یہ خیالات ہیں حضرت حکیم الامتؒ کے، مگر مولانا عبد الماجد دریابادی کو نہ جانے قادیانیوں سے اس قدر ربط کیوں ہو گیا ہے کہ وہ اپنے مُربی اور مُرشد تک کی بات کو نہیں مانتے اور ان کے علی الرغم ہمدردی اور موانست کا جذبہ رکھتے ہیں، اور قادیانیوں کی طرف سے وکالت کئے جاتے ہیں

؎ خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے؟

قادیانیوں کی لاہوری جماعت کا جب ذکر چھڑا ہے تو ایک سچا قصہ بیان کر دوں ——— جونا گڑھ کے ایک اہلِ علم جاگیر دار کے یہاں خواجہ کمال الدین (آنجہانی) ٹھیرے ہوئے تھے اور اسی مکان کے (غالباً) بالا خانہ میں ایک درویش کا قیام تھا، خواجہ کمال الدین نے صاحبِ خانہ سے کہا کہ میں ان بزرگ سے ملنا چاہتا ہوں، میزبان نے شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ خواجہ کمال الدین جو قادیانیوں کی لاہوری جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ جماعت مرزا کو نبی نہیں مجدّد کہتی ہے، آپ سے ملنے کے بہت زیادہ خواہشمند ہیں، ان بزرگ نے جواب دیا "۔ ۔ ۔ کہ میں اس شخص سے مل تو لیتا مگر بھائی! غیرتِ نبوت اسے برداشت نہیں کر سکتی ۔ ۔ ۔"

یہ فتنہ عظیم؟

۱۸ اگست ۱۹۵۲ء کے "صدقِ جدید" میں یہ شذرہ دیکھ کر جو اذیت ہوئی ہے اُس کا لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا

دل کی چوٹیں کہیں الفاظ میں ڈھل سکتی ہیں
اتنی پُرسوز ہے اس پر بھی ادھوری ہے فغاں

اناالحق اور اناالنبی

صوفی شاہ نذیر احمد کاشمیری کے قلم سے اسی "صدق" کے پچھلے نمبر میں:-

"اگر قادیانی طبقہ اپنی پوزیشن کی اس طرح اصلاح کرلے کہ وہ اپنے شیخ کی تصدیق کو کسی صورت مدارِ ایمان نہ قرار دیں تو علماء تو یہ کریں کہ ان کی تکفیر سے اسی طرح دستکش ہوں کہ جس طرح منصور ابنِ حلاج جیسے لوگوں کے دعوئے "انا الحق" کے باوجود علماء کی اکثریت ان کی تکفیر سے بچتی رہی ہے اگر محض غلبۂ محبت کے امکان سے یہ "انا الحق" کا دعویٰ قابلِ تاویل ہے تو اگر کسی شخص نے کہیں انا النبی کہہ دیا تو اسے بھی ایسے ہی کسی امکان کے پیشِ نظر نظر انداز کر دیا جائے"

یہ تو صوفی شاہ نذیر احمد کے دماغ کی اُپج تھی، اب اس پر "صدقِ جدید" کے لائق مدیر کی حاشیہ آرائی ملاحظہ فرمایئے:-

"اور صوفی صاحب کا یہ وزنی دار مشورہ بیشک تمام سنجیدہ اور صاحبِ فہم و بصیرت علماء کے لئے قابلِ غور ہے ——— اپنے کو قادیانی دعووں میں اب تک جو بات سب سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ یہی کہ نہ کسی نہ

---

[۱] منصور ابن حلاج کے "انا الحق" کو سراہنے والے "صوفی" ذرا سوچیں کہ اس "غلبۂ محبت" کو کس کس عنوان سے لوگ استعمال کر سکتے ہیں اور اس میں کس قدر مفسدات پنہاں ہیں۔ [۲] جی! "قادیانیت" کی حمایت میں جو آواز بھی بلند ہوتی ہے "وزن دار" ہی ہوتی ہے، ہلکی باتیں تو یہ قادیانیوں کے مخالفین کیا کرتے ہیں ——— ناشدنی و گردن زدنی کہیں کے!

[۳] اس طنز میں نرمی اور احتیاط کا پہلو خاص طور سے قابلِ غور ہے ——— اور یہ "کھٹکنا" بھی مدیر صدق نے دل پر جبر کر کے لکھا ہے!

کسی عنوان سے بھی سہی، بہرحال یہ دعویٰ نبوت ایک اُمتی کی زبان سے نکلا کیونکر" لیکن حال میں اتفاق سے اس کی ایک نظیر مولانائے رومؒ کے کلام میں مل گئی —— اور وہ بھی اُن کے غیر مستند کلمات میں نہیں بلکہ مشہور و معروف اور مستند مثنوی ہی میں مرید اور پیر کے فضائل مراتب کے سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے:۔

چوں بہ دادی دستِ خود در دستِ پیر | پیرِ حکمت کو علیم ست و خبیر
کو نبیِ وقتِ ست اے مریدؔ | زانکہ زو نورِ نبی آید پدید

(دفترِ پنجم —— بہ عنوان درمیاں آنکہ ماسوای اللہ تعالیٰ ہر چیز آکل و ماکول است)

یہاں صاف ارشاد ہو رہا ہے کہ شیخ کامل "نبی وقت" ہوتا ہے اس لئے کہ اس کے انوار، نورِ نبوت ہی کا پرتو ہوتے ہیں! بڑے بڑے علماء، فضلاء، عارفین مثنوی کی شرح لکھتے چلے آئے ہیں، کسی نے اس طرزِ بیان پر نکیر نہ کی بلکہ خود حضرت مولانا رومیؒ کے صاحبزادہ سلطان ولدؒ سے تو یہ شرح بھی نقل ہوئی ہے:۔

"مبالغہ ست در تشبیہ ولی بہ نبی در اثر ارشاد، و الّا در ہیچ وقت بعد از حضرت محمدی نبوت محقق نیست"

(حاشیہ ۱۳، صـ۹۷ جلد ۵ مثنوی مطبوعہ نامی پریس کانپور)

ظاہر ہے کہ خلافِ احتیاط اسے بھی کہا جائے گا، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اس بے احتیاطی کی مثال سے اکابر کا کلام خالی نہیں ہے۔ اس بات کا کبھی وہم بھی نہ گزرا تھا کہ کسی مرفوع القلم اور مجذوب صفت مراسلہ نگار کی کوئی ایسی تحریر "صدق جدید" کے کالموں میں بار پاسکے گی، اور پھر اُس پر مدیر "صدق" اپنی طرف سے تائیدی حاشیے بھی چڑھادیں گے —— ہائے! اِن آنکھوں نے یہ قیامت خیز منظر بھی دیکھ لیا

؎ آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

ضد، ہٹ دھرمی اور کٹ حجتی کی انتہا ہو گئی!

۵۱؎ جزاک اللہ! عمرت دراز باد! ریسرچ کی ان گہرائیوں تک تو شاید قادیانی اہلِ تحقیق بھی نہ پہنچے تھے، اسی کو کہتے ہیں "مدعی سُست گواہ چُست" —— آپ جیسے اہلِ تحقیق، نکتہ شناس اور دیدہ وروں کی نگاہ سے ایسی "نظیر" بھلا چھوٹ سکتی تھی —— معلوم ہوتا ہے کہ شاید مولانا دریابادی قرآن کی تفسیر و ترجمہ کا کام چھوڑ کر مرزا غلام احمد کے دعوائے نبوت کی تائید میں نظیریں اور مثالیں فراہم کرنے میں ان دنوں معروف ہیں!

۵۲؎ ابن جوزیؒ اور ابن تیمیہؒ بیچاروں کو تصوف کی اس مضرت کی تو شاید ہوا بھی نہ لگی تھی، کہ نبوت کے جھوٹے دعویداروں کی تائید میں صوفی شاعروں کے شعروں سے سند لی جائے گی!

۵۳؎ "صدق جدید" میں یہ مصرعہ اسی طرح درج ہے!

۵۴؎ اگر ایسی باتیں بلکہ اس سے ملتی جلتی کوئی ذرا سی بات بھی، کسی دوسرے کی زبان اور قلم سے نکل جاتی تو دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے دارالافتاء سے تکفیر و تفسیق کے فتووں کی مہم کبھی کی جاری ہو چکی ہوتی —— مگر مولانا عبدالماجد دریابادی چونکہ انہی کے ایک فرد ہیں یا اُن کے بزرگوں سے نسبت رکھتے ہیں، لہٰذا آج ستمبر کی ۲۰ تاریخ تک ان دینی اور علمی اداروں میں حرکت اور بے چینی نظر نہیں آئی، یہ سب کچھ خاموشی کے ساتھ گوارا کیا جا رہا ہے! —— کا پیاں پریس میں جا رہی تھیں کہ ماہنامہ "دارالعلوم" (دیوبند) میں ایک مضمون نظر سے گزرا جس میں مولانا دریابادی کی اس روش پر جرح و تنقید کی گئی ہے —!

جن بزرگوں سے "انا الحق" کے علاوہ "قم باذنی" "سبحانی ما اعظم شانی" "پنجہ با پنجۂ خدا کردم" ۔ ۔ ۔ جیسے "شطحیات" منسوب کئے جاتے ہیں، اُن کے بارے میں پہلی بات تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ سب کے سب "ہفوات" ہیں، کسی تاویل کے بغیر ان سے اظہار برارت کرنا چاہئے اور دوسری بات یہ ہے کہ منصور ابن حلاج نے اگر "انا الحق" غلبۂ محبت ہی کے سبب کہہ دیا تھا، تو اُس نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ جو مجھے خدا نہیں مانتا یا میرے دعویٰ "انا الحق" کی تصدیق نہیں کرتا وہ کافر اور خارج از اسلام ہے اور نہ "انا الحق" کہنے والے نے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں "نبوت" "وحی" اور "کتاب" کا کوئی جداگانہ نظام پیش کیا تھا ——— یہاں یہ معاملہ نہیں ہے ——— مرزا غلام احمد کے تو یہ دعوے تھے :-

"ہر ایک شخص جس کو میری دعوت پہونچی ہو اور اُس نے مجھے قبول نہیں کیا وہ مسلمان نہیں ہے۔
(حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۶۳)"

"جو مجھے نہیں مانتا، وہ خدا اور رسول کو بھی نہیں مانتا کیونکہ میری نسبت خدا اور رسول کی پیشگوئی موجود ہے (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۶۳)

اپنے اس دعوے پر سند لانے کے لئے اس ظالم نے قرآن پاک تک میں معنوی تحریف کی ہے :-

• قل یا ایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً (اے مرسل من اللہ) کہہ (اے غلام احمد) اے تمام لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول ہوں (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۵۶ ج ۲ مجموعہ الہامات غلام احمد قادیانی)

• ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلہ (براہین احمدیہ صفحہ ۴۹۸)

اس میں صاف طور پر اس عاجز کو رسول کرکے پکارا گیا ہے ۔ ۔ ۔ !

"مجھے بتلایا گیا تھا کہ تیری خبر قرآن شریف اور حدیث میں موجود ہے اور تو ہی اس آیت کا مصداق ہے ۔ ۔ ھو الذی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (الیٰ آخرہ) (اعجاز احمدی ضمیمہ نزول المسیح صفحہ ۷ از غلام احمد قادیانی)

یہ تو نثر کے "الہامات" (معاذ اللہ!) تھے، اب ذرا مرزائے قادیان کی نظم کے چند شعر بھی کلیجہ پر پتھر کی سل رکھ کر پڑھ لیجئے :-

انبیاء گرچہ بودہ اند بسے	من بعرفاں نہ کمترم ز کسے
آنچہ داد است ہر نبی را جام	داد آں جام را مرا بہ تمام
کم نیم زاں ہمہ بروئے یقیں	ہر کہ گوید دروغ گو است و لعین

(درثمین صفحہ ۲۸۷ - ۲۸۸)

ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ صوفی شاہ نذیر احمد اور اُن کے موید مولانا عبد الماجد دریابادی سے کہ مرزا غلام احمد کی یہ "بکواس" کیا اُن کی نظر سے نہیں گزری، اگر گزری ہے تو اس سب کو کیا "انا الحق" کی طرح "غلبۂ محبت" سمجھ کر صرفِ نظر کر لیا جائے، ایک شخص صرف "انا النبی" کہہ کر ہی نہیں رہ جاتا، کتابوں پر کتابیں لکھتا ہے، اور پوری چالاکی کے ساتھ مسلمانوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کے لئے "بروزی" اور "ظلی" نبی کی اصطلاح تراشتا ہے، اپنے ماننے والوں کی عام مسلمانوں سے جدا اُمت بناتا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے توڑ پر ایک "اُمت" ظہور میں

آتی ہے جس میں مرزا کے ساتھی "صحابی" اور اس کے گھر کے لوگ "اہل بیت" کہے جاتے ہیں اور مرزا کی بیوی کو "ام المومنین" کا لقب دیا جاتا ہے، اور وہ لوگ اپنے سوا تمام مسلمانوں (غیر احمدیوں) کو کافر سمجھتے ہیں ——— کیا اس سوچے سمجھے ہوئے پروگرام اور برسوں کی جدوجہد کو مرزا کے "غلبۂ حال" - "غلبۂ محبت" - یا "سکر" سمجھ کر چشم پوشی اختیار کر لی جائے ——— ایک دجال اور کذاب کی حمایت کے لئے یہ نکتہ آفرینیاں، یہ موشگافیاں، یہ فلسفہ آرائیاں اور نازک خیالیاں! اور اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں کہ ان تمام تاویلات کی زد اُس صادق و مصدوق (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) کی "نبوت" پر آ کر پڑتی ہے؛ جس کی رسالت کی تصدیق کے بغیر "توحید" کا اقرار بھی ناتمام رہتا ہے!

اور یہ جو "بروزی" اور "ظلّی" نبی کی اصطلاحیں مرزا نے تراشی ہیں، آخر ان کے لئے قرآن اور حدیث میں کوئی سند ملتی ہے ——— اس کے جواب میں کہا جا سکتا کہ رسول اللہ نے "علماء اُمتی کانبیاء بنی اسرائیل" فرمایا ہے یعنی یہ کہ "میری اُمت کے علماء انبیاء بنی اسرائیل کی مثل ہوں گے" ——— اوّل تو یہ حدیث ہی اپنی جگہ محل غور ہے، اور فرض کر لیجئے درایت و روایت کی کسوٹی پر یہ حدیث پوری بھی اترتی ہو، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے کسی عالم کو کوئی نہ مانے بلکہ اس کی اہانت تک کر دے تو بھی ایسا کرنے والا دین سے خارج نہ ہوگا ——— مگر اس "بروزی نبی" کا نہ ماننے والا کافر ہے!

اور معاملہ صرف "بروزی" اور "ظلّی" نبوت ہی تک محدود نہیں ہے ——— اپنی کتاب اربعین میں مرزائے قادیان لکھتا ہے:-

"ہم درحقیقت نبی ہیں اور ہماری وحی قرآن کی طرح یقینی ہے"

"چونکہ میری وحی میں امر بھی ہے اور نہی بھی اور شریعت کے ضروری احکام کی تجدید بھی"[1]

"سچا خدا وہی ہے جس نے قادیان میں اپنا رسول بھیجا (دافع البلاء)

"حق یہ ہے کہ خدا کی وہ پاک وحی جو میرے پر نازل ہوتی ہے اس میں ایسے لفظ رسول اور مرسل اور نبی کے موجود ہیں نہ ایک دفعہ بلکہ ہزار دفعہ (براہین احمدیہ صفحہ ۴۹۸)

اور ان سب سے بڑھ کر یہ:-

"خدا نے ہزارہا نشانوں سے میری وہ تائید کی ہے کہ بہت ہی کم نبی گزرے ہیں جن کی یہ تائید کی گئی ہو، لیکن پھر بھی جن کے دلوں پر مُہریں ہیں وہ خدا کے نشانوں سے کچھ بھی فائدہ نہیں اُٹھاتے"

(تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۴۸ از غلام احمد)

پہلے اس شخص نے اپنے کو ایک مبلغ اور مصلح کی حیثیت سے پیش کیا اور وہ بھی اس انداز میں:-

---

[1] اس کے ساتھ میاں محمود قادیانی نے حقیقۃ النبوت کے صفحہ ۲۴ پر جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی ہاتھ کے ہاتھ پڑھ لیجئے:-
"پس اسلامی شریعت نبی کے جو معنی کرتی ہے، اس کے معنی سے حضرت مرزا صاحب ہرگز مجازی نبی نہیں بلکہ حقیقی ہیں۔"

"یہ عاجز مؤلف براہین احمدیہ حضرت قادرِ مطلق جل شانہٗ کی طرف سے مامور ہوا ہے کہ نبی اسرائیلی مسیحؑ کے طرز پر کمال مسکینی و فروتنی اور غربت و تذلل و تواضع سے اصلاح خلق کے لئے کوشش کرے۔"

(خط مندرجہ مقدمہ براہین احمدیہ صفحہ ۱)

پھر دس سال کے عرصہ میں یہ "سنے" بڑھتی ہی چلی جاتی ہے کبھی مجدد، کبھی امام زمان، کبھی خدا کے جانشین اور مہدی و محدث۔۔۔ یہاں تک کہ "بروزی" "نبی ہونے کا دعویٰ کر دیا جاتا ہے، یہ "مراق" بلکہ "خباثت" ترقی کر کے "تشریعی نبوت" تک پہونچ جاتی ہے جس کی مثالیں اوپر گزر چکی ہیں، "جہاد" کو جو مرزا نے منسوخ کیا ہے، یہ اسی "تشریعی نبوت" ہی کا تو شاخسانہ ہے!

بلند بانگ لغو اور متضاد دعووں کا ایک طوفان ہے کہ اُبلا پڑتا ہے:۔

"اور دانیال نبی نے اپنی کتاب میں میرا نام میکائیل رکھا ہے (حاشیہ اربعین صفحہ ۲۵)

"پہلے خدا نے میرا نام مریم رکھا اور بعد اس کے ظاہر کیا کہ اس مریم میں خدا کی طرف سے روح پھونکی گئی اور پھر فرمایا کہ روح پھونکنے کے بعد مریمی مرتبہ عیسوی مرتبہ کی طرف منتقل ہو گیا اور اس طرح مریم سے عیسیٰ پیدا ہو کر ابن مریم کہلایا (حاشیہ براہین احمدیہ صفحہ ۴۹۶)

"آریہ لوگ کرشن کے ظہور کا ان دنوں انتظار کرتے ہیں، وہ کرشن میں ہی ہوں۔" (حقیقۃ الوحی صفحہ ۸۵)

"اس کے لئے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے) چاند کے خسوف کا نشان ظاہر ہوا اور میرے لئے چاند اور سورج دونوں، اب کیا تو انکار کرے گا۔۔۔ (اعجاز احمدی صفحہ ۷۱)

یہ تو اس طوفانِ خباثت اور قلزم ضلالت کے چند قطرے ہیں جن سے کاغذ کو آلودہ کیا گیا ہے ——— یہ مرزائے قادیان کے "کفریات" تھے، اب اس کی "اُمت" کے ذمہ دار علماء اور اس کے جانشینوں کے چند اقوال ملاحظہ ہوں:۔

"ہمارا یہ بھی یقین ہے کہ اس اُمت کی اصلاح اور درستی کے لئے ہر ضرورت کے موقع پر اللہ تعالیٰ انبیاء بھیجتا رہے گا (فتویٰ محمود میاں مندرجہ الفضل قادیان جلد ۱۲ ۱۳۲ مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۲۵ء)

"مسیح موعود کا ذہنی ارتقاء آنحضرت سے زیادہ تھا، یہ جزوی فضیلت ہے جو حضرت مسیح موعود کو آنحضرت پر حاصل ہے۔" (قادیانی ریویو ۱۹۲۹ء)

"یہ بالکل صحیح بات ہے کہ ہر شخص ترقی کر سکتا ہے اور بڑے سے بڑے درجے پا سکتا ہے! حتیٰ کہ محمدؐ سے بھی بڑھ سکتا ہے۔ (الفضل جولائی ۱۹۲۲ء)

"کل مسلمان جو حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے، خواہ انہوں نے حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سنا وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں (آئینہ صداقت صفحہ ۳۵ از میاں محمود احمد)

سلہ یہ ابتدا تھی، اس کی انتہا ملاحظہ ہو۔

ابن مریم کے ذکر کو چھوڑو — اُس سے بہتر غلام احمد ہے (دافع البلاء صفحہ ۲۰)

محمد پھر اتر آئے ہیں ہم میں ۔ اور آگے سے بھی بڑھ کر اپنی شاں میں
محمد دیکھنے ہوں جس کو اکمل ۔ غلام احمد کو دیکھے قادیاں میں
(از قاضی محمد ظہور الدین از اخبار پیغام صلح ۱۴ مارچ ۱۹۲۶ء)

"درحقیقت خدا کی طرف سے خدائے تعالیٰ کی مقرر کردہ اصطلاح کے مطابق قرآنِ کریم کے بتلائے ہوئے معنیٰ کی رو سے جو نبی ہو اور نبی کہلانے کا مستحق ہو، تمام کمالاتِ نبوت اُس میں اُس حد تک پائے جاتے ہوں جس حد تک نبیوں میں پائے جانے ضروری ہیں، تو میں کہوں گا کہ ان معنیٰ کی رو سے حضرت مسیح موعود حقیقی نبی تھے۔" (القول الفصل صفحہ ۱۲ از میاں محمود احمد)

یہ ہے مرزائے قادیان کی مزعومہ "نبوت" کا کچا چٹھا اور اُس کی اُمت کے ذمہ دار علماء کے معتقدات ——— مولانا عبدالماجد دریابادی ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ وہ کس گروہ کی طرف سے مدافعت کر رہے ہیں؟ اور اُن کا ایسا کرنا کیا حق و صداقت کی حمایت ہے!! اب رہا مولانا موصوف کا تقویٰ اور اُن کی نیکوکاری تو صحابہ کرام جن کی یہ شان تھی:—

"رضی اللہ عنہ ورضوا عنہم"

اور جن کے اخلاص کی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی، اُن کو اللہ تعالیٰ نے وعید سنائی تھی اور متنبہ فرمایا تھا کہ رسول اللہ کی آواز پر آواز بلند نہ کرو، ورنہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں گے، تو رسول اللہ کے ایک حریف کی حمایت کے بعد نیکوکاری اور تقویٰ کی کیا قدر و قیمت رہ جائے گی، اس پر مدیرِ "صدقِ جدید" اچھی طرح غور کر لیں۔

خدا کرے مولانا عبدالماجد دریابادی صد و سی سال تک زندہ رہیں، مگر موت بہرحال ایک نہ ایک دن آنی ہے ——— اگر مرزا غلام احمد قادیانی اور اُس کی اُمت کی حمایت اور مدافعت کا جذبہ لئے ہوئے خدانخواستہ انہی حالات میں پیغامِ اجل آ گیا تو اُن کا خاتمہ کس چیز پہ ہو گا؟ اسے خوب اچھی طرح سوچ لیا جائے، کیونکہ قیامت کے دن مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی کے متبعین اور مریدین اور مرزائے قادیان کے اُمتی اور مریدین ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے!

اور یہ جو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا شعر مثال میں پیش کیا گیا ہے کہ انھوں نے مُرشد کو "نبی وقت" لکھا ہے، تو مولانا عبدالماجد دریابادی جو شعر و ادب کی نزاکتوں، تشبیہوں اور استعاروں سے اچھی طرح واقف ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ اس قسم کی "مبالغہ آمیزیاں" شاعروں سے کبھی کبھار ظہور میں آ جاتی ہیں! عارفِ رومیؒ نے دین و شریعت اور حدیث و فقہ کا کوئی کلیہ یا اصول اس شعر میں بیان نہیں کیا، یہ محض شاعرانہ اصطلاح ہے، مرزا غلام احمد قادیانی کے "دعویٰ نبوت" کے لئے اس شعر سے دلیل لانا کسی اعتبار سے بھی درست نہیں ہے! کیا مولانا دریابادی کا ضمیر اس پر مطمئن ہے کہ عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ نے مُرشد کو جو "نبی وقت" کہا ہے تو اُس "مرشد" کا ماننا ایمانیات میں داخل ہے اور اُس کا انکار کفر ہے۔

یہ تو ایسی ہی بات ہے، جیسے میر تقی میر کو بعض لوگ "خدائے سخن" لکھا کرتے ہیں، یا علامہ اقبال کے بارے میں مولانا گرامی نے کہا تھا:—

در دیدۂ معنی نگراں حضرتِ اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

کیا یہ "پیغمبری کرد" نبوت کے دعویداروں کے لئے سندِ جواز بن سکتی ہے؟ خود اقبال نے بعض مشاہیر کے لئے اسی قسم کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

یا

آں کلیم بے تجلّی آں مسیحِ بے صلیب

ایک مشہور شاعر نے تو یہاں تک کہہ دیا

ایک ایک حرف میر اُترتا ہے عرش سے
میری بیاضِ شعر خدا کی کتاب ہے

تو اب کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ مجھ پر سچ مچ وحی آتی ہے، اور اپنی "وحی" کو ایک کتاب میں نقل کرکے اُسے "خدا کی کتاب" کہنے لگے ——— تو اس سے کیا یہ کہہ کر "صرفِ نظر" کی جا سکتی ہے کہ اس سے پہلے فلاں شاعر نے اپنی بیاضِ شعر کو "خدا کی کتاب" کہا ہے اور اُس پر کسی نے بھی نکیر نہیں کی اس لئے اس شخص نے کہہ دیا تو کونسی قیامت ٹوٹ پڑی؟

کیا مرزائے قادیان نے اپنے کو شاعرانہ زبان[1] میں "نبی" کہا تھا اور اُس کی تمام کتابیں "شاعرانہ مصطلحات" میں لکھی ہوئی ہیں، اور اُس کے تمام اُمتی اپنے فکر و معتقدات کے اعتبار سے "شعراء" واقع ہوئے ہیں ——— اگر فکر و استدلال کی اس سطح تک ہی مدیر "صدق" اُتر آئے ہیں تو یہ لکھ کر وہ بحث کو ختم کر دیں کہ مرزائے قادیان نے شاعرانہ اصطلاح میں اپنے کو "نبی" کہا تھا اور چونکہ معشوق کو شاعری کی زبان میں "کافر" کہا جاتا ہے، لہٰذا ان کو "کافر" بھی شاعرانہ زبان ہی میں کہا جا رہا ہے ——— جب دین و ایمان کا معاملہ شعر و شاعری کے "لطیفوں" تک آگیا ہے تو اس ایک لطیفہ کا اور اضافہ سہی!

کُفر و ارتداد کی حمایت

اسی ۸ راگست کے "صدقِ جدید" میں ایک نہیں دو دو تشذرے قادیانیوں کی حمایت میں، "زیبِ قرطاس" (؟) فرمائے گئے ہیں:۔

ایک ضروری تصحیح

"بعض مولویوں کے اس خیال پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہ احمدی مرتد ہیں اور مرتد کی سزا قتل ہے۔ . . . مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے اپنے مشہور روزنامہ ہمدرد میں پے در پے تین مقالات اس موضوع پر لکھے۔ پہلے دو مقالوں میں قرآن اور حدیث سے یہ ثابت کیا کہ اسلام میں مرتد کی کوئی سزا نہیں اور تیسرے مقالہ میں بتایا کہ کیا احمدی مرتد و کافر ہیں؟"

(پیغام صلح - لاہور ۹ر جولائی ۵۲ء)

---

[1] اگرچہ "خدا" "نبی" "الکتاب" "وحی" وغیرہ کا اس طرح شاعرانہ زبان میں بھی استعمال شدید ترین بے اعتدالی ہے۔

ہمعصر موصوف کو ایک مغالطہ اس بیان میں اچھا خاصہ ہو گیا ہے جس میں بڑی حد تک وہ معذور بھی ہیں۔ اس کا یہ بیان بیشک صحیح ہے کہ ۱۹۲۳ء میں ہمدرد میں تین ایڈیٹوریل اس موضوع پر نکلے تھے، یہ بھی صحیح ہے کہ مولانا مرحوم اس باب میں عام علماء کے ہم مسلک نہ تھے۔ بلکہ بعض علماء اور بہت سے پڑھے لکھے مسلمانوں (مثلاً مولانا ابوالکلام، مولانا محمد علی قصوری، سید حبیب شاہ مرحوم، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، مولانا اسلم جے راجپوری، عارف ہسوی، حکیم اجمل خاں مرحوم، سالک صاحب، خواجہ حسن نظامی، شوکت علی مرحوم اور غالباً مولانا شبلی اور مہر صاحب کی طرح مولانا مرحوم بھی اہل قادیان کو باوجود سخت غلط اور گمراہ اور مبتدع سمجھنے کے کافر مرتد خارج از اسلام نہیں سمجھتے تھے۔ اور یہی مسلک "قائد اعظم" جناح صاحب اور مسلم لیگ کے سارے اکابر کا بھی رہا ہے۔ جیسا کہ سر ظفر اللہ خاں کی صدارت مسلم لیگ کے وقت (غالباً ۱۹۳۲ء میں) اکابر لیگ کی طرف سے ظاہر ہو کر رہا۔ لیکن بہر حال ہمدرد کے وہ تینوں مقالے مولانا کے قلم کے نہ تھے۔ ہمدرد کے ایڈیٹوریل عام طور پر مولانا کے قلم سے کبھی ہوتے ہی نہ تھے حالانکہ اخبار کی پیشانی پر نام انھیں کا بحیثیت ایڈیٹر کے درج رہتا تھا، عموماً وہ صرف کامریڈ میں لکھتے۔ ہمدرد میں جب کبھی انہیں لکھنا ہوتا تو وہ اپنے نام کے ساتھ لکھتے۔ ہمدرد کے وہ تینوں مقالے عارف ہسوی مرحوم کے قلم سے تھے۔ مولانا نے خود جو بڑا طویل مقالہ ۲۲ کالموں کا اس موضوع پر لکھا تھا وہ کامریڈ میں نکلا تھا اور آج بھی جہاں کامریڈ کی فائلیں محفوظ ہیں ان میں دیکھا جا سکتا ہے، فروری مارچ ۱۹۲۵ء کے تین نمبروں میں ——— گاندھی جی نے بحیثیت صدر کانگریس اس وقت اہل قادیان سے جو ہمدردی کی تھی، اس کا ذکر بھی اس وقت کے کامریڈ میں ملے گا۔

شذرہ کا عنوان تجویز فرمایا ہے "ایک ضروری تصحیح" کس کی؟ "پیغام صلح" کی ایک فرو گزاشت کی! اس کے لئے دو چار سطریں کافی تھیں مگر مدیر "صدق" نے اس "تصحیح" کے ساتھ قادیانیوں کی مدافعت کا حق بھی ادا کر دیا، اس گمراہ فرقہ سے مولانا دریابادی کو نہ جانے کیوں اتنا ربط ہو گیا ہے!

یہ جو فرمایا گیا ہے کہ "مولانا (محمد علی جوہر) اس باب میں عام علماء کے ہم مسلک نہ تھے، بلکہ بعض علماء اور بہت سے پڑھے لکھے مسلمانوں . . . . . کی طرح مولانا بھی اہل قادیان کو باوجود سخت غلط اور گمراہ، اور مبتدع سمجھنے کے کافر، مرتد اور خارج از اسلام نہ سمجھتے تھے . . . . . " تو ازراہ کرم جہاں بہت سے پڑھے لکھے مسلمانوں کے نام ظاہر فرما دیئے ہیں وہاں "بعض علماء" کے نام بھی بتا دیے جاتے جو اہل قادیان "کو مسلمان سمجھتے تھے یا سمجھتے ہیں ان علماء میں صرف کسی ایک عالم ہی کا نام یہاں لکھ دیا ہوتا۔ مولانا شبلی کا نام لکھا ہے تو اس سے پہلے "غالباً" بھی تحریر فرما دیا ہے، مقصد اس "غالباً" سے بھی قادیانیوں کی پوزیشن کو مضبوط کرنا اور ان کے "اسلام اور ایمان" کے لئے دلیل لانا ہے جو بیچارے "غالباً" کی نزاکت کو نہ سمجھ سکیں گے یا تحقیق نہ کر سکیں گے کہ وہ اس (غالباً) سے "یقیناً" اور "واقعۃً" کا مفہوم اخذ کریں گے اور جو اس پر احتجاج کریں گے کہ مولانا شبلی کا یہ عقیدہ نہ تھا، تو مولانا دریابادی بڑی آسانی کے ساتھ دامن بچا کر صاف نکل جائیں گے کہ میں نے اسی شبہ اور غلط فہمی کے ڈر سے "غالباً" پہلے ہی لکھ دیا تھا! ان "قادیانیوں" کو بھی نفس اور بل تحقہ . کا بھیث غریب درد مند دکیل "تقدیر سے مل گیا ہے!

اب رہے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا اسلم جیراجپوری کا معاملہ تو ان حضرات کی کوئی ایسی تحریر ہماری نظر سے نہیں گزری کہ انھوں نے

قادیانیوں کے کفر و ارتداد کی تردید اور اُن کے ایمان اور اسلام کی تردید میں کچھ لکھا ہو ——— دوسری بات یہ ہے کہ مولانا ابوالکلامؒ آزاد نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن میں "نجات" کے سلسلہ میں جن چیزوں کو مدارِ ایمان بتایا ہے اور اُن کے اس عقیدہ پر جو تنقیدی مضامین شائع ہوئے ہیں اُس سے مولانا عبدالماجد دریابادی ناواقف نہ ہوں گے، میں اس بحث کو یہاں چھیڑنا نہیں چاہتا، ارباب خبر کیلئے اتنا اشارہ بہت کافی ہے ——— رہے مولانا اسلم جیراجپوری تو وہ چونکہ حضورؐ کی سنت کو دین میں حجت نہیں مانتے اور نہ حضورؐ کی اطاعت کو داخلِ ایمان سمجھتے ہیں بلکہ "اطیعوا الرسول" کے صریحی حکم کی طرح طرح سے تاویلیں کرتے ہیں اس لئے "نبوت" یا "ختمِ نبوت" کے سلسلہ میں اُن کے اقوال قطعاً لائقِ اعتماد اور درخورِ اعتنا نہیں ہیں، ان ناموں میں ایک نام خواجہ حسن نظامی کا بھی نظر آتا ہے، حیرت ہے کہ خواجہ صاحب کا نام لکھتے ہوئے مولانا دریابادی کے ضمیر نے اُن کے ہاتھوں کو ذرا سا بھی جھٹکا نہیں دیا، ان صاحب کی دینی بصیرت، مبلغِ علم اور سب سے بڑھ کر اُن کی روش کی رنگا رنگی اور بوقلمونی کو مولانا موصوف بہت اچھی طرح جانتے ہیں، رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ صاحب کے درمیان جو قلمی معرکہ آرائیاں رہی ہیں وہ بھی مولانا دریابادی کی نگاہوں سے گزر چکی ہیں ——— مگر یہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے قادیانیوں کی طرف سے صفائی کے گواہوں میں اس نام نامی (؟) کا اضافہ ذہن و فکر کے انقلاب کی ایک عجیب مثال، اور اصابتِ فکر اور دیانت و ثقاہت کا ایک نادر نمونہ ہے!

جن پڑھے لکھے لوگوں کے نام مدیر "صدقِ جدید" نے تحریر فرمائے ہیں اُن میں سے بعض تو اس دنیا ہی میں نہیں ہیں اور جب مرحومین کے نام ہی لکھنے ٹھیرے تو پھر سید حبیب شاہ اور حکیم اجمل خاں کے ناموں کے ساتھ مشیر حسین قدوائی، تصدق احمد خاں شیروانی، مولوی محمد شفیع داؤدی، مظہر الحق، نواب نصیر حسین خیال، ڈاکٹر محمد اسلم اور حافظ ہدایت حسین مرحومین کے ناموں کا بھی اضافہ فرما دیا جاتا تو صفائی کے ان گواہوں کی فہرست خاصی طویل اور وزنی ہو جاتی ——— ہم دریافت کرتے ہیں کہ سید حبیب شاہ اور حکیم اجمل خاں کی کیا کوئی تحریر قادیانیوں کی "عدمِ تکفیر" کے بارے میں دکھائی جا سکتی ہے، کوئی ثقہ راوی پیش کیا جا سکتا ہے جس نے اپنے کانوں سے یہ سنا ہو کہ یہ لوگ قادیانیوں کو مرتد اور کافر نہیں سمجھتے تھے ——— مرحومین میں قادیانیوں کو کافر اور مرتد کون کون نہیں سمجھتا اس فہرست کو ترتیب دینے کا شرف بھی سب سے پہلے مولانا عبدالماجد دریابادی ہی کے حصہ میں آیا، آخر اس "نیکی" سے اُن کا اعمال نامہ خالی کیوں رہ جاتا!

اگر درایت و روایت کا یہی اصول مقرر کر لیا جائے تو پھر ہر آدمی سے ہر بات منسوب کی جا سکتی ہے ——— مثلاً کہا جا سکتا ہے کہ مولانا شیخ الہند محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ مسیلمہ کو کافر و مرتد نہیں سمجھتے تھے، اس لئے کہ اُن کی تمام تحریروں میں "مسیلمہ کذاب" کی تکفیر کا کہیں ذکر نہیں آیا، اور نہ اُن کی روزمرہ کی گفتگو اور عام وعظوں میں کوئی ایسی بات سنی گئی ——— فرعون اور نمرود سے لیکر مرزا غلام احمد کے زمانہ تک جتنے مشاہیر کفار، مرتدین اور ربوبیت و نبوت کے جھوٹے دعوے دار گزرے ہیں اُن سب کی نام بہ نام تکفیر کیا ہر عالم اور ہر مسلمان کی زبان اور قلم سے ہونی ضروری ہے، اور اگر نہیں ہوئی تو پھر اس کے یہ معنی نکالے جائیں کہ فلاں عالم یا فلاں مسلمان فلاں مرتد یا نبیِ کاذب کی تکفیر ہی کا سرے سے قائل نہ تھا، یہ عجیب و غریب منطق اور بڑے خطرناک قسم کا مغالطہ ہے۔

مولانا شوکت علی مرحوم کے بارے میں مجھ سے بیان کرتے ہیں، ایک صاحب نے اُن کی گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے (جو انہوں نے اپنے کانوں سے سنی تھی) کہا ہے کہ مولانا مرحوم نے قادیانیوں کو اپنی زبان سے کافر کہا ——— مولانا محمد علی مرحوم جب حجاز تشریف

لے گئے ہیں تو اُن کے اِس سفر کے حالات یا تو میں نے کسی اخبار[1] میں پڑھے ہیں یا کسی معتمد علیہ شخص کی زبان سے سُنے ہیں ——— کہ کعبہ کا پردہ تھام کر مولانا نے جو دُعائیں کی تھیں اُن میں سے ایک دُعا اُنھوں نے اپنے قادیانی بھائی ذوالفقار علی خاں گوہر کیلئے کی تھی کہ اُن کو قادیانیت سے توبہ اور اسلام کی طرف واپسی نصیب ہو۔

اس سلسلہ میں آخری بات یہ کہنے کی ہے کہ فقہی مسائل کا اختلاف یا اجتہاد و قیاس کا معاملہ تو دوسرا ہے مگر کسی ایسی چیز پر جس پر ایمان اور نجات کا مدار ہے اگر تمام علما اور سیاسی لیڈر غلط طور پر متفق ہو جائیں تو اُن کی بات ہرگز تسلیم نہیں کی جائے گی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کا نبوت کا دعویٰ کرنا اور اس دعوے کے سبب اُسی کاذب کو کافر نہ سمجھنا، ایک ایسی ہی چیز ہے جس کے سلسلہ میں کسی کی بات نہیں سُنی جا سکتی، اور نہ اس خصوص میں تاویلات کو قبول کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب گمراہی کی باتیں ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر نبوت ختم ہو گئی، منشورِ رسالت پر آخری مُہر لگا دی گئی، بس اب کوئی نبی "کسی قسم" اور کسی حیثیت کا بھی نہیں آسکتا، اور جو ایسا دعویٰ کرے گا اُس کو کذّاب، خدّاع، مُفتری، کافر اور مُرتد سمجھا جائے گا ——— حضور ختمی مرتبت کے بعد کسی کا "دعویٰ نبوت" کرنا شدید غلطی اور گمراہی ہی نہیں بلکہ صریح اور واضح کفر ہے، جس میں نہ تاویل کی گنجائش ہے اور نہ موشگافیوں کی۔ جو کوئی اس صریحی کفر اور کھلے ہوئے ارتداد کو صرف گمراہی، بدعت اور غلطی سے تعبیر کر کے رُک جاتا ہے اور "کفر" نہیں کہتا، اُس کے ایمان کی بنیاد متزلزل ہو چکی ہے، اور شیطان نے اُس کو اعتدال و توسع اور بیجا احتیاط کے وہم اور وسعتِ قلب اور کشادہ خاطری کے زعمِ باطل میں مبتلا کر دیا ہے، اس لئے قادیانیوں کو معتزلہ، قدریہ، جہمیہ، خارجیوں، بدعتیوں اور شیعوں کی سطح پر ہرگز نہیں رکھا جا سکتا، عقاید کا عدمِ اعتدال، غلو اور گمراہی اور چیز ہے اور "کفر" و "ارتداد" اور چیز ہے، ان دونوں میں امتیاز کرنا ضروری ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کو عارف ہسوی، سید حبیب شاہ جلال پوری، اور خواجہ حسن نظامی کے نام تو یاد رہے کہ ان لوگوں نے ان کے قول کے مطابق "قادیانیوں" کو گمراہ تو سمجھا مگر کافر اور خارج از اسلام نہیں سمجھا ——— لیکن مولانا موصوف کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن، حضرت مولانا انور شاہ صاحب، حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور حضرت مولانا سید شاہ سلیمان پھلواروی (رحمہم اللہ تعالیٰ) کے نام یاد نہ آئے جو قادیانیوں کے ارتداد اور کفر کے صریحی طور پر قایل تھے اور جو دین میں درجۂ استناد رکھتے تھے ——— اور دین کے معاملات میں سیکڑوں حبیب شاہ ہزاروں عارف ہسوی اور لاکھوں حسن نظامی بھی اُن میں سے کسی ایک کا بھی سد بہ نہیں کر سکتے۔

جائزہ

مرزا غلام احمد قادیانی کی زندگی کے حالات اور کوائف جو میں نے پڑھے ہیں اُن کو پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اب سے ساٹھ برس پہلے کتابوں اور رسالوں کا آج کی طرح رواج نہ تھا، اور مذہب اخلاق پر لکھنے والوں کی بھی بہتات نہ تھی، مرزا نے مذہب پر جن خیالات کا شروع شروع میں اظہار کیا، بہر حال ان کا تبلیغی انداز تھا، اور لوگوں نے اُسے پسند کیا، اور یہی لوگوں کی پسندیدگی اُس کیلئے ایک مستقل فتنہ

---

[1] میں پوری دیانت اور ذمہ داری کے ساتھ اس کا حوالہ دے رہا ہوں اس ذمہ داری کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ کے روبرو مجھے اس کی جوابدہی کرنی ہے، یہ اب سے پچیس برس سے بھی کچھ پہلے کی بات ہے پوری تفصیل ذہن میں نہیں رہی مجھے کیا خبر تھی کہ اس اخبار کے حوالہ کی ضرورت کبھی پیش آئے گی ورنہ میں اس کا تراشہ محفوظ کر لیتا۔

کا سبب بن گئی ـــــــ چھوٹے پیمانہ پر مرزا یگانہ چنگیزی کے یہاں یہی چیز ملتی ہے کہ اس شخص کی شاعری کی جو شہرت ہوئی تو اُس شہرت کو وہ سنبھال نہ سکا، اور اُس کے ذہن میں یہ خناس سما گیا کہ آج مجھ سے بڑا کوئی شاعر نہیں ہے، اسی احساس کمتری کی بنا پر اُس نے "غالب" پر نہ صرف یہ کہ تنقید کی بلکہ اتنے بڑے مستند و مقبول و محبوب شاعر کو بے نقط گالیاں دیں، غالب کے قدردانوں کو "غلیچے" کہا، پھر علامہ اقبال پر ہاتھ صاف کیا، اور اُن کو خوب جلی کٹی سنائی اور اس انداز میں تنقید کی جو ایک شریف اور متوازن دماغ کے ناقد کو کسی طرح زیب نہیں دیتی پھر خود اپنی تعریف میں قصیدہ خوانی کی، اپنے کلام کے مجموعہ کو "سوائے زمانہ چنگیز خاں" کے نام سے معنون اور منسوب کیا اور اُس کو "پیغمبر قہر و عذاب" اور "چنگیز خاں اعظم" جیسے القاب سے یاد کیا، اس نے یہاں تک بڑھی کہ اس کمبخت نے قرآن کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو بھی تنقید کا نشانہ بنا ڈالا، "صدق جدید" میں اس پر احتجاجی نوٹ آچکا ہے دہلی کے جس رسالہ میں یہ مضمون شائع ہوا ہے اُس کے ہندو ایڈیٹر نے تو اس مضمون کی اشاعت پر معذرت اور افسوس کا اظہار کیا مگر یہ شخص اسی طرح دوڑن کی لے رہا ہے اور اسی خباثت نفس میں مبتلا ہے ـــــــ بلکہ "فزادہم اللہ مرضا" کا مصداق ہے!

مرزا غلام احمد قادیانی کی نفسیاتی کیفیت کا قریب قریب یہی حال تھا، اس چنگیزی مرزا کا پیمانہ ذرا چھوٹا ہے، قادیانی مرزا کا پیمانہ بڑا تھا اس نے گندگی کی مقدار بھی زیادہ ہے ـــــــ مرزا چنگیزی نے "احساس کمتری" کے ہاتھوں اپنی برتری جتانے کے لئے اُردو کے سب سے بڑے غزل گو "غالب" کو نشانۂ تنقید بنایا، اور مرزائے قادیان کا میدان چونکہ دوسرا تھا، اس لئے اُس نے اس میدان کے سب سے بڑے شہسوار ـــــــ حضور اقدس سیدنا محمد رسول اللہ خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے مقابلہ میں اپنی "نبوت" کا دعویٰ کیا اور حضورؐ کی اُمت کے توڑ پر ایک جداگانہ اُمت بنا ڈالی!

مرزائے قادیان ایک تو "احساس کمتری" اور "زعم برتری" میں مبتلا تھا اُس کے ساتھ اُس کو جسمانی عوارض بھی لاحق تھے۔ ۔ ۔ ۔ وہ خود (اربعین ۔۔۔ ۔۔۔) لکھتا ہے:۔

"میں ایک دائم المریض آدمی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ہمیشہ درد سر اور دوران سر اور کمی خواب اور تشنج دل کی بیماری دورہ کے ساتھ آتی ہے اور دوسری بیماری ذیابیطس ہے کہ ایک مدت سے دامنگیر ہے اور بسا اوقات سو سو دفعہ رات کو یا دن کو پیشاب آتا ہے ۔ ۔ ۔ اور اس قدر کثرت پیشاب سے جس قدر عوارض ضعف وغیرہ ہوتے ہیں وہ سب میرے شامل حال رہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔"

اور سنئے:۔

"مجھے دو مرض دامنگیر ہیں، ایک جسم کے اوپر کے حصہ میں کہ درد سر اور دوران سر اور دوران خون کم ہو کر ہاتھ پیر سرد ہو جانا، نبض کم ہو جانا اور دوسرے جسم کے نیچے کے حصے میں کہ پیشاب کثرت سے آنا اور اکثر دست آتے رہنا، یہ دونوں بیماریاں قریب تیس برس سے ہیں۔ ۔ ۔ ۔" (نسیم دعوت صفحہ ۶۸ از غلام احمد)

مکتوب احمدیہ جلد پنجم صفحہ ۲۱ (مجموعہ مکتوبات مرزا غلام احمد) میں یہ خط بھی ملتا ہے:۔

"مکرمی اخویم سلمہ میرا حافظہ بہت خراب ہے اگر کئی دفعہ کسی کی ملاقات ہو تب بھی بھول جاتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حافظہ کی یہ ابتری ہے کہ بیان نہیں کر سکتا ـــــــ" خاکسار غلام احمد از صدر انبالہ ناگ پھنی۔

یہ تو قادیان کے جھوٹے نبی کی بیماری کی کہانی خود اُس کی زبانی تھی، اب اُس کے ایک اُمتی کا بیان سنئے:۔

"پہلے بھی کئی دفعہ ایسا ہوا کہ جب حضور سخت دماغی محنت کیا کرتے تو اچانک آپ کے دماغ پر ایک کمزوری کا حملہ ہوتا اور بے ہوش ہو جاتے۔ ۔ ۔ ۔ (منظر وصال از مفتی محمد صادق قادیانی مندرجہ اخبار الحکم قادیان خاص نمبر مورخہ ۲۱ مئی ۱۹۳۴ء)

رسالہ ریویو قادیان (بابت ۱۸ مئی ۱۹۳۴ء) کا یہ اقتباس بھی لگے ہاتھوں پڑھ لیجئے:۔

"حضرت (مرزا) صاحب کی تمام تکالیف مثلاً دوران سر، درد سر، کمی خواب، تشنج دل، بدہضمی، اسہال، کثرت پیشاب اور مراق وغیرہ کا صرف ایک ہی باعث تھا اور وہ عصبی کمزوری تھا۔ ۔ ۔ ۔ "

"احساس کمتری" نے مرزا کو بڑا آدمی بننے کے خبط میں مبتلا کیا، اُس پر مستزاد یہ کہ اُس کی صحت خراب تھی، طرح طرح کے جسمانی عوارض لاحق تھے اس کے ساتھ کچھ تعریف کرنے والے اور عقیدت رکھنے والے بھی ہاتھ آگئے بس یہ چیزیں مل ملا کر "مراق" بن گئیں اور ایک حالاک مراقی کی طرح اُس کے ذہن رسا نے اپنی بڑائی کا مظاہرہ شروع کیا ——— کبھی مجددیت کا دعویٰ، کبھی "امامزماں" کا نعرہ کبھی اس خرافات کا اظہار کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے مجھے مخاطب کیا ہے کبھی یہ کہ آدم ہوں، شیث ہوں میں ابراہیم ہوں، اسحاق ہوں، میں اسماعیل ہوں، میں یعقوب ہوں، میں یوسف ہوں، میں موسیٰ ہوں، میں داؤد ہوں، میں عیسیٰ ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کا مظہر اتم ہوں، یوں ظلی طور پر میں محمد اور احمد ہوں (حاشیہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۷۲ نزول المسیح صفحہ ۲) کبھی یہ خرافات بکے کہ

صد حسین است در گریبانم

اور کبھی اپنے کو انبیاء کرام پر فضیلت دی اور خاص طور سے حضرت مسیح علیہ السلام کی تنقیص کی کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کی تعداد تین ہزار اور اپنے معجزات کی تعداد تین لاکھ بتائی ———

ان تمام مقدمات کو ذہن میں رکھ کر مرزا کی زندگی کے اس رُخ کو بھی خاص طور پر دیکھئے کہ انگریزی حکومت کی تعریف و منقبت اور نصرت و حمایت کا کام وہ مذہبی فریضہ سمجھ کر انجام دیتا ہے:۔

"اب اس تمام تقریر سے جس کے ساتھ میں نے اپنی سترہ سالہ مسلسل تقریروں سے ثبوت پیش کئے ہیں صاف ظاہر ہے کہ میں سرکار انگریزی کا بدل و جان خیر خواہ ہوں اور میں ایک شخص امن دوست ہوں اور اطاعت گورنمنٹ اور ہمدردی بندگان خدا میرا اصول ہے اور یہ وہی اصول ہے جو میرے مریدوں کی شرائط بیعت میں داخل ہے۔ ۔ ۔ ۔ (ضمیمہ کتاب البریہ صفحہ ۱۹ از غلام احمد قادیانی)

"میں اپنے کام کو نہ مکہ میں اچھی طرح چلا سکتا ہوں نہ مدینہ میں، نہ روم میں، نہ شام میں، نہ ایران میں، نہ کابل میں مگر اس گورنمنٹ میں جس کے اقبال کے لئے دعا کرتا ہوں، لہٰذا وہ اس الہام میں ارشاد فرماتا ہے کہ اس گورنمنٹ کے اقبال اور شوکت میں تیرے وجود اور تیری دعا کا اثر ہے اور اس کی فتوحات تیرے سبب سے ہے کیونکہ جدھر تیرا منہ ادھر خدا کا منہ ہے"

(اشتہار مرزا غلام احمد مورخہ ۲۲ مارچ ۱۸۹۷ء مندرجہ "رسالت" صفحہ ۶۹ ج ۶)

برطانیہ جیسی ظالم، مسلم کش، اور اسلام دشمن حکومت کی قصیدہ خوانی، دعا گوئی اور خیر خواہی بے شک ایک جھوٹے نبی ہی کو سزاوار ہے، اور جس نے کہا سچ کہا کہ قادیانیت برطانیہ کا خود کاشتہ پودا ہے اور اُسی کی عنایتوں کے سہارے یہ پروان چڑھا ہے۔

انگریز مسلمانوں کے "جہاد" سے بہت ڈرتا تھا ——— اس خطرے کو دور کرنے کے لئے مرزائے قادیان سامنے "آیا" بلکہ لایا گیا، اُس نے اعلان کیا:-

"یاد رہے! کہ مسلمانوں کے فرقوں میں سے یہ فرقہ جس کا خدا نے مجھے امام اور پیشوا اور رہبر مقرر فرمایا ہے اور وہ یہ کہ اس فرقہ میں تلوار کا جہاد بالکل نہیں اور نہ اس کی [١] انتظار ہے، بلکہ یہ مبارک فرقہ نہ ظاہر طور پر اور نہ پوشیدہ طور پر جہاد کی تعلیم کو ہرگز جائز نہیں سمجھتا اور قطعاً اس کو حرام جانتا ہے۔ (تریاق القلوب صفحہ ۳۳۲ تیسرا ایڈیشن)

اللہ تعالیٰ نے جس "جہاد" کے لئے قرآن پاک میں بار بار مسلمانوں کو اُبھارا ہے اُس کو منسوخ کرنے والے "کاذب نبی" کے چند شعر بھی ذرا پڑھ لیجئے:-

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو! خیال — دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال
اب آگیا مسیح جو دین کا امام ہے — دیں کے تمام جنگوں کا اب اختتام ہے
اب آسماں سے نورِ خدا کا نزول ہے — اب جنگ اور جہاد کا فتویٰ فضول ہے
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد — منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد [٢]

(اعلان مرزا غلام احمد قادیانی مندرجہ تبلیغ رسالت جلد صفحہ ۴۹ از میر قاسم علی)

یہ ہے مرزائے قادیان کے ذہن و فکر کی صلاحیتوں اور کوششوں کا پس منظر، اور اُس کی خود ساختہ نبوت کا کچا چٹھا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاں اللہ تعالیٰ نے اور دوسری بزرگیاں اور خوبیاں عطا فرمائی تھیں وہاں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ حضورؐ صحت و توانائی اور خوش جمالی کا بہترین نمونہ تھے ——— اور جو شخص حضور کے "ظل" ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، اُس کے دائم المریض ہونے کا حال اوپر آچکا ہے، واہ رے! قادیان کے جھوٹے نبی ——— ہمسری انبیاء کرام اور رسولانِ عظام کی اور قابلیت کا یہ عالم کہ تیسرے درجہ کا نثر نویس اور ایک گھٹیا قسم کا شاعر بھی اس سے اچھا لکھ سکتا ہے ——— اگر اللہ تعالیٰ کسی "شاعر" کو بہ فرضِ محال نبی بناتا تو اُس کی شاعری کے آگے درحل، ہومر، امرؤ القیس اور فردوسی کی شاعری گرد ہوتی، مرزا کی زندگی کے پورے حالات پڑھنے کے بعد کوئی صاحبِ عقل اُس کو نبی، مجدد، امام اور مسیح موعود تو کجا، ایک بھلا مانس شہری بھی نہیں کہہ سکتا، کیا تضاد ہے اقوال میں کتنی لغو بیانیاں ہیں تحریر میں، اور کس قدر تعلیاں ہیں دعووں میں ——— اور پھر ان سب پر مستزاد، ایک ظالم حکومت کی تائید، خیر خواہی اور مدح سرائی [٣]! انبیاء تو بڑی چیز ہیں، نیک آدمیوں کی جن پر پرچھائیں پڑ جاتی ہے، اُن سے بھی دنیا ظالم و جابر حاکموں کے مقابلہ میں کلمۂ حق بلند کرنے کی توقع رکھتی ہے، اور قادیان کا "نبی" (؟) برطانیہ جیسی ظالم اور اسلام دشمن حکومت کی مدح خوانی کرتا اور اُس کی خیر خواہی کا دم بھرتا ہے! ایک طرف یہ دعویٰ کہ "اور جو میرے نشانات ظاہر ہوتے ہیں وہ تین لاکھ سے زائد ہیں، کوئی مہینہ بغیر نشانوں کے نہیں

---

[١] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افصح العرب تھے اور "قادیانی نبی" جو حضورؐ کے "ظل" ہونے کا مدعی ہے اُس کی زبان اور اسلوب بیان کا یہ عالم ہے!

[٢] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر ہونے کی اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں نفی فرماتا ہے مگر حضورؐ کے "ظلی نبی" کو ہندوستان میں شاعر بنا کر بھیجا ہے اور وہ بھی گھٹیا درجہ کا شاعر! اچھا "ظل" ہے جو اپنے "اصل" سے اس قدر مختلف ہے۔

[٣] "میں وہ مہدی موعود ہوں اور گورنمنٹ برطانیہ وہ تلوار ہے ..." (مرزا غلام احمد)

گزرتا۔" (اخبار البدر قادیان جون ۱۹۰۶ء) اور دوسری طرف یہ کمزوری، بزدلی، نیازمندی اور چاپلوسی کہ حکومت برطانیہ کے دامن میں پناہ تلاش کی جاتی ہے اور عرض و معروض میں خوشامدی درباریوں کا رنگ اختیار کیا جاتا ہے۔

قرآن میں تحریف، انبیاء کی ہمسری بلکہ اُن سے برتری کا دعویٰ، حضرت حسینؓ اور حضرت مسیح علیہ السلام کی تنقیص ——— بلکہ جہاد کی تنسیخ، اس کا اعلان کہ میں نبی ہوں، مجھ پر وحی آتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں مسیح موعود کو زائد معجزات دیئے گئے ہیں، یہی وہ "ہفوات اور کفریہ عقاید" ہیں جن کو "داخلِ اسلام" کر کے اور صوفی شاہ نذیر احمد جیسے مجہول الحال اور غیر ذمہ دار شخص کا ہم نوا بن کر، مولانا عبدالماجد دریابادی اپنے ایمان اور اسلام کے ساتھ بہت بڑی دشمنی کر رہے ہیں مولانا موصوف پر ایک دور الحاد و بے یقینی کا بھی گزرا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو الحاد و بے یقینی کے اندھیرے سے نکال کر یقین و اسلام کی روشنی میں پہنچایا ہے، اب وہ خود تاریکی کو ڈھونڈ رہے ہیں، یہ مشہور ضرب المثل "اوّل بہ آخر نسبتے دارد" خدا نہ کرے کہ اُن کے حق میں صادق آئے، ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مولانا عبدالماجد دریابادی کو توبہ کی توفیق عطا فرمائے اور اس ضلالت آمیز غلط اندیشی سے وہ جلد سے جلد نکل آئیں!

حکومتِ پاکستان سے!

حکومتِ پاکستان کی خدمت میں ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ مرزائیوں کو جداگانہ اقلیت دینے کا مطالبہ پاکستان کے عوام مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ ہے، انگریز کے زمانہ میں اس مطالبہ کے لئے موقعہ نہ تھا کہ وہ کافرانہ حکومت تھی اور مسلمان کس توقع پر برطانوی حکومت سے یہ مطالبہ کرتے جبکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ "قادیانیت" کا شجرۂ خبیثہ اسی حکومت کے سایہ میں پروان چڑھ کر برگ و بار لایا ہے ——— اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکومت عطاء فرمائی ہے اور حق و باطل میں فرق و امتیاز کرنے کا موقعہ دیا ہے، تو پھر ہم کو چاہیئے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "اُمت واحدہ" سے اُس گروہ کو چھانٹ دیں، جو غلام احمد کو اپنا نبی مانتا ہے، اُمت نبوت سے بنتی ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک گروہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے بعد مرزا غلام احمد کو اپنا نبی بھی مانتا ہو، پھر بھی اُس کو خاتم النبیین کی اُمت میں بھی شمار کیا جائے، یہ رواداری نہیں غلط اندیشی اور کوتاہ بینی ہے!

پاکستان کے ارباب اقتدار اس مسئلہ کو اس طرح سوچیں کہ ایک شخص پاکستان کے گورنر جنرل کی بڑی مدح سرائی کرتا ہے مگر ساتھ ہی اس کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ میں گورنر جنرل آف پاکستان کا "ظل" ہوں، وہ شخص کچھ احکام بھی دیتا ہے، اپنے وزرا بھی مقرر کرتا ہے، پاکستانی رعایا کے کچھ لوگ بھی اُس کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور اس کی حاکمیت کو تسلیم کر لیتے ہیں ——— تو پاکستان ہی کی حکومت کے اندر اس قسم کی "ظلی حکومت" اور "بروزی اسٹیٹ" کو پاکستان گورنمنٹ کیا برداشت کر سکے گی اور کیا اس جماعت کو باغی قرار نہیں دیا جائیگا۔ ——— اسی پر قادیانیوں کا قیاس کر لیا جائے، محمد رسول اللہ کی اُمت میں آخر غلام احمد کی اُمت کو کس طرح سمویا جا سکتا ہے؟ جو کوئی اس پر اصرار کرتا ہے کہ نہیں ان مرزائیوں کو رسول اللہ کی اُمت ہی میں شامل سمجھو، تو السلام کہنا الا گو، "اُمت" اور "نبوت" کے مفہوم ہی سے واقف نہیں ہے اور اگر واقف ہے تو پھر وہ مسلمانوں کا چھپا ہوا دشمن ہے اور اُمتِ مسلمہ کو نقصان پہنچانے کے درپے ہے ———

قادیانی ڈنکے کی چوٹ کہتے آئے ہیں کہ:—

"ہمارا یہ فرض ہے کہ غیر احمدیوں کو مسلمان نہ سمجھیں ... اور اُن کے پیچھے نماز نہ پڑھیں کیوں کہ ہمارے نزدیک وہ خدا تعالیٰ

لہ یعنی جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے اور اس قسم کی کفریات بکتا ہے اُس کو مولانا عبدالماجد دریابادی کسی طرح "خارج از اسلام" کہنے اور ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے بلکہ اُس کے "اسلام" پر اُلٹا اصرار فرماتے ہیں۔

کے ایک نبی کے منکر ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (انوارِ خلافت صفحہ ۹۰ از محمود)

"غیر احمدیوں سے ہماری نمازیں الگ کی گئیں ان کو لڑکیاں دینا حرام قرار دیا گیا، اُن کے جنازے پڑھنے سے روکا گیا اب باقی کیا رہ گیا جو ہم ان کے ساتھ مل کر کر سکتے ہیں؟ دو قسم کے تعلقات ہوتے ہیں ایک دینی دوسرے دُنیوی دینی تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ عبادات کا اکٹھا ہونا ہے اور دُنیوی تعلق کا بھاری ذریعہ رشتہ و ناطہ ہے سو یہ دونوں ہمارے لئے حرام قرار دیئے گئے۔ (کلمۃ الفصل از میاں بشیر احمد قادیانی)

"سوال:- کیا کسی شخص کی وفات پر جو سلسلہ احمدیہ میں شامل نہ ہو یہ کہنا جائز ہے کہ "خدا مرحوم کو جنت نصیب کرے ۔ ۔ ۔ اور مغفرت کرے؟

جواب:- غیر احمدیوں کا کفر بینات سے ہے اور اُن کے لئے دعائے مغفرت جائز نہیں۔

(مفتی دارالامان (قادیان) الفضل جلد ۸ صفحہ ۵۹)

یہ ہیں قادیانیوں کے عقاید عام مسلمانوں کے بارے میں! اس کے بعد فرقہ کونسی قدر مشترک رہ جاتی ہے جس کی بنا پر ان کو اُمتِ مسلمہ ہی میں شامل جانے پر اصرار کیا جاتا ہے، اس بے غیرتی بے حسی اور جہالت و بے خبری کی کوئی انتہا ہے کہ ایک گروہ ڈنکے کی چوٹ مسلمانوں کو کافر کہتا اور سمجھتا ہے، مگر اس پر بھی یہی مشورہ دیا جاتا ہے کہ یہ چاہے کچھ کہیں اور سمجھیں مگر تم ان کو مسلمان ہی سمجھتے رہو!

بریں عقل و دانش بباید گریست

اور یہ وہ مقام ہے جہاں رویا نہیں جاتا بلکہ ماتم کیا جاتا ہے!

قادیانیوں کو دینِ اسلام سے خارج قرار دینا یہ "ملاؤں" اور "مولویوں" کا اجتہاد نہیں ہے بلکہ کتاب و سُنت کا ہی فیصلہ ہے اور کتاب و سنت کے فیصلہ کا نفاذ کسی انتشار کا سبب نہیں ہو سکتا، جھگڑے کی بات تو یہ ہے کہ قادیانیوں کو مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ سمجھا جائے

قادیانی ایک جداگانہ "اُمت" ہیں مسلمانوں میں سے ایک فرقہ ہرگز نہیں ہیں!

پاکستان میں انتشار تو اس سے پھیلے گا بلکہ اُس کی جڑیں کھوکھلی ہوں گی کہ "غیر مسلموں" پر "مسلمانوں" کی طرح بھروسہ کیا جائے اور اہم ترین ذمہ داریاں اُن کے سپرد کی جائیں!

قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس اعلان کے بعد ہی وہ سب کے سب کالے پانی بھیج دیئے جائیں گے،

---

۵۱ اسی لئے سر ظفر اللہ خاں نے قاید اعظم مرحوم کے جنازے کی نماز نہیں پڑھی۔

۵۲ ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ مذہباً ہمارا ترکوں سے کوئی تعلق نہیں ہم اپنے مذہبی نقطہ خیال سے اس امر کے پابند ہیں کہ اس شخص کو اپنا پیشوا سمجھیں جو حضرت مسیح موعود کا جانشین ہو اور دنیاوی لحاظ سے اسی کو اپنا بادشاہ یقین کریں جس کی حکومت کے نیچے ہم رہتے ہوں پس ہمارے خلیفہ حضرت مسیح موعود (مرزا صاحب) کے خلیفہ ثانی ہیں اور ہمارے بادشاہ اور سلطان حضور ملک معظم ہیں۔

(قادیانی جماعت کا ایڈریس بخدمت ایڈورڈ میکلیگن لفٹنٹ گورنر پنجاب —

— اخبار الفضل ۲۲ر دسمبر ۱۹۱۹ء جلد نمبر ۷)

یا اُن کو قید خانوں میں بند کر دیا جائے گا، یا "ربوہ" کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی ——— نہیں یہ نہیں ہوگا بلکہ اُن کے ساتھ وہ سلوک ہوگا جو دوسری غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ ایک اسلامی حکومت میں ہونا چاہیئے۔

اگر موجودہ اربابِ اقتدار اس فرض کو انجام نہ دے سکے تو پھر یہ نیک کام اُن لوگوں کے ہاتھوں انجام کو پہونچے گا، جن کے سینے محبتِ رسول سے معمور ہوں گے، اور کفر و اسلام اور حق و باطل کے امتیاز کی جن میں صلاحیت ہوگی!

(ناظرین کرام اس مضمون کے بقیہ حصہ کو صفحہ ۴۷ پر ملاحظہ فرمائیں)

نیا ادب

(یہ نظم حضرت اسدؔ ملتانی نے حلقہ ادب اسلامی کراچی کے عام اجلاس میں خود پڑھ کر سنائی)

نہ پاسِ خلق، نہ خوفِ خدا، نہ شرمِ نبیؐ — نیا ادب ہے کہ سعیِ فروغِ بے ادبی
ہوائے نفس کی تصویرِ شوخ و عُریاں کو — کہیں حیات کا آئینہ، وائے بوالعجبی
بیانِ حال میں پنہاں ہے آرزومندی — ہے احتساب کے پردے میں مُدعا طلبی
یہ چاہتے ہیں کچھ ایسی مکمل آزادی — کہ جس کے دور میں کوئی بدی رہے نہ دبی
ہے سر میں ہوش بہ اندازۂ پریشانی — ہے دل میں جوش بمقدارِ بادۂ عنبی
یہ زندگی ہے کہ دنیائے دل کی بربادی — یہ روشنی ہے کہ فکر و نظر کی تیرہ شبی
وہ بوالہوس بھی جنھیں جُرأتِ گناہ نہیں — ادب میں ڈھونڈ رہے ہیں علاجِ تشنہ لبی
نئے ادب میں چمک و تپشِ آتش سہی لیکن — وہی کہ اصل ہے جن کی شرارِ بولہبی
جدید بھی تو نہیں یہ ادب کہ ہے اس میں — وہی قدیم ہوس جوئی و طرب طلبی
پھر ایک بار بہ فیضِ فرنگ ابھرا ہے — دبا ہوا ادبِ جاہلیتِ عربی

اسدؔ ادیب "ترقی پسند" سے کہہ دو
رہے تجھی کو مبارک فریبِ خوش لقبی

ضرورت ہے!

(حلقۂ ادبِ اسلامی کراچی کے اجلاسِ عام منعقدہ، ستمبر ۱۹۵۲ء میں خود شاعر کی زبان سے سُنی گئی)

امیروں کی ضرورت ہے نہ سلطاں کی ضرورت ہے
زمانہ کو فقط مردِ مُسلماں کی ضرورت ہے

حُنینؓ و بدرؓ کے پھر معرکے دُہرائے جائیں گے
زمیں کو سُرخیِ خونِ شہیداں کی ضرورت ہے

"ترقی"[۱] لے گئی ہے بے یقینی کے اندھیروں تک
ادب کی محفلوں میں شمعِ ایماں کی ضرورت ہے

سکوں کیسا؟ کہاں کی عافیت کوشی! ارے ناداں!
تری کشتی کو اک پُرشور طوفاں کی ضرورت ہے

بدلنا ہے خدا ناآشنا دورِ قیادت کو
علیؓ، خالدؓ و فاروقؓ و سلمانؓ کی ضرورت ہے

حُسینیؓ قافلہ میں آنے والے جلد آجائیں
کہ پھر اسلام کو خونِ رگِ جاں کی ضرورت ہے

قبائیں قیصر و کسریٰ کی ثابت رہ نہیں سکتیں
مری وحشت کو بھی چاکِ گریباں کی ضرورت ہے

ادب "کب تک رہے گا جاہلیت کے شکنجوں میں
گرفتارِ قفس کو اب گلستاں کی ضرورت ہے

حدودِ لذت و پاکیزگی پہچاننے والے
اِدھر آئیں کہ اُن کے علم و عرفاں کی ضرورت ہے

جہاں پر اتحادِ کفر و ایماں کی ضرورت تھی
وہاں اب امتیازِ کفر و ایماں کی ضرورت ہے

زمانہ منتظر ہے کس قدر ضربِ کلیمی کا
جہاں کو پھر کسی موسیٰؑ عمراں کی ضرورت ہے

وہ مشرق ہو کہ مغرب ہر طرف ہے فتنہ سامانی
نظامِ زیست کو منشورِ قرآں کی ضرورت ہے

دُعا کے ساتھ تدبیریں، عمل کے ساتھ تکبیریں
خدا کی راہ میں بھی ساز و ساماں کی ضرورت ہے

زمانہ آگیا جھوٹے خداؤں سے بغاوت کا
مکمل اتباعِ حکمِ یزداں کی ضرورت ہے

خدا کا دین کفر و جاہلیت کے ہے نرغے میں
غزل خواں کی نہیں ہے اب رجز خواں کی ضرورت ہے

ماہر القادری

[۱] نام نہاد ترقی پسندی

شفیق جونپوری

غزلیں!

اب کوئی بسمل نہ ہوگا تیغ قاتل ہے تو ہو
خون پروانہ نہ ہوگا شمع محفل ہے تو ہو

دل کا خالق دے چکا دل جوڑنے کا بھی سبق
پھر بھی سینے میں اگر ٹوٹا ہوا دل ہے تو ہو

راہ کے کانٹے ہٹائے جا رہے ہیں راہ سے
خود امیر کارواں منزل سے غافل ہے تو ہو

جادۂ ہر موج پر ہے اہل کشتی کی نگاہ
ناخدا تیری نظر خود سوئے ساحل ہے تو ہو

ہم تو اپنی بزم کو آراستہ کرتے رہیں
آنے والا ناشناس رسم محفل ہے تو ہو

بیکسوں کے خون سے شمع امارت جل چکی
رات کا افسانہ دہرانے کے قابل ہے تو ہو

حریت کا ذوق پیدا ہو چکا ہر قلب میں
آج بھی شاہنشہی کی سعی باطل ہے تو ہو

درہم و برہم ہوئی جاتی ہے بزم قیصری
شمع محفل بجھ گئی ہے شور محفل ہے تو ہو

جبر و استبداد کے آثار مٹ جانے کو ہیں
جا چکا ہے قافلہ اب گرد منزل ہے تو ہو

ادیب سہارنپوری

دیکھ پائے نہ ان کو جی بھر کے
رہ گئے روز حوصلہ کر کے

مار کر جی کو ۔ دل کا خوں کر کے
ہم کہاں تک جئیں گے مر مر کے

اور بھی خون کر لیا دل کو
شکر اسے کی آرزو کر کے

نہ گئی تیرگی شب غم کی
بجھ گئیں شمعیں آہ بھر بھر کے

پیچ و خم راہ زندگی کے نہ پوچھ
راہرو بڑھ رہے ہیں ڈر ڈر کے

ادھوری سی ہر لب پہ اک داستاں تھی
مجھے بات کرنے کی فرصت کہاں تھی

نکل کر جو قید نشیمن سے دیکھا
تو کچھ اور ہی وسعت دو جہاں تھی

لیا کی زمانے نے ہم سے الجھ کر
وہیں آج بھی ہے نظر کل جہاں تھی

سنی سب نے یوں میری روداد ہستی
کہ جیسے حقیقت، نہ تھی داستاں تھی

بہاروں کی پالی ہوئی آتش گل
جو بھڑکی تو پھر گلستاں گلستاں تھی

کھلائے ہوئے گل پلٹ کر نہ دیکھے
نسیم سحر تھی کہ عمر رواں تھی

تاثرات

بہار کوٹی

جو بدل سکے بدل دے ابھی زاویہ نظر کا
کہ نظر کی ایک لغزش ہے عذاب عمر بھر کا

تری ہر نظر تجلی ترا ہر نفس زمانہ
جو ہو شام غم میسر نہ رکھو آسرا سحر کا

مجھے زندگی گوارا غم زندگی گوارا
شب غم کا کاٹنا کیا جو یقین ہو سحر کا

ابھی اٹھ رہے تھے پردے ابھی گر رہے ہیں پردے
یہ صلہ دیا گیا ہے مری جرأت نظر کا

وہ بہار کی روش پر کبھی معترض نہ ہوگا
جسے پیش آ چکا ہے کوئی حادثہ نظر کا

قابل اجمیری

ہزار محکم سہی سفینہ مجھے بھروسہ مگر نہیں ہے
کوئی بھروسہ کرے بھی کیونکر کہ ناخدا معتبر نہیں ہے

وفور سجدہ تو صرف زاہد دلیل جذب اثر نہیں ہے
نہیں ہے ظالم تو آشنائے نزاکت سنگ در نہیں ہے

وہ شور جس سے ترے جہاں کا نظام زیر و زبر نہیں ہے
صدائے ناقوس برہمن ہے مری فغان سحر نہیں ہے

نہ جانے بدلیں گی کب فضائیں نہ جانے کب انقلاب ہوگا
ابھی تو گلشن کا کوئی غنچہ حریف برق و شرر نہیں ہے

نظر نظر کہکشاں ہے میری نفس نفس جاوداں ہے میرا
یہ لالہ و گل یہ چاند تارے کوئی مرا ہمسفر نہیں ہے

حرم کا عز و وقار ہوں میں صنم کدے کی بہار ہوں میں
جہاں مرا نقش پا نہیں ہے وہ آپ کی رہگذر نہیں ہے

نہ اپنی ناکامیوں کا شکوہ نہ اپنی بربادیوں کا ماتم
میں اس تصور سے مطمئن ہوں کہ ان کو میری خبر نہیں ہے

مری توجہ عجب توجہ مرا تغافل عجب تغافل
شکست ساغر کو دیکھتا ہوں شکست دل کی خبر نہیں ہے

میں زندگی کی لطافتوں میں کمی سی محسوس کر رہا ہوں
ابھی ترے حسن کی ملاحت شریک درد جگر نہیں ہے

روش روش پر میں زخم دل کا لہو چھڑکنا بھی جانتا ہوں
مرے چمن کا فروغ قابل بہار پر منحصر نہیں ہے

مخمور یوسف زئی سعیدی

جو دل کو دے گئی اک درد عمر بھر کے لئے
تڑپ رہا ہوں ابھی تک میں اس نظر کے لئے

ادا کئے ہیں وہ سجدے بھی میں نے در پہ ترے
جو سجدے فرض نہ تھے مجھ پہ تیرے در کے لئے

تری نظر جسے ممنون التفات کرے
کہاں سے لاؤں میں وہ دل تری نظر کے لئے

قدم قدم ہے عبادت، نفس نفس سجدہ
چلا ہوں لے کے جبیں کس کے سنگ در کے لئے

فزوں کچھ اور بھی ہوگا خیال مجبوری
قفس میں بیٹھ کے کیا رو ئیں بال و پر کے لئے

دھواں دھواں سی فضائیں نظر نظر تاریک
دعائیں مانگتے تھے کیا اسی سحر کے لئے

غم فراق کی یہ تشنہ کامیاں مخمور
رہے نہ اشک بھی اب دل میں چشم تر کے لئے

مدیر "فاران"

اِسے بھی پڑھئے!

(میں خاموش نہیں رہ سکتا" کا آخری حصّہ)

مولانا عبدالماجد دریابادی اور "قادیانیت" کے سلسلہ میں جو مضمون میں نے لکھا ہے اُس کی کتابت ہو چکی تھی کہ اتنے میں ۱۲ر ستمبر (۵۲ء) کا "صدق جدید" وصول ہوا، اور اس کے مضمون "ایک خط اور اُس کا جواب" پڑھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ "قادیانیت" کی حمایت میں مولانا دریابادی، دیانت و انصاف کی شاید ساری حدوں کو پھلانگ چکے ہیں، "قادیانیت" کا جوش مدافعت اور جذبہ حمایت اُن کے ذہن و فکر میں رچتا چلا جا رہا ہے اور اب وہ کسی کی بات مانتے ہوئے نظر نہیں آتے!

"صدقِ جدید" میں قادیانیت کے سلسلہ میں جو مضامین شائع ہوتے رہے ہیں اُن کو پڑھ کر ایک صحیح العقیدہ دردمند مسلمان (عبدالمجید صاحب بی-اے) نے لائل پور سے مولانا دریابادی کو خط لکھا کہ قادیانیوں کے متعلق دُنیائے اسلام کا فتویٰ یہ ہے کہ وہ کافر اور خارج از اسلام ہیں، مرزا صاحب نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اپنی نبوت کی طرف دعوت دے کر ایک علیحدہ اُمت بنائی، خود ہمارے سلسلہ دیوبند کے حضرات اکابر علماء حضرت شیخ الہندؒ حضرت مولانا سہارنپوریؒ اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا یہی مسلک رہا ہے اور ان حضرات نے تکفیر کی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "صدق" میں ان کے متعلق اس قسم کے مضامین دیکھ کر افسوس بھی ہوتا ہے اور دُکھ بھی اور اسی تاثر کی بنا پر آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں کہ خدارا اس طریق کار کو چھوڑ دیجئے قادیانیوں کی حمایت کے علاوہ بھی دین کی خدمت کی اور بہت سی شکلیں ہیں اور آپ کر بھی رہے ہیں، انھی میں مشغول رہئے ۔ ۔ ۔ ۔"

اس نیک مشورے نے مولانا دریابادی کے حق میں "دیوانہ را ہُوئے بس است" کا کام کیا، قادیانیت کی حمایت کا طوفان پُورے جوش کے ساتھ اُبل پڑا، اور مدیر صدق نے پورے چار کالم اس چیز کے ثابت کرنے میں صرف کر دیئے کہ علماء نے شیعوں اور نیچریوں کی بھی تو تکفیر کی ہے ۔ ۔ ۔ اس تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ قادیانیوں کی جو تکفیر ہو رہی ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، علماء ایسا کرتے آئے ہیں اور:—

"مغالطہ سب میں مشترک بس یہی ہے کہ نصوص کی تاویل و تعبیر کو ہر جگہ انکار و تکذیب کے مرادف سمجھ لیا گیا ہے اور تاویل و تعبیر میں ٹھوکر کھانے والوں کو جوشِ دینی سے مغلوب ہو کر منکرین و مکذبین کے حکم میں رکھ دیا گیا ہے"!

یہ موضوع اس قدر پیچیدہ اور شاخ در شاخ ہے کہ "فاران" کے چند صفحوں میں اس کی سمائی نہیں ہو سکتی اس لئے ہم یہاں چند ضروری اور مفید اشاروں پر اکتفا کریں گے ——— ہم مانتے ہیں کہ افراد ہی نہیں مسلمانوں کے فرقوں کے درمیان بھی ایک دوسرے کی تکذیب، تردید اور بعض صورتوں میں تکفیر کی ہنگامہ آرائی رہی ہے، مگر "قادیانیت" کی تکفیر کو اس سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے، اس لئے کہ قادیانیت کی تکفیر کی تاویل ممکن ہی نہیں ہے!

مثلاً فرقہ شیعہ کی "تکفیر" کے بارے میں ایک تو ان مولوی صاحبان کے فتاویٰ ہیں جن کا مولانا دریابادی نے نام بنام

جوڑ دیا ہے، دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ علم حدیث میں شیعہ راویوں کی بیان کی ہوئی حدیثیں قبول کی گئی ہیں حالانکہ کسی "کافر" کا راوی حدیث کی حیثیت سے کوئی قول قبول نہیں کیا جاتا۔[1] صدیاں گزر گئیں آپس میں بہت سے ہنگامے اور شدید معرکہ آرائیاں بھی رہیں لیکن شیعہ حضرات کو مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ سمجھا گیا، اور تمام اختلافات کے باوجود "اجماعِ امت" نے فرقہ شیعہ کو خارج از اسلام قرار نہیں دیا، بعض علماء نے یہ تو لکھا ہے کہ فلاں فلاں عقیدے کا رکھنے والا "کافر" ہے مگر پورے شیعہ فرقہ کی تکفیر کا فتویٰ نہیں دیا، اور جنھوں نے دیا ہے اُس کی تاویل کی جا سکتی ہے اور اُن کے مقابلہ میں، ہم اُن علماء کے قول کو قبول کر سکتے ہیں جو فرقہ شیعہ کو مسلمانوں میں شمار کرتے ہیں ——— اس پر بھی کوئی شخص ایسا عقیدہ رکھتا ہے جو صریحاً کفر ہے اور جس کی تاویل ہی نہیں ہو سکتی تو اُس کے "کفر" میں اسلام کی گنجائش پیدا کرنا خود اپنی جگہ موجب فساد و طغیان ہے!

یہ بات سُنیوں اور شیعوں تک ہی محدود نہیں ہے؛ معتزلہ، اشاعرہ، جہمیہ، جبریہ، قدریہ اور ماتریدیہ ——— کلامی گروہوں کے درمیان کیسی کیسی ہنگامہ آرائی رہی ہے، "خلقِ قرآن" کا فتنہ کوئی معمولی فتنہ تھا۔ "تہافۃ الفلاسفہ" میں امام غزالی نے ابنِ سینا کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں ہے، ابنِ عربی کو ایک گروہ امام بلکہ علمِ لدنی کا "محرمِ اسرار" سمجھتا ہے اور دوسرا گروہ اُن کے بعض خیالات کو گمراہ کن کہتا ہے ——— ——— ہندوستان میں امکانِ کذب، امتناعِ نظیر اور علمِ غیب کی بحثیں جب نکلی ہیں تو بریلوی حضرات نے علماءِ دیوبند کی تکفیر کی ہے۔

یہ تو مشہور مسائل تھے بعض اوقات چھوٹے چھوٹے فقہی مسائل کی جب بحث چھڑی ہے تو اُس میں ایسے پہلو اور بات میں بات نکلتی چلی گئی ہے کہ دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو گمراہ کہا ہے، مثلاً بریلوی اور بدایونی علماء عقاید میں ایک دوسرے کے سو فی صدی ہم خیال ہیں، طریقت میں بھی اُن کا ایک ہی خانوادے سے تعلق ہے، اس اتحادِ عقیدہ و خیال اور ہم مشربی کے باوجود جمعہ کی اذانِ ثانی کے بارے میں آج سے تقریباً ۴۵ سال قبل جو بحث چلی تھی تو نوبت سب و شتم تک پہونچی، ایک نے دوسرے کو گمراہ بتایا، یہاں تک کہ عدالت میں چارہ جوئی کی گئی!

خود ائمہ فقہا میں یہ اختلافات پائے جاتے ہیں کہ ایک کے یہاں ایک فعل کے کرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اور دوسرے کے یہاں نہیں ہوتی، مگر اس اختلاف کے باوجود وہ ایک دوسرے کو "بے نمازی" نہیں سمجھتے!

ہم عرض کرتے ہیں کہ یہ تمام اختلافات اپنے اندر کسی کیسی حد تک تاویل کی گنجائش رکھتے ہیں اور ایسا بھی ہوا کہ "کفر"، "گمراہی" کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے ——— ایک تو ہوتا ہے "صریحی کفر" اور ایک وہ "کفر" جو کسی قول اور فعل کے نتیجے سے اخذ کیا جاتا ہے مثلاً پاکستان میں اندنوں غلّہ کی سخت کمی ہو رہی ہے اور کہا جاتا ہے اس کمی کا سبب یہ ہے کہ یہاں سے غلّہ چوری چھپے ہندوستان بھیج دیا گیا ہے ——— بعض درد مند پاکستانی کہتے ہیں کہ غلّہ کی کمی کے سبب پاکستان کمزور ہو رہا ہے، اس لئے جنھوں نے یہ سب کچھ کیا ہے انھوں نے پاکستان کو کمزور بنا کر پاکستان کے ساتھ "غداری" کی ہے لہٰذا اُن کے ساتھ غداروں اور باغیوں جیسا سلوک کرنا چاہئے ——— ایک تو "غداری" اور "بغاوت" کی یہ صورت ہے، دوسری شکل یہ ہے کہ ایک شخص پاکستان

---

[1] یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ محدثینِ کرام، اختلافات کے باوجود شیعہ فرقہ کو مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ سمجھتے تھے!

کی حکومت کے خلاف کھلم کھلا علمِ غدر و بغاوت بلند کرتا ہے ——— تو یہ دونوں "غداریاں" ایک جیسی نہیں ہیں، پہلی "غداری" کی تاویل ہو سکتی ہے یعنی یہ کہ ان لوگوں نے ہندوستان جا کر واقعی بہت بڑا جرم کیا وہ پاکستان کے یقیناً مجرم ہیں مگر "غدار" نہیں ہیں، اس جرم کے باوجود وہ پاکستانی رعایا ہی میں شمار کئے جائیں گے ——— الّا یہ کہ نفع خوری اور ناجائز منفعت اندوزی کے علاوہ ہندوستانی حکومت سے اُن کی ساز بازبھی ثابت ہو جائے، تب اُس کی دوسری نوعیت ہو گی ——— اسی طرح "کفر"[1] اور "گمراہی" میں علماء نے بعض اوقات یا تو فرق نہیں کیا یا پھر "کفر" کو "گمراہی" کے معنیٰ میں استعمال کیا ہے۔

مگر قادیانیوں کا مسئلہ صریحی کفر ہے اس میں تاویل کی گنجائش ہی نہیں ہے "قادیانیت" علم کلام، تصوف اور فقہ کا اختلاف نہیں ہے، یہ بنیادی عقیدہ کا اختلاف ہے، مسلمانوں کے جتنے فرقے ہیں، یہاں تک کہ اُن میں کے شدید مبتدع اور گمراہ فرقے بھی ایک خدا، ایک نبی اور ایک کتاب پر ایمان رکھتے ہیں، اس لئے وہ سب ایک اُمت میں شمار کئے جاتے ہیں، اس کے برخلاف قادیانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دوسرے "نبی" کو مانتے ہیں جس کی کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی، اُن کے "نبی" کی کتابیں اور اقوال موجود ہیں جس میں وہ اپنی نبوت پر دلیلیں لاتا ہے اور اپنی نبوت کی تصدیق کو ابراہیم و موسیٰ اور عیسیٰ اور محمد (علیہم السلام) کی نبوت کی تصدیق کی طرح ایمان کی ضروری شرط بتاتا ہے ——— تو یہ وہ "مشترک مغالطہ" ہرگز ہرگز نہیں ہے جسے مولانا عبدالماجد دریابادی کے بقول "نصوص کی تاویل و تعبیر کو ہر جگہ انکار و تکذیب سمجھ لیا گیا ہے، اور تاویل و تعبیر میں ٹھوکر کھانے والوں کو جوشِ دینی سے مغلوب ہو کر منکرین و مکذبین کے حکم میں رکھ دیا گیا ہے" (صدق جدید ۱۲ / ستمبر ۵۲ء)

یہ صریحی غلط بیانی ہے، کھلی ہوئی ہٹ دھرمی اور غیر دیانت دارانہ کٹ حجتی ہے کہ مرزا غلام احمد کے "دعویٰ نبوت" کو "تاویل و تعبیر کی ٹھوکر" سے موسوم کیا جاتا ہے ——— "اہلِ قبلہ" اور "کلمہ گوئی" کا کریڈٹ اور "تاویل و تعبیر کی ٹھوکر" کا "الاؤنس" تو مسلمانوں کے اُن فرقوں کو ملنا چاہیئے جن کا اجمالاً اوپر ذکر آچکا ہے۔ غلام احمد کی "اُمت" اس دائرے میں آہی نہیں سکتی، اور جو کوئی اسے اسلام کے دائرے میں لانے کے لئے دلیلیں تراشتا اور منطقیں چھانٹتا ہے، وہ خود اسلام کے ساتھ دشمنی کرتا ہے! ہماری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا کہ کوئی مسلمان کسی شخص کے کھلے ہوئے "دعویٰ نبوت" کی تاویل اور تعبیر کے لئے اپنے اندر گنجائش کس دل سے پیدا کر سکتا ہے۔

ایک قاتل نے ایک شخص کو قتل کر دیا، مقتول کی لاش سامنے تڑپ رہی ہے، قاتل کے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے ہیں، قتل کا وہ خود اقرار بھی کرتا ہے، سب لوگ بالاتفاق یہی کہہ رہے ہیں کہ یہی شخص

---

[1] اور جہاں "کفر" سے وہ حقیقی اور واقعی "کفر" مراد ہے، جس کے سبب ایک مسلمان دین کے دائرے سے نکل جاتا ہے، تو اس کفر کا ارتکاب جو کرے گا وہی اس پاداش کا مستوجب ہو گا، پورے فرقہ کو "کافر" قرار نہیں دیا جاسکتا، مگر قادیانیوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، اس گروہ کا ہر فرد مرزا غلام احمد کو "نبی" مانتا ہے اس لئے یہ تمام کا تمام گروہ کافر ہے!

"قاتل" ہے ——— مگر ایک "بزرگ" تشریف لاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ نہیں! اس قاتل کے اس فعل کی تاویل ہو سکتی ہے اور اس کو قتل کی پاداش سے بچایا جا سکتا ہے ——— سب حیران ہیں کہ آخر اس فعل کی تاویل ہو کیا سکتی ہے، مگر وہ "بزرگ" بہت دور کی کوڑی لاتے ہیں، فرماتے ہیں، بھائیو! اس قاتل کا قتل کرنے کا ارادہ نہ تھا، یہ تو مقتول کے حلقوم پر اپنے داسطی قلم کو رکھ کر اپنی تلوار سے قط لگا رہا تھا، قط لگانے میں یہ ہوا کہ چونکہ اس بدنصیب مقتول کا گلا کمزور تھا پھر اس شخص سے بھی بے احتیاطی ہو گئی، اور قط لگانے میں تلوار اس کے حلقوم میں اتر گئی بس یہ شخص زیادہ سے زیادہ بے احتیاطی کا قصوروار ہے اس کی نیت نیک تھی؛ اس میری "تاویل" سے اس شخص کی جان بچنے سے انسانی آبادی ایک متنفس کی تعداد کے کمی ہونے کے نقصان سے محفوظ رہے گی ——— تو مولانا عبدالماجد دریابادی کا مرزا غلام احمد "مدعی نبوت" کی حمایت اور مدافعت میں قریب قریب یہی رنگ ہے!

رُوحِ انتخاب

کہا جاتا ہے کہ "نماز پڑھو، اطاعتِ حق اور اقامتِ دین کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاؤ گے، اور جو نعمت اور سعادت نہیں جو اس دنیا میں مل سکتی ہو اور نہیں ملے" بات اتنی سچی ہے کہ اس سے زیادہ سچی بات اس آسمان کے نیچے نہیں کہی گئی۔ لیکن عموماً اس کا جو مطلب لیا جاتا ہے اس کو بھی ایسا ہی سچا سمجھنا اتنی ہی دشوار ہے۔ نماز پڑھنا فی نفسہٖ اطاعتِ حق اور اقامتِ دین کے ہم معنیٰ نہیں ہے، بلکہ نماز پڑھنے سے صرف وہ قوت پیدا ہو کر نشو و نما پاتی ہے جس کے بل پر اطاعتِ حق اور اقامتِ دین کا فرضِ گراں ادا کیا جا سکتا ہے۔ اب اگر آپ سرے سے نماز کی اس افادیت ہی سے غافل ہوں یا اس کی بخشی ہوئی قوتوں سے کام ہی نہ لیں، اور کفر و جاہلیت کی ان یلغاروں سے کترا کترا کر نکل جائیں جن کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ قوتیں آپ نے اکٹھی کی تھیں، تو قیامت تک دینِ حق کی مظلومی اسی حال میں قائم رہے گی، اور باطل یوں ہی آپ کے داہنے بائیں، آگے، پیچھے، حتیٰ کہ آپ کے منبر و محراب تک مسلط رہے گا۔ لاریب نماز بہت بڑی حیرت خیز چیز ہے، منبعِ دین ہے، سراپا قوتِ انقلاب ہے، اور اتباعِ دین و اقامتِ دین کا تیر بہدف نسخہ ہے۔ لیکن اس کی برکتوں کے ظہور کے لئے ضروری ہے کہ اس کے سامنے کوئی ہدف بھی تو ہو ورنہ وہ اپنی شانِ تسخیر کا کوئی کارنامہ کیوں کر انجام دے گی؟ یہ ہدف تو اس کو اسی وقت میسر آ سکتا ہے جب آپ سکون کے گوشوں سے نکل کر حق و باطل کی کشمکش میں اپنے آپ کو ڈال دیں، اور اہم معاملاتِ زندگی سے بے تعلقی کا تعلق ختم کر کے ان کا رُخ ہدایاتِ قرآنی کے مطابق موڑ دینے کی جد و جہد میں لگ جائیں۔ پھر دیکھیں کہ فی الواقع نماز میں کیا قوتیں چھپی ہوئی ہیں، اور کس طرح ان کے نتائج ایک فطری رفتار کے ساتھ ظہور میں آتے جا رہے ہیں۔ اس وقت ہوگا یہ کہ آپ جاہلی افکار، اعمال اور قوٰی سے پنجہ آزمائی کریں گے، وہ خشمناک ہو ہو کر آپ پر حملے کریں گے، طبعاً آپ گھبرا اٹھیں گے، مگر فوراً ہی اللہ کا نام دل میں سکینت کی ٹھنڈک پیدا کر دے گا، آپ ان حملوں کا مقابلہ کریں گے، اور سنتِ الٰہی کے مطابق ابتلائی مصائب سے گزرتے ہوئے بتدریج آگے بڑھتے جائیں گے یہاں تک کہ منزلِ مقصود کو پہونچ جائیں گے۔ یوں ذکر و نماز کی پیدا کردہ قوتیں بجائے اس کے کہ غیر محسوس شکل میں معطل پڑی رہیں اپنے لئے صحیح مصرف پا لیں گی، جہاں وہ ٹھیک اس مقصد کے لئے خرچ ہوں گی جس کے لئے مہیا کی گئی تھیں!

(مولانا صدر الدین اصلاحی)

تصحیح

فاران بابت ستمبر ۵۲ء کے صفحہ (۷) (سطر ۵ و ۶) پر "کارلائل اور گبن" کی جگہ سر ولیم میور اور زویمر کاٹ کر لکھ دیا جائے ——— (ایڈیٹر)

ہماری نظر میں

حقوقِ انسانی

"حقوقِ انسانی" از :- رقیہ خلیل عرب، ضخامت ۱۸۵ صفحات (بڑا سائز) قیمت[1] چار روپیہ پانچ آنہ، ملنے کا پتہ :- مدنی اسلام گرلز اسکول ۲۱۲ پرنسس اسٹریٹ نانک واڑہ کراچی!

پاکستان میں جہاں ایک طرف "اپوا" (A. P. W. A) کی لعنت پائی جاتی ہے اور مخدرات کو بے پردگی کی تعلیم دی جاتی ہے اور "قصرات الطرف" کو شوقِ تبرج کے لئے اُبھارا جاتا ہے، وہاں دوسری طرف اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے محترمہ رقیہ بیگم جیسی عصمت مآب خواتین بھی موجود ہیں جو مسلمان عورتوں کو غیرت و حیا اور اخلاق و پاکیزگی کا درس دیتی ہیں ——— صرف زبان و قلم ہی سے نہیں، اپنے عمل سے، کردار اور طور و طریق سے!

"حقوقِ انسانی" رقیہ علامہ خلیل عرب کی دینی بصیرت اور اسلامی حمیت و غیرت کا بولتا ہوا ثبوت ہے، اس کتاب میں قرآن و حدیث کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی باہمی معاشرت کیسی ہونی چاہیئے، تعدادِ ازدواج کا مسئلہ بھی عورتوں پر کتنا شاق گزرتا ہے مگر رقیہ بیگم نسوانی جذبات سے مرعوب نہیں ہوئیں انھوں نے بڑی جرأت کے ساتھ وہی کہا ہے جو اللہ اور رسولؐ کا منشا ہے!

(صفحہ ۱۲) "پھر جب یہ کائنات انسانوں سے اُبل رہی ہے" "اُبلنا" یہاں اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے ——— (صفحہ ۵۹) "اپنے سرور کائنات کا ادب ملحوظ رکھنا چاہیئے" "اپنے" غلط استعمال ہوا ہے اس کی ضرورت ہی نہ تھی ——— دو چار جگہ اس قسم کا تسامح بہرحال ہو گیا ہے، ورنہ مجموعی طور پر طرزِ نگارش اثر انگیز اور زبان صاف اور شستہ ہے، خاص طور سے آیات و احادیث کے ترجمے با محاورہ اور عام فہم ہیں اور ان میں اُردو زبان کی نزاکت اور سادگی کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے!

یہ کتاب مردوں، عورتوں، بچوں اور بچیوں ——— بلکہ ہم تو مشورہ دیں گے کہ علمائے کرام تک کے پڑھنے کی چیز ہے، اللہ تعالیٰ اس کی لکھنے والی کو جزائے خیر عطا فرمائے اور مسلمان عورتوں میں یہی خیالات، تصورات اور رجحانات عام ہو جائیں، "حقوقِ انسانی" کو مسلمان گھرانوں میں زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے!

---

[1] اس کتاب کی قیمت سے غیر مستطیع طالبات کی خدمت کی جاتی ہے!

نشاطِ غم

"نشاطِ غم" از:- بسمل سعیدی، ضخامت ۲۲۴ صفحات، مجلّد مع گرد پوش کے ساتھ قیمت چار روپیہ، ملنے کا پتہ:- منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز پبلشرز دہلی والا آباد (تجارت)

جناب بسمل سعیدی اردو دنیا میں شہرت رکھتے ہیں، مگر اتنی شہرت نہیں رکھتے جتنی شہرت کے وہ مستحق ہیں، بات یہ ہے کہ بسمل صاحب کو پروپیگنڈے کا فن نہیں آتا، اور آج کل شہرتیں اور ناموریاں پروپیگنڈے ہی کے سہارے پروان چڑھتی ہیں۔

نام، تخلص اور لقب کا بھی زندگی پر تھوڑا بہت اثر ضرور پڑتا ہے، اس لئے بسمل صاحب چوٹوں اور اردوں کی تیغوں کے ساتھ زمانہ کی چلتی ہوئی تلوار کے بھی گھایل ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں ہمیں ایک ایسا نشاط اور کیف ملتا ہے جس میں حزن و ملال بھی گھل مل گیا ہے، انھوں نے اپنے مجموعہ کلام کا نام "نشاطِ غم" بہت خوب تجویز کیا ہے۔

"نشاطِ غم" پر جناب جوش ملیح آبادی نے چو صفحے کا پیش لفظ لکھا ہے، اور حسبِ عادت "غزل" پر خوب چوٹیں کی ہیں، جوش صاحب غزل کو "ردائی چولہے کی ٹھنڈی راکھ" بتلاتے ہیں۔ حالانکہ "غزل" شعر و ادب کے آتش کدے کا سب سے زیادہ دہکتا ہوا شعلہ ہے اور جہاں وہ بوئے گل اور موجِ نسیم ہے وہاں بھی اُس میں گرمی پائی جاتی ہے، خود جوش ملیح آبادی کا وجدان بھی غزل ہی کے گہوارے میں جھول کر جوان ہوا ہے، یہ "غزل" ہی کا فیض تھا جس نے ان کے کلام کو اتنا نکھارا اور چمکایا، اگر اُن کے کلام سے "تغزل" کو نکال لیا جائے تو پھر چلے ہے "انقلاب" باقی رہ جائے تو رہ جائے مگر "شعریت" باقی نہ رہے گی، اور رہی بھی تو برائے نام جیسے اُدو پر سفیدی!

بسمل سعیدی کا شمار اُن شعراء میں ہوتا ہے، جنھوں نے غزل کے آئینوں کو جلا دی ہے اور اُردو شاعری کے نوک پلک درست کئے ہیں، سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ بسمل کا مزاج شاعرانہ واقع ہوا ہے، وہ دل سے نگاہ تک شاعر کے سوا اور کچھ نہیں ہیں ——— حالانکہ بہت سے "کاریگر" شعر تو اچھے خاصے تراش لیتے ہیں، لیکن ان کا مزاج غیر شاعرانہ ہوتا ہے، اس لئے اُن کی شاعری میں وہ "چیز" نہیں ہوتی جسے حافظ شیرازی "آن" سے تعبیر کرتے ہیں:-

بندۂ طلعتِ آں باش کہ "آنے" دارد!

بسمل کی غزلوں میں "رومان" (ROMANCE) اس قیامت کا ہے:-

ظالم خدا کرے کہ وہ تیرا شباب ہو　　　مر جاؤں جس گناہ سے توبہ کئے بغیر[1]

ان شعروں کو پڑھئے، اور حافظہ پر زور ڈال کر سوچئے کہ شعر و شاعری کے اس عالم سے آپ زندگی میں کبھی گزرے ہیں؟

عشق ہوتا ہے دل کا اک عالم　　　دل کا عالم بیاں نہیں ہوتا
تیری محفل کے علاوہ کوئی محفل ہی نہیں　　　وہ کہیں کا نہ رہا جو تری محفل سے اٹھا

---

[1] اور ہم دعا کرتے ہیں کہ اُن کو جلد سے جلد توبہ نصیب ہو!

ہر بار نئے شوق سے ہے عرضِ تمنا
سو بار بھی ہم کہہ کے مکرر نہیں کہتے

اب حُسن سے بھی ہے عشق بیزار
دیوانے کی کس سے دوستی ہے

ہائے وہ دو نامرادِ زیست جن کے درمیاں
زندگی نے موت ہی دوری کو حایل کر دیا

محبت ہی ہزاروں مدعاؤں سے عبارت ہے
محبت ہی مگر ہے بے نیازِ مدعا رہنا

تمہاری جیسی شباہت کو ڈھونڈتا تھا دل
تمہاری شکل نہ دیکھی تھی جس زمانے میں

بسمل کا یہی وہ رنگ تغزل ہے، جس میں وہ منفرد ہے اور اُس کا کوئی حریف نہیں ہے۔
ارباب ذوق کی تواضع کے لئے کچھ اور اشعار بھی حاضر ہیں:-

ہزار حُسن عبادت گناہ سے پہلے
اور ایک لطفِ عبادت مگر گناہ کے بعد

ہوس کی دنیا میں رہنے والوں کو میں محبت سکھا رہا ہوں
جہاں پہ دامن بچھے ہوئے ہیں وہاں پر آنکھیں بچھا رہا ہوں

اے جوانی، اے محبت مرحبا!
پھر نہ یہ نیندیں نہ یہ بیداریاں

جب تک اُن کے عشق کی شامل پریشانی نہ تھی
زندگی کی مشکلوں میں کوئی آسانی نہ تھی

اُس زمانہ کا ورق تاریخِ انساں میں نہیں
جس زمانے میں محبت کی جہاں بانی نہ تھی

دست و دامن میں نہ ہو جیسے کوئی وابستگی
میرے دستِ شوق سے دامن چھڑانا دیکھئے

نہ وہ منکر خدا کے ہیں، نہ جنت کے نہ دوزخ کے
یہ کیا کچھ دیکھ آئے تیری محفل دیکھنے والے

وہ آرزو، وہ تمنا، وہ اضطراب نہیں
میں اب وہاں ہوں جہاں کوئی باریاب نہیں

ہے وہی اس کی منزلِ مقصود
جو جہاں تھک کے چور ہو جائے

مرے دستِ طلب، میری نگاہِ شوق سے پوچھو
نہ مصروفِ دعا رہنا، نہ صرفِ التجا رہنا

اب چشمِ التفات کا یارا نہیں مجھے
منظور یہ فریب دوبارا نہیں مجھے

اب تک تو خیر آئے اور آکر چلے گئے
اب کے تعلقات بڑھا کر چلے گئے

وعدہ خلافِ "وعدۂ فردا" کب آئے گا
یارب! وہ میرا بھولنے والا کب آئے گا

اب نہ پھولوں میں وفا کی بو نہ رنگ اخلاص کا
تجھ کو اے آب و ہوائے گلستاں کیا ہو گیا

اُجاڑنے سے یہ جنت کہیں اُجڑتی ہے
مصیبتوں سے "محبت" میں جان پڑتی ہے

جب اپنے دشمنوں کا ذکر کرتا ہے کوئی بسمل
تو اپنے دوست اور احباب مجھ کو یاد آتے ہیں

بہاریں تبسم کی پرچھائیاں ہیں
وہی مسکرا کر گل افشاں ہوئے ہیں

یہ ہے وطن کہ یہ کہتے بھی شرم آتی ہے
کہ اس چمن میں کبھی میرا آشیانہ تھا

بہت شاد ہوتی ہے اب، جب طبیعت
تو کچھ دیر رونے کو جی چاہتا ہے

قہقہوں کی گونج میں خاموش آنسو بھی تو ہیں
عشرتوں کی کروٹوں میں غم کے پہلو بھی تو ہیں

ہوگا تمہارا نام ہی عنوانِ ہر ورق
اوراقِ زندگی کو اُلٹ دیں کہیں سے ہم

سفینہ بھی ہے بحرِ عشق میں ساحل بھی ہے لیکن
سفینہ جس کو ملتا ہے اُسے ساحل نہیں ملتا

دہرائی جاسکے گی نہ اب داستانِ عشق　　　کچھ وہ کہیں سے بھول گئے ہیں کہیں سے ہم

کانٹے تو خشک ہو کے کھٹکتے ہیں اب بھی
وہ پھول تھے جو باغ میں مرجھا کے رہ گئے

جناب بسمل (ڈونگی) کی نظمیں بھی خوب ہیں اور بعض خوب تر! "فریبِ حُسن" جس نظم کا عنوان ہے، اُس کا ایک شعر ہے

نگاہ ناز کی بے التفاتیوں کی قسم　　　مرے دروں کے کیا تھا خمار جو آیا

اور "جوانی" میں تو شاعر نے اپنے جذبات کی ساری قوت اور پورا زورِ بیان صرف کردیا ہے:-

دُنیا کے قوانین بدل دیتی ہے ہمت　　　قسمت کے نوشتوں کو بدلتی ہے جوانی
ہے عقل ہی دل سوزِ عمل ار غمِ محبت　　　اور عقل ہی کم بخت سے سنی ہے جوانی

ایک رُباعی میں نفسیات کی کتنی صحیح ترجمانی کی ہے

اک رات سہانی نہیں دیکھی جاتی　　　جذبات فشانی نہیں دیکھی جاتی
موعیبوں کا اک عیب ہے یہ پیری میں　　　اوروں کی جوانی نہیں دیکھی جاتی

دوسرا رُخ :-

آپ میں آنے کی پھر کوئی جہت ہی نہ رہی　　　میں تری بزم سے جب تیرے مقابل سے اُٹھا
(صفحہ ۲۰)

پہلا مصرعہ ہر اعتبار سے کمزور ہے، اور "جہت" یہاں خاص طور سے کھٹکتا ہے۔

جب محبت اور وفا کی اتنی ارزانی نہ تھی　　　اُن دنوں میں تو یہ دُنیا اس قدر فانی نہ تھی
(صفحہ ۶۰)

کیا دُنیا یا اُس کی کوئی چیز "کم فانی" اور "زیادہ فانی" بھی ہوا کرتی ہے ——————

نزاکت غم کدوں کی عشق کے بسمل معاذاللہ　　　کہ وزنِ سایۂ رہگیر سے دیوار گرتی ہے (صفحہ ۷۳)

مصرعۂ اولیٰ میں ناگوار تعقید پائی جاتی ہے اور دوسرے مصرعہ میں "شعریت" نام کو نہیں! "وزنِ سایۂ رہگیر" نے سارا معاملہ بگاڑ دیا، "وزن" کی جگہ "بار" ہوتا تو یہ ترکیب کم سے کم "گوارا" ہو جاتی۔

بسمل کتابِ عشق ہے مفہوم یک نظر　　　تا فہم اس میں زیر و زبر دیکھتے رہے (صفحہ ۷۹)

"زیر، زبر" (بغیر واؤ عطف کے) لکھنا تھا، "زیر و زبر" تو "نشیب و فراز" (UP AND DOWN) کو کہتے ہیں۔

ہے جس پہ گراں میرے سلاموں کا جواب اب　　　وہ ہاتھ مری سمت بڑھایا تھا تمہیں نے (صفحہ ۱۰۹)

"جواب اب" میں صوتی اعتبار سے تنافر پایا جاتا ہے۔

ہوتا ہے اُس سے باغ میں جو موسمِ بہار　　　یارب! بہار کا وہ زمانہ کب آئے گا (صفحہ ۱۱۵)

پہلا مصرعہ ٹھیک طور پر بن نہ سکا۔

روح پر پڑتی نہیں چوٹ اب کسی کے رنج کی ۔۔۔ دل کی گہرائی سے دردِ دیگراں کیا ہوگی (صفحہ ۱۳۱)

"روح پر چوٹ کا پڑنا" کچھ بھلا نہیں لگتا، یہ خیال دوسرے لفظوں میں ادا کرنا تھا، اور مصرعہ ثانی بھی محلِ نظر ہے!

اب اس دُنیا اور اس دنیا کی بابت ۔۔۔ نہیں اس کے سوا کوئی حقیقت (صفحہ ۱۶۰)

"بابت" بہی کھاتہ اور تمسک و دستاویز کی "زبان" ہے!

کبھی ترنمِ گل بانگ اور کبھی دمِ سرد ۔۔۔ کبھی شگفتہ شگفتہ کبھی اُداس اُداس (صفحہ ۱۶۲)

کیا "گل بانگ" کے بعد "ترنم" کہنے کی بھی ضرورت تھی؟

بہ ارادہ جو کسی کی یاد میں شامل نہیں ۔۔۔ وہ حقیقت میں ابھی مہجور ہے واصل نہیں (صفحہ ۲۱۷)

مفہوم کچھ کھُلا نہیں، دوسرا مصرعہ بندش کے اعتبار سے کمزور ہے، نظرِ ثانی میں اس شعر کو مجموعہ کلام سے خارج کر دینا چاہیئے تھا!

کبھی صبحِ مسرت میں کبھی شامِ مصیبت میں ۔۔۔ سمائے جا رہے ہیں وہ مرے ذوقِ محبت میں (صفحہ ۲۴۰)

اگر "ایطا" سے صرفِ نظر بھی کر لیا جائے تو "ذوقِ محبت میں سمانا" اچھا نہیں لگتا، اس مفہوم کو دوسرے لفظوں میں ادا کرنا چاہیئے تھا۔

بے دیکھے رہ سکوں، نہ جسے دیکھ ہی سکوں ۔۔۔ وہ آفتابِ ذوقِ تمنا کب آئے گا (صفحہ ۲۴۱)

"ذوق" کی جگہ "شوق" ہونا چاہیئے تاکہ شعر اپنے دروبست کے لحاظ سے ہموار اور متوازن ہو جائے۔

ادھر اُدھر میری آنکھیں تجھے پکارتی ہیں ۔۔۔ مری نگاہ نہیں ہے، زبان ہے گویا

کاش! پہلا مصرعہ اس طرح ہوتا:—

ادھر اُدھر مری آنکھیں پکارتی ہیں تجھے[1]

ایک قطعہ کا عنوان "کمرۂ ملاقات" ہے جس کی "اضافت" محلِ نظر ہے

بسملؔ سعیدی انسان ہیں فرشتہ نہیں ہیں بھول چوک کس سے نہیں ہوتی اور ہم جو تنقید و احتساب میں اتنی باریک بینی اور دقتِ نظر سے کام لیتے ہیں تو خود ہم سے بھول چوک ہوتی رہتی ہے، اور لاکھ احتیاط کے باوجود بھی کہیں نہ کہیں کور کسر رہ ہی جاتی ہے ——— کوئی شک نہیں کہ "نشاطِ غم" اُردو ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے، جس کا دل جتنا زیادہ "محبت زدہ"[2] ہوگا، اُتنا ہی اس کتاب سے وہ لطف اندوز ہوگا ——— حضور سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی نعت میں بسملؔ کا صرف ایک شعر ہمیں ملتا ہے جو دسیوں نظموں پر بھاری ہے

---

[2] اور اس "محبت" میں ہوا و ہوس بھی شامل ہے!

ہر مسلمان کا فرض ہے کہ

وہ صنعتوں میں اپنا سرمایہ لگائے

"قدرت نے ہمیں غیر محدود ذرائع عطا کئے ہیں اور اب ہمارا کام یہ ہے کہ ہم انکو بطریق مناسب کام میں لائیں تاکہ پاکستان طاقتور اور خوشحال ملک بنے"

قائد اعظم
محمد علی جناح

"میں سرمایہ داروں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ آگے بڑھیں اور صنعتوں کے قیام میں حکومت کی طرح حصہ لیں"

الحاج خواجہ ناظم الدین
وزیر اعظم

پین اسلامک اسٹیم شپ کمپنی لمیٹڈ

کے حصص میں اپنا سرمایہ لگائیے

اس طرح سے قوم کی خدمت کیجئے اور منافع بھی حاصل کیجئے -

منظور شدہ سرمایہ ـــــ پانچ کروڑ روپیہ

جاری شدہ سرمایہ ـــــ ایک کروڑ روپیہ

کمپنی کے حصص ابھی تک پوری قیمت پر مل رہے ہیں

فی حصہ صرف ۱۰۰ روپیہ

کمپنی کا بیڑہ

سفینہ عرب	(مسافر و مال بردار)	وزن	۸۲۸۲ ٹن
سفینہ مراد	(مسافر و مال بردار)	وزن	۸۰۰۰ ٹن
سفینہ طارق	(مال بردار)	وزن	۳۳۲۳ ٹن
سفینہ ملت	(مسافر و مال بردار)	وزن	۸۱۳۶ ٹن

پراسپکٹس اور حصص کے فارم اور مطبوعہ لٹریچر کے لئے لکھئے :-

پین اسلامک اسٹیم شپ کمپنی لمیٹڈ

ادریس چیمبر ۔ ۔ ۔ ووڈ اسٹریٹ ، کراچی-۲

جلد ۴ ——— شمارہ ۸

ماہ نامہ

فاران

نومبر سنہ ۱۹۵۲ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ

۹ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۱۰

۸ روپے (ہندستانی) فی پرچہ ۱۱

مقامِ اشاعت:- دفتر فاران
کیمبل اسٹریٹ
کراچی نمبر (۱)

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

"کُفر" کے مقابلہ میں "**نفاق**" کی مضرت زیادہ خطرناک اور شدید تر ہوتی ہے، اس لئے کہ کفر خنجر بکف ہوتا ہے اور نفاق دشنہ در آستین! کھلی ہوئی دشمنی کا توڑ ممکن ہے اور اُس سے بچاؤ کے لئے بروقت تدبیریں کی جاسکتی ہیں، مگر چھپی ہوئی دشمنی کی مضرتوں سے بچنا بہت مشکل ہے، "نفاق" گھر کا بھیدی بن کر ہی لنکا ڈھاتا ہے، منافقین نے ہمدردی کے پردے میں سفاکی اور دوستی کی آڑ میں سدا دشمنی کی ہے!

مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو، اسلامی حکومت کو اور مسلمانوں کو کُفارِ قریش سے اُتنا اندیشہ نہ تھا جتنا اندیشہ منافقین سے تھا! کُفارِ مکہ میدانوں میں آکر لڑتے تھے، اُن کی دُشمنی سب کو نظر آتی تھی، عتبہ اور شیبہ جیسے صنادید قریش میدانِ جنگ میں شمشیر بکف ہوکر جب دعوتِ مبارزت دیتے تو مسلمانوں کی طرف سے علیؓ اور حمزہؓ جیسے نامور شجاعوں کو بھیجدیا جاتا مگر عبداللہ بن ابی اور اُس کے اہلِ نفاق ساتھی مسلمانوں کے خلاف جو خفیہ تدبیریں کرتے اور طرح طرح کی اسکیمیں بناتے تھے اُن کا توڑ بہت مشکل تھا، اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا، وحی کے ذریعہ منافقوں کی چھپی ہوئی سازشوں کی اطلاع نہ دی جاتی اور انصار و مہاجرین غیرمعمولی عزم و ثبات اور فراستِ ایمانی سے کام نہ لیتے تو خاکم بدہن، اسلام کا شیرازہ بکھر کر رہ جاتا اور مدینہ کی پوری بستی مسلمانوں کے لئے شعب ابی طالب بن جاتی۔

"نفاق" کی فطرت ہی سازش کرنا ہے اور سازش کی خوفناکی کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا، سازش فرد سے لیکر خاندانوں تک اور خاندانوں سے لیکر قوموں اور حکومتوں تک کی تباہی کا سبب بن سکتی ہے اور بن چکی ہے، اقوام و ملل کی تاریخ کے نہ جانے کتنے ورق "**نفاق**" کی فتنہ سامانی اور "سازش" کی خوں ریزیوں سے رنگین ہیں! یہ منافقین ہی تھے جنھوں نے غنیم کی فوجوں کو قلعوں کے چور دروازوں کا اتا پتا دیکر عزتوں کو ذلتوں سے اور حاکمیت کو غلامی سے بدلا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے اہلِ نفاق مسلمانوں کی طرح رہتے سہتے تھے، وہ نمازیں بھی پڑھتے تھے اور روزے بھی رکھتے تھے اور انصار و مہاجرین سے اس طرح ہمدردی کا اظہار کرتے تھے جیسے وہ اُن کے بہت بڑے ہی خواہ ہیں اور اسلام کا درد اپنے دلوں کے اندر رکھتے ہیں ——— مگر اس تصویر کا دوسرا رخ یہ تھا کہ منافقینِ مدینہ اسلام کی ترقی کو دیکھ کر انگاروں پر لوٹتے تھے،

مسلمانوں کی فتح و نصرت کا حال سُن کر اُن کے تن بدن میں آگ لگ جاتی اور غصہ و حسد کے مارے دانتوں سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگتے، ان بدنصیبوں اور موذیوں کا کام ہی یہ تھا کہ رسول اللہ، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے ڈالتے اور شبہے پیدا کرتے رہیں، جھوٹی افواہیں اُڑائیں، اُن کی وسوسہ اندازی چونکہ ہمدردی اور دوستی کے بھیس میں ہوتی تھی اس لئے کبھی کبھی یہ جادو بعض مسلمانوں پر بھی چل جاتا، کافروں کی طرح اسلام کو اہلِ نفاق بُرا نہ کہتے تھے بلکہ وہ تو مسلمانوں کے سامنے اسلام کی تعریفیں کرتے تھے لیکن اُن کی درپردہ کوشش یہ رہتی تھی کہ اسلام سربلند نہ ہونے پائے اور یہ نہالِ نو خاستہ مدینہ کی سرزمین میں جڑ نہ پکڑ سکے۔

نفاق ——— تاریخ کے ہر دور میں تعمیر کے نام پر اسلام کی جڑیں کھودتا رہا ہے

منافقین کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اسلام کو غلبہ نصیب نہ ہونے پائے اور مسلمان اگر زندہ رہیں تو ایک مغلوب، مظلوم اور مجبور قوم کی حیثیت سے زندہ رہیں، یہ اہلِ نفاق دنیا کے ہر دستور، ہر قانون اور ہر تہذیب و تمدن کا غلبہ گوارا کر سکتے ہیں مگر اسلامی دستور و تہذیب کے غلبہ کو برداشت نہیں کر سکتے اور اگر ایسا موقع آ جائے اور اسلام کے غلبے کے امکانات پیدا ہو جائیں تو منافقین غلبۂ اسلام کے امکانات کو تباہ کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔

پاکستان میں آج اسلام کو اسی قسم کے نفاق اور اہلِ نفاق سے واسطہ آپڑا ہے، یوں سمجھئے کہ تاریخ اپنے کو دہرا رہی ہے یہاں اسلام ہی کا نام لیکر اور اسلام کی تعریفیں کرکے اسلام کو گزند کیا جا رہا ہے، ایک مہم ہے جو اسلام کے خلاف چلائی جا رہی ہے اور سازشوں کا ایک جال ہے جو بچھتا چلا جا رہا ہے۔

پاکستان کے منافقین اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر کتاب و سنت کی بنیاد پر پاکستان کا دستور پورے کا پورا خالص اسلامی بن گیا، تو اللہ کے دین کو غلبہ نصیب ہو جائے گا، لہٰذا اس غلبے کے امکانات اور مواقع کو مجروح کرنے کے لئے اہلِ نفاق کی ٹولیاں ریشہ دوانیوں اور وسوسہ اندازیوں میں مصروف ہو گئی ہیں۔

ہم نے اوپر کہا تھا کہ "نفاق" چھپ کر سازش کرتا اور اسلام دوستی کا بھیس بدل کر تفرقے ڈالتا ہے، تو یہاں پاکستان میں "نقاب پوش صحابیوں" کا ایک گروہ ظہور میں آگیا ہے جس کا کام ہی یہ ہے کہ "اسلامی دستور" کی افادیت اور اہمیت کو مسلمانوں کی نگاہ میں، ہلکا، بے وزن اور غیر موثر بنا دے، اسی سوچی سمجھی سازش کے تحت یہ کہا جا رہا ہے کہ جب تک مسلمانوں کی معاشرت درست نہ ہوگی، اُس وقت تک "اسلامی دستور" بھی بے اثر ہی رہے گا، علماء اور اکابرِ ملت کو چاہیئے مسلمانوں میں جا کر وعظ و نصیحت کریں اور پہلے اُن کو سُدھاریں۔

بظاہر یہ مشورہ کس قدر ہمدردانہ اور سادہ و معصوم نظر آتا ہے مگر حقیقت میں یہ وہ زہر کا پیالہ ہے جس پر "آبِ حیات" کا لیبل لگا دیا ہے، یہ وہ پھولوں کا ہار ہے جس کی ہر پتّی میں سانپ بچھو لپٹے ہوئے ہیں ——— اس نفاق آمیز مشورت کی غرض یہ ہے کہ "دستور سازی" کے مطالبہ کی مہم سرد پڑ جائے اور لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ "دستور" کی زندگی اور سوسائٹی میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے ——— اس سازش کا پس منظر یہ ہے کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی اگر کوئی ایسا دستور مدون کر دے جو خالص اسلامی نہ ہو، جس میں اسلام اور جاہلیت اور حق و باطل کو گڈمڈ کر دیا جائے تو پاکستان کے مسلمان اس پر احتجاج نہ کریں بلکہ خوشی کے ساتھ منظور کر لیں ———

صید از حرم کشدم جعد بلند تو

فریاد از تغافل دل شکیں کنندِ تو

حالانکہ کتاب وسنت کی بنیاد پر دستور سازی کا مطالبہ اسی غرض کے لئے کیا جا رہا ہے کہ اسلام جن بُرائیوں کو مٹانا چاہتا ہے اُن کو قانون کے ذریعہ مٹایا اور ممنوع قرار دیا جائے اور جن اچھائیوں کو پھیلانا چاہتا ہے اُن کے لئے دستور اور قانون میں گنجائشیں پیدا کی جائیں ——— اسلئے "اسلامی دستور" معاشرت کو صالح بنانے میں نہایت موثر اور کارگر ثابت ہوگا! واعظوں کی ایک لاکھ تقریریں وہ کام نہیں کرسکتیں، جو کام قانون کی ایک سطر کر سکتی ہے ——— مثلاً کراچی کی گھوڑ دوڑ میں کھلے خزانے قمار بازی ہوتی ہے، ان ریس کھیلنے والوں کو اس بُرائی سے متنفر بنانے کے لئے برسوں کی محنت درکار ہوگی، لٹریچر، وعظ ونصیحت، تبلیغ وتنذیر ——— یہ تمام کام دو چار آدمیوں کے بس کے نہیں ہیں، ان کے لئے کافی مدت، کثیر دولت، اور کام کرنے والوں کی ایک جماعت کی ضرورت ہے، مگر "قانون" کی صرف ایک "سطر" قمار بازی کے اس ہنگامہ کو آن کی آن میں روک سکتی ہے۔ اگر یہ لوگ مسلمانانِ پاکستان کی معاشرت کی واقعی اصلاح چاہتے تو اُن کا مشورہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ ایک طرف "قانون" بُرائیوں کے روکنے میں اپنی طاقت کو استعمال کرے اور دوسری طرف مُبلّغین اور واعظین مسلمانوں کو معاصی وفواحش سے نفرت دلائیں، قانون اور تبلیغ کی قوتیں دوش بدوش کام کریں گی تو معاشرت کے سُدھار کا کام اطمینان بخش طریقہ پر انجام پا سکتا ہے ——— مگر مسلمانوں کی معاشرت کی اصلاح کب مقصود ہے، "معاشرتی اصلاح" کا شوشہ تو "دستور سازی" کے اسلامی مطالبہ کو مجروح کرنے کے لئے چھوڑا گیا ہے کہ اس مُہم کے لئے جو کوششیں کی جارہی ہیں اُن میں انتشار پیدا ہو جائے — اور لوگ دوسری طرح پر سوچنے لگیں۔

ایک طرف کلب گھروں اور ریس کورسوں ( ) میں قمار بازی اور شراب نوشی ہوتی رہے، دوسری طرف "اپوا" ( ) کی "سماتیں" اسٹیجوں پر لڑکیوں کو نچواتی رہیں، کالجوں اور اسکولوں میں نامحرم نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کو اختلاط کے مواقع حاصل ہوں، سود خواری کی لعنت اپنے پورے شباب پر رہے، بلبل چودھری اور مس آزوری کے رقص وسرود کی محفلیں سرکاری عہدیداروں کی سرپرستی میں جمتی رہیں ——— اور دوسری طرف علماء اور اسلام پسند اہلِ فکر ان فواحش ومنکرات پر ٹوکیں تو اُن کو "مُلّا" کہہ کر مطعون کیا جائے اور اُن کے خلاف "مُلّا ازم" کے نام پر باقاعدہ مہم شروع کردی جائے ——— اس "سازش" کی خطرناکی کا بھلا کوئی اندازہ کیا جا سکتا ہے، دل ودماغ کی ساری صلاحیتیں اور تمام ذہانتیں اسی مہم میں لگادی گئی ہیں کہ جیسے بھی ممکن ہو پاکستان کو خالص اسلامی حکومت بننے سے روکا جائے!

"اسلامی دستور" جو پاکستان کی معاشرت کو بڑی حد تک صالح بنا سکتا ہے، یا جس کے اثر ونفوذ سے بہت کچھ بُرائیاں رُک سکتی ہیں، اس کے خلاف طرح طرح کی بدگمانیاں پھیلائی جاتی ہیں، حکومت سے اصلاحِ معاشرت کا مطالبہ ہوتا ہے تو فرمایا جاتا ہے کہ یہ کام تو عوام کے کرنے کا ہے، حکومت سے یہ ذمہ داری متعلق ہی نہیں ہے، خدا کے جو نیک بندے اصلاحِ معاشرت کا کام کر رہے ہیں، اُن پر "مُلّا ازم" کی پھبتیاں کسی جارہی ہیں اور "قدامت پرستوں" اور "رجعت پسندوں" کے فقرے چُست کئے جا رہے ہیں، جو لٹریچر عوام میں اخلاق کی حس کو بیدار کر سکتا ہے اُس پر قدغن ہے کہ کسی سرکاری اہلکار کے کان میں اس کی بھنک نہ پڑنے پائے۔

کچھ منافق اہلِ قلم اس ڈیوٹی پر مامور ہیں کہ دینی حکومت کے مقابلہ میں "سیکولرزم" کی حمایت کریں ———

اور کتاب و سنت کی بنیاد پر دستور سازی کے مطالبہ کی مہم جب سے تیز ہوئی ہے بعض اہلِ نفاق صحافیوں نے اس قسم کے دعوے پیدا کرنے شروع کر دیئے ہیں کہ مسلمانوں کے فرقوں میں تو طرح طرح کے فقہی اور نظریاتی اختلافات پائے جاتے ہیں ایک "دستور" پر تمام فرقے کس طرح متفق ہو سکتے ہیں، حالانکہ اللہ کے فضل سے پاکستانی مسلمانوں کے تمام فرقے دستور سازی کے معاملہ میں متفق اور ایک زبان ہیں اُن کے نمائندہ علماء نے اسلام کی مشترک قدروں کو دستور کی اساس تسلیم کر لیا ہے ——— مگر یہ منافقین جان بوجھ کر آپس کے اختلافات کو اُجاگر کر رہے ہیں، جو وقت اختلافات کو بھلا دینے کا تھا، ٹھیک اُسی وقت اختلافات یاد دلائے جا رہے ہیں بلکہ اُن کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔

قرارداد مقاصد منظور کرنے کے بعد حکومت پاکستان نے بے شک کلمہ تو پڑھ لیا ہے مگر ابھی اس حکومت میں اسلام کو غلبہ کہاں نصیب ہوا ہے، ابھی تک تو اسلام کی گیرائی اور حکمرانی محراب و منبر اور مدرسہ و خانقاہ تک محدود ہے اسلام کو سربلندی تو اُس وقت نصیب ہو گی جب یہاں کا دستور خالص اسلامی دستور ہو گا اور اللہ کے قانون کو تنفیذی قوت (EXECUTIVE POWER) حاصل ہو گی ——— مگر بعض قانونچیوں کے لئے اسلام کے اس غلبہ کا تصور سوہانِ روح بنا ہوا ہے، شرطیں لگائی جا رہی ہیں، دربازیاں بدی جا رہی ہیں کہ قرآن کریم کی کسی ایسی آیت کو پیش کرد جس سے دستور سازی کا حکم نکلتا ہو۔

حالانکہ یہ مطالبہ اُس وقت کرنے کا تھا جب مسلم لیگ کے اکابر ایک ایک اسٹیج سے اسلام اور قرآن کا نام لے لے کر قوم کی ہمدردیاں حاصل کر رہے تھے ——— اور سب سے زیادہ مناسب موقعہ وہ تھا جب پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں قراردادِ مقاصد پیش کی جا رہی تھی، اب جب کہ قراردادِ مقاصد کو منظور ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں، دستور کا بنیادی مسودہ اسمبلی میں بہت جلد پیش ہونے والا ہے، اور کیا عجب ہے اسی نومبر (۱۹۵۶ء) میں پیش ہو جائے ——— "یوسوس فی صدور الناس" کی ڈیوٹی انجام دی جا رہی ہے، اور یہ شرارتیں ظہور میں آ رہی ہیں!

اس چیلنج کا جواب پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کو دینا چاہئے تھا کہ اُسی نے پاکستان کے دستور کی اساس کتاب و سنت کو بنایا ہے ——— اس سلسلہ میں ایک بات ہم اربابِ اقتدار سے کہنا چاہتے ہیں، آج اگر کوئی شخص یہ "چیلنج" اخباروں میں چھپوائے کہ "ہندوستان کی تقسیم غیر فطری طور پر ہوئی ہے، اسے پھر ایک ہو جانا چاہئے ——— جو کوئی میرے اس دعوے کو غلط ثابت کر دے گا اُسے دس ہزار روپیہ انعام دئے جائیں گے ——" تو اس فتنہ پردازانہ بحث کی اجازت کیا دیدی جائے گی اور حکومت اُس شخص سے ذرا سی بھی بازپرس نہ کرے گی؟ اگر اس چیلنج پر احتساب کیا جا سکتا ہے اور اس قسم کے مباحث کو انتشارِ فکر کا سبب سمجھا جا سکتا ہے تو پھر ہم دریافت کرتے ہیں کہ قراردادِ مقاصد منظور ہو جانے کے بعد ایسی شرارت آمیز بحث چھیڑنے والا کیا کسی احتساب یا بازپرس کا مستحق نہیں ہے ——— اظہارِ رائے کی آزادی کے ہم سب سے بڑھ کر مؤید ہیں مگر اُس کی بھی کچھ حدود ہیں، آزادی اور بدلگامی اور تفرقہ اندازی میں بہت فرق ہے۔

اسلامی تاریخ کے سب سے زیادہ تابناک صفحات اور درخشندہ ترین اوراق وہی ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مسعود اور خلافتِ راشدہ کے مبارک دور کا ذکر پایا جاتا ہے ——— تاریخ بتاتی ہے اور دوٹوک انداز میں بتاتی ہے کہ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے یہ نہیں کیا کہ قرآن کی آیات مسلمانوں کے سامنے تلاوت فرما دیں اور لوگوں کو نماز روزے کی تلقین کر کے آزاد چھوڑ دیا کہ وہ جس طرح چاہیں زندگی گزاریں اور جو قانون انھیں پسند ہو یا اُن کے ماحول سے مطابقت کرتا ہوا نظر آئے اُسے

اختیار کر لیں ـــــ بلکہ حضورؐ نے پُورے کے پُورے دین کو قائم فرمایا، اور یہی "اقامتِ دین" ایک اسلامی ریاست کے قالب میں متشکل اور جلوہ گر ہو گئی، حجاز کے طول و عرض میں حضورؐ نے جو حکومت قائم فرمائی اُس حکومت میں جو قانون چلتا تھا وہ قیصرِ روم اور شاہ مدائن کی حکومتوں کے دستور و قانون سے مُستعار نہیں لیا گیا تھا اور نہ ملوکِ حیرہ کی مملکت کے قدیم قانون کا عکس تھا اور نہ اُس میں حمورابی کے قانون کی جھلک پائی جاتی تھی ـــــ جس اسلامی اسٹیٹ کو رسولُ اللہ نے قائم کیا تھا اُس کا قانون قرآن سے سرِ مو اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا، کیونکہ حضورؐ اسی کتابِ ہدایت کو پھیلانے اور اسی منشورِ حیات کو برپا کرنے کے لئے مبعوث ہوئے تھے، جس خدا نے رسولُ اللہ کو نماز پڑھنے کیلئے وضو کرنے کا طریقہ تک وحی فرمایا، کیا یہ کسی طرح عقل میں آسکتا ہے کہ ایک حکومت رسولؐ کے ہاتھوں بس یوں ہی ظن و تخمین کی بنیادوں پر وجود میں آجائے اور اللہ تعالیٰ اُس کے لئے کوئی ہدایت نازل نہ فرمائے، ایسا خیال کرنا اللہ پاک کی حکمتِ بالغہ پر سب سے بڑی تہمت ہے، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔

جو لوگ پاکستان میں دستور سازی کیلئے قرآنی آیات کی سند طلب فرماتے ہیں اُن کے اس جواب میں ہم اُس پوری حکومت کو پیش کرتے ہیں جسے رسول اللہ نے عرب میں قائم فرمایا تھا، حضورؐ سے بڑھ کر قرآن کے معارف و غوامض اور احکام و منشا کا واقف کار اور کون ہو سکتا ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن جس پر نازل ہوا ہو اور جس کا قلب مہبطِ وحیِ الٰہی ہو اُس کی قائم کردہ حکومت میں اور تو سب کچھ ہو مگر قرآن نہ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس اسلامی حکومت کے بانی اور قیم (FOUNDER OF THE STATE) تھے، وہ یقیناً قرآن اور سُنت کی بنیادوں پر قائم ہوئی تھی بلکہ حق تو یہ ہے کہ اُس حکومت کے ہر شعبہ سے قرآن آواز دیتا تھا کہ :-

"میں یہاں موجود ہوں"

اسی حکومت کو خلفاء راشدین (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) نے سنبھالا اور اُس کے حدودِ سلطنت کو بہت کچھ وسیع کر دیا۔ ـــــ پس پاکستان میں ہم اُسی مثالی اسلامی حکومت کا قیام چاہتے ہیں! اسلامی حکومت، اسلامی دستور، اسلامی تہذیب، اسلامی ادب غرض تمام اسلامی نسبتوں سے وہی شخص متوحش ہو گا جس کے دل میں نفاق کا مرض جڑ پکڑ چکا ہے اور غلبۂ اسلام کے تصور سے جو اپنے سینہ میں بیچا دٹ اور تنگی محسوس کرتا ہے۔

اہلِ ایمان اور اہلِ نفاق کی پرکھ اور اُن کے مابین صحیح امتیاز کا وقت وہی ہوتا ہے، جب اسلام کے غلبہ اور سربلندی کے امکانات نظر آنے ہوتے ہیں، اہلِ ایمان اللہ کے دین کے غلبہ کے آثار دیکھ کر خوشی کے مارے باغ باغ ہو جاتے ہیں، اُن کی تمام کوششیں سمٹ سمٹا کر اسی محور پر اکٹھی ہو جاتی ہیں کہ اللہ کا دین جلد سے جلد پُورے کا پُورا برپا ہو جائے، اُن کے سامنے اقامتِ دین کی جدوجہد کے علاوہ کوئی اور پروگرام ہی نہیں ہوتا، یہی وہ وقت ہوتا ہے جب اہلِ ایمان اپنے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بُھلا کر یک دل، یک جان اور یک زبان ہو جاتے ہیں ـــــ مگر اہلِ نفاق پر یہ گھڑیاں بڑی شاق گزرتی ہیں، اقامتِ دین کی جدوجہد کو دیکھ کر وہ تلملا تلملا جاتے ہیں، اور اب اُن کی تمام کوششیں اس کام میں لگ جاتی ہیں کہ اہلِ ایمان میں کسی طرح پُھوٹ پیدا ہو جائے، وہ چھپ چھپ کر شوشے چھوڑتے، شبہے پیدا کرتے اور وسوسے ڈالتے ہیں، مسلمان کو وہ مسلمان کہہ کر مطعون نہیں کر سکتے اس لئے مسلمان کا نام "مُلّا" رکھتے ہیں اور اس نام پر ملامت کے جتنے تیر برسا سکتے ہیں بلا دریغ برسا دیتے ہیں، اسی طرح یہ منافقین اسلام پر طنز "مُلّا ازم" کے پردے میں کرتے ہیں، نفاق کُھل کر کبھی سامنے نہیں آتا وہ ہمیشہ ٹٹیوں کی اُوٹ سے ناوک فگنی کرتا رہتا ہے۔

وہ ملک جس میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے، وہاں سوئٹزرلینڈ، اٹلی، جرمنی، فرانس، انگلستان، امریکہ بلکہ روس تک کے دستور کے انداز پر کوئی دستور بن جائے تو ان منافقین کی زبانوں سے "اُف" بھی نہ نکلے گی بلکہ اُسے خوشی سے قبول کرلیں گے مگر کتاب و سُنّت اور اسلام و قرآن کا نام آتے ہی ان کے مرچیں لگ جاتی ہیں، اس غم کو وہ ضبط ہی نہیں کرسکتے، انھیں دُنیا میں سب سے زیادہ کد اسلام سے ہے۔

ان منافقین کا ایک گروہ اسلامی دستور کے بارے میں طرح طرح کے شُبہے پیدا کرنے کی مہم میں مصروف ہے، دوسری ٹولی یہ پروپیگنڈا کر رہی ہے کہ "دستور" کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے، اصل چیز معاشرت ہے اس کے سُدھارنے کی فکر کرنی چاہیئے، تیسری جماعت نے "ملّا ازم" کے نام پر اسلامی روایات کے خلاف ایک فتنہ کھڑا کردیا ہے۔ ——— اور وہ اخبارات جو ان منافقین کے ترجمان ہیں اُن میں کوئی یہ لکھتا ہے کہ اسلام نے شراب کی تجارت کی ممانعت ہی نہیں کی، حضرت جنیدؒ کی محفل میں لوگ شراب پی کر آتے تھے ——— کسی اخبار میں بلبل چودھری کے رقص کی تعریف اور تفصیل کئی کئی کالموں میں چھپتی ہے تاکہ مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں میں یہ جذبہ پیدا ہو کہ شہرت اور دولت حاصل کرنے کے تو دراصل یہ طریقے ہیں، تہذیب و تمدّن کی جلوہ گری تو "آرٹ" میں نظر آتی ہے ——— اسلامی دستور کی تدوین کے خلاف وہ دوسرا اندازیاں اور معاشرت کو بگاڑنے کے لئے یہ کوششیں! اسلام کو یہاں سربلندی حاصل ہو تو کس طرح ہو! منافقینِ مدینہ کو وہ ترکیبیں کہاں سوجھتی تھیں جو ترکیبیں منافقینِ پاکستان کو آتی ہیں!

"نفاق" کی یہ خاصیت ہے کہ "تالیفِ قلب" سے اُس کی شرارت میں اور ترقی ہوجاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے راس المنافقین عبداللہ بن ابی کے ساتھ کس قدر رواداری کا برتاؤ فرمایا مگر اُس دُشمنِ اسلام کی منافقت بڑھتی ہی چلی گئی، پس اہلِ ایمان کو چاہیئے کہ وہ اپنے اور منافقین کے موقف کو پہچان کر قدم اُٹھائیں اور اس میں امتیاز کریں کہ اُن کو کہاں حریر و ابریشم بننا ہے اور کس جگہ سنگِ خارا اور فولاد کی سختی اپنے طرزِ عمل میں پیدا کرنی ہے۔

پاکستان میں اسلام شدید مظلومیت کے دور سے گزر رہا ہے مولانا حالیؔ نے اسلام کی نوحہ خوانی ہندستان میں کی تھی، جب یہاں انگریزی راج تھا،

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

مگر آہ! کہ آج اسلام اپنے وطن ——— پاکستان' ہی میں پردیسیوں اور اجنبیوں کی طرح ایک ایک کا مُنہ تک رہا ہے!

ان حالات میں اہلِ ایمان کا کیا فرض ہے؟ کیا وہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں مگر مایوسی تو اسلام میں قریب قریب کفر کے برابر ہے ——— اس معاملہ کو اللہ پر چھوڑ دیں کہ جو تقدیرِ الٰہی ہوگی وہی ہوکر رہے گا لیکن ایسا توکل بھی اسلام میں جائز نہیں ہے، تو پھر کیا کریں؟ وہی کریں، جو ایک مردِ مومن کو کرنا چاہیئے، ایثار، خلوص، خشیتِ الٰہی، محبتِ رسولؐ اور جُرات و عزم کو لیکر اُٹھیں اور باطل کے ہر مورچے کے مقابل ڈٹ کر کھڑے ہوجائیں۔

پاکستان میں حالات کو بدلنے کے لئے پورے نظم وضبط کے ساتھ آئینی اور دستوری انقلاب ہی کامیاب ہو سکتا ہے، اور اسی انقلاب کے لئے فضا ہموار کرنی ہے، مسلمانوں کے ایک ایک گھر سے یہ آواز بلند ہونی چاہیئے کہ ہم "خالص اسلامی" دستور چاہتے ہیں ——— سو فی صدی اسلامی! جاہلیت اور اسلام کا معجون مرکب دستور ہم ہرگز ہرگز قبول نہیں کرسکتے، جو کوئی اس قسم کا نیم کا فرانہ دستور ہم پر مسلط کرنے کی کوشش کرے گا اُس کو ہمارے جذبۂ تسلیم و رضا سے مایوس ہو جانا چاہیئے، ہم اس قسم کے دستور کو نہ تو تسلیم کریں گے اور نہ آسے چلنے دیں گے، پاکستان صرف اسلام کی بنیاد پر بنا ہے اس لئے یہاں اسلام ہی کو سربلند اور غالب ہونا ہے!

صاف صاف کہہ دینا چاہیئے، برملا، دو ٹوک، ڈنکے کی چوٹ، کسی جھجک اور ذرا سی نرمی کے بغیر ——— کہ ہمیں جیل خانوں میں بند کیا جا سکتا ہے، ہمارے گھر ویران ہو سکتے ہیں، ہمیں گولیوں کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی حاکمیت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے کا اُسوہ ہمیں قبول نہیں ہے، ہمارا قائد، ہمارا ولی الامر، ہمارا لیڈر اور رہنما وہی ہو سکتا ہے جس کی زندگی میں محمدؐ رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ کی جھلک نظر آتی ہو، ہمیں ایسے حاکم اور لیڈر نہیں چاہئیں جن کی زندگی تقویٰ، پاکیزگی اور نیکو کاری سے خالی ہو، ہم حکومت کی کرسیوں پر ایسے حاکموں کو دیکھنا چاہتے ہیں جنھوں نے عہدوں کی ذمہ داریوں کو اللہ کی امانت سمجھ کر قبول کیا ہو، جن میں صدیقؓ کی صداقت و اخلاص، عمر فاروقؓ کا عدل اور حق شناسی، عثمان غنیؓ کی حیا اور علیؓ مرتضیٰ کی جُرأت اور پاکبازی جھلکتی ہو ——— جن کے پیش نظر یہ پروگرام ہو کہ پاکستان میں اسلام کو سربلند کرنا ہے، پاکستان کو ایک مثالی اسلامی حکومت بنانا ہے، ہمیں ہر اُس نیکی کو پھیلانا ہے جسے اسلام پھیلانا چاہتا ہے اور ہر اُس بُرائی کو مٹانا ہے جسے اسلام مٹانا چاہتا ہے، اُس بے حیا اور جاہلانہ معاشرت کا نام و نشان مٹا دینا ہے جس میں نامحرم مرد اور عورتیں ایک دوسرے سے آزادی کے ساتھ ملتی جلتی ہیں اور خواتین نامحرموں کو دکھانے کے لئے بن ٹھن کر نکلتی اور جان جان کر مقاماتِ زینت کو نمایاں کرتی ہیں۔

جن اربابِ اقتدار کا یہ کردار، ایسی زندگی اور یہ عزائم اور اس طرز کا پروگرام ہو اُن کے آگے ہم اپنا سر اطاعت خم کرتے ہیں، اور جن کی زندگیاں، جن کے ارادے منصوبے اور پروگرام اس سے مختلف ہوں اُن کے حکم اور فرمان کے لئے ہمارے پاس ٹھوکروں کے سوا اور کچھ نہیں ہے ——— اور یہ اصول ہم نے اپنی طرف سے نہیں گھڑ لیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "**معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے**" جو حکومت اللہ اور رسول کی مطیع ہے، ہم بھی اس کے مطیع اور وفادار اور جو اللہ اور رسول کے احکام کی باغی ہے، ہم اس کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں ہیں

"اِسلام صِرف اِسلام، خالِص اور پُورے کا پُورا اِسلام"

یہ ہے ہمارا نعرہ، ہمارا مقصود، اور ہماری منزل !!

ماہر القادری
دوشنبہ [illegible] ۵۲ م

ضیا احمد
بدایونی - ایم - اے

معلّمِ اخلاق نظامی

فارسی ادب ؛ خصوصاً فارسی شاعری میں جس قدر اخلاق و تصوف کا سرمایہ ہے شاید ہی کسی اسلامی - بلکہ مشرقی ادب میں ہو - اوّل تو یوں ہی نثر کے مقابلہ میں شعر کی تاثیر عموماً زیادہ ہوتی ہے - پھر جب اُس میں کوئی سچائی یا دانائی کی بات سلیقے سے ادا کی جائے تو اُس کے اثر کا کیا پوچھنا - ایسے ہی اشعار کی نسبت فرمایا گیا ہے اِنّ من الشعر لحکمۃ - یعنی بیشک بعض شعر سراپا حکمت ہوتے ہیں - ایک صحابیؓ کہتے ہیں کہ حضور سرورِ عالم نے مجھ سے فرمایا کہ اگر تم کو اُمیہ بن ابی الصلت کے کچھ شعر یاد ہوں تو سُناؤ - میں نے تعمیل کی - حکم ہوا اور سُناؤ - میں نے اور سُنائے یہاں تک کہ سو شعر پیش کئے - ارشاد ہوا کہ " اس کی زبان ایمان لے آئی تھی - مگر قلب کافر تھا - اور کچھ بعید نہ تھا کہ اُمیہ اسلام لے آتا " اسی طرح آں حضرتؐ کا لبید اور فرزدق کے اشعار کی تحسین فرمانا بھی احادیث سے ثابت ہے - یوں تو اخلاقی شاعری کا سراغ ایران میں رودکی اور اس کے معاصرین کے یہاں بھی ملتا ہے لیکن یہ صنف باقاعدہ طور پر جس نے شروع کی وہ محمد بن محمودؒ بن العلی تھا - یہ بلخ کا باشندہ اور سلطان محمود غزنوی کا ہم عصر تھا - تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس صنف کے مجدد اور مجتہد مولانا نظامی گنجوی ہیں - انھوں نے اپنے کلام اور خصوصاً مخزن الاسرار میں اخلاقی مضامین کو اس حسن ادا اور لطف بیان کے ساتھ پیش کیا ہے کہ مذاقِ سلیم وجد کرنے لگتا ہے -

مولانا نظامی کا پورا نام شیخ نظام الدین ابو محمد الیاس نظامی بن یوسف بن ذکی بن موید ہے - بعض نے ان کا نام اُدیس لکھا ہے - مگر خود ان کی صراحت کے مطابق یہ صحیح نہیں ان کا خاندان ایک علمی خاندان تھا - ان کے وطن اصلی کے بارے میں اختلاف ہے - عام طور پر وہ گنجوی مشہور ہیں - لیکن ایک جگہ خود فرماتے ہیں :-

چو دُر گرچہ در بحرِ گنجہ گمم ولے از قہستانِ شہرِ قُمم
بہ تفرش دہے ہست تا نامِ او نظامی از آنجا شدہ نام جو

قُم اصفہان کے قریب ایک علاقہ ہے جس کے شہر تفرش کے ایک چھوٹے اور غیر معروف گاؤں (تا) میں اس مشہور و معروف اُستادِ سخن کا خاندان رہتا تھا - وہاں سے کسی وجہ سے منتقل ہو کر گنجہ (ELIZOBETHAO) میں جو قفقاز کا خاص شہر ہے اقامت اختیار کی یہیں نظامی کی ولادت ہوئی اور یہیں ان کا مزار ہے - ایرانی محقق وحید دستگردی کی رائے ہے کہ وہ عراقی الاصل ہیں - لیکن نظامی کے جن اشعار سے انھوں نے استدلال کیا ہے وہ وہ اثبات مقصود کے لئے کافی نہیں ہیں - ان میں اہل عراق کے علم و فضل کی مدح اور عراق کی دید کا اشتیاق ظاہر کیا گیا ہے - اور بس -

اُن کا سالِ ولادت اور سالِ وفات بھی مختلف فیہ ہے - مگر چونکہ ان کی آخری تصنیف (سکندر نامہ)

۵۹۹ھ میں اختتام کو پہونچی اور وہ غالباً اس کے بعد دو تین سال جئے ہوں گے اس لئے ۶۰۲ھ کو اُن کا سال وفات قرار دے سکتے ہیں۔ نیز اکثر تذکروں میں ان کی عمر ۶۳ سال بتائی گئی ہے اس لئے ۵۳۹ھ ہجری کے لگ بھگ ولادت ہوئی ہوگی۔

مولانا کے تفصیلی حالات کہیں نہیں ملتے۔ البتہ ان کی تصنیفات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے تمام علوم عقلی و نقلی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کے علم و فضل۔ اور زہد و تقویٰ کا مشرق و مغرب میں سب نے اعتراف کیا ہے۔ ان کو فارسی کے اُن شعراء میں شمار کیا جاتا ہے جو مرتبۂ ولایت پر فائز تھے۔ براؤن نے الفاظ ذیل میں ان کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ "وہ اعلیٰ ذہانت اور بے داغ سیرت کے مالک تھے جس کی کوئی مثال دوسرے شعرائے ایران میں نہیں ملتی" انھوں نے اپنے آپ کو درباداری کے لوث سے پاک رکھا۔ تاہم بڑے بڑے سلاطین اُن کا ادب کرتے اور اُن کی تصانیف کا اپنے نام سے منسوب ہونا موجبِ فخر جانتے تھے۔

تصانیف ـــ مولانا کی تصانیف اور خصوصاً خمسہ کا شمار فارسی زبان کے بلند شاہ کاروں میں ہے۔ ہر زمانے میں اکابر شعراء نے جن کی تعداد سو سے اوپر ہے۔ خمسۂ نظامی کی تقلید کی کوشش کی اور ان کی پیروی کو ذریعۂ افتخار جانا ـــ تفصیل حسب ذیل ہے :-

(۱) مخزن الاسرار (۵۵۹ھ) بنام ملک فخر الدین بہرام شاہ سلجوقی والی ارزنجان

(۲) خسرو شیریں (۵۷۶) " سلطان رکن الدین طغرل بن ارسلان سلجوقی

(۳) لیلیٰ مجنوں (۵۸۴) " خاقان اکبر جلال الدین ابوالمظفر اخستان بن منوچہر شروان شاہ

(۴) ہفت پیکر یا ہفت گنبد یا بہرام نامہ (۵۹۳) " سلطان علاء الدین کرب ارسلان والی مراغہ

(۵) سکندر نامہ (۵۹۹) اوّل بنام اتابک نصرۃ الدین ابوبکر شاہ آذربائیجان

بری (شرف نامہ) و بحری (اقبال نامہ یا خرد نامہ) و ثانی بنام ملک عز الدین مسعود بن ارسلان سلجوقی والی موصل

(۶) گنجینۂ گنجوی (قصائد و غزلیات)

مولانا نظامی نے (قصائد و غزلیات کو چھوڑ کر) زیادہ تر مثنوی ہی کی صنف کو اختیار کیا لیکن ان کی مثنویوں کے موضوعات میں کافی تنوع پایا جاتا ہے۔ یہ اخلاقی۔ صوفیانہ۔ فلسفیانہ۔ عشقیہ۔ تمثیلیہ۔ رزمیہ۔ تمام مباحث پر حاوی ہیں۔ سعدیؒ وغیرہ اخلاقی شاعری کے اُستاد ہیں۔ مگر رزمیہ میں اُن کا کوئی درجہ نہیں۔ فردوسی رزم کا بادشاہ ہے۔ لیکن بزم میں تقریباً صفر ہے۔ مگر نظامی نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اپنا سکہ بٹھا دیا ہے۔ ان کی نزاکت تخیل اور زور کلام مسلم ہے ـــ بقول علامہ شبلی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے پانچ مختلف بحروں میں پانچ مثنویاں لکھیں۔ جن میں سے مخزن الاسرار اور ہفت پیکر کی بحریں پہلی بار استعمال کی گئی ہیں اسی طرح فلسفیانہ مباحث کو نظم کرنا۔ ساقی نامہ کو رواج دینا۔ قصیدہ کو مداحی سے پاک کرنا ان کی اولیات میں ہے۔

آج کی صحبت میں ہم مخزن الاسرار کی بعض خصوصیات پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ مولانا کی پانچ مثنویوں (خمسہ یا پنج گنج نظامی) میں یہ سب سے پہلی ہے۔ اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا بہرام شاہ والی ارزنجان کے نام ۵۵۹ھ میں اختتام کو پہونچی۔ شاہ ممدوح نے نظامی کو اس کے صلے میں پانچ ہزار دینار، پانچ گھوڑے مع ساز و یراق۔ پانچ

نجز۔ اور قیمتی جوڑے عطا کئے اور کہلا بھیجا کہ اس کتاب کے عوض میں خزانہ بھی کم ہے کیونکہ یہ بقائے نام کا ذریعہ ہے۔ یہ مثنوی بحر سریع میں ہے اور ۲۲۶۳ اشعار پر مشتمل ہے۔ تصنیف کے وقت شاعر جوانی کی حدود میں تھا اور عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ کتاب کا موضوع اخلاق ہے۔

تصوف اور اخلاق کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مولانا ایک ممتاز صوفی تھے۔ اس لئے اخلاقی مسائل سے اُن کو قدرةً لگاؤ تھا۔ اُن کے تصوف کے بارے میں اتنا اشارہ کافی ہے کہ ان کے یہاں وحدۃ الوجود کی وہ بیخودی اور سرشاری نہیں ملتی جو عطار اور دوسرے صوفی شعرا کے یہاں ہے۔ ان کا تصوف زہد و تقویٰ۔ توکل و قناعت اور صبر و رضا کا دوسرا نام ہے۔ اور یہی رنگ ان کے کلام میں نمایاں ہے۔

ان کے خمسے کی مقبولیت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ متعدد بڑے شعرا مثلاً خسرو۔ جامی۔ فیضی وغیرہ نے ان کی تقلید کو فخر جانا اور خمسے تصنیف کئے۔ صرف مخزن الاسرار کی تقلید میں جن شعرا نے اسی موضوع اور اسی بحر میں مثنویاں لکھیں ان کی تعداد ساٹھ سے اوپر ہے۔ یہاں تک کہ ہر ایک نے اس کا اہتمام کیا ہے کہ اس کی مثنوی کا افتتاحیہ مطلع بھی نظامی کے افتتاحیہ مطلع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
ہست کلید در گنج حکیم

کا جواب ہو۔ اساتذہ کے تقریباً تیس مطلعے اس انداز کے ملتے ہیں۔ جن کو یہاں بخوف طوالت لنظر انداز کیا جاتا ہے۔

مثنوی کا آغاز حسب توقع حمد باری تعالیٰ سے کیا ہے۔ اسی کے ساتھ دو مناجاتیں ہیں۔ ایک میں شان جلال پر اور دوسری میں صفت جمال پر زور دیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:—

اے ہمہ ہستی ز تو پیدا شدہ	خاک ضعیف از تو توانا شدہ
زیر نشین علمت کائنات	ما بتو قائم۔ چو تو قائم بذات
ہستی تو صورت پیوند نے	تو بکس و کس بتو مانند نے
انچہ تغیر نپذیرد تو ئی	وانکہ نمردہ است ونمیرد توئی
ما ہمہ فانی و بقا بس تراست	ملک تعالیٰ و تقدس تراست

تنزیہہ پر کس قدر پاکیزہ خیالات ہیں۔ سبحان اللہ۔ پھر بندشوں کی چستی اور زبان کی صفائی نورٌ علیٰ نور۔

حلقہ زن[1] خانہ بدوش توایم	چوں در تو حلقہ بگوش توایم
داغ تو داریم و سگ داغ دار	می نہ پذیرند شہاں در شکار
ہم تو پذیری کہ زباغ توایم	قمری طوق ور سگ داغ توایم

کتنا اچھوتا اور پُر اثر طرز بیان ہے۔ کہتے ہیں کہ ہمارے وجود پر تیری غلامی کا داغ (نشان) ہے اور بادشاہوں کا قاعدہ ہے کہ دوسرے کا نشان رکھنے والے کتے کو اپنے ساتھ شکار میں نہیں لے جاتے۔ اس لئے اگر

---

[1] گدا

تو نے ہی جب نہ پوچھا تو ہمارا کہاں ٹھکانا۔

یار شو اے مونس غمخوارگاں چارہ کن اے چارۂ بیچارگاں
قافلہ شد، واپسی ما بہ بیں اے کس ما بیکسی ما بہ بیں
برکہ پناہیم، توئی بے نظیر درکہ گریزیم، توئی دستگیر

اس کے بعد نعت رسول شروع ہوتی ہے۔ استعارات کی لطافت۔ خیالات کی نزاکت کے ساتھ عقیدت و محبت کا ایک دریا ہے کہ موجیں مار رہا ہے۔ ایک چھوڑ پانچ پانچ نعتیں ہیں۔ مگر زور سخن کہیں کم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ نمونہ کے طور پر چند شعر حاضر ہیں۔ داد دیجئے اور درود پڑھئے۔ کلام میں درد اس قدر ہے کہ ممکن نہیں کوئی پڑھے اور چشم پُرنم نہ ہو

اے مدنی برقع و مکی نقاب سایہ نشیں چند بود آفتاب
گر مہی از مہر تو موئے بیار ور گلی از باغ تو بوئے بیار
منتظراں را بلب آمد نفس اے ز تو فریاد بہ فریاد رس

اسلام کی غربت اور اہل اسلام کی غفلت۔ سلطنتوں کی تباہی اور سلاطین کی گمراہی پر اُن کا دل کڑھتا ہے۔ اور وہ سرکارِ رسالت سے عرض کرتے ہیں کہ عرب کو چھوڑیئے اور عجم کی حالتِ زار آکر دیکھئے:۔

سوئے عجم راں منشیں در عرب زردہ روز اینک و شبدیز شب
ملک برآرائے و جہاں تازہ کن ہر دو جہاں را پر از آوازہ کن
سکہ تو زن تا امرا کم زنند خطبہ تو خواں تا خلفا دم زنند

یعنی آجکل کے سلاطین و خلفا جو آپ کے مسلک سے ہٹے ہوئے ہیں دراصل غاصب ہیں۔ آپ تشریف لاکر اپنا سکہ چلائیں تاکہ یہ حکمرانی سے باز رہیں اور آپ خطبہ پڑھیں تاکہ یہ لوگ سکوت اختیار کریں۔ ان لوگوں نے حقیقت میں آپ کی مسند پر ناجائز قبضہ کر رکھا اور آپ کے منبر کو ناپاک کر دیا ہے

باز کش ایں مسند از آسودگاں غسل دہ ایں منبر از آلودگاں

آگے بڑھ کر لہجہ اور سخت ہو جاتا ہے۔

خانۂ غول اند بپرداز شاں در غلہ دانِ عدم انداز شاں
کم بکن اجری کہ زیادت خورند خاص کن اقطاع کہ غارت گرند

اُس زمانہ کے جبار امرا و خلفا کا پول اس بے باکی اور دلیری سے کھولنا صرف ایسے ہی مردِ خدا سے ممکن تھا، جو طمع اور خوف سے پاک ہو جیسا کہ سعدیؒ کہتے ہیں

سعدیا چندانکہ می دانی بگوئے حق نباید گفتن الا آشکار
ہر کرا خوف و طمع در کار نیست از خطا باکش نباشد وز تتار

مسلمانوں کے عام انتشار کی تصویر جو اس استغاثہ میں کھینچی گئی ہے آج بھی کس قدر ہمارے حسب حال ہے۔ مولانا کہتے ہیں۔

از طرفے رخنہ بہ دیں می کنند — دزدگر اطراف کمیں می کنند
شحنہ تو ئی قافلہ تنہا چراست — قلب تو داری علم آنجا چراست
یا علیے در صف میداں فرست — یا عمرے بہر شیطاں فرست

مصرع ثانی میں اُس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ شیطان حضرت عمرؓ سے ڈر کر بھاگتا ہے۔ یہ درست ہے کہ مولانا جامی نے اپنی مثنویوں میں نعت گوئی کا کمال دکھایا ہے مگر جس نے اس عمارت کی داغ بیل ڈالی وہ نظامی تھے۔

اس کے بعد بادشاہ وقت کی مدح۔ سخن کی تعریف اور دوسرے مضامین ہیں یہاں تک کہ اصل کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ بیس مقالوں پر مشتمل ہے۔ اور ہر مقالے کے بعد اس کی تشریح کے لئے مناسب موقع ایک حکایت آتی ہے۔ مقالوں کے عنوانات۔ آفرینش آدم۔ محافظت عدل۔ حوادث عالم۔ حسن رعایت شاہ با رعیت۔ وصف پیری وغیرہ وغیرہ ہیں۔

پوری مثنوی کے بارے میں ہر عنوان کے تحت بحث کرنا تو طوالت سے خالی نہیں۔ ہم جستہ جستہ چند مقامات سے نظامی کی تعلیم پیش کر کے اُس پر اظہار رائے کریں گے۔

اُس دور کی شخصی حکومتوں کو اُن کے طرز عمل پر ٹوکنا۔ اور عدل و احسان کی تلقین کرنا حدیث نبوی کی رو سے افضل الجہاد تھا۔ اور مولانا نے اس جہاد کا حق نہایت جرأت سے ادا کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

کار تو پر ور دن دین کردہ اند — داد گراں کار چنیں کردہ اند
داد گری مصلحت اندیشہ ایست — رستن ازیں قوم ہمیں پیشہ ایست
خانہ کن ملک ستم کاری است — دولت باقی ز کم آزاری است
راحت مردم طلب آزار چیست — جز خجلی حاصل ایں کار چیست
روز قیامت کہ بود داوری — شرم نداری کہ چہ عذر آوری

آخر میں نوشیرواں کی مشہور حکایت لکھی ہے کہ وہ پہلے ظالم تھا۔ بعد کو وزیر کی تدبیر سے عدل اختیار کیا۔ اسی طرح سلطان سنجر سلجوقی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک روز ایک بڑھیا نے اُس سے آکر فریاد کی۔ کہ اے بادشاہ تجھ سے کبھی رعیت کو چین نہیں ملا۔ ہمیشہ دُکھ ہی پہونچا۔ کل تھانہ دار شراب پی کر میرے گھر آیا۔ مجھے مارا پیٹا۔ اور پوچھا کہ بتا تیری گلی میں جو قتل ہوا ہے اس میں کون کون شریک تھا۔

آنکہ دریں ظلم نظر داشتہ است — ستر من و عدل تو برداشتہ است
گر ندہی داد من اے شہریار — با تو رود روز شمار ایں شمار
داوری و داد نمی بینمت — وز ستم آزاد نمی بینمت

جب تو انصاف نہیں کرتا اور ظالموں سے بازپرس نہیں کرتا تو تو بھی ظلم میں شریک ہے۔

از ملکان قوت و یاری رسد — از تو ہمایں کہ چہ خواری رسد
مال یتیماں ستدن کار نیست — بگذر کایں عادت احرار نیست

بندۂ ای دعوئ شاہی کنی — شاہ نۂ ای چوں کہ تباہی کنی

اس سے بڑھ کر سنئے۔

دولت ترکاں کہ بلندی گرفت — مملکت از داد پسندی گرفت

چونکہ تو بیداد گرے پروری — ترک نۂ ای، ہندوئے غارتگری

یعنی جب تو ظالموں کی حمایت کرتا ہے تو تجھے تُرک نہیں۔ بلکہ غارتگر چور کہنا چاہئے۔ اس فہمائش کا نتیجہ کیا ہوا۔ سنجر نے سُنی اَن سُنی کر دی اور آخر ایک دن حکومت سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

سنجر کا قلیم خراساں گرفت — کرد زیاں کیں سخن آساں گرفت

لُطف یہ ہے کہ مخزن الاسرار جس میں یہ حکایت درج ہے سنجر ہی کے خاندان کے ایک بادشاہ سے منسوب ہے۔ الشّی بالشّی یذکر۔ تاریخ کہ سنجر کے باپ ملک شاہ کا یہ واقعہ فراموش نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک مرتبہ بغداد کے پُل پر سے سوار گزر رہا تھا اچانک ایک ضعیف عورت نے اُس کے گھوڑے کی باگ تھام کر کہا اے الپ ارسلاں کے بیٹے بتا میرا انصاف بغداد کے پُل پر کرے گا یا پُل صراط پر۔ ملک شاہ با ایں جاہ و جلال اُس عورت کے ٹوکنے پر رو پڑا اور بولا مائی میں تیرا انصاف یہیں کروں گا پُل صراط پر انصاف کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں۔ چنانچہ اس نے وہیں کھڑے کھڑے ظالم کو طلب کر کے سخت سزا دی اور مظلوم کی داد رسی کرنے کے بعد شاہی سواری آگے بڑھی مثنوی کے متعدد مقالے کسبِ فضائل ترکِ دُنیا۔ بے وفائی روزگار۔ حق تجرید۔ اور فکر آخرت سے متعلق ہیں۔ چند اشعار نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ کہ مالا یدرک کلّہ لا یترک کلّہ۔

(۱) ہمیں دوسروں کے عیب اس لئے نظر آتے ہیں کہ اپنے عیبوں پر نظر نہیں۔

دیدہ زعیب دگراں کن فراز — صورت خود بیں و در و عیب ساز

چشم فرو بستہ ای از عیب خویش — عیب کساں را شدہ آئینہ پیش

عیب نمائی مکن آئینہ دار — تا نشوی از لقب عیب دار

ایک بار حضرت عیسیٰؑ بازار سے گزر رہے تھے۔ راہ میں ایک مرا ہوا کتّا پڑا تھا۔ اور گزرنے والے اُس پر اظہار رائے کرتے جا رہے تھے۔ کوئی اس کی بدنمائی۔ کوئی اُس کی بدبو کا تذکرہ کر رہا تھا۔ حضرتؑ نے دیکھ کر فرمایا دیکھو اس کے دانت کتنے سفید ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اچھوں کی نظر اچھائی ہی پر پڑتی ہے۔

(۲) فکر ہر کس بقدر ہمّت اوست۔

بحر بصد رود شد آرام گیر — جوئے بیک سیل برآرد نفیر

دیکھو سمندر میں بیسیوں دریا آکر گرتے ہیں پھر بھی اُس کے سکون میں فرق نہیں آتا۔ اور دریا ایک ہی سیلاب میں چلّا اُٹھتا ہے۔

(۳) خدمت خلق خدا کی دوستی کا زینہ ہے۔

رابعہ با رابع آں ہفت مرد — گیسوئے خود را بنگر تا چہ کرد

اے ہنر از مردی تو شرمسار — از ہنر بیوہ زنے شرم دار

ہفت مردے سے اصحاب کہف اور رابع سے ان کا کتا مراد ہے (رابعہم کلبہم) مشہور ہے کہ حضرت رابعہ بصریؒ نے ایک کتے کو صحرا میں پیاسا دیکھا۔ آپ نے اپنے گیسو کاٹ کر رستی بنائی اور پیرہن کو اس میں باندھ کر کوئیں میں ڈالا۔ اور نچوڑ کر اس بے زبان کو پانی پلایا۔ جس کی برکت سے مرتبۂ ولایت پایا۔

(۴) دست سوال سیکڑوں عیبوں کا عیب ہے۔ صوفیہ پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ قوم پر بار ہیں۔ خود بیکار اور دوسروں کو بیکاری کی ترغیب دینے والے معترض دیکھیں کہ مولانا کا اس بارے میں کیا مسلک ہے۔

بر دل دو ستت ہمہ خارے بزن — تن مزن و دست بکارے بزن
ہر کہ بکارے بجنبد دست خویش — نالشوی پیش کساں دست کش

(۵) تن پروری سے بچنا اور سخت کوشی کی عادت ڈالنا اخلاق کی پہلی شرط ہے۔

زنی دل می طلبی نغز دار — نازِ صفت تن بدرشتی سپار
اے کہ ترا بر زخشن جامہ ہیست — علم بہ ابریشم و بادامہ نیست

(۶) یقین ہر کامیابی کی کلید ہے۔

پائے بہ رفتار یقیں سر شود — سنگ بہ پندار یقیں زر شود
گر قدمت شد بہ یقیں استوار — گرد ز دریا، نم از آتش برآر

(۷) انسان کا فرض ہے کہ جدوجہد کرے اور اپنی خطا کو تقدیر کے سر نہ تھوپے

آئینۂ جد فرا پیش دار — در نگر و پاس رخ خویش دار
عذر ز خود بیں و قبول از خدائے — جلد بہ تسلیم قدر در میائے

(۸) محنت سے راحت ہے۔

بار عنا کش بہ شب قیر گوں — ہر کہ عنا بیش عنایت فزوں
زاہل وفا ہر کہ بجائے رسید — بیشتر از راہ عنائے رسید
نزل بلا عافیت انبیاست — وانچہ ترا عافیت آرد بلاست

(۹) دنیا دل لگانے کی جگہ نہیں ہے۔

اے کہ درین کشتیٔ غم جائے تست — خون تو در گردن کالائے تست
بار در افگن کہ عذابت دہد — نان مدہد تا کہ بہ آبت دہد
صحبت گیتی کہ تمنا کند — با کہ وفا کرد کہ با ما کند

(۱۰) آدمی کو خدا کی محبت اور انجام کی فکر چاہیے۔

تا بہ جہاں در نفسے می زنی — بہ کہ در عشق کسے می زنی
بانگ برین ورد جگر تاب زن — سنگ برین شیشۂ خوشاب زن

۱؎ پوستین ۲؎ جامۂ منقش

غرض کہاں تک لکھا جائے۔ یہ مولانا کی پاکیزہ اور بلند تعلیمات کا ایک ہلکا سا خاکہ تھا رہا اُن کا اسلوبِ تحریر۔ اس کی نسبت کچھ کہنا۔ سورج کو چراغ سے دکھانا۔ تاہم اس قدر اشارہ کرنا کافی ہے کہ تمام ناقدانِ سخن اور اہلِ فن نے اُن کو ایک باکمال استاد تسلیم کیا ہے۔ اُن کی قوتِ تخیل اور زورِ کلام کا کلمہ ایک دنیا پڑھتی آئی ہے۔ اِسی قوتِ تخیل کا کرشمہ ہے کہ انھوں نے نئی نئی تشبیہات اور نادر استعارات اختراع کئے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض قدرے بعید اور عسیر الفہم ہیں۔ جن کی وجہ سے اُن کا کلام شرح کا محتاج ہو گیا ہے تاہم مجموعی طور پر ان سے شاعر کی قوتِ اختراع کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً فرشِ دورنگ (زمین)۔ بادِ سلیمانؑ (تختِ سلیمانؑ) غلہ دانِ عدم (زمین) ۔ منطق مرغاں (آوازِ خوش) لعبتِ فلک (کواکب) زاغِ طبیعت خراش (دنیا) مرغِ قفس پر (روح) سرِ سرکش دیدۂ نرگس (صبا) زنگِ زجاجۂ بس (کیمیا) نعلِ مسیح گاہ (ماہ) ابجد نہ مکتب (اسرارِ آسمانی) ہمائے حلی (آفتاب) آبِ معلق (آسمان) ابلق سوار نیم زنگی (آسمان)۔ پنج نوبت زن شریعتِ پاک (رسولِ مقبولؐ) تختۂ زرد آبنوسی (آسمان) چشمۂ سیماب ریز (آفتاب) داغِ یعقوبی (کوری) ——— یہی کنایات کا حال ہے۔ مثلاً آب خفتہ (برف) آب در جگر داشتن (دولت مندی) آبِ دنداں خوردن (افسوس کرنا) آب نخوردن (دیر نہ کرنا) آسمان بہ ابر پوشیدن (کسی ظاہر بات کو چھپانا) آفتاب زرد (قریب مرگ ہونا) از خر افتادن (مرجانا) استخواں شکستن (حقیر ہونا) افیون خور مہتاب گشتن (چاندنی میں سو جانا) باد در کلاہ داشتن (مغرور ہونا) چشم در کلاہ داشتن (ذلیل ہونا) پل بر آب چشمہ شکستن (محروم ہونا)

نظامی کے یہاں سیکڑوں پرانے اور متروک الفاظ اور نئی نئی لطیف تراکیب ملتی ہیں۔ جن کا استیعاب یہاں مقصود نہیں ہے۔ انہیں چیزوں نے اُن کا کلام کا اشکال و اغلاق بڑھا دیا ہے۔ اس کے باوجود جو مقبولیت اور شہرت ان کی شاعری کے حصے میں آئی ہے وہ یقیناً حیرت انگیز ہے۔ زورِ کلام جو ان کی شاعری کا خاص وصف ہے ایسی چیز ہے جو در اصل وجدانی ہے۔ اور جس کا تجزیہ کرنا آسان نہیں ہے۔ البتہ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس میں بندش کی چستی اور خیالوں کی روانی کو خاص دخل ہے۔ ضرورت ہے کہ اُن کے کلام کا معتدبہ حصہ پڑھا جائے جس سے اس خصوصیت کا صحیح اندازہ ہو۔

نظامی کے یہاں اپنے عہد کے دیگر اکابر شعرا (انوری۔ خاقانی) کی طرح قوتِ اختراع۔ کمالِ بلاغت اور زورِ بیان کی فراوانی ہے اور یہ وہ اوصاف ہیں جو کم و بیش ان سب میں مشترک ہیں۔ لیکن ایک چیز جس میں وہ سب سے سبقت لے گئے ہیں وہ ان کی جامعیت ہے۔ یعنی اخلاقی۔ عشقیہ۔ رزمیہ جس موضوع پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے زمینِ سخن کو آسمان پر پہونچا دیا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ

قبولِ خاطر و لطفِ سخن خدا داد ست

ترجمہ:- معتدی علی صدیقی

شراب

جسے

قرآن نے "رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ" بتایا!

اُس کے بارے میں

یورپ کے مفکرین کیا کہتے ہیں؟

(تجربہ، مشاہدے اور تحقیق کے بعد)

یہ ایک مسلّم مسئلہ ہے کہ اسلامی تعلیمات بعض معاملات میں تہذیب حاضر کے تقاضوں کے بالکل برعکس ہیں۔ جو لوگ ہر مسئلہ کو سرسری نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں وہ اسلام پر رجعت پسندی اور تعصب کا الزام لگاتے ہیں۔ لیکن جو شخص ان مسائل میں غائر نظر رکھتا ہے وہ محسوس کرے گا کہ وہ معاملہ جس میں اسلام کا فتویٰ آرائے جدیدہ کے منافی ہے وہاں صداقت ہماری جانب ہے ایسی حال نشہ آور مشروبات کا ہے۔ ان کا استعمال اسلامی احکام کے لحاظ سے قطعی حرام ہے۔ اور زمانہ حال کی دقیق ترین سائنسی تحقیقات بالآخر اسی نتیجے پر پہونچی کہ نشہ آور اشیاء کا استعمال نہ صرف انسانی جسم بلکہ عمرانی نظام کے لئے بالکلیہ مضرت رساں ہے۔ انسان کی زندگی پر شراب نوشی کے اثرات مُہلک درجہ تک مُضر ہیں۔ اعضائے جسم کے مقررہ وظائف میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ دماغ اور حواس کا توازن درہم برہم ہو جاتا ہے اور اس کا آخری نتیجہ سماجی نظام کی ابتری کی شکل اختیار کرتا ہے۔ جرائم، خودکشی، قتل اور جنون اس عادت قبیحہ کے سہارے سوسائٹی میں جڑ پکڑ لیتے ہیں۔

معاشرے کے وہ گروہ جن کے خلاف نفرت، اخلاق اعمال اُنھیں سماج میں انگشت نما کرتے ہیں اُس منظم ہوتی اُٹھان اور نامکمل ارتقا کی علامت ہیں جو شراب نوشی کی وجہ سے قوموں میں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ عادی نشہ بازوں میں جو غیر فطری رجحانات پائے جاتے ہیں اُن میں خودکشی کا تناسب بہت زیادہ ہے اور اُن کے اعصابی نظام کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے اس لئے اقدام خودکشی کے ستر فیصدی مُلزم عادی شراب خور ہی ہوتے ہیں۔ جرائم کی دوسری قسم جو عادی شراب نوشوں میں بالعموم پائی جاتی ہے وہ مجبورہ الحواسی سے قریب ہی قریب

یعنی بچوں سے جنسی جرائم کا ارتکاب ہے۔ ان سے کم درجے پر جو جرائم شراب نوشوں کو مرغوب ہوتے ہیں وہ آتش زنی اور سرقہ ہیں جو نظامِ عقلی کے مغلوج ہونے کی علامت ہیں۔ بڑھتے بڑھتے یہ عادتیں مفت خوری کے روپ میں مستقل پیشے کی نوعیت اختیار کرتی جاتی ہیں اور اب شراب نوشوں کو گداگری، عصمت فروشی، یا طفیلی پن کی زندگی گزارتے پائیں گے۔ یہ بیانات ڈاکٹر ڈبلیو سی سلیون (C. SULLIVAN) کے مشاہدات پر مبنی ہیں جو انھوں نے اپنی تصنیف "الکحلزم" (ALCOHOLISM) میں جمع کئے ہیں۔ مزید تحقیقات کے سلسلے میں ڈاکٹر سلیون لکھتے ہیں کہ ان عوامل میں سے جو انسان کی نسلی ارتقا کو متاثر کرتے ہیں شراب نوشی ایک نہایت زبردست عامل ہے۔ اولاد کی نشو و نما پر والدین کی شراب نوشی کا اثر بڑا مختلف مگر بہت دور رس ہوا کرتا ہے۔ مثلاً بچے کی دماغی صلاحیت ہی کو لیجئے تو یہ بالکل ممکن ہے یہ اثر کم سے کم کج فہمی یا کم فہمی اور زیادہ سے زیادہ مراق اور جنون تک پر مشتمل نکلے۔ پھر جسمانی اور عضویاتی وظائف میں شراب کا اثر وقتی کمزوری سے لیکر ایسی مستقل کمزوری تک ہو سکتا ہے کہ بچہ ہمیشہ مردہ پیدا ہو یا اسقاط حمل ہو جایا کرے۔ جن لوگوں نے انسانی صلاحیتوں پر نسلی اثرات کے مطالعہ کو اپنا موضوع تحقیقات بنایا ہے وہ متعجب ہیں کہ کس قدر کثرت اور تواتر سے انھیں ذہنی طور پر انحطاط پذیر اولاد کے مورثوں میں شراب کی عادت اور عادی شرابیوں کی نسل میں انحطاط ذہنی کے آثار صاف صاف نظر آتے ہیں۔ اعداد و شمار سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ کتنے مختلف فطری عیوب، مثلاً جنون، ضعف عقلی، صرع، ضعف عصبی، جرم پسندی، غرض کہ بیشتر بداعمالیوں میں مورثین اور اسلاف کی شراب خواری کا پس منظر کس کثرت سے موجود پایا گیا۔ کچھ دن قبل انگلستان میں ایک سو بیس شراب کی عادی عورتوں کی اولاد کے متعلق کچھ اعداد و شمار جمع کئے گئے۔ ان عورتوں کے چھ سو بچے ہوئے جن میں سے تین سو چھتیس یا تو بچپن ہی میں مر گئے یا مردہ پیدا ہوئے۔ جو زندہ بچے ان میں چار فی صد صرع میں مبتلا نکلے اور بیشتر کے دماغ کسی نہ کسی حد تک ناپختہ پائے گئے۔ ڈاکٹر سلیون کے الفاظ ہیں "ماں کی شراب خوری کے مضر اثرات جنین اور اس کے خلیوں کو براہ راست متاثر کرتے نظر آتے ہیں۔"

شراب کی عادت پڑنے کے وجوہ ازدواجی نقطۂ نظر سے ایک خاص کیفیت کے حامل ہیں، مثال کے طور پر اسلامی احکام کا وہ پہلو لیجئے جس میں عورت کے فرائض میں پرورشِ اطفال اور بقائے نسل کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اسے ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنی دلچسپیاں اور مصروفیتیں اپنے گھر اور متعلقین کے مفاد اور فلاح تک محدود رکھے لیکن اہلِ مغرب نے نسوانی حقوق اور فرائض کا کچھ ایسا مختلف نظریہ اختیار کیا ہے جس سے اکثر زن و شو کے تعلقات شکست ہوتے ہیں، گھر برباد ہو جاتا ہے اور شرح پیدائش میں تشویشناک کمی ہونے لگتی ہے، مغرب میں شراب نوشی کی کثرت کا ایک سبب یہی غلط نظریہ ہے۔ ممکن ہے کہ ناظرین ہماری اس بات کو باور کرنے پر آمادہ نہ ہوں لیجئے ہم ڈاکٹر سلیون کی زبان سے ان کے شکوک رفع کئے دیتے ہیں۔ اپنی متذکرہ بالا معرکۃ الآرا تصنیف میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے "آجکل کے معمولی صنعتی اداروں میں عورتوں کا ملازم ہو جانا ان کی گھریلو مصروفیتوں اور فرائض کو ملیٹ کر دیتا ہے۔ اور اگر وہ شادی شدہ نہیں ہیں تو ان میں گھر گرہستی کی تربیت حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آجکل انگلستان میں نچلے متوسط طبقے کی مائیں، پرورشِ اطفال، صفائی، اور پکوان سے ایسی نابلد اور نامانوس ہوتی ہیں کہ ان کی بدسلیقگی اور فضول خرچی سے تنگ اُن کے تھکے ماندے شوہر شراب خانوں میں وہ مزے

تلاش کرتے پھرتے ہیں جو انھیں گھر میں میسر نہیں آتے۔ غرض ایسے تمام پیشے اور مصروفیتیں جو عورتوں کو ان کے گھریلو مشاغل سے دور کرتے جاتے ہیں شراب نوشی کی ترویج میں بڑے معاون ہوتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ قوم کی ذہنی اور جسمانی صحت متاثر ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ فرانس کا ایک مشہور ادارہ جو سماجی حالات اور اسباب کی تحقیقات کیا کرتا ہے اس کی سالانہ رپورٹ کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے "شراب پینے کی مستقل عادت، خواہ نشہ کتنا ہی حد اعتدال میں رکھا جائے فرانس میں شرح اموات کے ایک بڑے حصّے کا ذمّہ دار ہے۔ بہت تیز اور تند شراب پینا صحت عامہ کے لئے اتنا مضر نہیں ہوتا جتنا شراب کا موقعہ بے موقعہ، ہر وقت، اور ہر مقام پر مستقل اور کثرت سے استعمال"

یہ تصوّر کہ شراب نوشی حد اعتدال میں جائز ہے نہ صرف غلط ہے بلکہ یہی عورتوں اور نوعمروں کی شراب خوری کا بڑی حد تک ذمّہ دار بھی ہے۔ فرانس میں لڑکوں یہاں تک کہ بچّوں کی شراب خوری کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ کئی موقعوں پر ان بچّوں کے ناشتہ دان دیکھے گئے جو اپنے دوپہر کے کھانے اسکول لاتے ہیں اور ان میں کھانے سے زیادہ مقدار شراب کی موجود پائی گئی۔ بیس سال کی عمر اور شراب کی مستقل عادت کوئی عجیب چیز نہیں۔ برٹنی[1] اور نارمنڈی[2] کے اضلاع میں بچّوں کو گہواروں میں شراب دیجاتی ہے۔ اور بعض نوخیز نوجوانوں کے چہروں پر پکّے شرابی ہونے کے آثار نظر آتے ہیں۔ مغربی دنیا کے ایمان اور عمل کے پیشوا فرانس میں شراب نوشی کی کثرت کے مضر اثرات و نتائج کی طرف سے آنکھیں کیونکر بند کر سکتے ہیں۔ کیا ان کے خیال میں ابھی کثرت شراب نوشی اس حد تک نہیں پہونچی جسے موت کو بالاقساط دعوت دینے کے ہم معنے سمجھا جائے اور قومی انحطاط و زوال کا پیش خیمہ بھی۔

گزشتہ پچاس برس کے اندر اندر ممالک متحدہ امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں اس امر کے متعلق بہت کچھ تحقیقات کی گئی ہے کہ انسانی جسم، دماغ، اور سماجی طرز عمل پر الکحل کے اثرات بالعموم کیا اور کس طرح پڑتے ہیں۔ ان تحقیقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب تمام حکماء اس پر متفق ہوگئے ہیں کہ شراب خوری ایک مرض اور عادی شراب نوش ایک مریض ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کم نہیں کہ شراب خور اپنی عادت کے مقابلے میں بے بس ہوتا ہے۔ دیکھئے نا شراب خوری کے بالکل ابتدائی اثرات یہی ہیں کہ آدمی میں اپنی سمجھ اور طبیعت پر قابو رکھنے کی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ شراب شروع کرنے کے وجوہ ہر منفرد صورت میں خواہ کیسے ہی مناسب اور جائز ہوں ایک مرتبہ عادی ہونے کے بعد شراب چھوڑنا ناممکن ہے۔ اسی انسانی کمزوری کا نتیجہ ہے کہ آج تنہا ممالک متحدہ میں پانچ کروڑ عادی شراب خور ہیں جن میں سے تین کروڑ "بلا انتہا" پینے والوں کی تعریف میں آتے ہیں۔

اس آخری تقسیم میں پانچ لاکھ کے قریب عورتیں ہیں۔ ڈاکٹر ہوارڈ ہیگرڈ جو YALE یونیورسٹی میں علم نفسیات کے پروفیسر ہیں اور پروفیسر ای ایم جیلنک (E. M. JALLINEK) جو "الکحل" کے مطالعہ کے ادارہ کو اسی جامعہ میں چلاتے ہیں اپنی تحقیقات میں اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ ممالک متحدہ میں شراب پینے والوں کی تعداد آٹھ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ جس میں چالیس لاکھ اس عادت میں بری طرح گرفتار ہیں۔ پروفیسروں نے حساب لگایا ہے کہ امریکہ میں ساڑھے سات لاکھ کے قریب ایسے شرابی ہیں جو جسمانی اور دماغی اعتبار سے اپنی زندگیاں ختم

---

۱ BRITTANS ۲ NORMANDY

کر چکے ہیں اور برائے نام زندہ ہیں۔ قومی آمدنی میں خسارے کا یہ عالم ہے کہ شراب نوشی کی بدولت ممالک متحدہ کو ہر سال مزدوروں کی عدم کارکردگی کی ضمن میں نو سو کروڑ روپے کا، متعلقہ جرائم کی مد میں پچھتر کروڑ روپے کا، حادثات کے سلسلے میں چھتیس کروڑ روپے کا، شرابیوں کے طبی اخراجات کی بدولت چار سو کروڑ روپیہ کا، اور شرابیوں کے قید خانوں کے انتظام میں چار سو کروڑ روپیوں کا، صرفہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح گویا محض شراب نوشی کی وجہ سے تقریباً گیارہ سو کروڑ کا بار ملک پر عائد ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ گھرانوں کی ابتری، دماغوں اور صلاحیتوں کی بے کاری اور شخصیتوں کی تباہی سے کتنا قومی نقصان ہوتا ہے اسی بنیاد پر ڈاکٹر سیلڈن بیکن (SALDON BACON) جو جامعہ [illegible] میں عمرانیات کے پروفیسر ہیں "الکحلزم" کی تحقیقات کی ضمن میں لکھتے ہیں کہ "الکحلزم" اُن زبردست مسائل میں سے ایک ہے جن سے ہمارا ملک دوچار ہے اس نے عوام میں خوف اور نفرت کے جذبات پیدا کر دئے ہیں اور افراد کا اطمینان قلب، توانائی اور خوشحالی کو متاثر کر رکھا ہے۔ مغرب میں عام طور پر سیکڑوں ہزاروں عورتیں اپنے دن تلخی اور شکست خوردگی کے احساس کے ساتھ محض اس وجہ سے گزار رہی ہیں کہ ان کے شوہروں کو شراب کی لت ہے کیونکہ جب تک کسی عورت میں غیر معمولی صبر اور رواداری کا جذبہ نہ ہو وہ ایک شرابی شوہر کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتی"

اس سلسلے میں موجودہ طبی اور نفسیاتی تحقیقات کا لب لباب یہ ہے کہ شرابیوں میں سے ایک غیر معمولی کثیر تعداد کی شخصیت بالآخر اس درجہ بدل جاتی ہے کہ وہ سماج کے حق میں بجائے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوں، شرابی اپنا توازن دماغ، جذبات پر قابو، خود اعتمادی، اور دوسروں پر اعتبار سب کچھ کھو بیٹھتا ہے اور اکثر اپنی محبوب ترین ہستیوں سے وحشیانہ سلوک کرنے لگتا ہے" ڈاکٹر گلن شیفرڈ (GLEN SHEPRERED) کا قول ہے "شراب کی تھوڑی مقدار بھی صلاحیت کار اور کارکردگی کو عارضی سہی کم ضرور کر دیتی ہے گو رفتار کار بظاہر کچھ تیز ہی محسوس ہو" ایک اور ڈاکٹر کہتا ہے کہ شراب کا تھوڑی مقدار میں استعمال بھی ایک تو احساس اور رد عمل کی رفتار کو گھٹاتا ہے۔ دوسرے جھوٹی خود اعتمادی پیدا کرتا ہے۔ تیسرے انہماک کو کم کرتا ہے اور چوتھے بصارت کو ضعیف کر دیتا ہے۔ اس عام انحطاط کا صحیح مظاہرہ موٹر چلانے میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر لیونارڈ گولڈ برگ (LENARD GOLD BERG) نے اس معاملہ میں بڑی چھان بین کی ہے۔ اور اُنھوں نے معلوم کیا ہے کہ خون میں "الکحل" کا تناسب اگر پانچ فیصد کے قریب بھی پہونچ جائے تو موٹر چلانے کی صلاحیت اس میں انہماک اور قوت فیصلہ بڑی طرح متاثر ہو جاتے ہیں۔ اور اچھے سے اچھا موٹر چلانے والے کی بھی صلاحیتیں ذرا سی شراب استعمال کرنے کے بعد بیس فیصد تک کم ہو جاتی ہے۔ یہ غلط مشہور ہے کہ دو ایک جام شراب موٹر رانی میں مدد کرتے ہیں۔ موٹر چلانے والا یہ محسوس ضرور کرتا ہے کہ وہ موٹر اچھا چلا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شراب اس کی صلاحیت تنقید کو کمزور اور قوت فکر کو مغلوج کر دیتی ہے، یہ بالکل وہی کیفیت ہے جس میں ایک شرابی اپنے معمولی فقروں پر خود ہی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے"

۳۰ جون [illegible]ء کو کناڈا کے دار العوام نے اپنے ملکی قانون میں ایک ترمیم منظور کی جس کی رو سے طے ہوا کہ "اگر کوئی شخص ایسی حالت میں موٹر چلائے جب شراب کے استعمال سے اس کی صلاحیت متاثر ہو چکی ہو تو اُسے جرمانے کی سزا دی جائے گی جس کی مقدار پچاس سے پانسو ڈالر تک یا قید کی جس کی میعاد تین ماہ تک ہو سکے گی، یا دونوں سزائیں دی جاسکیں گی" دار العوام میں اس تحریک کو منظوری حاصل کرتے ہوئے وزیر عدلیہ اسٹوارٹ گارسن (GARSON)

نے اپنی تقریر میں کہا "اب سائنٹفک تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ شراب موٹر چلانے والے کی قابلیت کو اس طرح کم کرتی ہے کہ آدمی اپنی معمولی کیفیت سے موٹر نہیں چلا سکتا اگرچہ اسے نشہ بالکل ہی نہ چڑھا ہو۔ شراب موٹر ڈرائیور میں جھوٹی خود اعتمادی پیدا کر دیتی ہے جس کا نتیجہ غیر ذمہ داری کی شکل میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ شرابی کی حس اور ردِّ عمل کی قوت کمزور اور سست پڑ جاتی ہے۔" چنانچہ اب ممالک متحدہ میں شاہراہوں پر جگہ جگہ ایسی تختیاں جلی حروف میں لگائی گئی ہیں "اگر تمہیں موٹر چلانا ہے تو شراب نہ پیو اور اگر شراب پینا ہے تو موٹر نہ چلاؤ۔"

عورتوں پر شراب نوشی کے اثرات بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ جن عورتوں کو شراب کی لت پڑ جائے وہ بدمزاج، جل ککڑی اور بے قابو ہو جاتی ہیں۔" شہر نیو یارک کے ناظم فوجداری (MAGISTRATE) چارلس ریمز گیٹ (RAMSGATE) لکھتے ہیں "شرابی عورت بدزبان، گندی اور وحشی بن جاتی ہے جو اچھائی کی بات سوچ ہی نہیں سکتی۔ اپنے سماج، گھر، جنس اور ذات کے لئے ایک بدنما داغ۔" ایک اور ماہر کا بیان ہے کہ شراب عورت سے شرم و احتیاط کو چھین لیتی ہے اور نشے کے عالم میں وہ ہر مرد کو یکساں نظر قبول اور نگاہ پسندیدگی سے دیکھنے لگتی ہے۔"

لیکن شکر ہے کہ اب تقریباً ہر بڑے مغربی ملک میں سائنس داں اپنی تحقیقات کا رُخ شراب نوشی کی انسدادی طبّی تدابیر اور دواؤں کی دریافت کی جانب موڑ رہے ہیں۔ امریکہ میں کئی دوائیں اس قسم کی کئی ادویہ تیار کی گئی ہیں مثلاً اینٹی ابیوز (ANTI ABUSE) انگلستان میں بھی انسدادی تدابیر کی تحریک زور پکڑتی جا رہی ہے۔ اس تحریک کا نام "ALCOHLISM ANONYMOUS" ہے۔ اس کے رکن ایک دوسرے کو شراب چھوڑنے میں مدد دیتے ہیں خواہ کیسا ہی عادی شرابی کیوں نہ ہو وہ نشہ اُترنے کے بعد ہوش کے عالم میں خوب سمجھتا اور محسوس کرتا ہے کہ اس عادت کے طفیل اُس نے اپنی صحت، مسرت، عزت، مہارت اور صلاحیتِ کار کی بازی لگا رکھی ہے۔

یورپ کے وہ ماہرین سائنس جنہوں نے اس مسئلہ پر برسوں کام کیا ہے، اُنہوں نے شراب خواروں کو کچھ اشارے کئے ہیں، جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) اگر آدمی ایک دفعہ پینے کا عادی ہو جائے تو وہ اپنی طبیعت پر قابو نہیں پا سکتا۔

(۲) شرابی رفتہ رفتہ ہر انسانی مسرت اور کامیابی کا بدل شراب کی سرخوشی کو بنانے لگتا ہے اور پھر اُس میں سعی اور جستجو کا مادّہ ہی باقی نہیں رہتا۔

(۳) نتیجہ یہ کہ پھر ہر حالت میں شراب اُسے سچی خوشی سے محروم رکھتی۔

(۴) ان حالات میں یہ بات کہ شراب محض وقتی سرخوشی کے لئے پی جائے طفلانہ خود فریبی ہے۔

(۵) شراب خوری نہ حقیقی ترقی کی علامت ہے نہ خوش مذاقی کی۔

(۶) زیادہ پینے کی ابتدا، بے اختیاری کا پیش خیمہ ہے۔

(۷) عادی مے خواری کی بڑی لعنت یہ ہے کہ پھر ترکِ مے نوشی پر قدرت نہیں رہتی شراب خوری پر ڈاکٹر رابن سیلنگر ایم ڈی (ROBIN SELINGER) نے بڑی تحقیقات کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "شراب خوری کا ایک علاج مذہب کی طرف رجوع کرنا ہے۔ میری اپنی دانست میں مذہب ایک ضابطہ حیات ہے۔ عملی نفسیات کے ماہر کی حیثیت سے میں ذاتی تجربہ رکھتا ہوں کہ کس طرح

مذہب کا ضابطہ صحت بخشتا ہے اور کس طرح مذہبی قواعد کو نظرانداز کرنے سے نقصان ہوتا ہے۔ ان مذہبی قوانین کی حدود میں جو زندگی ہے وہ صحیح زندگی ہے اور ان کے باہر انسان محض ایک طرح کی جماداتی زندگی گزارتا ہے۔"

شراب کی بُرائیاں، جن تک اب مغربی تحقیقات کی رسائی ہوتی ہے، ایک کتاب میں جا بجا بدی حقائق سے بھری پڑی ہے۔ آج سے چودہ سو سال پہلے، بیان ہو چکی ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ "شراب پینا شیطانی عمل ہے اس لئے شراب سے اجتناب کرو۔"

(پندرہ روزہ "یقین" Yaqeen سے ترجمہ کیا گیا)

طیّب عثمانی
(ندوی)

اشتراکیت اور اقبال

اقبالؔ بہت بڑا شاعر تھا، اس کی شاعری اپنے اندر بڑی وسعت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے کمالِ شاعری کی شمع کے اردگرد بہت سے پروانوں کا ہجوم نظر آتا ہے، ان میں مختلف مکتبِ خیال اور فکر و نظر کے حضرات شامل ہیں۔ اقبال کی ہمہ گیری ان سب کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اقبال کی شاعری اور فکر و نظر میں خود کوئی تضاد ہے۔ اقبال کی ایک فکر ہے، اس کا ایک خیال ہے اور اس کے دل کا "دیا" اس ایک ہی چراغ سے روشن ہے جس کی ضیا پاشیاں سارے عالم کو منور کئے ہوئے ہیں، یہ اور بات ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے فکر و خیال کی تائید کے لئے ــــــ اقبال کے بنیادی افکار اور مرکزی تصورات سے ہٹ کر ــــــ اقبال کی شاعری کو استعمال کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے یا پھر فکری تہی دامنی، کوتاہ نظری اور غلط بینی میں مبتلا ہے۔

علامہ اقبال کو اُن کے اصل مقام سے ہٹا کر اپنی راہ پر چلانے والے کارواں کے "امیر" ہمارے بعض ترقی پسند ادبا ہیں جن کی تمام تر کوشش یہی رہتی ہے کہ اقبال کو ایک ترقی پسند اور اشتراکی شاعر ثابت کیا جائے اس سلسلہ میں علامہ اقبال کی مشہور نظم ؎

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو

اُن کے سارے دعوے کی دلیل رہتی ہے۔ ابھی حال ہی میں مشہور ترقی پسند ادیب عزیز احمد کی "اقبال کی ایک نئی تشکیل" دراصل اسی قسم کی ایک علمی کوشش ہے، جس کا مقصد اقبال کو صرف اشتراکی رنگ و روغن میں پیش کرنا ہے ــ اقبالؔ کس قدر اشتراکی شاعر تھا؟ اس کا تفصیلی جائزہ تو ہم آنے والی سطروں میں لیں گے، سب سے پہلے ہم یہ چاہتے ہیں کہ اقبالؔ اور اس کی شاعری کا فکری تجزیہ کیا جائے، تاکہ خود اقبالؔ اپنے صحیح رنگ میں اُبھر کر سامنے آسکے۔

اگر اقبالؔ اور اس کی شاعری کا فکری تجزیہ کیا جائے تو اُس کے تین درجے ہوں گے۔ اقبالؔ کی ایک ابتدائی شاعری ہے جسے وطنی شاعری کہا جاسکتا ہے، دوسری قومی شاعری اور تیسری خالص اسلامی شاعری! اقبالؔ کی فکری بلندی جوں جوں بڑھتی گئی، اس کی شاعری میں اسلامی رنگ نکھرتا چلا گیا، یہاں تک کہ ایک دور وہ آیا جب کہ اقبالؔ قرآن میں گم ہو چکا تھا اور اس کی شاعری قرآن کی آواز بازگشت بن گئی، اس آخر دور میں اقبالؔ نے جو کچھ کہا وہ قرآن کا پرتو تھا، اس کی زندگی عشقِ رسولؐ اور محبتِ الٰہی میں سرشار تھی، اس کی فکر قرآن کی فکر بن گئی تھی اور وہ خود قرآن میں کھو چکا تھا۔ اس کی زندہ مثال اقبالؔ کے کلام کا آخری مجموعہ "ارمغان حجاز" ہے۔

اُردو ادب کے مشہور ترقی پسند نقاد پروفیسر آل احمد سرور نے اقبال کو "قوت و توانائی" کا شاعر کہا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرور صاحب اقبال کی شاعری اور اس کے فلسفہ پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں مگر پھر بھی وہ اقبال کے متعلق اس سے زیادہ اور کہہ ہی کیا سکتے ہیں؟ قرآن کی حقیقی رُوح سے واقف ہوئے بغیر نہ کوئی اقبال کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اس کی شاعری کی حقیقی رُوح کو! قرآنی رُوح سے علٰحدہ ہو کر اقبال کی شاعری کو "قوت و توانائی" ہی کی شاعری کہی جا سکتی ہے اور بس! سچ تو یہ ہے کہ اقبال اور اس کی شاعری کو سمجھنے کے لئے نہ ادبی ذوق کافی ہے اور نہ مذہبی جنون درکار ہے، بلکہ دلِ روشن ضمیر بیدار اور قرآنی فکر و نظر درکار ہے۔

اقبال کے کلام کو جب قرآن کے نقطۂ نظر اور اس کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے تو پھر صحیح معنوں میں اس کے کلام کا زور اور زندگی کا پتہ چلے گا، اس کا سوز درون، اس کی آہِ سحرگاہی، اس کا عشق، اس کا فقر اور اس کی خودی یہ سب کے سب ایک مسلمان کی سچی زندگی کے حقیقی صفات ہیں، اقبال کا "مردِ مومن" دراصل قرآنی نظریہ کا "انسانِ کامل" ہے۔

"علامہ اقبال کی ہمہ گیر شاعری کی بنیاد پر اقبال کو کسی خاص طبقہ کا شاعر کہنا میرے نزدیک بڑی کوتاہبینی ہے" حالانکہ علامہ اقبال کا وہ خط جو پروفیسر آل احمد سرور کے نام ابھی چند سال ہوئے شائع ہو چکا ہے جس میں علامہ اقبال نے صاف لفظوں میں اس کا اظہار کیا ہے کہ "میرے سامنے فاشزم اور کمیونزم یا زمانہ حال کے اور "ازم" کوئی حقیقت نہیں رکھتے، میرے عقائد کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوعِ انسان کے لئے ہر نقطۂ نگاہ سے موجبِ نجات ہو سکتی ہے" ——— اتنے صاف اور صریح بیان کے بعد اقبال کے فکر کی خود تراشیدہ توجیہیں ———

بے حقیقت یا مری چشمِ غلط بیں کا فساد

اب آیئے ذرا تفصیل سے جائزہ لیا جائے کہ اقبال کے نزدیک ساری انسانیت کے درد کا مداوا اگر اشتراکیت ہے تو وہ کس قدر ہے؟ صرف زبانی بلند بانگ دعوے اور علمی انداز بیان سے حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ اقبال کا تنقیدی مطالعہ ہمیں اس حقیقت کی طرف اچھی طرح نشان دہی کرتا ہے کہ اشتراکیت "خلوطِ خمدار" اور "مرزۂ تجدار" کی نمائش کے سوا کچھ بھی نہیں، اقبال کے کلام میں محکوموں کے اُبھارنے، مزدوروں کے سنوارنے، ضعیفوں اور مظلوموں کی حمایت کے جو عناصر پائے جاتے ہیں وہ اس بات کی دلیل نہیں کہ علامہ اقبال اشتراکیت اور اس کے بنیادی فلسفہ کے بھی قائل ہیں بلکہ "اسلام" جو اقبال کی شاہراہِ حیات ہے اور "قرآن" جو اس کا دستورِ زندگی ہے نہ صرف اِن اُصولوں کا حامی ہے بلکہ ان کا پُرجوش داعی و مبلغ بھی ہے یہی وجہ ہے کہ اقبال کے کلام میں یہ عناصر بہت ہی زیادہ اُجاگر ہیں ؎

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

اشتراکیت کا بنیادی فلسفہ تاریخ کی مادّی تعبیر ہے جس کے نتیجہ میں "لا سلاطین، لا کلیسا، لا الٰہ" اس کا اصل "نعرہ" قرار پایا۔ لیکن اقبال کا کائناتی اسلامی فلسفہ صرف سلبی صورت دنیا کے سامنے پیش نہیں کرتا بلکہ اثباتی پہلو بھی رکھتا ہے، اس کے نزدیک کائنات کے وجود کا راز اور اس کی حقیقت "لا و الّا" میں پوشیدہ ہے

"نفی بے اثبات مرگ اُمتاں" ہے دونوں کا امتزاج ہی "انسان" کے کمال کا باعث بن سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں اقبال کے یہ چند اشعار اس کے فکر کی پوری ترجمانی کرتے ہیں۔

نکتہ می گویم ز مردانِ حال | اُمتاں را لا جلال الا جمال
لا و الا احتسابِ کائنات | لا و الا فتحِ بابِ کائنات
تا نہ رمز لا الٰہ آید بدست | بندِ غیر اللہ را نتواں شکست
در جہاں آغازِ کار از حرفِ لاست | ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست

اقبال کا یہ فلسفۂ زندگی انسان میں خودی، خودداری، خود اعتمادی پیدا کرتا ہے اور یہی لا و الا ہے جس کی حقیقت احتسابِ کائنات ہے، جس کا لازمی نتیجہ ہے "فتحِ بابِ کائنات"! یہ لا و الا ہی کا ضرب ہے جو محکوم کو حاکم کے سخت پنجے اور مظلوم کو ظالم کے خونیں چنگل سے نجات بخشتا ہے۔

اشتراکیت جس کی بنیاد "نفی" پر ہے جس نے نفی ہی کے ذریعہ تمام پرانے رسوم و قیود سے آزادی حاصل کی لیکن یہ "نفی بے اثبات" ہے جو در اصل "مرگ امتاں" ہے اور یہ آزادی دوامی نہیں بلکہ عارضی ہے اسی نکتہ کی طرف اقبال نے "روس" کو متوجہ کیا ہے۔

روس را قلب و جگر گردیدہ خوں | از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں
آں نظامِ کہنہ را برہم زد است | تیز نیشتر بر رگِ عالم زد است
فکرِ او در تندبادِ لا بماند | مرکبِ خود را سوئے الا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں | خویش را زیں تندباد آرد بروں
در مقامِ لا نیاساید حیات | سوئے الا می خرامد کائنات
لا و الا سازو برگِ امتاں | نفی بے اثبات مرگِ امتاں

ایک دوسری نظم میں علامہ اقبال نے اشتراکی ہیئت اجتماعی کی غلطی کا صاف لفظوں میں اظہار اور "صاحبِ سرمایہ" کی فکری بے راہ روی اور حق ناشناسی کا ببانگ دہل اعلان کیا ہے۔ اخوت و مساوات کی غلط بنیادوں کی طرف بھی خوب نشان دہی کی ہے اور صحیح حیثیت کو اُجاگر کیا ہے ——— اقبال کے ان افکار کو خود انہیں کی زبان میں ملاحظہ کیجئے۔

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل | یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است | قلبِ او مومن دماغش کافر است
غربیاں گم کردہ اند افلاک را | در شکم جویند جانِ پاک را
رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک | جز بہ تن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس | بر مساواتِ شکم دارد اساس
تا اخوت را مقام اندر دل است | بیخِ او در دل نہ در آب و گل است

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علامہ اقبال نے اشتراکیت پر نہایت صریح اور صاف تنقیدیں کی ہیں

اور علامہ کو اس سے شدید اختلاف رہا ہے لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ اقبالؔ نے سرمایہ داری اور ملوکیت کی حمایت کی ہے سچ تو یہ ہے کہ وہ شہنشاہیت و استبدادیت کے بھی شدید ترین دشمن ہیں، سرمایہ دار نہ صرف یہ کہ انسانیت کا دشمن ہے بلکہ اس کی مثال اس خون خوار درندے کی طرح ہے جو کمزوروں کا خون چوستا اور گوشت نوچتا رہتا ہے، طوالت کا خوف مانع ہے ورنہ ملوکیت و استبدادیت کی تردید میں بھی علامہ اقبالؔ نے جو کچھ کہا ہے اُسے پیش کرتا، مندرجۂ بالا نظم میں بھی — چند اشعار کے بعد ملوکیت کی مذمت کرتے ہیں فرماتے ہیں۔

هر دو را جاں ناصبور و ناشکیب — هر دو یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی ایں را خروج آں را خراج — در میان ایں دو سنگ آدم زجاج
ایں بہ علم و دین و فن آرد شکست — آں برد جاں را ز تن ناں را ز دست
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل — ہر دو را تن روشن و تاریک دل

زندگانی سوختن با ساختن
در گلے تخم دلے انداختن

اشتراکیت و ملوکیت دونوں ہی خدا ناشناس اور آدم فریب ہیں آج کی انسانیت ان دونوں پتھروں کے درمیان شیشہ کی طرح چور چور ہو رہی ہے۔ اگر آج اشتراکیت کا بوس بن کر اپنے علم و فن اور فلسفہ سے دنیا کو پریشان کر رہی ہے تو سرمایہ داری انسانیت کے بدن سے روح و زندگی کھینچے لے رہی ہے اور افلاس و فاقہ سے نواز رہی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ دونوں "مادیت" میں غرق ہیں اور دونوں کا —— چہرہ روشن اندرون چنگیز سے تاریک تر!

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے علامہ اقبالؔ کا اشتراکیت کے بارے میں جو اصولی اور بنیادی اختلاف ہے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اشتراکیت کی تردید اور عالم کی اصلاح و بقاء کے لئے ایک صالح نظام کی طرف اشارہ اقبالؔ نے اپنی ایک نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں واضح اور کھلے لفظوں میں کیا ہے۔ اقبالؔ کے فکر و عقیدہ کی وضاحت کے لئے اس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ ابلیس کی زبان میں اشتراکیت کی پریشاں حالی، آشفتہ مغزی کا صاف صاف اعلان ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو کہ اشتراکی فکر کی حقیقت کھول کر رکھدی ہے اور یہ بات یقیناً سچ ہے کہ ؎

دست فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو

پھر "اشتراکی انقلابیوں" کے نام ایک کھلا چیلنج ہے ؎

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز آشفتہ مُو

"ابلیسی نظام" کو سارا خطرہ و خوف اشتراکیت سے نہیں، بلکہ ؎

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو

جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں "اسلام" ہے

اس پھیلے ہوئے شیطانی نظام کو اگر کوئی خطرہ ہے تو اشتراکیت سے نہیں بلکہ "اسلام" سے ہے، موجودہ شیطانی نظاموں کی جو چکی ساری انسانیت کو پیس رہی ہے اس سے چھٹکارے کا واحد علاج اقبال "اسلام" کو بتاتا ہے، یہ اور بات ہے کہ اس زمانے میں ——— "ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں!" لیکن عصر حاضر کے تقاضوں سے ابلیس کا یہ خوف بجا ہے کہ ——— "ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں" وہ شرع پیغمبر اور آئین اسلام کیا ہیں، جن سے پورا ابلیسی نظام حیران و سرگرداں اور درہم برہم نظر آتا ہے؟ چلتے چلتے اُسے بھی سُن ہی لیجیے۔

الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر — حافظ ناموس زن مرد آزما مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لیے — نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیر رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف — منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

رات کی اس اندھیاری میں جب کہ ساری انسانیت حیران و سرگرداں بھٹکتی پھر رہی ہے، یہی وہ اصول زندگی ہیں جن سے سحر کی روشنی نمودار ہو سکتی ہے اور اسی میں اس سوال کا جواب پنہاں ہے کہ ———

"کیوں نہیں ہوتی سحر حضرت انساں کی رات؟"

ماہرؔ القادری

سامانے ندارد ......

غریبِ عشق سامانے ندارد جنوں دارد بیابانے ندارد
محبت فارغ از رسم و تکلف اسیرِ عشق زندانے ندارد
بہارِ اُو گلستاں در گلستاں بہارِ من گلستانے ندارد
زہے غم! غمگسارے را نجوید خوشا! دردے کہ درمانے ندارد

مبیں الفاظ در اشعارِ ماہرؔ
حدیثِ شوق پایانے ندارد

...... ہو کے رہ گئے!

جلوے تمام صرفِ نظر ہو کے رہ گئے جو گل نہ بن سکے وہ شرر ہو کے رہ گئے
کس جوش سے چلے تھے مسافر مگر یہ کیا آسودۂ نشاطِ سفر ہو کے رہ گئے
راہِ وفا نہ ختم ہوئی ہے نہ ہو سکے اچھے رہے جو خاک بسر ہو کے رہ گئے
ذرے ہوئے بلند ہوا اُن کو لے اُڑی قطرے ہوئے جو پست گہر ہو کے رہ گئے
جوشِ نیاز و ناز نہ طوفانِ سوز و ساز کیا حُسن و عشق شیر و شکر ہو کے رہ گئے

ماہرؔ یہ جدتیں یہ ترقی پسندیاں
جتنے بھی عیب تھے وہ ہنر ہو کے رہ گئے

ART

لطفی رضوانی

منتخبات

ترے در سے جس کو صلہ ملا تو بقدرِ ذوقِ وفا ملا
کوئی دل جھکا کے وہیں رہا کوئی سر جھکا کے چلا گیا

زمانہ ایک نیا رُخ بدلنے والا ہے
سرود و نغمہ و چنگ و رباب بجنے دے

گزرگاہِ جہاں میں سب مسافر ہی مسافر ہیں
مگر کم ہیں جو سامان سفر تیار کرتے ہیں

شکست سازِ دل کی ہیں صدائیں
جسے کہتے ہیں بلبل کا ترانہ

کسی کی جلوہ گہِ ناز سے اد رکھیے
گئے تھے ہنستے ہوئے غم سے چور چور آئے

ضرورت بندگی میں بھی دلِ درد آشنا کی ہے
اسے ایمان کیا ہم حاصلِ ایماں سمجھتے ہیں

جہاں میں ایسے بھی پابندِ وضع رہتے ہیں
کہ غم سے چور ہیں اور مسکرائے جاتے ہیں

نہ کر فکر اُن بندگانِ جنوں کی
یہ گرداب میں ڈھونڈھ لیں گے کنارے

وہ بہار کی ہو رونق کہ خزاں کی پائمالی
مرے غم پسند دل کو کوئی چاہیے بہانہ

کوئی آواز تک نہیں ہوتی
ٹوٹ جاتے ہیں یوں بھی پیمانے

لطفِ حیات کشمکشِ زندگی میں ہے
بجلی کی زد سے دور مرا آشیاں نہ ہو

زندگی کے موڑ پر کس نے مجھے آواز دی
جلوہ گر ہے کون نزدیک رگِ جاں دیکھیے

پابندِ غم نہ ہو کہیں وہ بھی مری طرح
پوچھے تو کوئی برق سے حالِ اضطراب کا

جنونِ عشق کا وہ ذوق اب کہاں لطفی
نہ دشت ہے نہ کوئی قیس ہے نہ محمل ہے

ادب اور زندگی

اسلام کی سطح پر!

ایک مشاہد کے قلم سے

شہر کراچی کی دیواروں پر ایک اشتہار نظر آیا، جس میں لکھا تھا:۔

> ادب برائے ادب کا زمانہ گزر گیا، اب ادب ــــ "برائے زندگی" کا زمانہ ہے، اسلام پسند ادب زندگی کا اسلامی تصور پیش کرتے ہیں اس زندگی کا جس میں سیاست معیشت، اخلاق، شعر و ادب اور حرکت و انقلاب ساتھ ساتھ چلتے ہیں ــــ!

لوگوں نے اس اشتہار کو حیرت کے ساتھ پڑھا، حیرت اس لئے کہ کراچی کی دیواریں اُن اشتہاروں کے بوجھ سے دبی جارہی ہیں، جن کے ذریعہ ایک دوسرے کی پگڑی اچھالی جاتی ہے، اور صرف پگڑی نہیں اس کے ساتھ گندگی بھی! حلقۂ ادبِ اسلامی کا یہ اشتہار لوگوں کے لئے ایک اچنبھا تھا، جن کو اسلام سے لگاؤ ہے اُن کے چہروں پر اس اشتہار کو پڑھ کر رونق سی آگئی جیسے پژمردہ شاخوں پر کسی نے آبِ حیات چھڑک دیا، اور اہلِ نفاق میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ اسلام! اب ادب و صحافت کے مورچوں کو بھی سر کرنے ڈالا ہے چہرے زرد اور سیاہ ہونے لگے!

۶ ستمبر (سنہ۵۲ء) کا آفتاب ادبِ اسلامی کا نقیب بن کر طلوع ہوا جیسے اُس کی کرنیں ادبِ اسلامی کا منشور سنہرے حرفوں میں لکھ رہی ہیں، حلقۂ ادبِ اسلامی کے کارکن فجر کی نماز پڑھ کر ہی سندھ مسلم کالج میں جلسے کے انتظامات کے لئے پہونچ چکے تھے، ہر شخص اپنے متعلقہ کام کو "عبادت" سمجھ کر انجام دے رہا تھا، دن چڑھ رہا تھا، روشنی پھیلتی جارہی تھی، دھوپ نکل رہی تھی، چھ بجے، سات ہوئے، یہاں تک کہ گھڑی کی سوئی آٹھ پر پہونچ گئی ــــ وقت کتنی تیزی سے گزرتا ہے اور

وہ بھی دبے پاؤں! کسی کسی کو تو خبر بھی نہیں ہوتی، غفلت کا نشہ بیدار کہاں ہونے دیتا ہے ۔

آدمی نشۂ غفلت میں بھلا دیتا ہے
ورنہ جو سانس ہے پیغامِ فنا دیتا ہے

جلسہ گاہ کے آس پاس چہل پہل دکھائی دینے لگی، لوگ آ رہے تھے اور آتے چلے جا رہے تھے، ان میں طلبا بھی تھے، پروفیسر بھی تھے، علما بھی تھے، تاجر پیشہ بھی تھے، سرکاری ملازم بھی تھے اہلِ قلم اور اربابِ صحافت بھی تھے، وہ بھی جن کے چہروں پر ڈاڑھیوں کا نور تھا، اور وہ بھی جو صبح سویرے ریزر ہاتھ میں لیکر مادہ رُو بننے کی مشق فرمایا کرتے ہیں۔ عبائیں، شیروانیاں، کوٹ پتلون، اور بش شرٹیں ملی جلی نظر آ رہی تھیں!

جلسہ گاہ کے دروازے پر منتظمین آنے والوں کا متبسم چہروں اور کشادہ دلی کے ساتھ استقبال کر رہے تھے، ابھی نو بھی نہ بجنے پائے تھے کہ ہال سامعین سے کھچا کھچ بھر گیا، ہال کے باہر شامیانہ تھا، اس کے نیچے بھی کرسیاں بچھی تھیں اب جو آئے اُن کو یہیں جگہ ملی ـــ دروازوں سے لیکر شہ نشین (ڈائس) تک ایک خاص سلیقہ پایا جاتا تھا اور سادگی بھی! جابجا خوشنما کتبے لگے ہوئے تھے، جو اسلامی ادب، اسلامی تہذیب اور اسلامی اخلاق کی ترجمانی کر رہے تھے۔۔

عام طور پر جلسوں میں لیڈروں کی تصویریں آویزاں کی جاتی ہیں اور کسی کسی تصویر کو ہار بھی پہنایا جاتا ہے، مگر حلقہ ادب اسلامی کے اجتماع میں اس "بدعت" کو کس طرح گوارا کیا جا سکتا تھا، ڈائس کے قریب کی دیوار پر تصویروں اور مجسموں کی جگہ یہ کتبہ بخطِ جلی آویزاں تھا:۔

ایک خدا، ایک انسان، ایک نظام

یہ کتبہ سامعین کے لئے سب سے زیادہ جاذبِ توجہ تھا، ہر طرف سے پھر پھر اکر نگاہ اسی کتبہ پر آکر جمتی تھی اور بعض لوگ محسوس کر رہے تھے کہ وہ کراچی جہاں کے جلسوں، پارٹیوں اور دعوتوں میں تصویروں، ہاروں اور گجروں کی نمائش ہوتی ہے اور جہاں گراموفون کے نغمے فضا میں گونجتے ہیں اور ہر طرف جشنِ جمشید کا سماں نظر آتا ہے، اُسی کراچی میں ایک ایسا اجتماع بھی دیکھنے کو مل گیا جس کے چاروں طرف اخلاق، پاکیزگی، نیکی، اور خیر و فلاح کی جھلکیاں چشمِ تماشا اور نگاہِ شوق کی پذیرائی کر رہی ہیں۔

جلسہ کا آغاز اللہ کے کلام سے ہوا، مولانا احتشام الحق تھانوی نے سورۂ "والعصر" پڑھی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس کا ترجمہ بیان فرمایا، اُس کے بعد ماہر القادری مدیر فاران نے حلقہ ادب اسلامی کے تعارف کے سلسلہ میں مختصر سی تقریر کی، پھر مصر کے سفیر ڈاکٹر عبدالوہاب عزام اسٹیج پر تشریف لائے اور انگریزی میں نہایت ہی جامع اور اثر انگیز تقریر فرمائی، وہ اُن کا نرم لہجہ، سنجیدہ اور باوقار اندازِ تخاطب درمیان میں اقبال کے اردو شعروں کا استعمال! مجمع ہمہ تن گوش ہی نہیں سراپا نگاہ بھی تھا، جب انھوں نے کتبہ کی طرف مڑتے ہوئے

ایک خدا، ایک انسان، ایک نظام

کو دُہرایا تو دلوں کی دھڑکنوں نے "لبیک" کہا، جناب عزام بے کی ذہانت و فراست کو صد آفریں کہ حلقہ ادب اسلامی کا نام سنکر ہی وہ سمجھ گئے کہ انھیں کیا کہنا ہے! اور انھوں نے اس اجتماع میں وہی کہا جو یہاں کے لئے مناسب، موزوں اور برمحل تھا ـــ

دھوپ تیز ہو چلی تھی، جلسہ گاہ کے آس پاس درختوں کے سایہ میں شائقین کھڑے تھے، ہال اور شامیانہ کی کرسیاں بھر چکی تھیں، جس کو جہاں جگہ ملی خاموشی کے ساتھ بیٹھ گیا یا کھڑا ہو گیا، سامعین اور منتظمین کے درمیان ایک تلخ لفظ کا بھی تبادلہ نہیں ہوا۔

ڈاکٹر عبد الوہاب عزام کی عالمانہ افتتاحی تقریر کے بعد شمیم جاوید نے اپنی پُر جوش نظم سنا کر جلسہ کو گرما دیا بلکہ یوں کہئے کہ شباب پر پہونچا دیا، جب اُس نے گرجتے ہوئے انداز میں کہا :-

دیکھو روحِ محمدؐ نے آواز دی
اور مشیت نے پھر فکر پرواز دی

تو کتنی آنکھیں آنسوؤں کی زبان سے صلوٰۃ وسلام پڑھنے لگیں، اور قریب تھا کہ محمدؐ (فداہ ابی و امی) کے غلاموں کی چیخیں نکل پڑیں ــــــــ پھر اسد ملتانی ڈائس پر تشریف لائے، اور فرمایا :-

"میں نے یہ نظم اُس وقت کہی تھی جب ترقی زدہ ادب نیا تھا اب تو وہ پُرانا ہو چکا ہے لیکن میری نظم اس گمراہ ادب کے جواب میں آج بھی نئی ہے "

اسد کی نظم میں جوش سے زیادہ سنجیدگی تھی، وقار تھا، اور ان سب سے بڑھ کر فن کار جادو تھا، اُن کا تنہا یہ ایک شعر کتنی نظموں کا نچوڑ اور کتنے مقالوں کا حاصل تھا :-

نئے ادب میں چمک اور تپش سہی لیکن ۔۔۔ وہی کہ اصل ہے جن کی شرار بو لہبی

اس کے بعد احمد اسحٰق نے جو اناؤنسر کا فرض انجام دے رہے تھے، میکروفون پر اعلان کیا کہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ ایم۔ اے، پی، ایچ، ڈی اپنا مقالہ سنائیں گے ــــــــ ایم، اے اور اس پر پی، ایچ، ڈی بھی، جنھوں نے ڈاکٹر صاحب موصوف کو دیکھا نہ تھا اُن کو یقین تھا کہ کوئی سوٹیڈ بوٹیڈ پروفیسر سگار کی گل جھٹکتے ہوئے ڈائس پر آئے گا ــــــــ مگر لوگوں کو حیرت ہوئی جب انھوں نے شیروانی، پاجامہ اور ترکی ٹوپی کے ساتھ اچھی خاصی لامبی ڈاڑھی آنے والے کے چہرے پر دیکھی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ نے اپنے بلند پایہ مقالہ کو انکسار آمیز انداز میں پڑھا جسے سب لوگوں نے کانی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سُنا ــــــــ اس کے بعد ماہر القادری ڈائس پر آیا اور اُس نے اپنی تازہ ترین نظم پڑھی جو خاص اسی موقعہ کے لئے کہی گئی تھی، شاید اس نظم کے ایک دو شعر لوگوں کو یاد رہ جائیں :-

تمائیں قیصر و کسریٰ کی ثبات رہ نہیں سکتیں ۔۔۔ مری وحشت کو بھی چاکِ گریباں کی ضرورت ہو
ادب کب تک رہے گا جاہلیت کے شکنجوں میں ۔۔۔ گرفتارِ قفس کو اب گلستاں کی ضرورت ہو

ماہر کی رجز خوانی کے بعد اسلام پسند افسانہ نگار محمود فاروقی ڈائس پر ننگے سر مگر شہرت کا تاج پہنے ہوئے نظر آیا، اُس کے افسانہ کا عنوان تھا ــــــــ "جوانی کا آخری دن" ــــــــ پلاٹ سے لیکر اظہار و بیان تک ہر چیز مربوط، اور دلچسپ پھر اُس پر مستزاد لکھنے والے کا خلوص، سامعین نیم مسحور ہو چکے تھے!

محمود فاروقی کے افسانہ کے معاً بعد ہی اعظم ادیب کی نظم "اے قائدِ مرحوم" خود اُن کی زبان سے سُنی گئی، جب وہ اس شعر کو پڑھ کر :-

درکار نہیں دین و سیاست کی جُدائی
منظور نہیں جھوٹے خداؤں کی خدائی

ڈرامائی انداز میں ڈائس سے اُترے تو لوگ محسوس کر رہے تھے کہ دنیا بناوٹی خداؤں اور جھوٹے معبودوں سے واقعی تنگ آ چکی ہے اور یہ شیشہ گری بس چند دن کی اور مہمان ہے ــــــ

پھر پروفیسر جلیل الدین احمد تشریف لائے، چھریرا بدن، گوری رنگت، ستواں ناک، سیاہ داڑھی، ــــــ انداز خطابت باوقار بھی اور شیریں بھی! "جمالیات" کے عنوان پر تقریر کی اور معلومات کے نہ جانے کتنے دفتر کھنگال کر رکھ دیئے، مجمع اس قدر خاموش اور پُرسکون تھا کہ ایک آلپین گرنے کی آواز بھی سُنی جا سکتی تھی، علمی تقریریں اس قدر دلچسپی کے ساتھ عام طور پر نہیں سُنی جاتیں ــــــ پروفیسر جلیل کی علمی شخصیت للکار کر کہہ رہی تھی کہ اسلامی فکر رکھنے والوں پر "ملّا" کی پھبتی چُست کرنے والے نادانو اور جاہلو! تنہا میری ذات تمہارے اس چیلنج کا جواب دینے کے لئے کافی ہے!

پھر فیض حسینی نے ایک ہلکی پھلکی سی غزل پڑھی ــــــ یہ "ترقی زدہ ادب" کے اندھیروں سے نکل کر "اسلامی ادب" کے روشن ماحول میں نئے نئے آئے ہیں، اللہ تعالیٰ ثبات عزم عطا فرمائے، مجمع کے اصرار پر شمیم جاوید نے ایک نظم اور پڑھی جس میں پہلی نظم کے مقابلہ میں جوش کم مگر تفکّر زیادہ تھا اور موضوع کے اعتبار سے اس نظم میں "تفکر" ہی کی ضرورت تھی۔

پھر وہ ڈائس پر آیا، جسے آنکھیں ڈھونڈ رہی تھیں ــــــ نعیم صدیقی ایک دُبلا پتلا انسان مگر عمل و حرکت میں بجلی سے زیادہ تیز اور پھرتیلا اور وقار و استقامت میں اپنی جگہ کوہِ الوند! وہ اگر دوسری راہ اختیار کرتا تو اپنے قلم اور زبان کے زور سے بہت کچھ دولت کما سکتا تھا لیکن اس نے خونِ جگر کو دولیت مژگانِ یار سمجھ کر "مژگانِ یار" ہی کی نذر کر دیا، اور جو باقی رہا ہے اُسے نذر کئے جا رہا ہے شعر و ادب، افسانہ، اقتصاد و سیاست غرض ہر محاذ پر یہ مردِ مجاہد باطل سے ستیزہ کار نظر آتا ہے اور حیرت ہے کہ تھکنے کا نام نہیں لیتا۔

نعیم صدیقی سے اندازہ کرنے میں غلطی ہوئی، وہ سمجھ رہے تھے کہ سامعین اُکتا چکے ہیں کسی لمبی تقریر کو برداشت نہ کر سکیں گے حالانکہ سامعین کی دلچسپی میں ذرا سا بھی فرق نہ آیا تھا، نعیم صدیقی نے بہت ہی مختصر تقریر کی، انھوں نے حقیقت میں اسلام پسند ادیبوں، اور شاعروں کے دامنوں کو نصیحت کے پھولوں اور پند و موعظت کے موتیوں سے بھر دیا، انھوں نے جو کچھ کہا اس کا وہ منصب رکھتے ہیں ــــــ پھر اُنھوں نے اپنی نظم میں نیل کی موجوں سے خطاب کیا۔

ہے ایک ہی جذبہ کہیں واضح کہیں مبہم ہے ایک ہی نغمہ کہیں اونچا کہیں مدھم
مل جائیں گی امواج سے امواج یہ باہم ہو جائیں گے طوفان میں طوفان یہ مدغم

سوتے ہوں الگ چاہے مگر ایک ہے سنگم

اے نیل کی موجو! نہ کرو خوفِ کنارا

نعیم صدیقی کی یہ طویل نظم دعوت اتحاد اور پیغام عمل تھی، اور اس لئے اور بھی زیادہ موزوں تھی کہ ارضِ نیل کے سفیر اور مصر کے مایۂ ناز ادیب جناب ڈاکٹر عبدالوہاب عزّام نے حلقۂ ادب اسلامی کے اس عام اجلاس کا افتتاح فرمایا تھا۔

بارہ بجنے والے تھے، نصف النہار کا وقت تھا ــــــ یعنی آفتاب عالم تاب کا انتہائی عروج؟ اب صاحب صدر کی اختتامی تقریر تھی! میکروفون کو میز کے قریب لگایا گیا، اور وہ شخصیت گویا ہوئی جس کو کسی مبالغہ کے بغیر علم و ادب کی یونیورسٹی کہہ سکتے ہیں، علامہ شبلی نعمانی کے ممتاز شاگرد اور صحیح جانشین، حکیم الامت حضرت تھانوی کے تربیت یافتہ ــــــ مولانا سید سلیمان ندوی جن کی ساری زندگی قلم و قرطاس کی معیت میں بسر ہوئی ہے، سپید داڑھی، اُجلا باس

گوری رنگت اچہرے پر تقدیس غازے کی طرح نمایاں، اس بوڑھے مصنف اور آزمودہ کار مورخ اور سیرت نگار نے اسلامی ادب کے موضوع پر جو کچھ کہا وہ حرزِ جان بنانے کے قابل تھا، مجاہدانہ انداز میں فرمایا:-

"اجتماعی فساد کا مقابلہ اجتماعی جد و جہد ہی سے ہو سکتا ہے، حلقہ ادب اسلامی کی یہ کوشش اسی لئے قابل قدر ہے ——"

: آخری تقریر تھی ——— جلسہ کی سب سے بڑی کامیابی اُس کا نظم وضبط اور سکون و وقار تھا، شروع سے آخر تک ایک تالی بھی نہیں بجی اور نہ مشاعروں اور عام ادبی جلسوں کی طرح شاعروں اور ادیبوں نے داد دینے والوں کو جُھک جُھک کر سلام کیا، حلقہ ادب اسلامی کے تمام شاعر، مقررین اور مقالہ نویس اس تصور کے ساتھ ڈائس پر آئے تھے کہ ——— سامعین کرام! ہمارے افکار اور تحریر و تقریر کی داد، تالیاں، سیٹیاں اور "واہ واہ" نہیں ہے، ہم اپنے خونِ جگر کو اتنی سستی قیمت پر ہرگز نہیں بیچ سکتے، اس کی صحیح ستایش اور سچی قدردانی "عمل" ہے، اب رہا اس کا اجر تو اس کا اجر ہم اپنے اللہ سے طلب کریں گے۔

اللہ کی راہ میں گرم رفتار ادیبو اور شاعرو! تم کو مُبارکباد اور فتحمندی کا پیشگی مژدہ بھی! تمہاری کوششیں رائگاں نہیں جا سکتیں، ان میں برگ وبار ایک دن پیدا ہو کر رہیں گے، حق و صداقت کا یہ قافلہ کسی کے روکے اب رُک نہیں سکتا، جو اس کی راہ میں آکر مزاحم ہوگا، وہ خود کچل کر رہ جائے گا، غلبہ حق ہی کو ہوگا، اور زندگی کے ہر شعبہ پر حق شناس اور خدا پرست ہی چھا کر رہیں گے،

آج "اسلامی ادب" پر جو طنزیں کرتے ہیں کل اُن کو معذرت کرنی پڑے گی ——— اللہ تمہاری حفاظت کرے اور تم کو سخت سے سخت آزمائشوں میں صبر و استقامت کی توفیق عطا فرمائے ———

——— وہ دیکھو! اُفق کتنی روشن ہے، غبار چھٹ رہا ہے، منزل کے نشان تک نظر آنے لگے ———

مُجاہدو! بڑھے چلو — بڑھے چلو!

رُوحِ انتخاب

اوّلین چیز، جس سے کسی مسلمان کو ناواقف نہ ہونا چاہئیے تھا، یہ ہے کہ قادیانیت ایک ایسے مسئلہ میں مسلمانوں کے بنیادی عقائد سے متصادم ہوتی ہے جو قرآن، حدیث، اور پوری اُمت کے تیرہ سو سال کے اجماع سے ثابت ہے اور جس کے معاملہ میں مسلمانوں نے اپنی پچھلی تاریخ میں آج تک کسی انحراف کو برداشت نہیں کیا ہے۔ قرنِ اوّل سے تمام مسلمان آج تک اس بات پر متفق رہے ہیں کہ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں، ان پر سلسلۂ نبوت ختم ہو چکا ہے، اور ان کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔

مسلمانوں کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے اپنے درمیان کسی نئی نبوت کے دعوے کو کبھی نہیں چلنے دیا، اور جہاں کہیں اس فتنے نے سر اٹھایا، سارے مسلمانوں نے بالاتفاق اس کا سر کچل دیا۔ اگر ہندستان میں مسلمان یہاں اس تلخ گھونٹ کو صرف اس مجبوری سے نگلتے رہے کہ یہاں ایک غیر مسلم حکومت ان پر مسلط تھی جس کا آئین کسی نئی نبوت کے دعوے میں مانع نہ تھا۔

اس بات سے بھی کوئی مسلمان ناواقف نہیں ہو سکتا کہ ایک دعوائے نبوت پیش ہو جانے کے بعد یہ ممکن نہیں رہتا کہ اس کے بارے میں غیر جانبداری یا تغافل کی روش اختیار کی جا سکے۔ اس کے بعد تو ناگزیر ہو جاتا ہے کہ یا اسے مانیے یا جھوٹا قرار دیجئے۔ جو اس کو مانے وہ لامحالہ تکذیب کرنے والوں کے نزدیک کافر ہوگا، کیونکہ جھوٹے نبی کو نبی ماننا کفر ہے۔ اور جو اس کو نہ مانے وہ بلاریب ماننے والوں کے نزدیک کافر ہوگا، کیونکہ سچے نبی کو جھوٹا کہنا کفر ہے۔ اس لئے قادیانیت نے نہ صرف یہ کہ ایک ایسا مسئلہ مسلمانوں کے درمیان پیدا کر دیا جسے نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا، بلکہ اس مسئلے نے عملاً ماننے اور نہ ماننے والوں کے درمیان ایک ایسی دیوار کھڑی کر دی جس کے ہوتے یہ دونوں گروہ کسی طرح بھی ایک اُمت میں جمع نہ ہو سکتے تھے۔ مزید برآں، جبکہ قرآن، حدیث اور اجماعِ امت کی بنا پر عام مسلمانوں کے نزدیک بابِ نبوت قطعی بند تھا۔ تو یہ بات بالکل ناگزیر تھی کہ ایک گروہِ قلیل کے سوا مسلمانوں کا سوادِ اعظم اس کو جھٹلا دے اور اس طرح سوادِ اعظم اس گروہِ قلیل کے نزدیک کافر ہو اور وہ گروہِ قلیل سوادِ اعظم کے نزدیک کافر ٹھیرے —

(مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی)

ہماری نظر میں

حکیم الامت

"حکیم الامت" (نقوش و تاثرات) از:— عبدالماجد دریابادی مدیر "صدق" ضخامت ۴۰۱ صفحات (قیمت درج نہیں ہے) ملنے کا پتہ (۱) دار المصنفین اعظم گڑھ (۲) صدق بک ایجنسی — کچہری روڈ — لکھنؤ!

اس کتاب کے سرورق پر لکھا ہے:—

"حکیم امت، امام وقت، علامہ اشرف علی تھانوی کے آخری ۱۵ سالہ حضر زندگی کا نرالا مرقع، فقہ و تفسیر حدیث و سنت، سلوک و کلام، ادب و حکمت، صحافت و سیاست کے صدہا مضامین کا گلدستہ!"

اور اس میں ذرا سا بھی مبالغہ نہیں ہے، واقعی یہ کتاب گل ہائے رنگ رنگ کا گلدستہ اور حکیم الامت کی زندگی کا قابلِ دید مرقع ہے، مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم کا زورِ بیان اور شوخیٔ تحریر دیکھنی ہو تو اس کتاب کا پڑھنا ضروری ہے، مولانا موصوف کے قلم نے حرف نہیں لکھے پھول پتیاں بنائی ہیں کہ صرف دیکھنے اور پڑھنے سے دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور اگر پڑھنے کے ساتھ غور و فکر بھی شریک ہو تو قلب و روح کے سامنے فردوس کے دریچے کھل جاتے ہیں۔

سرسید کی تالیف (حیاتِ جاوید) مولانا حالی کی شاہکار تصنیف ہے، حیاتِ شبلی میں علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرت نگاری کا کمال دکھایا ہے مگر "حکیم الامت" اپنے انداز اور اسٹائل میں منفرد ہے، خطوط اور روزنامچوں سے واقعات کی آئینہ سازی کی ہے، اس اچھوتے انداز پر کم سے کم اردو میں تو کسی کی "تالیف" نہیں لکھی گئی۔

"حکیم الامت" ایک طرف تو حضرت مولانا تھانوی کے سوانح حیات کی عکاسی کرتی ہے اور دوسری طرف خود مولانا عبدالماجد دریابادی کے واردات قلبی اور نفسی کیفیات کی آئینہ دار ہے، اس کتاب میں تصوف و علمِ کلام کے بعض ادق مسائل بھی آ گئے ہیں مگر دلچسپی اور دلکشی کی "لے" تیز ہے کہ کہیں ٹوٹنے نہیں پاتی۔

اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا تھانوی معمولی معمولی جزئیات تک میں شریعت کا لحاظ رکھتے تھے! مولانا دریابادی نے دو دو صفحہ میں جو شبہات پیش کئے ہیں یا مسائل پوچھے ہیں اُن کا حضرت تھانوی رح نے ایک ایک دو دو سطروں میں اس قدر تسلی بخش جواب دیا ہے کہ دل کا سارا تکدر دور ہو جاتا ہے۔

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کے دو انداز ہیں جہاں سادہ اور سلیس ہے وہاں "سہل ممتنع" ہے کہ معمولی شد بدھ رکھنے والا بھی اُس سے مستفید ہو سکتا ہے، اور جہاں اغلاق ہے وہاں اس کے سمجھنے کے لئے بلند درجہ کا علم و بصیرت درکار ہے، ہم جیسے تو بس اُلجھ اُلجھ کر ہی رہ جاتے ہیں — "حکیم الامت" میں دونوں طرح کے نمونے ملتے ہیں۔

مولانا تھانوی قدس سرہٗ کی تفسیر "بیان القرآن" کے سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے بہت

سے مشورے دئے ہیں، اور بعض مقامات پر ترجمہ اور تفسیر کے سہو وتسامح کی نشان دہی بھی کی ہے، اور حضرت تھانویؒ نے اُن کو قبول بھی کر لیا ہے ——— یہ دلیل ہے مولانا تھانوی کی حق شناسی کی اور ثبوت ہے، مولانا دریا بادی کے قرآن میں فکر وتعمق کا!

اس کتاب میں مصنف نے ایسے واقعات بار بار پیش کئے ہیں جن سے حضرت مولانا تھانویؒ کے مزاج کی خشونت کی نفی ہوتی ہے، نہ معلوم یہ بات کیسے مشہور ہو گئی کہ حضرت تھانوی کے مزاج میں درشتی پائی جاتی ہے ——— جس کی تردید "حکیم الامت" کے مصنف کو کرنی پڑی ——— اس کتاب کو پڑھ کر ایک بات بہت کھٹکی وہ یہ کہ مولانا شبلی نعمانی سے حضرت مولانا تھانوی کچھ زیادہ خوش نہ تھے، حالانکہ شبلی کی "سیرۃ النبی" نے مولانا تھانوی کی "نشر الطیب فی ذکر الحبیب" سے کہیں زیادہ خدمتِ دین، اور حُبِ رسولؐ دلوں میں جاگزیں کرنے کا کام انجام دیا ہے —

اس مُرقعِ زنگار رنگ کی کچھ جھلکیاں :——

"سن کے عناصر کے ساتھ سنہ وسال کے ساتھ دل ودماغ پر کیسے کیسے دور گزرتے رہتے ہیں اور جگ بیتی تو جگ پر چھوڑیئے کم از کم آپ بیتی تو یہی ہے، ایک سن الحاد، عقلیت، لامذہبیت کے دور کا تھا، پھر تصوف نے مذہب کی راہ دکھائی، بات کچھ سمجھ میں آئی کچھ نہ آئی، ٹھنڈی، سہانی خوشگوار، جاں بخش ہوا اپنے ساتھ کچھ خس وخاشاک کوڑا کرکٹ بھی لگا لائی، تصوف آیا تو بدعاتِ تصوف لئے ہوئے، اور دھوئیں کے پھندے میں! لطیف کثیف کے ہاتھ میں ہاتھ دئے ہوئے، "عقلیت" گئی تو خوش عقیدگی آئی، دین دین سے زیادہ بزرگانِ دین سے اٹکا ہوا اور اہلِ حال کے ذوق ووجدان کی اہمیت دماغ پر دین کے حقائق اور اصل سے کچھ زیادہ ہی بیٹھی ہوئی ——— زندگی کے عین اُسی دور میں توفیق الٰہی نے رسائی آستانۂ اشرفی پر کرا دی، قدرۃً سوال وجواب زیادہ تر ان ہی مباحث پر رہے، اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنی تاریکیاں اسی واسطہ سے دُور ہوئیں اور کتنی اُلجھنیں اسی ذریعہ سے سلجھیں ———" (صفحہ ۳۴، ۳۵)

تھانہ بھون کے جس مکان میں مولانا دریا بادی نے قیام کیا تھا اُس کی تعریف کس قدر جامع لفظوں میں کی ہے :—

"کیسا منجنیر تھا یہ جس نے حقائق کو رسوم پر اور ضروریات کو نمائش پر غالب رکھا ——" (صفحہ ۱۳۹)

حضرت مولانا تھانوی کی وفات پر عبارت کیا مرثیہ لکھا ہے :—

"انا للہ وانا الیہ راجعون —— آہ! کہ طبیبوں کی اٹکل پر قائم کی ہوئی اُمیدوں کی بنیاد کیسی ریت پر نکلی اور بشری تقدیر کے مقابلہ میں بُری طرح شکست کھائی! مولانا میرے استاد تھے، مقتدا تھے، سردار تھے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ میرے محبوب تھے! آہ! کہ عقیدت، عظمت، محبت تینوں ایک ہی وقت میں کچل کر رہ گئیں! تعزیت کا مستحق میں خود ہوں، کسی دوسرے سے تعزیت کیا کروں ——" (صفحہ ۴۰۶)

اور پھر قبر پہ پہونچ کر :——

"جی میں آیا کہ مٹی اٹھا کر آنکھوں سے لگائیے، عقل نے کچھ اور ہی سُجھایا، روتی ہوئی آنکھوں اور روتے ہوئے دل کے ساتھ سلام عرض کیا، اور اپنے کو خانقاہ تک پہونچایا، خانقاہ! آہ وہ روحِ بے جسد وہ

مکان بے مکیں اور وہ انگشتری بے نگیں! مدرسہ چل رہا تھا لیکن سب بڑی خاموش و ویران، بجھی ہوئی شمع ایک ہُو کا عالم، سناٹے کا مقام، نہ دری نہ جاجم، نہ تکیہ نہ مسند، نہ ڈیسک نہ قلمدان ——— یاد ایک ایک چیز کی آ رہی تھی، اور دل کو حسرت و عبرت کی نہ ختم ہونے والی داستان سُنا رہی تھی یوں آتا ہوتا تھا، یہاں ایسا ہوتا تھا، کیا کیا سننے میں کیا کیا دیکھنے میں آتا تھا ——— آہ! تو کیا تیرا یہ بندہ بھی فانی تھا؟ بیشک موت دفنا تو اس نامور خادم کے آقا تک کو مقدر کر دی گئی تھی ——— وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ——— یہ ایک آیت اُمت کی تسلی و تعزیت کی کیسی پوری دُنیا اپنے اندر آباد رکھتی ہے۔" (صفحہ ۶۱۱)

اب مقتدی اور مقتدا کا صرف ایک سوال اور جواب لگے ہاتھوں پڑھ لیجئے:—

م ——— (عبدالماجد) ——— ابھی چند روز ہوئے امریکہ سے انگریزی میں ایک کتاب عقائد و علوم و تاریخ یہود پر ۱۲ ضخیم جلدوں میں تقریباً ۱۱/(۲۰۰۰) میں آئی ہے، حال کے بیسیوں علماء یہود نے مل کر لکھی ہے، کام کی بہت سی باتیں اس میں مل گئیں، البعض وقت بڑی حسرت ہوتی ہے کہ کاش! ہمارے علماء نے بھی یہود و نصاریٰ کے دفاتر و اسفار کا مطالعہ کیا ہوتا، خدا جانے کتنے موتی اس سمندر سے نکال لاتے ———

ا ——— (مولانا اشرف علیؒ) ——— مگر بعض کے ڈوب جانے کا بھی ڈر تھا، اور جہاں یہ اندیشہ نہ ہو میں بھی متفق ہوں۔"

آج کل رسالوں اور کتابوں کی کثرت ہی نہیں ہنگامہ آرائی ہے، رسالے اور کتابیں ہیں کہ سبزے کی طرح اُگتی چلی آ رہی ہیں، مگر "علم" کا دُور دُور پتہ نہیں ——— اس پر مولانا تھانوی کا حکیمانہ تبصرہ سُنئے:—

" آج کل رسالوں کے باعث لوگوں میں کتب بینی کا مذاق بہت پھیل گیا ہے اور معمولی طالب علم بھی خوب خوب کتابیں پڑھنے لگے ہیں لیکن نظر کی اس وسعت نے نظر کے عمق کو غارت کر دیا ہے، لوگوں کی نظریں پھیلی ہوئی تو بہت ملتی ہیں لیکن گہری نہیں ہوتیں، صرف سطح پر رہتی ہیں، اپنے مضامین اور مقالات میں حوالے تو خوب دیتے ہیں کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پر یوں لکھا ہے لیکن فہم مسائل کی استعداد نہیں بڑھتی، سمندر سے موتی وہی نکال کر لا سکتے ہیں جو گہری غواصی کر سکتے ہوں، محض سطح سمندر پر دور تک پیرتے ہوئے چلے جانے سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ (صفحہ ۳۰۰)

مصنف سے اظہار بیان میں کہیں کہیں تسامح بھی ہو گیا ہے:—

(صفحہ ۵) ——— "جناب کی تصانیف سلوک حال میں دیکھیں اور دل بھڑک گیا" ——— غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے "پھڑک گیا" ہوگا ورنہ ایسے موقعوں پر "بھڑکنے" کے معنی میں حیرت و استعجاب کے ساتھ مخالفت اور فرنٹ ہو جانے کا بھی پہلو ہوتا ہے ———

(صفحہ ۱۶) مولانا تھانوی کی تجوید اور ترتیل کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:— "ہر لفظ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سانچے میں ڈھلا ہوا نکل رہا ہے" "خوش آوازی" اور لحن مرتب و شیریں کو "سانچے میں ڈھلا ہوا" عام طور پر بولا نہیں جاتا ———

(صفحہ ۸۵) "آخر ایک روز صبح سویرے عمر کی رقم اُٹھ گئی" ——— رقم کے سلسلہ میں "اُٹھ گئی" کے یہ معنی

ہوئے کو خرچ ہو گئی اور مصنف نے "چرائی گئی" کے معنی میں استعمال کی ہے جو درست نہیں ہے ——— "ہر خود، خدا کیا ہوتا تھا ایک مستقل ہدایت نامہ ہوتا تھا مفید بھی لذیذ بھی ---" فارسی میں اگرچہ داستان و حکایت کو "لذیذ" بولتے ہیں مگر اُردو میں مکتوب، غزل، شعر وغیرہ کو "لذیذ" نہیں کہتے، اُردو میں عام طور پر "لذیذ" ماکولات اور مشروبات کے لئے بولتے ہیں ——— (صفحہ ۱۲۷) "ایک اتھاہ سمندر ہر وقت بہہ رہا ہے" سمندر کے لئے "بہنا" محلِ نظر ہے ——— (صفحہ ۱۳۵) "حضرت کی خدمت میں گستاخ اور ڈھیٹ اتنا تھا کر جواب اُلٹا سیدھا جو کچھ بھی سمجھ میں آتا عرض کر گزرتا ———" "ڈھیٹ" کی جگہ "بے باک" زیادہ موزوں تھا، ڈھیٹ تو اُس آدمی کو کہتے ہیں جو بے حیا اور چکنا گھڑا ہو ——— صفحہ (۲۹۸) "جل تھل سب بھر گئے" ضرب المثل یوں ہے "سب جل تھل ایک ہو گئے" ——— (صفحہ ۲۹۸) "رات بڑھے پانی کچھ دھیما ہوا" ——— ممکن ہے "رات گئے" کو لکھنؤ اور حوالی لکھنؤ میں "رات بڑھے" بولتے ہوں ———

"حکیم الامت" ——— حقیقت میں نہ صرف اُردو ادب بلکہ اخلاقیات میں ایک خوشگوار اضافہ ہے،

کاش! مولانا عبدالماجد دریابادی خدمتِ دین اور تبلیغ حق و صداقت کے انہی کاموں میں مصروف رہتے، "قادیانیت" کی اُن کے قلم سے حمایت ہوتی دیکھ کر ہم اُن کے نیاز مندوں کو جو دُکھ ہوتا ہے، وہ ناقابلِ بیان ہے، بارِ الٰہا! جس قلم نے تیرے آخری نبی کی مدح و نعت لکھی ہے اُسے جھوٹے نبی کی مدافعت میں اب اور زیادہ آلودہ نہ ہونے دے! اس آلودگی کو دھو کر اُسے پہلے کی طرح پاک و شفاف بنا دے!!

شاہنامہ اسلام (جدید)

"شاہنامہ اسلام" (جدید) حصہ اوّل ——— از: ——— عامر عثمانی، ضخامت ۱۹۸ صفحات، مجلد گرد پوش کے ساتھ (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ: ——— مکتبہ تجلی دیوبند، ضلع سہارنپور (یو-پی- بھارت)

جناب عامر عثمانی نے ——— نہایت تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کی ہیں، اُنھوں نے ماہنامہ "تجلی" نکالا اور دیکھتے ہی دیکھتے تھوڑی سی مدت میں اس مجلّے نے اپنا ایک خاص مقام پیدا کر لیا، عامر عثمانی نثر اور نظم پر یکساں قدرت رکھتے ہیں، وہ دیوبند کے ایک علمی خانوادے کے چشم و چراغ ہیں، علم اُن کو ورثہ میں ملا ہے اور شعریت اور ادبیت اُن کو قدرت نے عطا کی ہے، یہی اکتساب اور موہبت ہے جس نے عامر کی شاعری اور ادب و انشاء کو مل جل کر سنوارا ہے ——— پھر اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و احسان یہ ہے کہ اُن کا قلم دین کی خدمت، جرأت و بے باکی کے ساتھ انجام دے رہا ہے، اور گروہی عصبیت اُن کو حق گوئی سے نہیں روک سکی، اسی لئے اُن سے بیگانے تو بیگانے ہیں خود "اپنے" لوگ خفا ہیں ——— کیونکہ

وہ زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

"شاہنامہ اسلام" (جدید) اُن کی غالباً پہلی کتاب ہے، جو منظرِ عام پر آئی ہے، اس کے نام سے پہلی خلاف ہے، اس نام کی ایک کتاب اُردو زبان میں کافی مشہور ہو چکی ہے، اس لئے ناموں میں التباس کا امکان ہے، ——— عامر عثمانی نے خود "شاہنامہ اسلام" کا دیباچہ لکھا ہے جو بہت خوب ہے، اُنھوں نے بڑے سلیقہ اور شائستگی کے ساتھ اپنے مدعا کو ظاہر کیا ہے ——— صفحہ (۱۰) پر وہ لکھتے ہیں: ———

"مجھ جیسا کوئی بھی ناکس یہ وہم نہیں کر سکتا کہ وہ حفیظ کے شاہنامے جیسی کوئی چیز پیش کرنے کا اہل ہو سکتا ہے بلکہ کسی بھی بڑے سے بڑے اُردو شاعر کے لئے اب یہ ممکن نہیں کہ حفیظ اپنے شاہنامہ کی بنیاد پر جو مقام حاصل کر چکے ہیں اس کے آگے یا اُس تک پہونچ سکے ..."

اس "مرعوبیت" اور "احساسِ کمتری" کو دیکھ کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی! کوئی شک نہیں کہ حفیظ جالندھری کے شاہنامہ میں روانی اور جوش پایا جاتا ہے مگر اس رائے میں ایک فیصدی اصابت بھی نہیں ہے کہ اُس کا جواب ہی نہیں ہو سکتا، یہ چیز تو فردوسی کے شاہنامہ اور سعدی کی گلستاں ہی کو حاصل ہے کہ اُن کا جواب نہ ہو سکا۔

جناب عامر عثمانی اُس مکتبۂ فکر و خیال سے تعلق رکھتے ہیں جہاں حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، حضرت سید احمد بریلوی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے تصورات و معتقدات کے چراغ روشن ہیں ——— لیکن حیرت ہے کہ انھوں نے "شاہنامہ اسلام" (جدید) کے دسیوں شعروں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے "استعانت" چاہی ہے اور حضور کو "امداد" کے لئے پُکارا ہے، یہ عقیدت کا وہ غلو اور محبت کی وہ شدت ہے جو دین میں معتبر نہیں، استغاثہ، استعانت اور دُہائی دیئے جانے کا حق صرف اللہ تعالٰے کے لئے مخصوص ہے ——— ایک آدھ شعر میں اگر اسی قسم کی جھلک آجائے تو اُس کی تاویل اس طرح کی جا سکتی ہے کہ بچے ماں باپ سے دور رہ کر بھی تکلیف کے وقت شدتِ محبت کے سبب "ماں" یا "باپ" کو پکارنے لگتے ہیں حالانکہ اُن کو یقین ہوتا ہے کہ اُن کے ماں باپ اُنکی فریادرس رہے ہیں اور نہ وہ دستگیری کے لئے پہونچ سکتے ہیں ——— مگر غیر اللہ (اور اس میں نبی بھی شامل ہیں) سے مستقل طور پر استغاثہ کرنا اور مدد چاہنا درست نہیں ———

اے مخزنِ رحمت، بر کرم اے نورِ مجسم حسنِ اتم　　ادنیٰ سا تصرف کافی ہے پھر کیسی فغاں پھر کس کا الم　(صفحہ ۲۲)

"تصرف" یہاں گنجلک سا لگتا ہے۔ "اشارہ" ہوتا تو بات واضح ہو جاتی۔

معمار تھے جو مستقبل کے روتے ہیں گزشتہ غفلت کو　　بیباک تھی جن کی بُت شکنی ہنستے ہیں انھیں پتھر کے صنم　(صفحہ ۲۳)

"ہنستے ہیں انھیں" بولا نہیں جاتا، شعر کی نثر کرنے میں "دیکھ کر" کا اضافہ کرنا پڑے گا (اُنھیں دیکھ کر پتھر کے صنم ہنستے ہیں) تو کہیں جا کر شعر کی چُول ٹھیک بیٹھے گی، "میں انھیں روتا ہوں" تو بولتے ہیں مگر "میں اُنھیں ہنستا ہوں" نہیں بولا جاتا یہی وہ مقام ہے جہاں "قیاس" پر "سماع" کو ترجیح دی جاتی ہے۔

بنام ربِ کعبہ ایک مشعل لیکے نکلا ہوں　　بہت چھوٹی سی شمعِ ناململ لیکے نکلا ہوں　(صفحہ ۲۶)

"شمعِ ناململ" موزوں اور حسین ترکیب نہیں ہے "مشعل" کے قافیہ کے سبب شاعر کو یہ ترکیب تراشنی پڑی، مگر "نکلا" کو قافیہ قرار دے کر دوسرا مصرعہ اچھے انداز پر کہا جا سکتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر ایک شعر ہے :-

وہی انسان رُخصت ہو گیا ہے آج دُنیا سے　　وہی انمول قطرہ مل گیا ہے آج دریا سے　(صفحہ ۳۹)

مصرعہ ثانی میں جو بات کہی گئی ہے وہ احتیاط کے خلاف ہے!

بچارے سوگوار و مضمحل بیٹھے تھے سالوں سے　　سراسر عاجز و مجبور تھے اللہ والوں سے　(صفحہ ۵۴)

"سالوں" میں ذم کا پہلو نکلتا ہے، ایک دو جگہ اور بھی اسی لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔

ضرورت ہے کہ فوراً ایک اپنا حکمراں چن لوں ۔ کوئی بوجہل جیسا مستقل مرسٹ جواں چن لوں (صفحہ ۵۹)

ایک تو "مستقل" یہاں اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے دوسرے "مرسٹ جواں" سے غالباً یہ مُراد ہے کہ "مرٹنے والا جوان" مگر اس طرح اُردو میں بولا نہیں جاتا ـــ

یہاں کھائے ہیں دھوکے کم نگاہوں بدنصیبوں نے ۔ کیا ہے سوئے ظن وسواس شیطاں کے نقیبوں نے (صفحہ ۷۲)

اوّل تو "کیا ہے سوئے ظن" محل غور ہے دوسرے "وسواس" بالکل "زاید" لفظ ہے، جس نے شعر کے زور کو گھٹا دیا ـــ

یہی وہ مرحلہ ہے جس پہ انساں ڈگمگاتا ہے ۔ شعور و ہوش کے سارے تقاضے بھول جاتا ہے (صفحہ ۷۸)

پہلا مصرعہ کاش! اس طرح ہوتا ۔ یہی ہے وہ دوراہہ جس پہ انساں ڈگمگاتا ہے ـــــ "دوراہہ" لانے کی اس لئے ضرورت تھی کہ اس سے قبل کے شعروں میں شاعر نے فرض و محبت، عقل اور عشق، دل اور دماغ کی کشمکش کو دکھایا ہے ـــ

جنھیں حاصل تھا بیہوشی میں نقدِ ہوش پر قابو (صفحہ ۷۹)

"نقد" زائد ہے اس تکلف کی کیا ضرورت تھی ۔ "اپنے ہوش" کہنا چاہئے تھا ـــ

تو سطے پا پا کہ یہ نقدہ ہی جگر پاک کر ڈالیں ۔ لہو آشام تلواروں سے سینے چاک کر ڈالیں (صفحہ ۸۷)

"توسطے" میں صوتی اعتبار سے تنافر پایا جاتا ہے اور "لہو" خالص اُردو لفظ ہے اس لئے "لہو آشام" کی ترکیب درست نہیں ـــ

یہی میرا ارادہ تھا کہ اس منزل سے ہو گزروں ۔ اگر ممکن نہ ہو ضبط و شکیبائی تو ردگزروں (صفحہ ۹۴)

"ردگزروں" نے سارے شعر کو بے مزہ بنا دیا ـــ

ہوئی تشویش اس بارِ امانت کو اُٹھانے کی ۔ جہاں بانی کی گہری اُلجھنوں پر فتح پانے کی (صفحہ ۱۰۴)

اُلجھن کے لئے "گہری" اور "اُلجھی" نہیں "شدید" اور "نازک" بولتے ہیں، دوسرے مصرعے میں یوں بھی "آورد" پائی جاتی ہے ـ

ہوئے جب جمع میدانِ جرأت میں لشکری سارے ۔ سمائے دین و ایماں کے ثوابت اور سیارے (صفحہ ۱۱۴)

"سمائے دین و ایماں" اچھا نہیں لگتا ـــــ "وہ چرخ دین و ایماں" ہوتا تو شعر میں حُسن پیدا ہو جاتا ـــ

اس کا سبب کتابت کی غلطیاں ہی ہو سکتی ہیں کہ "تلاطم" کو "طلاطم" اور "پگھلنے" کو "پنگھلنے" لکھا ہوا ملتا ہے ـــ اور "زعم" کی "ز" پر پیش لگا دیا گیا ہے ـ

ـــــ یہ تو کتاب کا وہ رُخ تھا کہ جس سہو و لغزش سے کوئی شاعر اور ادیب بھی دامن نہیں بچا سکتا، وہ شہسوار ہی نہیں جس نے میدان میں کبھی ٹھوکر ہی نہ کھائی ہو ـــــ مجموعی طور پر ـــــ "شاہنامہ اسلام" (جدید) میں یقیناً روانی، جوش، تاثیر اور دلکشی پائی جاتی ہے ـــــ ان شعروں کے تیور دیکھئے: ـــ

سیاہی ایک بحرِ بیکراں معلوم ہوتی ہے ۔ فضا سر تا قدم یکسر دھواں معلوم ہوتی ہے

اُجالے سو گئے ہیں وقت کی آرام گاہوں میں ۔ ہزاروں قافلے بھٹکے ہوئے بھرتے ہیں راہوں میں

وہ افسانے درِ معراجِ آدم باز ہے جن پر　　　جمالِ شاہدِ انسانیت کو ناز ہے جن پر
وہ افسانے جو طوفاں بھی ہیں بادِ صبحگاہی بھی　　　سُو رجن کے پرتو سے فقیری بھی ہے شاہی بھی

ہزاروں منتظر آنکھیں اُٹھی ہیں بہرِ نظارہ　　　ہزاروں دل بنے ہیں شوق و بے تابی کا گہوارہ
بصیرت مضمحل، ہمت شکستہ، عقل پژمردہ　　　تخیل گُند، آنکھیں بے بصر، روحِ عمل مردہ

حضورِ سرورِ کائنات کی مقدس زندگی پر جب شاعر نگاہ کرتا ہے تو بیشمار صفات پوری شانِ تکمیل کے ساتھ جلوہ زا نظر آتی ہیں۔ شاعر حیرت میں ہے کہ کس کو موضوعِ نگارش اور عنوانِ شاعری بنائے:—

بڑی مشکل یہ ہے جب لب پہ تیرا ذکر آتا ہے　　　دماغ و دل میں اک خوابیدہ محشر جاگ جاتا ہے
اُبھر آتے ہیں خاکے تیری صورت تیری سیرت کے　　　رُتل پڑتے ہیں سوتے بیکراں جذبِ محبت کے
کبھی جی چاہتا ہے تیری معصومی کے گُن گاؤں　　　کبھی جی چاہتا ہے سادگی کا ذکر کر ڈالوں
کبھی کہتا ہے دل دریا دلی کا تذکرہ کر لوں　　　کبھی کہتا ہے دل زہد و ورع سے ابتدا کروں
کبھی ذکرِ جہاں دل نشیں پر جی مچلتا ہے　　　کبھی عہدِ رسالت شوق کے سانچے میں ڈھلتا ہے
کبھی ایامِ ہجرت کے مصائب یاد آتے ہیں　　　دماغ و روح و دل زِد اترے کانپ جاتے ہیں
کبھی تیرے کمالِ صبر پر دل وجد کرتا ہے　　　تخیل میں ترے اوصاف کا پرچم اُبھرتا ہے
کبھی تیری جفا کوشی پہ آنکھیں ڈبڈباتی ہیں　　　تصور سے ترے فاقوں کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں
کبھی جلوے نکھرتے ہیں تری مہماں نوازی کے　　　یتیموں بے سہاروں، بیکسوں کی چارہ سازی کے
مسلسل کشمکش ہوتی ہے الفاظ و معانی میں　　　میں بہہ جاتا ہوں اک خاموش طوفاں کی روانی میں

حضورِ اقدس کی وفات پر اگر صحابہ کرام صبر و ضبط سے کام نہ لیتے ——— تو کیا عالم ہوتا؟

مدینہ حشر زارِ ماتم و فریاد بن جاتا　　　ہجومِ شورِ ماتم سے فغاں آباد بن جاتا
مسلسل ہاتھ کی ضربوں سے سینے خون ڈالتے　　　مسامِ ضبط سے رستے پسینے خون ڈالتے
بہت نادانیاں اشکوں کی طغیانی میں بہہ جاتیں　　　بہت عقلیں ہمیشہ کے لئے مفلوج رہ جاتیں

مگر ——— !

گلوں میں رہ گئیں گھٹ کر مسلسل ہچکیاں اُن کی[۱]

صحابہ کرام کے جوشِ عقیدت اور حبیبِ رسول کی یہ شان تھی:—

محمدؐ کے لئے وہ ساری دنیا چھوڑ سکتے تھے　　　وہ اس رشتہ کی خاطر سارے رشتے توڑ سکتے تھے
شکیبائی حریفِ آہن و فولاد تھی جن کی　　　جوانمردی پہاڑوں کے دلوں کو یاد تھی جن کی
بشر ہو کر بھی جو فوقُ البشر کردار رکھتے تھے　　　جمالِ قدس میں ڈوبے ہوئے افکار رکھتے تھے

---

[۱] اس مصرعہ میں طور و زدیا کی جاتی ہے ... "ڈوبے ہوئے" یہاں کھٹکتا ہے، اگر یوں ہوتا "شیمِ قدس سے مہکے ہوئے افکار رکھتے تھے"!

فلک پیما تھیں قدریں جن کے اخلاقی اصولوں کی　　ہوئی تھیں جمع جن میں نسبتیں سارے رسولوں کی
مصرعہ ثانی کی تعریف ہی نہیں ہو سکتی ——— یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری "جزویست از پیغمبری" بن جاتی ہے!

تبسم جیسے بادِ صبح سے ڈھلکی ہوئی شبنم　　تبسم جیسے گہرے پانیوں میں چاند کا عالم

حضرت عامر عثمانی نے اس کتاب کو حضورؐ کی وفات سے شروع کیا ہے، اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے انتخابِ خلافت، سقیفہ بنی ساعدہ کی سرگزشت، جیشِ اسامہؓ کی کیفیت اور منکرینِ زکوٰۃ اور باغیوں سے جنگ کے مناظر کو پوری شاعرانہ قوت کے ساتھ دکھایا ہے، اسی تاریخ کے یہ وہ تابناک اوراق ہیں، جن پر کسی شاعر نے اس انداز میں اب تک توجہ نہیں کی، یہ سعادت عامر عثمانی کے حصہ میں آئی، واقعات کی جزئیات تک کو بیان کیا ہے، اور جھول پیدا نہیں ہونے دیا ایک ایک شعر سے خشیتِ الٰہی، عشقِ رسولؐ، عظمتِ صحابہ اور اسلام سے شغف جھلکتا ہے، اثر انگیزی کا یہ عالم ہے کہ پتھر دل کی آنکھیں بھی اشکوں کی روانی کو نہ روک سکیں، بے دلی کی نمازیں چاہے منھ پر پھینک کر مار دی جائیں مگر عشقِ رسولؐ میں جو آنسو نکل آتے ہیں، شاید وہ سببِ مغفرت اور ذریعہ نجات بن جائیں ———

"شاہنامہ اسلام" (جدید) کتابت، طباعت اور جلد کے اعتبار سے بھی ایک مثالی کتاب ہے اور کاغذ تو اتنا بڑھیا اور قیمتی لگایا گیا ہے، جو بہت ہی کم کتابوں کو میسر آتا ہے، یہ کتاب فارسی کی اس ضرب المثل کی مصداق ہے:—

"عروسِ جمیل ——— لباسِ حریر"

ہم اس کے دوسرے حصہ کے لئے ابھی سے چشم براہ ہیں! اللہ تعالیٰ مصنف کی صحت اور عمر میں ترقی و توانائی عطاء فرمائے!

یہ ناخدا

"یہ ناخدا" از:— محمود فاروقی ضخامت ۲۸۰ صفحے، مجلد قیمت تین روپے
ملنے کا پتہ:— کتاب محل، الفنسٹن اسٹریٹ، صدر، کراچی!

یہ ناول جناب محمود فاروقی (اسلامی ادب والے محمود فاروقی نہیں) کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے، جس میں ناول نگار نے سماج پر طنز بھی کی ہے اور ہوس اور محبت کے فرق کو بھی واضح کیا ہے، پلاٹ آخر تک اس قدر مربوط ہے کہ پڑھنے والا ناول کے ساتھ ساتھ بندھا ہوا چلا جاتا ہے، زبان خاصی منجھی ہوئی اور طرزِ نگارش بہت دلچسپ ہے، کردار نگاری میں ہر "کردار" کی نفسیات کو ملحوظ رکھا ہے!

تفصیلات میں کہیں کہیں مصنف کا قلم زیادہ رنگین اور شوخ ہو گیا ہے، مثلاً ——— گنڈا سنگھ جب شراب کے نشہ میں دھت ہو کر سعیدہ پر ہاتھ ڈالتا ہے، تو اس کیفیت کو ناول نگار نے نام نہاد ترقی پسندوں کے انداز میں بہت کھل کر لکھا ہے (صفحہ ۵۳) حالانکہ یہ بات دوسرے لفظوں میں بھی بیان کی جا سکتی تھی ———

ناول میں "نواب صاحب تلپٹ" ——— "وزیر تام جھام" ——— "محکمہ گھاٹ پاٹ کے سکریٹری" (صفحہ ۱۵۰) جیسے فرضی اور مزاحیہ ناموں کے لانے کی آخر کیا ضرورت تھی، اس سے ناول کی "واقعیت" کو

بہت صدمہ پہنچا، جس طرح سعیدہ، نجمہ، سنکھر وغیرہ نام استعمال کئے گئے ہیں، اسی طرح کے نام یہاں بھی لانے چاہیئے تھے!
(صفحہ ۱۱) "اسے اپنے دل میں ایک نامعلوم سا غم جاگزیں ہوتا ہوا معلوم پڑا، اچانک اُس کا دل اچھل پڑا ـــــــ
ـــــــ "معلوم پڑا" اول تو اچھا نہیں لگتا، "معلوم ہوا" کا محل تھا پھر بہت قریب قریب "پڑا" کی تکرار ناگوار معلوم ہوتی ہے اور "دل کا اُچھلنا" تو خوشی کی علامت ہے نہ کہ غم کی ـــــــ (صفحہ ۱۲) "جو صورتیں نظر آتی ہیں پھیکی، سیٹھی، ڈھیلی ڈھالی" ـــــــ چہروں اور صورتوں کو "ڈھیلی ڈھالی" آخر کہاں بولا جاتا ہے؟ ـــــــ
ـــــــ (صفحہ ۴۰) "ہلالی ایک اعلیٰ عہدے پر فائفن تھا" ـــــــ یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے کہ "فائز" کو "فائفن" لکھ مارا ـــــــ (صفحہ ۴۶) "اور کسی خیال کے زیر اثر پوچھا" ـــــــ "زیر اثر" یہاں ترجمہ سا لگتا ہے ـــــــ (صفحہ ۵۳) "چار سال تک کے تمام واقعات اُس کے ذہن میں بھنبھنانے لگے" مکھیوں کا بھنبھنانا تو سُنا تھا واقعات کا بھنبھنانا پہلی بار سُننے میں آیا ـــــــ اگر یہ ناول نگار کی جدت ہے تو حسین جدت نہیں ہے، ـــــــ (صفحہ ۶۱) "وہ جذبات امتنان و تشکر سے بھر گئی"[1] انگریزی میں تو اس طرح ضرور بولتے ہیں مگر اردو زبان کا مزاج اس انگریزی انداز بیان سے مختلف ہے، اردو میں اس کیفیت کا اظہار یوں کریں گے "وہ سراپا تشکر و امتنان بن گیا" یا "اُس کا دل تشکر و امتنان سے معمور ہو گیا" ـــ (صفحہ ۶۳) "وہ گانے الاپنے لگا" "گانا نہیں راگ الاپا جاتا ہے" یہی روزمرہ ہے ـــــــ (صفحہ ۷۶) "غالباً آپ کو میری ہمت افزائی مقصود ہے ـــــــ اصغر نے ہوا بھری ـــــــ اس جملے سے ایسا مترشح ہوتا ہے جیسے اصغر نے کسی غبارے میں یا سائیکل کے ٹیوب میں ہوا بھری حالانکہ ناول نگار کہنا یہ چاہتا ہے کہ اصغر نے نواب صاحب کو بھرے پر رکھا، یا اُن کے سر لگایا ـــــــ (صفحہ ۷۷) "اصغر دھیرے سے ہنہنایا" یہ لفظ (ہنہنایا) بار بار استعمال ہوا ہے اور وجدان کو تشویش میں ڈال دیتا ہے ـــــــ
ـــــــ (صفحہ ۸۸) "نجمہ خاموش ہو گئی، اَڑنا مناسب خیال نہ کیا" ـــــــ "اَڑنا" غلط استعمال نہیں ہوا مگر سیاق و سباق کے اعتبار سے "ضد کرنا" یا "اصرار کرنا" زیادہ موزوں تھا ـــــــ (صفحہ ۱۰۱) "آج یہیں شب بسری کا ارادہ ہے" "شب باشی" بولا جاتا ہے "شب بسری" بے جوڑ ترکیب ہے ـــــــ (صفحہ ۱۰۳) "سلطے نخرائی" پروفیسر وحید الدین سلیم نے "برق" سے جو "برقانا" بنایا تھا وہ تو ٹھیک تھا مگر اُس کے وزن پر "نخرہ" سے "نخرانا" ناگوار معلوم ہوتا ہے، نئی ترکیبوں اور لفظوں کے وضع کرنے میں شدید احتیاط کی ضرورت ہے ـــــــ (صفحہ ۱۴۳) "نجمہ کی سُرخ آنکھیں غمازی کر رہی تھیں کہ وہ رات بھر نہیں سوئی ہے، چہرہ نہایت گمبھیر تھا" "گمبھیر" یہاں ملول و افسردہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے حالانکہ ہندی زبان میں "گمبھیر" صاحب ظرف اور بُردبار آدمی کو کہتے ہیں ـــــــ (صفحہ ۱۷۵) "جس کی زبان سے نکلے ہوئے جملوں کو لوگ موتیاں سمجھ کر یادداشت کے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں ـــــــ" "موتی سمجھ کر" لکھنا تھا، موتی کی جمع "موتیاں" دکن کی زبان ہے، وہاں اس طرح بولتے ہیں:-

"میں بازار سے لکھنے کے لئے قلماں مول لے کو آیا ہوں"

---

[1] He was filled with joy.

——— . . بنرش نیر بجی ——— صفحہ ۱۸، ”محلوں میں صبح ذرا دیر سے ہوتی ہے“ دولت مندوں اور اُن
پر کتنی دلفریب طنز ہے ——— (صفحہ ۱۱) ”تو پھر آپ نے مجھے غلط سمجھا، یہ تو قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ میں ثروت
مند گھرانے میں پیدا ہوئی، اور وہ سنجیدہ ہوگئی، اُس کی آنکھوں میں شوخی کا نام و نشان نہ تھا جس کے اثر سے تھوڑی دیر
پہلے وہ چہک رہی تھی، یکایک وہ اپنی عمر سے کچھ زیادہ معلوم ہونے لگی تھی“ ——— سنجیدگی کی کیفیت کا اظہار
کتنے موزوں انداز میں کیا ہے ——— (صفحہ ۲۶) ”لڑکیوں کی محبت بھی پہاڑی ندی ہوتی ہے کہ چڑھتی
ہے تو روکے نہیں رُکتی اور جب اُترتی ہے تو اپنا نام و نشان بھی نہیں چھوڑتی“ ——— یہ اس زمانہ کے
”FREE LOVE“ پر کیسی بڑی طنز ہے ———

ہوس پرست اصغر بیچاری نجمہ کو پھانسنے کے لئے ایرنگ کا تحفہ لے کر آیا ہے اور اُس کے کانوں میں پہنانا
چاہتا ہے: ———

”نجمہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی کہ یہ تو ہاتھ پکڑتے پکڑتے پہونچا پکڑنے لگا۔ اُدھر اصغر اپنی کامیابی پر
باغ باغ ہو رہا تھا، ایرنگ نکال کر اس کی طرف بڑھا۔ ابھی اس کی انگلیاں نجمہ کے کان کی لو سے مس ہی ہوئی
تھیں کہ نجمہ کا ہاتھ اُٹھا اور چٹخ کر بائیں گال پر پانچوں انگلیوں کا نشان لگاتا ہوا کھنچ گیا، اصغر کے ہاتھ سے
ایرنگ چھوٹ کر دور جا گرا، طمانچہ لگاتے ہی نجمہ کا غصہ اندر بیٹھ گیا۔ . . . نجمہ کا دوسرا ہاتھ بھی
بلند ہوا اور اپنے گال کو سُرخ کر گیا اور پھر وہ روتی ہوئی کمرے سے باہر بھاگ گئی، جس کے جاتے
ہی سلمیٰ کمرے میں داخل ہوئی اور اُس نے اصغر کے گالوں کو دیکھتے ہی ہنس کر کہا ——— اس لڑکی کے
اسٹروکس (STROKES) تو بڑے غضب کے ہیں، تم نے کہا نہیں

؎ آ مصور ترے ہاتھوں کی بلائیں لے لوں“

کوئی شک نہیں کہ یہ ناول انتہائی دلچسپ ہے، ناول نگار نے اکثر مقامات پر نفسیات کی [illegible]
ہے، کاش! محمود فاروقی اسلام اور اخلاق کو اپنا موضوع بنائیں تو ناول کے ذریعہ وہ معاشرے کی کتنی گرانقدر
خدمت انجام دے سکیں گے ———

پہلی کرن

”پہلی کرن“ از ——— قمر قریشی بسنداروی ضخامت ۲۰۸ صفحات کتابت، طباعت دیدہ
زیب قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے، غیر مجلد دو روپے، ملنے کا پتہ (۱) مہتمم مکتبہ حیات الادب
معصوم شاہ نجیب نگر پوسٹ بجنور یو پی (بھارت)، (۲) مکتبہ پرچم پرچم اسٹریٹ
حسن علی آفندی روڈ، کراچی ۱ (پاکستان)

جناب قمر قریشی یو پی کے ممتاز و مشہور شاعر ہیں، انھوں نے سلامت روی کے ساتھ ترقی کی
منزلیں طے کی ہیں، ”پہلی کرن“ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جس پر ابو الفضل ازہر جاجموری نے مقدمہ تحریر فرمایا ہے
جو خاصہ وزنی اور دلچسپ ہے۔

اس کتاب میں بصورت اعلان و اشتہار ایک ورق چپکا ہوا ملتا ہے جس پر لکھا ہے:-

اُردو ادب و شعر کی تاریخ میں نادر قربانی کی پہلی مثال

جناب طرزؔ قریشی نے زیرِ نظر کتاب کی طباعت و اشاعت کے لئے
اپنا گھر فروخت کردیا

کیا آپ اُن کے اس ایثار و قربانی کی قدر نہیں فرمائیں گے؟ آپ کے عطیات و اعانت سے اُن کے اس نقصانِ عظیم کی تلافی باسانی ہوسکتی ہے، مصنف کو گرانقدر عطیات سے نوازیئے ——— ! (مہتمم ادارۂ حیات الادب ناگپور، سی۔ پی)

اوّل تو شاعر کو اپنا گھر بیچ کر اپنا مجموعۂ کلام چھپوانے کی غلطی نہیں کرنی چاہئے تھی اور یہ غلطی وہ کر بیٹھے تھے تو اُس کا اعلان نہ کرنا تھا کہ اس میں مضحکہ کا پہلو نکلتا ہے، دوسرے اس اعلان سے شاعر کی سُبکی بھی ہوتی ہے کہ کسی پبلشر نے اُن کا مجموعۂ کلام نہیں چھاپا یہاں تک کہ انہیں اس کے لئے اپنا گھر بیچنا پڑا، اور یہ سب کچھ کر گزرنے کے بعد "عطیات و اعانت" کے لئے درخواست اور اعلان اور زیادہ ہلکی بات ہے۔

"پہلی کرن" میں شاعروں اور ادیبوں کی جو آراء، قطعے اور نظمیں درج ہیں اُن کی تعداد چالیس سے بھی کچھ اوپر ہے، کسی کسی شاعر کی رائے تو دو دو تین تین سطروں ہی کی ہے اور ان میں کوئی قیصر ہمدردی اور یاور رائے پوری تک شامل ہیں ——— یہ دلیل ہے مُصنف کے جذبۂ خود اعتمادی کے کمزور ہونے کی!

طرزؔ صاحب یقیناً ایک خوش گو شاعر ہیں، اور صرف خوش گو ہی نہیں پُرگو بھی ہیں! غزل اور نظم دونوں میں اُن کی طبیعت اپنے جوہر دکھاتی ہے، اُن کی شاعری میں ایک شکوہ (GRANEUR) پایا جاتا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری ایک حوصلہ مند دل کی صدائے بازگشت ہے، اُن کے آنسو بھی اپنے اندر مسکراہٹیں چھپائے ہوئے ہیں۔

"پہلی کرن" سے ہم نے ایک نظر میں کچھ اشعار منتخب کئے ہیں:-

بازو مرے نے اُسے آگے بڑھایا بھی تو کیا
ہے کہاں تقدیر میں ذرّے کی سورج کا خرام ÷

خرد کے ہاتھوں کو دامن کی خاک تک نہ لگی
جنوں نے اپنی ہتھیلی پہ رکھ لئے سو طور ÷

میری ہمت سنگ در آہن میری ہستی اک چٹان
آبشاروں کی روانی میں نہا سکتا ہوں میں ÷

عزم و یقین فطرتِ بے تاب کی قسم
تیرے حضور تیری نظر بن کے آؤں گا ÷

خیال تھا تری قربت کبھی تو ہوگی نصیب
مگر نصیب سے وہ بھی خیال، خواب ہوا ÷

کرم سمجھ کے تمہارا ستم قبول کیا
وفا سرشت محبت نے غم قبول کیا ÷

وہ رنگ رُخ، وہ سُرخیٔ لبہائے دلنشیں[1]
وہ کیا نظر میں تھے کہ گلستاں نظر میں تھا ÷

اب مجھے بھی اپنی آرائش کا ہوتا ہے خیال
عکس شاید پڑ گیا مجھ پر تری تصویر کا ÷

سُنا ہے حُسن اور الفت میں چوٹیں ہیں برابر کی
یہ ہنگامہ نگاہوں سے گزر جاتا تو اچھا تھا ÷

وہ تو اچھا ہی ہوا شب کو بندھا اشکوں کا تار
اور بھی تارے اگر دن کو نظر آتے تو پھر؟

آپ نے ابھی کہی محفل سے اُٹھ جانے کی بات
ہم خدا ناخواستہ بیٹھے ہی رہ جاتے تو پھر؟

---

[1] "دلنشیں" کی جگہ کوئی دوسرا لفظ کاش! ہوتا!

مجھ سے غرض ہے تیری حضوری سے کام ہے ✽ کونین میرے سامنے آئے تو کیا کروں

جگر میں درد آنکھوں میں نمی محسوس کرتا ہوں ✽ لب اوقات کچھ کچھ زندگی محسوس کرتا ہوں

سورج کی کرن پھول کا دامن نہ سیئے گی ✽ تم اپنی نگاہوں کو ذرا کام میں لاؤ

افسانہ ہو بریں کہیں اپنے بھی تغافل ✽ ساحل سے بہت دور سفینے کو لگاؤ

ہزاروں سرخیاں آنکھوں سے ٹپکاتا ہے غم اکر ✽ مرتب جب کہیں ہوتا ہے اک رنگین افسانہ

عشق کو چاہیئے رکھ دے وہیں بنیادِ حرم ✽ جس جگہ بھی ترا نقشِ کفِ پا مل جائے

نظموں میں "دوشیزۂ جنگ" "مفقود نظر" —— "بھول جا" "غمِ دوراں" اور "زندگی" خوب ہیں اور خاص طور سے "زندگی" میں شاعر کا زورِ بیان اپنے شباب پر ہے!

دوسرا رُخ: ——

(صفحہ ۴۴) —— "تجزیہ" میں آذر ناگوری نے "دیوانے کی بکواس" لکھا ہے، محاورہ "دیوانے کی بڑ" ہے۔

روز و شب گا رہا ہوں عشق کے تُندر نغمے ✽ سوز میں ڈوبے ہوئے سازِ جگر پر نغمے (صفحہ ۶۵) [1]

"نغمے" کے ساتھ "تُندر" بھلا نہیں لگتا —— "وہ سازِ دل و جاں" تو سنتے آئے ہیں "سازِ جگر" پہلی بار دیکھنے اور سننے

دہقاں کی زندگی کی خوش حالیاں نہ پوچھو ✽ نکھرے ہوئے ہیں دانے پھولا ہوا ہے خرمن (صفحہ ۶۹)

کھیتوں کی فصل یا باغ کو "پھلا پھولا" کہتے ہیں یا پھر "سرسوں پھولی" بولتے ہیں "خرمن" تو غلّے کے ڈھیر یا فصل پکنے کے بعد کاٹ کر جب جمع کی جاتی ہے اُس کے انبار کو کہتے ہیں، اور "پھولا ہوا" خرمن کی صفت نہیں ہے۔

کس قدر کال اور آئیں گے ✽ کتنی سانسوں کو زہر کھائے گا

کتنے ارمانوں میں پڑے گا نیل ✽ کتنے صدموں کو دل دبائے گا؟ (صفحہ ۷۳)

زہر کا سانسوں کو کھانا اور ارمانوں میں نیل پڑنا —— یہ عجیب وحشت ناک قسم کا اندازِ بیان ہے!

اسی نظم (بھونچال صفحہ ۷۴) میں

؎ کتنی راتیں اُجالے کھائیں گی

؎ کتنی آنکھیں اندھیرے کھائیں گی

کی تکرار سے طبیعت بے مزہ ہو جاتی ہے، اور یہ وہ انداز ہے جس سے نام نہاد ترقی پسند شاعری بدنام ہے،

؎ عرفان کہاں ان میں یعنی اک سازِ غلط خواں ہیں دونوں (صفحہ ۸۰)

"سازِ غلط آہنگ" بولا جاتا ہے ——

سمجھ کے جادۂ منزل ستائے آزادی ✽ بشر نے مرحلۂ جذب و ضم قبول کر لیا (صفحہ ۱۲۰)

پورا شعر ایک "چیستان" ہے!

درد و غم، آلام و کلفت، یاس و حرمان و خلش ✽ سو بلاؤں کی سکونت ہے مرے دل کے قریب (صفحہ ۱۳۶)

---

[1] مگر اس کے آخری بند کو ردیف (فضول) نے غیر شگفتہ بنا دیا۔

حیرت ہے کہ "سکونت" جیسا غیر شاعرانہ لفظ شاعر نے کس طرح نظم کر دیا ——

اپنی توصیف سے بھی ہے معذور آدمی اور اس قدر مجبور (صفحہ ۱۴۰)

آدمی کی مجبوری کے لئے یہ دلیل لانا کہ وہ اپنی توصیف سے بھی معذور ہے —— ایک خلافِ واقعہ بات ہے نہ جانے شاعر کہنا کیا چاہتا ہے؟

ثبت ہر ذرّے پہ ہے مہرِ نظامِ فردوس تم نے دیکھا ہی کہاں ہے ابھی ویرانۂ دل (صفحہ ۱۴۵)

مصرعِ ثانی خوب ہے مگر مصرعِ اولیٰ کو "مہرِ نظامِ فردوس" نے بے جوڑ سا بنا دیا ——

سجتی رہی نغمات کی دنیا مرے آگے جو تار ہا وجدانِ تمنا مرے آگے (صفحہ ۱۹۳)

"وجدانِ تمنا" —— "جو تار ہا" یہ پہلی بار سننے میں آیا!

گرم بازاری سعیٔ ارتقا[1] کیوں سرد ہے گر پڑی کیوں عزمِ مستحکم پہ شبنم کیا ہوا (صفحہ ۸۴)

ایسے موقعوں پر جہاں جوش و ولولہ کی کمی اور افسردگی دکھانی ہوتی ہے وہاں "شبنم گر پڑی" نہیں "اوس پڑ گئی" بولتے ہیں ——

طرفہ صاحب کے کلام میں ایک چیز نمایاں طور پر کھٹکی، وہ یہ کہ بھاری بھرکم اور ثقیل ترکیبیں لا کر، وہ شعر کو بےمزہ بنا دیتے ہیں ——

جو بات سمجھ سے باہر تھی وہ بات سمجھ میں آ کے رہی تہِ علم و یقیں کی دنیا میں تغلیط کنِ اوہام ملا (صفحہ ۱۱۱)

رگ رگ تھی جمود افزائے عدم ہر سانس پہ غفلت تھی طاری دل چونک گیا، میں جاگ اٹھا، کس نے تمہارا نام لیا (صفحہ ۱۲۹)

مانعِ صحرا نوردی فہمِ ایذا کوشی تھا کیا مرا ذوقِ جنوں صیدِ طلسمِ ہوش تھا (صفحہ ۱۴۷)

ظرفِ استقلال کو بے بانگ پہلے کیجئے زندگی سی زندگی کرنا کوئی مشکل نہیں (صفحہ ۱۵۳)

[2] یہ زمیں کی پستیٔ غم شاں، یہ فلک کا اوجِ ضرر رساں (صفحہ ۱۶۹)

جگر کے داغ دود افروز نالہ ہو گئے طرفہ! بڑھا دی کس نے لا کر چراغِ شامِ ہجراں کی (صفحہ ۱۷۷)

کچھ نہ پوچھئے ہم سے نرخ زارِ الفت میں دل کی کیا لگی قیمت، ہاتھ کتنے دام آئے (صفحہ ۱۸۷)

ان شعروں میں "تغلیط کنِ اوہام" —— "جمود افزائے عدم" —— "فہمِ ایذا کوشی" —— "ظرفِ استقلال" —— "اوجِ ضرر رساں" —— "دود افروزِ نالہ" —— "نرخ زارِ الفت" غلط تراشیدہ چٹانیں ہیں جو شعر و ادب کی راہ میں لڑھکا دی گئی ہیں۔

قطعاتِ تاریخ میں :——

"ارتحالِ شاعرِ کہنہ محل —— اور —— "انتقالِ بکر تسلیم و داد"

۱۳۶۹ ہجری ۱۳۶۹ ہجری

---

[1] "گرم بازاری سعیٔ ارتقا" میں بھی ضرورت سے زیادہ تکلف پایا جاتا ہے! [2] دوسرا مصرع کتنا رواں اور شگفتہ ہے!
[3] "زندگی سی زندگی کرنا" بالکل سمجھ میں نہیں آیا! [4] کاش پہلا مصرع بھی مصرعِ ثانی کے جوڑ کا ہوتا ——

کس قدر بے تکلف ہیں!

طرفہ قریشی کی "پہلی کرن" میں دھوئیں کے پیچ ہی نہیں روشنی کے ہالے بھی ہیں ——— اُن کے دو چار اچھے شعر ناظرین کے ذوق کی پذیرائی کے لئے حاضر ہیں:—

تارے مجھے کیا دیں گے محبت کے پیامات[1] ۔۔۔ یہ تو مرے قدموں کے ہیں دُھندلے سے نشانات

انگڑائی جو لیتی نہ تنک ظرفیٔ منصور ۔۔۔ اُٹھتے نہ اٹھائے سے انا الحق کے حجابات

ہموار ہو ماحول تو پورے ہوں ارادے ۔۔۔ شفاف ہوں رستے تو جلا پائیں خیالات

بیرن کے پیام بہار لاتی تھیں ۔۔۔ برس نہ پڑتے گھٹاؤں پہ ہم تو کیا کرتے

اس آخری شعر کو اگر امیرؔ و داغؔ بھی سنتے تو طرفہ کو گلے سے لگا لیتے!

قربانی

"قربانی" از مہدی علی صدیقی ضخامت ۲۹۲ صفحے، سفید کاغذ اچھی طباعت، جلد گرد پوش کے ساتھ قیمت چار روپے، ملنے کا پتہ:— کتاب منزل، لاہور

مشہور افسانہ نگار ڈکنس "DICKENS" نے فرانسیسی انقلاب کی (TALES OF TWO CITIES) میں ترجمانی اور عکاسی کی تھی۔ جناب مہدی علی صدیقی نے اسی ناول کو ماخذ بنا کر ہندوستانی انقلاب کو "قربانی" میں مصوّر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

مصنف کی زبان سادہ اور سلیس ہے، وہ بات کو خواہ مخواہ فلسفہ کا رنگ دے کر اینچ پیچ سے کہنے کا بھی عادی نہیں ہے، پلاٹ بھی کافی مربوط ہے بس کہیں کہیں ذرا ذرا خلا محسوس ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ خوبی کی بات یہ ہے کہ ناول نگار لذت و پاکیزگی کے اخلاقی حدود کو پہچانتا ہے، اور ناول کو دلچسپ بنانے کے لیے "لذتیت" سے اندھا دھند کام نہیں لیتا۔

چند جملوں کے تیور دیکھئے:—

"ایک ہلکی سی آڑی شکن جو پیشانی میں غور کرتے وقت پڑ گئی تھی، ٹھیری اور مٹ گئی" (صفحہ ۴۴)

"اُن کی بے آب آنکھوں میں مدتوں کے بدنی کے آثار پیدا ہو رہے تھے"— (صفحہ ۴۷)

"گر قانون کا نقطۂ نگاہ تبدیل ہوتا ہے تو انصاف کا معیار کیونکر قائم رہ سکتا ہے۔" (صفحہ ۱۷)

ایسے جملے "شعر" کا لطف اپنے اندر رکھتے ہیں:

(صفحہ ۷) "حمیدن ماما نے پیچھے سے اضافہ کیا" اس میں "ذم" کا پہلو پایا جاتا ہے، کہنا یوں چاہئے تھا کہ "حمیدن ماما نے پیچھے سے آن کر، یا پیچھے بیٹھے بیٹھے اپنی طرف سے یہ ٹکڑا لگا دیا، یا ان جملوں کا اضافہ کر دیا"———۔

(صفحہ ۴۹) "صبیحہ کا رنگ صاف تھا مگر ایک ہلکی چمپا کی کلی جیسی زردی جھلکتی تھی، چہرہ کسی قدر لانبا، ہونٹ پتلے مگر کسی قدر گلابی، بھویں خمدار، پیشانی چوڑی ... رخسار کی ہڈیاں کسی قدر اونچی جس سے چہرے کی لمبائی اور بڑھ جاتی ہے"

"ہونٹ پتلے اور کسی قدر گلابی" لکھنا تھا "مگر" کی ضرورت نہ تھی "مگر" ایسے موقعوں پر لاتے ہیں جب دونوں صفتوں

---

[1] "پیام" کی جمع "پیامات" صحیح نہیں ہے مگر شعر اس قدر خوب ہے کہ اس تسامح کو گوارا کیا جا سکتا ہے۔

میں تضاد کا امکان ہو ـــــــ مثلاً "آنکھیں چھوٹی مگر خوب صورت" "بدن گٹھیلا مگر پھرتیلا" ـــــــ سبیحہ کے ناک نقشہ کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے، وہاں "رخسار کی ہڈیاں" بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا ہے اس کو دوسرے لفظوں میں بیان کرنا چاہیے تھا ـــــــ (صفحہ ۳۱) "فقیروں کی چیخ پکار" "داد" کی کیا ضرورت تھی ـــــــ (صفحہ ۵۱) "وہ تمہاری بہو بھی جب سجدے پر سجدے کرتی ہے تو آگ لگ جاتی ہے مجھے ـــ" "میرے آگ لگ جاتی ہے" ہونا چاہیے ـــــــ صفحہ (۱۰۳) "اپنے اُلجھے ہوئے بستر پر اسی طرح گر گیا ـــــ" "اُلجھا ہوا بستر، آخر کیا بات ہوئی! کہنا یہ مقصود ہے کہ اپنے بے ترتیب یا شکنے ہوئے بستر پر اسی طرح گر گیا ـــــ یعنی اُس نے بستر کو ٹھیک طرح درست بھی نہیں کیا ـــــ (صفحہ ۱۰۴)

باب ہشتم کا عنوان "تلاطم" ہے جسے "طلاطم" لکھا ہے ـــــــ (صفحہ ۱۴۰) "موانع" کی جمع الجمع "موانعات" بنائی ہے ـــــــ (صفحہ ۲۵۱) "یہ دونوں ادارے عرصہ ہوا بالائے طاق ہو چکے تھے" "بالائے طاق" کے ساتھ "ہونا" نہیں آتا، یہاں "دونوں ادارے بے نام ونشان ہو چکے تھے، یا ٹوٹ چکے تھے" لکھنا چاہیے تھا ـــ اگر کوئی دفتر بند ہو جائے یا کوئی محکمہ ٹوٹ جائے تو یوں نہیں کہیں گے، "وہ محکمہ بالائے طاق ہو گیا" ـــــــ (صفحہ ۳۳۷) ـــ "یار اور کچھ کہو، اس پھانسی کی **جنجھٹ** سے بچ جائے" "**جنجھٹ**" تو اُلجھن یا مخمصے کو کہتے ہیں، اور پھانسی جو باعث ہلاکت ہوتی ہے اُسے "جنجھٹ" کہنا پھانسی کی **نوعیت** اور المناکی کی غلط تعبیر ہے ـــ

مہدی علی صدیقی میں ناول نگاری اور افسانہ نویسی کی کافی صلاحیت اور خاص سلیقہ پایا جاتا ہے، یہ ناول (قربانی) اس کی گواہی دیتا ہے، ہم اُن سے مستقبل میں اور زیادہ اچھے اور مفید ناولوں کی توقع رکھتے ہیں!

بریدِ فرنگ

"بریدِ فرنگ" از:ـ سید سلیمان ندوی ضخامت ۲۱۳ صفحات، کتابت، طباعت، کاغذ اور جلد ـــــــ ہر چیز عمدہ اور دیدہ زیب ـــ قیمت تین روپے آٹھ آنے، ملنے کا پتہ:ـ مکتبۃ المشرق، آرام باغ، کراچی ـ

ہندوستان کے مسلمانوں پر ایک ایسا دور بھی گزرا ہے جب کہ اُن کی سیاسیات کا محور "ترکوں کی حمایت" تھا، "الہلال" اور "کامریڈ" کے اُس زمانہ کے فائل کوئی اٹھا کر دیکھے تو "ترکی" کے ذکر سے اُن کے بہت کم صفحات خالی ملیں گے، یہی صدائے احتجاج تھی جس کی بازگشت "الوکیل" (امرتسر) اور "زمیندار" کی زبانِ صحافت سے سُنائی دیتی تھی ـ

پھر ایک ایسا دور بھی آ گیا کہ خلافت اور کانگریس کے ملے جُلے اجلاس ہونے لگے، انگریز کی دشمنی اور آزادی کی جدوجہد نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا تھا، مسلمان گاندھی جی کی "جے" پکارتے اور ہندو "علی برادران زندہ باد" کے نعرے بلند کرتے ـــــ اسی زمانہ (۱۹۲۰ء) میں ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک وفد انگلستان گیا، جس کے ارکان حسب ذیل اصحاب تھے:ـــ

(۱) مولانا محمد علی رئیس وفد (۲) علامہ سلیمان ندوی رکن (۳) انڈی پنڈنٹ کے ایڈیٹر سید حسین[1] رکن

---

[1] جو مصر میں بھارت گورنمنٹ کے سفیر تھے، اور تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا کہ وفات پا گئے!

(۴) شیخ مشیر حسین قدوائی رکن ـــــ حسن محمد حیات[1] صاحب سکریٹری ! ـــــ انگریز دل میں سے مسٹر ہارنی مین جو بمبئی کرانیکل کے بھی ایڈیٹر تھے، ہندوؤں میں مسز نائیڈو جو اس وقت لندن ہی میں تھیں اور نوجوان مسلمانوں میں شعیب قریشی صاحب اور عبدالرحمٰن صدیقی صاحب جو اس وقت انگلینڈ میں زیر تعلیم تھے۔ . . . خاص طور سے وفد کے کاموں میں شریک ہوئے" . . .

اس وفد کے مطالبات حسب ذیل تھے :ـــ

(۱) ترکی کے سلطان کی حکومت بحیثیت اس کے وہ مسلمانوں کا خلیفہ ہے قسطنطنیہ، تھریس، طوبیہ اور آرمینیا میں مستقل و آزاد قائم رکھی جائے۔

(۲) حجاز، شام و فلسطین اور عراق کو جہاں مسلمانوں کے مقدس مقامات ہیں اور جس کے مجموعہ کا نام جزیرۃ العرب ہے غیر اسلامی اقتدار سے محفوظ رکھا جائے اور اس طرح حکومت برطانیہ نے جو وعدہ اسلامی مقامات مقدسہ کی حفاظت کے متعلق کیا تھا اس کو وہ پورا کرے۔

(۳) ہندستان کی آزادی کے لئے رائے عامہ ہموار کی جائے کیونکہ بلادِ اسلامیہ کا تحفظ ہندستان کی آزادی کے بغیر ممکن نہیں۔

اس وفد کے ایک ممتاز رکن مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ابوالکمال سید عبدالحکیم[2] صاحب اور مولوی سید ابوظفر ندوی صاحب کو یورپ کے مختلف مقامات سے جو خطوط لکھے تھے، "برید فرنگ" انھی خطوط کا مجموعہ ہے، یہ خطوط زیادہ تر روزنامہ "ہمدم" (لکھنؤ) میں اور اس کے علاوہ "زمیندار" (لاہور) "خلافت" (بمبئی) اور "وکیل" (امرتسر) میں چھپا کرتے تھے۔

"برید فرنگ" کا مقدمہ خود فاضل مصنف[3] نے لکھا ہے اور اس زمانہ کی سیاست کے بحرِ ذخار کو چند صفحوں میں سمو دیا ہے، اس مقدمہ کا ہر صفحہ معلومات آفریں ہے۔ خطوط کی زبان سلیس اور سادہ ہے اور مکتوب نگار کو اس وقت اس کا خیال بھی نہ تھا کہ یہ مکاتیب کتابی شکل میں کبھی چھپیں گے بھی ؟ اس لئے ان میں تکلف نہیں پایا جاتا۔

لطفِ بیان اور زورِ قلم کے چند نمونے :ـ

ـــــ "یہاں (دمشق) کا ہر پتھر تاریخ کا ایک صفحہ ہے گویا دہلی مرحوم کا نقش مرقوم ہے"

ـــــ "ترکی ارکانِ صلح پیرس میں ٹھیرے ہیں، ترکی کی طرف سے صلحنامہ کا جواب تیار ہو رہا ہے لیکن بہترین جواب وہ ہے جو توفیق پاشا کی زبان سے نہیں بلکہ مصطفےٰ کمال پاشا کے دست و بازو سے ملیگا۔

ـــــ "ایشیا لُٹ کر یورپ آباد ہوا ہے، ہمارے گھر خالی ہوتے ہیں تو یہاں کے گھر بھرے ہیں، ہم ننگے ہوئے

---

[1] غالباً یہ وہ صاحب ہیں جو علی گڑھ کالج میں بزمانۂ طالب علمی "لارڈ حیات" کے نام سے مشہور تھے :
[2] مہتمم دار المصنفین اعظم گڑھ [3] مصنف کے رشتہ میں چچا ہوتے ہیں !

ہیں تو یہاں ریشم و سنجاب کی بہار آئی ہے ..... ہمارے گھر غم خانے ہیں تب یہاں یہ عشرت خانے سجے ہیں۔

——"ٹھیک اسی وقت جب انگریز مصر میں بیٹھ کر شریف حسین سے عرب شہنشاہی کا معاہدہ کر رہے تھے وہ یورپ میں جرمن کے یہودیوں کو فلسطین کی نذر پیش کر کے سارے یورپ کو اپنے ساتھ ملا رہے تھے اور آخر یہودیوں نے جرمن کے خلاف سازش کر کے اس کو تباہ کر ڈالا اور اُس کے بدلے میں فلسطین کے یہودی قومی وطن بنائے جانے کا اعلان انگریزی حکومت سے کرا لیا، یہی وہ تخم ہے جس سے فلسطین میں تیس سال کے بعد اسرائیل کی خود مختار حکومت کا نخل تناور پیدا ہوا اور جو آج ہمارے سامنے ہے۔"

ان خطوط سے بہت سی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں ——— یہ کہ مولانا سید سلیمان ندوی جہاز میں انگریزی بولنے کی مشق کرتے تھے اور مولانا محمد علی عربی بولنے کی ——— انگریزی کھانا ہندستانی مسلمانوں کو کب پسند آسکتا تھا، یہاں تک کہ مولانا محمد علی مرحوم نے باورچی خانہ میں جاکر خود گوشت بھونا[1] ——— ٹبرلی (واقع ڈربی شائر) میں ہندستانی طلبہ نے ایک مشاعرہ منعقد کیا، جس کی شمع انجمن (یعنی میر مشاعرہ) مسز سروجنی نائیڈو تھیں اس مشاعرے میں ہندستان کی تمام مشہور زبانوں کی نظمیں پڑھی گئیں اور علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی اپنی نظم پڑھ کر سنائی۔

انگریز کی چالاکی اور باخبری کا اندازہ ان جملوں سے ہوتا ہے:۔

"انڈر سکریٹری صاحب نے جو کبھی بنگال کے گورنر رہ چکے ہیں، فرمایا کہ مقاماتِ مقدسہ کے دائرے میں تم عراق کو کیوں کر داخل کرتے ہو، زیارتِ مقابر تو تمہارے ہاں جائز نہیں ——— بڑا مولویانہ اعتراض تھا، محمد علی صاحب نے کہا ہاں ہمارے ہاں ایک فرقہ اہلِ حدیث کا ایسا ہے ورنہ تمام مسلمان اس کو جائز اور ثواب سمجھتے ہیں، خصوصاً شیعہ فرقہ زیارتِ عراق کو ضروری جانتا ہے، بہر حال یہ کوشش کسی ایک فرقہ کے خیال کے مطابق نہیں بلکہ تمام مسلمان فرقوں کی طرف سے ہے، خواہ اُن میں باہم کسی قدر جزئی اختلاف ہو۔"

اب سے تیس برس پہلے لندن کی اخلاقی حالت کیسی تھی؟ ایک ثقہ اور دیانت دار عالم کی عینی شہادت سنئے:۔

"انگریزوں کو فخر ہے کہ اُن کے اور صرف اُن کے ملک کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں قانوناً فاحشہ کا وجود نہیں لیکن عملاً اُن کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اُن کے ملک کا کوئی راستہ، گلی، چوراہہ، باغ، دریا، غرض ہر وہ مقام جہاں مادی جسم رہگزر پا سکتا ہو، اس ——— "شریف طبقہ" کے وجود سے محروم نہیں"

اشتراکیت کے بارے میں مفتی زادہ وقت کے یہ الفاظ پڑھئے:۔

"بابا! چہ می گوئی روش ہماں روش است کہ می دانی بالشوک نام دیگر ست، برائے ہماں شہنشاہی روس . . ."

---

[1] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید تمام ذہین آدمی کھانے کے شوقین ہوتے ہیں (م - ق)

اور تجربہ اور واقعات نے ثابت کر دیا کہ استان کی شہنشاہی نے جبرو ظلم الثانی میں زار کی ملوکیت کو منزلوں پیچھے چھوڑ دیا۔

" ہمارے جلسوں میں آرمینی شریک ہوتے ہیں اور اپنے مفروضہ واقعات سنا کر حاضرین کو برافروختہ کرتے ہیں، یہاں کے اخبارات اُن کے ایک ایک حرف کو شائع کرتے ہیں اور ہمارے جوابات پر ایک نظر بھی ڈالنا گناہ سمجھتے ہیں یہاں تک کہ اُجرت لے کر بھی اُن کو ہمارا کوئی مضمون چھاپنا گوارا نہیں ——" (صفحہ ۷۰) یہ ہے انگریزی صحافت کی دیانت کا عالم! اور تیس سال پہلے انگریز جس طرح مسلمانوں کا دشمن تھا، آج بھی اسی طرح ہے،

مولانا سید سلیمان ندوی کو یورپ کے اس سفر میں پروفیسر آرنلڈ، سعد زاغلول، پروفیسر براؤن[1]، امیر فیصل، موسیو فیران وزیر اعظم فرانس، لائیڈ جارج، وزیر اعظم برطانیہ، پاپائے اعظم، بلو مہارٹ[2]، موسیو کیلا دفرے اور دوسرے مشاہیر سے ملنے کے مواقع میسر آئے، ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور اور ڈاکٹر یوسٹس جن سے وہ کبھی ہندوستان میں نہ مل سکے، اُن سے بھی یورپ ہی میں ملاقات ہوئی! علامہ سید سلیمان ندوی کا یہ سفر تاریخ، سیاست اور تہذیب و تمدن کی معلومات کے اعتبار سے بھی ان کے لئے یقیناً فائدہ مند ثابت ہو۔

ان خطوط کو پڑھ کر مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ سے تنقید نگار کو جو عقیدت ہے اُس میں اور اضافہ ہو گیا کہ اس مرد مجاہد نے یورپ کی بڑی بڑی باجبروت اور صاحب اقتدار شخصیتوں کے سامنے اظہار حق میں کوتاہی نہیں کی!

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

(صفحہ ۱۵) (مقدمہ) "اور کیسے اٹکل کرتا رہا" "اٹکل کرنا" پہلی بار نظر سے گزرا۔—— (صفحہ ۴۴) "آرمینوں نے بجدر دیہ پھیلتا ہے" —— شاید صوبہ بہار میں اس طرح بولا جاتا ہے، ہم تو یوں بولتے ہیں۔ "آرمینوں نے بجدر دیہ بکھیرا ہے" —— (صفحہ ۵۷) "مسلمانوں کے قعر مذلت سے نکلنے کے لئے ان حوادث اور مصائب کے پُر تنبیہ وجود کی ضرورت تھی" یہ ترجمہ سا لگتا ہے اور اُس میں بھی "آورد" غالب ہے ——

واہ ری تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے (صفحہ ۶۱)

غالب کے اصل شعر میں "واہ ری" نہیں "دیکھنا" ہے! —— (صفحہ ۷۰) "سب سے پہلے وہ آرمینیا کے قتل عام کو لیکر بیٹھتا ہے" —— ایسے موقعوں پر "لیکر بیٹھنا" نہیں "لے بیٹھتا ہے" بولتے ہیں ——

"بریدِ فرنگ" کہنے کو تو خطوط کا مجموعہ ہے مگر حقیقت میں یہ اب سے تیس سال قبل کی ایک سیاسی دستاویز ہے اور جو آج بھی عبرت انگیز تحریروں کی افادیت اپنے اندر رکھتی ہے!

---

[1] سید صاحب نے لکھا ہے کہ پروفیسر براؤن ہماری ہمنوائی کرتے ہیں،

[2] برٹش میوزیم کے اُردو صیغہ کے انچارج، جو فصیح اُردو بولتے تھے —— مگر دوسری کتابوں میں یہ نام "بلوم ہارٹ" لکھا ہوا دیکھا گیا۔

[3] مشہور فرانسیسی اہلِ قلم

مصباح القرآن

"مصباح القرآن" از:- شیخ محمد نصیب بیرسٹرایٹ لا (گورداسپور) ؛ ضخامت ۲۰۰ صفحے؛ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ ملنے کا پتہ:- "دارالبلاغ" محمد نگر، اقبال روڈ، لاہور؛

"مصباح القرآن" ——— قرآن مجید کے مضامین کا انڈکس ہے، جسے شیخ محمد نصیب صاحب مرحوم نے تیار کیا تھا، صاحب "تفہیم القرآن" مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس کتاب کی تعریف کی ہے جو اس کی افادیت کے لئے قابلِ اعتماد سند ہے، قرآن کے مضامین کی اس انداز پر تبویب کی ہے:—

مثلاً "قرض حسنہ" پر کوئی شخص قرآنی آیات دیکھنا چاہتا ہے ——— تو یہ کتاب اس کی شکل کو اس طرح حل کرتی ہے:—

قرض حسنہ خدا کو دو ٢٨/٢ دو چند ثواب اور درجہ ٥٤/٢ ٣٣/٢ انفاق — خرچ کا صلہ ملے گا ٤/٥ ٥٤ اگر تم بڑے گناہوں سے بچو گے تو چھوٹے گناہ خدا معاف کردے گا ٥/٥

یہ کتاب بڑے کام کی چیز ہے، اور ہم نے اس سے خود فائدہ اُٹھایا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے مرتب اور مولف کے آخرت میں درجات بلند فرمائے (آمین)

فتنۂ مرزائیت

"فتنۂ مرزائیت" از:- محمد امیر الزماں خاں کشمیری (فاضل دیوبند) ضخامت ۱۷۲ صفحات قیمت ایک آٹھ آنہ ——— ملنے کا پتہ:- مجلس تبلیغ شعبہ دارالافتا مدرسہ دارالعلوم آرام باغ- کراچی ۱

فاضل مؤلف نے "بشارت" کے عنوان سے لکھا ہے:—

"۲۳ رمضان المبارک (۱۳۷۲ھ) بعد از نماز صبح قریب سات بجے فاروقی مسجد کے حجرے میں سو رہا تھا کہ یکایک خواب ہی میں یہ معلوم کرکے رونا شروع کیا (کہ میں سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک مجلس میں ہوں) کہ "یارسول اللہ فتنۂ مرزائیت حد سے بڑھ گیا ہے، یا رسول اللہ اس سے بچائیے" سرورِ کائنات علیہ افضل الصلوات نے ارشاد فرمایا کہ "رضیت باللہ رباً و بالاسلام دیناً و بمحمد نبیاً"

یہ وہ زمانہ تھا جب مولف اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں مصروف تھے کہ سوتے میں اُن کا نصیبہ جاگا اور حضور ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بارگاہِ قدس سے یہ بشارت ملی!

مولانا محمد امیر الزماں کشمیری نے بڑی محنت کے ساتھ قادیان کے جھوٹے نبی اور اُس کی "اُمت" کے بعض عمائد کے وہ اقوال جمع کئے ہیں، جن کو پڑھنے کے بعد یہی اور صرف یہی رائے قائم ہوتی ہے کہ "قادیانیت" کفر و ارتداد اور کذب و دجل کا دوسرا نام ہے — لائق مؤلف نے ان کفریہ اقوال کو کتابوں کے حوالوں کے ساتھ نقل کیا ہے ———

کتاب کے شروع میں صاحبِ تالیف نے ختم نبوت پر دلائل دیئے ہیں اور لغات کے حوالے سے "خاتم" کے معنیٰ بتائے ہیں ——— "قادیانیت" کیا ہے؟ اس کے سمجھنے اور معلوم کرنے کے لئے تنہا اس کتاب کا مطالعہ

لے اوپر کے ہندسوں میں سورت اور نیچے کے ہندسوں میں رکوع کے نمبر ہیں۔

کافی ہے، ہم نے اکتوبر کے فاران "میں جو قادیانیت" پر کی تھا اُس میں اِسی کتاب سے استفادہ کیا، اللہ تعالیٰ مولف کو جزائے دارین عطا فرمائے!

پردۂ شرعی کی چہل حدیث

"پردۂ شرعی کی چہل حدیث" مولفہ:- نور احمد، صفحات ۵۰ —— قیمت:- چھ آنے، ملنے کا پتہ:- ادارۂ اشرف العلوم مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی!

پاکستان کی مسلمان عورتوں میں بے حجابی، مغرب زدہ آزادی اور بے باکی کا فتنہ جس تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے اُس کی اگر بروقت روک تھام نہ کی گئی تو مسلمانوں کے گھرانے صحیح معنی "کلب گھر" بن کر رہ جائیں گے اور کراچی اور لاہور کا وہی حشر ہوگا، جو حشر آج طہران اور قاہرہ کا ہو رہا ہے!

مولانا نور احمد صاحب کی غیرت دینی اس فتنہ کو دیکھ کر صبر نہ کر سکی اور انھوں نے اِس رسالہ کو مرتب فرمایا جس میں قرآنی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے عورتوں کے حجاب کی شرعی حیثیت کو ثابت کیا ہے، اور یہ بتایا ہے کہ نامحرم مردوں اور عورتوں کا اختلاط اسلام میں جائز نہیں ہے!

یہ کتاب بڑے کام کی چیز ہے اور وقت کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کرتی ہے، اِس کا مطالعہ عورتوں اور مردوں سبھی کے لئے فائدہ بخش ہے!

الاخوان المسلمون اور اُن کی دعوت

"الاخوان المسلمون اور اُن کی دعوت" ترجمہ:- ظہ لبیب، صفحات ۸، چھپائی کتاب کا " دیدہ زیب! قیمت:- ایک روپیہ چار آنہ

ملنے کا پتہ: مکتبہ چراغِ راہ" کراچی ۵

شہید راہ حق حضرت حسن البنا رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۳۵ء میں "الاخوان المسلمون" کے پانچویں اجلاس میں جو خطبہ دیا تھا، یہ اُسی کا ترجمہ ہے، جس کے لئے جناب ظہ لبیب دررفیق دارالعروبہ راولپنڈی) مستحق تبریک اور لائق تحسین ہیں، ترجمہ نہایت شستہ، رواں اور سلیس ہے، فاضل مترجم نے عربی زبان کے جوش اور اثر کو اردو میں قائم رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے، اور ترجمہ میں یہ خصوصیت اِس لئے پیدا ہو گئی ہے کہ خود مترجم کے دل کی دھڑکنیں حسن البنا شہید کی دعوت پر "لبیک" کہتی ہیں، مقصد کی ہم آہنگی نے ترجمہ میں خلوص پیدا کر دیا ہے —— البتہ اس آیت:-

وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین —— "تجھ کو ہم نے بھیجا مہربانی کرکے جہان کے لوگوں پر" کا ترجمہ محلِ نظر ہے —— لائق مترجم نے قرآنِ مجید کے کسی قدیم اردو ترجمہ سے یہ عبارت نقل کی ہے، اُن کو خود ترجمہ کرنا چاہیے تھا کہ آیت کا "ORCE" کسی نہ کسی حد تک ترجمہ میں باقی رہتا! "رحمت" کا لفظ اپنے اندر جو وسعت رکھتا ہے "مہربانی" میں وہ بات کہاں آتی ہے،

حضرت حسن البنا شہید صحیح فکر اسلامی رکھتے تھے، فکر و بصیرت کے ساتھ ساتھ صاحبِ عزیمت بھی تھے، مصر کے معصیت کدے کی "تطہیر" کے لئے انھوں نے اُس وقت آواز اٹھائی جب کہ بیانو اور دائنس کے نغموں اور جام و مینا کی کھنک فضا پر چھائی ہوئی تھی، حق کی یہ آواز بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئی اور آج مصر ہی نہیں بلکہ دوسرے عربی ممالک

میں اُس کا وزن محسوس کیا جا رہا ہے ——

چند اقتباسات :-

—— "ہمیں بڑا ہی تعجب ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو ہم پورے خلوص اور بے نفسی کے ساتھ ان کاموں میں لگے ہیں اور دوسری طرف دنیا کے سارے کاموں سے فارغ اور نشۂ غفلت کے متوالے قہوہ خانوں اور بدکاری کے اڈوں کے چکر لگا رہے ہیں، اگر تم ان میں سے کسی سے پوچھو کہ آخر اس بے فائدہ بیٹھک کا مقصد کیا ہے تو وہ پوری بے باکی سے تمہیں جواب دے گا، "میں وقت کاٹ رہا ہوں" غریب اتنا نہیں سمجھتا کہ جو وقت کاٹتا ہے وہ خود اپنی زندگی کے درخت پر تیشہ چلا رہا ہے اس لئے کہ وقت ہی زندگی ہے . . . ."

—— "ایہا الاخوان المسلمون! جذبات کی ہیجان انگیزیوں کو عقل کی لگام دے رکھو اور عقل کی خواہش بیگانیوں کو جذبات کی آگ سے بھڑکاؤ، تخیل کو حقیقت و واقعیت کا پابند بناؤ اور حقیقت کو اپنے تابناک تخیل کی روشنی میں دیکھو! کسی ایک سمت بھی نہ جھک جاؤ کہ دوسری سمت سے بالکل ہی غافل ہو جاؤ، قوانینِ فطرت سے ٹکراؤ نہیں بلکہ انہیں مغلوب کرو، اُن سے فائدہ اُٹھاؤ اُن کے بہاؤ کی سمت کو بدل دو . . . ."

—— "اسلام کے سوا میں اپنا کوئی اور وطن نہیں جانتا، اس معاملہ میں ملک شام اور وادیٔ نیل دونوں میرے لئے یکساں ہیں، ہر وہ ملک جہاں اللہ کا نام لیا جاتا ہو میں اس کے حدودِ اربعہ کو اپنے وطن میں شمار کرتا ہوں . . . ."

مکتبۂ چراغِ راہ نے اس کتاب کو چھاپ کر اپنی دینی خدمات کی فہرست میں اضافہ کیا ہے، یہ کتاب زیادہ سے زیادہ اشاعت کی مستحق ہے!

اصلاح الاصلاح

"اصلاح الاصلاح" از:- ابر احسنی گنوری ضخامت ۱۴۴ صفحے مجلّد، قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ ملنے کا پتہ:- تابش ابن ابر احسنی رضا ٹیکسٹائل رام پور اسٹیٹ (یو۔ پی) —— جناب ابر احسنی گنوری کا شمار اُن اساتذہ میں ہوتا ہے جو فنِ عروض میں گہری بصیرت رکھتے ہیں، اس کتاب میں حضرت سیماب اکبرآبادی مرحوم کی تصنیف "دستور الاصلاح" پر محاکمہ کیا گیا ہے! اس محاکمے کے علاوہ کچھ اور بحثیں بھی درمیان میں آ گئی ہیں —— مثلاً یہ کہ سیماب مرحوم نے عاؔلی اکبرآبادی، خاؔک اجمیری اور ازلؔ عظیم آبادی سے بھی مشورۂ سخن کیا تھا، جس کا اعتراف نہیں کیا گیا —— مگر یہ بحثیں اُن کی وفات کے بعد بند کر دی گئیں، اور ہم بھی اُن سے صرفِ نظر ہی مناسب سمجھتے ہیں!

"اصلاح الاصلاح" یقیناً جناب ابر گنوری کے صاحبِ فن ہونے کی شہادت ہے، تنقید اور محاکمہ میں البتہ کہیں کہیں طنز زیادہ تیز ہو گئی ہے —— ہم اس تنقید و محاکمہ کے تین مختلف نمونے پیش کرتے ہیں:-

(۱) آغاز برہانپوری :- وہ جہاں نظروں میں ہیں نظریں ہیں سرِ دفِ طواف * اللہ اللہ یہ سماں اُن کے حریمِ ناز کا

اصلاح :- " " " " " " " دبدبہ " "

توجیہ سیماب مرحوم :- "سماں" ہلکا لفظ تھا "دبدبہ" سے تخیل میں شوکت پیدا ہو گئی

نقدِ آبر :— شوکتِ ظاہر ضرور پیدا ہو گئی، لیکن معنویت ختم ہو گئی "سماں" تو یہ ظاہر کر رہا تھا کہ حریمِ ناز کا سماں اتنا دلکش و حسین ہے کہ دونوں جہاں نظروں میں ہیں مگر پھر بھی نگاہیں حریمِ ناز ہی کا طواف کر رہی ہیں، ہمارے خیال میں "سماں" مصرع کی جان ہے "سماں" نکالنے کے بعد "سماں" ہی کا مترادف اس معنویت کو باقی رکھ سکتا تھا۔ "دبدبہ" کا اثر خوف و ہیبت ہوتا ہے یہاں اس کا کوئی محل نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ —! (صفحہ ۱۰۲)

آبر صاحب کی تنقید بالکل درست ہے، "دبدبہ" کا یہاں واقعی کوئی محل ہی نہیں ہے۔

(۲) کیفی :— پھر رونقوں پہ آنے لگا کاروبارِ عشق پھر اک نگاہ سلسلہ جنباں ہے آجکل (صفحہ ۷۷)

اصلاح :— پھر ہے جراحتِ جگر و دل میں اک خلش " " " "

توجیہ سیماب :— "رونق" کی جگہ "رونقوں" خلافِ محاورہ و فصاحت تھا اور کاروبارِ عشق کو نگاہ کی سلسلہ جنبانی سے کوئی تعلق نہ تھا، اب "نگاہ جراحتِ جگر و دل" میں صوری و معنوی دو ربطے پیدا ہو گئے۔

نقدِ آبر :— رونقوں عام طور پر لکھا اور بولا جاتا ہے کہ اس کے خلافِ محاورہ و فصاحت ہونے کی کوئی دلیل ہماری سمجھ میں نہیں آتی، کاروبارِ عشق کوئی تجارتی کاروبار نہیں کہ اس کو نگاہِ محبوب کی سلسلہ جنبانی سے کوئی تعلق نہ ہو، سیماب صاحب نے مصرعِ اولیٰ کاٹ کر ایک "امانت شاہی" مصرع لگا دیا جس نے کیفی کے شعر کی لطافت کو ختم کر دیا —— "پھر اک نگاہ" سے نگاہِ محبوب کا مفہوم بمشکل ادا ہوتا ہے۔

آبر صاحب کی تنقید درست نہیں ہے۔ "رونقوں" عام طور پر نہیں بولا جاتا، اسے سامعہ کو ناگوار محسوس ہوتا ہے! پھر "کاروبارِ عشق" کا "رونق پہ آنا" اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ذاتی تجارت عاشقی کا بازار گرم ہے، حضرت سیماب نے اچھا کیا کہ مصرعِ اولیٰ کو سرے سے بدل دیا۔

صفحہ ۸۳ —— پر جناب آبر نے لکھا ہے "مضطرب سہی" اور "مضطر سہی" میں کوئی معنوی فرق نہیں، حالانکہ معنوی فرق ہے —— "مضطرب" بیقرار کو کہتے ہیں اور "مضطر" مجبور کو! دونوں کے مصادر (اضطراب اور اضطرار) مختلف ہیں ——

(۳) آغاز :— یہ دمِ آخر تبسم عاشقِ جانباز کا خاتمہ ہی خاتمہ ہے تیری مشقِ ناز کا

اصلاح :— " " " " مضحکہ ہی مضحکہ ہے " " "

توجیہ سیماب :— عاشقِ جانباز کا تبسم دمِ آخر مشقِ ناز کا خاتمہ کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے البتہ تبسم میں مضحکہ کی شان پیدا ہو سکتی ہے، یعنی وہ مسکرا مسکرا کر کہہ رہا ہے کہ دیکھو! تمہاری مشقِ ناز تو ختم نہ ہوئی لیکن میرا جذبۂ جاں نثاری مکمل ہو گیا ——

نقدِ آبر :— ہمارے خیال میں آغاز کا مصرع اپنی جگہ بامعنی ہے، جس کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں اور یہ کہ ہمیں وہ جاں نثار تھے جو مشقِ ناز کو جان دینے کے وقت تک برداشت کرتے رہے، اب یہ جرأتِ عشق کسی اور میں نہیں نظر آتی اس لئے ہمارے بعد تیری مشقِ ناز کا خاتمہ ہی خاتمہ ہے۔ ۔ ۔ ۔"

یہ پورا شعر ہی قلمزد کر دینے کے قابل تھا، مفہوم بہت زیادہ الجھا ہوا ہے، آغاز کا مصرعہ اپنی جگہ بامعنی نہیں ہے اور اصلاح نے تو شعر کے "ابہام" میں اور اضافہ کر دیا —— حضرتِ سیماب کی اصلاح و توجیہ اور جناب آبر کی تنقید دونوں محلِ نظر

ہر مسلمان کا فرض ہے کہ
پین اسلامک سٹیمرشپ کمپنی لمیٹڈ
کمپنی کا بیڑہ
پین اسلامک سٹیمرشپ کمپنی لمیٹڈ

کے ذیل میں پورے حالات موجود ہیں

سی ایف اینڈریوز کی سوانح عمری

ہر بڑے تاجر کتب سے ملے گی

چراغ راہ

کراچی

"دو" کا گلتہ نظر ہے مگر اس آخری شعر

نے اس سارے حصے ہی کو مکدر کر دیا۔

کا جو پایا جاتا ہے وہ اس کا بیان محل نہیں

فاران
ماہر القادری

جلد ۲ —— نمبر ۱

ماہنامہ

فاران

جنوری سنہ ۱۹۵۳ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپیہ (پاکستانی) —— فی پرچہ ۱۰/

۸ روپیہ (ہندستانی) —— فی پرچہ ۱۱/

مقامِ اشاعت

دفتر فاران - کیمبل اسٹریٹ

کراچی نمبر ۱

نظم و ترتیب

حصۂ نظم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نقشِ اوّل

تاریخ میں یہ واقعہ بھی ایک "اعجوبہ" کی صورت میں یادگار بن کر رہ جائے گا کہ ایک مملکت صرف "اسلام" کے نام پر وجود میں آئی تھی، اُس مملکت کے ارباب اقتدار خدا کے فضل سے مسلمان تھے اور وہاں کی اکثریت بھی خدا اور رسولؐ پر ایمان رکھتی تھی —— مگر اُس جگہ مسلمانوں کو "اسلامی دستور" کے لئے مطالبہ کرنا پڑا۔

آنے والی نسلیں اس واقعہ کو تاریخ میں پڑھیں گی اور غرقِ حیرت ہو کر رہ جائیں گی کہ یہ بات آخر ظہور میں کس طرح آئی اور وہ کس قسم کے مسلمان تھے جن پر "دستورِ اسلامی" کی اہمیت واضح کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اس کے لئے بھلا کسی مطالبہ اور احتجاج کی ضرورت تھی؟ وہ کہ جن کے ہاتھوں میں زمامِ کار تھی اور اللہ تعالیٰ نے جن کو حکمرانی اور دستور سازی کا موقع دیا تھا، اُن کے کرنے کا کام ہی یہ تھا —— مگر تاریخ میں اس ورق کا بھی اضافہ ہو کر رہا، ان آنکھوں نے اس کشمکش کو بھی دیکھ لیا، اور نہیں کہا جا سکتا کہ ابھی اور کیا کیا دیکھنا باقی ہے۔

نومبر ۱۹۵۲ء کا دوسرا ہفتہ نہ صرف پاکستان بلکہ اسلام کی تاریخ میں یادگار سمجھا جائے گا جس میں پاکستان کے طول و عرض میں "اسلامی دستور" کے مطالبہ کی مہم انتہائی جوش مگر پورے نظم و ضبط کے ساتھ شروع کی گئی، پاکستان کے چھوٹے چھوٹے قصبوں میں ایسے ایسے شاندار جلوس نکلے ہیں کہ اُن بستیوں کی اگلی اور پچھلی تاریخ میں اُن کی نظیر نہیں مل سکتی اور سب سے زیادہ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس جوش و خروش، مطالبہ کی اس شدت اور جذبات کی اس گرما گرمی کے باوجود کسی مقام پر ذرا سا بھی کوئی ناخوشگوار واقعہ ظہور میں نہیں آیا،

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

جذبات کا یہ عالم یہی عالم تھا، مگر ایک قدم بھی ضبط و نظم کی حدوں سے باہر نہیں ہوا، اسلامی دستور کا مطالبہ کرنے والوں سے ہمیں اسی شریفانہ مظاہرہ کی توقع تھی۔

کراچی کا جلوس ہر اعتبار سے پاکستان کے دار الخلافہ کے شایانِ شان تھا، اللہ کی فوج کے یہ بے ہتھیار سپاہی ایک میل سے بھی کچھ زیادہ دُور تک صف بہ صف اور قطار در قطار نظر آ رہے تھے، وقار اُن کے پیروں کو چوم رہا تھا اور سنجیدگی اُن کی بلائیں لے رہی تھی، کیا ڈسپلن تھا، کیسی تنظیم تھی اور احساسِ ذمہ داری بھی! پولیس برسوں کی ٹریننگ کے بعد بھی اس قدر تنظیم آشنا (D i s c i p l i n e d) نہیں ہو سکتی جتنے یہ لوگ تھے!

یہ ہزاروں خدا پرست جمعہ کی نماز پڑھ کر روانہ ہوئے تھے، ان کی پیشانیوں میں سجدے جھم جھم کر رہے تھے، لبوں پر خاموش تکبیر اور صلوٰۃ و سلام تھا، اور کسی کسی کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے تھے، یہ خدا شناس اور حق پرست اہلِ جلوس زبانِ حالی سے کہہ رہے تھے ——— مالک! تو دلوں کا حال جانتا ہے، ہم اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے اس جد و جہد میں شریک نہیں ہوئے، مقصود صرف یہ ہے کہ جن آنکھوں نے باطل کے غلبہ کو دیکھا ہے وہ آنکھیں حق کے غلبہ کو بھی دیکھ لیں، ہم تیرے خالص دین کو پورے کا پورا قایم کرنے کے لئے نکلے ہیں، یہی ہمارا مقصد ہے اور یہی ہماری منزل ہے، اسی راستے میں زندگی اور موت چاہتے ہیں، جانتے ہیں کہ ہم بے سر و سامان ہیں، کمزور ہیں اور خستہ حال ہیں مگر تیری تائید و نصرت شاملِ حال ہو گئی تو پھر یہی کمزور ہاتھ منکرات کو مٹائیں گے اور معروف کو قایم کریں گے، بار الہا! ہماری مدد فرما، صبر و استقامت کے ساتھ عزیمت کی توفیق بھی عطا ہو!

سبز ہلالی جھنڈیاں ہاتھوں میں تھیں، موٹر سائیکلوں پر انتظام کرنے والے گھوم رہے تھے لاوڈ اسپیکر پر نہایت پُر جوش اعلانات ہو رہے تھے، اعلان کرنے والوں کی آواز میں سوز تھا، درد تھا، جوش تھا، خلوص تھا جیسے ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں سے نکل رہا ہے ——— مجاہدوں کے اسی جلوس میں یہ گنہگار بھی شریک تھا، تماشائی کی حیثیت سے نہیں سراپا مطالبہ اور مجسّم استجاج بن کر، زندگی میں پہلی بار یہ سعادت نصیب ہوئی، ہر قدم پر یہ محسوس ہوتا تھا جیسے میرے اگلے تیے گناہوں کا کفارہ ادا ہو رہا ہے ——— کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ؎

"ان الحسنات یذھبن السیئات"

اور نظامِ حق کے قیام کے لئے جد و جہد میں شریک ہونا یقیناً بہت بڑی نیکی ہے!

خدا جانتا ہے کہ فخر و نمود کا اظہار مقصود نہیں ہے، تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ کم و بیش دو ہائی گھنٹے تک زبان ذکرِ رسولؐ سے تر رہی، حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جمعہ کے دن مجھ پر درود کثرت کے ساتھ بھیجا کرو ——— جمعہ کا مُبارک اور مقدس دن تھا اور پھر مزید سعادت یہ کہ اُس جلوس میں شرکت میسر تھی جو مطالبۂ نظامِ حق کیلئے مظاہرہ کر رہا تھا، اس ماحول میں دل آپ ہی آپ چاہتا تھا کہ جس کے "اسوۂ حسنہ" کی بنیاد پر حکومت اور معاشرت کی تشکیل مقصود ہے، بس اُس پر مسلسل درود و سلام بھیجتے رہئے ——— میرے قریب جو نوجوان مطالبہ دستورِ اسلامی کی جھنڈی لیکر چل رہا تھا، بڑے جوش کے ساتھ بار بار کہہ رہا تھا:۔

"اس دُنیا میں باطل کامیاب ہو جاتا ہے ——— تو کیا اللہ تعالیٰ حق کو کامیاب نہ کرے گا؟"

پھر وہ مُٹھی بھینچ کر خود ہی جواب دیتا ——

ضرور کرے گا - - - - - - یہ کر رہی گا - - - - - - -

تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے، دیکھنے والے حیرت زدہ سے تھے، اُن کی آنکھوں نے زندگی میں شاید نہیں پہلی بار اس قدر باوقار اور منظم جلوس دیکھا تھا، وہ لوگ جو خلافت، کانگریس اور مسلم لیگ کے جلوس، ہنگامے اور جلسے دیکھ چکے ہیں، اُن کا یہ کہنا تھا کہ اتنا سنجیدہ اور مہذب جلوس ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔

لوگوں نے تو اب تک فخر و نمود کے مظاہرے دیکھے تھے، والنٹیر یونیفارموں (وردیوں) میں اکڑتے ہوئے چل رہے ہیں، لیڈر زندہ باد کے نعرے تحسین و ستائش کے نغمے میں چور ہوئے جا رہے ہیں، کارکن اپنے کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اہلِ جلوس کی نگاہیں چھجوں، روشندانوں اور دریچوں کی طرف اٹھی ہوئی ہیں تاکہ پردہ نشینانِ حرم کا لطفِ دیدار میسر آسکے، لیڈر، انتظام کرنے والے اور رضاکار اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کیمرہ مین بس انہی کی تصویریں کھینچے، مگر یہ ان لوگوں کا جلوس تھا جن کا مقصود رضائے الٰہی کے سوا اور کچھ نہ تھا، فخر و نمود کے سفلی تصورات سے یہاں دل و دماغ خالی تھے، کارکن اتنا کچھ کرنے کے بعد شرمائے شرمائے سے چلتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے حضور زبانِ حال سے ایسا عجز پیش کر رہے تھے کہ مالک! ہم سے اس کام میں جو کوتاہیاں ہوئی ہیں، انہیں معاف فرما دے، اور ہم نے کیا ہی کیا ہے جو تجھ سے کسی اجر کا مطالبہ کریں، جس راہ میں تیرے محبوب بندوں نے اپنے خون کا چھڑکاؤ کیا ہو اور اپنی جانوں کی قربانیاں پیش کی ہیں، اس راستہ کی خاک سے صرف ہمارے قدم آلودہ ہوئے ہیں، دعا یہ ہے کہ جب آزمائش کی سخت گھڑی آئے تو ہمارے قدموں کو ڈگنے نہ دیجیو ——— یا رب! تعالیٰ! اپنے خوف کے سوا ہر خوف ہمارے دلوں سے نکال دے، غم ہو یا خوشی، تنگی ہو یا کشادہ حالی، ہر حال میں تیری ہی رضا ہمارا مقصود رہے۔

جہانگیر پارک میں جا کر یہ جلوس ختم ہو گیا، ہزاروں آدمیوں نے عصر کی نماز ادا کی، وضو کے لئے پانی کا پہلے سے انتظام تھا۔ جلسہ گاہ میں لوگ جوق در جوق آ رہے تھے، شام ہوتے ہوتے پارک نصف کے قریب بھر گیا، یہاں تک کہ مؤذن نے نماز مغرب کے لئے "حی علی الصلوٰۃ" پکارا اور نمازوں کی صفیں جم گئیں، بجلی کے قمقمے اور ٹیوب روشن ہو گئے، نماز کے بعد سامعین ایک دوسرے سے مل کر بیٹھ گئے، حدِ نگاہ تک سر ہی سر نظر آ رہے تھے، اللہ کے کلام سے جلسہ کا آغاز ہوا، پھر مقررین نے تقریریں کیں، مسلم لیگ کے پرانے کارکن نے اپنی تقریر میں اس کا اعتراف کیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا مگر پاکستان بننے کے بعد اس وعدے کو پورا نہیں کیا گیا۔

آخری تقریر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تھی، مولانا کھڑے ہوئے تو جلسہ میں جوش و مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی، اس مفکر مجاہد نے ایک گھنٹہ تقریر کی، استدلال، وقار، سنجیدگی اور عزیمت کا ایسا امتزاج کم دیکھنے میں آیا ہے، جو کچھ کہا پوری جرأت و بے خوفی اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ کہا، مجمع ہمہ تن گوش تھا، باوقار سکوت! آدمیوں کے سمندر میں بس ایک ہی آواز سنائی دے رہی تھی اور حاضرین کے دل کی دھڑکنیں ایک ایک لفظ پر "لبیک" کہہ رہی تھیں۔

جلسہ اور جلوس کی کامیابی پر لوگ کیا کیا فخر کیا کرتے ہیں کہ ہم نے یہ کیا اور ہم نے وہ کیا، مگر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ارکانِ جماعت اسلامی کے خصوصی اجتماع میں جو کچھ کہا وہ اس بات کی ضمانت ہے کہ جماعت اسلامی حق و صداقت کی بنیادوں پر قائم ہوئی ہے، وہ دوسری سیاسی اور غیر سیاسی جماعتوں کے مقابلہ میں اپنا امتیازی

کردار اور منفرد مزاج رکھتی ہے، اُس کے پیشِ نظر کسی مخصوص شعبہ کی اصلاح نہیں ہے، اُس کا پروگرام نہ صرف مذہبی [illegible] تک محدود ہے اور نہ صرف معاشی انصاف اُس کی کوششوں کا محور ہے، وہ تو اللہ کے خالص اور پورے دین کو دنیا میں نافذ کرنا چاہتی ہے، اور اس کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام ہی زندگی کا فطری اور حقیقی نظام ہے، اور فکر و عمل کا یہی وہ مرکز ہے جس کے اردگرد دنیا کو جمع ہونا چاہیئے، جہاں اسلام نہیں وہاں نہ تو سچائی مل سکتی ہے اور نہ انصاف!

مولانا مودودی نے جماعتِ اسلامی کے کارکنوں سے کہا کہ رجوعِ خلق ایک بہت بڑی ذمہ داری اور ساتھ ہی خطرناک چیز ہے، دیکھنا! خلق کی قبولیت یا عدمِ قبولیت معیار نہ بننے پائے، خلق کو خوش رکھنے اور پیشوائی اور لیڈری کرنے کا چسکا بہت بڑا فتنہ ہے یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں تحریکیں سطحی ہو جاتی ہیں، آپ کو وہ نہیں بننا ہے جو مخلوق چاہتی ہے چاہے ساری مخلوق آپ سے کٹ کر علیحدہ ہو جائے، آپ کو خدا کی مرضی کے مطابق اپنے کو بنانا ہے، "رجوع الی اللہ" کا سر رشتہ ہاتھوں سے نہ چھٹنے پائے —— اور دیکھو! حکومت سے جو عام بیزاری پیدا ہو رہی ہے اُس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھانا اور نظم کو درہم برہم کرنے کی ذمہ داری سے خود کو بچانا، کام کرنے کی طاقت پہلے فراہم کر لیجئے اور جماعتِ اسلامی کے لٹریچر کے مطالعہ سے غافل نہ رہیئے!

جماعتِ اسلامی کا یہی وہ مزاج اور امتیازی وصف ہے جس نے ہمیں متاثر کیا ہے اور جس کے سبب ہمارے اندر یہ یقین پیدا ہو گیا ہے کہ اس جماعت کی بنیاد ہی حق پرستی پر رکھی گئی ہے، اس جماعت کا ساتھ دینا حق کی حمایت ہے اور جو کوئی اس جماعت کی دشمنی پر آمادہ ہے وہ یقیناً "صد من سبیل اللہ" کا مجرم ہے، اور اشتراکی گروہ، قادیانی بہروپئے اور مغرب زدہ ذہنوں کو تو جماعتِ اسلامی کی مخالفت کرنی ہی چاہیئے مگر قلبی اذیت اس وقت ہوتی ہے جب بعض مذہبی طبقوں کی طرف سے عناد و عداوت کا ظہور ہوتا ہے۔

پاکستان میں دستورِ اسلامی کا مطالبہ تنہا جماعتِ اسلامی ہی کا نہیں بلکہ یہاں کی اکثریت کا مطالبہ ہے، یہ سارے مسلمانوں کے دل کی آواز ہے، یہ وہ تمنا ہے جس کے سبب پاکستان وجود میں آیا ہے، اسلام کے نام کے طفیل میں مسلم لیگ کو مقبولیت حاصل ہوئی، ورنہ مسلم لیگ ۱۹۰۶ء سے [illegible] بھی موجود تھی ...... ہاں! تو عرض کرنا یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی "دستور سازی" کے معاملہ میں جو پارٹ ادا کر رہی ہے، اس کی نوعیت ایسی ہے جیسے "اقامتِ صلوٰۃ" تمام مسلمانوں پر فرض ہے، اور اس کی ضرورت سے ایک متنفس بھی انکار نہیں کر سکتا، تو ایک جماعت خاص طور پر اس کام کے لئے اٹھتی ہے، نماز کا لٹریچر وہ مہیا کرتی ہے، کارکن صبح سویرے محلوں اور گلی کوچوں میں گشت لگا کر "الصلوٰۃ خیر من النوم" کی صدائیں بلند کرتے ہیں، وضو کا، چٹائیوں اور مصلوں کا، موذن اور پیش اماموں کا انتظام وہ اپنے ذمہ لیتی ہے —— "جماعتِ اسلامی" اس مہم میں قریب قریب یہی فرض انجام دے رہی ہے، اب کسی کو اپنی "پیشوائی" یا "اقتدار" کے لئے جماعتِ اسلامی کی اس کوشش میں خطرہ نظر آتا ہو تو جماعت اس سلسلہ میں نہ کسی قسم کی صفائی پیش کرنے کے لئے تیار ہے اور نہ معذرت کی اُس سے توقع رکھی جائے، اور نہ وہ لوگوں کی دلدہی اور اُن کے خوش رکھنے کے لئے اپنے پروگرام کو بدل سکتی ہے، جو لوگ اس تحریکِ حق کو بھی گروہ بندیوں کے پیمانوں سے ناپتے ہیں، وہ اپنی روش اور طرزِ عمل سے اسلام کو نقصان پہنچا رہے ہیں، ہم پھر عرض کرتے ہیں کہ دستورِ اسلامی کا مطالبہ پاکستان کے عوام کا مطالبہ ہے، جماعتِ اسلامی ایک مخلص خدمت گزار کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔

نفاق و سازش

مطالبۂ دستورِ اسلامی کی مہم کے جوش و سرگرمی کو دیکھ کر منافقین کی صفوں میں تہلکہ مچ گیا ہے اور اس بدحواسی کے عالم میں ان سے عجیب عجیب مضحکہ انگیز، مجبوری اور بازاری قسم کی حرکتیں سرزد ہو رہی ہیں۔

کچھ منافق تو ابھی تک اوٹ ہی میں رہ کر سازشیں کر رہے ہیں ——— مگر بعض اہلِ نفاق بے نقاب ہو کر سامنے آ گئے ہیں، دستورِ اسلامی کی مہم کے جوش و خروش اور قبولِ عام کو دیکھ کر وہ اپنا غم ضبط نہ کر سکے، انھوں نے کھُل کر اعلان کر دیا کہ ہم "دنیادارانہ جمہوری دستور" چاہتے ہیں، ان اعلان کرنے والوں میں وہ بھی ہیں جو اپنے کو علامہ اقبال کا بہت بڑا عقیدت مند سمجھتے ہیں یا یوں کہئے کہ ظاہر کرتے ہیں، ہم ان کے بارے میں پہلے سے بھی "حسنِ ظن" نہیں رکھتے تھے، مگر اس کا سان گمان بھی نہ تھا کہ یہ نام نہاد "عقیدت مندانِ اقبال" اسلام سے اس قدر بیزار ہیں، اور اسلام کے غلبہ کو وہ کسی طرح گوارا ہی نہیں کر سکتے، یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ ریاکاری کے نقاب چہروں سے اتر گئے، ورنہ ان چھپے ہوئے سازشیوں سے آگے چل کر شدید نقصانات کا اندیشہ تھا، اب یہ دشمنے "در آستین" نہیں رہے!

کتاب و سنت کی بنیاد پر دستور سازی کے مطالبہ کی مہم جاری ہو، ایسے وقت میں "دنیادارانہ جمہوری دستور" کا مطالبہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اسلام سے اپنے دلوں میں سخت کد اور شدید عناد و عداوت رکھتے ہیں، اور حیرت ہے کہ ان دشمنانِ اسلام کے نام مسلمانوں جیسے ہیں، اسلامی سوسائٹی کو آستین کے ان سانپوں سے ہشیار رہنا چاہئے۔

تعلیماتِ اسلامی بورڈ کے ارکان اور اربابِ اقتدار کے مابین جب بنیادی سفارشات پر تبادلۂ خیال ہو رہا تھا اسی دوران میں ایک خطرناک سازش کا ظہور ہوا مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ از بروقت فاش ہو گیا، ہم اس سلسلہ میں صرف اس اشارہ پر کفایت کرتے ہیں کہ علماء کرام اپنے فرض کو پہچانیں اور دستور کے معاملہ میں اپنے موقف پر پوری استقامت کے ساتھ جمے رہیں ——— اسلام اور خدا اور رسول ہی کے نام پر ان میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے ——— اُف! یہ جاہ پرست واعظ!

؎ چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

ہماری صحافت

مطالبۂ دستورِ اسلامی کی آواز سے پاکستان کے در و بام گونج رہے ہیں، مگر افسوس ہے کہ دو چار اخباروں کو چھوڑتے ہوئے پاکستان کے قریب قریب تمام اخباروں نے ان خبروں کا "بلیک آؤٹ" کیا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں! یہ چیز صحافتی دیانت کے خلاف ہے، اخبارات عوام کے ترجمان ہوتے ہیں، "دستورِ اسلامی" کا مطالبہ پاکستان کے عوام کا مطالبہ ہے پس اخبارات کا فرض تھا اور ہے کہ اس مطالبہ کے سلسلہ میں جو مہم جاری ہے اور جو کوششیں ہو رہی ہیں، اس کی تفصیلات اور کارروائیاں اپنے یہاں شائع کریں ——— کرکٹ کے میچوں کی لمبی لمبی تفصیلات کے لئے وہ اپنے اخبارات میں جگہ نکال سکتے ہیں، فلم، موسیقی اور رقص کے مقابلوں کی روداد ان کے یہاں چھپ سکتی ہے لیکن اسلامی دستور سازی کی مہم کی اشاعت کا سوال آتا ہے تو ان کا دریائے صحافت یکایک پایاب ہو جاتا ہے، حیرت سب سے زیادہ اس کی ہے کہ ان اخباروں میں چپراسیوں سے لیکر ایڈیٹروں اور پروپرائٹروں تک سب، اللہ کے فضل سے مسلمان ہیں، کیا ان لوگوں کو اس کا ذرا سا بھی خیال نہیں آتا کہ ان کو ایک دن اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے، قیامت کے دن ان سے پوچھا جائیگا

ر پاکستان میں جب خدا کے نیک بندے اسلامی دستور کا مطالبہ کر رہے تھے، بتاؤ! تم نے اس سلسلے میں کیا کیا؟ تمہاری صحافت نے، قلم نے، کاغذ نے، پریس نے اور ذہن و فکر نے اس سلسلے میں کتنی خدمت انجام دی ——— کیا "بڑے آدمیوں" کی چشم کرم ان کی طرف سے کوئی معذرت پیش کر سکے گی؟ کیا اُن کی آمدنی کے رجسٹر، اشتہارات کی منفعت اندوزیاں، اور دوسری مصلحت اندیشیاں اور راحت سامانیاں اُن کو آخرت کے مواخذے سے بچا لیں گی؟ اس دنیائے فانی کی شہرت اور عیش و راحت کی عمر ہی کتنی ہے؟ آخر ایک دن مرنا ہے اور خدا کے سامنے جانا ہے، اس دن کے لئے ہمارے اہلِ صحافت اور ارباب قلم جواب سوچ رکھیں!

روزنامہ "امروز" (کراچی) کی پالیسی سے شدید اختلاف کے باوجود، ہم اُس کے ساتھ حُسنِ ظن رکھتے تھے کہ وہ گھٹیا درجہ کی صحافت اور اوچھی سیاست کی سطح تک اُتر کر نہیں آ سکتا مگر اسلامی دستور سازی کے مطالبہ کی مہم کو دیکھ کر وہ بھی بدحواس ہو گیا، اور اس خصوص میں اُس نے جو زبان، طرزِ نگارش اور اندازِ بیان اختیار کیا ہے وہ شریف صحافیوں کو کسی طرح زیب نہیں دیتا۔ کراچی میں "مطالبہ دستور اسلامی" کے سلسلہ میں جو تاریخی جلوس نکلا اور جلسے منعقد ہوئے، وہ اپنے وقار، سنجیدگی، معقولیت، تہذیب و شائستگی اور حُسنِ انتظام کے اعتبار سے مثالی اجتماعات تھے ——— مگر "امروز" نے جلوس اور جلسوں کی رُوداد کو جس طرح بگاڑ بگاڑ کر اپنے یہاں پیش کیا ہے، اور بالکل بازاری انداز میں جو پھبتیاں چُست کی ہیں اس نے جرنلزم کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگا دیا ہے۔

مگر ایسے اخبار نویس اور اہلِ قلم، کمیونسٹ، منافقین اور قادیانی ——— یہ ٹولیاں "اسلامی دستور سازی" کے خلاف کھُل کر اور چھپ کر تدبیریں بلکہ سازشیں کر رہی ہیں، ہمیں خاص طور سے "قادیانیوں" پر غصہ نہیں رحم آتا ہے کہ ایسی باتیں کر کے وہ اپنی قبر اپنے ہاتھوں سے کھود رہے ہیں اور اسلامی حکومت میں اُن کے ساتھ جو "ذمیوں" کا سلوک کیا جائے گا اُس اپنے حق کو بھی وہ اپنی ان ذلیل حرکتوں سے مجروح کر رہے ہیں، قادیانیوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی حد میں رہیں اور یہ نہ سمجھیں کہ اُن کی خفیہ سازشیں "راز" ہی میں رہتی ہیں!

"دستورِ اسلامی" کے مطالبہ کے محاذ کو کمزور بنانے اور مسلمانوں میں انتشار پھیلانے کے لئے "جماعتِ اسلامی" کو خاص طور سے نشانہ بنایا جا رہا ہے، وہ ارباب صحافت اور اہلِ قلم جن کو خرید لیا گیا ہے اور جو اپنے ضمیر دل کا سودا کر چکے ہیں، جماعتِ اسلامی کو بدنام کرنے کے لئے طرح طرح کے شوشے چھوڑ رہے ہیں! جماعتِ اسلامی اور اس کے امیر مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے خلاف کتابیں لکھوائی جا رہی ہیں، پوسٹر اور پمفلٹ چھپوا چھپوا کر تقسیم کئے جا رہے ہیں، شہر کی دیواروں پر عبارتیں لکھ دی گئی ہیں غرض جماعتِ اسلامی کو بدنام کرنے اور گرانے کے لئے ہر اوچھی سے اوچھی تدبیر عمل میں لائی جا رہی ہے، جماعتِ اسلامی کے لٹریچر سے ادھ کٹے جملے اور سیاق و سباق سے کچھ فقرے علیحدہ کر کے شائع کئے جا رہے ہیں، عوام مسلمانوں کو اس قسم کی سازشوں اور افترا پردازیوں سے ہشیار رہنا چاہیئے، جماعتِ اسلامی کی کسی کتاب کا جب کوئی حوالہ نظر سے گزرے، عوام کو چاہیئے کہ اس "عبارت" ہی پر اعتماد کر کے کوئی رائے قائم نہ کر لیں بلکہ پوری کتاب کو پڑھیں تاکہ حقیقت واضح ہو جائے، اور یہ ہم اس لئے لکھ رہے ہیں کہ ہماری سوسائٹی میں کچھ ایسے ضمیر فروش پیدا ہو گئے ہیں جو "لا تقربوا الصلوٰۃ" تو نقل کر دیتے ہیں مگر "وانتم سکاریٰ" کو چھپا دیتے ہیں۔

جماعتِ اسلامی کو جو کوئی شخص سمجھنا چاہے اُس کو چاہیئے کہ اس جماعت کے لٹریچر کا مطالعہ کرے، مزید اطمینان اور

ذوق رکھنے والے جماعت اسلامی کے کارکنوں کی زندگیوں کو جانچ کر اور پرکھ کر دیکھے کہ خدا اور بندوں کے ساتھ اُن کے تعلقات کیسے ہیں، اس کے بعد جماعت اسلامی، اُس کے امیر (مولانا مودودی) اور اُس کے ارکان کے بارے میں وہ رائے قائم کرنے کا مجاز ہے، جو لوگ مفسدہ پردازوں اور ضمیر فروشوں کی وسوسہ اندازیوں اور افترا پردازیوں پر اعتماد کر کے، تحقیق کے بغیر جماعت اسلامی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے ہیں وہ اپنی اس غفلت اور غلط اندیشی کے لئے اللہ کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔

ارباب حکومت اور عوام!

ہمارے ارباب اقتدار و ارباب حل وعقد کی پیہم غفلتوں اور غلط کاریوں کے سبب اُن کی ہر دلعزیزی جو روز بروز مجروح ہوتی چلی جا رہی ہے یہ چیز ہمارے لئے خدا جانتا ہے کہ کتنی اذیت کا باعث ہے، خدانخواستہ زیادہ دن تک یہی لیل و نہار رہے تو شدید سے شدید خطرے کا ظہور ممکن ہے، پاکستان کے دشمن ان حالات سے غافل نہیں ہیں اور وہ اس ابتری سے فائدہ اُٹھانے کی پوری کوشش کریں گے، اور کمیونسٹوں کی تو دلی تمنا ہی یہ ہے کہ پاکستان کے نظم و نسق میں کسی طرح ابتری پیدا ہو، یہ عنصر ہر غیر اشتراکی حکومت میں افراتفری، بددلی اور بے اطمینانی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کا ہر جگہ یہی دستور رہا ہے کہ عوام کی ہمدردی کے بھیس میں "حزب مخالف" کا الاؤ جلاتے ہیں، اور حکومت کی گرتی ہوئی ساکھ سے بروقت فائدہ اُٹھاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے عزائم سے پاکستان کو محفوظ رکھے۔

پاکستان کے عوام سے ہمیں یہ کہنا ہے کہ وہ حکومت کی ہر مخالف آواز پر کان دھرنا چھوڑ دیں اور ہر اُس شخص کو بُرا بھلا کہتا ہو، اپنا لیڈر اور ہمدرد نہ سمجھیں بعض لوگوں نے حکومت کو گالیاں دینا اپنا شیوہ بنایا ہے، اس طرح وہ عوام میں مقبولیت حاصل کرنے بیٹھے ہیں، عوام کا فرض ہے کہ وہ حکومت پر تنقید کرنے والوں کی زندگیوں کو پرکھ کر دیکھیں، اور اُن کی سیرتوں کو ٹٹولیں کہ کون کیا ہے؟ اگر موجودہ حکمرانوں کی جگہ کچھ غیر صالح لوگ، کمزور کردار کے انسان، موقع شناس و [illegible] اور مفاد پرست برسر اقتدار آ گئے تو یہ ایک نہایت بُرے قسم کا انقلاب ہوگا۔ بُرائی کی جگہ اچھائی کے آنے کا نام مفید انقلاب اور "نعم البدل" ہے اور اگر ایک بُرائی کی جگہ دوسری بُرائی نے لی تو یہ "نعم البدل" نہیں "بئس البدل" ہے؟

ارباب حکومت کی خدمت میں ہماری یہ گزارش ہے کہ وہ حالات کا صحیح جائزہ لیں اور اندازہ لگائیں کہ ہوا کا رُخ کدھر ہے؟ عوام کیا چاہتے ہیں؟ ان کے بارے میں لوگوں کے کیا احساسات ہیں؟ اور ان کے اسباب کیا ہیں؟ کیا ہوٹلوں، کلب گھروں، چائے خانوں، سینما ہاؤسوں، ریلوں اور بسوں میں عوام کی باتیں اُن کے کانوں تک نہیں پہونچتیں؟ اگر نہیں پہونچتیں تو اُن کے خفیہ اطلاعات کے محکمہ کی انتہائی نااہلی ہے اور اگر پہونچتی ہیں تو اصلاح حال کی تدبیر سے غفلت نہ تو ان کی ذات کیلئے مفید ہے اور نہ اس سے پاکستان کا بھلا ہو سکتا ہے، غیر ہر دلعزیزی کی فضا اور بے اطمینانی کے ماحول میں صرف اقتدار کی قوت سے کوئی حکومت زیادہ دن تک قائم نہیں رہ سکتی۔ اور نہ صرف زبانی وعدوں، کاغذی اسکیموں، لچھے دار تقریروں اور پولیس اور فوج کی پریڈ کے مظاہروں سے عوام کو مطمئن اور مرعوب کیا جا سکتا ہے۔

ارباب اقتدار اگر حکومت کی داخلی اور خارجی خرابیوں کی اصلاح کا بیڑا اُٹھالیں اور کسی توقف اور تامل کے بغیر کام شروع کر دیں تو فضا بہت تھوڑی مدت میں بدل سکتی ہے، لیکن اس کیلئے خلوص، ایثار اور سب سے بڑھ کر

یہ کہ خشیتِ الٰہی مددگار ہو ——— اور عالی ظرفی بھی! یعنی اپنی پچھلی غلطیوں کا کھلے دل سے اقرار کریں اور تلافی مافات کے لئے آغازِ کار کر دیں!

وہ لوگ جن کے ہاتھ رشوتوں اور ناجائز کمائیوں سے آلودہ رہے ہیں، چاہے وہ کتنے ہی بڑے عہدوں پر کیوں نہ ہوں، ان کی برطرفی اور علیحدگی تو فوراً عمل میں آنی چاہیئے اور اس کے بعد کھلی عدالت میں اُن پر مقدمہ چلانا چاہئے کہ دوسروں کو عبرت ہو اور مجرموں اور خائنوں کو اپنے کئے کی سزا مل جائے۔ فلسطین میں یہودیوں کے مقابلہ میں عربوں کی شکست کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اسلحہ اور رسد کی فراہمی خائنوں چوروں اور رشوت کھانے والوں کے ہاتھوں میں تھی، ایک پیسہ کی جگہ دس پیسہ میں جنگی سامان خریدا گیا اور وہ بھی ناقص اور نکما! اس کا جو نتیجہ ہوا، وہ سب پر ظاہر ہے، عرب کی تاریخ کا یہ سب سے زیادہ اندوہناک باب ہے یہ ایک ایسی ٹریجڈی ہے جس نے عرب قوم کو بہت بے آبرو کر دیا ہے! ہمیں اندیشہ ہے کہ خیانت، فرض ناشناسی، چور بازاری نفع اندوزی اور مفاد پرستی کی بدولت خدانخواستہ پاکستان کو بھی کہیں اس قسم کے خطرات میں مبتلا نہ ہونا پڑے۔

صوبہ پرستی کی وبا ملک کے طول و عرض میں تیزی کے ساتھ پھیلتی جا رہی ہے، دفتروں اور محکموں میں کھلے طور پر صوبہ نوازیاں ہو رہی ہیں، یہ چیز پاکستان کی سالمیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے ——— ان تمام خرابیوں کا علاج، صرف ایک ہے ——— اور وہ ہے

"اِسلام"

اگر "اسلام" کو پاکستان میں پورے کا پورا نافذ کر دیا جائے تو بہت سی خرابیوں سے تو فوری طور پر نجات مل سکتی ہے، مگر افسوس ہے کہ اربابِ حکومت "اسلام، اسلام" کے نعرے تو بہت کچھ بلند کرتے رہتے ہیں لیکن عملاً اسلام کے نفاذ کی کوشش نہیں کرتے اور وہ جماعت جس کا سنگِ بنیاد ہی دینِ حق کے قیام و نفاذ کے پروگرام پر رکھا گیا ہے، اُسے اپنا حریف مقابل خیال کرتے ہیں پاکستان کے دوستوں اور بہی خواہوں کو اربابِ اقتدار نے خواہ مخواہ اپنا اور پاکستان کا دشمن سمجھ رکھا ہے، وہ پاکیزہ کتابیں جو عوام میں صحیح اسلامی اسپرٹ پیدا کر سکتی ہیں اُن پر قدغن ہے، محکموں سے سرکلر جاری کئے گئے ہیں کہ عمالِ جماعتِ اسلامی کے پاس بھی نہ پھٹکیں، کتنے ہی ملازم صرف اس جرم میں کہ وہ جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھتے تھے نوکریوں سے برطرف کئے گئے ہیں ——— حالانکہ پرانے پرانے کمیونسٹوں کو گرانقدر مشاہروں پر ملازم رکھا گیا ہے، یہ عجیب قسم کا تضاد اور ناقابلِ فہم شوراشوری اور بے نمکی ہے! جماعتِ اسلامی کے گرانے کے لئے اسکیمیں تیار کی جاتی ہیں، اُن کے خلاف کتابیں لکھوائی جاتی ہیں اور نہ جانے کتنے بے ضمیر اور ایمان فروش صرف جماعتِ اسلامی کی مخالفت کے طفیل میں تنخواہیں پا رہے ہیں ——— جو جماعت پاکستان کی تعمیر میں سب سے زیادہ کارآمد اور مفید ثابت ہو سکتی ہے اُسی کو ہمارے اربابِ اقتدار نے اپنا حریف اور مخالف سمجھ رکھا ہے، عناد و عداوت کی انتہا ہے کہ جماعتِ اسلامی کو نیچا دکھانے کے لئے کمیونسٹوں تک سے اشتراک اور تعاون کیا جا رہا ہے۔

جماعتِ اسلامی کے رہنما سیفٹی ایکٹ کا نشانہ بن چکے ہیں اور مقدمہ چلائے بغیر اُن کو مہینوں قید و بند میں رکھا گیا ہے، اس جماعت کے اخباروں کی ضمانتیں ضبط کی جاتی ہیں تاکہ اُن کی آواز ہی بند کر دی جائے، ریاست سوات جو پاکستان ہی کا ایک علاقہ ہے اس میں جماعتِ اسلامی کے کارکنوں پر جو مظالم ہوئے ہیں اُس نے دورِ بربریت کی

یاد تازہ کردی ہے مگر ہماری حکومت نے اُن مظالم پر کوئی نوٹس تک نہیں لیا۔

آخر یہ کیا عدل و انصاف ہے، یہ کیسی جمہوریت ہے، یہ کونسا آئین ہے، جو اقتدار اس قسم کی بے اعتدالیوں اور زیادتیوں کے سہارے قائم ہو، اُس کو عوام میں مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل کس طرح ہو سکتی ہے۔

خدا کے جو نیک بندے نظامِ حق کے قیام کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں اُن کی خدمت میں ہم تبریک و تحسین کے ناچیز ہدیے پیش کرتے ہیں اور اُن کو اطمینان دلاتے ہیں کہ وہ اپنے کو تنہا نہ سمجھیں، پوری قوم اُن کے ساتھ ہے، حق بہت دن تک مظلوم نہیں رہ سکتا، سچائی ایک نہ دبنے والا جوہر ہے جس کو اُبھرنا ہی چاہیئے، ہاں! یہ ضرور ہے کہ حق کی راہ میں آزمائشوں سے ضرور سابقہ پڑتا ہے اور مشیت کا یہ ایسا ناقابلِ تغیر قانون ہے کہ انبیاء کرام تک کو اس سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا، حق کے لئے یہ مقدر کر دیا گیا ہے کہ وہ مظلومیت کی منزل سے گزرنے کے بعد ہی غالب و پیش ہوتا ہے، پس دینِ حق کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے والے اپنی مظلومیت پر ملول نہ ہوں اللہ کی رضا جب مقصود ہو تو پھر آزمائشوں پر ملال و شکوہ کیسا؟

یا

جاں بہ رضائے دوست می باید داد

یا

قطعِ نظر زیاری می باید کرد

تو "رضائے دوست" اگر مطلوب ہے تو پھر اس راہ میں جو مصیبت بھی آئے اُس پر صبر و عزیمت ہی لازم ہے، ہمیں کہا جا سکتا کہ حق کا راستہ روکنے والے اور کیا کیا فتنے کھڑے کرتے ہیں، حق پرستوں کو ہر فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے ——— اور بڑی سے بڑی قربانی دینے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کے حضور اپنا عجز اور نیاز پیش کرنے کی ضرورت ہے، خوف صرف اپنے معبود کا خوف اور رضا صرف اپنے خالق کی رضا اس عزیمت کے بعد دنیا کی تمام باطل قوتیں بھی اکٹھا ہو کر آ جائیں تو حق پرستوں کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں، بہت سے بہت یہ ہوگا کہ جانیں چلی جائیں گی، تو جانیں اپنی تھیں کب، یہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہم پہلے ہی بیچ چکے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اَحْیِنَا مُسْلِمِیْنَ وَاَسْتَفِدْنَا مُسْلِمِیْنَ وَاحْشُرْنَا مُسْلِمِیْنَ ؛

ماہرالقادری

۱۵ر دسمبر سنہ ۵۲ء

مرد اور عورت

کون کیا ہے ؟

(جناب بدر شکیب (بی اے، ایل ایل بی) کی تصنیف (اسلام اور جنسیات) سے یہ مضمون مقتبس کیا گیا ہے، لائق مصنف کی یہ کتاب بہت جلد منظر عام پر آ رہی ہے، جسے پاک لٹریچر کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۶۴ کراچی نمبر ۱ سے طلب کیا جا سکتا ہے)

یورپ میں انیسویں صدی کی وسط تک عورت کی حالت بہت گری ہوئی تھی۔ عیسائی مذہب نے اس کو مرد کے مقابلہ میں بڑی کمتر حیثیت عطا کی تھی جس کی وجہ سے نہ شادی بیاہ اور نہ طلاق و خلع کے معاملہ میں اس کی مرضی کو دخل تھا۔ حتیٰ کہ وہ جائداد کی مالک بھی نہیں بن سکتی تھی۔ لیکن جب عیسائی معاشرہ پر کلیسا کے اثر و نفوذ کا خاتمہ ہوا عورت کی معاشری حیثیت میں اضافہ ہونے لگا۔ صنعتی انقلاب نے عورت کے سماجی مرتبہ کو بہت بلند کر دیا۔ ہر معاملہ میں عورت مرد کے مد مقابل ہو گئی۔ زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں رہا جس میں مرد کے شانہ بشانہ عورت نے حصہ دیا ہو۔ پھر یورپی ممالک میں جمہوریت کے فروغ کی وجہ سے عورت نے سیاسی حقوق کا مطالبہ شروع کیا اور اپنے حقوق مرد سے تسلیم کرا لئے۔

عورت کی اس ترقی کا یہ نتیجہ ہوا کہ گھریلو زندگی اور خاندان کی عظمت کا خاتمہ ہو گیا۔ بچوں کی پیدائش اور نگہداشت ایک ناقابل حل مسئلہ بن گیا۔ عورتیں گھر سے نکل کر فیکٹری، کارخانہ یا دفتر کی زینت بن گئیں۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے مغربی محققین نے اس مسئلہ کی طرف اپنی توجہ منعطف کی کہ جسمانی اور ذہنی اور نفسیاتی لحاظ سے مرد اور عورت میں کیا فرق ہے اور دنیا میں دو مختلف اصناف پیدا کرنے میں قدرت کے پیش نظر کونسی مصلحت تھی۔ ان کی تحقیقات کے نتائج کو ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

حیاتیاتی نقطہ نظر سے مرد اور عورت کی جسمانی ساخت اور اعضاء کے اعمال کا تجزیہ کرنے سے یہ چیز ظاہر ہوتی ہے کہ مرد کا جسم ہر لحاظ سے مکمل ہے اور اس میں کوئی چیز تشنۂ تکمیل نہیں ہے۔ جسمانی ساخت کے اعتبار سے مرد اور عورت کے فرائض مختلف ہیں۔ مرد فعال ہے اور عورت میں انفعالیت ہے۔ عورت کی فطرت میں ماں بننا داخل ہے جس کے بغیر اس کی شخصیت کی تکمیل نہیں ہوتی اور نہ اس کی نسوانی خصوصیات اجاگر ہوتی ہیں۔ جنسی اختلاط کی مرد کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن عورت اس کے ذریعہ ایک بڑی ذمہ داری قبول کرتی ہے۔

اسی لئے مرد اور عورت کے تولیدی اعضا ایک دوسرے سے بالکل مختلف رکھے گئے ہیں کیونکہ قدرت دونوں سے علیحدہ کام لینا چاہتی ہے۔ مرد بیج بونے والا ہے اور عورت اپنے خون جگر سے کھیتی کو سینچنے والی ہے۔ استقرار حمل کے ساتھ ہی عورت کی ماہواری بند ہو جاتی ہے اور اس سے جنین کی نشو و نما کا کام لیا جاتا ہے۔ پھر رحم مادر میں بچہ اپنی غذا ماں کے ذریعہ حاصل کرتا ہے گویا عورت اپنی توانائیوں کا ایک حصہ اس کام کے لئے بھی نذر کرنے پر مجبور ہے۔ زچگی کے بعد ایام رضاعت میں اس کے سینہ میں جو دودھ پیدا ہوتا ہے وہ بچہ کی غذا کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ گویا جو خون عورت کے جسم میں طاقت اور توانائی کا ضامن

ہوتا ہے وہ دودھ میں منتقل ہو کر جدید نسل کی پرورش کا کفیل بنتا ہے۔ غرض آنے والی نسلوں کی پیدائش اور پرورش کی پوری ذمہ داری عورت پر عائد کر دی گئی ہے۔ اور اس چیز کو عورت کی فطرت اور جسمانی ساخت کا جزو بنا دیا گیا ہے۔ قدرت کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں۔ مرد کو جسمانی طور پر مجبور نہ کر کے قدرت نے اس کو ارتقاء تمدن کے کام کے لئے منتخب کیا۔ سب سے پہلے اس کے ذمہ یہ کام کیا گیا کہ وہ عورت کی جس سے قدرت افزائش نسل کا کام لیتی ہے حفاظت کرے، اس کے لئے غذا فراہم کرے اور اس کو آرام و آسایش پہنچائے کیونکہ اپنے کام یا قدرت اس سے جو کام لینا چاہتی ہے اس کی خاطر اس کو گھر میں رہنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ ویسے ہر عورت کو ایام ماہواری کے زمانہ میں پانچ سات روز آرام و سکون حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ان ایام میں عورت کی طبیعت اور اعصاب پر بڑا بار پڑتا ہے۔ اس کے بعد ایام حمل میں تو عورت کو بہت ہی آرام اور اطمینان کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اپنے جسم کے اندر وہ اپنی طاقت اور توانائی کے ذریعہ ایک نئی زندگی کو جنم دینے کے کام میں مصروف رہتی ہے۔ اس زمانہ میں اس کو زیادہ محنت و مشقت کے کام نہیں کرنے چاہئیں اور اپنے آپ کو ہر قسم کے بکھیڑوں اور دماغی اُلجھنوں سے بچائے رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد زچگی کا زمانہ ہے جس میں خود عورت ایک نئی زندگی حاصل کرتی ہے کیوں کہ اس کو ایک جاں گسل امتحان سے گزرنا پڑتا ہے پھر رضاعت کا زمانہ ہے۔ جب بچہ کی پرورش اور نشوونما کے لئے قدرت اس کو مجبور کرتی ہے۔ جو عورتیں مصنوعی طریقہ سے بچوں کی پرورش کرتی ہیں اور اپنے حیاتی فرائض کے انجام دینے سے پہلو تہی کرتی ہیں قدرت انہیں سزا دیتی ہے اور ان کی تولیدی قوتیں قبل از وقت ختم ہو جاتی ہیں۔

اب تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے تعلق سے ہم دیکھیں گے کہ اس معاملہ میں مرد نے زیادہ خدمات انجام دی ہیں یا عورت نے۔ کس کی صلاحیتیں اور توانائیاں اس کام کے لئے وقف رہی ہیں اور کس کی کاوشوں اور جانفشانیوں سے تمدن کا یہ سر بفلک قصر تعمیر ہوا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ مرد کی سعی پیہم اور تگ و دو نے تہذیب و تمدن کی اس عظیم الشان عمارت کو بنایا ہے۔ ابتدائے تاریخ سے آج تک سارے علوم و فنون، سائنس و طبیعیات، فلسفہ و مذہب، ادب و شاعری، آرٹ اور حسن کاری کی ترقی اور فروغ میں مرد کا حصہ رہا ہے۔ دنیا کی ساری ایجادات و اختراعات کا سہرا بھی مرد ہی کے سر ہے۔ ارسطو، افلاطون، روسو، والٹیر، شکسپیر، گوئٹے، گلیلیو، کوپرنیکس، نیوٹن، ایڈیسن، سعدی، حافظ، اقبال سب کے سب مرد تھے۔ مذہبی پیشوا، فلسفی، شاعر، حسن کار، سپہ سالار، انجنیر و موجدین سب کے سب مرد ہیں۔ حتیٰ یہ کہ بقول ڈاکٹر آسولڈ شوارڈ کے ان شعبہ ہائے زندگی میں بھی جو عورتوں کے لئے مخصوص ہیں مثلاً پکوان یا سلائی ان میں بھی عورتوں سے زیادہ مردوں نے ترقی کی ہے۔ آج دنیا کے بہترین ہوٹلوں میں پکانے والے مرد ہیں۔ اسی طرح خیاطی کے جتنے بڑے ادارے ہیں وہ سب مردوں کے ہاتھ میں ہیں۔ عورتوں کے لباس کی وضع قطع اور ان میں جو جدید اختراعات ہوتی رہتی ہیں وہ بھی مرد ہی کرتے ہیں۔

ذہنی اور دماغی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی مرد اور عورت میں بڑا فرق ہے۔ جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں مرد میں فاعلیت ہے اور عورت میں انفعال پذیری۔ مرد دینے والا ہے اور عورت لینے والی ہے۔ مرد عطا کرتا ہے اور عورت قبول کرتی ہے۔ اس اعتبار سے دونوں کی ذہنی اور نفسی کیفیات میں بھی فرق ہے۔ عورت سے چونکہ قدرت افزائش نوع کا کام لیتی ہے اس لئے اس کے جذبات اور احساسات بھی ایسے رکھے گئے ہیں کہ وہ زیادہ تندہی اور دلچسپی سے اپنے اس کام کو انجام دے۔ اس لئے اس کے جذبات میں زیادہ گہرائی ہے اور وسعت بھی۔ محبت کا جذبہ اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا گیا ہے۔ زندگی کی ہر منزل میں اُس کو اس جذبہ کے مظاہرہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ بیٹی، بیوی اور ماں کی حیثیت سے اس کی

محبت کی آغوش میں بڑی وسعت رکھی گئی ہے۔ اسکے فرائض کے تعلق سے اور اپنی انفعال پذیری کے لحاظ سے مرد کے مقابلہ میں عورت میں رحمدلی، ہمدردی، محبت، شیفتگی، خدمت گزاری کے جذبات زیادہ ہیں۔ اور اپنے کام کی نوعیت سے مرد کے اندر شجاعت و دلیری، استقلال و پامردی جیسے جذبات کی فراوانی ہے۔ ویسے جذبات اور احساسات کے تعلق سے مرد اور عورت دونوں برابر ہیں لیکن کسی میں کسی جذبہ کی شدت ہے اور کسی میں نہیں ہے۔

ان حیاتیاتی اور جسمانی و ذہنی حقایق کی روشنی میں یہ چیز متعین ہو گئی کہ خود قدرت نے مرد اور عورت کے دائرۂ عمل کو مختلف بنایا ہے۔ ایک سے نوعِ انسانی کی حفاظت کا کام لیا جاتا ہے تو دوسرے سے ارتقائے تمدن کا اور یہ دونوں مل کر انسانیت کی تکمیل کرتے ہیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں

"یہ وہ تقسیم عمل ہے جو خود فطرت نے انسان کی دونوں صنفوں کے درمیان کر دی ہے۔ حیاتیات، عضویات، نفسیات اور عمرانیات کے تمام علوم اس تقسیم کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ بچہ جننے اور پالنے کی خدمت کا عورت کے سپرد ہونا ایک ایسی فیصلہ کن حقیقت ہے جو خود بخود انسانی تمدن میں اس کے لئے ایک دائرۂ عمل مخصوص کر دیتی ہے اور کسی مصنوعی تدبیر میں یہ طاقت نہیں ہے کہ فطرت کے اس فیصلہ کو بدل سکے۔ ایک صالح تمدن وہی ہو سکتا ہے جو اولاً اس فیصلہ کو جوں کا توں قبول کرے، پھر عورت کو اس کے صحیح مقام پر رکھ کر اسے معاشرت میں عزت کا مرتبہ دے۔ اس کے جائز تمدنی و معاشی حقوق تسلیم کرے۔ اس پر صرف گھر کی ذمہ داریوں کا بار ڈالے اور بیرون خانہ کی ذمہ داریاں اور خاندان کی قوامیت مرد کے سپرد کرے۔"

ڈاکٹر آسوالڈ شوائز کا بیان ہے

"مرد کو ہر لحاظ سے عورت پر تفوق حاصل ہے۔ جو عورتیں مرد کی تقلید کرتی ہیں اور مردانہ مشاغل میں حصہ لینا اپنا حق سمجھتی ہیں وہ دراصل غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور ایسی چیز حاصل کرنا چاہتی ہیں جو ان کی فطرت اور انسانی تاریخ کی رو کے خلاف ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"مرد کے لئے گھر صرف رہائش کی جگہ ہے۔ اس کا کاروبار، اس کے دوست احباب، اس کا کلب اور سماجی تقاریب اس کے عمل کے مختلف دائرے ہیں لیکن عورت کے لئے گھر اس کی جان ہے۔ اس کے لئے کلب اور مردانہ یا زنانہ مجالس کی ضرورت نہیں ہے۔ گھر کے بغیر عورت کی زندگی ہی نہیں۔ وہ گھر کی زینت اور اس کی روشنی ہے" ۱؎

مشہور فرانسیسی سرجن ایلکسس کارل جو نوبل پرائز کا حامل ہے اپنی عہد آفریں کتاب MAN THE UNKNOWN میں تحریر کرتا ہے:-

"عورت کو اس کے تولیدی فرائض کی اہمیت پوری طرح واضح نہیں کی گئی۔ خود اس کی نسائیت کی تکمیل

۱؎ Psychology of Sex

کے لئے اس فرض کی بجا آوری لابدی ہے۔ اس لئے عورت کو پیدائش اولاد کے کام سے پھیرنا جہل اور لغو ہے۔
اسی طرح لڑکیوں کو لڑکوں کی طرح ذہنی اور جسمانی تربیت دینا بھی صحیح نہیں ہے۔ معلمین کو خاص طور پر مرد اور عورت کی جسمانی ساخت، ذہنی اور نفسی اعمال اور حیاتیاتی فرائض کی نوعیت پر گہری توجہ مرکوز کرنا یوں لازمی ہے کہ ان کے بغیر تمدن کی تعمیر ناممکن ہے۔"

مشہور برطانوی فلسفی اور مفکر انتھونی یم لڈ وڈیسی اپنی شہرۂ آفاق کتاب WOMAN : A VINDICATION میں تحریر کرتا ہے:۔

" اس امر پر زور دینا بہت ضروری ہے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی زندگی کا مقصد وحید پیدائش اولاد ہے۔ والدین کا یہ فرض ہے کہ اپنی لڑکیوں کو اس فرض کی انجام دہی کے لئے ابتداء ہی سے تیار کریں۔ دنیا کے دوسرے بڑے سے بڑے کام کا نمبر بعد کا آتا ہے۔ جو لوگ نوجوان عورتوں کو اپنی غلط بیانیوں سے یہ باور کراتے ہیں کہ پیدائش اولاد سے بہتر دنیا میں اس کے لئے دوسرے مشاغل موجود ہیں وہ نہ صرف عورت کے بلکہ نوع انسانی کے دشمن ہیں۔"

اسی کتاب میں ایک اور جگہ اس خیال کا ان الفاظ میں اعادہ کیا گیا ہے:۔

" زندگی کے کاروبار اور بکھیڑوں میں عورت کو اس بری طرح مصروف دیکھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے اور صاف و صریح الفاظ میں کہ جو لوگ عورت کو یہ سکھلاتے ہیں کہ دنیا کے دوسرے کاروبار میں اس کا حصہ لینا ضروری ہے اور جو زندگی اور اس کی گہرائیوں سے ہٹ کر عورت کے سامنے نسائیت کا علیحدہ معیار پیش کرتے ہیں اور جو اس کو مرد اور اولاد سے مطابقت پیدا کرنے کے سوا کسی اور شعبۂ حیات میں مسرت و آسودگی اور آسائش کے سبز باغ دکھلاتے ہیں وہ نہ صرف دروغ گو ہیں بلکہ ناعاقبت اندیش اور مجرم ہیں۔"

اسلام نے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے اسی امر کا اعلان کیا اور عورت پر مرد کی فوقیت کو تسلیم کیا۔
قرآن مجید میں محکوم ہے

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ

ترجمہ:۔ مرد عورتوں پر قوام ہیں اس فضیلت کی بنا پر جو اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر عطا کی ہے اور اس بنا پر کہ وہ ان پر (مہر و نفقہ کی صورت میں) اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ

ترجمہ:۔ صالح بیویاں شوہروں کی اطاعت گزار اور اللہ کی توفیق سے شوہروں کی غیر موجودگی میں ان کے ناموس کی محافظ ہیں۔

خاندان کی سالمیت اور عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے مرد کو حاکم اور نگران تسلیم کرنا ضروری ہے جس کے بغیر تمدن کا ارتقا ناممکن ہے۔ اور یوں بھی جو شخص خاندان کی پرورش کا ذمہ دار اور اس کے سیاہ و سفید کا مالک ہے اسی کو

خاندان کے دوسرے افراد پر فضیلت بھی ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں شارع اسلام کا حکم بھی ملاحظہ ہو:۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ التحیات والتسلیم نے فرمایا تم میں سے ہر ایک نگراں ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے متعلق باز پرس کی جائے گی۔ امیر اپنی امارت کا نگراں ہے اور خاوند اپنے گھر والوں کا نگراں اور بیوی اپنے خاوند کے گھر اور اس کے بچوں کی نگراں۔ پس ہر ایک تم میں سے اپنی اپنی رعیت کا نگراں ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق باز پرس کی جائے گی۔

عورت کا اصلی مقام گھر ہے

خاندان کی وحدت اور تنظیم کی خاطر ایک ہمہ وقتی نگراں کی ضرورت ہے جس کے ذمہ نہ صرف گھر کا انتظام و انصرام، بچوں کی نگہداشت اور پرورش ہے بلکہ شوہر کے لئے چین اور آسودگی کا فراہم کرنا بھی ہے تاکہ تفکرات سے آزاد رہ کر مرد کشمکش حیات میں حصہ لے سکے۔ خاندان کے لئے روزی کا انتظام کرے اور اسی طرح ارتقاء تمدن میں حصہ لے۔ اس کام کے لئے قدرت نے عورت کو منتخب کیا ہے جو اپنی فطری صلاحیتوں اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے اس کام کے لئے موزوں بھی ہے۔ اسلام نے عورت کے دائرۂ عمل کو گھر تک محدود کیا ہے۔ اس کو گھر کی ملکہ بنایا گیا ہے۔

مغربی عورت نے جب سے زندگی کے میدان میں مرد کے شانہ بشانہ حصہ لینا شروع کیا ہے گھر کا تصور ہی ختم ہو گیا اور خاندان کا شیرازہ بکھر گیا جس کا آج مغرب میں ماتم کیا جا رہا ہے۔ عورت جب تک نا کتخدا ہے اس کے والدین اور سرپرست اس کے نگراں ہیں اور شادی کے بعد اس کا شوہر۔ لیکن اگر اس کو کھلے بندوں باہر پھرنے کی اجازت ہے خواہ کسب معیشت کی خاطر ہو یا کسی اور وجہ سے تو اس پر کسی طرح کا کنٹرول باقی نہیں رہ سکتا۔ لیکن بعض صورتوں میں عورت گھر سے باہر نکلنے پر مجبور ہے جیسے خاندان کا کوئی سرپرست نہ ہو یا سرپرست کی بیماری یا معذوری ہے یا ایسی دوسری ناگزیر صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ عورت کو گھر سے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ ان صورتوں میں اسلام نے عورت کو باہر نکلنے کی اجازت دی ہے۔

اس سلسلہ میں شارع اسلام کے احکام درج ذیل کئے جاتے ہیں:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی عورت شوہر کی مرضی کے خلاف گھر سے نکلتی ہے تو آسمان کا ہر فرشتہ اس پر لعنت بھیجتا ہے اور جن وانس کے سوا ہر چیز جس پر سے وہ گذرتی ہے اس پر پھٹکار بھیجتی ہے جب تک کہ وہ واپس لوٹ نہ آئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک عورت کے لئے جو اللہ پر ایمان رکھتی ہے اور یوم آخر کو مانتی ہے جائز نہیں ہے کہ وہ تین دن یا تین دن سے زیادہ کا سفر کرے بغیر اس کے کہ اس کے ساتھ اس کا باپ یا اس کا بھائی یا اس کا خاوند یا اس کا بیٹا یا کوئی محرم مرد ہو۔

آپؐ نے فرمایا کہ ایک عورت کے لئے ایک دن اور رات کا سفر بھی بغیر محرم کو ساتھ لئے جائز نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تم کو اجازت دی ہے کہ تم اپنی ضروریات کے لئے گھر سے نکل سکتی ہو۔

ان قیود اور پابندیوں کے بعد اسلام نے عورت کو سماج میں ایک ایسا بلند مقام عطا کیا جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب یا قوم میں نہیں ملتی۔ اس کو دیوانی اور فوجداری کے معاملات میں مرد کے مساوی حقوق عطا کئے گئے۔ وہ جائداد کی مالک بن سکتی ہے اور اس کا انصرام خود کر سکتی ہے۔ نکاح اور خلع کے اس کو حقوق عطا کئے گئے۔ ان حقوق کے تعین

میں اسلام نے تین امور کو ملحوظ رکھا جن کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے یوں بیان فرمایا ہے :-

۱— مرد کو جو حاکمانہ اختیارات محض خاندان کے نظم کی خاطر دیئے گئے ہیں ان سے ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ ظلم نہ کر سکے، اور ایسا نہ ہو کہ تابع و متبوع کا تعلق عملاً لونڈی اور آقا کا تعلق بن جائے۔

۲— عورت کو ایسے مواقع بہم پہونچائے جائیں جن سے فائدہ اٹھا کر وہ نظام معاشرت کے حدود میں اپنی فطری صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکے اور تعمیر تمدن میں اپنے حصہ کا کام بہتر سے بہتر انجام دے سکے۔

۳— عورت کے لئے ترقی اور کامیابی کے بلند سے بلند درجوں تک پہنچنا ممکن ہو مگر اس کی ترقی اور کامیابی جو کچھ بھی ہو عورت ہونے کی حیثیت سے ہو۔ مرد بننا نہ تو اس کا حق ہے نہ مردانہ زندگی کیلئے اس کو تیار کرنا اس کے لئے اور تمدن کے لئے مفید ہے اور نہ مردانہ زندگی میں وہ کامیاب ہو سکتی ہے۔

اس باب کو ختم کرتے ہوئے ہم یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ مرد کی فوقیت اور برتری کے باوجود عورت کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ دنیا کی ساری نامور ہستیوں کو جن کی وجہ سے تہذیب و تمدن نے ارتقا کے اعلیٰ منازل طے کئے ہیں جنم دینے والی اور انہیں پروان چڑھانے والی عورت ہے۔
اس اعتبار سے ارتقاء تمدن میں عورت کا حصہ مرد سے کم نہیں ہے بلکہ اس معاملہ میں وہ مرد کی شریک و سہیم ہے۔

سیرتِ امام شافعیؒ

پر

ایک نظر

مولانا محمد عبد الرشید نعمانی کے قلم سے

محاکمہ، جرح و تنقید، واقعات
کی تحقیق
درایت و روایت کی روشنی
میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وحدہٗ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہٗ اما بعد

اللّٰھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ

اللہ تعالیٰ ہزاروں رحمتیں نازل فرمائے مولانا شبلی نعمانی پر جنھوں نے سب سے پہلے ہماری زبان میں ائمہ مجتہدین کی سوانح نگاری کی طرح ڈالی، اور سیرۃ النعمان جیسی بلند پایہ اور گرانقدر کتاب لکھ کر سیرت نگاری کا کمال دکھایا اور اس طرح ہمارے علمی سرمایہ میں ایک مفید اور بیش بہا اضافہ فرمایا۔ اس کے بعد ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے حیات امام مالکؒ لکھی، اب حال میں مولانا میاں خالد صاحب انصاری بھوپالی نے سیرت امام شافعیؒ لکھ کر اس سلسلہ کی تیسری کڑی کو ختم کیا۔ خدا کرے کوئی اللہ کا بندہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی بھی مفصل سوانح عمری قلمبند کر دے تو اس سلسلہ کی تکمیل ہو جائے۔

ائمہ کرام کی سوانح نگاری کے کار خیر ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے، صالحین کا ذکر اللہ کی رحمت کے نازل ہونے کا سبب ہوتا ہے۔ ائمہ مجتہدین کا مرتبہ تو بہت اونچا ہے اس لئے یقیناً میاں خالد صاحب مستحق مبارکباد اور لائق صد آفرین تھے اگر وہ اس کار خیر کو خوبی کے ساتھ نبھا دیتے۔ لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے اس فرض کی نزاکت کو محسوس نہیں کیا اور وہ اس بارے میں حد درجہ اس درجہ تجاوز کر گئے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی منقبت نگاری کے ساتھ ساتھ دوسرے ائمہ کرام کی منقصت شماری بھی شروع کر دی۔ خصوصاً حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کوفی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب اور فقہاء احناف پر طعن بیجا اور اعتراضات بے سر و پا کا ایک طومار باندھ دیا جس سے کتاب جا بجا داغدار بن گئی اور ہم مجبور ہو گئے کہ علمی تنقید کی روشنی میں مولف کی تحقیقات کا جائزہ لیں حالانکہ خود مولف نے تحریر فرمایا ہے۔

> "یہ رسم کہن ہے کہ اکابرین پر کچھ نہ کچھ اعتراض کر کے اپنے دلوں کو تسکین دی جائے اور اپنے نفس کو فریب دیا جائے" صفحہ ۳۰۵

باوجود اس کے مولف نے اس رسم کہن سے کہاں تک دامن بچایا ہے اس کا فیصلہ اب ہم ناظرین ہی پر چھوڑتے ہیں۔ پیش نظر مقالہ کے تین جز ہیں۔ پہلے میں مولف کی عام غلطیوں کا بیان ہے۔ دوسرے میں فرضی مناظروں پر کلام ہے۔

سلہ "سیرت امام شافعی" از:۔ مولانا میاں خالد انصاری بھوپالی، (کتابت و طباعت دیدہ زیب) ضخامت ۴۴۴ صفحات، قیمت چار روپیہ آٹھ آنہ ــــ ملنے کا پتہ:۔ انجمن مسلمانان چاٹگاؤں، شریف بلڈنگ، ری روڈ بمبئی ۱۰

تیسرے میں حنفی فقہ کے سلسلہ میں مولف کے اعتراضوں کا جواب ہے۔

مؤلف کی عام غلطیوں پر ایک نظر

اصول فقہ میں پہلی تصنیف

(۱) ص ۵ و ۶ پر حجۃ اللہ البالغہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ

"مختلف احادیث کے متعلق متقدمین کے زمانہ میں ایسے قواعد منضبط نہ تھے جن سے ان میں باہمی جمع و تطبیق ہو سکے۔ اس لئے ان کے اجتہادی مسائل میں اکثر خرابیاں۔ اس کی تعیین اس ضرورت کے پیش نظر امام شافعی رح نے اس قسم کی حدیثوں کے متعلق اصول کی بنا ڈالی اور ان سب باتوں کو ایک کتاب میں جمع کر دیا۔ اصول فقہ میں سب سے پہلی یہی تصنیف ہے۔"

اولاً تو مؤلف نے ترجمہ میں ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیا۔ الفہ لم تکن قواعد الجمع بین المختلفات مضبوطة عندھم میں المختلفات کا ترجمہ "مختلف نصوص" زیادہ مناسب تھا۔ مولف نے اس کا ترجمہ "مختلف احادیث" کر دیا۔ حالانکہ احادیث کی کوئی وجہ تخصیص نہیں ہے۔ چنانچہ مثال میں جو مناظرہ نقل کیا ہے وہ بھی کتاب اللہ اور خبر واحد کے اختلاف سے ہی متعلق ہے۔

ثانیاً یہ بھی صحیح نہیں کہ اصول فقہ میں سب سے پہلی تصنیف امام شافعیؒ کی ہے۔ بلکہ علامہ سمعانی شافعی نے کتاب الانساب میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے متعلق یہ تصریح لکھا ہے

وھو اول من وضع الکتب فی اصول الفقہ علی مذھب ابی حنیفة　　　یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب پر اصول فقہ میں کتابیں مدون کیں۔

التعلیق الممجد علی موطا محمد مولف کی فہرست مآخذ میں ہے اس میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے بھی امام ابو یوسفؒ کے تذکرے میں سمعانی سے یہ نقل کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایا جائے۔ اسی طرح نواب صدیق حسن خاں صاحب "اتحاف النبلا" میں امام موصوف کے متعلق رقمطراز ہیں

"و اول لے است کہ در اصول فقہ بر مذہب ابی حنیفہؒ کتبہا ساختہ و مسائل املا نمودہ وآں را نشر کردہ" صفحہ ۲

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی وفات ۱۸۲ھ میں ہوئی۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ آپ کی وفات کے ۲ سال بعد ۱۸۴ھ میں بغداد پہونچے پر امام محمدؒ سے فقہ و اصول کی تکمیل کی ہے۔

تعداد روایات

(۲) ص ۱۸ پر مرقوم ہے۔

"(موطا امام مالک رحمہ اللہ میں کل روایتیں ۱۷۲۰ ہیں۔ جن میں مسند و مرفوع ۶۰۰، مرسل ۲۲۵، موقوف ۶۱۳۔ تابعین کے اقوال و فتاوی ۲۸۵ اور بلاغات امام مالک ۵ ہیں)

امام شافعی رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ کے فیضان سے یہ سب کچھ حاصل کیا۔"

مؤلف نے موطا کی روایات کی یہی تعداد صفحہ ۲۳ پر بھی نقل کی ہے وہاں مؤلف نے یہ حوالہ بھی نقل کر دیا ہے (مقدمہ مسوی شاہ ولی اللہ صاحب صفحہ ۶)

ہم نے مسوے کے مقدمہ کو من اولہ الی آخرہ دیکھا۔ اس میں کہیں موطا کی روایات کی تعداد منقول

نہیں۔ معلوم ہوا حوالہ غلط ہے مولف صاحب تصحیح نقل فرمائیں۔ علاوہ ازیں ان اعداد کی میزان لگائی جائے۔ تو (۱۰۲۰) ہوتی ہے۔ (۱۷۲۰) نہیں اس لئے یقیناً مولف کی یہ بیان کردہ تعداد روایات غلط ہے۔ اور مولف کو یہ بھی ثبوت دینا ضروری ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے موطا کے جس نسخہ کو امام مالک رح کے سامنے پڑھا تھا۔ اس میں روایات کی یہی تعداد تھی۔ ورنہ نری احتمال آفرینی سے کام نہیں چلتا۔ کیونکہ محدثین نے تو نہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نسخے کی روایت کی ہے اور نہ اس کی روایات کا شمار کیا ہے۔

امام شافعی اور علم نجوم | "(۳) ص ۲۲ پر مرقوم ہے
"آپ (یعنی امام شافعی رحمہ اللہ) نے منازل شمس و قمر، رجوع استقامت سعد نحس تاثیرات کواکب و رفتار سیارات، اسباب تغیر و تبدل موسم کو ماہرین علم ہیئت و نجوم سے اچھی طرح سیکھا، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے توالی التاسیس بمناقب محمد بن ادریس میں چند روایتیں نقل کی ہیں از آں جملہ یہ واقعہ ہے کہ امام شافعی رح کے ایک دوست کا زائچہ آپ نے دیکھ کر کہا کہ ستائیس دن میں تمہارے یہاں بچہ پیدا ہوگا اور اس کی بائیں ران میں سیاہ تل ہوگا۔ چوبیس روز زندہ رہے گا پھر دفتاً مر جائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس کے بعد ساری کتابیں اس علم کی جلا ڈالیں پھر کبھی نجوم کے متعلق کسی کا جواب نہ دیا۔ نہ اس کا مطالعہ روا رکھا۔"

ہمارے نزدیک یہ ایک خیالی افسانہ ہے، امام شافعی رحمہ اللہ نے سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا دس (۱۰) سال کی عمر میں موطا یاد کی، تیرہویں سال امام مالک رح کے آستانہ پر حاضر ہوئے، پندرہویں سال مسلم بن خالد زنجی نے آپ کو افتاء کی اجازت دی۔ اب علم نجوم سیکھا تو کب سیکھا۔ کیا موطا کو حفظ کرنے کے بعد بھی امام صاحب کو علم نجوم کی حرمت کا پتہ نہ ہوا یا ان بزرگوں کے فیض صحبت نے اتنا بھی اثر نہ کیا تھا۔ کہ امام صاحب اس لایعنی اور حرام فن سے مجتنب رہتے۔ یہ بھی بتایا جائے کہ نجوم سیکھا تو کس شہر میں اور کس منجم کے پاس اور امام شافعی رح کے ابتدائی عہد تک علم نجوم کا کتنا سرمایہ عربی زبان میں منتقل ہو چکا تھا۔ درحقیقت امام شافعی رح کے متعلق اس طرح کی باتیں ثابت کرنا نادان کی دوستی کا مصداق ہے کہ اثبات مدح کے درپے ہیں اور مذمت ثابت ہو رہی ہے۔ علاوہ ازیں کتاب الام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ علم نجوم سے تو امام موصوف کا کیا تعلق ہوتا وہ سرے سے علم ہیئت ہی سے ناواقف تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں

لو اجتمع صلوٰۃ العید و صلوٰۃ الکسوف ابتدأ بالصلوٰۃ التی یخاف فوتہا ... بدأ بالکسوف ثم العید[1]	اگر نماز عید اور نماز کسوف (سورج گہن) دونوں جمع ہو جائیں تو کونسی نماز پہلے پڑھی جائے۔

حالانکہ جس شخص کو علم ہیئت میں ذرا بھی درک ہوگا وہ مسئلہ کی یہ صورت فرض ہی نہیں کر سکتا کیونکہ سورج گہن قمری مہینہ کی ۲۸ یا ۲۹ تاریخ کے سوائے کسی دوسری تاریخ میں واقع نہیں ہوتا مولف نے صفحہ ۴۰ پر لکھا ہے
"کہ امام شافعی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے۔ غیر موقوعہ مسائل اور مفروضہ صورتوں سے بجد احتیاط کرنی چاہیئے چونکہ یہ صحابہ کرام کی روش نہ تھی"

[1] کتاب الام ج ۱ ص ۲۱۴

خدا جانے مولف نے امام شافعیؒ کا یہ مقولہ کہاں دیکھا ہے ہمارے نزدیک اس مقولہ کی نسبت بھی امام موصوف کی طرف صحیح نہیں کیونکہ فقہ کی تدوین کے لئے ان تمام صورتوں پر گفتگو ضروری ہے کہ جن کا وجود ممکن ہو گو ان کا وقوع نادر ہی ہو۔ اور یہ مسئلہ تو ایسا ہے کہ اس کو فرض کرنے کی بھی گنجائش نہیں کیونکہ اس کا وقوع ہی سرے سے محال ہے۔

سبب وفات امام شافعیؒ

(۴) ص ۴۴ پر امام شافعی رحمہ اللہ کے وفات کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

" بالعموم جو واقعہ مشہور ہے وہ یہ ہے کہ فتیان بن ابی السمح مالکی مصری سے آپ کا مباحثہ ہوا۔ فتیان نے خلاف تہذیب گفتگو کی اور مقدمہ بازی تک نوبت پہونچی، امیر مصر نے فیصلہ کیا اور فتیان کو سزا دیدی فتیان موقع کی تاک میں تھا۔ ایک روز اندھیری رات میں موقع پاکر آپ کے سر پر ایسا گرز مارا جس کی وجہ سے سر پھٹ گیا"

تاریخی اعتبار سے یہ واقعہ ثابت نہیں ہے چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی، توالی التاسیس میں ارقام فرماتے ہیں

ولم ار ذلك من وجه يعتمد (صفحہ ۸۶ طبع مصر) میں نے یہ واقعہ کسی قابل اعتماد طریقہ سے نہیں دیکھا۔

اشہب کی بد دعا

(۵) اس کے بعد لکھا ہے

" دوسری طرف اشہب بن عبد العزیز فقیہ مالکیہ کا مستقل کام یہ تھا کہ وہ آپ کے لئے بد دعا کرتا ہے" صفحہ ۴۶

یہ وہی اشہب ہیں جن کے لئے امام شافعیؒ فرماتے ہیں

ما رايت افقه من اشهب (الديباج المذهب لابن فرحون صفحہ ۹۸ طبع مصر) میں نے اشہب سے زیادہ کسی کو فقیہ نہیں دیکھا۔

کیا اسحاق بن راہویہ نے فقہ حنابلہ میں کوئی تصنیف کی ہے

(۶) ص ۸۸ پر لکھا ہے

" اسحاق بن ابراہیم المروزی مشہور بہ اسحاق بن راہویہ آپ نے بھی فقہ حنابلہ میں کتاب السنن مرتب فرمائی " ــــــ فقہ حنابلہ میں اسحاق بن راہویہؒ کا کتاب السنن مرتب کرنا قطعاً غلط ہے۔ وہ امام احمد رحمہ اللہ کے معاصر اور علم و اجتہاد میں ان کے ہمسر ہیں۔ عمر میں بھی ان سے بڑے تھے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تقریب التہذیب میں ان کا تذکرہ ان لفظوں میں کیا ہے ثقة حافظ مجتهد قرين احمد بن حنبل، ان کی وفات بہتر (۷۲) سال کی عمر میں ۲۳۸ھ میں ہوئی ہے۔ اور امام احمد رحمہ اللہ کا انتقال ستر (۷۰) سال کی عمر میں ۲۴۱ھ میں ہوا ہے۔

مکالمہ

(۷) ص ۶۹ پر یہ غلط اور جعلی مکالمہ مرقوم ہے

" ایک مرتبہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمہ اللہ سے کہنے لگے یہ تو بتلایئے کہ ہمارے استاد یعنی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تمہارے استاد امام مالک رحمہ اللہ سے زیادہ عالم تھے یا نہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا اگر منصفانہ گفتگو ہو تو پھر میں جواب دوں، کہنے لگے منصفانہ ہی گفتگو ہوگی، امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا، اب آپ قسم کھاکر فرمایئے امام مالکؒ کا رتبہ فہم قرآن میں زیادہ تھا یا آپ کے استاد کا۔ امام محمدؒ نے فرمایا بخدا امام مالکؒ کا درجہ بلند تھا۔ پھر امام شافعیؒ نے فرمایا اب آپ قسم کھاکر فرمایئے کہ احادیث رسول اللہ و اقوال و افعال صحابہ کرام سے بہت زیادہ واقف میرے استاد تھے

یا آپ کے - امام محمدؒ نے فرمایا - خدا کی قسم احادیث رسول اللہ و اقوال صحابہ سے تمہارے استاد بہت زیادہ واقف تھے - تب امام شافعیؒ نے فرمایا اب بجز قیاس کے اور کیا باقی رہا اور قیاس کا دارومدار بھی انھیں تینوں اصولوں پر ہے جو شخص ان تینوں اصولوں سے زیادہ باخبر ہوگا اس کا قیاس بھی بلند ہوگا - امام محمدؒ خاموش ہو گئے - (تاریخ ابن خلکان ترجمہ امام مالکؒ)

حمایت مذہب کا جوش شباب پر ہے - کیا نقشہ پیش کیا ہے - امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے علم کا اور وہ بھی امام محمد رحمہ اللہ کی زبانی - واقعہ اصل میں صرف اتنا ہے جس کو امام شیخ الاسلام عماد الدین مسعود بن شیبہ سندی نے امام ابو عاصم محمد بن احمد عامری کی کتاب المبسوط سے نقل کیا ہے

ان الشافعی سأل محمدا أيما اعلم مالك او ابوحنيفة فقال محمد بماذا قال بكتاب الله قال ابوحنيفة فقال من اعلم بسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال ابوحنيفة اعلم بالمعانی ومالك اهدى للالفاظ فقال من اعلم باقاويل الصحابة فامر محمد باحضار كتاب اختلاف الصحابة الذی صنفه ابوحنيفة (۶)

امام شافعیؒ نے امام محمدؒ سے سوال کیا کون زیادہ عالم ہیں امام مالکؒ یا امام ابو حنیفہؒ - فرمایا کس چیز کے؟ کہنے لگے کتاب اللہ کے امام محمدؒ نے جواب دیا امام ابو حنیفہؒ پھر امام شافعیؒ نے پوچھا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کون زیادہ عالم ہے فرمایا - امام ابو حنیفہؒ معانی کے زیادہ عالم ہیں اور امام مالکؒ کی پہنچ الفاظ پر زیادہ ہے - امام شافعیؒ نے سوال کیا اقوال صحابہ کا کون زیادہ عالم ہے اس پر امام محمدؒ نے حکم دیا کہ کتاب اختلاف الصحابہ کو لایا جائے جو امام ابو حنیفہؒ کی تصنیف ہے -

کتاب التعلیم کا قلمی نسخہ مجلس علمی ڈابھیل کے کتب خانہ کراچی میں موجود ہے - جائے غور ہے - امام محمد رحمہ اللہ امام شافعی رحمہ اللہ کے اکابر شیوخ میں سے ہیں - علم اور تفقہ میں ان سے بڑھے ہوئے ہیں - امام ابو حنیفہؒ کے علوم کے ناشر و مدون ہیں - امام مالک رحمہ اللہ سے تین سال تک کسب فیض کر چکے ہیں[1] اس لئے ان دونوں حضرات کی منزلت علمی سے امام شافعیؒ سے زیادہ واقف ہیں پھر بھلا ان کو یہ بات امام شافعی رحمہ اللہ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی - امام محمد رحمہ اللہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے خود امام مالکؒ کی زبان سے سات سو سے زیادہ احادیث کا سماع کیا تھا - حالانکہ دوسرے شاگردوں کو یہ حکم تھا کہ وہ خود پڑھیں - آج موطا کے دو ہی نسخے متداول ہیں - ایک امام محمدؒ کا اور دوسرا امام یحییٰؒ کا - ہاں امام شافعیؒ نے امام مالکؒ سے تو ضرور استفادہ کیا تھا لیکن چونکہ امام ابو حنیفہؒ کا زمانہ نہیں پایا تھا بدیں وجہ ان ہر دو حضرات کی جلالت علمی کے متعلق امام محمدؒ سے ان کا سوال قرین قیاس ہے کیونکہ وہ ان کے استاذ تھے اور ہر دو ائمہ کے علوم اور ان کی خصوصیات سے واقف تھے -

ایک غیر محقق روایت | (۸) ص ۸۸ و ۸۹ پر امام اوزاعیؒ امام مالکؒ وغیرہ ائمہ کرام کے متعلق یہ گل افشانی کی ہے :-

---

[1] مولف نے سیرۃ امام شافعیؒ کے ص ۸۰ پر لکھا ہے کہ امام شافعیؒ نے امام مالکؒ کی خدمت میں تقریباً تین سال صرف کئے، خدا جانے یہ بات مولف نے کہاں سے نقل کی ہے - عام کتابیں تعیین مدت کے ذکر سے خاموش ہیں - اگر مولف کسی معتبر کتاب کا حوالہ پیش کریں تو ان کی تصدیق کی جا سکتی ہے -

"امام بیہقی نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے امام احمدؒ سے امام مالکؒ کے متعلق پوچھا آپ نے فرمایا۔ حدیث صحیح درای ضعیف یعنی حضرت امام مالکؒ کی حدیث تو صحیح ہے مگر رائے کمزور ہے۔ پھر سائل نے امام اوزاعی کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا حدیث ضعیف ورای ضعیف ان کی حدیث بھی کمزور ہے اور رائے بھی کمزور ہے۔ پھر سائل نے امام شافعیؒ کے متعلق پوچھا فرمایا حدیث صحیح ورای صحیح ان کی حدیث بھی صحیح ہے اور رائے بھی صحیح ہے۔ پھر اصحاب کوفہ کے متعلق پوچھا تو فرمایا لا رای ولا حدیث یعنی ان کی رائے اور حدیث دونوں کچھ نہیں ہیں"

مؤلف کو خدا جانے دوسرے ائمہ کی تنقیص میں کیا مزہ آتا ہے

ترا کہ گفت کہ اے نازنین زپردہ برآ — بغمزہ بر صف مردان شیر افگن زن

امام یحییٰ بن معینؒ فرماتے ہیں

العلماء اربعة الثوری وابوحنیفة ومالک والاوزاعی — علماء چار ہیں امام سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام اوزاعی (رحمہم اللہ)

(البدایہ والنہایہ از حافظ ابن کثیر شافعی ص ۱۱۶ ج ۱۰)

مولف نے سب پر ہاتھ صاف کر ڈالا۔ امام ثوری اور امام ابوحنیفہ (رحمہما اللہ) دونوں کوفی ہیں۔ اب اگر ان حضرات ائمہ کے علم میں بھی خامیاں ہیں تو پھر امام شافعی اور امام احمد (رحمہما اللہ) تو ان ہی حضرات کے خوان علمی کے زلہ ربا اور ان ہی کے تلامذہ کے دامن فیض میں پلے بڑھے ہیں۔ خود ان کے متعلق کیا رائے قائم کی جائے گی۔ ذرا تھوڑی دیر کے لئے ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔

نام نیک رفتگاں ضائع مکن — تا بماند نام نیکت یادگار

درحقیقت یہ امام احمدؒ پر افترا ہے انھوں نے ہرگز ایسا نہیں فرمایا اور بیہقی کی یہ غلطی ہے کہ انھوں نے بغیر تنقید کے اس کو نقل کر ڈالا۔ امام شعرانی شافعیؒ نے المیزان الکبریٰ میں اس روایت کی ساری قلعی کھول کر رکھدی ہے چنانچہ وہ ابوبکر آجری کے حوالے سے اس روایت کو نقل کر کے فرماتے ہیں

فھو کلام ظاھر التعصب علی الائمۃ باجماع کل منصف ان صح النقل عنہ فان الحس لا یصدق ھذا القائل فیما قال — یہ ایسا کلام ہے جو ائمہ پر کھلا تعصب ہے، اور ہر انصاف پسند اس سے اتفاق کریگا۔ بشرطیکہ اس کی نقل بھی صحیح ہو کیونکہ مشاہدہ اس قائل نے جو کچھ کہا اس کی تصدیق نہیں کر سکتا۔

(ج ۱ ص ۶۰ طبع مصر)

امام شافعیؒ ہارون کے دربار میں

(۹) ص ۶۳ پر مولف نے پہلے تو یہ عنوان قائم کیا ہے۔ "آپ کا مفتی حرم بنایا جانا" پھر صفحہ ۶۴ پر لکھا ہے۔ "آپ کو مکہ میں ۱۹۵ھ ہجری تک مفتی رہے پھر بغداد تشریف لائے۔ ہارون رشید نے آپ کو بلوایا اور فرمایا کہ آج میرے دربار میں جب سب جمع ہوں وعظ کیجئے آپ نے وعظ فرمایا حاضرین مجلس کے تاثرات زبان سے باہر ہیں خود ہارون رشید کا یہ حال تھا کہ چیخ چیخ کر رونے لگا وعظ ختم ہونے پر آپ کو ۵۰ ہزار درہم نذر کئے (توالی التاسیس)

ہم نے توالی التاسیس کو بغور دیکھا اس میں تو یہ کہیں موجود نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ہارون الرشید کی وفات

جمادی الآخر ۱۹۲ھ میں ہوئی ہے۔ پھر یہ واقعہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ کیا اچھا ہو جو مولف اپنے بیان کے ثبوت میں توالی التاسیس کی اصل عربی عبارت نقل فرما دیں۔ تاکہ ان کی علمی تحقیق منظر عام پر آجائے۔

الجزائر کا سفر

(۱۰) ص ۶۵ پر مرقوم ہے :-

"تمام ائمہ میں تنہا آپ کی ذات ہے کہ جس نے مکہ، مدینہ، نواح یمن، عراق، شام، مصر، الجزائر تک سفر کئے۔ اور ہر ہر جگہ علماء و فضلاء سے مذاکرات فرماتے رہے۔ صرف آپ کی مساعی جمیلہ تھیں جن کی وجہ سے ان شہروں میں لوگوں نے آپ کے اجتہادی مسائل کو تسلیم کرتے ہوئے آپ کو ناصر الحدیث، مجدد امام الائمہ مان لیا"

اسی طرح ص ۴ پر، امام شافعی کے دس اصول کو بیان کرکے یہ لکھا ہے :

"آپ نے ان اصولوں کو مع دلائل مدون و مرتب کیا۔ پھر اس کی نشر و اشاعت میں آپ نے عالم اسلام کا دورہ کیا، بغداد و عراق چونکہ اہل الرائے کا مرکز تھا اس لئے وہاں پہونچکر آپ نے مذاکرات اور مباحثوں سے بڑے بڑے فقہاء اہل الرائے کو قائل کر دیا۔ مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ، یمن، شام، دمشق، مصر غرضکہ ہر جگہ پہونچکر آپ نے سارے اصول دنیا سے منوا لئے"

ہم کو امام شافعیؒ کا ناصر الحدیث مجدد امام الائمہ ہونا سب تسلیم۔ لیکن مولف کی تلبیس تسلیم نہیں۔ اول تو امام شافعی کی فہرست سفر میں شام، الجزائر اور دمشق کا نام نہیں آتا۔ مولف بتائیں کہ یہ انھوں نے کس کتاب سے نقل فرمایا ہے۔ ثانیاً (۸) یہ ثابت کریں کہ امام شافعیؒ نے یہ سفر اصول کو مع دلائل مدون و مرتب کرنے کے بعد پھر ان کی نشر و اشاعت کے لئے کئے ہیں خود مولف نے ص ۲۲، ۲۳ و ۲۲۲ پر لکھا ہے۔ کہ

"آپ کی تعلیم و تربیت ابتدائی جس قدر ہوئی وہ سرزمین حجاز و یمن میں ہوئی .... علم فقہ کو ابتداءً تو آپ نے مسلم بن خالد زنجی مفتی مکہ سے حاصل کیا .... اور حضرت سفیان بن عیینہ و حضرت امام مالک رحمہما اللہ کے فیوض و برکات سے حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل کیا .... مگر چونکہ قدرت باری تعالیٰ کو آپ سے تجدید و اصلاح امت کا کام لینا تھا۔ آپ نے اکناف عالم اسلامی کا دورہ شروع کیا اور تیس سال کی عمر تک جگہ جگہ جاکر احادیث رسول اللہ و آثار صحابہ کرام کو جمع کیا ان کے باہمی اختلاف پر غور کرتے رہے۔ اس دوران میں کچھ حکومت کی خدمت بھی ادا کی۔ اور پھر جس وجہ سے معتوب ہوئے اس کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ اس کو چھوڑ کر کوفہ بغداد و عراق میں فقہ امام ابو حنیفہؒ و اہل الرائے کو امام محمد بن حسن شیبانی علیہ الرحمۃ اور وہاں کے ممتاز فقہاء سے اچھی طرح سمجھا"

امام شافعیؒ جب معتوب ہو کر بغداد آتے ہیں تو آپ کی عمر ۳۴ سال تھی یہ ۱۸۴ھ کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد آپ اتنی طویل مدت تک فقہ کی تکمیل کے لئے امام محمدؒ کی خدمت میں حاضر رہے ہیں کہ ایک بار شتر کے برابر کتابوں کا آپ نے سماع فرمایا ظاہر ہے کہ اتنے کثیر علم کے لئے کتنی طویل مدت درکار ہے اور وہ بھی خاص طور پر فقہ کے لئے کہ جو نہایت ہی ادق فن ہے۔ فقہ کی تکمیل کے بعد آپ مکہ مکرمہ واپس ہوگئے پھر دوبارہ آپ کی واپسی بغداد ۱۹۵ھ میں ہوئی ہے۔ جس کو خود مولف نے بھی ص ۶۴ پر لکھا ہے اور پھر ص ۵۰ پر یہ تحریر کیا ہے کہ

"پھر وہاں سے دو برس کے بعد آپ مکہ مکرمہ واپس تشریف لے گئے کہ مکہ مکرمہ میں حج سے فارغ ہو کر ۱۹۸ھ میں آپ پھر بغداد تشریف لائے اور چند مہینہ ٹھہر کر پھر مصر تشریف لے گئے پھر آخر عمر تک آپ نے وہیں قیام فرمایا اور وہیں مرجع خلائق رہے"

اب مؤلف صاحب کتب تاریخ سے ثابت فرمائیں کہ امام شافعیؒ نے تدوین اصول کے بعد ان کی ترویج و اشاعت کے لئے بلادِ اسلامیہ کا سفر کس سنہ میں کیا تھا۔ حوالہ مع اصل عبارت کے قلمبند فرمائیں۔ ورنہ خالی خولی باتوں سے کام نہیں چلا کرتا

واقعہ نکاح

(۱۱) ص ۸۸ پر مرقوم ہے:۔

"بالعموم یہ مشہور ہے کہ امام شافعیؒ کی والدہ سے امام محمدؒ نے نکاح کر لیا تھا۔ اور اس وجہ سے مذاکرات علمی و مناظرات میں امام محمدؒ امام شافعیؒ سے درگزر فرماتے رہتے تھے۔ یہ واقعہ بالکل غلط ہے کسی صحیح تاریخ سے اس کا ثبوت نہیں ملا"

لائق مؤلف مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کی تحقیق کا بہت تو ہا مانتے ہیں چنانچہ جابجا مسائل خلافیہ میں ان ہی کے حوالے نقل کرتے جاتے ہیں اور ص ۲۶۱ پر ان کے متعلق لکھتے کہ وہ "مشہور محقق حنفی ہیں" یہی مشہور محقق اس واقعہ کے ناقل ہیں چنانچہ مقدمہ ہدایہ میں امام محمدؒ کے تذکرہ میں رقمطراز ہیں کہ

وتزوج ہو بام الشافعی — آپ نے امام شافعیؒ کی والدہ سے نکاح کر لیا تھا۔

اب مؤلف کو اختیار ہے ان کی تحقیق مانیں یا نہ مانیں۔ ہم کو کچھ اصرار نہیں ہے۔ مگر یاد رہے کہ یہ صرف مولانا عبدالحئیؒ ہی کی تحقیق نہیں بلکہ مؤلف کے ہموطن فاضل قنوجی نواب صدیق حسن خاں بھوپالی کی بھی یہی تصریح ہے۔ چنانچہ اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء والمحدثین میں رقمطراز ہیں

"گویند با مادر امام شافعیؒ نکاح کردہ بود" صفحہ ۲۲۹

مسند امام احمدؒ

(۱۲) ص ۸۸ پر امام احمدؒ کی مسند کے متعلق لکھا ہے:۔

"آپ نے ایک لاکھ حدیثوں سے منتخب کر کے مسند کو مرتب فرمایا۔ جس میں کئی ہزار حدیثیں ہیں"

یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ مسند کی احادیث کی تعداد کئی ہزار نہیں بلکہ تیس ہزار ہے۔ اور ایک لاکھ احادیث سے نہیں بلکہ ساڑھے سات لاکھ احادیث سے منتخب کر کے مرتب فرمایا ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی "بستان المحدثین" میں فرماتے ہیں:۔

"مسند امام احمد مشہور آنست کہ در اصل سی ہزار حدیث است و بازیادات پسر ایشاں عبداللہ چہل ہزار حدیث اما بعضے از محدثین از بعضے ثقات و شیوخ خود نقل کردہ اند کہ ہمگی سی ہزار حدیث است واللہ اعلم و ممکن است تطبیق باسقاط مکرر و شمار آں پس ہر دو قول صحیح باشند"
ص ۳۰ طبع لاہور

مسند امام احمد کیلئے مشہور تو یہ ہے کہ اصل کتاب میں تیس ہزار حدیثیں ہیں اور آپ کے صاحبزادہ عبداللہ کی زیادات کو بھی شمار کیا جائے تو چالیس ہزار حدیثیں ہوتی ہیں۔ لیکن بعض محدثین نے اپنے بعض شیوخ و ثقات سے یہ نقل کیا ہے کہ سب ملا کر تیس ہزار ہوتی ہیں۔ اور تطبیق کی یہ صورت ہے کہ مکررات کے بغیر تیس ہزار ہیں اور ان کو بھی شمار کیا جائے تو چالیس ہزار۔ پس دونوں قول صحیح ہیں۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:-

"وامام احمد چوں از سودہ ایں مسند فارغ شد ہمہ اولاد خود را جمع کردہ برایشان خواند وگفت ایں کتابیست کہ من آنرا جمع کردہ ام وچیدہ ام از ہفت لکھ وپنجاہ ہزار حدیث یعنی طرق
صفحہ ۳۰

اور امام احمدؒ جب اس مسند کے مسودہ سے فارغ ہوئے تو آپ نے اپنی سب اولاد کو جمع کر کے ان کے سامنے اس کتاب کو پڑھا اور پھر فرمایا کہ یہ وہ کتاب ہے جس کو میں نے ساڑھے سات لاکھ حدیثوں سے منتخب کر کے جمع کیا ہے۔ حدیثوں سے مراد اس تعداد میں متون نہیں بلکہ اسانید ہیں۔

امام شافعیؒ کی تصانیف کی تعداد

(۱۳) ص ۱۰۲ پر مرقوم ہے:-
"اتحاف النبلاء میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے بحوالہ ملا علی قاریؒ تصریح کی ہے کہ آپ کی تصانیف ایک سو تیرہ تھیں۔"
افسوس ہے کہ ہم کو یہ تصریح اتحاف النبلاء میں نہ مل سکی۔ مولف براہ کرم تصحیح نقل فرمادیں۔ ورنہ یہ حوالہ خود ساختہ ہے۔

کیا امام مالکؒ کے شیوخ میں کوئی عراقی نہیں

(۱۴) ص ۱۱۳ پر امام مالکؒ کے متعلق لکھا ہے:-
"کہ آپ کے شیوخ میں ایک بھی عراقی نہیں"
یہ بھی محض غلط ہے۔ ایوب سختیانی، حمید طویل، عبدالکریم ابوامیہ ان تینوں سے موطا میں روایتیں موجود ہیں یہ تینوں حضرات بصرہ کے رہنے والے تھے جو عراق کا مشہور شہر ہے۔ اور علامہ عینی نے شرح بخاری میں تصریح کی ہے

(۱۰) ان مالک بن انس کان یسال اباحنیفة رضی الله عنه و یاخذ بقوله (ج ۱ صفحہ ۳۳ طبع استنبول)

امام مالکؒ امام ابوحنیفہؒ سے مسائل دریافت فرماتے اور ان کے قول کو اختیار کرتے تھے۔

خود امام شافعیؒ کتاب الام میں فرماتے ہیں:-

وقیل لمالک الدراوردی هل قال احد بالمدینة لا یکون الصداق اقل من ربع دینار فقال لا والله ما علمت احدا قاله قبل مالک وقال الدراوردی اراه اخذه عن ابی حنیفة (ج ۷ صفحہ ۲۴۸)

میں نے دراوردی سے پوچھا تھا کہ کیا مدینہ منورہ میں بھی کوئی اس کا قائل تھا کہ مہر ربع دینار سے کم نہیں ہونا چاہئے انہوں نے فرمایا قسم بخدا مجھے تو معلوم نہیں کہ مالکؒ سے پہلے کسی نے یہ کہا ہو۔ دراوردی کا بیان ہے کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ انہوں نے یہ بات امام ابوحنیفہؒ سے لی تھی۔

اور امام مسعود بن شیبہ سندی نے کتاب التعلیم کے مقدمہ میں امام طحاوی کی اس کتاب کے حوالہ سے کہ جس میں انہوں نے ان حضرات کا تذکرہ جمع کیا ہے یہ نقل کیا ہے

عن الدراوردی سمعت مالک یقول عندی من فقه ابی حنیفة ستون الف مسئلة

دراوردی کا بیان ہے کہ میں نے امام مالکؒ سے سنا فرماتے تھے میرے پاس امام ابوحنیفہؒ کی فقہ کے ساٹھ ہزار مسئلے موجود ہیں

علم عراق کی عظمت کا امام مالکؒ کو جس درجہ اعتراف تھا اس کا اندازہ آپ اس روایت سے لگایئے جس کو حافظ ابن عبدالبر مالکی نے الانتقاء فی فضائل الثلاثة الائمة الفقهاء میں بسند متصل نقل کیا ہے۔ کہ جب خلیفہ مہدی عباسی نے یہ کہا کہ آپ میرے لئے ایک ایسی کتاب تیار کردیں کہ میں ساری امت کو اس پر عمل کے لئے مجبور کردوں تو آپ نے فرمایا: امیرالمومنین

اس طرف (مغرب کی سمت اشارہ کرتے ہوئے جس سے افریقہ اور اندلس مراد ہیں) سے تو یہی تمہاری طرف سے کافی ہوں اور اہل شام میں اوزاعی موجود ہیں جن کو تم بھی جانتے ہو رہے اہل عراق تو وہ تو اہل عراق ہی ہیں اما اھل العراق فھم اھل العراق۔(ص ۴۰) امام مالک رحمہ نے علم و فضل میں اہل کوفہ کو ہمیشہ اہل مدینہ کا ہمسر مانا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں باسناد متصل امام ابن وہبؒ کی زبانی کہ جو امام مالکؒ کے شاگرد رشید ہیں یہ نقل کیا ہے کہ ایک بار امام مالکؒ سے کسی نے مسئلہ پوچھا آپ نے اس کا جواب دیا اس پر سائل کی زبان سے یہ نکل گیا کہ اہل شام تو اس مسئلہ میں آپ کی مخالفت کرتے ہیں اور اس کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں۔ فرمایا ومتی کان هذا الشان بالشام انما هذا الشان وقف علی اهل المدينة والكوفة (ج ۲ صفحہ ۱۵۰) ——— اہل شام کی یہ شان کب سے ہو گئی۔ یہ شان و صرف اہل مدینہ اور اہل کوفہ کی ہے۔

حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کان شان المسائل بالكوفة مدارہ علی ابی حنیفة واصحابه والثوری (کیونکہ کوفہ میں مسائل کے معاملہ کا دارومدار امام ابوحنیفہ ان کے تلامذہ اور سفیان ثوری پر ہے)

بحوالہ علامہ ذہبی

(۱۵۱) ص ۱۱۳ پر یہ گل افشانی بھی ہے۔

"علامہ ذہبی نے اسمعیل بن داؤد المخراقی سے روایت کیا ہے کہ میں نے امام مالکؒ سے سنا آپ فرماتے تھے کہ میں نے امام ربیعہ سے سنا وہ فرماتے تھے اس مقدس مقام کے رب کی قسم میں نے کسی عراقی کو کامل سمجھدار نہیں پایا۔

(۱۱) "امام ذہبی نے بواسطہ معن بن عیسےٰ روایت کیا ہے کہ ہارون الرشید مع قاضی ابو یوسفؒ کے حج کے لئے جا رہے تھے، مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ امام مالکؒ سے بھی ملے اور آپ کا بیحد احترام کیا۔ قاضی ابو یوسفؒ نے امام مالکؒ سے ایک مسئلہ پوچھا آپ خاموش ہو رہے اس پر ہارون رشید نے عرض کیا۔ اے ابو عبداللہ یہ ہمارا قاضی یعقوب ہیں جو آپ سے مسئلہ دریافت کرنا چاہتے ہیں آپ نے فرمایا۔ کاش آپ مجھ کو لغو آدمیوں میں بیٹھے دیکھیں تو اس مجلس میں ان کا جواب دے سکتا ہوں"

بلا شبہ یہ دونوں باتیں ذہبی نے نقل کی ہیں اور ان دونوں باتوں کے درمیان ذہبی نے ایک تیسری بات بھی نقل کی ہے جو معلوم نہیں کس مصلحت سے مولف نے چھوڑ دی وہ یہ ہے کہ انہی اسمٰعیل بن داؤد مخراقی نے امام مالکؒ کو یہ کہتے بھی سنا تھا۔ کہ عطاء بن ابی رباح رحمہ سیہ فام اور ضعیف العقل تھے۔ شاید اس کو چھوڑ دینے کی یہ وجہ ہو گی کہ ان کے متعلق مولف ص ۵۹ پر امام شافعیؒ سے بالمستقریٰ کے سلسلہ میں یہ نقل کر چکے ہیں کہ

"ہم سے بہتر شخص عطاء بن ابی رباح نے یہی کہا ہے"

اب مولف عطاء بن ابی رباح رحمہ کے متعلق جو جواب دیں وہی ہماری طرف سے اہل عراق کے متعلق سمجھ لیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں اور ذہبی نے ان دونوں کو بلا سند بیان کیا ہے ظاہر ہے کہ ایسی روایتوں میں کہ جن سے ائمہ کی تنقیص ہوتی ہو کس قدر تحقیق کی ضرورت ہے۔ عطاء بن ابی رباح رحمہ کی وہ شان ہے کہ جس کے متعلق امام ترمذیؒ اپنی جامع میں حضرت امام ابوحنیفہؒ سے ناقل ہیں کہ

حدثنا محمود بن غیلان حدثنا ابو یحیی الحمانی ——— میں نے کسی کو جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا نہیں دیکھا اور

قال سمعت ابا حنیفۃ یقول ما رأیت احدا اکذب من جابر الجعفی ولا افضل من عطاء بن ابی رباح (جامع ترمذی مع شرح ابن العربی طبع مصر ج ۱۳ صفحہ ۳۰۹)

عطاء بن ابی رباح سے افضل نہیں پایا۔

امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول حافظ ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں نقل کیا ہے[۱]۔ حالانکہ امام ابوحنیفہؒ ان ربیعۃ الرائےؒ سے بھی مل چکے اور ان کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ اہل عراق کے متعلق ذہبی نے ربیعہؒ سے بھی جو کچھ نقل کیا ہے محض غلط ہے۔ بھلا ابن سیرین، حسن بصری، ابراہیم نخعی، اور شعبی جیسے جلیل القدر ائمہ کے بارے میں کون بے عقل یہ کہے گا کہ وہ تام العقل نہ تھے۔

اسی طرح امام ابویوسفؒ کے بارے میں بھی جو کچھ نقل کیا ہے صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس واقعہ میں امام مالکؒ کا نہایت [illegible] کچھ ایسا پیش کیا گیا ہے کہ کسی سنجیدہ آدمی سے سیدھی طرح بات بھی نہیں کرتے۔ خود فرمایئے محض مسئلہ دریافت کرنے میں کیا قباحت تھی کہ برجستہ فرما دیا "کاش آپ مجھ کو لغو آدمیوں میں بیٹھے دیکھیں تو اس مجلس میں اس کا جواب دے سکتا ہوں" بھلا یہ کیا لغویت ہوئی۔ خدا جانے واقعہ کیا ہوگا ذہبی نے اس کو حاکم کے حوالہ سے نقل کیا ہے یہ دونوں سخت متعصب تھے اور ائمہ احناف کے بارے میں بہت سی بے سروپا باتیں بغیر تنقید نقل کر دیتے تھے۔ اسی لئے قاضی القضاۃ علامہ ابوالفضل محب الدین بن الشحنہ نے اپنی شرح ہدایہ کے مقدمہ میں علامہ تاج الدین سبکی کے حوالہ سے تصریح کی ہے کہ ذہبی کے کلام سے کسی سنی عالم کا تذکرہ نہیں نقل کرنا چاہئے[۲]۔

شاہ کی عبارت کی تحقیق (۱۲)

(۱۵) ص ۱۳۳ پر مرقوم ہے :-

"ازالۃ الخفاء میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔ خلفائے راشدین کے بعد کسی خلیفہ نے خود اپنی امارت میں حج ادا نہیں کیا۔ ان لوگوں کی حکومت مجوسیوں کے مانند رہی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ یہ نماز پڑھتے ہیں اور کلمہ پڑھ لیتے ہیں"

اس عبارت کا مطلب تو یہ ہوا کہ خلفائے راشدین کے بعد جتنی بھی اسلامی حکومتیں برسر اقتدار آئیں سب نعوذ باللہ مجوس کے مانند تھیں۔ یہ ازالۃ الخفاء میں کہیں نہیں ہے۔ مولف تصحیح نقل فرمائیں۔ ازالۃ الخفاء میں اس سلسلہ میں جو کچھ ہے حسب ذیل ہے :-

"اقامت حج بعد حضرت عثمانؓ ہیچ خلیفہ بذات خود نکردہ است" (ج ۱ صفحہ ۱۳۳) اور گیارہ ورق کے بعد ص ۱۵۰ پر یہ تحریر ہے

باز دولت قریش منقرض شد بلکہ دولت عرب برہم خورد و رؤسا محافل و ملوک عالم عجمیان شدند چون دولت عرب منتشی شد و مردم در بلاد مختلفہ افتادند ہر یکے آنچہ از مذاہب یاد گرفتہ بود ہماں را اصل ساخت و آنچہ مذہب مستنبط سابقا

پھر قریش کی سلطنت ختم ہو گئی بلکہ عرب کی حکومت درہم برہم ہوئی اور رؤسا محافل اور شاہان عالم اہل عجم ہوئے۔ جب عرب کی سلطنت جاتی رہی اور لوگ مختلف ملکوں میں بٹ گئے تو جس نے بھی جو مذہب یاد کر لیا تھا اسی کو اصل بنا لیا اور

---

[۱] ملاحظہ ہو عینی شرح بخاری ج ۲ صفحہ ۷۵۰ اور تخریج ہدایہ از زیلعی ج ۲ صفحہ ۴۹)

[۲] ملاحظہ ہو تعلیقات ذیول تذکرۃ الحفاظ ص ۳۲۸ طبع مصر۔ ہم نے اس کی اصل عبارت اپنے اس مقالہ میں نقل کر دی ہے جو حاکم کی مشہور کتاب المدخل فی اصول الحدیث کی تنقید کے سلسلہ میں لکھا ہے اور ندوۃ المصنفین کے موقر جریدہ برہان میں فروری ۵۲ء سے لیکر جون ۵۲ء تک مسلسل شائع ہوتا رہا ہے۔ یہ عبارت جون کے رسالہ میں ہے۔ اسی طرح فروری کے رسالہ میں حاکم کے تعصب کو بھی بحوالہ حافظ ابن الجوزی [illegible]

بودالحال سنت مستغرہ شد علم ایشاں تخریج بر تخریج
و تفریع بر تفریع و دولت ایشاں مانند دولت مجوس
الا آنکہ نمازمی گزارند و تکلم بکلمہ شہادت می شدند

جو مذہب پہلے استنباطی و اجتہادی تھا وہ اب مستقل سُنّت
بن گیا ان کا علم تخریج پر تخریج اور تفریع پر تفریع ہو گیا اور
ان کی حکومت مجوسیوں کی حکومت کے مانند
تھی فرق یہ تھا کہ یہ لوگ نماز پڑھتے تھے اور کلمہ شہادت کے قائل تھے

ملاحظہ فرمائیے مولف نے اپنی طرف سے حاشیہ چڑھا کر ایک کا جوڑ دوسرے سے لگایا اور واقعہ کو سرے سے کچھ کا کچھ کر دیا۔ فاضل مولف نے کتاب میں اکثر جگہ یہی کارروائی کی ہے۔

ابن معین کی جرح

(۱۶) ص ۱۴۳ پر لکھا ہے:-
"غلط طور پر یہ مشہور کیا گیا تھا کہ امام یحییٰ بن معین نے امام شافعیؒ پر کچھ جرح کی ہے۔ جس کا جواب علامہ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ امیر عبداللہ بن ناصر نے فرمایا ہے میں نے اصل کتاب محمد بن وضاح کی مشرق میں دیکھی ہے اس میں لکھا ہے کہ انھوں نے فرمایا ہے کہ یحییٰ بن معین نے امام شافعیؒ کی ثقاہت روایت حدیث کی توثیق فرمائی ہے"

یہ محض غلط ہے حافظ ابن عبدالبر نے تو ابن ناصر کی تردید کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ یحییٰ بن معینؒ سے یہی صحیح ہے کہ وہ امام شافعیؒ پر کلام کرتے تھے چنانچہ وہ ابن ناصر کے مذکورہ بالا بیان کو نقل کر کے لکھتے ہیں

وھذا کلہ عندی تخرص وتکلم علی الھوی وقد صح عن ابن معین من طرق انہ کان یتکلم فی الشافعی (ج ۲۔ صفحہ ۱۶۰ طبع مصر)

یہ سب میرے نزدیک اٹکل ہے اور اپنی خواہش کے مطابق بات بنانا ابن معین سے تو متعدد طرق سے یہی صحت کو پہنچی ہے کہ وہ امام شافعیؒ کے بارے میں کلام کیا کرتے تھے۔

بات یہ تھی کہ معاصرت کی بنا پر امام ابن معینؒ کو امام شافعیؒ کی عظمت شان کا صحیح احساس نہ ہو سکا۔ اور وہ فن حدیث میں ان کے قائل نہیں ہوئے۔

کیا مامون ہروی فقیہ تھا

(۱۷) ص ۱۴۴ پر مرقوم ہے:-
"ایک شخص مامون بن احمد سلمی متوفی ۲۴۵ھ ہرات کا رہنے والا مشہور فقیہ ہے اس کا کام یہی تھا کہ امام شافعیؒ اور آپ کے مسلک کے خلاف روایتیں وضع کیا کرتا تھا"

مولف کو اس جھوٹے کی فقاہت کی شہرت کس کتاب سے معلوم ہوئی ذرا اس کا نام بتایا جائے۔

مرسل خفی کی خودساختہ تعریف

(۱۸) ص ۱۵۹ پر لکھتے ہیں:-
"مرسل خفی اس کو کہتے ہیں کہ ایک ایسا صحابی روایت کر رہا ہو جس نے حضور علیہ السلام کو تو بچشم خود دیکھا ہے مگر اس کا کسی روایت کو سننا ثابت نہیں ہوتا بلکہ وہ دوسرے کسی صحابی سے روایت کرتا ہے اور اس کا نام نہیں لیتا"

مرسل خفی کی یہ تعریف محض خودساختہ ہے۔ اصول حدیث کی کسی کتاب میں مذکور نہیں۔ مرسل خفی کے معنی ظاہر ہیں کہ جس کا ارسال بظاہر معلوم نہ ہو بلکہ بادی النظر میں تو متصل نظر آئے اور حقیقت میں مرسل ہو۔

مرسل کے بارے میں امام شافعیؒ کا مذہب

(۱۹) ص ۱۶۰ و ۱۵۸ پر مولف نے امام شافعیؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ
"روایت مرسل بجز سعید بن مسیب کے ناقابل قبول ہے"

یہ بھی کلیتہً صحیح نہیں بلکہ مذہب شافعی میں مرسل کے بارے میں تفصیل ہے۔ وہ چند شرائط کے ساتھ حدیث مرسل سے احتجاج کے قائل ہیں۔ چنانچہ خود مولف نے ص ۵ پر حجۃ اللہ البالغہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ

"امام شافعی رحمہ نے یہ اصول طے کیا کہ مرسل روایتوں پر عمل جب ہی کیا جا سکتا ہے کہ ان کے شرائط بھی پیش نظر ہوں"

ثبوت چاہیئے

(۲۰) مولف نے ص ۱۵۹ سے لیکر ص ۲۰۹ تک کامل پچاس صفحات میں امام شافعی رحمہ کے دس اصول کی تشریح میں جو کچھ خامہ فرسائی کی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ امام شافعی رحمہ کی تصنیفات سے اس کا ثبوت فراہم نہ کر سکے جس سے ناظرین کو مولف کے دعوے کی صداقت معلوم ہوتی۔ بلکہ متاخرین مصنفین اصول حدیث کے اقتباسات درج کرتے ہیں اور ان اقتباسات میں بھی یہ کہیں تصریح نہیں کہ امام شافعی رحمہ نے یہ سب فرمایا ہے یا امام شافعی رحمہ کے فلاں اصول پر ان تفصیلات کی تخریج ہے۔ یہ اصول حدیث متاخرین کی اپنی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ ان سب کو بیدھڑک سراسر امام شافعی رحمہ کی طرف منسوب کر دینا بڑی جسارت ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آئندہ مولف اگر سیرت امام شافعی رحمہ پر نظر ثانی فرمائیں تو اپنے دعوے کے ثبوت میں خود امام شافعی رحمہ کی تصریحات خواہ ان کی اپنی تصانیف سے یا دوسرے علما کی کتابوں سے نقل فرما دیں تاکہ بات بے سند نہ رہے۔

کیا تدلیس صرف کوفہ اور بصرہ والوں کے ساتھ مخصوص تھی

(۲۱) مولف نے ص ۱۹۸ سے لیکر ص ۲۰۷ تک کامل چار ورق تدلیس اور مدلس کی وضاحت پر صرف کئے ہیں۔ حالانکہ ہزاروں (۱۴) راویان حدیث میں مدلسین کی کل تعداد (۱۵۲) ہے۔ اور ص ۱۹۹ پر توجیہ النظر کے حوالے سے یہ داد تحقیق دی ہے۔

"اہل حجاز، حرمین، مصر، اور عوالی مصر کا طریقہ تدلیس کا نہ تھا۔ اسی طرح خراسان۔ دامان کوہ۔ اصفہان۔ بلاد فارس، خوزستان اور ماوراء النہر کے ائمہ محدثین کے متعلق بھی تدلیس کا علم نہیں ہوا۔ البتہ بیشتر محدثین کوفہ اور کچھ بصرہ والوں کی یہ عادت تھی۔

مولف کے پیش نظر حافظ ابن حجر عسقلانی کی طبقات المدلسین تھی جو مدلسین کے حالات میں سب سے جامع تصنیف ہے تاہم مولف نے توجیہ النظر کی اس عبارت کو قصداً نقل کیا تاکہ اہل عراق یعنی علماء کوفہ اور بصرہ پر طعن کا موقع ملے لیکن ہم اس غلط تحقیق کی حقیقت کھول کر اپنے ناظرین کے سامنے رکھے دیتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اور ان کے تلامذہ میں سے کسی کے دامن پر تدلیس کا دھبہ نہیں ہے۔ طبقات المدلسین میں حافظ ابن حجر نے (۱۵۲) مدلسین کا تذکرہ کیا ہے۔ ہم نے جب ان کے اوطان کی تحقیق کی تو حسب ذیل اعداد و شمار ہوئے۔

کوفہ	بصرہ	مدینہ منورہ	مکہ مکرمہ	باقی مدلسین حسب ذیل مقامات کے رہنے والے تھے:
۳۹	۲۵	۱۴	۱۱	———

اصفہان، سمرقند، جزیرہ، یمامہ، مرو، یمن، طائف، مصر، مدائن، بخارا، اندلس، نیشاپور، واسط، دمشق، بغداد، شام، صنعا، رے، حران، ہمدان، مصیصہ، حمص، حدیثہ، خراسان، افریقہ، ہرات، اس لئے صرف اہل کوفہ و بصرہ کو مورد طعن بنانا مناسب نہیں کہ

ایں گناہ است کہ در شہر شما نیز کنند

توجیہ النظر کے مولف طاہر جزائری اسی عہد کے علماء میں سے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی سے ان کی شام میں ملاقات

ہوئی تھی۔ غالباً انھوں نے مدلسین کے اوطان پر نظر نہیں ڈالی ورنہ ایسا نہ لکھتے۔

سماء دنیا سے کیا مراد ہے

(۲۲) ص ۱۸۵ پر لکھتے ہیں:۔

"کلام عرب میں سماء دنیا سے مراد وہ حالت ہے جو ہم سے قریب ہے"

یہ محض غلط ہے۔ مولف لغت و کلام عرب سے ثبوت پیش کریں

صاحب ہدایہ پر اعتراض کا جواب

(۲۳) ص ۱۹۴ پر ارقام فرماتے ہیں:۔

"صاحب ہدایہ نے حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے قربانی نہ کرنے پر ایک احتمال پیدا کیا تھا کہ ان دونوں حضرات نے بحالت سفر ایسا کیا ہوگا اس کا جواب حافظ ابن حجرؒ نے نصب الرایہ فی تخریج احادیث ہدایہ صفحہ ۲۳۵ پر یہ دیا ہے:۔

"یہ روایت کہ بحالت سفر ایسا کیا ہو مجھے نہیں ملی بلکہ بسند صحیح ان حضرات سے یہ ثابت ہے کہ اس خطرہ کی وجہ سے قربانی نہیں کرتے تھے کہ لوگ اس کو واجب نہ سمجھ لیں"

یہاں مولف نے کئی غلطیاں کی ہیں۔ اول تو یہ کہ حافظ ابن حجر کی تخریج کو نصب الرایہ لکھدیا اور یہیں نہیں بلکہ مولف نے جہاں بھی اپنی کتاب میں اس کا حوالہ دیا ہے یہی نام لکھا ہے۔ حالانکہ یہ محض غلط ہے نصب الرایہ حافظ جمال الدین زیلعی کی تصنیف ہے جو ہندوستان اور مصر دونوں جگہ طبع ہوچکی ہے۔ حافظ ابن حجر کی کتاب کا نام الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ ہے۔ طبع قدیم میں مطبع والوں نے غلطی سے نصب الرایہ چھاپ دیا ہے مولف نے اسے صحیح سمجھ لیا یہ علمی کوتاہی ہے۔

دوسری غلطی یہ ہے کہ صاحب ہدایہ کے لئے لکھدیا کہ انھوں نے ایک احتمال پیدا کیا تھا۔ حالانکہ صاحب ہدایہ نے احتمال کے طور پر نہیں بلکہ جزم کے ساتھ لکھا ہے کہ

وابوبکر وعمرؓ لا یضحیان اذا کانا مسافرین	حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما جب مسافر ہوتے تو
(ج ۴ - صفحہ ۴۲۹)	قربانی نہیں کرتے تھے۔

تیسری غلطی یہ ہے کہ حافظ ابن حجر کے یہ لکھدینے سے کہ لم اجدہ (یہ روایت مجھے نہیں ملی) آپ نے بھی یہ باور کرلیا کہ واقع میں اس کا وجود نہیں حالانکہ حافظ صاحب موصوف کو اگر کوئی روایت نہ مل سکے تو اس سے لزوماً کے ثبوت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اور یہ کیا ضرور ہے کہ اگر حافظ صاحب کو کوئی روایت معلوم نہ ہوسکے تو دوسروں کو بھی اس کا علم نہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ درایہ کی تالیف میں حافظ صاحب کی اپنی سعی وکاوش کچھ نہیں ہے بلکہ نصب الرایہ کی اپنے مذاق کے مطابق محض تلخیص کردی ہے۔ اور حافظ زیلعی کو جو کوئی روایت نہیں ملتی تو یہ بجائے اس کے کہ اس روایت کے لئے مزید تلاش وتفحص کو کام میں لائیں۔ عام طور پر امام زیلعی ہی کی تقلید کرتے ہیں چنانچہ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ اور ویسے بھی حافظ ابن حجر عسقلانی کی نظر حدیث میں اس درجہ کی نہیں ہے کہ وہ اگر کسی روایت کے لئے لم اجدہ کہدیں تو اس روایت کے ثبوت سے ہاتھ اٹھالیا جائے۔ غور فرمائیے۔ حافظ صاحب نے ساری عمر صحیح بخاری کی خدمت کی ۲۶ سال کے قریب فتح الباری شرح صحیح بخاری کے نذر کئے جو ان کا شاہکار ہے۔ اور جس کے متعلق مشہور کیا جاتا ہے کہ لا ھجرۃ بعد الفتح۔ پھر بھی یہ کیفیت ہے کہ بجا بجا تعلیقات و متابعات صحیح بخاری کے لئے فرمادیتے ہیں لم اجدہ۔ چنانچہ

پانچ حوالے سردست ہم ہدیہ ناظرین کرتے ہیں:-

(۱) روایۃ ابراھیم بن یوسف بن اسحٰق بن ابی اسحٰق السبیعی عن ابیہ عن ابی اسحٰق حدثنی عبد الرحمٰن بن الاسود، لم اجدھا (مقدمہ فتح الباری ص ۱۹ طبع میریہ مصر)

(۲) موسیٰ عن مبارک عن الحسن قال اخبرنی ابو بکرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یخوف اللہ بھما عبادہ کے متعلق ارشاد ہے۔ ولم تقع لی ھذہ الروایۃ الی الآن من طریق واحد یعنی یہ روایت مجھے اب تک کسی ایک طریقے سے بھی نہیں ملی (فتح الباری ص ۴۴۵ ج ۲ طبع میریہ)

(۳ و ۴) باب ما جاء فی التطوع مثنی مثنی، قال محمد ویذکر ذلک عن عمار وابی ذر وانس وجابر بن زید وعکرمۃ والزھری، جابر بن زید کی روایت کے لئے ارشاد ہے واما جابر بن زید وھو ابو الشعثاء البصری فلم اقف علیہ بعد، زہری کے لئے سنئے، واما الزھری فلم اقف علی ذلک عنہ موصولاً یعنی ان دونوں روایتوں کی اسناد پر حافظ صاحب کو واقفیت نہ ہو سکی (فتح الباری ج ۳ صفہ ۳۹)

(۵) قال ابن سیرین وابو صالح عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا کلب غنم اوصید، اس کے لئے فرماتے ہیں۔ واما روایۃ ابن سیرین فلم اقف علیھا بعد التتبع الطویل یعنی ابن سیرین کی روایت پر بڑی تلاش کے بعد بھی میں مطلع نہ ہو سکا (فتح الباری ج ۵ صفہ ۵)

یہ انتہائی خیرہ چشمی ہے کہ اگر ہدایہ کی کوئی روایت متاخرین مخرجین کو نہ مل سکے تو شور مچا دیا جائے۔ اور جو (۱۶) صحیح بخاری کی کسی غیر مسند روایت کی اسناد نہ مل سکے تو چپ سادھ لی جائے۔ حالانکہ حنفیہ کے نزدیک ہدایہ کی احادیث کا اعتبار صحیح بخاری کی روایات سے کچھ زیادہ ہی ہے کیونکہ ہدایہ کی احادیث پر مسائل کی بنیاد ہے بخاری کی روایات پر نہیں۔

اب سنئے صاحب ہدایہ کی روایت مذکورہ کا حال علامہ حافظ قاسم بن قطلوبغا، منیۃ الالمعی فیما فات من تخریج الھدایۃ للزیلعی میں رقمطراز ہیں

قلت روی مسدد فی مسندہ ان ابابکر وعمر رضی اللہ عنہما شھدا الموسم فلم یضحیا وروی ابن ابی شیبۃ عن عمر انہ کان اذا حج لا یضحی

(ص ۵۶ طبع مصر)

میں کہتا ہوں مسدد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے کہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سفر حج کیلئے تشریف لیگئے اور آپ نے قربانی نہیں کی، اور ابن ابی شیبہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب وہ سفر حج پر جاتے تو قربانی نہیں کرتے۔

اسی طرح حافظ ابن حجر نے حدیث ہدایہ لا جمعۃ ولا تشریق ولا اضحی الا فی مصر جامع کے لئے لکھدیا کہ لم اجدہ اور آپ نے سند متصل سمجھ کر اسے ص ۲۷۳ پر نقل فرما دیا ہے سو یہ بھی حافظ صاحب کے قلت تتبع کا نتیجہ ہے چنانچہ شیخ الاسلام حافظ بدر الدین محمود عینی بنایہ شرح ہدایہ میں رقمطراز ہیں

وقد ذکر الامام خواھر زادہ فی مبسوطہ ان ابا یوسف ذکرہ فی الاملاء مسنداً مرفوعاً الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم (بحث صلوۃ جمعہ)

امام خواہرزادہ نے اپنی مبسوط میں بیان کیا ہے کہ امام ابو یوسف رح نے اس روایت کو باسناد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوعاً ذکر کیا ہے۔

آپ نے ہمارے حق کا لحاظ فرمایا - فرمایا یقیناً تمہارا حق تو یہی ہے کہ مجھ آنا چاہیئے تھا اگر تم ایسی قوم کے پاس جا رہے ہو جہاں شہد کی مکھیوں کی گنگناہٹ کی طرح قرآن پڑھا جاتا ہے - اس لئے تم وہاں حضور علیہ السلام کی روایتیں کم بیان کرنا - قرظہ نے کہا کہ میں کبھی حضور علیہ السلام کی حدیث ہی بیان نہ کروں گا -

پھر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یاد رکھو - روایتیں بہت بڑھ گئی ہیں اور ان میں بیشتر نامعلوم ہیں اس لئے وہ حدیثیں لو جن پر ایک جماعت کا اتفاق ہو اور وہ قرآن کریم کے مطابق ہوں فرماتے ہیں ہم سے معتبر لوگوں نے بیان کیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنے مرض الموت میں قرآن و مشہور روایات کے عمل کا حکم صادر فرمایا ہے -

مؤلف نے اپنی کتاب کا تعارف کراتے ہوئے پہلے ہی صفحہ پر یہ تحریر فرمایا ہے کہ

"مزار امام شافعی رضی اللہ علیہ پر تقریباً روزانہ حاضری ہوتی تھی - حضرت شیخ عبدالقاہر شافعی رح سے رسالہ امام شافعی و کتاب الام من اولہ الی آخرہ پڑھی"

اس کے باوجود آپ کی خوش فہمی کا یہ حال ہے - کہ امام ابو یوسف رح کی عبارت کو آپ امام شافعی رح کی عبارت سمجھ گئے سبحان اللہ اسی فہم و دانش پر ائمہ کرام پر نکتہ چینیاں ہیں - یہ ترجمہ تمام تر الرد علی سیر الاوزاعی کا ہے جو حضرت امام ابو یوسف رح کی مشہور تصنیف ہے اور جس کو عرصہ ہوا کہ مولانا ابو الوفا افغانی تصحیح و تحشیہ کے اہتمام کے ساتھ، مجلس احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد دکن کی طرف سے مصر میں طبع کرا کر شائع کر چکے ہیں الرد علی سیر الاوزاعی چونکہ امام شافعی رح کے مسموعات میں داخل ہے اس لئے وہ کتاب الام کے مجموعہ میں اس کتاب کو بھی روایت کرتے ہیں، لائق مؤلف جنہوں نے سیر الاوزاعی اور سیر الواقدی (۱) کو امام شافعی رح کی تصنیفات میں شمار کیا ہے (صفحہ ۱۱) وہ اگر الرد علی سیر الاوزاعی کو بھی امام شافعی رح کی تصنیف خیال کر لیں تو کیا تعجب ہے -

اب ہم الرد علی سیر الاوزاعی کی اصل عبارت ہدیہ ناظرین کرتے ہیں :-

حدثنا ابن ابی کریمۃ عن ابی جعفر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ دعا الیہود فسألہم فحدثوہ حتی کذبوا علی عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام فصعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم المنبر فخطب الناس فقال ان الحدیث سیفشو عنی فما اتاکم عنی یوافق القرآن فہو عنی وما اتاکم عنی یخالف القرآن فلیس عنی، حدثنی مسعر بن کدام والحسن بن عمارۃ عن عمرو بن مرۃ عن ابی البختری عن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ انہ قال اذا اتاکم الحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فظنوا انہ الذی ہو اہدٰہ والذی ہو اتقٰی والذی ہو احیا، حدثنا اشعث بن سوار واسماعیل بن خالد عن الشعبی عن قرظۃ بن کعب الانصاری رضی اللہ عنہ انہ قال اقبلت فی رہط من الانصار الی الکوفۃ فشیعنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ یمشی حتی انتہینا الی مکان قد سماہ ثم قال ہل تدرون

---

(۱) مؤلف نے تنبیہ نہیں کی مگر یہاں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس سے مراد احکام کی احادیث نہیں بلکہ غزوات وغیرہ کے واقعات ہیں - منکرین حدیث غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں - چنانچہ امام دارمی اپنی سنن میں فرماتے ہیں

معناہ عندی الحدیث عن ایام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس السنن والفرائض صفحہ ۱۷ طبع نظامی

اس کا مطلب میرے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کے واقعات ہیں سنن اور فرائض نہیں -

لم مشيت معكم يا معشر الانصار قالوا نعم لحقنا قال ان لكم الحق ولكنكم تأتون قوما لهم دوي كدوي النحل فاقلوا الرواية عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وانا شريككم فقال قرظة لا احدث حديثا عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ابدا" ص ۳۰ و ۳۱

چند سطروں کے بعد پھر وہ عبارت شروع ہوتی ہے جس کا ترجمہ مولف نے نئی سطر سے یہ کہہ کر شروع کیا ہے کہ "پھر امام شافعی رح فرماتے ہیں" الخ جو حسب ذیل ہے:-

والرواية تزداد كثرة ويخرج منها ما لا يعرف ولا يعرفه اهل الفقه ولا يوافق الكتاب و السنة فاياك وشاذ الحديث وعليك بما عليه الجماعة من الحديث وما يعرفه الفقهاء وما يوافق الكتاب والسنة فقس الاشياء على ذلك فما خالف القرآن فليس عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وان جاءت به الرواية، حدثنا الثقة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم انه قال في مرضه الذي مات فيه انى لا احرم الا ما حرم القرآن والله لا يمسكون على بشئ" ص ۳۱

اس پوری عبارت کے ترجمہ میں مولف نے جو کچھ گڑبڑ کیا ہے اس پر ہم سردست کچھ نہیں کہتے۔ مولف کی کتاب کا کافی حصہ اسی قسم کے تصرفات سے پر ہے۔ اس لئے اس کی تو شکایت ہی بے کار ہے

ہاں مولف نے اس کا بھی خیال نہیں کیا کہ ابن ابی کریمہ، مسعر بن کدام، حسن بن عمارہ، اشعث بن سوار، اسمٰعیل بن خالد ان میں سے کسی ایک کا شمار امام شافعی رح کے شیوخ میں نہیں ہے۔ پھر امام شافعی رح ان کے متعلق حدثنا اور حدثنی کے الفاظ کس طرح استعمال کر سکتے ہیں اگر واقعی امام شافعی رح نے ان سے روایتیں کی تھیں تو آپ نے ان کا شمار امام شافعیؒ کے اساتذہ میں کیوں نہیں کیا۔ نیز آپ نے پہلی روایت کا ترجمہ یہ فرمایا ہے

"ہم سے ابن کریمہ نے انھوں نے ابو جعفر سے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا"

یہ ابو جعفر کونسے صحابی ہیں جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ ذرا طبقات صحابہ سے پتہ بتائیے۔ روایت میں لفظ عن مذکور ہے۔ سمعت نہیں اس لئے آپ نے سنے کا غلط ترجمہ کیوں کیا۔ علاوہ ازیں جب ابو جعفر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تو وہ صحابی ہوئے۔ اور ابن ابی کریمہ تابعی اور چونکہ آپ کے خیال شریف کے مطابق امام شافعیؒ نے ان سے سنا لہٰذا وہ تبع تابعی۔ پھر امام شافعی رح کی اس اہم فضیلت کا ذکر اپنی اس کتاب میں کیوں نہیں فرمایا

امام ابو حنیفہ رح کی طرف غلط نسبت

(۲۶) ص ۲۰۹ پر تحریر ہے:- "امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے یہ فرمایا تھا کہ ایمان اعتقاد کا نام ہے جو دل سے متعلق ہے فرائض اور اعمال، اعضاء اور جوارح کے کام ہیں ایک شخص اگر دل سے توحید و نبوت کا قائل ہو اور فرائض نہ ادا کرتا ہو تو وہ بہر نوع مسلمان ہے اور مواخذہ سے بری ہے"

یہ فرائض ادا نہ کرنے والے کا امام ابو حنیفہ کے نزدیک مواخذہ سے بری ہونا افتراء ہے۔ اس کا ثبوت چاہئے۔

غیر حنفی علماء کو حنفی لکھ دینا

(۲۷) مولف کو طبقات علماء پر بالکل نظر نہیں ہے یا وہ دانستہ غیر حنفی علماء کو حنفی لکھ دیتے ہیں تاکہ عوام سمجھیں کہ جب خود حنفی علماء ہی مذہب حنفی پر اعتراض کرتے ہیں تو یقیناً صحیح ہی ہوگا چنانچہ ص ۲۲۶ پر ملا معین سندی، مصنف دراسات اللبیب کو جو مشہور غیر مقلد اور شیعیت کی طرف مائل تھے حنفی لکھ دیا

ہے جو انکار کے بارے میں علامہ مخدوم ابراہیم سندی المتوفی ۱۳۱۹ھ اپنی کتاب سحق الاغبیا من الطاعنین فی کمل الاولیا والاتقیا والعلماء میں یہ رقمطراز ہیں:-

واعجب من ذلک واغرب ان المخدوم محمد معین بن المخدوم محمد امین الذی کان ابوہ عالما حنفیا تقیا، وھو بعد ما تعلم العلوم العربیۃ وصار ماھرا فی کل فن ترک مذھب ابی حنیفۃ و طعن فیہ و اظھر کثرۃ الاصابۃ مع الامام الشافعی فتقلد الامام الشافعی ثم جمع رسائل صرح فیھا ان دلائل اھل السنۃ والجماعۃ ظنیۃ تتعارض وتتساقط فیما بینھا فلم یبق لھم دلیل الی الحق، وجزم ان معاویۃ رضی اللہ عنہ کان اماما جائرا ولا یتحمل عن مثلہ الدین ولا السنۃ وقال ان الذی اتبع مذھبا معینا ھو الذی حجر علی سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ، ثم قال ان المتبع مذھبا شنوی مشرک لان من تبع ابا حنیفۃ او الشافعی فقد اخرج عنقہ من کوۃ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وآلہ وصحبہ و ادخل فی کوۃ امامہ ابی حنیفۃ والشافعی یتبرأ منہ امتہ یوم القیمۃ (اذ تبرأ الذین اتبعوا من الذین اتبعوا ورأوا العذاب وتقطعت بھم الاسباب) واثبت رفع الیدین فی کل خفض و رفع وقال فی خفض السجدتین ورفعھما عند الشافعی غلطا وحرم الصبر علی شھادۃ الامام حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنھما، واوجب تعزیۃ کل عاشوراء مع الرسوم والبدعات، وقال بقطعیۃ الاقوال الاجتھادیۃ للائمۃ الاثنا عشریۃ من اھل بیت النبوۃ، وقطعیۃ کل کشف من کشوف کل ولی من اولیاء اللہ کیفما کان کقطعیۃ النص القرآنی والحدیث المتواتر وبقطعیۃ الحکم بایمان فرعون. تقیطی الی غیر ذلک من المفاسد

اور اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ مخدوم محمد معین بن مخدوم محمد امین کہ جن کے والد ایک حنفی اور متقی عالم تھے - انھوں نے علوم عربیہ کی تحصیل اور ہر فن میں مہارت پیدا کرنے کے بعد امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کو خیر باد کہا اور امام پر طعن کرنے لگے اور یہ اعلان کیا کہ اکثر مسائل میں امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے زیادہ صائب ہے پھر چند رسائل مدون کئے جن میں یہ صاف طور پر کہہ دیا کہ اہل سنت و جماعت کے دلائل ظنی ہیں اور باہم متعارض اور ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں لہذا ان کے پاس اپنی حقانیت کی کوئی دلیل نہیں - اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق بڑے یقین کے ساتھ کہہ گزرے کہ وہ ظالم خلیفہ تھے اور ان جیسے لوگوں سے دین یا سنت کی کوئی بات نہیں لینی چاہئے - اور یہ کہنے لگے کہ جو شخص کسی مذہب معین کا پیرو ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کو تنگ کرنا چاہتا ہے پھر یہاں تک کہہ دیا کہ ان مذاہب میں سے جو بھی کسی خاص مذہب کا پیرو ہے وہ بت پرست اور مشرک ہے - کیونکہ جو شخص امام ابو حنیفہ یا امام شافعی رحمہا اللہ کی اتباع کرتا ہے وہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روشندان سے اپنی گردن نکال کر اپنے امام کے روشندان میں داخل کرتا ہے - الخ لہٰذا اس تبع سے قیامت کے دن اپنی بیزاری کا اظہار کریں گے یہ وہ دن ہوگا کہ سب مقتدا اپنے اپنے پیرووں سے براءت ظاہر کریں گے عذاب کو دیکھ رہے ہوں گے اور باہمی تعلقات سب ٹوٹ چکے ہوں گے - مخدوم موصوف نے نماز میں ہر دفعہ جھکنے اور اٹھنے پر رفع یدین کو ثابت کیا اور اس بارے میں مذہب شافعی کی تغلیط کی - نیز حضرت امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی شہادت پر صبر کو حرام اور ہر عاشورہ کو پوری رسوم و بدعات کے ساتھ تعزیت کو واجب کر دیا - اور دعویٰ کیا کہ اہل بیت میں سے ائمہ اثنا عشر کے اجتہادی اقوال قطعی ہیں - مکاشفات اولیاء اللہ میں سے ہر ولی کا کشف خواہ وہ کچھ بھی ہو اسی طرح قطعی ہے جس طرح نص قرآنی اور حدیث متواتر قطعی ہیں - اور فرعون قبطی کے متعلق فیصلہ کیا کہ وہ قطعی مومن ہے

الکثیرۃ الوفیرۃ مع ان کل ذلک باطل باطل باطل - (ورق ۲۹ مخطوطہ کتب خانہ مدرسہ مظہر العلوم کراچی)

اور اسی طرح کی بہت سی باتیں ہیں کہ جن کے وہ قائل تھے۔ حالانکہ یہ سب باتیں سرے سے باطل اور غلط اور غیر صحیح ہیں۔!

ہم نے ملامعین کے عقائد زائغہ کی کچھ تفصیل اپنے اس مقالہ میں پیش کی ہے۔ جو کتب خانہ مدرسہ مظہر العلوم کی مخطوطات پر لکھا ہے۔ اور جو دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار سندھ کے ماہنامہ دعوۃ الحق کراچی کے رمضان و شوال ۱۳۷۱ھ کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے۔ ہندوستان کے اہل حدیث حضرات نے ملامعین کی دراسات اللبیب فی الاسوۃ الحسنۃ بالحبیب کو احناف کے مقابلہ میں ایک دستاویز سمجھ رکھا ہے۔ سب سے زیادہ اس کتاب کی تعریف میں اہل حدیث کے مشہور عالم نواب صدیق حسن خاں مرحوم رطب اللسان ہیں۔ چنانچہ اتحاف النبلاء میں رقم طراز ہیں:-

"دراسات اللبیب فی الاسوۃ الحسنۃ بالحبیب، الشیخ الفاضل المحقق محمد معین بن محمد امین سندی است۔ ذاتیفش برائے اثبات عمل بر حدیث صحیح و ترک روایت مذہب مخالف آن بودہ است، و در باب خود در متانت عبارت و رشاقت الفاظ و تحقیقات مطالب علیہ و سرد ادلہ صحیحہ بر مدعائے مطلوب خیلی خوب واقع شدہ برائے افحام خصم و الزام مقلدین کافی ووافی است، قاضی ملا محمد پشاوری را در مدح کتاب مذکورہ تحریص عمل بالحدیث قصیدہ عربی است کہ در آخر کتاب طبع شدہ دیدنی است" (اتحاف النبلاء ص ۲۸)

اگر کبھی موقع ہوا تو انشاء اللہ دراسات کی تحقیقات پر پورا مقالہ قلمبند کریں گے۔

(۲۷) اسی طرح صفحہ ۲۲۳ پر یہ ثابت کرنے کے لئے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کی ہدایت پر آپ کے متبعین نے عمل نہیں کیا — ارشاد ہوتا ہے:-

"کہ اس حقیقت کے انکشاف کے لئے ہم متقدمین و متاخرین ائمہ محققین حنفیہ کے اقوال کو پیش کرتے ہیں"

اس کے بعد مولف نے علی الترتیب حسب ذیل علماء کے اقوال پیش کئے ہیں علامہ عبد الرحمن ابو شامہ، امام شعرانی، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، اور علامہ محمد حیات سندھی حنفی، حالانکہ ان میں سے کوئی بھی حنفی نہیں - ملا محمد حیات سندھی کے متعلق نواب صدیق حسن خاں اتحاف النبلاء میں صاف تصریح کرتے ہیں کہ

"تقلید ہیچ یکے نمی کرد" ص ۴۴

شیخ اکبر بھی کسی کے مقلد نہیں خود مجتہد ہیں، علامہ ابو شامہ اور امام شعرانی دونوں شافعی ہیں اور ان حضرات نے اپنے بیانات میں کہیں فقہاء احناف کا نام نہیں لیا، اس لئے ان کے بیانات کو محض فقہاء حنفیہ کے متعلق سمجھنا بڑی جسارت ہے بلکہ ابو شامہ اور شعرانی کے متعلق تو ظن غالب یہی ہے کہ انہوں نے یہ اپنے مسلک کے فقہاء کا طرز عمل پیش کیا ہے - باقی ابن عربی اور ملا حیات سندھی چونکہ کسی خاص فقہی مسلک کے پیرو نہ تھے اس لئے اس بارے میں ان کے بیانات کا جو وزن ہے ظاہر ہے۔

حنفی مذہب کے بارے میں مولف کی معلومات

(۲۸) ہم اس سلسلہ میں صرف تین مثالوں پر اکتفا کریں گے - مولف نے صفحہ ۲۵۵ سے لیکر صفحہ ۲۵۸ تک حنفیہ اور شافعیہ کے اختلافی مسائل کا ایک نقشہ پیش کیا ہے - منجملہ ان کے حسب ذیل یہ تین مسائل بھی حنفیہ کی طرف منسوب فرمائے ہیں -

(۱) "وضو اور غسل میں کلی کرنا اور ناک میں پانی دینا فرض ہے"

حالانکہ حنفی مذہب کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ وضو میں چار فرض ہیں اور ان میں کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا شامل نہیں۔

(۲) "مسلمان غلام کا کافروں کو امن دینا جائز ہے"

اس مسئلہ کو بھی اس طرح حنیفہ کی طرف منسوب کر دیا صحیح نہیں۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ الرد علی سیر الاوزاعی میں فرماتے ہیں، قال ابوحنیفۃ رضی اللہ عنہ اذا کان العبد یقاتل مع مولاہ جاز امانہ، صفحہ ۱۲ (امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب غلام اپنے آقا کے ساتھ لڑ رہا ہو تو اس کی امان جائز ہے)۔

(۳) "عید کے دن اگر روزے کی نذر مانے تو جائز ہے"

اس مسئلہ کو بھی ادھورا بیان کیا۔ یوں چاہیئے کہ نذر تو صحیح ہے مگر عید کے دن روزہ رکھنا ناجائز۔ ایام ممنوعہ کے علاوہ کسی اور دن قضاء کرے۔ امام محمد، جامع صغیر میں فرماتے ہیں

محمد عن یعقوب عن ابی حنیفۃ رضی اللہ عنہم فی رجل قال للہ علی صوم یوم النحر قال یفطر ویقضی (ص ۲۹ طبع مصطفائی)

امام محمد بواسطہ امام ابو یوسف امام ابوحنیفہ (رضی اللہ عنہم) سے روایت کرتے ہیں جو شخص یہ کہے کہ میں اللہ کے لئے بقرعید کے دن روزے کی نذر مانتا ہوں تو وہ اس دن روزہ نہ رکھے اور اس کی قضا کرے۔

مذاہب اربعہ کے متعلق مولف کی معلومات

(۲۹) مذاہب اربعہ کے بارے میں مولف کی جو معلومات ہے اس کے اعداد و شمار ملاحظہ ہوں صفحہ ۲۵ پر ارشاد ہے:-

"امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت امام شافعی رح کے ممتاز شاگرد ہیں اور دنیائے اسلام کے ممتاز مسلم امام ہیں آپ نے حضرت امام شافعی رح کے معتد اصولوں کو کلیتہً تسلیم کیا، اور عمل کیا صرف ان اصولوں میں دو باتوں کا اضافہ کیا یا ترمیم کی۔ (۲۲)

(۱) ہمارے قیاس سے اقوال صحابہ بہتر ہیں۔

(۲) خبر واحد قابل عمل ہے۔

"ان اصولوں کی وجہ سے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا امام شافعی رح کے مذہب سے اگر اختلاف تسلیم کر لیا جائے تو وہ زیادہ سے زیادہ دس فیصدی مسائل میں نظر آتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب سے امام شافعی رح نے تقریباً ۲۰ فیصدی مسائل میں اختلاف کیا ہے یہ اختلاف عبادات میں کمتر اور معاملات میں نمایاں ہے۔ حنفی مذہب سے امام شافعی رح نے تقریباً ۷۰ فیصدی مسائل میں اختلاف کیا ہے۔ یہ اختلاف عبادات معاملات ہر فقہی شعبہ میں نمایاں نظر آتا ہے۔"

ماشاء اللہ تحقیقات کا دریا بہایا جا رہا ہے لیں اختلاف ہے تو ایک فقہ حنفی سے، اعداد و شمار اس طرح بیان کر دیئے ہیں۔ کہ جیسے مولف کو مذاہب اربعہ پر بڑی گہری بصیرت حاصل ہے اور ان مذاہب کا ایک ایک مسئلہ پیش نظر ہے۔ درحقیقت مولف نے جو کچھ لکھا ہے خود ساختہ ہے یہ بھی غلط ہے کہ امام احمد رح نے امام شافعی رح کے اصول کو کلیتہً تسلیم کیا۔ اور وہ دونوں باتیں بھی غلط ہیں جن کا ذکر مولف نے اضافہ اور ترمیم کے سلسلے میں کیا ہے کیونکہ امام شافعی رح کے نزدیک خبر واحد پر عمل کرنا کیا معنی ان کے اصول پر تو خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادتی تک ہو سکتی ہے چنانچہ خود مولف نے اسی سلسلے میں صفحہ ۵ پر امام محمد رحمہ اللہ سے امام شافعی رح کا مناظرہ نقل کیا ہے۔ رہا اقوال صحابہ سے امام شافعی رح کا اپنے قیاس کو بہتر سمجھنا اس کے متعلق خود مولف صفحہ ۵۹ پر امام شافعی رح سے نقل کر چکے ہیں کہ

" صحابہ کرام کے متعلق فرماتے تھے والصحابۃ فوقنا فی کل علم واجتھاد وورع وعقل۔ صحابہ ہم سے علم، اجتہاد تقویٰ اور عقل میں بڑھے ہوئے ہیں"

یہ ہے اختلافی مسائل کے اعداد و شمار دہ تو سرتا سر خود ساختہ ہیں ہی۔ اب ہم اس سلسلہ میں علماء نے جو کچھ لکھا ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم اتحاف النبلاء میں لکھتے ہیں کہ

خلاف احمد با ابوحنیفہؒ در بست مسئلہ گفتہ اند ص۱۹۳

علماء نے امام احمد کا اختلاف امام ابوحنیفہ سے صرف بیس مسائل میں بتایا ہے۔

اور علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شرح سفر السعادت میں ارقام فرماتے ہیں:۔

مذہب امام ابوحنیفہ اکثر موافق مذہب امام احمد بن حنبل است در تمام مذہب در مواضع معدودہ خلافے باشد واگر ہست روایتے در آں جانب ہست و بنائے مذہب امام احمد تمام بر احادیث واخذ بظواہر است و خلاف امام شافعی اکثر است از خلاف وے با ابی حنیفہ یکصد و بیست و پنج مسئلہ از اصول مسائل نوشتہ اند کہ احمد با ابوحنیفہ موافق است در آں و با شافعی مخالف و فی الحقیقت مذہب حنفی جامع معقول و منقول است۔

(ص ۲۳ طبع نولکشور)

امام ابوحنیفہؒ کا مذہب اکثر امام احمد بن حنبلؒ کے موافق ہے۔ سارے مذہب میں چند گنے چنے مسائل میں اختلاف ہوگا۔ اور جہاں اختلاف ہے وہاں اس طرف بھی روایت موجود ہے۔ اور امام احمدؒ کے مذہب کی بنا تمام تر احادیث اور ظواہر کے اخذ پر ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی بہ نسبت امام احمدؒ کا اختلاف امام شافعیؒ سے زیادہ ہے علماء نے ایک سو پچیس مسئلے اصول مسائل کے ایسے لکھے ہیں کہ جن میں امام احمدؒ امام ابوحنیفہؒ کے موافق ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ کے مخالف، اور درحقیقت مذہب حنفی معقول اور منقول دونوں کا جامع ہے۔ (۴۳)

یہ تو امام احمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے باہمی اختلاف مسائل کی تفصیل تھی۔ اب ذرا امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے اختلافی مسائل کی تعداد بھی معلوم فرما لیجئے۔ امام شعرانی، المیزان الکبریٰ میں لکھتے ہیں:۔

قال الامام ابوجعفر الشیز امادی رحمہ اللہ تعالیٰ وقد تتبعت المسائل التی وقع الخلاف فیھا بین الامام ابی حنیفۃ والامام مالک رضی اللہ عنھما فوجدتھا یسیرۃ نحو عشرین مسئلۃ انتھی و لعل ذلک بحسب اصول المسائل التی نص علیھا الامامان

(ص ۶۲ ج ۱ طبع مصر)

امام ابوجعفر شیز امادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے ان مسائل کا تتبع کیا کہ جن میں امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے درمیان اختلاف ہے تو وہ بہت ہی تھوڑے پائے کوئی بیس مسئلوں کے قریب قریب ہیں (امام موصوف کا بیان ختم ہوا) اور غالباً یہ تعداد ان اصول مسائل کے اعتبار سے ہے کہ جن کے متعلق دونوں اماموں کی تصریح موجود ہے۔

اب مولف اس امر کا ثبوت فراہم کردیں کہ امام شافعیؒ کا اختلاف امام ابوحنیفہؒ سے مسائل میں ستر فیصدی ہے۔

دعوے اور دلیل میں عدم مطابقت

(۳۰) بوالعجبی ملاحظہ ہو۔ ص ۲۵۸ پر عنوان قائم کیا ہے۔
" نیت کہاں لڑا یا نڑھنا چاہیئے"

اس کی دلیل سنئے:۔

" وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے حضور علیہ السلام کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ نے

داہنا ہاتھ بائیں پر رکھ کر سینہ پر نیت باندھی" ص ۲۵۹

مدعا کی ثابت ہوا۔

"یہی شافعیہ کا مذہب ہے۔ اور جمہور محدثین کا بھی یہی طریقہ ہے کہ ناف سے اوپر اور سینے کے نیچے نیت باندھی جائے" ص ۲۶۰

سینہ پر اور سینہ کے نیچے کا فرق ملحوظ رہے۔

حضرت ابن مسعودؓ اور معوذتین!

(۳۱) مولف نے رفع یدین کی بحث میں محض اس بنا پر کہ حنفیہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں اس صحابی جلیل المرتبت کے متعلق ابوبکر بن اسحق شافعی کے حوالے سے یہ نقل کیا ہے۔

"آپ کو یہ محفوظ نہ رہا تھا کہ قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس قرآن سے ہیں یا نہیں"

حالانکہ یہ محض غلط ہے۔ حافظ ابن حزم ظاہری فرماتے ہیں

هذا كذب على ابن مسعودؓ موضوع وانما صح عنه قراءة عاصم عن زر عنه وفيها المعوذتان
(شرح سلم الثبوت از بحر العلوم صفحہ ۲۱۴)

یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ پر جھوٹ گڑھ دیا گیا ہے۔ ان سے عاصم کی قرأت صحیح ہے جو زر کے واسطے سے روایت کرتے ہیں اور اس میں قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس دونوں موجود ہیں۔

صرف عاصم ہی نہیں بلکہ حمزہ اور کسائی (رحمہم اللہ) کی قرات میں بھی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے معوذتین موجود ہیں۔ ان تینوں حضرات کا شمار قرائے سبعہ میں ہے کہ جن کی قرات متواتر ہے۔ (۴۴)

کیا صحیح بخاری میں امام ابن معین اور امام احمد سے کوئی روایت موجود نہیں

(۳۲) ص ۳۰۷ پر اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ صحیحین میں امام شافعیؒ سے کوئی روایت کیوں نہیں ہے یہ غلط بیانی کی ہے۔

"امام بخاری رحمہ اللہ کے استاد امام احمد بن حنبلؒ و یحییٰ بن معین بھی تھے گو صحیح بخاری میں ان سے بھی روایت نہیں ہے۔ جس کی حقیقت یہ ہے کہ جامع صحیح کے لئے جو اصول امام بخاریؒ نے مقرر فرمائے تھے اس لحاظ سے امام شافعی، امام احمد و امام یحییٰ بن معین کے ذریعہ سے اگر روایت کی جاتی تو وہ سند نازل ہو جاتی۔ امام بخاریؒ نے یہ التزام اپنی تاریخ کبیر وغیرہ میں نہیں فرمایا اس لئے ان کتابوں میں ان مقدس حضرات سے روایتیں موجود ہیں"۔

مولف نے یہ نہیں بتایا کہ صحیح مسلم میں امام شافعی رحمہ سے کیوں روایت نہیں ہے۔ اور امام بخاری رح کی طرف سے جو عذر بیان کیا ہے وہ خود ساختہ اور خلاف واقعہ ہے۔ یہ بھی غلط بیانی ہے کہ امام شافعی رح سے تاریخ کبیر وغیرہ میں کوئی روایت موجود ہے۔ مولف امام بخاریؒ کی کسی تصنیف میں بھی امام شافعیؒ کی روایت سے کوئی حدیث ثابت کر دکھائیں۔ ورنہ ایسی بے دلیل باتوں سے کیا فائدہ!

صحیح بخاری میں امام احمد بن حنبل رح سے بھی روایت موجود ہے اور امام یحییٰ بن معین رح سے بھی اور نہ صرف امام احمدؒ سے بلکہ ان کے شاگردوں تک سے روایت موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

قال ثنا احمد بن حنبل حدثنا يحيى بن سعيد عن سفيان حدثني حبيب عن سعيد عن ابن عباس حرم من النسب سبع (الحديث)۔ باب ما يحل من النساء وما يحرم

اور امام احمدؒ کے شاگرد کی روایت یہ ہے

حدثنی احمد بن الحسن قال حدثنا احمد بن محمد بن حنبل بن هلال قال حدثنا معتمر عن كهمس عن ابن بريدة عن ابيه قال غزا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم ست عشرة غزوة باب كم غزا النبي صلى الله عليه وسلم۔

امام یحییٰ بن معین کی روایت سنئے۔ حدثنا یحیی بن معین وصدقة قالا اخبرنا عمر بن سعيد بن ابي حسين عن ابن ابي مليكة عن عقبة بن الحارث قال رأيت ابا بكر وحمل الحسن الحديث مناقب الحسن والحسين۔

کیا اندلس میں امام اوزاعی کا مذہب شافعی مذہب کے اثر سے ختم ہوا

(۳۳) ص ۳۱۵ پر مرقوم ہے:-

"تیسری صدی کے نصف میں امام شافعیؒ کے مذہب کے مقابلہ میں اندلس میں امام اوزاعیؒ کے مذہب کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہوگیا"

یہ بھی خود ساختہ ہے۔ اندلس میں امام اوزاعیؒ کا مذہب شافعی مذہب کے مقابلہ میں نہیں بلکہ مالکی مذہب کی اشاعت کے سبب ختم ہوا ہے۔ علامہ ابن فرحون لکھتے ہیں

وغلب مذهب الاوزاعي رحمه الله على الشام وعلى جزيرة الاندلس الى غلب عليها مذهب مالك فانقطع (ص ۱۳ طبع مصر)

امام اوزاعیؒ کے مذہب کی اشاعت شام اور اندلس میں ہوئی پھر جب اندلس میں امام مالکؒ کا مذہب شائع ہوا اوزاعی کا مذہب ختم ہوگیا۔

کیا صاحبین نے امام ابوحنیفہؒ سے دو ثلث مسائل میں اختلاف کیا

(۳۴) ص ۳۱۹ پر مرقوم ہے:-

"امام غزالی رحمہ اللہ نے منخول میں فرمایا ہے کہ ان دونوں اماموں ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے اپنے امام سے دو ثلث مذہب میں اختلاف کیا ہے"

یہ بھی محض بے اصل اور بالکل غلط ہے۔ حنفی مذہب کی کتابیں موجود ہیں ان کی بنیاد پر کسی ایک باب ہی میں اس دعویٰ کو ثابت کیا جائے۔ علاوہ ازیں منخول اس موضوع پر غیر مستند کتاب ہے، اس سے ایک بات بھی ائمہ احناف کے متعلق نقل نہیں کرنا چاہئے۔

چنانچہ علامہ شہاب الدین احمد بن حجر مکی شافعی "الخیرات الحسان" میں منخول کے بارے میں فرماتے ہیں:-

اعلم ان بعض المتعصبين ممن لم يميز توفيقا جاءني بكتاب منسوب للامام الغزالي فيه من التعصب الفظيع والحط الشنيع على امام المسلمين واوحد المجتهدين ابي حنيفة رحمه الله ما تمجه الاذان ويقول عند سماعه الموفق المنصف ليت ذلك ما كان۔ (ص ۴۵۳ طبع مصر)

جاننا چاہئے کہ ایک متعصب جو توفیق سے بے بہرہ تھا میرے پاس ایک کتاب لیکر آیا جسے امام غزالی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور جس میں امام مسلمین اور یکتا مجتہدین امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے متعلق ایسے برے تعصب کا ثبوت دیا ہے اور آپ کی اتنی سخت تنقیص کی ہے کہ جس کو سن کر کان بند کرنے پڑیں اور ہر انصاف پسند جو توفیق الٰہی سے محروم نہ ہو کہہ اٹھے کہ کاش ایسا نہ ہوتا۔

سحنون کو امام مالکؒ کا شاگرد قرار دیدیا

(۳۵) ص ۲۲۸ پر یہ کہہ کر

"آپ (یعنی امام مالکؒ) کے شاگرد خاص اور جانشین کہلائے جاتے تھے یہ ہیں"

دوسرے نمبر پر عبدالسلام بن سعید التنوخی الملقب بہ سحنون کو ذکر کیا ہے جو امام مالکؒ کے شاگرد خاص کیا ان کی زیارت تک سے مشرف نہ ہوئے تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں :-

لحی اللہ الفقر فلولاہ لادرکت مالکا (الدیباج المذہب صفحہ ۱۶۰)

اللہ مفلسی کا برا کرے اگر وہ نہ ہوتی تو میں فرور امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔

اسی طرح نمبر ۹ پر عیسیٰ بن دینار کو ذکر کیا ہے ص ۲۳۰ حالانکہ ان کے متعلق بھی ابن فرحون نے تصریح کردی ہے کہ انھوں نے امام مالک کو نہیں دیکھا تھا (ملاحظہ ہو الدیباج المذہب ص ۱۷۸)

کیا فقہ شافعی کا مسئلہ غلط ہے؟

(۳۶) مولف نے حنفی مذہب کی مخالفت میں تو ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے۔ لیکن شیخ ابن قیم کے علم کے آپ اس قدر معترف ہیں کہ شافعی فقہ کے مسئلہ کو بھی غلط ماننے کے لئے تیار ہیں۔ چنانچہ امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب میں اگر کوئی شخص تین طلاقیں بیک وقت دے تو وہ تین ہی شمار کی جائیں گی۔ دیگر ائمہ کا بھی یہی مسلک ہے لیکن مولف صاحب اس بارے میں شیخ ابن القیم رحمہ اللہ کے ہم زبان ہیں کہ "اگر کوئی شخص بیک وقت تین طلاقیں دیدے تو وہ ایک محسوب ہو" صفحہ ۲۳۲

حنفی مذہب

(۳۷) ص ۲۳۴ پر مرقوم ہے :-

"حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے تفہیمات الٰہیہ میں جو یہ ارشاد فرمایا ہے۔ میرے دل میں ایک خیال ڈالا گیا ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے مذہب امت میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ سب سے زیادہ پیرو بھی ان ہی مذاہب کے پائے جاتے ہیں، فقہا، محدثین، مفسرین، متکلمین اور صوفیہ زیادہ تر مذہب شافعی کے پیرو ہیں اور حکومتیں اور عوام زیادہ تر مذہب حنفی کے تبع ہیں"

مولف ہر جگہ مذہب حنفی کی تنقیص کے در پے ہیں۔ سعدی نے سچ کہا ہے

ہر بہ چشم عداوت بزرگ تر عیب است   گل است سعدی و در چشم دشمنان خار است

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی مذکورہ بالا عبارت نقل کرنے سے بھی۔ یہی مقصد ہے۔ حالانکہ شاہ صاحب موصوف نے اپنی تصنیفات میں جگہ جگہ مذہب حنفی کی خوبی اور اس کی عظمت کو بیان کیا ہے خود ان کا خاندان بھی حنفی ہے۔ نواب صدیق حسن خاں نے اتحاف النبلاء میں شاہ عبدالعزیز صاحب کے تذکرہ میں لکھا ہے۔

"خاندان ایشاں خاندان علوم حدیث وفقہ حنفی است" ص ۲۹۶

گر مولف ہر جگہ سے اپنا مطلب نکالنا چاہتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب، المسوی من احادیث الموطا میں کیا فرماتے ہیں

واذکر فی کل باب مذہب الشافعیۃ والحنفیۃ اذہم الفئتان العظیمتان الیوم وہو اکثر الامۃ

اور میں ہر باب میں شافعی اور حنفی مذہب کو بیان کروں گا کیونکہ اس عہد میں یہی دو بڑے گروہ ہیں اور امت میں سب سے

وهم المصنفون فی اکثر الفنون الدینیة وهم قادة الامة (ص ۹۵-۱۰ طبع مکرمہ)

زیادہ ان ہی کی تعداد ہے اور یہی دونوں اکثر فنون دینیہ کے مصنف ہیں اور یہی اُمت کے مقتدا ہیں۔

دیکھئے شاہ صاحب دونوں مذاہب کی عظمت کے یکساں معترف ہیں۔ اور دونوں کے متعلق تصریح فرماتے ہیں کہ یہی اکثر فنون وغیرہ کے مصنف ہیں۔ نیز اپنے مکتوبات میں رقم طراز ہیں!۔

روزے در حدیث لو کان الایمان عند الثریا لنالہ رجال او رجل من ھولاء یعنی اہل فارس و فی روایة لنالہ رجال او رجل بلا شک مذاکرہ کردیم فقیر گفت امام ابو حنیفہ رہ دریں حکم داخل است کہ خدائے تعالیٰ علم فقہ را بر دست وے شائع ساخت و جمعے از اہل اسلام را بآں فقہ مہذب گردانید خصوصاً در عصر متاخر کہ دولت ہمیں مذہب است و بس، در جمیع بلدان و جمیع اقالیم بادشاہان حنفی اند و قضاة و اکثر مدرسان و اکثر عوام حنفی (ص ۱۶۸ کلمات طیبات یعنی مجموعہ مکتوبات شاہ صاحب وغیرہ طبع مجتبائی دہلی)

ایک دن اس حدیث پر ہم نے گفتگو کی کہ اگر ایمان ثریا کے پاس بھی ہوتا تو اہل فارس کے کچھ لوگ، یا ایک شخص اس کو ضرور حاصل کر لیتا اور ایک روایت میں بلا شک کے الفاظ اور آتے ہیں۔ فقیر نے کہا کہ امام ابو حنیفہؒ اس حکم میں داخل ہیں کیونکہ خدائے تعالیٰ نے علم فقہ کی اشاعت آپ کے ہاتھوں کرائی اور اہل اسلام کی ایک جماعت کی اس فقہ کے ذریعہ اصلاح فرمائی۔ خصوصاً اس عہد اخیر میں کہ دولت بس یہی ایک مذہب رہ گیا ہے، سارے شہروں میں اور تمام ملکوں میں بادشاہ حنفی ہیں، قاضی حنفی ہیں، اکثر مدرسین اور اکثر عوام حنفی ہیں۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا مسلک افتا

(۳۸) صفحہ ۳۴۴ پر تحریر ہوتا ہے۔

"حضرت قطب الاقطاب شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ شافعی مذہب کے مطابق فتوے دیتے تھے اور آپ کا حنبلی مذہب تھا۔ حنبلی اور شافعی تقریباً ایک ہی ہیں۔"

بیشک آپ حنبلی تھے لیکن باقی دونوں باتیں غلط ہیں۔ غنیة الطالبین حضرت پیران پیر کی موجود ہے اس سے پتہ لگایا جائے کہ وہ فقہ شافعی کے مطابق ہے یا فقہ حنبلی کے۔

کیا حنبلی مذہب کے سوا اور کسی مذہب میں ولی نہیں ہوتا

(۳۹) اسی صفحہ پر مرقوم ہے:۔

"آپ (یعنی حضرت پیران پیر) سے جب پوچھا گیا ھل کان للہ ولیا علی غیر اعتقاد؟ فقال ما کان ولا یکون طبقات ابن رجب یعنی جو اعتقاد آپ کا ہے (حنبلی) یا اس کے سوا بھی ولی ہوتے ہیں۔ فرمایا نہ تو ہوئے ہیں نہ ہوں گے"

مولف نے اوپر جو دونوں غلط باتیں لکھی تھیں اس کا منشا صرف یہ تھا۔ کہ حنبلی اور شافعی تو ایک ہی ہیں اسی لئے حضرت پیران پیر صاحب رحمہ اللہ شافعی مذہب پر فتوے دیا کرتے تھے۔ اور خود آپ کے فرمانے کے مطابق دوسرے مذاہب میں نہ اولیا ہوئے ہیں اور نہ ہوں گے۔ لہذا حنفی مذہب میں کوئی ولی نہیں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں کیا تلبیس ہے۔

ہم مولف سے دریافت کرتے ہیں کہ اگر اعتقاد کا مطلب آپ فروعی اختلافات سمجھے ہیں تو حنفی مالکی کیا شافعی مذہب میں بھی اولیا ندارد ہیں اور اگر اعتقاد سے مراد عقائد ہیں تو بیان فرمائیں کہ امام احمد بن حنبل کا وہ کونسا نیا عقیدہ ہے جو حضرت امام ابو حنیفہ امام مالک اور امام شافعی (رحمہم اللہ) کے خلاف ہے اور جب چاروں ائمہ کے عقائد ایک ہیں تو اس بات کو نقل کرنے سے بجز ابلہ فریبی کے اور کیا مقصد حاصل ہوا کیونکہ اس صورت میں حنفی مالکی سبھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ ان کے اعتقاد

کے خلاف نہ کوئی دلیل ہو اب نہ ہوگا۔

مؤلف نے اپنی کتاب کے تعارف کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ

"تقریباً چالیس سال ہوئے جب سیرۃ حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہ کا مسودہ مرتب کیا تھا۔ اس کے عین بعد حج کو گیا۔ حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ حاضر ہوا وہاں ہفتہ عشرہ قیام کر کے پھر مصر پہنچا۔ مصر میں تقریباً دو سال قیام رہا ہندوستان میں تکمیل علوم عربیہ کر چکا تھا لیکن پھر بھی یہ ذوق تھا کہ اس علمی شہر میں فقہ حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہ وحدیث کی مزید تکمیل کی جائے۔ جامع ازہر میں اور اس کے علاوہ حضرت علامہ رشید رضا رحمۃ اللہ علیہ و حضرت شیخ عبدالظاہر شافعی رحمہ اللہ و حضرت شعیب مالکی رحمہ اللہ سے بھی معمولی استفادہ کا موقع ملا۔ مزار امام شافعی رضی اللہ عنہ پر تقریباً روزانہ حاضری ہوتی تھی، حضرت شیخ عبدالظاہر شافعی رحمہ اللہ سے رسالہ امام شافعی و کتاب الام من اولہا الی آخرہ پڑھیں۔ اس انعام یزدانی کے بعد یہ احساس ہوا کہ "خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم" آنکھیں کھل گئیں اور یہ خیال ہوا کہ اب "سیرۃ الشافعی" کو بڑے احتیاط سے دوبارہ مرتب کرنا چاہئے۔ وہاں سے واپسی پر آہستہ آہستہ اسماء و رجال کا ذخیرہ مرتب کیا حیدرآباد میں چند نادر اور ضروری کتابیں بھی چھپ گئی تھیں ان کو منگا کر مطالعہ کیا" صفحہ ۲

بایں ہمہ فضل و کمال و کد و کاوش خود مولف کے ادعاء کے مطابق "از سرِ نو نئی ترتیب سے مرتب کردہ اور مکمل سوانح" سیرۃ کا حال یہ ہے۔ خدا جانے وہ پہلا مرتب کردہ مسودہ ہی شائع ہو جاتا تو نہ جانے وہ کیا ہوتا مولف کے چونکہ چالیس سال سے زیادہ شغل علمی کی نذر ہوئے۔ اس لئے ہم نے بھی مشتے نمونہ از خروارے و اندکے از بسیارے کے طور پر پچاس سے کہیں زیادہ غلطیاں ناظرین کے سامنے پیش کر دی ہیں ان انتالیس نمبروں میں متعدد نمبر ایسے ہیں کہ جن میں ایک نمبر کے تحت مولف کی کئی کئی غلطیاں درج ہیں۔ اور بہت سی موٹی موٹی غلطیاں نظر انداز کر دی ہیں کہ ناظرین پڑھتے پڑھتے اکتا نہ جائیں جیسے امام مالکؒ کے درس میں تمری کا قصہ صفحہ ۱۰ پر مذکور ہے یا امام شافعیؒ کا بشر بن غیاث مریسی سے مکالمہ جو صفحہ ۲۹۹ اور ۳۰۲ پر درج ہے وغیرہ وغیرہ کہ یہ سب خانہ ساز باتیں ہیں۔ محدث کوثری رحمہ اللہ نے "احقاق الحق بابطال الباطل فی مغیث الخلق" میں ان کے جعلی ہونے پر سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔ اہل علم اس میں ملاحظہ فرمالیں۔

غالب کا مذہب

میکش اکبرآبادی

"فاران" کے دوسرے تحقیقی مقالوں کے علاوہ میں خصوصیت سے فاضل مدیر کا "نقش اول" اور "ہماری نظر میں" ضرور پڑھتا ہوں اور اس سے استفادہ کرتا ہوں۔ ماہر صاحب جو کچھ لکھتے ہیں اس سے میں پوری طرح متفق نہیں ہوں لیکن یہ مجھے یقین ہے کہ جو کچھ وہ لکھتے ہیں خلوص و صداقت سے لکھتے ہیں، تفکر و تدبر سے لکھتے ہیں اور اپنے علم میں وہ خالص اسلام کی نمایندگی کرنا چاہتے ہیں لیکن بعض اوقات مجھے یہ خیال ضرور ستانے لگتا ہے کہ معلوم نہیں ماہر صاحب علامہ مودودی صاحب[1] کی تصانیف کا مطالعہ زیادہ کرتے ہیں یا قرآن و حدیث کا۔ اور یہ خیال جب آتا ہے جب میں ان کی ایسی تنقیدیں دیکھتا ہوں جیسی فاران جون ۱۹۶۸ء میں حیات اشرف پر منصور کے ضمن میں کی گئی ہے کیونکہ جس کی نظر سے بخاری شریف کی حدیث قرب بہ نوافل گزری ہوگی وہ منصور پر اگر تنقید بھی کرے گا تو اس کا لہجہ دوسرا ہوگا اور جس کی نظر سے صوفیہ کا ادب گزرا ہوگا وہ منصور کے دعوے کا ذمہ دار تصوف کو نہ ٹھیرائے گا[2] کیونکہ اکثر صوفیہ نے منصور کی تردید بھی کی ہے اور اگر تصوف کو قطعاً مردود سمجھ کر اس کے ادب پر نظر ڈالنا بھی غیر ضروری قرار دیا جائے تو ایسی صورت میں تصوف پر تنقید بھی یقیناً غیر ضروری ہے جس چیز کو ہم نہیں جانتے اس کے متعلق رائے دینا بھی صحیح طریقہ کار نہیں ہے۔ ایک بڑے علامہ جو امام کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں تصوف پر اتحاد و حلول کا الزام عائد کرتے ہیں تو حیرت ہو جاتی ہے کیونکہ ایک معمولی طالب علم بھی یہ جانتا ہے کہ اتحاد و حلول کے لئے دو مستقل وجود ضروری ہیں اور صوفیہ دو وجودوں سے قطعاً انکار کرتے ہیں۔ بہر حال حدیث مبارک کے مطابق ہمیں اپنے اختلاف کو رحمت ہی بنائے رکھنا چاہیئے (اختلاف امتی رحمة او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم)

دراصل عرض کرنا تو مجھے غالب کے مسلک کے متعلق تھا۔ "ذکر غالب" پر تبصرہ کرتے ہوئے فاضل مدیر نے غالب کے مذہب کے متعلق مالک رام صاحب ایم۔ اے کے فیصلے کو ان کے ہی الفاظ میں اس طرح نقل کیا ہے۔

"گویا وہ حضرت علیؑ کو دوسرے صحابہ پر فضیلت دیتے ہیں جسے دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شیعیت کا امتیازی نشان تبرا نہیں بلکہ تولا ہے، وہ دوسرے صحابہ پر تبرا نہیں کرتے بلکہ حضرت علیؓ سے اپنے تولا اور محبت کا اظہار کرتے ہیں یعنی اثنا عشری تفضیلی شیعی ہیں۔"

مالک رام صاحب ایک محقق اور بلند پایہ مصنف ہیں لیکن اس موقع پر موصوف نے غالب کو اثنا عشری اور تفضیلی ایک ساتھ کہہ کر کوئی واضح بات نہیں فرمائی ہے کیونکہ تفضیلی اور اثنا عشری دو بالکل علیحدہ اور مختلف مسلک ہیں۔

تفضیلی انہیں کہتے ہیں جن کے خیال میں حضرت علی رضؓ کو تمام صحابہ اور خصوصاً حضرت ابو بکرؓ پر فضیلت ہے اور کم سے کم ان امور میں ضرور فضیلت ہے جو استحقاق خلافت کے لئے ضروری ہیں۔ اس عقیدے کے لوگ خود صحابہ میں موجود تھے۔ سلمانؓ فارسی، عمار یاسر، سعید بن زید[3]

---

[1] مولانا مودودی کی کتابوں کو میں کتاب و سنت سے قریب تر پاتا ہوں اس لئے انھیں پڑھتا ہوں۔ (م۔ ق)

[2] مگر میں کوئی کیجئے کہ کیا اہل تصوف "انا الحق" کی طرح طرح سے توجیہیں کرتے ہیں۔ (م۔ ق)

[3] حالانکہ یہ فضیلت سبقت ایمان میں ہے یعنی ان حضرات کے خیال میں ہے کہ سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ ایمان لائے تھے (م۔ ق)

خباب بن ارت وغیرہ کا یہی عقیدہ تھا (رضوان اللہ علیہم اجمعین) علمائے اسلام اور صوفیوں میں اس عقیدے کے بہت اصحاب ہیں۔ لیکن اثنا عشری فرقہ ایک مستقل فرقہ ہے جس کے عقائد اعمال وغیرہ کا ایک علٰحدہ اور مستقل ضابطہ ہے یہ حضرات بارہ اماموں کو مانتے ہیں اسی لئے اثنا عشری کہلاتے ہیں (اثنا عشر کے معنی بارہ ہیں) اور اس لئے یقیناً اس فرقہ کا یہ نام امام حسن عسکری علیہ السلام امام یازدہم کے بھی کافی زمانے بعد میں رکھا گیا ہوگا۔ اس فرقہ کا اصول ہے کہ تولا بغیر تبرا نہیں ہو سکتا۔ اور اس فرقے کے عقیدے میں اہل بیت رسول سے یہی دوازدہ امام مع حضرت سیدۃ النساء علیہا السلام مراد ہیں۔ کل بنی ہاشم یا کل بنی فاطمہ مراد نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت محمد ابن حنفیہؓ اور حضرت زید شہید علیہ السلام سے بھی یہ فرقہ بیزاری کا اظہار کر چکا ہے اور کرتا ہے۔

لہٰذا یہ تو ممکن ہے کہ غالبؔ اثنا عشری شیعی ہوں یا محض تفضیلی ہوں لیکن یہ کہتے وقت ہمیں یہ ضرور سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ دونوں فرقے ایک نہیں ہیں بلکہ بالکل مختلف ہیں۔

معلوم نہیں یہ کیوں فرض کر لیا گیا ہے کہ ہر مسلمان کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُسے شیعہ سُنّی وہابی خارجی کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہیئے۔ اس ضمن میں ایک لطف کی بات یہ ہے کہ سُنّی حضرات نے تو یہ طے کر رکھا ہے کہ کوئی شخص اگر ذرا بھی حضرت علیؓ کی طرف میلان[1] طبع رکھتا ہے تو وہ شیعہ ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ جیسے بزرگ سے ایک طالب علم اس لئے ناراض ہو کر چلا گیا کہ انہوں نے حضرت علیؓ کی مدح کیوں کی ———— اور دوسری طرف شیعہ حضرات نے یہ فرض کر لیا ہے کہ کوئی بھلا آدمی غیر شیعہ ہو ہی نہیں سکتا ایرانی آب و ہوا کے اثر سے یہ فرقہ شعر و ادب کی طرف زیادہ مائل ہے اس لئے خصوصیت سے شاعروں پر توجہ زیادہ ہے چنانچہ خواجہ عطارؒ مولانا رومؒ شمس تبریزؒ خواجہ حافظؒ وغیرہ سب کو شیعہ کہا جاتا ہے۔ اب آئیے اردو شاعروں کی طرف اور ملاحظہ فرمائیے کہ میر تقی میر شیعہ تھے اگرچہ میر صاحب نے خود اقرار فرمایا ہے کہ میرے والد اگرچہ کے صاحب خانقاہ صوفی تھے اور ان کے ایک مرید نے میری تربیت کی ہے۔ نظیر اکبر آبادی شیعہ تھے حالانکہ ان کے والد کا نام محمد فاروق تھا اور ان کے یہاں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے جس سے ان کی شیعیت کا یقین کیا جائے۔ میر حسن دہلوی شیعہ تھے حالانکہ انہوں نے فرمایا ہے

سلام ان پہ جو اس کے اصحاب ہیں — وہ اصحاب کیسے کہ احباب ہیں
ہوئی فرض ان کی ہمیں دوستی — کہ ہیں دل سے وہ جاں نثارِ نبیؐ
اگر چاہتا ہے مرے دل کو چین — نہ دیتا وہ ساغر جو ہو قلتین

ناسخ لکھنوی بھی شیعہ تھے حالانکہ انہوں نے کہا ہے

یا رسول اللہ ناسخ کو بچا لینا ضرور — عشق ہے اس کو تمام اصحاب سے اور آل سے

اور خود غالبؔ کے متعلق شیعہ مورخ مولانا محمد حسین آزادؔ نے صراحت سے لکھا ہے کہ غالبؔ مولانا فخر الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان میں مرید تھے مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ کی شخصیت اور ان کا مسلک عالم آشکارا ہے اور آج سارے ہندوستان میں ان کا سلسلہ غالب اکثریت میں ہے۔ اور پھر جب غالبؔ خود کہہ رہے ہیں کہ

"شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری"

تو کسی کو کب یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے ان کا مذہب متعین کرے اس رباعی کو تقیہ کہہ کر ساقط الاعتبار کر دیجیے مگر انہوں نے اپنے خطوط میں بھی خود کو صوفی صافی اور وحدۃ الوجود کا قائل لکھا ہے ------

[1] "بہت زیادہ میلان" لکھنا چاہیئے تھا (م-ق)

طیبہ کی زیارت ہوتی ہے ......

کس ہم درجا کے عالم میں طیبہ کی زیارت ہوتی ہے
اک سمت شریعت ہوتی ہے، اک سمت محبت ہوتی ہے

اُس دل پر خدا کی رحمت ہو، جس دل کی یہ حالت ہوتی ہے
اک بار خطا ہو جاتی ہے، سو بار ندامت ہوتی ہے

جو بات وہ فرما دیتے ہیں معیارِ صداقت ہوتی ہے
دستورِ عمل بن جاتی ہے، اسلام میں حجت ہوتی ہے

اے صلِ علیٰ ایک ایک ادا، اللہ کی آیت ہوتی ہے
ہے روئے محمد پیشِ نظر قرآں کی تلاوت ہوتی ہے

اک وہ بھی مقدر ہوتا ہے اک ایسی بھی قسمت ہوتی ہے
بوجہل یوں ہی رہ جاتا ہے، بوذرؓ کو ہدایت ہوتی ہے

طیبہ کی ببولوں کے کانٹے پھولوں سے بھی نازک تر نکلے
تلووں کو بھی لذت ملتی ہے، آسودہ طبیعت ہوتی ہے

مقصودِ جہاں، محبوبِ خدا اور اس پہ یہ شانِ فقر و غنا
کپڑے بھی وہ خود دھو لیتے ہیں، فاقوں کی بھی عادت ہوتی ہے

اللہ کے آگے رو رو کر خلوت میں دعائیں بخشش کی
ہم خاک نشینوں کی خاطر راتوں کو عبادت ہوتی ہے

"اتممت علیکم" فرما کر اللہ نے خود اعلان کیا
اتمامِ کرم اب ہو تو چکا، بس ختم نبوت ہوتی ہے

ماہر القادری

عاصی کرنالی

شہدائے بالاکوٹ!

وہ افرنگی، جنازہ جس کا ہم نے دفن کر ڈالا
رہا برسوں تسلط سرزمینِ ہند پر اُس کا

وہ کافر، جس نے اکثر آزمایا حق کی شہ رگ کو
وہ باطل، جو صداقت کے گلے پر ضربِ پیہم تھا

وہ ظالم، سنتِ چنگیز کی تکمیل کی جس نے
وہ قاتل، جو خلیفہ تھا ہلاکو کی شریعت کا

وہ، جس کی حرص نے تجدید کی دینِ سکندر کی
وہ، جس کی عشرتوں سے جاگ اٹھا مذہبِ دارا

وہ سلطاں، جس نے استبداد کی دفعیں مرتب کیں
وہ حاکم، جس نے پھیلایا نظامِ قیصر و کسریٰ

خدا جانے، حکومت کی گئی تھی اہلِ مشرق پر
کہ دہرائی گئی تھی داستانِ رومۃ الکبریٰ

پھر اک تہذیبِ نو جس کو سمندر پار سے لا کر
ہمارے خاص رجحاناتِ اسلامی سے ٹکرایا

یہ جمہوری حکومت تھی کہ استبدادِ محدودی
یہ عیسےٰ کا مقدس دین تھا، یا متنبی آیا

فرنگی تھے، کہ ساقی، زہر تھا جن کے پیالوں میں
حکومت تھی، کہ بستی، جس میں کھنچتی تھی شرابِ "لا"

زمینِ ہند گویا، بت خانۂ تہذیبِ مغرب تھی
نہ تھا آذر کے دل میں گرزِ ابراہیم کا کھٹکا

تھیں ہر ذرے میں سحرِ سامری کی ظلمتیں رقصاں
ابھی لوگوں سے پوشیدہ، تھا موسیٰ کا یدِ بیضا

دکاں اک سج چکی تھی "لاالٰہ" کی شیشہ بازی سے
ابھی حکمِ خدا کا منتظر تھا تیشۂ "الّا"

کہ اٹھتے ہیں خدا کے غازیوں کی اک جماعت نے
جہادِ فی سبیل اللہ کی وادی میں قدم رکھا

وہ غازی جو تمنائے براہیمؑ کا مظہر ہیں
وہ غازی جو کریں گے دینِ اسماعیلؑ کا احیا

وہ غازی، توڑنے والے ہیں جو فرعون کی گردن
وہ غازی جن کے دم سے زندہ ہے ضربِ یدِ موسیٰؑ

وہ غازی جن کے دل رمز آشنائے فرضِ پیغمبرؐ
وہ غازی، جن کے سر پر سنتِ شبیرؑ کا سایا

وہ غازی، جن کی خدمت میں حدودِ پاک کی ڈالی
وہ غازی، جن کے قدموں میں سلامِ خاص کا تحفہ

رضاکارانِ ملت، سرفروشانِ وطن غازی
فدایانِ نبوت، جاں نثارانِ شہِ بطحاؐ

یقین و عزم کے آتشکدے ہیں جن کے سینوں میں
ہے صد طوفان در آغوش جن کے عشق کا دریا

زمانہ اِن کی حالت دیکھتا ہے، مسکراتا ہے
کسے معلوم، یہ ذرے ہیں یا سمٹا ہوا صحرا

ذرا تم دیکھنا، جس وقت ٹکرائیں گے باطل سے
کوئی آتش، کوئی پارہ، کوئی بجلی، کوئی شعلہ

یہ وہ غازی تھے جو باطل کے آگے جھک نہ سکتے تھے
یہی مقصودِ ایماں ہے، یہی فطرت کا ہے منشا

انھوں نے مسکرا کر جان دے دی جادۂ حق میں
کہ یہ سودا خدا سے کر چکے تھے اپنی جانوں کا

انھوں نے قتل ہو جانا گوارا کر لیا لیکن
نہ پہنچا اِن کی گردن تک نظامِ کفر کا پھندا

ہوئے قربان، لیکن دینِ حق کی آبرو رکھ لی
"خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را"!

پھول اور انگارے

عزیز حاصل پوری

خالی حرم سے ہے تری بزم تصورات
زینت ترے خیال کی تصور سومنات

ہیں لوح تیرے دائرۂ فکر کو محیط
روشنی تخیلات فرنگی تخیلات

روشن تری نگاہ نہیں دل کے نور سے
ظلمت کدہ ہے تیرے لئے بزم کائنات

کہتا ہے کون سالکِ راہ یقیں تجھے
تیرے دل ودماغ سراپا تو ہمات

تو ہے وہ کور چشم کہ حاصل نہیں تجھے
اہل نظر کے فیض نظر کی تجلیات

تنویر؟ اور تیرے شبستانِ فکر میں
تاریک تر ہے تیرا جہانِ تفکرات

ناپختہ و شکستہ ہے تیرا ہر ایک عزم
بے ربط و بے نظام ہے تیری ہر ایک بات

ہے تجھکو اپنی چشم غلط بیں پہ اعتماد
ممکن نہیں درست ہوں تیرے مشاہدات

شفیق جون پوری

بھولا ہوا ہے مجھے مری منزل کا نام ہے
چلتا ہوں کب سے اور سفر نا تمام ہے

واعظ ہے اور بحثِ حلال و حرام ہے
رندوں کے لب پہ ساقی کوثر کا نام ہے

ہر راہ رو کے لب پہ قیادت کا نام ہے
اب جس کو دیکھو خضر علیہ السلام ہے

سورج بنا دیا ہے ستارے بنے ہوئے
دل تو سمجھ رہا ہے وہی صبح و شام ہے

آوارگانِ عشق کی وسعت نہ پوچھئے
فرشِ زمیں سے عرشِ بریں تک مقام ہے

وعدوں سے وہ بڑھاتے ہیں میعادِ زندگی
برسوں گزر گئے ہیں سحر ہے نہ شام ہے

آزاد ہو تو نکہتِ گل کی مثال بن
چھوٹا چمن تو ساری خدائی مقام ہے

پردہ اٹھا دو تم تو نگاہوں کی داد دوں
کہتے ہو دیکھنے کا سلیقہ کہاں مجھے

ہے گلستاں سے خانۂ صیاد تک نگاہ
اب فرصتِ بنائے نشیمن کہاں مجھے

بھولا ہے راستہ تو مرے پاس آئے ہو
تم جانتے تھے گردِ رہِ کارواں مجھے

اپنی خوشی کو بھول گیا ہوں شفیق میں
اتنا ستا رہا ہے غمِ دیگراں مجھے

طرفہ قریشی

ہمارا بھی لہو ہے وقت کی بیتاب نبضوں میں
ہمیں بھولیں نہ آزادی کا حاصل ڈھونڈنے والے

دلوں میں وسعتیں پیدا کریں فکروں میں گہرائی
نشانِ امن کو منزل بہ منزل ڈھونڈنے والے

فضائے دہر سے واقف نہیں ہیں غالباً طرفہ!
مرے شعروں میں نغماتِ عنادل ڈھونڈنے والے

اسے کیا کہئے ......؟

۲۴ر دسمبر کا دن ختم ہو چکا، رات کے آٹھ بجے ہیں اور میں یہ سطریں سپرد قرطاس کر رہا ہوں، دستوری رپورٹ کو پیش ہوئے تین دن گزر چکے، اخبار والے اپنی اپنی فکر و استعداد، رجحانات، میلانِ طبع اور بصیرت کے مطابق اظہار رائے کر رہے ہیں، انفرادی طور پر بھی کسی کسی کی رٹ آرہی ہے مگر اربابِ فکر کی اکثریت سوچ رہی ہے، غور و فکر ہو رہا ہے، اور یہ مقام چلتی ہوئی رائے دینے اور سرسری طور پر اظہار خیال کرنے کا ہے بھی نہیں، خوب سوچ سمجھ کر، پرکھ کر، جانچ کر اور ٹھوک بجا کر دیکھنے کے بعد ہی اظہار رائے کرنا چاہیئے، یہ پاکستان کی تقدیر اور ملت کے مستقبل کا مسئلہ ہے، یہی وہ موڑ ہے جہاں سے پاکستان کی راہِ عمل متعین ہو گی۔

قوم علمائے کرام کے فیصلہ کے لئے چشم براہ ہے، ایمان کی بات یہ ہے کہ "اسلامی دستور" پر یہی حضرات اظہار رائے کا حق رکھتے ہیں! علماء کے لئے سخت امتحان کی گھڑی ہے، کامل اور کسی حالت میں نہ ٹوٹنے والے اتحاد کی ضرورت ہے، کسی ایک پیر کو بھی لغزش ہوئی تو اسلام کے " C A U S E " کو شدید نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے! پوری ذمہ داری، خوفِ خدا اور آخرت کی جواب دہی کے تصور کے ساتھ دستوری سفارشات کو اسلام کی کسوٹی پر کس کر دیکھنے کی ضرورت ہے، جو کچھ کسوٹی بتلائے بس وہی معتبر ہے اُس کا اظہار دو ٹوک انداز میں کر دینا چاہیئے۔

ہر طرف دستور ہی کے چرچے ہیں ——— ہزار منہ اور ہزار باتیں:-

——— حکومت نے "ملازم" کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ——— اسلام کہیں کہیں سے جھانک رہا ہے۔

——— اس دورِ انکار و الحاد میں اسلام اور کتاب و سنت کی اتنی جھلک بھی غنیمت ہے ——— سیفٹی ایکٹ جیسا غیر اسلامی قانون بدستور موجود، قادیانیت کے مسئلہ کا سرے سے ذکر ہی نہیں، اور معذوروں اور بیروزگاروں کی کفالت کی کوئی "ضمانت" نہیں بس "کوشش" ——— "اردو زبان" کے ذکر سے نادانستہ گریز ———

——— "DIRECTIVE PRINCIPLES" کا باب ایک "نصیحت نامہ" ہے، قانون اور حکم نہیں ہے ———

——— مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی مساوات "PARITY" کا مسئلہ خدا نہ کرے کہ کسی کشمکش کی بنیاد بن جائے، پاکستان کی سالمیت ہر قیمت پر باقی رہنی چاہیئے ——— یہ دستور کیا ہے؟ یوں سمجھئے کہ ایک انگریز کو جبہ و دستار پہنانے کی کوشش کی گئی ہے اور اُس کے چہرے پر چھوٹی سی مصنوعی ڈاڑھی بھی لگا دی ہے ——— اسلام کی طرف قدموں کو جنبش ہوئی تو ——— پھر ——— !

یہ عوام کی باتیں اور عام تاثرات ہیں، ہم اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں اس لئے کہ دستوری سفارشات کا پورے طور پر مطالعہ ہم نہیں کر سکے!

اللہ تعالیٰ سے ہم دعاء کرتے ہیں کہ حق کو دکھائے اور حق کی راہ پر چلائے! (آمین)

ماہر القادری

ماہر القادری

گم شدہ ڈائری!

کوئی روزنامچہ لکھتا ہے اور کوئی شب نامچہ، یہ فیشن ہے، تہذیب ہے، لکھے پڑھوں کی نشانی ہے، کسی ڈائری میں "آپ بیتی" ہوتی ہے اور کسی کی یادداشت کو "جگ بیتی" کہا جا سکتا ہے، کسی کسی کی ڈائری میں بجز ادھر ادھر کی لکیروں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور کوئی کوئی خدا کا بندہ سچ مچ خونِ جگر سے واقعات کو لکھتا ہے، اپنا اپنا ذوق اور اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد ہے، دنیا میں سب آدمی ایک جیسے کہاں ہوتے ہیں، اور نہ ہو سکتے ہیں اور نہ انھیں ہونا چاہئے۔ ـــ اس لئے کہ

اے ذوق! اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

اس "مختصر مفید" تمہید کے بعد ناظرین کی خدمت میں ایک "ڈائری" کے چند اوراق پیش کئے جا رہے ہیں یہ ڈائری کس کی ہے؟ یہ نہ معلوم ہو سکا، لکھنے والے نے غضب ہی نہیں کمال بھی کیا کہ کہیں اپنا نام تک نہیں لکھا، شاید وہ گمنام رہنا چاہتا ہے، شہرت اور نمود کی اسے ہوس نہیں ہے، بہرحال یہ ڈائری جس کسی کی بھی ہے، اس کا لکھنے والا ایک صاحبِ فکر انسان ہے، اس نے جو کچھ دیکھا ہے، اسے بوا ہی ہے، اس کا مشاہدہ قوی اور اس کا احساس نازک تر ہے!! اس ڈائری کے لکھنے والے تک کاش "راقم الحروف" کا یہ پیام کسی طرح پہونچ سکتا کہ اے دانشور! تجھے اپنی صلاحیتوں کی خبر نہیں ہے، اگر تو کوشش کرے اور اپنی صلاحیتوں کو کام میں لائے، تو بہت جلد تو ایک کامیاب افسانہ نگار کی حیثیت حاصل کر سکتا ہے ـــ مگر مجھے شبہ ہے کہ میری یہ گزارش اس شخص تک پہونچ بھی سکے گی، اس دنیا میں بہت سی آوازیں "ناشنیدہ" اور بہت سی حقیقتیں "ناگفتہ" رہ جاتی ہیں!

لیجئے ڈائری شروع ہوتی ہے، میں اپنی طرف سے کچھ نہ کہوں گا، اور مجھے کہنے اور اضافہ کرنے کا حق بھی نہیں ہے میرا کام تو ڈائری کو ہو بہو اور لفظ بہ لفظ کاغذ پر منتقل کر دینا ہے ـــ آخر میں اتنا اور عرض کیا جاتا ہے کہ اس ڈائری کے اوراق ثابت نہیں ہیں، کہیں کہیں سے پھٹے ہوئے ہیں مگر اس شکستہ اور نامکمل حالت میں بھی یہ "یادداشت" بڑے کام کی چیز ہے:۔

۲۲ اگست ـــ میں دن چھپے اپنے ایک دوست کے یہاں سے واپس آ رہا تھا، گلی کے نکڑ پر لوگوں کا ہجوم دیکھ کر میں کھڑا ہو گیا کہ دیکھوں کہ یہ لوگ کیوں جمع ہیں؟ دو آدمیوں میں گالی گفتار ہو رہی تھی، یوں سمجھو کہ اس ڈرامہ کے ایکٹر یہ دو ہی شخص تھے، باقی تو تماشائی تھے۔

ـــ تم دودھ میں پانی ملاتے ہو ـــ چودھری موچھوں والے نے مٹھیاں بھینچ کر کہا

ـــ میں نے انکار کب کیا تھا کہ میں دودھ میں پانی نہیں ملاتا ـــ دودھ والے نے جواب دیا۔

ـــ تو تم چور ہو، بے ایمان ہو، دھوکے باز ہو ـــ دو تین آدمی ایک ساتھ بول اٹھے

ـــ آپ لوگ غصہ میں نہ آیئے، پہلے میری سن لیجئے! ـــ سنئے "پانی کونسا دودھ والا نہیں ملاتا، ملاوٹ ہر کسی کے دودھ میں ہوتی ہے، مگر مجھے یہ ناز ہے کہ میں ایک بالٹی دودھ میں دو لوٹے پانی ملاتا ہوں، دوسرے دودھ والوں کے یہاں آدھا پانی اور آدھا دودھ ہوتا ہے، اور میرے یہاں ایک حصہ پانی اور تین حصہ دودھ کا اوسط رہتا ہے،

آپ لوگوں کو میری ایمانداری کی قدر کرنی چاہئیے کہ آپ مجھ سے اُلٹا لڑنے کے لئے آئے ہیں ——— دودھ والے کے اس جواب پر بہت سے لوگ ہنسنے لگے۔

۲۴ر اگست:- میں ابھی ابھی ایک چائے خانے سے چائے پی کر گھر آیا ہوں، اور آتے ہی یہ سطریں قلمبند کر رہا ہوں دس بجے کے قریب میں ایک بس میں جمشید روڈ سے سوار ہوا، دوسرے ٹھیراؤ (BUS STAND) پر بس رُکی تو وہاں سے چار پانچ مسافر سوار ہوئے، ان میں ادھیڑ عمر کے ایک خوش پوشش "مولوی نما" بزرگ بھی تھے، سفید شیروانی، مخمل کی رام پوری ٹوپی، کو بے خاصہ کا استری کیا ہوا پاجامہ، سیاہ پمپ شو، کھلتی ہوئی رنگت، چھوٹی سی ڈاڑھی ہونٹوں پہ پان کھانے کے نشان بھی طرح نمایاں، ان کے ساتھ ایک برقعہ پوشش عورت بھی تھی، جس نے بس میں بیٹھتے ہی نقاب اُلٹ لیا، زنانہ سیٹ کے پیچھے کی نشست پر دو نوجوان بیٹھے ہوئے تھے اور اس عورت کو بُری طرح گھور رہے تھے، بندر روڈ پر مجھے اُترنا تھا، وہاں بس ٹھیری تو میں بس سے اُتر کر ایک چائے خانہ میں چلا گیا، طبیعت تو دو سے بے کیف سی تھی، اور بے کیفی دور کرنے کے لئے "چائے سے بہتر" مشروب "ابھی تک ایجاد نہیں ہوا، میں نے چائے خانے کے ملازم سے چائے لانے کے لئے کہا اور اس نے ابھی پانی کا گلاس ہی میز پر رکھا تھا دیکھتا کیا ہوں کہ وہی دو نوجوان جو ابھی بس میں ہم سفر تھے، میرے قریب ہی کرسیوں پر آکر بیٹھ گئے، اور آہستہ آہستہ گفتگو کرنے لگے، وہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی بات چیت کوئی سُن نہیں رہا ہے، یہ اُن کی بھول اور نادانی تھی، شروع شروع کے بول تو البتہ صاف سنائی نہیں دیئے، مگر پھر جذبات کے ساتھ اُن کی آواز بھی تیز ہوتی چلی گئی ——— اُن کی باتیں:—

——— ارے صاحب! عورت کیا تھی قیامت تھی! اس قدر حسین اور نازک ناک نقشہ کی عورت میری نظر سے آج تک نہیں گزری

——— اور اس کے ساتھ جو مولوی صاحب تھے اگر اُس کے شوہر تھے، تو اُس مولوی کی قسمت پر رشک کرنا چاہیئے۔

——— مگر بھائی! اُس فیشن ایبل اور خوش نظر عورت کو "قل آعوذی قسم کا ملا" پسند کا ہے کو آتا ہوگا۔

——— ٹھیک کہا تم نے حسین بھیا! لیکن وقت تو تم مجھ یوں، جو تیوں اور پاسپورٹوں کے کان کاٹتے ہو، اُس قتالہ روزگار کی آنکھیں پیاسی پیاسی اور کھوئی کھوئی ہوئی سی تھیں ——— مجھ سے تین بار آنکھیں میں اور ہر بار ایک "پیام" دیا ...!

——— اور (دوسرے ساتھی کی بات کاٹتے ہوئے) وہ مولوی "یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ عورت کسی کو دیکھ رہی ہے اور نہ اسے کوئی دیکھ رہا ہے" اس دنیا میں کیا کیا چغد اور کیسا کیسا بڑا خفش پڑا ہوا ہے، میں شرط بد کر کہتا ہوں کہ اگر اس عورت سے تھوڑی دیر صرف بات چیت کا موقع مل جائے تو بس شکار پھنسا ہوا ہی سمجھو ... اور ....

اتنے میں فایر بریگیڈ کا انجن تیزی کے ساتھ ٹن ٹن کرتا ہوا گزرا، اور ان نوجوانوں کی آواز انجن کی آواز میں یا تو یوں کہئے کہ گھل مل گئی یا یوں سمجھئے کہ دب کر رہ گئی، مجھے اُن کی باتوں سے بڑا دُکھ ہوا اور میں اُس دن اسی سوچ میں رہا کہ عورتوں کے عُریاں چہرے ایک مستقل فتنہ ہیں، بے نقاب چہروں کو دیکھ کر ہوس پرست مرد کیا کیا اُمیدیں قائم کرتے اور ہوس آمیز جذبات کے کیسے کیسے قلعے بناتے ہیں ...... (یہاں سے ورق کا کچھ حصہ غائب ہے، جیسے کسی چھوٹے بچے نے دانتوں سے کاغذ کتر لیا ہے ......)

۲۸ر اگست:- آج دس بجے کے بعد ایک صاحب سے ملنے کے لئے گیا، بہت آدمی ہیں، تین چار ہزار کے لگ بھگ "پگار"[1] ملتی ہے، فرض شناس اور ذہین افسر ہیں، بنگلہ، فرنیچر، ایک چھوڑ دو دو موٹر، خوبصورت

[1] گجراتی زبان کے شکریہ کے ساتھ

بیوی، تندرست اولاد، اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے، پھر دنیوی عزت اس پر مستزاد! دن میں نہ جانے کتنی بار "جی حضور" "سرکار" اور "جناب عالی" کی آوازیں اُن کے سامنے کی تواضع کرتی رہتی ہیں ——

ع آدمی فربہ شود از راہِ گوش

تو یہ صاحب اچھا خاصہ تن و توش رکھتے ہیں، قد بھی لانبا ہے اس لئے اُن کی فربہی نگاہوں پر گراں نہیں گزرتی، میں گیا تو بڑی گرم جوشی کے ساتھ کرسی سے اُٹھ کر ہاتھ ملایا، اور مزاج پرسی کے بعد "اسلام" پر ایک تقریر شروع کر دی، قرآن کی آیتیں پڑھیں، رسول اللہ کی احادیث سنائیں، صحابہ کی زندگی کے واقعات بیان فرمائے، اور اس کے بعد گھنٹی بجائی اور نوکر شراب کا پیگ لے کر آیا، شراب کا پیالہ اُنھوں نے ہاتھ میں لے لیا، چُسکیاں لینے لگے اور اسی عالم میں "اسلام" کی شان میں قصیدے بھی پڑھتے جاتے تھے، کہنے لگے، مسلمانوں کی دینی غیرت بیدار ہو جائے تو سارا عالم آج ہمارے زیرنگیں ہو سکتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ اتنے میں اُن کی صاحبزادی تشریف لے آئیں، سترہ اٹھارہ سال کا سن، شباب کی وہ منزل جب عورت سچ مچ "قیامت" ہوتی ہے، لباس! نہ پوچھئے کہ کیسا تھا؟

ع کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

بغلوں تک کی سپیدی نظر آ رہی تھی، قریب قریب نیم برہنہ سینہ! بلاؤز اس انداز سے پہنا تھا کہ کوئی نہ دیکھنا چاہے تو بھی دیکھنے پر مجبور ہو جائے، اس غیرت مند باپ سے اس سعادت مند اور عصمت مآب (؟) بیٹی نے آتے ہی کہا ۔ ۔ ۔ "میں مسٹر فیروز کے ساتھ سینڈپٹ جا رہی ہوں، آج وہاں پک نک پارٹی کا انتظام ہے، شاید واپسی میں رات ہو جائے، اس لئے آپ میرا انتظار نہ کیجئے میں ہوٹل میں خود ہی آ جاؤں گی، ڈانس تو نو بجے کے بعد شروع ہوگا، آپ میری سیٹ ریزرو رکھئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اور والد بزرگوار نے اس پر "سر ہلایا" کہ میری طرف سے منظوری ہے، اجازت ہے، آزادی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

۳ ستمبر: — ایک "مولانا صاحب" سے کل شام ایک پارٹی میں ملاقات ہوئی تھی، انھوں نے بڑے اصرار کے ساتھ مجھ سے کہا کہ آپ سے چند مسائل پہ گفتگو کرنی ہے یا تو آپ اپنے مکان پر کوئی وقت مقرر کیجئے یا میرے یہاں تشریف لائیے، میں نے کہا کہ میں کل آپ کے یہاں صبح میں نو بجے سے گیارہ بجے تک کسی وقت خود ہی آؤں گا! میری رسٹ واچ ہے تو مبلغ ساڑھے تین سو روپیہ کی قیمت کی مگر بعض وقت یہ ظالم شوخیاں کرنے لگتی ہے، وقت ہوگا نو بجے کا، اور یہ بتلائے گی "سو نو" نہ جانے! گھڑی کی مشین کا قصور ہے یا میری تقدیر کی گردش ہے —— ہاں! تو میں مولانا صاحب کے یہاں مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی پہونچ گیا، نوکر نے کہا کہ "حضرت قبلہ" غسل خانہ میں ہیں، میں اُن کے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا، میز پر بہت سے کاغذ اور کتابیں بکھری ہوئی تھیں، جب زندگی معروف ہو تو کاغذوں اور کتابوں میں ترتیب کہاں قائم رہ سکتی ہے —— ایک کورے کاغذ پر پنسل سے کچھ عبارت لکھی ہوئی تھی اور کاغذ کے نیچے کاربن پیپر لگا ہوا تھا، پرائیویٹ کاغذوں کا پڑھنا ہر چند کہ خلاف تہذیب ہے اور کیا عجب ہے کہ گناہ بھی ہو، مگر میں نے اُس کاغذ کو پڑھ لیا، مولانا صاحب نے خود اپنے دستِ مبارک سے تحریر فرمایا تھا:—

—— فخرِ اسلام، فخرِ ملت حضرت مولانا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاہ صاحب مدظلہ العالی کے اعزاز میں ۴ ستمبر کو جو ڈنر دیا گیا تھا اُس میں حضرت محترم نے فرمایا کہ نام و نمود کی ہوس، دولت کی حرص اور دنیوی ترقی کی بے پناہ محبت

نے مسلمانوں کے کردار کو سطحی بنا دیا ہے، ہر کوئی تن پروری اور دُنیا کی لذتیں سمیٹنے کی فکر میں مبتلا ہے۔۔۔۔۔

"۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔!" میں اتنی ہی عبارت پڑھ پایا تھا کہ مولانا صاحب پاجامہ کے نیفہ کو سنبھالتے ہوئے تشریف لے آئے، بڑی محبت کے ساتھ مجھے گلے سے لگایا، درود شریف پڑھا "یغفر اللہ لک" کہا اور نہ جانے کیا کیا دعائیں زیر لب دُہرائیں، میری نگاہ بار بار اُس کاربن والے کاغذ کی طرف بے اختیار اُٹھ رہی تھی، کاغذ کو موڑتے ہوئے بولے۔

"یہ اطلاع آپ نے پڑھی۔۔۔۔" (میں نے سر کو جھکا کر جواب دیا) جی ۔۔۔ جی! معاف فرمائیے ۔۔۔ دو چار سطریں! (مولانا صاحب اس پر بولے ۔۔۔) بھائی! ہماری جمعیت کے آدمی قریب قریب سب کے سب "کُر" ہیں، مجھی کو سب کچھ کرنا پڑتا ہے، اور خدا دوں کا حال اچھی طرح جانتا ہے کہ اپنے قلم سے خود اپنے بارے میں جو کچھ مجھے لکھنا پڑتا ہے اُس سے دین اور ملت ہی کی سر بلندی مقصود ہے (میں نے فوراً عرض کیا) قبلہ! آپ اور ایسے چھوٹے چھوٹے معاملات میں صفائی پیش کریں! آپ سے بھلا میں بدگمان ہو سکتا ہوں، میری یہ مجال! اور جب کہ میں خود بھی اس بات کو جانتا ہوں کہ آج کل کے ماحول میں دُنیا اور دین کا کوئی کام پروپیگنڈے کے بغیر چل ہی نہیں سکتا (مولانا صاحب نے اس پر مسکرا کر ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور فرمانے لگے) جزاک اللہ! "فراستِ مومن" اسی کا نام ہے، ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے اسی طرح کا "حُسنِ ظن" رکھنا چاہیئے! بارک اللہ لکم! بھائی! آپ کو ایک اہم معاملہ میں مشورت کے لئے بلایا تھا، آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ "وہابیت" کتنی زور پکڑتی جا رہی ہے، ہر محاذ پر اسی عقیدے کے لوگوں کا قبضہ ہوتا چلا جا رہا ہے، اس فتنہ کو روکنے کی ضرورت ہے ورنہ پاکستان "نجد" بن جائے گا، (میں نے اس پر اپنے سر کو جنبش دی زبان سے کچھ نہ کہا اور اس جنبش میں یہ بات بھی پنہاں تھی کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں ٹھیک کہہ رہے ہیں اور یہ بھی کہ اس فتنہ کا آخر توڑ کس طرح کیا جائے؟۔۔۔۔۔ مولانا نے اس پر فرمایا) "وہابیت" کو شکست یوں طرح دی جا سکتی ہے کہ ہر مہینہ بزرگانِ دین کے عُرس منعقد ہوں اور اُن میں قوالیاں ہوا کریں، یہ چیز عوام کے لئے سب سے زیادہ جاذبِ توجہ ہے، اس کا ہمیں تجربہ ہے، اور ہاں! بھائی! یہ بھی اللہ تعالیٰ کا خاص فضل اور بزرگانِ دین کی برکت ہے کہ دو تین سیٹھوں نے اس اسکیم کو چلانے کے لئے مالی اعانت کی ہامی بھر لی ہے، بجلی ناس روڈ کے پاس جو نکڑ پر مسجد ہے اُس کے احاطہ میں حضرت "لوٹ شاہ" کا مزارِ اقدس ہے، بس وہیں سے اس اسکیم کے شروع کرنے کا ارادہ ہے، ایک سیٹھ صاحب جن کا اُس محلہ میں شراب کا ٹھیکہ ہے، ان کے دل میں اللہ نے خدمتِ دین کا جذبہ پیدا کیا ہے، ایک ہزار روپیہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے، لنگر، چراغاں، مزار کی سجاوٹ وغیرہ یہ سب کام اتنے میں چل جائیں گے، اور۔۔۔۔۔۔ ابھی مولانا صاحب کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔

۔۔۔ جی! وعلیکم السلام ۔۔۔ میں ۔۔۔ خود بول رہا ہوں، بڑی عمر ہے آپ کی! آپ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔

۔۔۔ آپ کے لئے ہر وقت فرصت نکالی جا سکتی ہے

۔۔۔ ابھی آیا! بس موٹر کار میں سوار ہوا اور سیدھا آپ کے یہاں پہونچا۔۔۔۔۔!

مولانا صاحب مجھ سے معذرت کرنے لگے کہ پھر کبھی ملاقات ہوگی، ایک شدید ضرورت سے جانا نکل آیا ہے، معاف فرمائیے! کیا کیا جائے ہر کسی کا دل رکھنا پڑتا ہے "یک انار صد بیمار" والا مضمون ہے۔

۷ ستمبر: — ایک صاحب نے مجھ سے آٹھ دن کے وعدے پر سو روپے قرض لئے تھے، اُن کے گھر کے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو دسیوں بیسیوں پھیرے کر چکا ہوں مگر ہر بار "شاندار پسپائی" کا منہ دیکھنا پڑا، گھر میں ہوتے ہیں اور کہلوا دیتے

ہیں کہ بڑے صاحب باہر ہیں، جھوٹ کی بہت سی قسمیں ہیں ان میں سے ایک "سفید جھوٹ" بھی ہے، مگر یہ صاحب ایسا جھوٹ بولتے ہیں جو "سفید" ہے اور "سیاہ" ہے اور اگر اس کی کوئی رنگت ہو سکتی ہے تو اسے "چت کبرا" کہہ سکتے ہیں یعنی کچھ سفید اور کچھ سیاہ! ایک دن میں اُن کے یہاں تقاضے کے لئے گیا تو اُن کے مکان کے سامنے تھوڑی دور پر لوگوں کا مجمع تھا، معلوم ہوا کہ اس بلڈنگ کے اوپر فاحشہ عورتوں کا آنا جانا رہتا ہے اور وہاں اس وقت گڑبڑ ہو رہی ہے، پولس کا سپاہی تیزی کے ساتھ زینہ پر چڑھا اور پندرہ بیس منٹ میں واپس آگیا اور آتے ہی کڑک کر بولا، آپ لوگوں نے یہاں بھیڑ کیوں لگا رکھی ہے، کوئی بات نہیں ہے، سب کچھ ٹھیک ہے، لوگ منتشر ہونے لگے ——..... اور —— "پولس مین" کے ہونٹوں پر "لپ اسٹک" کی سرخی لگی ہوئی تھی —— "رشوت کی بہت سی قسمیں ہیں" ایک آواز آئی، مگر اس کی "بازگشت" نہیں سنی گئی!

اسلامی ادیبوں سے

اسلامی ادب کیا ہے؟ —— اس موضوع پر اب تک اسلامی ادیبوں نے کئی ایک مضامین لکھے اور لکھ رہے ہیں۔ اور دنیائے ادب کو اپنے منفرد منتہائے فکر و نظر کے ہر ایک پہلو سے واقف کرانے کی کوشش کی اور کر رہے ہیں۔ لیکن افسوس کہ یہ قیمتی جواہر پارے اب تک مختلف جرائد و رسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غیر اسلامی اور خود اسلامی ادبی حلقوں میں بھی اسلامی ادب کے تفصیلی تعارف کی تشنگی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ان بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک کتابی لڑی میں پرو کر ایک خوبصورت مالا کی شکل دی جائے، اور وقت کے اس اہم تقاضے کو پورا کیا جائے۔ میں "دکن" ہی میں —— ان منتشر مضامین کا ایک بہتر اور جامع انتخاب دنیائے ادب کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ کر چکا تھا، اور اس موضوع پر تقریباً تمام ہی مضامین اکٹھا کر لئے تھے۔ لیکن بعض وجوہات کی بنا پر پاکستان آنا پڑا۔ پاکستان آتے وقت وہ تمام قیمتی ذخیرہ تباہی کے نذر ہو گیا۔ اور پھر پاکستان آنے کے فوری بعد چھ سات ماہ تک کچھ ایسا مصروف رہا کہ اسلامی ادب کے نمائندہ جرائد و رسائل کا ایک لفظ پڑھنے کی فرصت بھی نہ ملی۔ اس لئے اس اہم کام کو فوری طور پر عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ اب پھر اس کام کو پورا کرنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان مضامین کے اکثر حوالہ جات نہیں مل رہے ہیں۔

اس لئے

ہند و پاکستان کے تمام ہی اسلامی ادیبوں اور اسلامی ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات سے میری یہ درخواست ہے کہ ان مضامین کے حوالہ جات اور ہو سکے تو ان کی کٹنگ یا نقول جلد از جلد مندرجہ ذیل پتہ پر روانہ کریں۔

کپتان حیدر علی۔ معرفت دفتر جماعت اسلامی نواب شاہ (سندھ) پاکستان

امید کہ

اسلامی ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اور بالخصوص اسلامی ادیب اس جانب خاص توجہ مبذول فرمائیں گے!

آپ کا ساتھی

کپتان حیدر علی

روحِ انتخاب

عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرء ما نوی فمن کانت ہجرتہ الی اللہ ورسولہ فہجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ہجرتہ لدنیا یصیبہا او امرأۃ ینکحہا فہجرتہ الی ما ہاجر الیہ۔ (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ وہ فرماتے تھے تمام عملوں کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اور ہر شخص وہی کچھ پائے گا جو اس کے دل میں ہے جس نے اللہ اور رسول کیلئے ہجرت کی اس کی ہجرت اللہ اور رسول کیلئے ہوگی۔ اور جس نے دنیا حاصل کرنے کیلئے کی۔ وہ اسے پالے گا یا کسی عورت سے نکاح کرنے کیلئے ہجرت کی۔ تو اسکی ہجرت اسی کیلئے شمار ہوگی جس غرض سے اس نے کی (بخاری)

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احدث فی امرنا ما لیس فیہ (او منہ) فہو رد (رواہ البخاری ومسلم وفی روایۃ لمسلم: من عمل عملاً لیس لہ امرنا فہو رد)

حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی بات پیدا کی جو دین میں نہیں وہ مردود و نامقبول ہے"۔ اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے "جس نے کوئی ایسا کام کیا جو ہمارے طریق کار سے مختلف ہے۔ وہ ناقابلِ قبول ہے۔"

عن النعمان ابن بشیر رضی اللہ عنہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول الحلال بین والحرام بین وبینہما مشتبہات لا یعلمہن کثیر من الناس فمن اتقی الشبہات فقد استبرأ لدینہ وعرضہ ومن وقع فی الشبہات وقع فی الحرام کالراعی یرعی حول الحمی یوشک ان یرتع فیہ الا وان لکل ملک حمی الا وان حمی اللہ محارمہ الا وان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حلال و حرام واضح ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ باتیں ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ پس جس شخص نے مشتبہ چیزوں سے پرہیز کیا، اس نے اپنے دین و آبرو کو بچا لیا۔ اور جو شخص مشتبہ امور میں پڑا تو اس کی مثال اس چرواہے جیسی ہے جو چراگاہ کے آس پاس چراتا ہے۔ قریب ہے کہ وہ اس میں پڑ جائے۔ یاد رکھو! کہ ہر بادشاہ کے لئے چراگاہ ہوتی ہے۔ اور سن رکھو! اللہ تعالیٰ کی زمین میں اسکی چراگاہ محرمات ہیں۔ خبردار یاد رکھو! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جب وہ درست ہے تو سارا جسم درست ہے اور جب وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ سنو! وہ دل ہے (بخاری ومسلم)

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ما نھیتکم عنہ فاجتنبوہ وما امرتکم بہ فاتوا منہ ما استطعتم فانما ھلک الذین من قبلکم کثرۃ مسائلھم واختلافھم علی انبیاءھم (البخاری ومسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس چیز سے میں نے تمہیں روک دیا ہے، اس سے پرہیز کیا کرو۔ اور جس چیز کے کرنے کا حکم دیا ہے، جہاں تک ممکن ہو اسے کیا کرو۔ تم سے پہلے کی قومیں صرف سوالات (کٹ حجتیوں) اور چون و چرا کی کثرت اور انبیائے کرام سے اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔ (بخاری مسلم)

عن الحسن بن علی سبط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وریحانتہ قال حفظت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دع ما یریبک الی ما لا یریبک (النسائی والترمذی وقال حسن صحیح)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور چمن رسالت کے پھول حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں "ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا اور یاد کیا۔ جو چیز تذبذب میں ڈالے وہ چھوڑ دو اور جس چیز میں شک نہ ہو، وہ لے لو۔ (نسائی ترمذی)

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ (الترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ غیر مفید امور کو چھوڑ دے۔ (ترمذی)

عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ (البخاری ومسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے واسطے پسند کرتا ہے (بخاری۔ مسلم)

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیراً او لیصمت ومن کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم جارہ ومن کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ۔ (البخاری ومسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا
جو اللہ تعالیٰ اور روز حساب پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ بات کہے تو اچھی، ورنہ خاموش رہے۔ جو اللہ اور آخرت پر یقین رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ اپنے ہمسایہ کی عزت کرے۔ جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے لازم ہے کہ اپنے مہمان کا احترام کرے۔

(بخاری۔ مسلم)

ہماری نظر میں

مسک الختام فی ختم النبوۃ

"مسک الختام فی ختم النبوۃ علی سید الانام علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام" از:- مولانا محمد ادریس کاندھلوی، ضخامت ۱۰۴ صفحات، قیمت پانچ آنہ، ملنے کا پتہ:- مکتبہ صدیقیہ ملتان

جناب مولانا محمد ادریس کاندھلوی صدر مدرس جامعہ اشرفیہ لاہور نے "ختم نبوت" کے موضوع پر بڑی محنت اور تحقیق کے ساتھ ایک مختصر مگر جامع کتاب لکھی ہے، جو اس وقت ہمارے سامنے ہے، اس کتاب میں فاضل مصنف نے قرآن و حدیث کے علاوہ توریت و انجیل اور علماء بنی اسرائیل کی شہادتوں اور بشارتوں سے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت سرور کائنات فخر موجودات سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت اور رسالت ختم کر دی گئی اور اب آپ کے بعد کوئی نبی اور رسول نہیں آئے گا!

"مسک الختام فی ختم النبوۃ" کا سب سے زیادہ اہم حصہ وہ ہے جس میں قادیانیوں کے پھیلائے ہوئے اوہام و وساوس کا جواب دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مسلم شریف کی ایک حدیث نقل کی گئی ہے:-

"انہ سیکون فی امتی کذابون ثلثون کلھم یزعم انہ نبی وانا خاتم النبیین لا نبی بعدی" تحقیق میری امت میں تیس بڑے بڑے کذاب اور دجال ظاہر ہوں گے، ہر ایک کا یہ زعم ہوگا کہ میں نبی ہوں، حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

ہمارے خیال میں ان کذابوں میں سب سے بڑا "کذاب" اور ان دجالوں میں سب سے بڑا "دجال" غلام احمد قادیانی ہے کہ مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی جیسے کذابوں کے فتنے تو مٹا دیئے گئے مگر قادیانی فتنہ اب تک جڑ پکڑے ہوئے ہے، نہ جانے امت کی زمین اس بار لعنت سے کب تک دبی رہے گی۔

"امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں کسی شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اپنی نبوت پر دلائل پیش کرنے کے لئے مہلت مانگی تو امام اعظم رح نے فتویٰ دیا کہ جو شخص اس کی نبوت کی دلیل طلب کرے گا وہ کافر ہے اس لئے کہ وہ ارشاد نبوی "لا نبی بعدی" کا منکر اور مکذب ہوگا" (صفحہ ۲۲)

حضرت امام اعظم رح پر اللہ کی رحمتوں کی بارش ہوں "ختم نبوت" کے مسئلہ پر چند لفظوں میں جو کچھ فرمایا ہے وہ حقیقت میں "قول فیصل" ہے، تفقہ فی الدین کی یہی وہ شان ہے جس نے نعمان بن ثابت رح کو "امام اعظم" بنا دیا۔

صفحہ (۶۹) "اور فقہا اور مجتہدین کے قلوب پر نبوت کے شعبۂ شریعت کا عکس پڑا جس سے ان حضرات کی بصیرت اور عقل و فراست ایسی روشن اور منور ہو گئی کہ دن میں ستارے نظر آنے لگے"

ضرب المثل یوں ہے "دن میں تارے نظر آنے لگے" پھر یہ ضرب المثل طنز کے موقعوں پر استعمال کی جاتی ہے،

ستارے نہیں!

کراچی
فاران
پاکستان
ماہر القادری

جلد ۴ ——— نمبر ۱۱

ماہنامہ

فاران

فروری سنہ ۱۹۵۳ء ——— ایڈیٹر: ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپیہ (پاکستانی) ——— فی پرچہ ۸/

۸ روپیہ (ہندستانی) ——— فی پرچہ ۱۰/

مقام اشاعت

دفتر: "فاران" کیمبل اسٹریٹ ——— کراچی نمبر (۱)

نظم و ترتیب:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے اور اسلام کے لئے بنا ہے، یہ ایک ایسی روشن حقیقت ہے جس کا انکار انگریزی "ڈان" کا "ترقی زدہ" ایڈیٹر کر دے تو کر دے ورنہ کوئی صاحبِ ہوش اور اہلِ نظر تو اس قسم کی احمقانہ جرأت کر نہیں سکتا، قائداعظم مرحوم اپنی عظیم شخصیت کے باوجود اگر "اسلام" کا نعرہ بلند نہ کرتے تو ان کے اردگرد عقیدت مندوں کا اتنا ہجوم کبھی نہ ہوتا جس کی نظیر ہندستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں تو کم سے کم نہیں ملتی، یہ صرف "اسلام" ہی کی نسبت تھی جس نے "مسٹر محمد علی جناح" کو "قائد اعظم" بنا دیا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ہندستان تقسیم ہوا اور پاکستان کا وجود عمل میں آگیا، پاکستان جس نام پر بنا تھا اور جس کے لئے بنا تھا سب سے پہلے وہی کام کرنے کا تھا، اسلام کے معروف و منکر کسی سے چھپے ہوئے نہ تھے، سب جانتے تھے کہ اسلام کیا چاہتا ہے؟ اور کیا نہیں چاہتا؟ مگر یہاں اور تو سب کچھ ہوتا رہا مگر وہی نہیں ہوا جس کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔

مغربی ممالک کو صلح و سلامتی کے مشن، سفارتیں، اور وفود جاتے رہے، سبّی میں سال کے سال شاہانہ دربار لگتا رہا، فوجوں کی سلامیاں لی جاتی رہیں، حکومت کی طرف سے بڑے آدمیوں کی تصویروں کے البم چھپتے رہے، ریلوے کی آمدنی میں کمی دیکھ کر بے ٹکٹ مسافروں کے لئے سخت سے سخت قانون بنائے گئے، سڑکیں نکلیں، دفتر اور بنگلے بنے، یہ سب کچھ ہوتا رہا مگر

جس مقصد کے لئے پاکستان بنا تھا اُس کی طرف کوئی قدم نہیں اُٹھایا گیا۔

عوام مسلمان اس انتظار میں تھے کہ اسلام کے لئے اب کچھ ہوتا ہے، تب کچھ ہوتا ہے لیکن اُن کے ارمان جی کے جی میں ہی رہ گئے، اُنھوں نے دیکھا کہ ارباب اقتدار کی روش اُن وعدوں کے مطابق نہیں ہے جن وعدوں کی بنیاد پر پاکستان بنا تھا، چہ میگوئیاں شروع ہوئیں، بے چینیاں بڑھیں یہاں تک کہ دل کی بات زبانوں پر آنے لگی اور اسلامی دستور کے لئے مطالبہ ہونے لگا ——— یہ حالت دیکھ کر ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں "قرارداد مقاصد" پیش ہوئی اس پر ہر طرف سے شور مبارک باد اُٹھا کہ پاکستان کی صحیح منزل متعین ہو گئی اور

؎ ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

کے ترانے گونجنے لگے۔

قرارداد مقاصد کے پیش ہونے کے کوئی ڈیڑھ سال بعد، ۲۸ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو دستور ساز کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کی، جسے ملک کی ہر پارٹی نے رد کر دیا، چار جانب سے شور تھا کہ اسلام ہی نہیں جمہوریت کے ساتھ بھی یہ ایک طرح کا مذاق ہے، عوام کی رائے کو ٹھکرانا کوئی آسان کام نہیں ہے اور جو کوئی حکومت اپنی طاقت کے زعم میں ایسی غلطی کر بیٹھتی ہے اُسے بہت کچھ پچھتانا بھی پڑتا ہے، عوام کی بات ماننی پڑی، اس رپورٹ کو خود اُس کے بنانے والوں نے یا تو آگ لگا دی یا ردی کی ٹوکری میں ——— ڈال دیا، بہرحال جو بھی حادثہ پیش آیا ہو ——— وہ رپورٹ منسوخ قرار دے دی گئی گویا کہ وہ وجود میں ہی نہ آئی تھی۔

اس غلطی کی تلافی کے لئے دستور سازی کا کام بہت تیزی کے ساتھ ہونا چاہیئے تھا، مگر نہیں ہوا، کیوں نہیں ہوا؟ اس کا حال تو اللہ ہی کو معلوم ہے، ہم تو صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس کا سبب اگر غفلت ہے تو یہ مجرمانہ غفلت ہے اور اگر بعض صاحبوں کو یہ اندیشہ تھا کہ اسلامی دستور اگر صحیح بنیادوں پر بن گیا تو اُن کے "اقتدار" پر اُس کی زد آ کر پڑے گی، تو یہ اندیشہ بزدلانہ سے زیادہ احمقانہ ہے، اس دورِ جمہوری میں خوشامدیوں کی قصیدہ خوانیاں کسی کے "اقتدار" کے اردگرد نہ تو حصار باندھ سکتی ہیں اور نہ محض طاقت کے زور سے کسی کی "کرسی" قائم رہ سکتی ہے، وہ زمانہ لد گیا جب شہنشاہ "عالم پناہ" "مالکِ رقاب اُمم" ہوتا تھا اور اُس کی زبان کا ہر لفظ حکومت کا قانون بن جاتا تھا۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۵۰ء کے بعد ہمارے "دستور ساز" پھر لمبی تان کر سو گئے، اور اگر جاگتے رہے ہوں تو انھوں نے دستور سازی کی کوئی خاص اہمیت محسوس نہیں کی، ایسا جاگنا بھی سوتے رہنے ہی کے برابر ہے، عوام نے ایک سال تک تو صبر کیا مگر جب دیکھا کہ "حریم ناز" کے پردوں کو جنبش تک نہیں ہوتی تو بے چینی بڑھنے لگی یہاں تک کہ پورے زور شور سے دستور سازی کا مطالبہ ہونے لگا، اسلامی دستور سازی کے لئے مطالبے کے لاکھوں کارڈ اور ہزاروں تار ارباب حل و عقد کی خدمت میں بھیجے گئے، بڑے بڑے شاندار جلوس نکلے، عظیم الشان جلسے ہوئے ——— یہ عالم دیکھ کر پھر کچھ حرکت پیدا ہوئی، محسوس فرمایا گیا کہ عوام کے تیور بدلے بدلے سے ہیں، صرف وعدوں پر معاملہ کو زیادہ دن تک ٹالا نہیں جا سکتا، یہاں تک کہ ۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو بنیادی سفارشات کی رپورٹ دستور ساز اسمبلی میں پیش کر دی گئی۔

بنیادی اصولوں کی اس رپورٹ پر اخباروں نے نکتہ چینیاں کیں، ملک کی پارٹیوں کے لیڈروں نے بیانات دیئے مگر علمائے کرام پورے وقار اور انتہائی سنجیدگی کے ساتھ خاموش رہے، انتہا یہ ہے کہ جماعت اسلامی نے سکوت اختیار کیا حالانکہ

عوام اُس کی رائے معلوم کرنے کے لئے بہت بے چین تھے۔

اخبارات کے صفحے، ریڈیائی لہریں اور سننے والوں کے کان اس کے گواہ ہیں کہ اسلامی دستور سازی کا مطالبہ جتنا تیز ہوتا جا
اُسی شدومد کے ساتھ اربابِ اقتدار، اُن کے متوسلین اہلِ قلم اور اُن کے حواری اخبارات نے "علماء" کے خلاف مہم شروع کر
اُن کو مُلّا، تنگ نظر، قدامت پرست اور نہ جانے کیا کیا کہا گیا، خاص طور سے جماعتِ اسلامی کو ہدفِ ملامت بنایا گیا۔

علماءِ کرام کو اگر اسلام اور پاکستان عزیز نہ ہوتا اور وہ ان اپنے کم نظر ناقدین سے انتقام لینا چاہتے تو بنیادی سفارشات کی
رپورٹ کو یکسر رد کر سکتے تھے، کیونکہ اس میں تمام تر حق نہیں ہے بلکہ کہیں کہیں حق کے ساتھ باطل بھی ملا ہوا ہے، اور جس زما
میں وہ کراچی میں مشورت کے لئے جمع ہوئے ہیں اُس وقت طلبا اور عوام پر فائرنگ کے سبب انتہائی خطرناک صورت پیدا ہو گئی
تھی، علماء اگر اپنے دشنام طرازوں سے انتقام پر اتر آتے تو شورش پسندوں کو بس ذرا شہ کی ضرورت تھی، سارا شہر آتش فشا
بن سکتا تھا، مگر علماءِ کرام کو ہزار آفرین کہ انہوں نے بڑے ظرف، وقار، سنجیدگی، امن پسندی، عفو و درگزر، اور اسلامی کردا
کا ثبوت دیا۔

دو اہم مسئلے

کوئی شک نہیں کہ ۱۹۵۰ء کی رپورٹ اور ۱۹۵۲ء کی رپورٹ میں زمین آسمان کا فرق ہے، وہ یکسر
قابلِ تنسیخ سمجھی گئی اور ٹھکرا دی گئی، یہ قابلِ ترمیم قرار پائی اور علماءِ کرام نے شبانہ روز کے غور و فکر کے
بعد ۲۱ جنوری ۱۹۵۳ء کو اپنی ترمیمات پریس کے حوالہ کر دیں۔

اس مشورت میں ہر مکتبِ فکر و خیال کے علماء شریک تھے، شاید صدیوں کے بعد علماءِ کرام کے اس درجہ اتحاد و اتفاق کی
صورت پیدا ہوئی، ان میں وہ بھی تھے جن کی عمریں قرآن و حدیث کی تعلیم و تدریس میں بسر ہوئی ہیں، جو سالہا سال سے مسندِ افتا
پر متمکن ہیں، جن کی راتیں ورد و وظائف اور ذکر و شغل میں گزرتی ہیں اور جو خدا کے خوف سے تنہائی میں روتے ہیں، ان میں تاریخ
و سیرت کے ماہرین بھی تھے، ان میں فقہا اور محدثین بھی تھے اور کوئی کوئی ان میں ایسا بھی تھا جو ایک ہی وقت میں "جہاد" "لاسل
"پردہ" "حقوقِ زوجین" "جبر و قدر" "اسلامی دستور" "مغربی قانون" اور حدیث و قرآن پر مجتہدانہ گفتگو کر سکتا ہے او
جس کی دینی بصیرت سے ہندستان اور پاکستان ہی نہیں، مصر و شام تک متاثر ہیں۔

ہمارا قیاس ہے اور کیا عجب ہے کہ صحیح بھی ہو، وہ یہ کہ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کی
اور زبان کے مسئلہ پر علماءِ کرام نے دانستہ سکوت اختیار کیا، اس لئے کہ ہمارے اربابِ اختیار نے اپنی سادہ لوحی سے ان دونو
مسئلوں کو اتنا خطرناک بنا دیا ہے کہ ان کو چھیڑتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں کوئی شدید تر فتنہ نہ اٹھ کھڑا ہو، ان مسائل کو علما
بحث میں لاتے تو اربابِ حکومت کی مشکلات میں اور اضافہ ہو جاتا اور علماء کا مقصد مشکلات کو گھٹانا ہے بڑھانا ہرگز نہیں

ہم اس سلسلہ میں صرف اس قدر عرض کرنا چاہتے ہیں کہ پاکستان کی سالمیت اور مرکزیت ہر صورت میں باقی
رہنی چاہئے، یہ پنجاب ہے، وہ بنگال ہے، اسے سندھ کہتے ہیں، یہ سرحد اور بلوچستان ہیں، وہاں کی آبادی سب سے زیا
ہے، اس علاقہ کے لوگوں کی کثرت فوج میں ملازم ہے، اس خطہ میں غلہ زیادہ پیدا ہوتا ہے، فلاں صوبہ کی زمین سب سے
زیادہ زرخیز ہے، اس صوبہ کا رقبہ بہت بڑا ہے ———— اگر ان امتیازات کو باقی رکھا گیا تو پھر پاکستان میں اسلا
وحدت اور دینی اخوت کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا، اسلام تو نسل و رنگ اور وطن و قوم کے انہی تصورات او
امتیازات کو مٹانے کے لئے آیا تھا اور اس نے مٹا بھی دیا، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے جب کسی نے اُن کا نسب

دریافت کیا تو آپ نے فرمایا، سلمان ابن اسلام، ابن اسلام ...... " یعنی اسلام لانے کے بعد میرے حسب و نسب اور قوم و وطن کا ہر امتیاز اور تفاخر ختم ہو گیا، اب میں صرف "مسلم" ہوں! پاکستان میں اسی تصور کو عام کرنے کی ضرورت ہے کہ تمام نسلی اور وطنی امتیازات "اسلام" میں ضم ہو جائیں اور عوام مسلمان صوبوں، نسلوں اور خاندانوں کے بجائے خالص اسلامی نقطۂ نگاہ سے اپنے نفع نقصان کو سوچیں، اس قسم کی وحدتِ فکر اور مرکزیت جب تک پیدا نہ ہوگی، اُس وقت تک پاکستان اُس دیوار کی طرح نہ ہوگا جس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کو تھامے رہتی ہے۔

یہ مصیبت بھی ہمارے اربابِ اقتدار ہی کی لائی ہوئی ہے، ملازمتوں میں "کوٹے" (کوٹہ سسٹم) اُنھیں نے مقرر کئے ہیں، اور انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے دانستہ طور پر خطوں اور صوبوں کے امتیازات کو باقی رکھا گیا ہے، یہ اُلجھنیں اُنھی کی ڈالی ہوئی ہیں اور مناسب یہی ہے کہ وہی اس کو سلجھا بھی دیں۔

دوسرا اہم مسئلہ زبان کا ہے، اس بات کو ہر کوئی جانتا ہے کہ مسلم لیگ نے "اسلام" کے بعد جس چیز کے تحفظ، ترقی اور بقا پر سب سے زیادہ زور دیا وہ "اردو" زبان ہی تھی، پاکستان جب نیا نیا وجود میں آیا تھا اُس وقت صوبائی تعصب پاکستانیوں میں، اگر ہوگا بھی تو برائے نام تھا جیسے آرد پر سفیدی! اردو زبان کو اُسی وقت قومی زبان کی حیثیت سے نافذ کر دیا جاتا تو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا کہ "اُردو" کا نام سُنتے ہی بنگال میں غیظ و غضب کی اک لہر دوڑ جاتی ہے، اُردو کے ساتھ حکومتِ پاکستان کا سلوک نہ صرف یہ کہ بیگانوں کا بلکہ بے رحمانہ اور نامنصفانہ رہا ہے، غضب خدا کا کراچی میں جہاں کی سو فی صدی آبادی اُردو بولتی ہے، وہاں کے ذیلی دفاتر تک میں اُردو کو رواج دینے اور عام کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

عربی زبان کے بعد اسلامی علوم کا سب سے بڑا ذخیرہ اُردو اور صرف اُردو زبان میں محفوظ ہے، اس معاملہ میں فارسی زبان بھی اپنی قدامت، شیرینی اور تمام دلکشی کے باوجود اُردو زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی، پس پاکستان میں اُردو زبان کو اس لئے بھی رواج دینے کی ضرورت ہے کہ مسلمان اسلامی علوم سے آشنا ہوں، پھر اُردو زبان پاکستان کی وحدت، سالمیت یک جہتی اور مرکزیت کے لئے بھی نہایت موثر ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے!

علماء کے اجتماع میں بنگال سے جتنے علماء آئے تھے وہ سب کے سب بہت اچھی اُردو جانتے ہیں، مگر سرحد، بلوچستان، آزاد کشمیر، سندھ اور پنجاب کے جن علماء نے اس اجتماع میں شرکت فرمائی ان میں سے کوئی ایک عالم بھی بنگلہ زبان نہیں جانتا، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ پاکستان کے ہر خطہ، ہر علاقہ، ہر صوبہ اور ہر شہر میں جو زبان سمجھی اور بولی جاتی ہے وہ صرف "اُردو" ہے! یعنی ایک طرف تو یہ عوام کی مقبول زبان ہے اور دوسری طرف علمی طور پر پاکستانی علاقوں کی کوئی زبان اُردو کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اگر کسی کو مزید شہادت درکار ہو تو وہ بنگال کے شہروں اور قصبوں میں جا کر دیکھ لے کہ وہاں اُردو جاننے والے کتنی تعداد میں ملتے ہیں، خلافت، کانگریس اور مسلم لیگ کی تحریک کے دور میں لیڈر اور علماء بنگال میں بیشتر زیادہ تر اُردو ہی میں تقریر کرتے تھے کہ یہی وہ واحد زبان ہے جو ہر جگہ سمجھی اور بولی جاتی ہے —— مگر اس کے برخلاف پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد کے قصبوں ہی میں نہیں اُن شہروں میں جن کی تعداد

ایک ایک لاکھ سے بھی زیادہ ہے، شاید بیس ہزار میں ایک آدمی بھی بنگلہ زبان جاننے والا مشکل ہی سے مل سکے گا۔

پاکستانی علاقوں کی دوسری زبانوں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ محدود علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں، اُردو زبان کی مقبولیت، ہمہ گیری، اور علمی وسعت اور کسی زبان کو حاصل نہیں ہے۔

پس اربابِ اختیار اور واضعانِ دستور کا فرض ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کی مساوات "parity" اور "اُردو زبان" کے مسئلہ کو جسے علماء کرام نے مصلحتاً نہیں چھیڑا فراست ودانائی کے ساتھ حل کر دیں اس "خلا" "gap" کو وہی پُر کر سکتے ہیں، یہ گتھیاں انھی کے سلجھانے کی ہیں۔

ترمیمات!

دستوری سفارشات میں چونکہ "کتاب وسنت" کو ماخذ ومبنیٰ تسلیم کیا گیا ہے، اس لئے پاکستان کے دستور پر سب سے زیادہ وزنی رائے علمائے کرام ہی کی ہو سکتی ہے کہ "کتاب وسنت" اُن کے غور وفکر، درس وتدریس اور تعلیم وتعلّم کا موضوع رہا ہے، ان بزرگوں کی زندگیاں انھی منزلوں کی جادہ پیمائی میں صرف ہوئی ہیں، کتاب وسنت کے سب سے زیادہ رمز شناس یہی حضرات ہیں۔ اور یہ علمی اجارہ داری یا "PRIEST HOOD" نہیں ہے، ورنہ اس طرح تو وکیل، بیرسٹر، انجنیر، اور ڈاکٹر ان سب پر "فنی اجارہ داری" کی تہمت لگائی جا سکتی ہے! جن لوگوں نے علم وفن کی باقاعدہ سبقاً سبقاً تحصیل کی ہے، وہ اُن لوگوں کی سطح پر کیسے لائے جا سکتے ہیں، جنھوں نے اُردو کی دس پانچ کتابیں پڑھ کر یا اِدھر اُدھر سے کچھ سُن سُنا کر معلومات حاصل کی ہوں۔

دستوری سفارشات میں اسلامی نقطۂ نگاہ سے جو خامیاں اور کمزوریاں تھیں، علماء کرام نے اپنی متفقہ "ترمیمات" کے ذریعہ ان کو دور کر دیا ہے، انھوں نے حالات کا اندازہ لگاتے ہوئے "زیادہ سے زیادہ" نہیں "کم سے کم" کو قبول کیا ہے، اربابِ اختیار اور اہلِ حل وعقد کو چاہئیے کہ وہ علمائے کرام کی ترمیمات کو خوش دلی کے ساتھ مان لیں؛ علماء کرام نے دستوری سفارشات کی قبا کا جھول نکال دیا ہے اس کی سلوٹیں درست کر دی ہیں اور اب یہ قبا پاکستان کے جسم پر "درست ٹیک" سکتی ہے۔

اربابِ اقتدار کی فراست، دانائی، دور اندیشی اور پاکستان دوستی کا یہی تقاضا ہے اور ہونا چاہئیے کہ دستوری سفارشات میں علماء کرام کی ترمیموں کو قبول کر لیں اور ایک نئل کے اندر اندر دستور بنا کر ملک میں نافذ کر دیں، اگر ضد سے کام لیا گیا اور علماء کے مشوروں کو مُلّاؤں کے مشورے سمجھ کر لفظ انداز کر دیا گیا یا کہیں کہیں سے کوئی بات لے کر، باقی مشورے رد کر دیئے گئے، تو پھر ملک کو شدید کشمکش سے دوچار ہونا پڑیگا کوئی طاقت "نیم کافرانہ" یا ایسا دستور جس میں حق وباطل سے جلے ہوں، پاکستان میں نافذ نہیں کر سکتی، نہیں کر سکتی، نہیں کر سکتی، ان کوششوں کو نہیں چلنے دیا جائے گا۔

علماء اور عوام مسلمان فیصلہ ہی نہیں تہیہ کر چکے ہیں کہ پاکستان جس اسلام کے نام پر بنا ہے، اُسی اسلام کو یہاں غالب ہو کر رہنا ہے، اور وہ وقت انشاء اللہ دُور نہیں ہے کہ دنیا کے اس ظلمت کدے میں

پاکستان کی اسلامی حکومت ایک روشن مینارے کی طرح چمکے گی، ہم جب اسلام کو عملاً برت کر دکھا دیں گے تو دُنیا کے ایک ایک مُلک میں شور اُٹھے گا اور مطالبہ ہوگا کہ یہاں بھی پاکستان جیسا دستور نافذ کرو، یہاں بھی اسی روشنی کے چراغ جلاؤ، اور یہی وہ دن ہوگا جب آسمان سے ہماری جانب سلام آئیں گے اور اس دن سے زیادہ شیطان کبھی مایوس اور غمگین شاید نہ ہوا ہوگا۔

عوام سے!

ایک بات ہمیں عوام مسلمانوں سے بھی کہنی ہے وہ یہ کہ جب وہ پاکستان کے ارباب اقتدار پر تنقید کرتے ہیں تو اپنے کو بھول جاتے ہیں، بیشک اعلیٰ طبقہ میں ہر طرح کی بُرائیاں کمزوریاں اور خرابیاں موجود ہیں مگر عوام نے کیا اپنے گریبانوں کی طرف بھی کبھی جھانک کر دیکھا ہے کہ خود اُن کی زندگیوں کا کیا عالم ہے؟ فٹ پاتھ پر جوا کون کھیلتا ہے؟ رات رات بھر ٹکٹ خریدنے کے لئے سینما کے دروازوں پر کون کھڑا رہتا ہے؟ دودھ میں پانی کون ملاتا ہے؟ نمازوں کے وقت اپنے کاروبار میں کون مصروف رہتا ہے؟ دھوکے کا لین دین کون کرتا ہے؟ جھوٹی گواہیاں کون دیتا ہے؟ یہ جو برقعوں کی نقابیں اُٹھائے ہوئے عورتیں سرِ بازار گھومتی رہتی ہیں اور اُن کو جو لوگ گھور گھور کر دیکھتے ہیں وہ عوام ہی تو ہیں، خواص اور "بڑے لوگ" نہیں ہیں۔

چکلوں اور قحبہ خانوں کی رونق اُن عوام ہی کے دم سے ہے جو اسلام دوستی کا دم بھرتے ہیں، کونسی بُرائی نہیں جو ہم میں نہیں ہے، آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے، فصل کی فصل ہی خراب ہے اور پوری قوم میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے، ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ "بڑے لوگوں" کی غفلتیں، نادانیاں اور بداعمالیاں بھی ہمارے معاشرے پر بہت کچھ اثر انداز ہوئی ہیں، ہماری عورتوں نے "بیگمات" کو دیکھ کر آزادیاں اور بے باکیاں سیکھی ہیں اور اوپر کے طبقہ کی رشوت ستانی اور نفع اندوزی کی داستانیں سُن سُن کر نیچے طبقہ کے لوگوں کی جُراتیں بڑھی ہیں مگر یہ نہیں ہے کہ ان بدکاریوں اور بداعمالیوں کا سارا وبال "اعلیٰ طبقہ" پر ہی ڈال دیا جائے، اخلاق کے خون میں عوام اور خواص دونوں کے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں۔ اخلاقی فساد قصر و ایوان ہی میں نہیں جھونپڑیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

———عیش و راحت میں خدا کا بھول جانا اتنا زیادہ حیرت انگیز نہیں ہے جتنا مصیبت اور غربت و افلاس کی حالت میں حیرت انگیز ہے، امیروں دولت مندوں اور جاہ و منزلت والوں کے بگاڑ پر ہمیں افسوس تو ہے لیکن حیرت نہیں ہے کہ اُن سے ہم حسن ظن بھی نہیں رکھتے تھے، حیرت ہے اُن عوام کی بگڑی ہوئی حالت پر جن کو ہم خدا اور رسولؐ کا عاشق اور اسلام کا فدائی سمجھتے تھے، اور جن سے آج بھی ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ

؎ عشق با نانِ جویں خیبر کشاد

کی داستان یہی خاک نشین دُہرائیں گے۔

اسلامی دستور آرہا ہے کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی پس عوام کو چاہیئے کہ وہ اُسے کامیاب بنانے کے لئے اپنے میں اخلاقی تبدیلیاں شروع کر دیں، اللہ کا ڈر اور آخرت کے محاسبہ کا خوف زیادہ سے زیادہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے، ایک ایک گاؤں، ایک ایک محلہ، ایک ایک گلی بلکہ ایک ایک فلیٹ کے نیک، دردمند اور اخلاق پسند لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے گھر والوں اور پاس پڑوس کے لوگوں کی اصلاح کا کام شروع کر دیں، عوام کی حس ابھی تک مُردہ نہیں ہوئی ہے، اُن کی دینی غیرت سو تو گئی ہے مگر مری نہیں ہے، اُس کو بیدار کیا جا سکتا ہے۔

ارباب اقتدار کی خدمت میں!

ارباب اقتدار کی خدمت میں ہماری یہ گزارش ہے کہ وہ دستور کی تسوید

اور اس کے نفاذ کے انتظار میں نہ رہیں، انفرادی اور اجتماعی تغیر کی کوشش اسی وقت سے شروع کر دینی چاہیئے، اسلامی دستور چلانے اور اسلامی حکومت میں منصب کی کرسی پر بیٹھنے کے لئے "اسلامی اخلاق" اوّلین شرط ہے جس کسی کی زندگی اسلامی اخلاق سے خالی ہے، وہ اسلامی حکومت میں کسی کرسی اور عہدے پر رہ ہی نہیں سکتا، اُسے یا تو راضی خوشی سے خود ہی علیحدہ ہو جانا چاہیئے ورنہ اُسے علیحدہ ہونا پڑے گا۔

یہ ذہنیت انگریز کی پیدا کی ہوئی ہے کہ اہلِ منصب اور اربابِ اختیار قوم و ملک کے "مخدوم" ہوتے ہیں، اس بگڑی ہوئی ذہنیت کو یکسر بدل جانا چاہیئے، اسلامی حکومت کا معیار تو یہ ہے :-

سروری در دینِ ما خدمت گری است

تو اسلامی حکومت کے کارکن اپنے کو "مخدوم" نہیں "خدمت گار" سمجھیں اور جس دن وہ اپنے کو قوم کا "خادم" سمجھنے لگیں گے، بہت سے غلط تفاوت اور غیر اسلامی امتیازات تو اُسی وقت مٹ جائیں گے۔

یہ واقعہ ہے کہ پاکستان کے اربابِ اقتدار نے ملک میں، اسلامی ماحول اور دینی معاشرت پیدا کرنے کی ذرہ برابر کوشش نہیں کی بلکہ اُن کی روش، طرزِ عمل اور پالیسی عام طور پر بیگانوں کی سی رہی ہے، اور غیر ممالک میں پاکستانی سفیروں کے حالات جو ہم تک پہنچے ہیں وہ اور زیادہ افسوسناک اور شرم انگیز ہیں، زیادہ دن تک یہ باتیں برداشت نہیں کی جا سکتیں، ان بے اعتدالیوں کو ختم ہو جانا چاہیئے ——— جلد، بہت جلد! کسی مطالبہ، احتجاج اور دباؤ کے بغیر ہی!

یہ پوری قوم کی طرف سے گزارش ہے، التجا اور استدعا ہے، جو پورے ادب و احترام کے ساتھ کی جا رہی ہے، دانشمندی اور فراست کا تقاضا ہے کہ اسے گوشِ ہوش سے سُن نہ صرف یہ کہ سُنا جائے بلکہ اُس پر پورا پورا عمل کیا جائے، یہ آخری مہلت ہے جو دی جا رہی ہے، اس مہلت سے کاش فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے۔

انگریز نے قوم کے مطالبوں کو کھٹائی میں ڈالنے کی جو پالیسی اختیار کی تھی وہ پاکستان میں نہیں چل سکتی اور خود انگریز بھی اپنی اس پالیسی میں ناکام ہو چکا ہے، وہ لوگ جنت الحمقاء میں رہتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ صرف زبانی وعدوں، بھڑکیلے دار تقریروں اور خیالی اور کاغذی اسکیموں سے کسی قوم کو مطمئن کیا جا سکتا ہے، ہاں! تھوڑے دن تک یہ باتیں ضرور چل سکتی ہیں مگر پھر ان کا "ردِ عمل" بڑا خطرناک ہوتا ہے۔

خوشامدی اہلِ صحافت اور ضمیر فروش اربابِ قلم کے مشوروں اور قصیدہ خوانیوں پر جو کوئی اعتماد کرے گا اُسے اپنے زوال کی خبر سننے کے لئے تیار رہنا چاہیئے، یہ بڑے کمزور سہارے ہیں، حبابوں سے بھی زیادہ کمزور! اس قسم کے درباری لوگوں نے ہمیشہ صحیح حالات کو چھپایا ہے اور شدید سے شدید آتش فشانوں پر حجابات ڈالنے کی کوشش کی ہے مگر تاریخ میں یہ کوششیں "ٹریجڈی" کی صورت میں محفوظ ہیں۔

"اسلام کو لاؤ اور پورے اسلام کو لاؤ"!

کاغذوں اور زبانوں سے نہیں اپنی زندگیوں سے اس کا ثبوت دو، تلافیٔ مافات کرو اور اپنے کو بدلنے کی کوشش ابھی سے شروع کر دو!!

ماہر القادری
۲۶ جنوری ۱۹۵۳ء

حکیم الامتؒ

مولانا عبدالباری ندوی کی نظر میں!

"مولانا عالم بے بدل اور درویش کامل تو خیر تھے ہی۔ لیکن سب سے پہلے انسان تھے اور جس نے اُن کے اس جوہر کو نہ پہچانا اس نے ان کو ذرا بھی نہ پہچانا" (صفحہ ۱۱۲)

حکیم الامت مجدد وقت کے علوم و تعلیمات، اصلاحات و تجدیدات کے گوناگوں کمالات و جامعیت کے علاوہ سلسلۂ تجدید[1] کے مولف احقر نے سلسلہ کی پہلی کتاب جامع المجددین کے مقدمہ میں کچھ خود حضرت علیہ الرحمۃ کی شخصیت اور انسانی کمالات کے بھی تھوڑے بہت جاننے پہچاننے کا دعویٰ کیا تھا۔ لیکن حکیم الامت کے نامے مولانا (دریابادی) سلمہ کے قلم نے اُمت کے اس حکیم کی خدمت میں اپنی ۱۶،۱۵ سال کی طویل مکاتبت اور مہینوں کی مجالست کے "نقوش و تاثرات" کی ۴۱۴ صفحے کی ضخیم کلاں تقطیع کی کتاب میں جو شاہکارانہ نقاشی فرمائی ہے اس کو حرف حرف پڑھ کر اعتراف کرنا پڑا کہ اس دعویٰ کا پورا حق ان ہی کے حق میں محفوظ ہو گیا۔ یاد آتا ہے کہ سلسلۂ تجدید کی کسی کتاب پر اُن سے ایک مختصر مقدمہ کی بھی درخواست کی تھی۔ مگر یہ کیا معلوم تھا کہ ایسا مطول مقدمہ و تکملہ سب ہی کچھ اُن کے قلم سے مقدر فرمایا جا چکا تھا، جو غریب مولف کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا۔

باطنی و روحانی کمالات تو خدا ہی جانتا ہے کہ کتنوں کو اور کیسے کیسے حکیم الامت کے در سے نصیب ہوئے ہونگے۔ مگر ظاہری زندگی کے انسانی کمالات کے اتنے گہرے مطالعہ کی سعادت حضرتؒ کی خدمت میں سالہا سال مختلف رہنے[2] والے خدام و خواص میں بھی شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ اور پھر ان کمالات کی مصوری کا حق اس مرقع میں جس کمال کے ساتھ ادا کیا گیا ہے، اس میں تو "شاید" کی بھی گنجائش نہیں۔ اور بلا شرکت غیرے دریابادی کے قلم کا یہ شاہکار آپ اپنی نظیر ہے۔ مقبولین کے درجات اور قرب ولایت کے مقامات کے لحاظ سے یقیناً بڑے بڑے کاملین امت میں گزرے ہیں۔ اور ان میں بہتیرے انسانی کمالات کے بھی جامع اپنے اپنے وقت و زمانہ کے اعتبار سے رہے ہونگے۔ لیکن دوسری طرف یہ

---

[1] اس انمول کتاب کی قیمت ہے، ملنے کا پتہ دار المصنفین اعظم گڑھ اور صدق جدید کچہری روڈ لکھنؤ ہے!

[2] یعنی تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحوں کی تین کتابیں جن میں دین کی اُن انفرادی و اجتماعی، ظاہری و باطنی جامع اصلاحات کو جدیدیٹنگ میں جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو حضرتؒ نے نصف صدی سے زائد کی مسلسل خدمات سے فرمائی ہیں۔

بھی یقینی ہے کہ "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا" عالم و فاضل، مصنف و مقرر، ولی و صوفی سب کچھ ہونے کے مقابل میں انسان ہونا ہمیشہ ہی مشکل رہا ہے۔ اور آج کا عہد حاضر تو انسانیت کے انحطاط و زوال میں اس انتہائی کمال کو جا پہنچا ہے کہ کمالات کو اُلٹ کر نقائص اور نقائص کو کمالات کا نام دیدیا گیا ہے۔ خود حضرتؒ[1] کے علمی و قلمی، اصلاحی و تجدیدی، دینی و روحانی فضائل و کمالات کے اعتراف کے باوجود، معاندین کا ذکر نہیں، بعض اچھے اچھے معتقدین تک کو حضرت کے عین انسانی کمالات ہی اُلٹے نقائص نظر آنے لگتے ہیں۔ راقم ہذا کے پاس کبھی کبھی اسی غلجان کے ایسے عقید تمندوں تک کے بھی خطوط آجاتے ہیں جو حضرت کے دوسرے کمالات پر سر دھنتے ہیں۔ اس کا بڑا سبب زمانہ کی وہی ذہنیت ہے کہ "خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد"۔ حکیم الامت کے "نقوش و تاثرات" کے مطالعے سے یہ پھانس بھی انشاء اللہ ہر انصاف پسند دل سے نکل جائیگی۔

عام طور سے لوگوں نے خوش خلقی سمجھ رکھا ہے محض رسمی تعظیم و تکریم، تکلف و تصنع یا دنیا سازی اور بناوٹ کی باتوں کو۔ حالانکہ انسانیت و آدمیت یا شرافت جو چاہے کہہ لو، اس کا اعلیٰ جوہر یہ ہے کہ آدمی دوسروں کو بھی آدمی ہی سمجھے۔ اور خود غرضی یا بے پروائی سے کسی کی آزادی اور راحت و مصلحت کو ذرہ بھر بھی پامال نہ ہونے دے۔ دیکھنے والوں کو سب سے پہلا سبق حضرتؒ کی زندگی و معاشرت میں یہی ملتا تھا اور اس معاملہ میں جہاں تک حضرت کا عمل جاتا تھا دوسروں کی نظر بھی جاتے دیکھی گئی۔ مثال خود حکیم الامت کے مرقع نگار کی لیجئے۔ اپنے گوناگوں کثیر مشاغل چھوڑ کر، دور دراز سفر کر کے تھانہ بھون حاضری تمام تر اسی لئے ہوتی تھی کہ مجالس اشرفی کی حکیمانہ تعلیمات اور علوم و معارف سے مالا مال ہوں۔ بھلا کسی مجلس سے ایک لمحہ کی غیر حاضری بھی وہ خوشی کیسے گوارا کرتے۔ پھر بھی حضرت کو اپنے چھوٹوں اور بڑے سے بڑے عقید تمندوں تک کو خفیف سی خفیف گرانی و تشویش سے بھی بچانے کا اتنا اہتمام رہتا کہ صبح کی مجلس خاص کے لئے "پہلی بار جب خادم صاحب بُلانے آئے تو بجائے زبانی پیام کے ذیل کا پرچہ لائے

" کرمی السلام علیکم - میں اس وقت فارغ ہوں، اگر جی چاہے تشریف لایئے۔ لیکن اگر اس وقت کوئی ایسا شغل ہو جس کا انقطاع تشویش کا سبب ہو تو تکلیف نہ کیجئے۔ دوسرا وقت مل جائے گا۔"

پھر اس کے بعد روزانہ کی اطلاع میں بھی یہی معمول تھا کہ

" کوئی خادم صاحب آتے اور حضرت کی طرف سے بُلاوا ہرگز نہ دیتے بلکہ صرف اتنا کہہ جاتے کہ مولانا نے فرمایا ہے کہ میں اس وقت خالی ہوں۔ مگر آپ کو بھی فرصت ہو اور جی چاہے آجایئے۔"

" قربان جایئے ان حکیمانہ احتیاطوں کے کہ خوب جانتے تھے کہ اس شرفِ حضوری ہی کے لئے تو وطن سے چل کر آیا ہوں۔ اتنے دنوں کے لئے وطن کی ضرورتوں کو چھوڑ آیا ہوں۔ ہر طرح نیازمند ہوں۔ اس پر بھی یہ کبھی نہ کہتے کہ مخدومانہ، حاکمانہ، افسرانہ لہجہ میں کہلا بھیجتے کہ آجاؤ۔ ہمیشہ لحاظ اس نیازمند ہی کی فرصت کا اور طبیعت کی آمادگی کا رکھتے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ اللہ اتنی احتیاط کون کرے گا۔ چھوٹوں کے لئے نہیں برابر والوں کے لئے بھی جذبات کی اتنی رعایت کون کرتا ہے۔" (ص۳۳)

" کوئی مولانا کے زہد و تقویٰ پر گرویدہ ہوگا۔ کوئی اُن کے علوم و معارف سے مسحور ہو گیا ہوگا۔ اس نا رُو سیاہ کے دل کو گھائل کرنے والی تو مولانا کی یہی ادائیں ذرہ نوازی و بندہ پروری کی تھیں۔ عبد کامل کے سچے جانشینوں میں جھلک ہونی بھی اسی رحمۃ للعالمینی کی چاہئے۔" (ص۴۱)

---

[1] مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

اور یہ ذرہ نوازیاں کچھ مولانا دریابادی کے ساتھ خاص نہ تھیں۔ نالائق راقم الحروف کا بھی ہر حاضری میں یہی تجربہ رہا کہ اطلاع فرمانے کا بعینہ یہی عنوان و معمول رہتا۔ ایک مرتبہ تو حد ہی فرمادی کہ میرا قیام خانقاہ سے ذرا فاصلہ پر ہوا۔ اب اطلاع کرنے والے صاحب کو مزید ہدایت یہ تھی کہ سب سے پہلے اس ناکارہ کو اطلاع ہو۔ خانقاہ کے پرانے پرانے حاضر باشوں کی سمجھ میں بھی اس کی حکمت نہ آئی تو اپنی سمجھ میں کیا آتی۔ آخر کسی سلسلہ میں حضرت ہی کے فرمانے سے معلوم ہوا کہ قریب والوں کو اگر پہلے اطلاع ہو جائے اور وہ آجائیں تو مجلس شروع ہو جائے گی اور دور والا پھر دس پانچ منٹ کے لئے پیچھے رہ جا سکتا ہے، بھلا حضرت اپنی طرف سے ایسی خفیف سی رعایت بھی کیسے نظر انداز فرما سکتے تھے۔ اللہ اکبر خود اپنی بھی کون اتنی رعایت و خیر خواہی کرتا ہوگا۔ کرنا الگ رہا ذہن ہی کس کا یہاں تک جاتا ہوگا بجز اس کے جس میں انسانیت و حکمت دونوں کی شانیں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہوں، حاضری کے دوران میں روز ہی اس طرح کے تجربات ہوتے رہتے تھے، جن کی یاد سے آج بھی دل بھرا آ رہا ہے!

بس "حکیم الامت" پڑھتے جائیے اور موقع موقع پر "حکمت و انسانیت" کے یہی سبق پر سبق ملتے چلے جائیں گے۔ یہ مطلب بالکل نہیں کہ اس ضخیم مجلد میں ایک "مجدد وقت" کے انسانی کمالات کے "نقوش و تاثرات" کے سوا کچھ اور ہے ہی نہیں۔ ہے اور بہت ہے جیسا کہ خود مصنف نے دیباچہ ہی میں واضح کر دیا ہے کہ

"درحقیقت معروض صرف ان کی انسانیت کی کرنی تھی" لیکن "چونکہ ان کی انسانیت ان کے مفسر و فقیہ و درویش ہونے سے الگ نہیں کی جا سکتی اس لئے ضمناً ذکر ان کے علم و فضل، تصوف و سلوک کا کرنا بھی ناگزیر ہو گیا۔"

"بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر"

اس بادہ و ساغر میں سرور و مستی کے بڑے بڑے مقامات ملیں گے۔ تصوف جس کے خاص طور پر حضرت "جامع المجددین" وقت کے سب سے بڑے جامع مجدد و مصلح تھے۔ اور جس میں طرح طرح کی گھر باہر کی غیر اسلامی آلائشوں نے راہ پاکر اچھے اچھے اہل علم و تحقیق تک کو ہمیشہ اور ہمیشہ سے بڑھکر آج اتنی بڑی خالص اسلامی دولت سے محروم ہی نہیں بہتوں کو اس کا کٹر دشمن بنا دیا ہے[1] مصنف کی ایک طویل حاضری کے ذرا ایک طویل اقتباس تاثر کو خود پڑھ کر دیکھو کہ تھانہ بھون کی خانقاہ میں اسلام کے جس صاف ستھرے اور نکھرے ہوئے تصوف و سلوک کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی اس کے دامن پر کوئی ہلکے سے ہلکا داغ دھبہ بھی کتاب و سنت کو داغ لگانے والا ملتا ہے۔

"خیال تھا کہ یہاں بھی صوفیوں کے سے دعوے ہوتے ہوں گے۔ مجذوبوں کے ہاں کے سے احکام جاری ہوتے ہوں گے۔ کشف و کرامات کے چرچے اور تذکرے ہوتے ہوں گے۔ بڑا زور خوابوں اور کیفیات کا رہتا ہوگا۔ اور سب سے زیادہ اہمیت و اہتمام کے ساتھ ذکر و شغل کے حلقے ہوتے ہوں گے...... ایک طویل صحبت اور روزمرہ کی گفتگوؤں نے رفتہ رفتہ بتایا اور دل میں اتار دیا کہ اصل شے تو احکام شریعت ہیں۔ مدار کار اتباع سنت ہے۔ البتہ پورے اخلاص اور تزکیۂ قلب کے ساتھ اللہ کے حقوق بقدر امکان ادا کیجئے۔ فرائض و واجبات میں حتی الامکان غفلت نہ کیجئے۔ اللہ کے بندوں سے اچھی طرح ملتے جلتے باپ، بھائی بیٹے، بیوی، شوہر، ماں، بہن، لڑکی، استاد، شاگرد، ملازم و آقا، دوست پڑوسی سب کے حق پہچانئے اور امکان بھر ادنیٰ سے ادنیٰ دل آزاری و دلشکنی کسی کی نہ کیجئے۔ احتساب نفس کرتے رہئیے۔ خود اپنی اصلاح کی فکر میں لگے رہئیے۔ طاعت ارادی کو ہاتھ سے جانے نہ دیجئے، غفلت غیر ارادی کی پرواہ نہ کیجئے، بس یہی عطر تصوف اور جان طریقت ہے۔"

---

[1] جو "تصوف" اسلام کے مطابق ہے، اُس کی افادیت سے کسکو انکار ہے، اختلاف "انا الحق" والے تصوف سے ہے (مدیر)

بیسیوں غیر ضروری مسائل جو تصوف میں گھس گئے ہیں، سب مجالس اشرفی کی برکت سے صاف ہوئے" (صـ۵۹)

تصوف سے کچھ ہی کم ایک خاص گروہ میں فقہا بھی ہمیشہ کیسے ہدف ملامت بنے رہے ہیں۔ اور آج کل اس پرانے گروہ کے نئے تجدد نواز جانشینوں کو تو اپنی تجدد نوازیوں کے لئے غریب فقہا پر لعن وطعن کے بغیر گویا کوئی راستہ ہی نہیں ملتا۔ خود مصنف کی نگاہ میں " یہ پوری کی پوری جماعت احمقوں، کم فہموں، خشک مزاج، لکیر کے فقیر، کٹھ ملاؤں کا ایک گروہ" تھی۔

" یہ زنگ بھی مجالس اشرفی سے دور ہوا۔ مولانا ہی نے بار بار معقول و مدلل گفتگوئیں کر کے کثرت سے مثالیں دے دے کر سمجھایا کہ شریعت کے نظام میں فقہ کا مقام کتنا بلند ہے۔ اور یہ فقہاء در حقیقت اُمت کے عقلاء اور ملت کے حکماء ہوتے ہیں۔ نظم ملت انھیں کے دم سے وابستہ ہے۔ انھوں نے اگر کتاب و سنت کی روشنی میں، عقل و منطق کے قاعدوں کے تحت اور فطرت بشری کے روزانہ تجربوں کی مدد سے، اتنے جزئیات ہر شعبۂ زندگی سے متعلق نہ مرتب کر دیئے ہوتے تو آج ہم لوگ خدا جانے کہاں کہاں بھٹکتے ہوتے۔ اور اُمت منتشر ہو کر کیسی کیسی گمراہیوں میں بٹ چکی ہوتی۔ فقہاء اور صوفیا دونوں درحقیقت اسلام کی فوج کے اہم بازو رہے ہیں۔ بدنام کنندہ نکو نامے چند نمونے تو ظاہر ہے کہ کس گروہ میں نہیں ہوتے۔ رائے ہر گروہ کے بہترین نمایندوں سے قائم کرنا چاہئیے نہ کہ بدترین سے" (صـ۵۹)

تصوف اور سلوک میں آنکھیں بند کر کے شیخ یا پیر کی پیروی پر جس شدومد کے ساتھ زور دیا جاتا ہے، وہ خواجہ حافظ کی زبان میں مشہور ہی ہو کر

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید   کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

مگر ایک مسلمان کو ذرا سا غور کرنے پر بڑا خلجان ہونے لگتا ہے کہ ایسی غیر مشروط اطاعت تو حق صرف خدا اور اس کے معصوم رسول ہی کو ہے۔ غیر معصوم انسان خواہ وہ وقت کا صدیق و فاروق یا غوث و قطب ہی کیوں نہ ہو، اس کے حق میں ایسے مطالبہ کی سند ہی کیا ہو سکتی ہے۔ اس خلجان کی پہلے مستفیدانہ ترجمانی خود نقاش حکیم الامت کی زبانی سُن لیں:-

" شبہ نفس اتباع میں نہیں، اتباع کامل میں بار بار پیدا ہوتا ہے اور دل کہتا ہے کہ یہ صورت تو شرک فی النبوۃ کی سی ہے۔ آنکھ بند کر کے اتباع تو صرف نبی معصوم کا کیا جا سکتا ہے۔ اور کوئی صاحب کیسے ہی بزرگ ہوں بہر حال رائے میں بھی غلطی کریں گے اور عمل میں بھی۔ یہ نہ ہو تو پھر ان میں اور معصوم میں فرق ہی کیا رہا۔ ہم ہزار ہا غلطیاں کریں گے اور روزمرہ، وہ بہت کم کریں گے اور کبھی کبھی۔ لیکن بہر حال جب حضرات صحابہ تک عملی غلطیوں سے محفوظ رہے نہ اجتہادی لغزشوں سے تو دوسروں کا مرتبہ ان سے تو فروتر ہی ہے" (صـ۳۰)

اب ذرا غور سے حکیم الامت کا جوابی مکتوب پڑھیں۔ اور حکیمانہ تحلیل و تشریح پر وجد کریں:-

" مکرمی سلمہٗ۔ السلام علیکم۔ غالباً میرے کل معروضات اس کے متعلق ذہن میں جمع اس لئے نہیں رہے کہ شاید ایک جلسہ میں مجتمعاً بیان نہیں کئے گئے۔ اب ان کو ملخصاً مجموعاً عرض کرتا ہوں۔ یہ اتباع نہ عقائد میں ہے، نہ کشفیات میں، نہ

لہ پوری نیک نیتی اور دین کی مخلصانہ خیر خواہی کے ساتھ فقہاء پر تنقید کی جا سکتی ہے، وہ کونسا فقیہ ہے جس کے " استنباطات" اور اجتہادات کا حرف حرف درست اور صحیح ہے، اسی لئے خود فقہاء نے ایک دوسرے کے استنباط کئے ہوئے مسائل پر جرح و تنقید کی ہے! (مدیر)

جمیع مسائل میں نہ امور معاشیہ (دنیوی) میں۔ صرف طریق تربیت و تشخیص امراض و تجویز تدابیر اور اُن مسائل میں جن کا تعلق اصلاح و تربیت باطنی سے ہے، وہ بھی اس وقت تک جب تک اس کا جواز مرید و شیخ کے درمیان متفق علیہ ہو۔ اور اگر خلاف ہو تو شیخ سے مناظرہ کرنا خلاف طریق ہے، اور امتثال امر خلاف شریعت ہے۔ ایسی صورت ادب جامع بین الادبین یہ ہے کہ علماء سے استفتا کر کے یا اپنی تحقیق سے حکم متعین کر کے شیخ کو اطلاع کر دے کہ میں فلاں عمل کو جائز نہیں سمجھتا اور ہمارے سلسلہ میں اس کی تعلیم ہے، مجھ کو کیا کرنا چاہیے۔ اس پر اگر شیخ پھر بھی وہی حکم دے تو اس شیخ کو چھوڑ دے اور اگر وہ ترک کی اجازت دیدے تو یہ بھی اس کی متابعت ہے۔ یہ معنی ہیں اتباع کامل کے یعنی جو مرض نفسانی اس نے تجویز کیا ہو یا جو تدابیر اس نے تجویز کی ہوں یا جو عمل شرعی جن کا شرعی ہونا شیخ و مرید میں متفق علیہ ہو، تجویز کیا، اُن چیزوں میں اتباع کامل کرے ذرا بھی اپنی رائے کو دخل نہ دے اور باقی امور میں اتباع مراد نہیں۔"

راقم احقر کو تو ہمیشہ یہ بات بالکل صاف سیدھی نظر آئی کہ جس طرح ظاہری و جسمانی امراض میں ہم طبیب کا مرض کی نفس علاج تدابیر کی حد تک کامل ہی اتباع کرتے ہیں کم و بیش وہی صورت باطنی و روحانی امراض اور ان کے معالجہ اور معالج کے ساتھ معاملہ کی بھی ہونی چاہیئے۔ اسی مثال سے خود حضرت علیہ الرحمۃ شیخ و مرید کے اکثر تعلقات کی تفہیم و تشریح فرمایا کرتے تھے۔ تاہم اس گرامی نامہ میں اپنے اوپر کے متن متین کی شرح فرما کر جو عملی نتائج خود ظاہر فرما دیئے ہیں، وہ ایسے ہیں کہ دُہرائے بغیر ہم سے نہیں رہا جاتا کہ ہر پیر و مرید دونوں ہی کے حرز جان بنانے کے ہیں۔

"حاصر بحث کا اس باب میں یہ ہے کہ اتباع کا محل نہ معلوم ہونے سے یہ سب شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ میں اس کا محل مع قیود و حیثیت متعین کئے دیتا ہوں۔ سو محل تو اس کا صرف شیخ کی تعلیمات قولیہ ہیں (نہ اس کا ہر عمل) جن کا تعلق تربیت و اصلاح باطن سے ہے۔ اور قید یہ ہے کہ جس فعل کی تعلیم کی جا رہی ہے شرعاً جائز ہو، جس کا جواز طالب کے اعتقاد میں بھی ہو۔ اور حیثیت اس کی شیخ کا مصلح ہونا ہے۔ یعنی مصلح ہونے کی حیثیت سے صرف تعلیمات سلوک میں اس کے اقوال پر عمل شرط نفع ہے۔ اب ان قیود کے فوائد احترازیہ بتلاتا ہوں۔ 'تعلیمات قولیہ' کی قید سے خود شیخ کے افعال بھی نکل گئے، خواہ وہ افعال طالب کے اعتقاد میں جائز ہوں جیسے شیخ پانسو رکعت نفل روزانہ پڑھتا ہو اس میں اتباع ضروری نہیں، اور خواہ وہ افعال طالب کے اعتقاد میں جائز نہ ہوں، خواہ مختلف فیہ ہونے کے سبب جیسے شیخ فاتحہ خلف الامام پڑھتا ہو اور طالب اس کو مکروہ جانتا ہو، خواہ شیخ غلطی سے کسی فعل ناجائز میں مبتلا ہو جیسے غیبت، اس میں اتباع جائز ہی نہیں۔

...... اسی طرح اس قید سے امور معاشیہ نکل گئے مثلاً شیخ کسی طالب سے یہ کہے کہ تم اپنی لڑکی کا رشتہ میرے لڑکے یا کسی اور سے کر دو، یہ بھی متابعت کا محل نہیں۔ ...... اب یہ بات باقی رہی کہ جو امور محل متابعت نہیں اُن میں اگر شیخ حکم دے تو اگر وہ شرعاً جائز اور طالب کی قدرت میں ہیں تو مروت کا مقتضا یہ ہے کہ ان میں متابعت کرے، جیسے شیخ اپنا کوئی ذاتی کام یا کوئی خاص خدمت کرنے کی فرمائش کرے۔ اور اگر وہ شرعاً ناجائز ہو، خواہ واقع میں بھی خواہ اس (طالب) کے اعتقاد میں، ادب سے عذر کر دے اور اگر وہ اصرار کرے قطع تعلق کر لے، مگر گستاخی و ایذا کا معاملہ کبھی نہ کرے۔ یہ تو اس وقت ہے جب وہ خلاف شرع کا حکم دے۔ اور اگر طالب کو ایسا حکم نہ دے مگر خود کسی لغزش میں مبتلا ہو تو اگر اس میں تاویل کی گنجائش ہے تو تاویل کرے اور قطع تعلق نہ کرے اور اگر تاویل کی گنجائش نہیں تو تفصیل یہ ہے کہ اگر احیاناً اس کا صدور ہو جاتا ہے تو بشریت و احتمال توبہ پر محمول کر کے قطع تعلق نہ کرے۔ اور اگر اصرار یعنی اعتیاد (عادت) ہے تو اگر

وہ صغیرہ ہے تو قطع تعلق نہ کرے اور اگر کبیرہ یا فسق و فجور یا ظلم و خیانت کے درجہ میں ہو تو تعلق قطع کردے۔ مگر ان سب حالات میں اس کے لئے دعائے صلاحیت کرتا رہے کہ حقوق احسان میں سے ہے۔" (ص ۲۱۱)

سُبحان اللہ تعلیم و تفہیم دونوں کیسی صاف و بے غبار۔ شکن اور جھول کا نام نہیں۔ عوام کا ذکر نہیں خواص پیر و مرید کتنے ہوں گے، جن کی نظر ان باتوں پر ہو ——— ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء

کتاب کا خاص موضوع تو حضرت حکیم الامت کے خاص انسانی فضائل و کمالات ہی ہیں، لیکن ضمناً اور بھی کیسے کیسے علمی و عملی مسائل و مشکلات کے کیسے کیسے حکیمانہ و محققانہ حل پڑھنے والوں کو ملیں گے اس کا اندازہ اوپر کے ایک ہی شکل مسئلہ کے اقتباس سے ہو گیا ہوگا، جس سے علمی ہی نہیں شیخ و سالک کے تعلقات کی عملی دشواریاں کتنی دور ہو جاتی ہیں۔

اہل علم کو ایک بڑا دلچسپ موضوع تفسیری استفادات و افادات کا ملے گا، جس کا تحریری سلسلہ مصنف سلمۂ اور حضرت حکیم الامتؒ کے درمیان آٹھ دس برس تک چلتا رہا اور جو کتاب میں بھی وسط کے کچھ بعد سے قریب قریب آخر تک چلا گیا ہے۔

انگریزی میں کلام مجید کے ترجمے یوں تو بہت سے ہوتے ہیں۔ غیر مسلموں کے قلم سے بھی اور خود مسلمانوں کے بھی۔ لیکن کیسی عجیب اور افسوسناک بات ہے کہ ان میں جمہور امت یعنی اہل سنت کے کسی مستند و محققانہ قلم کا ایک بھی نہیں! اس ضرورت کا احساس تو مولانا دریابادی کو خود ہوا، لیکن "نقوش و تاثرات" کے پڑھنے سے پتہ چلا کہ اس کی تکمیل کا عملی تاثر و اقدام موصوف میں حکیم الامتؒ کی قلبی توجہ و قلبی ہمت افزائی ہی سے پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت کی زندگی ہی میں اس کو مکمل بھی کرا دیا۔ اور طباعت کا ذمہ بھی حسن طباعت کی شہرۂ آفاق و صلہ مندیاں رکھنے والی تاج کمپنی نے لے لیا تھا۔ مگر خدا جانے، جس کمپنی نے قرآن مجید کی طباعت و اشاعت کو اپنی تخصیصی سعادت بنا رکھا ہے، اس نے اتنے بڑے اجر و اہمیت کی خدمت کو جو اس کی ساری خدمات کا سرتاج بن سکتی تھی کیوں سالہا سال سے کھٹائی میں ڈال رکھا ہے؟

یہ ترجمہ خالی ترجمہ نہیں مفصل تفسیری حواشی کے ساتھ ہے، جن میں مسلم و غیر مسلم سب کے ترجموں کی ان غلطیوں اور غلط فہمیوں کو پوری تحقیق کے ساتھ دور کیا گیا ہے جو جمہور امت کے مسلمات کے خلاف تھیں۔ نیز عہد جدید کے ہر طرح کے شکوک و شبہات کا ازالہ بھی کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جدید تاریخی و اثریاتی تحقیقات سے قرآنی حقائق پر جو ایمان افزا روشنی پڑتی ہے، اور بائبل سے متعلق وہ سارا لٹریچر جو انگریزی زبان کے واسطے سے مترجم و مفسّر کی دسترس میں تھا، سب پیش نظر ہے۔

باقی جمہور امت یا اہل سنت کے لفظ نظر سے ترجمہ و تفسیر کے مستند و محققانہ ہونے کے لئے تو اتنا ہی کافی ہے کہ خود حضرت حکیم الامتؒ کے ترجمہ و تفسیر (بیان القرآن) ہی کو کہنا چاہیئے کہ انگریزی میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ آخر کتاب (ص ۶۰۲) میں خود مصنف کے قلم سے آپ پڑھیں گے کہ "اس عالم و عارف کے افادات تفسیری صفحے کے صفحے، ورق کے ورق نقل کر دیئے ہیں، کہیں بجنسہ کہیں کتر بیونت کر کے" پھر حضرت کے اس ترجمہ و تفسیر کا درجہ قدیم و جدید دونوں جانب کے خیالات و معلومات کے واقف و جامع انگریزی مترجم و مفسّر کی نظر میں، سب کو کھنگالنے کے بعد یہ نکلا کہ

"میری پیش نظر تو عربی کی متعدد تفسیروں کے علاوہ شیخ الہند کا اردو ترجمہ بھی تھا۔ لیکن مدد سب سے زیادہ بیان القرآن ہی سے ملی۔ شیخ الہند کا ترجمہ شاہ صاحب دہلوی کے ترجمہ کی طرح صرف پختہ مسلمانوں کے لئے ہے۔ یہ کرامت آپ کی بیان القرآن ہی میں دیکھی کہ پختہ مسلمانوں کے لئے تو ہے ہی۔ لیکن ساتھ ہی بد مذہبوں اور مذبذبین سب کی رعایتیں موجود ہیں۔" (ص ۲۴۳)

ایک اور جگہ اسی حقیقت کا اظہار اس پیرایہ میں ہو کر

"مجھ سے اگر کوئی یہ فرمایش کرے کہ تفسیر ابن عباس سے لیکر تفسیر حقانی تک جتنا ذخیرہ تفسیروں کا ہو سب سے دستبردار ہو کر صرف ایک تفسیر اپنے پاس رکھو تو میرا انتخاب بیان القرآن کے حق میں ہوگا" (ص ۵۹۳)

اور جو لوگ حضرت کے مذاق سے واقف ہیں، جانتے ہیں کہ حضرت کسی ایمانی وعلمی مسئلہ میں ہی حضرات صحابہ اور سلف یا جمہور علمائے اُمت کے مسلک سے بال برابر ہٹنا گوارا نہیں فرماتے تھے۔ دریابادی مترجم ومفسر نے بھی اس باب میں یہاں تک احتیاط فرمائی ہے کہ اگر کہیں خود ان کا رجحان جمہور سے الگ ہوا ہو اور اس کی سند میں سلف کا قول بھی مل گیا ہو تو بھی اس کو اپنے خاص رجحان یا اس استثنائی قول ہی تک محدود رکھا ہے۔ قطعیت وصحت پر اصرار نہیں کیا ہے۔ کیا غم ہوتا ہے کہ ایسی تفسیر اور ایسا ترجمہ انگریزی میں منتقل ہو چکنے کے باوجود محض طبع نہ ہونے کی بدولت مسلمان اور غیر مسلمان انگریزی داں کتنی بڑی ہدایت واستفادہ سے محروم ہیں!

کتاب کا اصل موضوع حضرت حکیم الامت کی انسانیت کا کمال ہے۔ اس کی ایک مثال ترجمہ کے سلسلہ میں بھی سنتے چلیں۔ شاہ عبدالقادر صاحبؒ دہلوی کا ترجمہ سب سے بہتر خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے دریابادی مترجم کی مبصرانہ اور کیسی جازم رائے ہے کہ "اپنے تجربہ وبصیرت کی بنا پر حلف لینے کو تیار ہوں کہ جو رعایتیں بیان القرآن میں ملحوظ رکھی گئی ہیں ان کا شاہ صاحب کے ہاں پتہ بھی نہیں۔ ہاں شرف اولیت بے شک اُن کو حاصل ہے"

یہ خیال رہے کہ حضرت شیخ الہند نے اپنے ترجمہ میں شاہ صاحبؒ موصوف ہی کے ترجمہ کو مدنظر رکھا ہے۔ اور ساتھ ہی حضرت حکیم الامت کے اُستاد بھی ہیں۔ اب حکیمانہ جواب کی وجد انگیز بلاغت اور انسانیت وشرافت کا کمال ملاحظہ ہو۔

"اس پر بجز اس کے کیا عرض کروں کہ دانی اور عربی کا تناسب شرط ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی تفسیر وترجمہ کے دقایق غامض ہیں۔ ان پر حضرت مولانا دیوبندیؒ (شیخ الہند) کی نظر پڑی اس لئے اُنھوں نے کلام اللہ کی خدمت کے لئے اُن کو منتخب فرمایا۔ - - - - ایک بڑے نے دوسرے بڑے کا (ادراک) فرمایا۔ اور میں چھوٹا ہوں، میرے التزامات و رعایات بھی چھوٹے درجہ کے ہیں، جو زیادہ غامض نہیں۔ آپ بھی حضرت مولانا سے چھوٹے تھے ان کا ادراک آپ کو ہوا" (ص۸)

کہنا یہ ہے کہ حکیم الامت کے اس طرح کے انسانی کمالات کی نقاشی کے ساتھ ساتھ علمی اعتبار سے بھی حدیث وفقہ، کلام وتصوف وغیرہ کے علاوہ کلام اللہ کے ترجمہ وتفسیر کے متعلق خصوصاً دقائق وحقائق کا بڑا ذخیرہ کتاب میں اہل نظر کو ہاتھ آئے گا۔

تاہم اگر یہ سوال ہو کہ حضرت کے سارے علمی وعملی کمالات میں سب سے بڑھا ہوا کمال کون سا تھا؟ اس کا جواب ایک ہی ہوگا۔ اصلاحی تعلیم وتربیت یعنی دینی واخلاقی ساری ظاہری وباطنی بیماریوں کا حکمت وحذاقت اور شفقت سے بھرا ہوا علاج۔ شفقت ایسی کہ مہلک سے مہلک بیماری میں بھی کوئی کڑوی دوا بدرجہ مجبوری ہی تجویز فرماتے۔ معمولاً ہر دوا ایسی خوش ذائقہ ہوتی کہ بیمار کو اپنی بیماری میں بھی مزا آجاتا۔

حیدرآباد میں ایک مشہور طبیب حکیم مصباح الدین صاحب مرحوم تھے۔ بڑے باخدا۔ تہجد میں اپنے مریضوں کے لئے دعا کا خاص اہتمام رہتا۔ مزاج کی غایت لطافت کی وجہ سے قدرۃً طبیعت نازک بہت تھی۔ مریضوں پر اکثر ڈانٹ پڑجاتی۔ لیکن ہر دوا کے خوش ذائقہ خوشبو وخوش منظر ہونے کا اتنا التزام کہ خود راقم ہذا کئی مہینے زیر علاج رہا، کوئی دوا ایسی استعمال میں نہیں آئی جو لطف ولذت کے

ساتھ نہ کھائی پی ہو۔ یہی تجربہ دوسرے مریضوں سے بھی سُنا۔

حکیم الامت کے مطب کا رنگ بھی بالکل یہی تھا کہ مریض کا مزاج اگر بالکل ہی گنوار نہ ہو تو سالہا سال کے معالجہ میں بھی کسی بد
دوا یا سخت پرہیز سے قطعاً واسطہ نہیں پڑتا تھا۔ نقاشِ حکیم الامت نے حرف حرف سچ لکھا ہے کہ "خوش طبیب ست بیا تا ہمہ بیمار شویم
کفر کے بعد کبر سے بڑھ کر کون مرض شیطانی و مہلک ساتھ ہی عسیر العلاج ہوگا۔ بلکہ کفر بھی متکبرین کے استکبار ہی کا نتیجہ ہوا
ہوتا ہے۔ حکیم الامت کی نباضی و مزاج شناسی دیکھئے کہ کوئی بیچارہ بڑی شریف و غیور طبیعت والا اس مرض میں مبتلا تھا۔ اس ک
علاج یہ تجویز فرمایا کہ تین مرتبہ خط میں یہ لکھ کر بھیج دو کہ "مجھ میں کبر کا مرض ہے" ٹھیک یاد نہیں کہ ملفوظات میں پڑھا یا مجلس میں سُ
گر غالباً دو ہی مرتبہ لکھنے کے بعد مریض پر اللہ تعالیٰ نے فضل فرما دیا۔ اصل یہ ہے کہ اخلاقی و نفسانی امراض کو اب اچھے اچھے سر
سے مرض ہی نہیں جانتے۔ اور کبر جیسے زہریلے باطنی مرض کو بھی جو سارے علم و عمل کو کھا جاتا ہے پرواہ تک نہیں کرتے۔

جب تک نمائشی و مصنوعی تعلیم و تمدن کا زیادہ زور نہیں ہوا تھا آدمی کا جسم و نفس بھی فطرت صحت و سلامتی سے زیادہ دور نہیں تھ
جیسے جیسے "اهبطوا مصراً" وال تمصر و تمدن کی زندگی زور پکڑتی گئی، جسمانی و نفسانی بیماریوں کا بھی زور بڑھتا گیا۔ ساتھ ہی اس
لادینی تعلیم و تہذیب ہی کے زیر اثر ظاہری و جسمانی بیماریوں کی فکر تو اتنی بڑھ گئی کہ نئی نئی تحقیقات سے علاج و معالجہ کی روزانہ
نئی نئی تدبیریں اور طریقے نکلنے لگے جگہ جگہ اسپتال اور گلی گلی ڈاکٹر اور حکیم ملنے لگے۔

لیکن دوسری طرف اسی بھوٹی تمدن و تمصر کے سیلاب میں بہتے بہتے، انسان اپنی انسانیت سے اتنا دور جا پڑا ہے کہ باطنی
نفسانی امراض کے معالجہ و ازالہ کی فکر کیا ہوتی، ان کے مرض ہونے ہی کا احساس مرچکا ہے۔ حالانکہ ذرا سوچا جائے تو آج انسانیت
کے سارے انفرادی و اجتماعی، سیاسی و معاشی معائب کی جڑ افراد و جماعت، حاکموں اور محکوموں سب کے نفسانی امراض
ہی کی کثرت و شدت ہے۔ تکبر و ترفع، حرص و ہوس، مکر و فریب، خود غرضی و خود رائی کا دور دورہ، یہ سب نفس و نفسانیت کے
روگ نہیں تو اور کیا ہیں۔ ہمیشہ سے زیادہ امن کی جو کی آج پوری دنیا جنگ کے جن دو میدانوں میں صف آرا ہوتی جارہی ہے
کیا اس کی تہ میں ٹرومین اور اسٹالن دو متکبروں یا فرعونوں اور اُن کے ہمزاد دونوں طرف کے کچھ اور بالی موالی چھوٹے
بڑے ٹرومینوں اور سٹالنوں کی علو طلبی و ترفع پسندی کی ضد و نفسانیت یا اپنی اپنی رائے اور بات کی پیچ ہی سب سے
زیادہ کام نہیں کر رہی ہے۔

میں تو کہتا ہوں کہ جسمانی بیماریوں کے لئے اگر گاؤں گاؤں، گلی گلی حکیموں ڈاکٹروں کی ضرورت ہے، تو نفسانی بیماریوں
کے لئے گھر گھر ضرورت ہے۔ کون گھر ہوگا کہ جسم کے بیمار اگر ایک دو ملیں گے تو نفس کی کسی نہ کسی شدید موذی بیماری میں گھ
کا ہر ہر فرد مبتلا نہ ہوگا۔ اور جسمانی دو چار بیماریوں میں اگر ایک آدھ متعدی و بائی ہوگی تو نفسانی بیماری مشکل ہی سے کوئی تعد
سے خالی ہوتی ہے۔ عام بیماریوں کے علاوہ جسم کی خاص خاص متعدی بیماریوں کے لئے جُداگانہ اسپتال تک قائم کرنا ضروری
خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن روحانی یا نفسانی بیماریوں کے علاج کی کسی کو فکر نہیں!

اور اس اعتبار سے کتاب کا سب سے گرانقدر و سبق آموز حصہ مصنف کے وہ مکتوبات ہیں جن میں اُنھوں نے اپنے
اخلاقی امراض کے لئے رجوع فرمایا ہے۔ یاد رہے کہ مصنف خود کوئی عامی اور اناڑی نہیں۔ ایک طرف جدید نفسانیت کے
عالم و مصنف ہیں تو دوسری طرف کتاب و سنت کے حقائق اور امام غزالیؒ جیسے امام اخلاقیات کی اخلاقی تعلیمات پر عالم
و سندی مولویوں سے کہیں زیادہ وسیع و عمیق نظر رکھنے والے۔ پھر بھی حضرت حکیم الامت کی حکیمانہ و معالجانہ تجویزوں اور نسخوں

پر رقص کرتے اور جا بجا یہی دُہراتے ملیں گے کہ "بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری —
یا "تم سے جہاں میں لاکھ سہی تم مگر کہاں" ——— کتاب کے خاص موضوع ——— حضرت کی انسانیت شخصیت
سے متعلق بھی ان مکتوبات میں عجیب عجیب نقوش نظر آئیں گے۔ پھر مصنف کی قلم کاری کے حُسن کا پوچھنا ہی کیا سونے پر سہاگا

غرض اس غیر مبصر ——— ساتھ ہی غیر پیشہ ور ——— تبصرہ نویس کا دل تو کتاب کے اس جز کا خصوصاً کچھ معتد بہ ذکر کئے بغیر کسی طرح تبصرہ ختم کرنے پر راضی نہیں۔ اور کتاب کے قریب قریب آخر تک ہو چکا پھر پیچھے شروع تک پلٹنا پڑ رہا ہے۔ معالج کی علاجی مہارت سے پہلے خود اس کی امراض باطنہ سے دوری وفور شخصیت و سیرت کی ایک جھلک دیکھتے چلیں — سب سے زیادہ مہلک اورام الامراض اور معلوم ہو چکا، کہ تکبر و ترفع ہے۔ خدا کو شاہد کر کے خود بھی یہ شہادت ادا کرتا ہوں کہ ۱۳، ۱۴ سال کی مدت تعلق میں اس پیدائشی عیب بیں بلکہ عیب جو نظر کو دو چیزوں کے معاملہ میں کبھی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ شک و شبہ کیا وسوسہ تک کی گنجائش نہیں ملی۔ ایک جاہ و مال کی کوئی خفیف سی خفیف حرص، دوسرے ترفع و تعلی کا کوئی نام و نشان۔

حضرت اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "نفع بیعت پر موقوف نہیں۔ نہ آزادی کے ساتھ (بلا بیعت) کسی کی بھی خدمت کا مجھے عذر ہے"۔ بلکہ بہتوں کے لئے یہی صورت زیادہ نافع و مناسب اور طرفین کے لئے زیادہ خوشگوار رہتی تھی۔ تھانہ اور دریا بادی سالک کی مکاتبت میں قدم قدم پر استفادہ دانانہ کی یہ خوشگواری و آزادی طرفین میں جیسی نظر آئے گی وہ آپ اپنی نظیر ہے۔ راقم تبصرہ تو ہمیشہ کتاب کے محترم مصنف کے خاص رنگ و مذاق کی بنا پر یہ بڑی خوش قسمتی یقین کرتا رہا کہ حکیم الامت علیہ الرحمۃ کی خدمت میں باضابطہ بیعت کے تعلق سے اللہ تعالیٰ نے اُن کو آزاد رکھا۔ مصنف کی عقیدت و محبت حضرت کے ساتھ عشق کے درجہ کو پہونچی ہوئی ہے۔ پھر بھی طبیعت میں آزادی و بے تکلفی ایسی ہے کہ کسی مسئلہ و معاملہ میں اگر اختلاف ہو تو جب تک سمجھ میں نہ آ جائے اپنے اختلاف پر اصرار ہی کرتے رہتے ہیں۔ طرز خطاب کی بے تکلفی بھی جس درجہ تک پہونچ جاتی ہے اس کا اندازہ غایت عقیدت ہی کے جوش میں ایک مثال سے فرماتے ہیں۔

تھانہ بھون کے دوران قیام اور مجلس کی حاضریوں میں بار بار تجربہ ہوتا ہے کہ " اے لقائے تو جواب ہر سوال" ابھی کوئی خیال و سوال دل کا دل ہی میں ہے کہ اُدھر سے "بے قیل و قال" باتوں باتوں میں جواب عطا ہو جاتا ہے۔ اس کی بنا پر مصنف کو حضرت کے صاحب کشف ہونے کا یقین و اعتقاد اتنا جازم ہو جاتا ہے کہ اس کے خلاف واقع ہونے پر خود حضرت حلف تک کے لئے آمادہ ہیں۔ مگر معتقد کے اعتقاد میں ذرا تزلزل نہیں اور حضرت کا حلفیہ "انکار و تبری حقیقت پر نہیں صرف تواضع پر محمول" کر کے لکھ دیتے ہیں کہ

> "میں نے جو رائے قائم کی ہے وہ کسی دعوے و بیان کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے تجربہ و وجدان کی بنا پر۔ اور اس میں ضعف و تزلزل جب ہی پیدا ہو سکتا ہے، جب اپنے تجربہ و وجدان کی غلطی ظاہر ہو جائے۔ کسی متقی نے آج تک کبھی اپنی زبان سے اپنے کو متقی کہا ہے۔ اور اپنے تقویٰ کے باب میں تو ضعیف ترین شہادت اسی متقی کی رہے گی"

آگے عرفی ادب والے ذرا سنبھل کر اس رائے پر اصرار کا طرز خطاب بھی سُن لیں۔ زیر خط راقم ہذا نے کر دیا ہے۔

> "اور پھر یہ مسئلہ تو میں نے جناب کی خدمت میں تصویب یا تغلیط کے لئے پیش بھی نہیں کیا تھا۔

بالفرض میں غلطی پر بھی ہوں تو جناب تصحیح کی زحمت اپنے سر کیوں لیں؟"

واقعی مزاج و مذاق کا طبعی اختلاف بھی عجیب اور امنٹ ہوتا ہے. بالکل ایسے ہی تجربات کی بنا پر حضرت کے صاحب کشف ہو
کا خود مجھکو بھی شروع میں رہ رہ کر خیال ہوتا رہتا تھا۔ لیکن جب خود حضرت ہی نے قطعی تردید فرمادی تو معاً یہ خیال نکل بھی گ
البتہ نفس تجربہ اور بار بار تجربہ کی توجیہ کے لئے خود ہی ایک مجلس میں سوال کر لیا کہ کیا پھر ایسے تجربات کو " فراستہ المومن
پر محمول کیا جا سکتا ہے؟ لیکن اس کا علم صاحب فراست کو ہونا ضروری نہیں۔

رہی مصنف کو تقویٰ پر قیاس کی جو غلط فہمی ہو گئی تھی اس کا محققانہ جواب بھی کیسا لاجواب ہے۔

"کہ تقویٰ تو ایک کمال ہے اور اس کا دعویٰ خود ایک نقص ہے۔ اس لئے وہ دعویٰ ممنوع نہیں ہو سکتا بخلاف
کشف کے کہ وہ کوئی کمال نہیں۔ اس کا دعویٰ ایسا ہے، جیسے کوئی یہ دعویٰ کرے کہ میرے سر پر بال نہیں تو اس کو
تواضع پر محمول نہ کریں گے؟" (صہ۱)

سن رہے ہیں نہ عوام ہی نہیں اچھے اچھے خواص بھی، جو ساری زندگی ولایت کشف و کرامت کو جانتے ہیں! طالب و سالک کو ایک
غلط فہمی سے نکالنے کے اہتمام کے ساتھ ساتھ حضرت کی وہ سچی اور حقیقی شانِ تواضع بھی اس واقعہ میں کیسی جھلک رہی ہے کہ تر
کی طلب تو کیا ہوتی بلا دنیٰ طلب و اشارہ کے غلطی سے دوسروں کی نظر میں کوئی رفعت کی بات سما بھی گئی ہو، تو اس پر سکوت
جائز نہیں رکھتے۔ اور بالآخر اپنے فرض اصلاح سے سبکدوش ہوتے ہوئے بھی تواضع کی حفاظت آخر تک کیسی حکیمانہ شان ۔
فرماتے ہیں کہ

"اب میں اپنے دعوائے نفی پر اس لئے نہیں زور دیتا کہ میں نفی کرکے اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکا ہوں۔ اب
دعوائے اثبات میں میرا کوئی ضرر نہیں ۔ اگر خلاف واقعہ اعتقاد رکھنے کا کوئی ضرر ہو تو اعتقاد رکھنے والے اس
کے ذمہ دار ہیں۔ میرا تو فائدہ ہی ہے کہ ایک صاحب دل کی محبت کے برکات حاصل ہو رہے ہیں۔ اگر کوئی تاجر
اپنی متاع کا عیب بتلا دے اور مشتری اس عیب کی نفی کرکے اس کو خریدے تو بائع معصیت سے بچ گیا
اور دام کھرے مل گئے" (صہ۱)

سبحان اللہ کیا رنگ ہے خداد تواضع کا کہ معاملہ پر مزید قیل و قال کو ختم فرماتے ہوئے زور ہے تو اپنے کو مٹانے اور گھٹانے
پر اور کیسے لطیف پیرایہ میں کہ اپنے متاع کا سدکا پوری طرح کاسد ہونا واضح کرنے پر بھی اگر خریدار پورے اور کھرے دام دینے
ہی پر تلا ہے، تو پھر اپنا کیا بگڑتا ہے۔ ہم تو بہرحال اپنے مال کو کاسد و ناقص ہی جان اور بتلا رہے ہیں۔

کتنا التزام تھا ترفع سے بچنے کا۔ ذرا بھی اپنی بڑائی کے وہم و وسوسہ کا کوئی موقعہ آیا کہ فوراً ہی کاٹ فرما دیتے۔ بعض نما
حمائل نام کی ایک حمائل میں ترجمہ دراصل کسی اور کا تھا۔ لیکن منسوب حضرت کی طرف کر دیا گیا تھا۔ مصنف سلمہ نے سوال کیا
کہ "کیا اس ترجمہ کی نسبت جناب والا کی طرف درست ہے"؟ جواب اتنا کافی تھا کہ "نہیں" مگر ایک پہلو یہ بھی تھا کہ شائع کرنے
والے نے حضرت کے ترجمہ کو لوگوں کی نظر میں مقبول و بہتر جان کر ہی یہ نسبت کی ہو گی کہ مانگ زیادہ ہو۔ جواب میں اس کو
توڑ یوں فرما دیا کہ "خواہ میرے ترجمہ سے اچھا ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ میرا ترجمہ نہیں" اسی جواب میں انسانیت کے کمال کا بھی
ایک پَرتو دیکھتے چلئے، جو کتاب کا خاص موضوع ہے۔ ناشر حمائل کے ایسے "صریح کذب و بہتان" کے باوجود اپنی طرف سے
حتی الامکان اس کی تذلیل و رسوائی کے روادار نہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اصلاح کی دعا بھی ہے۔ فرماتے ہیں کہ

"کہ میری رائے اب بھی یہی ہے (پہلے ہی مشورہ دیا جا چکا تھا) کہ اگر وہ خود (ناشر صاحب) اس واقعہ کو شائع کر دیں تو غالباً اس میں خفت ہو جائے، ورنہ کسی کی طرف ایسی نسبت کرنا بہتان صریح و کذب قبیح ہے۔ اللہ تعالےٰ اصلاح فرمائے۔" (صفحہ ۵۵)

مصنّف محترم تو ایسی باتوں کو بالعموم حضرت کی انسانیت و شرافت ہی کا کمال بار بار فرماتے ہیں۔ لیکن اصل میں یہ کمالِ انسانیت بہت کچھ نتیجہ ہے کمالِ اسلامیت کا۔ اپنے کو ترفع اور دوسرے کو تذلیل سے بچانے کا اس درجہ خیال و لحاظ غایت تقویٰ و تدین ہی سے رونما ہو سکتا ہے۔ مسلمان بنے بغیر انسان بننا دشوار ہی ہے۔ حضرت علیہ الرحمۃ کی ساری تعلیم و تربیت مجموعہ تھی درحقیقت اسلامیت و انسانیت کے کمالِ جامعیت کا۔

اب مصنف کا ایک عریضہ اور پڑھئے جو حضرتؒ کی خدمت میں یہی "مسلمان انسان" بننے یعنی اپنی اخلاقی اصلاح کی غالباً سب سے پہلی درخواست ہے۔ ماشاء اللہ نماز روزہ وغیرہ کے فرائض و واجبات اور بیع و شرا وغیرہ کے معاملات کی پابندی کی حد تک پورے مسلمان ہیں۔ حج بھی کر آتے ہیں۔ حدیث و قرآن پر بھی نظر ہے۔ اخلاق و تصوّف کی کتابیں بھی پڑھی ہیں۔ مگر اخلاقی ذمائم کا تزکیہ کسی زندہ مزکی و مربی کی طرف رجوع کئے بغیر خالی کتابی دفتروں سے نہیں ہو رہا ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"حج سے آئے ہوئے ابھی دو ہی ڈھائی مہینے ہوئے تھے کہ مکان میں اپنے کمرہ سے کچھ چوریاں شروع ہوئیں ۔۔۔
۔۔۔ گھر کے پروردہ دو چھوٹے لڑکے تھے، شبہ ہر پھر کر انھیں پر ہوتا رہا ۔۔۔ ۔۔۔ آخر ایک روز صبح سویرے پھر کی رقم اٹھ گئی۔ غصّہ بہت ہی زور آیا اور کچھ موقع و مہلت دینے کے بعد اُن لڑکوں کو مارنا شروع کر دیا۔
۔۔۔ عین اسی حالت میں اصل مجرم مع رقم گرفتار ہو گیا۔ ۔۔۔ اب سخت ندامت شروع ہوئی کہ گھر کے ان دو بیچارے لڑکوں پر ناحق اتنی مار پڑی۔ مار تو واپس آسکتی نہیں۔ بجز توبہ و استغفار کے کیا ہو سکتا ہے ۔۔۔
سارا کچا چٹھا اسی دن اسی وقت مولانا کی خدمت میں لکھ بھیجا کہ اب تلافی و کفارہ کی صورت کیا ہے"؟

جواب آیا اور بالکل حکیم الامت کے شایانِ شان :-

"اگر وہ بالغ ہیں تو اُن سے معاف کرانا ضرور ہے، اور اگر نابالغ ہیں تو کم از کم ان سے اعترافِ غلطی اور اظہارِ ندامت اور معتد بہ مدت تک اُن کی دلجوئی اور اُن کی فرمائشیں پوچھ پوچھ کر پوری کرنا مناسب ہے اور اُن کا قصوروار ہونا اگر اخیر میں ثابت بھی ہو جاتا تب بھی سیاست کے وقت تو یہ فعل بلا دلیل شرعی ہی کے ہوتا۔"

"جواب کا یہ آخری جز خاص مولانا ہی حصّہ تھا۔ توبہ و استغفار کی حد تک تو اور بزرگ بھی جاتے ہیں۔ لیکن تدارک کی عملی تدبیریں اور پھر اُن میں یہ باریک بینی و دقت نگاہی مولانا ہی پر ختم ہو گئی۔ ؏ بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری۔" (صفحہ ۵۸)

بات وہی ہے کہ اور بزرگوں نے بالعموم اسلام کو بس حقوق اللہ تک محدود سمجھ رکھا ہے۔ باقی حقوق عباد خصوصاً حقوق معاشرت ان پر تو نظر ہی شاذ و نادر کسی کی جاتی ہے۔ گھر کے پروردہ کسی نوکر چاکر لڑکے کو خطا بے خطا کچھ مار پیٹ دینا اس کو کتنے پیر ہوں گے جو کوئی خطا ہی خیال کرتے ہیں۔ ان باتوں کی تھانہ بھون ہی میں اتنی تعلیم و نگرانی تھی کہ مریدوں اور طالبوں کو لازماً ایسی کوتاہیوں کا کچھ نہ کچھ احساس اور تدارک کا خیال ہو جاتا تھا۔ اور مصنّف محترم کا حضرت حکیم الامت کی جس انسانیت کی تعریف و تعارف پر اتنا زور ہے کہ "مولانا عالم بے بدل اور درویش کامل تو تھے ہی۔ لیکن سب سے پہلے

انسان تھے اور جس نے اُن کے اس جوہر کو نہ پہچانا اُس نے اُن کو ذرا بھی نہ پہچانا"۔ یہ انسانیت بہت بڑی حد تک نتیجہ تھی حضرت کی اس اسلامیت ہی کا (جیسا کہ جواب بالا کے اس جزسے ظاہر ہے کہ "یہ فعل بلا دلیل شرعی ہوتا") کہ حضرت حقوق معاشرت کو بھی اسلامی تعلیمات کا اسی طرح اہم جز خیال فرماتے تھے جس طرح عبادات کو۔ اور کیسے نہ فرماتے جب حدیث ہی میں خود ایمان کے ستر سے اوپر جو شعبے قرار دیئے گئے ہیں، ان میں بھی کم سے کم یہی ہے کہ آدمی راستے سے کسی ایسی چیز ہی کو ہٹا دے، جس سے آنے جانے والوں کی ذرا بھی تکلیف کا احتمال ہو۔

حکیم الامتؒ کی ساری انسانیت یہی تو تھی کہ دوسروں کی ادنیٰ سے ادنیٰ جسمانی ہی نہیں ذہنی اذیت و تشویش تک سے بچنے بچانے کا انتہائی اہتمام فرماتے۔ لیکن حُسن اخلاق اور حُسن معاشرت کا یہ رنگ خالی کتاب خوانی سے پیدا نہیں ہوتا۔ خواہ خدا کی کتاب کیوں نہ ہو۔ ایسا ہی ہوتا تو خود صاحب کتابؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو معلّم کتاب و حکمت ہونے کے ساتھ ساتھ ہی مزکی کیوں بنایا جاتا۔ یعلّمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم۔ اور وہ خود اپنی بعثت کا مقصد بالتخصیص "مکارم اخلاق" کی تکمیل کیوں ٹھہراتے کہ "میں بھیجا ہی اس لئے گیا ہوں کہ اخلاقی شرافتوں کو انتہا تک پہونچا دوں"۔ امتِ اسلام کے اس حکیم کا سب سے بڑا کارنامہ "مکارم اخلاق کو اپنی انتہا تک پہونچانے والے" بنی الاسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا اپنے وقت میں اخلاق کا سب سے بڑا حکیم مربی و مصلح اُمتی تھا۔ زندگی بھر اُمت کی یہی سب سے بڑی خدمت انجام دی۔ اور موت کی تیاری میں بھی سب سے بڑا سبق اُمت کو بھی دے گیا۔

روزہ نماز وغیرہ کے حقوق اللہ کے معاملہ میں تو کون ایسا ہے جو بڑا بزرگ و پیر ہو گا جو اللہ کے سامنے اپنی کوتاہیوں کا اقرار اور پھر استغفار نہ کرتا ہو لیکن ایسے چھوٹے پیر بھی آپ نے کتنے دیکھے ہوں گے، جو اللہ کے بندوں —— اپنے چھوٹے سے چھوٹے مریدوں اور خادموں —— کے سامنے اپنے کو اتنا چھوٹا جانتا ہو کہ خود ان کے حقوق میں حُسن معاشرت یا "مکارم اخلاق" کی جو کوتاہیاں ہوئی ہوں، اُن کی "دست بستہ نہایت لجاجت سے" معافی مانگ رہا ہو! اس منظر کو ملاحظہ فرمانے کے لئے اصل معافی نامہ پڑھیں:۔

> "یہ احقر اقرا ذل وارذل کام کا الکف، نام کا اشرف تمام ان حضرات کی خدمت میں جن کا کوئی حق میرے ذمہ ہو خواہ وہ مالی ہو (جس کا احتمال ضعیف و قلیل ہے) ۔۔۔ اور خواہ غیر مالی ہو، جیسے کسی کو ناحق کچھ کہہ لیا ہو یا انتقام میں حد سے تجاوز ہو گیا ہو یا کسی کو ناحق بدنی ایذا پہونچائی ہو (اور ایسے غیر مالی حقوق کا احتمال قوی و کثیر ہے) ان سب اہل حقوق کی خدمت میں دست بستہ نہایت لجاجت و سماجت سے درخواست کرتا ہے کہ ان حقوق کا خواہ مجھ سے عوض لے لیں اور خواہ حسبۃً للہ معاف فرمادیں۔ میں ان دونوں حالتوں میں ان کا شکر گزار ہوں گا۔ کہ مجھکو محاسبۂ آخرت سے بری فرمایا۔ اور معافی کی صورت میں دعا گو رہوں گا کہ میرے ساتھ مزید احسان فرمایا۔" (صـ۱۱۲)

اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا "اُسوۂ حسنہ" ہر دینی ضرورت اور اخلاقی و روحانی ترقی کے لئے کافی و وافی ہے، یہی سرمایۂ سعادت اور ذریعۂ نجات ہے! اہل تقویٰ اور راسخون فی العلم کی صحبت اور تربیت یقیناً فائدہ سے خالی نہیں مگر اس کے لئے "پیری مریدی" کو لازم سمجھ لینا بھی ایک گونہ کی زیادتی ہے، جو طریقہ پیری مریدی کا رائج ہے، اس سلسلہ میں ہمیں بتایا جائے کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام شافعیؒ (رحمہم اللہ تعالیٰ) کس خانوادۂ طریقت میں بیعت تھے اور اُن کے "مرشدوں" کے کیا نام تھے؟ (مدیر)

دیکھا آپ نے کہ معاشرت یا انسانیت کے ان حقوق میں اپنی تقصیرات کے احساس اور عفو خواہی کی تہ میں اصل جذبہ وہی محاسبۂ آخرت بالکمال اسلامیت ہی کام کر رہا ہے۔ اب آگے ذرا مصنف کا تاثر بھی قابل ملاحظہ ہے کہ

"بزرگی کے دعوے نہیں، درویشی کی تعلیاں نہیں، مشیخیت کی شیخیاں نہیں، جذب کی شوخیاں نہیں، بلکہ الٹا تقصیروں کا اعلان لغزشوں کا اشتہار ہو رہا ہے۔ ہائے ہائے کوئی اس عبدیت کی دل آویزی کہاں سے لا سکتا ہے۔"

یہ عبدیت تو عین اسلامیت ہے، جس نے اپنے ادنیٰ ادنیٰ غلاموں اور کفش برداروں کے سامنے دست بستہ معذرت کی شان اختیار کی۔ یہ شان حضرت پر اس درجہ چھائی ہوئی تھی کہ گوناگوں علمی و عملی کمالات رکھ کر بھی بڑائی کے ہر موقع پر اپنے کو مٹانے ہی کا اہتمام اور کتنا اہتمام کہ ایک لفظ بھی کسی زبان سے بڑھانے والا سن پایا کہ فوراً ہی اس کا توڑ فرما دیتے۔ آغاز تعلق کے زمانہ میں مصنف نے اپنی بعض تصانیف اس خیال سے خدمت میں بھیجیں کہ "مصنف کی اصلاح سے قبل تصانیف ہی کی اصلاح ہو جائے" ان میں سے کسی کتاب میں "خانقاہ امدادیہ" —— یاد رہے کہ حضرت اپنی خانقاہ کی نسبت تک اپنی طرف پسند نہیں فرماتے تھے۔ کا ذکر (لفظ) اکابر کے ساتھ تھا، اس پر ارشاد ہوا کہ "اگر حضرت شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی جو پہلے اسی خانقاہ میں قیام فرما تھے) رحمۃ اللہ علیہ تشریف رکھتے ہوتے تو یہ ذکر برجا تھا۔ اب تو دو شالہ میں ٹاٹ کا بخیہ ہے۔" (صـ۲۳)

ورق الٹتے الٹتے صفحہ ۱۶۸ پر ایک اور مثال اس سے بھی بڑھکر سامنے آگئی۔ حضرت مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ تو حضرت کے شیخ اور ہر طرح بڑے تھے۔ حضرت مولانا مدنی مدظلہم العالی تو اس اعتبار سے چھوٹے ہی تھے کہ حضرت کے پیر بھائی حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مجاز گویا حضرت کے پیر بھتیجے تھے۔ مصنف نے پہلے محل کی موجودگی میں ایک بیوہ سے عقد کر لیا تھا، جس میں کچھ دن بعد ہی خلاف توقع بڑی بڑی پیچیدگیوں اور تلخیوں کی صورتیں ظاہر ہونے لگیں۔ ان کے حل و تدارک کے لئے حضرت کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ جس میں جناب مولانا مدنی مدظلہ کے کسی والا نامہ کا کچھ ذکر تھا۔ اس کی نسبت فرماتے ہیں کہ "مولانا کا خط کافی اور جامع ہے" اس کے مقابل میں آگے خود اپنے بارے میں ارشاد ہے کہ

"لیکن اس بنا پر کہ شاید مجھ کو اس معاملہ میں زیادہ تجربہ ہے (کہ حضرت خود بھی حس ثانی رکھتے تھے) ..... تو اس کا درجہ مولانا (مدنی) کی تحریر کے سامنے ایسا ہوگا جیسے دواؤں کی خاصیت تو طبیب زیادہ جانتا ہے، جس سے پنساری کو کوئی نسبت نہیں۔ لیکن خود دواؤں کو پنساری زیادہ پہچانتا ہے، جو کہ پنساری کے لئے نہ کمال ہے، نہ طبیب کے لئے نقص۔ اس کے متعلق جو میں عرض کروں گا اس کا درجہ یہی ہوگا۔"

ہم اہل تو حضرت حکیم الامت کے سارے کمالات انسانیت کا بڑا چشمہ یہی ہے کہ خود اپنی بے کمالی کے احساس و اظہار کا کوئی بڑا چھوٹا موقع ہاتھ سے جانے نہیں پاتا۔ مولانا محمد علی مرحوم حضرت کے معتقد نہیں مخالف ہی تھے۔ اور ہمارے مصنف مرحوم کے بھی عاشقوں میں۔ انکی وفات پر ایک اطلاع و تعزیت کا کارڈ حضرت کی خدمت میں بھی لکھا تھا۔ جواب فوراً موصول ہوا کہ ان کی

"وفات سے میرے قلب پر جو اثر ہے بیان نہیں کر سکتا۔ خدا جانے کتنی دفعہ دعا کر چکا ہوں اور کر رہا ہوں۔ مجھ کو مرحوم کی جس صفت کا اعتقاد اور اس اعتقاد کی بنا پر محبت ہی صرف ایک صفت مسلمان کی سچی بے غرض محبت ہی۔ باقی دوسری صفات دیکھنے والے جانتے ہیں۔ میں نے کبھی دیکھا نہیں۔ اس لئے ایک ہی صفت سے محبت ہے اور اس کو میں مدح الصفات سمجھتا ہوں۔" (صـ۱۲۶)

اس پر مصنف نے اپنا تاثر حرف بحرف یہ لکھا ہے کہ "حضرت کی عالی ظرفی و شرافت نفس کا اعتقاد تو پہلے ہی سے تھا۔ اب اس حقیقی تعزیت نامہ نے علم الیقین کو عین الیقین میں تبدیل کر دیا" معاشرت میں عدل و اعتدال پر عمل و تعلیم دونوں کا کتاب بھر میں جو سب سے بڑھ کر نمونہ راقم تبصرہ کو نظر آیا وہ بقدر ضرورت ذرا تفصیلی اقتباس کے ساتھ ذیل میں ناظرین بھی ضرور ملاحظہ فرمالیں۔ حضرت کے ایک مرید مصنف کو وقتاً فوقتاً بہت سخت خط لکھتے رہتے تھے۔ آخر تنگ آکر خود حضرت کی خدمت میں انکی رپورٹ کر دی کہ

"اسوقت ذرا ایک تکلیف دہ موضوع کی طرف توجہ سامی مبذول کراتا ہے۔ اور اس کے لئے قبل ہی سے دست بستہ معافی مانگے لیتا ہوں۔ (۱) جناب کے مریدوں میں مرزا...... صاحب میرے لئے عذاب جان ثابت ہو رہے ہیں۔ (۲) مجھ سے کبھی کی شناسائی نہ تھی۔ (۳)..... ہر دوسرے تیسرے مہینے میرے نام ایک دل آزار مکتوب روانہ کرتے رہتے ہیں۔ میرے قدیم و عزیز دوست ظفر الملک سیاسی تحریک کے سلسلہ میں جیل خانہ گئے مرزا صاحب کا طنزیہ خط موجود۔ مولانا محمد علی کا انتقال ہوا دشمنوں تک نے ماتم کیا خود جناب والا کا تعزیت نامہ میرے نام آیا۔ یہ مرزا صاحب ایسے جنوں نے اس موقع پر بھی سنگ باشی کی۔ لکھا کہ محمد علی کی وفات پر جو کچھ ہو رہا ہے سب تیوی تزک و احتشام ہے عاقبت بخیر گزرے جب خوش ہونا چاہئے۔ (۴) اب تازہ خط میں سیخ پر جس تلخ انداز میں نکتہ چینی کی ہے بجنسہ خدمت والا میں روانہ کرتا ہوں۔ مضمون لغو بیہودہ سہی، لیکن آخر ان حضرت کو اتنے کرخت لہجے میں مجھے مخاطب کرنے کی کیا ضرورت لاحق ہوا کرتی ہے۔ (۵) میں نے تو کسی رشتہ سے نہ ان کو اپنا بزرگ تسلیم کیا تھا نہ مصلح و ناصح۔ میرا نفس بھی کچھ مردہ تو ہے نہیں۔ بری بھلی اچھی خاصی سخت تحریر دل پر قادر ہوں لیکن بحمد اللہ اپنی طرف سے ابتدا نہیں کرتا۔ اور حتی الامکان پہلے اتمام حجت کر لیتا ہوں۔ (۶) جناب والا کی صحبت میں تو پہلا ہی سبق دوسروں کی رعایت جذبات کا حاصل ہوتا ہے۔ (۷) مگر یہ حضرت خدا معلوم کس قسم کے مرید ہیں کہ روش شیخ کے بالکل برعکس اختیار کئے ہوئے ہیں۔ (۸) سیخ ناپسند ہے تو فوراً بند کر سکتے ہیں دوسروں سے بند کرانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ (۹) لیکن آخر اس دل آزار روش سے کیا نفع سوچے ہوئے ہیں۔ بجز اس کے کہ میرے نفس میں انتقام کے لئے حرکت پیدا ہو(۱۰)" (ص۱۷۳)

راقم الحروف کو حضرتؒ کی تعلیم و تربیت اور مزاج و مذاق کی معرفت کا کم نہ کچھ زعم تھا ہی۔ مصنف کی اس رپورٹ کو پڑھتے ہی خیال ہوا کہ بس ان مرید صاحب کی خیر نہیں۔ مگر آگے حضرت کا جواب پڑھتے ہی آنکھیں کھل گئیں کہ یہ زعم باطل بھی کتنا باطل تھا کہ حکیم الامت کی حکیمانہ تعلیمات کو اپنی احمقانہ فہم پر قیاس کر بیٹھا! جواب لاجواب حضرت کی اسلامیت و انسانیت اور اصلاحی تعلیم و تربیت کے ایسے انمول موتیوں سے بھرا ہے کہ ایک حرف بھی چھوڑنا ناظرین پر ظلم ہوگا۔ ایسی صورتیں دین دار و دنیا دار ہر طرح کے چھوٹے بڑے مخالفوں اور دشمنوں بلکہ نادان دوستوں تک سے دنیا میں کس چھوٹے بڑے کو پیش نہیں آتیں۔

خود حضرت نے اتنا اہتمام فرمایا کہ مختلف اجزا کے الگ الگ جوابات کے علاوہ ایک مستقل ہدایت نامہ بھی ایسے مواقع کے لئے تحریر فرما دیا ہے۔ پہلے ہر نمبر سے ملا ملا کر الگ الگ جزا کا نمبر وار جواب پڑھیں۔

(۱) جس تکلیف دہی کا اثر تخفیف دہی ہو وہ تکلیف دہی ہی نہیں میں تو آپکے تعلق کو ایسا قوی سمجھتا ہوں کہ شاید معافی مانگنے سے موافی

مانگنے کی ضرورت ہو۔

(۲) مگر ثواب ایمان بھی ساتھ ساتھ ہوں گے۔ کیونکہ سبب ہیں اجر صبر کے۔ جیسا جداگانہ پرچہ میں لکھا ہے۔

(۳) اچھا ہوا ورنہ زیادہ تکلیف ہوتی، جیسا لنگار مدت سے مجھ پر سخت حملے کرتا ہے، مگر اس ناشناسائی کی برکت ہے کہ مجکو پروا بھی نہیں ہوتی۔ اس کے خاص خصلی خطابات کرنے پر میں نے منھ نہیں لگایا اور راحت میں ہوں۔ رنج کی حقیقت ہے خلاف توقع۔ تو قع ہی چھوڑ دی۔

(۴) رنج کی باتیں ہیں۔ مگر رنج کے مصالح سے س رنج کا علاج کرنا جس کے تین طریقے جداگانہ پرچے میں لکھے ہیں یہ ہے اپنا فعل اختیاری اس میں مشغول ہونا چاہیئے دوسرے کے فعل کو جو اپنے اختیار میں نہ ہو کیونکر بند کیا جائے۔

(۵) بیشک سچ ہے مگر یہ تو خود اُن کو سمجھنا چاہیئے۔ اب ایک شخص نہیں سمجھتا تو آگے تین ہی راستے ہیں، ایک صبر، دوسرا انتقام، تیسرا انتظام سب کی تفصیل جداگانہ پرچہ میں لکھی ہے۔

(۶) یہ تو عین طریق ہے اہل طریق کا۔

(۷) یہ آپکی محبت و حسن ظن ہے، میں کیا چیز ہوں۔ لیکن آپ کو خود احساس ہو گیا تو مجکو زائد احساس کر دینا بھی جائز ہو گا، اور زائد یہ کہ میں اپنے مخالفوں اور موذیوں کے جذبات کی بھی رعایت کرتا ہوں کہ ان پر غیب یتی کا بھی احتمال رکھتا ہوں اور صبر تو ہر حال میں کرتا ہوں۔ (مولوی) احمد رضا خاں صاحب کے جواب میں بھی ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ کافر، خبیث، ملعون سب کچھ سنتا رہا۔

(۸) اس رعایت جذبات کے تحت میں یہ احتمال ہے کہ وہ اصل دین اسی طریق کو سمجھتے اور میرے طرز کو محارب دیل سمجھتے ہوں۔

(۹) میں تو خود فروخت کو بند کر دیتا۔

(۱۰) حد شرعی کے اندر اجازت ہے۔

آگے اب وہ مستقل ہدایت نامہ یا دستور العمل ملاحظہ ہو، تمہیدی چند سطریں چھوڑ دی گئی ہیں۔

"مجکو اس سے سخت سخت واقع پیش آتے ہیں دو حیثیت سے۔ ایک الفاظ اس سے سخت ہوتے ہیں۔ ابھی ابھی ایک عنایت فرما کا خط آیا تھا اس میں مجکو گدھا تک لکھا تھا۔ دوسرے ایسے اشخاص کی طرف سے جو اول مدعی اعتقاد تھے۔ مگر ان مراقبات کو اپنا امام بناتا ہوں۔

(۱) اپنی زبان یا قلم یا قلب کو ملوث کیا میرا کیا بگڑا۔ رہا رنج، وہ کوئی بگاڑ نہیں محض خیال کے تابع ہے۔

(۲) ممکن ہے اس شخص کی نیت اچھی ہو۔ مثلاً امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اس لئے وہ معذور ہو گو ہم بھی اسلئے معذور ہوں کہ ہم اپنے کو حق پر سمجھتے ہوں یا اپنی غلطی بھی نظر میں ہو مگر اصلاح کا طریق ہماری رائے میں اس سے اسہل اور اسلم ہو۔

(۳) اگر اس نے ناحق بھی ہمکو رنج دیا تو اپنی عاقبت خراب کی، ہم کو اجر کا ثواب ملا۔

(۴) نیز ایسے واقعات سے بعض اوقات اپنی کوتاہیوں پر نظر ہو کر اصلاح کی توفیق ہو جاتی ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو کم از کم معتقدین کی عنایت سے جو عجب و کبر پیدا ہو سکتا تھا اس سے ازالہ یا انسداد ہو جاتا ہے۔

(۵) نیز خود بھی ایسے مخاطبات اپنے سے سرزد ہو جاتے ہیں، اپنی ناگواری سے ان کی ناگواری سامنے آجاتی ہے اور ایسے خطاب سے اجتناب کی توفیق ہو جاتی ہے۔ اور بہت اسرار و فوائد ہیں غور کرنے کے لئے یہ کافی ہیں۔ یہ تو حقیقی تدبیر ہے زوالِ حزن کی اور ایک طبعی تدبیر ہے کہ انتقام لے لیا جائے یا جو شخص روک سکے اس سے روک دیا جائے۔ سو اگر مجھکو اطلاع دینے سے یہ مقصد ہے تو صریح اجازت کا انتظار ہے اور ایک تحریر آپ کی اپنی تحریر کے ساتھ بھیجنے کی ضرورت ہوگی تاکہ اس کی بنا پر خطاب کر سکوں۔

یہ کل تین تدبیریں ہیں اور اگر کوئی چوتھی بات میرے کرنے کی ذہن میں ہو ظاہر فرمائیے میں حدِ قدرت و حدودِ شرعی کے اندر اس کے لئے حاضر ہوں۔" (ص ۱۹۹)

متن قریب قریب پورا ہی نقل کر دیا پھر بھی تسلی نہیں کچھ شرح کے لئے قلم بیتاب ہے۔ بزبردستی روک رہا ہوں تاہم ناظرین سے درخواست ہے کہ اس متن متین کو سرسری طور پر پڑھ کر گزر جائیں۔ ہر مسلمان کی اسلامیت ہی کے نہیں ہر انسان کی انسانیت کے لئے پورا جواب ایسا دستور العمل ہے کہ زیر کرانے آویزاں کر لیا جائے جب مخالف و معاند دشمن ہی نہیں نادان یا غلط فہم دوست سے بھی ایسا معاملہ پیش آئے —— اور آتا ہی رہتا ہے —— تو کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اس سبق کو تازہ کرے۔ کچھ بھی اس پر عمل ہو سکا تو انشاء اللہ دین و دنیا دونوں کا بھلا ہی بھلا ہوگا۔ بار بار دل سے دعا نکلتی ہے کہ اُمت کے اس حکیم کو اُمت ہی کی طرف سے نہیں ساری انسانیت کی طرف سے اس کی ان بے بہا حکمت آموزیوں کا بے حساب اجر عطا ہو۔

حکیم الامت نام کی اس کتاب میں اور کچھ نہ ہوتا تو بھی اپنے مخالفوں اور موذیوں سے اسلامیت و انسانیت کی راہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تنہا یہ دستور العمل ہی حکیم الامت ہی نہیں حکیم الانسانیت ہونے کی سند و شہادت کے لئے کافی سے زائد ہوتا۔ صدقِ صدق و عمل کیا نظر بھی انسانیت و اسلامیت کی ایسی نزاکتوں تک کس کی جاتی ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ تعلیم و تربیت کے ان نمونوں اور ہدایتوں کو آدمی اگر وقتاً فوقتاً پڑھتا، سوچتا اور دل میں بٹھاتا رہے اور موقع پر دوستوں، دشمنوں، اپنوں، پرایوں سے دس بیس فیصدی بھی عمل ہو جائے تو دین و دنیا دونوں کے حق میں ان کی انمول قدر و قیمت کا خود ہی تجربہ و اندازہ ہو جائے گا۔

یوں تو کتاب پڑھتے وقت آپ پر اثر یہی ہوگا کہ مصنف کی عقیدت و محبت اپنے ہیرو کے ساتھ بالکل عاشقانہ ہے۔ اور کون ہے جو کمال شناسی کی نظر رکھ کر ایسے کامل کا عاشق نہ ہو جائے۔ تاہم یاد رہے کہ مصنف کا یہ عشق عقل پر غالب نہیں متعدد مثالیں کتاب میں آپ کو ملیں گی کہ انہوں نے خود اپنی عقل و رائے کو پوری تشفی کے بغیر کہیں مغلوب نہیں ہونے دیا ہے۔ تفسیری استفادات ہی میں نہیں، فقہی مسائل تک میں —— حالانکہ تفسیر کی طرح فقہ ان کا کوئی خاص و خصوصی مضمون نہیں —— جہاں کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی ہے اپنی ہی رائے پر مصر و قائم رہے ہیں۔

بس اصلاح تعلیم و تربیت ہی کا ایک ایسا مستثنیٰ مضمون ملے گا جس میں ان کو حکیم الامت کی حکیمانہ و نفس شناسانہ تعلیمات و ہدایات میں کہیں چون و چرا کی گنجائش راقم الحروف کو نظر نہیں آئی۔ اس موقع پر پھر یاد کر لیں کہ مصنف محترم نفس بشری کی معرفت میں کوئی عامی نہیں۔ علم النفس ان کی دلچسپی کا خاص موضوع رہا ہے۔ اردو انگریزی میں نفسیاتی مباحث پر کئی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ پھر بھی حضرت کی اصلاح تعلیم و تربیت کے باب میں شاید ہی کبھی کوئی شبہ واقع ہوا ہو، بلکہ حضرت علیہ الرحمۃ کی وفات پر اسی اصلاح و ارشاد کے کمال کا اپنا تجربہ "لے تو افلاطون و جالینوس ما" کے عنوان

سے یہ تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"اپنی ۶۰ سالہ زندگی میں اللہ والے متعدد دیکھ ڈالے .... بڑے بڑے عابد و زاہد متقی و پرہیزگار نظر سے گزرے .... لیکن اصلاح و ارشاد کی مسند نشینی کا حقدار ۱۵-۱۶ سال کے تجربہ میں جیسا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو پایا کسی کو نہ پایا" (ص ۶۱۲)

اور اس طویل تجربہ میں ایک طالب صادق کی طرح —— اپنی شہرت و نیکنامی تک سے بے پروا ہو کر —— خود اپنے امراض نفس کا کچا چٹھا جس طرح پیش فرما دیتے تھے کتاب میں اُن کو دُہراتے وقت خود حیرت کرتے ہیں کہ "بعض بعض خط بالکل اپنا کچا چٹھا ہوتا تھا۔ آج اُنھیں نقل کرتے وقت حیرت ہوتی ہے کہ اس وقت حضرت کی خدمت میں یہ سب کہہ ڈالنے کی جرأت اللہ تعالیٰ نے کہاں سے دیدی تھی"

اپنے صدقِ طلب پر نظر نہیں گئی ورنہ حیرت کی کیا بات تھی اور یہ صدق طلب بھی حضرت کی صحبت و تربیت کا خاص فیض تھا کہ اپنے اخلاقی و نفسانی امراض پر نظر اور اُن کے ازالہ و اصلاح کی فکر کچھ نہ کچھ بڑھ ہی جاتی تھی۔ خود فاضل مصنف کی طرح دوسرے علم و قلم نام و شہرت اور حکومت و قیادت والے حضرات کے لئے خصوصاً یہ زیادہ فکر کی بات ہے کہ اُن کی نظر اور بھی اپنی باطنی بیماریوں پر کم جاتی ہے اور نہ جانے کی بڑی وجہ وہی سب سے بڑا باطنی مرض کبر ہے جس کا آگے ذکر آتا ہے۔ اچھے اچھے اہل علم و اہل دین تک کو اس مہلک مرض میں گرفتار دیکھا جاتا ہے۔ اور دوسروں —— قوم و ملک بلکہ ساری دنیا —— کی فکر میں "قوا انفسکم و اھلیکم نارا" (خود اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ) سے بے فکری و غفلت کا مرض تو اس زمانہ میں خصوصاً وبا ہی کی طرح عام ہے۔ حضرت حکیم الامت کی تعلیم و تربیت کی ایک بڑی خصوصیت خود اپنی اور اپنے گھر والوں یا زیر نگرانوں کی اصلاح کی طرف توجہ کی تقدیم تھی۔

کتاب میں آپ کو پوری طرح نظر آئے گا کہ مصنف نے اپنے ساتھ ماشاء اللہ اپنے گھر بھر کو حضرت کی عقیدت و محبت میں شریک کر رکھا تھا۔ بہرحال خود اپنی اصلاح کی فکر و طلب کا کم از کم ایک طریقہ تو ہے جواب پڑھ ہی لیں :-

"کبر کی مذمت اور اس کا علاج تو جناب کی تصانیف و مواعظ میں جابجا کثرت سے ملا لیکن کبر کی حقیقت کبھی نظر سے گزرنا یاد نہیں پڑتی۔

"ایک عجیب مرض میں مبتلا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ میری ہی طرح بیشمار اور بندگان خدا بھی اس مرض میں مبتلا ہیں۔ وہ یہ کہ غلطی کو غلطی سمجھ لینے کے باوجود طبیعت اس کے پورے تدارک پر آمادہ نہیں ہوتی۔ حقوق العباد میں تو اس کا تجربہ ہر روز ہوتا رہتا ہے۔ ملازم پر بیجا سختی بارہا کر گزرا ہوں۔ کچھ دیر بعد نادم ہوا سمجھا کہ بُرا کیا، اپنے اوپر نفریں کی۔ آئندہ کے لئے احتیاط کا بھی دل میں عہد کیا۔ کبھی ایسا ہوا کہ اُسے خوش کرنے کے لئے کچھ دے دیا۔ اللہ کے سامنے توبہ و استغفار بھی کر لیا، لیکن یہ کبھی نہ ہوا کہ خود اُس ملازم سے اپنے قصور کی معافی مانگ لیتا۔ اور ایک ملازم ہی غریب پر کیا موقوف، عزیزوں دوستوں سے بھی معافی مانگتے طبیعت رُک جاتی ہے۔ حد یہ کہ خود والدہ مدظلہا سے صراحت کے ساتھ معافی مانگنے کی توفیق نہ ہوئی۔ حالانکہ خدا جانے کتنے قصور اُن کے کر چکا ہوں اور آج تک کر رہا ہوں"

عقلاً بھی کوئی امر اس میں مانع نہیں پاتا۔ بس ایک نفس ہی اس پر آمادہ نہیں ہوتا۔ دوسروں کو اس کے

منافع و فضائل بتا دوں۔ دوسروں کو ترغیب دیکر اس پر آمادہ کردوں بس اپنے ہی عمل کی توفیق نہیں ہوتی۔ یہ آخر کیا؟ نفس کا کبر ہے یا کچھ اور۔ والدہ مدظلہا کے مقابل میں تو ظاہر ہے کہ ادنیٰ تخیل بھی اپنی بڑائی کا نہیں کھتا۔ ان کی فرمانبرداری اپنے لئے انتہائی سعادت سمجھتا ہوں۔ اس پر بھی کیا شامت ہے کہ عملاً اُن کے سامنے جھکا نہیں جاتا۔ اپنی لڑکیوں پر تاکید رکھتا ہوں کہ برابر اُن کی خدمت کرتی رہیں۔ لیکن جب خود اُن کے پاس جاکر بیٹھتا ہوں تو یہ نہیں ہوتا کہ اُن کے پیر دابنے لگوں یا پنکھا جھلنے لگوں۔ اُلٹے وہ خود ہی میرے پنکھا جھلنا شروع کردیتی ہیں۔ دل میں خفیف ہوکر انھیں روکتا ہوں، جب بھی وہ نہیں مانتیں۔ اکثر یہی اُلجھن رہتی ہے کہ آخر میرا انجام کیا ہونا ہے۔ اللہ کے ہاں محض جاننا اور دوسروں کو بتا دینا کیا کام آئے گا۔ خود ان سطور کی تحریر کے وقت استحضارِ آخرت سے آنسو بہ رہے ہیں۔ لیکن عمل کا معاملہ جوں کا توں۔"

بخدا اس راقم بدحال کے حال کی تو مصنفِ مخدوم نے حرف بحرف ترجمانی فرما دی۔ اور شاذ ہی کوئی واقعی بندۂ خدا ہوگا جو اس لفظ بلفظ یہ حال نہ پائے۔ بقول مصنف "بیشمار بندگان خدا اس میں مبتلا ہیں" اللہ تعالیٰ ان سب کی ترجمانی کا بیشمار اجر و جزا عطا فرمائے! کیا کہوں کہ بہتوں پر ایسا کہنا بہت گراں گزرتا ہے! تاہم جواب پڑھ کر انصاف سے خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ اُمت ہی کے نہیں انسانیت کے کسی حکیم وقت کا جواب بھی کیا اس سے بہتر ہوسکتا پہلے کبر کی نفس حقیقت سُن لیں۔

"حقیقت اس کی ظاہر ہے، اپنے کو دوسرے سے بڑا سمجھنا۔ آگے اس کے دو درجے ہیں۔ ایک بلا اختیار بڑائی کا خیال آنا اور ایک باختیار ایسا خیال کرنا۔ پھر اوّل میں دو درجے ہیں۔ اس خیال کے مقتضا پر عمل نہ کرنا پس یہ تو بالکل مذموم نہیں۔ دوسرا عمل کرنا یہ مذموم و معصیت ہے۔ اسی طرح قصداً بڑا سمجھنا بھی علی الاطلاق مذموم ہے گو اس کے مقتضا پر عمل نہ بھی ہو۔"

اب آگے انسانیت اور اسلامیت دونوں کی رعایتوں اور حکمتوں سے معمور گو نسبتہً بہت مختصر، اصل جواب ملاحظہ ہو:-

"آپ نے جس غلطی میں ابتلائے عام لکھا ہے صحیح ہے۔ مگر اس میں قدرے تفصیل ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر ہم صریح الفاظ سے معافی مانگیں گے تو یہ گستاخ ہوکر زیادہ نافرمانی کریگا، بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ شرمندہ ہوگا۔ اور یہ اسی وقت تک عذر ہے جبتک اس سے تعلق رکھنا چاہیں۔ ان صورتوں میں تو صرف اس کا خوش کردینا اُمید ہے کہ قائم مقام معافی کے ہوجائے گا۔ اور بعض اوقات اس سے تعلق ہی رکھنا نہیں، جیسے ملازم کو موقوف کردیں یا وہ خود چھوڑ کر جانے لگا، اُس وقت ضروری ہے کہ زیادتی ہوجانے کی صورت میں اس سے صریح معافی مانگی جائے۔ چونکہ یہاں تو وہ عذر نہیں۔ اس میں اگر رکاوٹ ہو تو میرے نزدیک اس کا سبب غرور و کبر ہے۔ گو اپنے کو بڑا نہ سمجھ مگر کبر کے مقتضا پر عمل تو ہوا۔ تو غایت سے غایت کبر اعتقادی نہ ہوا، مگر کبر عملی تو ضرور ہی ہے اور اگر کوئی کبر کی تقسیم کو تسلیم نہ کرے تو یہی ظلم ہوا، جس سے معافی مانگنا واجب ہے۔ تو اگر کبر کا گناہ نہ ہو ظلم کا تو ہوا۔ میرے خیال میں خط کی سب شقوں کا جواب اس فیصلہ میں آچکا۔ اگر انطباق میں کچھ تردد ہو پھر تحریر فرمائیں۔" (ص ۲۰۴)

تبصرہ کی درازنفسی یوں ہی بڑھتی جارہی ہے ورنہ اپنی بری بھلی سمجھ کے مطابق جی چاہتا تھا کہ کچھ انطباقی تشریح و تصریح بھی ہوجائے۔ لیکن جس کو اپنے ان خبیث و مہلک باطنی امراض کے علاج و ازالہ کی کچھ فکر ہوگی انشاء اللہ وہ خود ہی تھوڑے

غور و فکر یا کسی سے مدد لیکر اپنے حال پر منطبق کرے گا۔ یہاں تو ابھی مصنف ہی کے صدق طلب کے طفیل میں حکیم الامت کے مطب کے کچھ اور اکسیری نسخے گھر بیٹھے حاصل کر لیں۔ لفس جاہ پسندی کو بھی لوگ بالعموم بہت بُرا اور بڑا مرض جانتے ہیں۔ مصنف نے بھی اُمرا و حکام وغیرہ بڑے بڑے لوگوں سے ملنے کی خواہش و میلان اپنے اندر پا کر علاج کی درخواست کے ساتھ یہ شکایت پیش کی ہے کہ "آجکل اپنے اندر ایک خاص مرض پا رہا ہوں یعنی جاہ پسندی" جواب میں پہلے تو اس عام غلط فہمی کو دُور فرمایا گیا ہے کہ محض "جاہ پسندی ذمیمہ نہیں امر طبعی ہے، خواہ عام ہو" اس (جاہ پسندی) کے لئے تدبیر کرنا یہ مذموم ہے۔ سو وہ اور اُس کا ترک دونوں اختیاری ہیں، اس لئے اس سے آدمی بچ سکتا ہے"

کسی زمانہ میں مصنف کے " تعلقات اونچے اونچے انگریز حکام سے ہمسرانہ اور بے تکلفانہ تھے اور ان پر فخر کیا کرتا اور ان کے خطوط بڑی احتیاط سے جمع کر رکھے تھے" پھر جب زندگی کی کایا پلٹ ہوئی تو ان کے "پشتارہ کو آگ لگادی" "برسوں کے بعد اب ادھر چند روز میں دل نے پہلی بار اپنی اس حماقت (یعنی جلانے) پر افسوس محسوس کیا" اس تازہ افسوس کو ان ذائل کے ضمن میں پیش کیا ہے جن کی بنا پر مصنف کو جاہ پسندی کے مرض کا اپنے اندر از سرِ نو عود کر آنے کا خیال پیدا ہوا۔ پڑھنے کے قابل اس کا علاج ہے۔ علاج کیا چٹکلا۔ اور کیسا اکسیر چٹکلا کہ

" تو اب اس (جلانے کے) افسوس پر افسوس کر لیجئے، تدارک ہو جائے گا" سُبحان اللہ!

اصل میں نقل کرنا اس سلسلہ میں حکیم الامت کے ایک مستقل ضمیمہ کا ہے جو کتاب کے صفحہ ۲۲۸ پر آپ کو ملیگا جسمانی امراض کی طرح نفسانی امراض کا علاج بھی درحقیقت ایک مسلسل مجاہدہ ہوتا ہے، جس میں مریض کو طبیعت و رغبت کے خلاف خود اپنے اختیار سے اپنے اوپر جبر کر کے طرح طرح کی تلخ و بدمزہ دوائیں کھانا پینا اور گوناگوں خوش مزہ اور مرغوب طبع چیزوں سے پرہیز کرنا پڑتا ہے۔ لیکن بچے ہی نہیں بعض بڑے مریض بھی ایسے ضدی و کم ہمت ہوتے ہیں، جو اپنے اختیار سے نہ کڑوی دوا کھاتے پیتے ہیں، نہ پرہیز کرتے ہیں۔ لیکن معالج اور تیماردار اپنی ہمدردی و خیر خواہی کی بنا پر زبردستی یا کسی نہ کسی بہانہ سے دوا و پرہیز دونوں اُن سے کراہی کے رہتے ہیں۔ کوئی بندہ نفسانی امراض کے معاملہ میں بھی جب ایسا ہی طفل مزاج یا کمزور و کم ہمت ہوتا ہے، ساتھ ہی کچھ نہ کچھ صدقِ طلب بھی رکھتا ہے اور ان امراض سے نجات بھی چاہتا ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت و شفقت بھی اس کے مناسب حال غیر اختیاری یا اضطراری مجاہدات سے اس کی دستگیری فرما کر معالجہ فرماتی ہے اور " عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم" کا معاملہ ہوتا ہے۔

خود راقم سطور ایسا ہی سراپا مریض ساتھ ہی کم ہمت ہی نہیں بے ہمت بندہ ہے کہ اختیاری مجاہدات کی کہنا چاہئے کہ بھولے ہی سے ہمت نہیں رکھتا۔ لیکن اضطراری معالجات ایسے ایسے حاذقانہ بالضد و بالمثل دونوں ہوتے رہتے ہیں کہ شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ فلاں علاج یا دوا فلاں بیماری یا فلاں کوتاہی کی ہے۔ چونکہ خود اپنا سالہا سال کا تجربہ ہے اور بھی یقیناً بہت سے بندگانِ خدا ایسے عاجز و قاصر ہوں گے جو اختیاری مجاہدوں کی زیادہ ہمت نہ رکھتے ہوں گے، ان کو انشاء اللہ اس سے بڑی تسلی ہوگی کہ ان کے ظاہری مصائب و آلام سب مصائب ہی نہیں ہوتے بلکہ بہت سی باطنی بیماریوں کا علاج اور پھوڑوں کا آپریشن ہوتے ہیں۔ اب خود وہ ضمیمہ پڑھئے۔

" اوپر جو کچھ عرض کیا گیا وہ مجاہدۂ اختیاریہ ہے، جو قانونی علاج ہے۔ ایک مجاہدۂ اضطراریہ ہے جو موہوب وغیر مکسوب ہے۔ وہ یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے ساتھ خیر چاہتے ہیں۔ اور مجاہدۂ اختیاریہ سے اس کو کام

دعا جو دیکھتے ہیں تو ایسے اسباب غیب سے پیدا فرما دیتے ہیں، جس سے اس کے امراض نفسانیہ حبِ جاہ وغیرہ کا علاج ہو جاتا ہے۔ حضرت مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

ہم بد ابلہاں نماید خویش را ہم بدرند خرقۂ درویش را

مثلاً اس پر کوئی مرض مسلط ہو جاتا ہے یا کوئی عدو مسلط ہو جاتا ہے، جو اس کو ایذائیں خصوصاً بدنامی کی ایذا پہنچاتا ہے، جس کی روایت کو، گر کوئی غلط سمجھتا ہے تو دوسرا صحیح سمجھتا ہے اور اس طرح وہ رسوا ہو جاتا ہے، جو اوّل اوّل نفس کو بحد ناگوار ہوتا ہے مگر صبر و رضا جب اختیار کرتا ہے، پھر تو اس میں ایسی قوت عمل کی ہو جاتی ہے کہ نہایت محبت کے ساتھ کہنے لگتا ہے ؎

ساقیا برخیز و در دہ جام را خاک بر سر کن غم ایام را
گرچہ بدنامی ست نزدِ عاقلاں ما نمی خواہیم ننگ و نام را

بس، اللہ تعالیٰ ایمان سلامت رکھے! اہل ایمان ہی کی تسلّی کے لئے ایک اور ملتی جلتی بات اور خود اپنی کم ہمتی کے مذاق کی کہہ دینے کو جی چاہتا ہے۔ دنیا کی چھوٹی چھوٹی اذیتوں کا بھی تحمل زیادہ نہیں رکھتا ہوں تو جب اپنی بداعمالیوں اور برزخ و آخرت کے شدائد کا خیال آتا ہے اور ساتھ ہی اس کا کہ مومن کی ہر چھوٹی بڑی اذیت و مصیبت اس کی سیئات کا کفارہ ہو جاتی ہے، تو واقعی بڑی تسلّی ہوتی ہے کہ اچھا ہے جتنا فاسد مواد اسی زندگی میں نکل جائے۔ ایک مزید تسکین اپنی کم ہمتی و کمزوری ہی کی بدولت یہ حاصل کر لیتا ہوں کہ ذرا بھی عقل و نقل کے منافی یا مزاج و مذاق کے خلاف کوئی بات پیش آ جاتی ہے تو اس سے کلفت و اذیت اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ دوسروں کی سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ اتنی ناگواری کی کیا بات تھی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے حسنِ ظن یہ قائم کر رکھا ہے کہ کفارۂ سیئات اذیت کے اعتبار سے نہیں بلکہ مقدار اذیت کے مطابق انشاء اللہ اتنا ہو جاتا ہوگا۔ غرض ایمان ہو اور اس سے کام بھی کچھ لیتے رہنے کی توفیق نصیب ہو تو واقعی زبان ہی پکار اٹھتی ہے کہ "خیر و ابقیٰ" زندگی کے سامنے دنیا کے غموں کا غم ہی کیا "خاک بر سر کن غم ایام را"۔

لیجئے چند ہی صفحے آگے لئے تھے کہ انسانیت و اسلامیت دونوں ہی کے کمال کی پھر ایک اور مثال سامنے آ گئی۔ سیاسی تحریکات کے زمانہ میں مخالفین حضرت علیہ الرحمۃ کے متعلق طرح طرح اتہام تراشیاں اور بالکل بے اصل افترا پردازیاں کرتے رہتے تھے۔ مثلاً حضرت نے "یہ فتویٰ دے رکھا ہے کہ جب تک جسم پر ولایتی کپڑے کا کوئی جز نہ ہوگا نماز درست نہ ہوگی" یا "گورنمنٹ انگریزی کے ساتھ موالات و مودت فرض قرار دیدی ہے"۔ ضبط کی بھی ایک حد ہوتی ہے مصنف سلّمہ کو آخر ایک عریضہ میں عرض کرنا ہی پڑا کہ "پہلے افترا کی تو زبانی تردید کر کے خاموش رہا" لیکن اس دوسرے کی تردید اب کی ہفتے کے پرچہ سچ میں کر رہا ہوں۔ اب حضرت کے "انسانی و اسلامی" کمال ضبط سے بڑھ کر کمالِ نظر کو دیکھئے کہ کہاں جاتی ہے۔ جواب میں فرماتے ہیں کہ:-

"یہ (خیال تردید) آپ کی محبت ہے۔ مگر مجھ کو طبعاً اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اس اتہام میں نہ ان کا ضرر نہ میرا۔ بلکہ جواب دینے میں ان کا ضرر یہ ہے کہ اب تو وہ اتہام میں معذور ہیں اور جب وہ جواب پر مطلع ہو کر قبول نہ کریں گے تو عاصی ہوں گے۔ تو ایک مسلمان کو عاصی بنانا کیا فائدہ؟"

پڑھنے والے ذرا سینہ پر ہاتھ رکھ کر سوچیں کہ عوام نہیں اچھے اچھے خواص بھی کتنے اپنے بدترین مخالفین کے ساتھ اتنی دور اتنی عالی ظرفی و شرافت نفس کا معاملہ کر سکتے ہیں۔ یہ کمال تو بس انسانیت و اسلامیت کی جامعیت ہی کا کرشمہ تھا۔

آگے پھر مصنف نے لکھا ہے کہ "حیرت ہی ہوتی رہتی ہے کہ بعض لوگ افترا کرنے پر اور بعض لوگ ہر خفیف سے خفیف بلکہ مہمل سے مہمل روایت کے قبول کر لینے پر کیسے آمادہ و مستعد ہو جاتے ہیں"

حکیم الامت کا اب جواب سنئے :-

"حکمت معلوم نہ ہونے پر حیرت لازم ہے۔ مگر مجکو حیرت نہیں ہوتی حکمت معلوم ہو گئی ہے۔ اس حکمت کا حاصل ایک مثال سے سمجھ لیجئے کہ جس امام کے پیچھے جتنے مقتدی کم ہوں گے اگر غلطی بھی کریگا تب بھی اس سے ہلکا رہے گا جس کے زیادہ مقتدی ہوں گے" (ص ۳۳۲)

سُن رہے ہیں دین کے مقتدا اور دنیا کے لیڈر بھی جو اپنا سارا کمال و کامیابی اپنے پیچھے نعرہ لگانے والوں کی زیادہ سے زیادہ بھیڑ ہی کو جانتے ہیں۔ اُمت کا یہ حکیم بات بات میں اسلامیت و انسانیت دونوں کے کیسے کیسے انمول سبق دیگیا ہے یہی تو حکیم الامت کی وہ اصلی کرامتیں اور دوائیں تھیں جن پر مصنف کے ہم زبان ہو کر مرنے کو جی چاہتا ہے ؎

ہم مرتے ہیں، جس پہ یہ بات ہی کچھ اور ہے　　تم سے جہاں میں لاکھ سہی تم مگر کہاں

تبصرہ شروع کرتے وقت ارادہ تھا کہ خاص خاص مضامین پر الگ الگ کچھ مختصراً اپنی بُری بھلی نظر کو نذرِ ناظرین کر دیا جائے گا۔ لیکن ایک مرتبہ پوری کتاب پڑھ جانے کے بعد جب تبصرہ کی نیت سے ورق گردانی شروع کی تو کتاب کا دامن ایسے قسم قسم کے بیش بہا جواہرات سے بھرا پایا کہ ہر قسم کا نمونہ پیش کرتا تو ایک دوسری کتاب ہی لکھ دینا ہوتا، تاہم نہ مدنظر اختصار پر قابو رہا اور نہ ہر قسم کے مضمون کو الگ الگ رکھنے پر۔ اب آدھے سے زیادہ اوراق تو آنکھیں بند کر کے الٹ دیئے اور آگے جلد جلد ورق اُلٹ کر بلاتقسیم و ترتیب جہاں نظر رُکنے پر بالکل بے بس ہو گئی وہیں رُکتا ہوا انشاء اللہ خاتمۂ کتاب تک ناظرین کو پہنچا دیتا ہے۔

ص ۳۴۳ سامنے آ گیا۔ طالبِ صادق مصنف نے شکایت یہ پیش کی ہے کہ "نماز میں حضوری پہلے ہی کب نصیب تھی اور اب تو بالکل ہی تشریف لے گئی ہے" حکیم الامت کا حکیمانہ جواب صرف یہ نہیں کہ یہ حال سرے سے مرض ہی نہیں بلکہ مریض جس کو صحت جانتا ہے وہی اصل میں ایک دقیق مرض ہے اور جس کو مرض جانتا ہے وہ عینِ صحت۔ ارشاد ہے کہ

"یہ غیب و تشویش اس حضوری سے بھی انفع ہے۔ اصل طریق مجاہدہ ہے۔ یہ کیفیت مجاہدہ ہے۔ اور جس حضوری کو اس پر ترجیح دی جاتی ہے وہ حظ نفسانی کے ساتھ مخلوط ہے۔ اللہ تعالیٰ بندہ کو جو عطا فرماتے ہیں وہی انفع و اصلح ہے"

عبدیت اور تسلیم و رضا کی کیسی لطیف و نازک تعلیم ہے سُبحان اللہ! آگے پھر اسی سلسلہ کی ایک دوسری شکایت مریض نے کی کہ "کوئی ذرا بڑی سورت تو پڑھ ہی نہیں سکتا۔ خصوصاً نماز عشا میں۔ حد یہ کہ بار بار نیت توڑ دینے کو جی چاہتا ہے"

اب طبیب علاج مریض کے درد کا خود اس کا "ہمدرد" و "ہمنوا" ہو کر کر رہا ہے کہ

"یہ سُن کر آپ کو تسلی ہوگی کہ آجکل ایک شکایت بدنی کے سبب میرے معمولات کا بھی یہی رنگ ہے۔ مگر میں خوش ہوں کہ طبیب اگر بدمزہ دوا تجویز کرے وہی مصلحت ہے"

بالکل سچ کہا کسی نے کہ "خوش طبیبے ست بیا تا ہمہ بیمار شویم" واقعی طبیب مل جائے تو بیمار ہونے میں بھی مزہ آتا ہے۔

آگے بہت سے ورق اُلٹ کر صـ۲۲ پر نظر ذرا رُک گئی۔ بات بظاہر بہت چھوٹی ہے۔ لیکن حکیم الامت کی دین و دنیا دونوں کے معاملات میں حکیمانہ فکر و نظر کی بہت بڑی دلیل۔ حضرت کے بعض جوابات ڈاک میں تلف ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ جن جوابات کا ایک ایک لفظ لاجواب ہوتا ہو اُن کے تلف ہونے سے مکتوب الیہ کو کتنا دکھ ہوتا ہوگا۔ آخر یہ عرض کیا کہ "اب اس کا علاج سمجھ میں نہیں آتا بجز اس کے آئندہ ہر خط رجسٹری بھیجا کروں۔ مصارف کی زیادتی سہی۔ لیکن اذیت قلب سے تو حفاظت رہے گی۔"

لیکن جس سراپا، شفقت اور حاذق حکیم و معالج کے مریض نے اپنے کو سپرد کر رکھا تھا اس کے ہاں لاعلاج ہی کون سا مرض تھا۔ جواب میں اس مشکل کا حل بھی کیسا سہل تجویز فرما دیا کہ "ایک صورت یہ بھی ہے کہ لفافہ جوابی پر تین پیسہ کا ٹکٹ لگا یا جائے تاکہ دو پیسہ کا بیرنگ ہو کر پہنچے۔" اس وقت لفافہ کا ٹکٹ ایک آنے کا تھا۔ مکتوب الیہ نے اس پر عمل کرتے ہوئے حرف حرف صحیح لکھا کہ :-

"میں تو کہا کرتا ہوں کہ دوسرے آپ کو حکیم صرف امور دین میں سمجھتے ہیں۔ لیکن میں تو اپنے تجربہ میں چھوٹے اور بڑے دنیوی معاملہ میں بھی آپ سے زیادہ صائب اور حکیمانہ و عاقلانہ مشورہ کسی کا نہیں پاتا۔ ذالکَ فضل اللہ۔"

یہ سر سے پیر تک دنیادار رقم تو خدا ہی جانتا ہے کہ ۱۴، ۱۵ سال کی سعادتِ تعلق میں کتنی اور بظاہر کیسی کیسی لاینحل دنیوی مشکلات پیش کرتا رہا، اور ایک مثال بھی یاد نہیں جس میں حکیم الامت کا حل سب سے بڑھ کر حکیمانہ و عاقلانہ" نہ رہا ہو۔

آجکل پاکستان قادیانیت کے ایک نئے فتنہ سے دوچار ہے۔ صـ۲۵۹ پر وقت کے مناسب اس سلسلہ کی بھی ایک پرانی تحقیقی بات نکل آئی جو حاضر ہے۔ فاضل مصنف قادیانیوں کو کسی نہ کسی طرح کفر سے اپنی ایک مخلصانہ نیت ہی کی بنا پر بچانے کی جیسی جیسی راہیں آج ہی نہیں ہمیشہ ڈھونڈھتے رہے ہیں، انھیں میں سے ایک حضرت کی خدمت میں عرض کی کہ

"فتنۂ قادیان کے سلسلے میں ایک مسئلہ محض اپنی تشفی قلب کے لئے دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم پر جو الزام اجرائے نبوت کا عائد کیا گیا ہے، تو اجرائے نبوت کے تو اہلسنت بھی قائل ہیں یعنی ظہور مسیح آخر الزماں کو مانتے ہیں۔ اب گفتگو تعین شخص میں رہ جاتی ہے۔ یعنی علامات و آثار مسیحیت کا مصداق فلاں شخص ہے یا نہیں تو اس میں اجتہاد کی بڑی گنجائش ہے۔ اس پر مختصر کچھ ارشاد فرما دیا جائے۔"

ارشاد ہوا کہ

"اس کا دعویٰ صرف مسیح علیہ السلام ہی کے ساتھ خاص نہیں جس میں شبہ مذکورہ فی السوال کی گنجائش ہو۔ وہ تو مسیح علیہ السلام غیر مسیح سب کے لئے نبوت کو ممکن کہتا ہے۔ اس کے رسائل میں اس کی تصریح ہے۔ پھر مسیح علیہ السلام میں بقائے نبوت سابقہ (جو کہ موصوف کا کمال ذاتی ہے، جو بعد عطا سلب نہیں ہوتا بدون ظہور آثار خاصہ تشریع وغیرہ جیسا کہ خود عالم برزخ میں یہ کمال سب حضرات کی ذات میں باقی ہے) عطائے نبوت کو مستلزم نہیں۔ و در معانی ختم نبوت کے عطائے نبوت ہے جس کا وہ اپنی ذات کے لئے مدعی ہے۔ کیونکہ یہ پہلے موجود نہ تھا تاکہ اس نبوت کو نبوت سابقہ کہا جا سکے نہ کہ بقا بشان مذکور اور یہ بالکل ظاہر ہے۔"

"بالکل ظاہر" ہونے پر بھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ مصنف کی اس شان میں اُس وقت سے آج تک کوئی فرق نہیں آیا

کہ وہ خود اپنی رائے[1] و عقلیت کو کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی محض عقیدت و محبت سے اس وقت تک متاثر و مغلوب نہیں ہونے دیتے جب تک کہ خود ان کی ذاتی رائے ہی نہ بدل جائے۔ حد یہ کہ اسی تکفیر قادیانیت کے مسئلہ میں خرق اجماع تک کی پروا نہیں فرماتے! یہ بات کتاب کو پڑھتے وقت اس لئے بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ انھوں نے حکیم الامت کے جن فضائل و کمالات کی نقاشی فرمائی ہے، خوب جانچ اور پرکھ کر فرمائی ہے۔ حسن ظن اور خوش عقیدگی کی رنگ آمیزیوں سے کام نہیں لیا ہے۔ نہ "شرک فی النبوۃ" کا ارتکاب کیا ہے!

لیجئے ایک ہی ورق بعد انسانیت و اسلامیت کے کمال و جامعیت کا ایک اور منظر سامنے آگیا جس سے صرف نظر دینی و قومی اداروں اور خدمات کے خادموں کو ایک بڑے قیمتی سبق سے محروم رکھنا ہوگا۔ کسی معاملہ میں اپنے رفقاء کار سے اختلاف ہو جانا بعید ہے۔ ہوتا ہی رہتا ہے۔ اور نہ کبھی کبھی اس اختلاف کا انقطاع کی حد تک پہنچ جانا۔ لیکن اس خلاف و انقطاع کو اپنے حدود میں رکھنا، کتنا بڑا انسانی کمال ہے، اس کا اندازہ تجربہ رکھنے والے اس سے فرما سکتے ہیں کہ ہر جگہ یہ جنس کم و بیش نایاب ہی ہے۔ حضرت علیہ الرحمۃ دار العلوم دیوبند کے نہ صرف ضابطے کے معمولی سرپرست تھے، بلکہ اپنی شخصیت، تقوی و دین کے لحاظ سے چھوٹوں بڑوں سب کے لیے معتمد علیہ کہ شاید ہی کبھی کسی کو حضرت کے حکم و ارشاد سے سرِ مو تجاوز کرنے کی ضرورت ہوئی ہو۔ اور اس سرپرستی سے محرومی کا تو تصور بھی کون گوارا کر سکتا ہوگا۔ لیکن عہد حاضر کی فتنہ پرور سیاسی تحریکات کا ایک بحرانی دور ایسا آیا کہ دیوبند کے "بند" دروازے بھی سیاست کے اس "دیو" پر بند نہ رہ سکے! اور حضرت کو بالآخر انقطاع ہی کا فیصلہ کرنا پڑا۔ جس کے اعلان کے لئے ایک مختصر تحریر صاحب صدق کو صدق یا کسی دوسرے اخبار میں اشاعت کے لئے روانہ فرمائی ہے۔ اور اس اجازت کے ساتھ کہ خواہ "اپنی رائے کے ساتھ شائع فرمائیں یا بدون رائے، در رائے میں بھی بالکل آزاد ہیں" لیکن جس بات کی تاکید ہے وہ یہ کہ "اتنا لحاظ ضروری ہے کہ مدرسہ کو کوئی گزند نہ پہونچے بلکہ کسی قدر مدرسہ کی خدمت کی ترغیب ہو تو مصلحت ہے، ورنہ نہ نفع نہ ضرر"

اب اصل اعلان ملاحظ ہو:۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم الآیۃ — حامداً و مصلیاً
احقر اشرف علی آیت کی بنا پر عرض رساں ہے چونکہ آجکل مدرسۃ العلوم دیوبند کے ارکان نیز بعض مسائل انتظامیہ میں غیر معمولی اختلاف ہے جس کو بنا بر حسن ظن اختلاف اجتہادی کہنا احوط ہے اور منجملہ ان مسائل کے احقر کی سرپرستی کی نوعیت کا مسئلہ بھی ہے۔ جو میری آزادی پسند طبیعت پر سب سے زیادہ گراں بھی ہے۔ اور آئندہ ناگوار آثار کے ترتب کا بھی احتمال ہے۔ اس لئے احتیاطاً و اخذاً بالعزیمۃ حضرت سیدنا حسن کی سنت کے اتباع میں نفس سرپرستی سے اپنے کو معزول کرتا ہوں جو حقیقت میں تجدید اعادہ استعفاء سابق ہے۔ امید کہ اس کے بعد مسائل جلد ہی سہولت سے حل ہو جائیں گے۔ لیکن مدرسہ کی ہر خدمت

---

[1] قادیانیت کے مسئلہ میں مولانا دریابادی نے جو روش اختیار فرمائی ہے وہ "کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی عقیدت و محبت" کا سوال نہیں بلکہ خود ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی "نبوت" کا مسئلہ ہے، اور اس مسئلہ (ختم نبوت) میں جناب دریابادی کا اپنی "رائے اور عقلیت" پر اسقدر اعتماد کرنا، نہ صرف یہ کہ خودرائی اور بیجا ضد ہے بلکہ گمراہی ہے (مدیر)

معاذرہ سے انشاء اللہ تقاعد نہ ہوگا، واللہ الموفق۔"

البتہ جن صاحبوں نے اس معاملہ میں حدود شریعت و تہذیب سے متجاوز ہوکر میرا دل دکھایا ہے ان سے خاص تعلقات رکھنے سے معذور رہوں گا جب تک اس دل آزاری کا تدارک نہ کریں۔ گو عام اسلامی تعلقات باقی رہیں گے۔"

دیکھا آپ نے کس طرح ایک ایک لفظ انسانیت و اسلامیت کے حدود و رعایات کے کانٹے میں تُل تُل کر نکلا ہے!

اسی مکتوب مبارک میں بظاہر "دو پیسے" کی ایک آدھ بات، لیکن حقیقت میں لاکھوں روپیہ کی بلکہ انمول! بہت کان لگا کر سُن لیں آجکل کی لادینی سیاست جو سرتاسر شور و شر اور فتنہ و فساد بن کر رہ گئی ہے، اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ امن و امان کی بنیاد اصل میں اطاعت پر ہے اور یہ لادینی سیاست کہنا چاہیئے کہ تمام تر بغاوت[1] کی تعلیم پر مبنی ہے۔ اس کے برخلاف اسلام کی دینی تعلیم اپنے سچے پیروؤں کو اسلامی ہی نہیں غیر اسلامی قوانین[2] کا بھی (خاص شرائط کے تحت) کتنا سچا اور پکا مطیع بنا دیتی ہے اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حضرت علیہ الرحمۃ ڈاک اور ریل کے ٹکٹ اور خطوں وغیرہ تک کے قاعدوں میں کتنے محتاط تھے کہ ایک رتی اور ایک پائی کے فرق کو جائز نہ رکھتے تھے۔ اس مکتوب کو بھی حضرت نے حفاظت کے خیال سے دو پیسے کا بیرنگ فرما دیا۔ ساتھ ہی آدھ آنے کے ٹکٹ لفافہ میں رکھ دیئے اور لکھا کہ :۔

"اگر ڈاک والے نہ لیں تو ٹکٹ حاضر ہیں۔ اور اگر ذہول سے نہ لیں تو ان ٹکٹوں کو چاک کر دیجئے اگر چاک کرنے کو دل نہ گوارا کرے، تو کسی خط میں (جو خاص اس غرض سے نہ بھیجا جائے) مجھکو اطلاع کر دی جائے میں خرید کرکے چاک کر دوں گا۔"

اللہ اکبر پرائی کیا آج پورے کرۂ ارض پر خود اپنی حکومت کے قواعد و ضوابط کے اتنے فرماں بردار و وفادار کتنے ہوں گے! آہ! کہ آج ہم مسلمان اگر اس طرح کے مسلمان ہوتے تو کوچہ و بازار میں رُسوا ہونے کی جگہ غیروں کی آنکھ کا بھی تارہ بن کر رہتے۔ اس "تقویٰ و تدین" سے کون کافر بھی گھائل ہوئے بغیر بچ سکتا ہے۔ بقول مصنف "سچ یہ ہے کہ تقویٰ و تدین کا اب تک نام ہی سُنا تھا۔ عملی نمونہ حضرت ہی کا دیکھا!"

اب اور بھی جلد جلد ورق اُلٹتا ہوا بہت ہی اُچٹتی نظر ڈال رہا ہوں۔ اسی میں ایک بڑے کام کی بات نکل آئی بقول مصنف "ایک اہم مسئلہ" یہ ہے کہ :۔

"عدالتی عہدے مثلاً منصفی، سب ججی، تحصیلداری، خواہ وہ عہدے بلا تنخواہ ہوں، مثلاً آنریری مجسٹریٹی غیر مسلم حکومت کے تحت میں قبول کرنا جبکہ فیصلے لامحالہ غیر اسلامی قانون کے تحت کرنے پڑیں گے کہاں تک جائز ہے؟ ۔۔۔۔ لیکن اگر کوئی مسلم ان عہدوں پر نہ رہ جائے تو اُمت اسلامی ہی کے دوسرے مصالح فوت ہوئے جاتے ہیں۔"

جواب کا بہت مختصر ضروری اقتباس یہ ہے :۔

---

[1] مگر طاغوت سے بغاوت کی تو اسلام بھی تعلیم دیتا ہے۔ (مدیر)

[2] ڈاک اور ریل کا کرایہ وغیرہ یہ عدالتوں کے قوانین کی طرح کوئی "قانون" نہیں ہے۔ (مدیر)

"مگر بعض افعال ایسے ہیں کہ شرعی کلی قانون سے حرام ہیں۔ لیکن ضرورت میں شرعاً بھی اُن کی اجازت دیدی جاتی ہے۔ خواہ نصاً، خواہ اجتہاداً جیسے اکل میتہ (مردار کھالینا)....

.... البتہ کلام ضرورت میں ہے۔ اور یہی اہم ہے۔ سو اس کی تحقیق یہ ہے کہ ضرورت کی عرفی قسمیں دو ہیں۔ ایک تحصیل منفعت خواہ دینی ہو یا دنیوی، خواہ اپنی ہو یا غیر کی۔ دوسری دفع مضرت اسی تعمیم کے ساتھ۔ سو تحصیل منفعت کے لئے تو ایسے افعال کی اجازت نہیں۔ مثلاً محض تحصیل قوت و لذت کے لئے دوائے حرام کا استعمال ..... اور دفع مضرت کے لئے اجازت ہے۔ جبکہ وہ مضرت قواعد صحیحہ منصوصہ یا اجتہادیہ سے معتد بہا ہو۔ اور شرعی ضرورت یہی ہے۔ مثلاً دفع مرض کے لئے دوائے حرام کا استعمال جبکہ دوسری دوا کا نافع نہ ہونا تجربہ سے ثابت ہوگیا ہو۔ کیونکہ بغیر اس کے ضرورت ہی کا تحقق نہیں ہوتا.... پس یہی تفصیل واقعہ مسئول عنہا میں سمجھا جائے کہ یہ مناصب فی نفسہ شرعاً حرام ہیں، جن کی وجہ خود سوال میں بھی مذکور ہے۔ اور اگر عمل کے ساتھ خاص فساد عقیدہ بھی ہو کہ حکم قانونی کو بمقابلہ حکم شرعی مستحسن و راجح، سمجھا جائے تو کفر ہے، جس کو میں نے بیان القرآن سورۂ مائدہ آیت "من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون" کی تفسیر میں بیان بھی کیا ہے۔

مگر اسوقت کلام صرف اس درجہ میں ہے، جو محض معصیت و حرام ہے۔ پس فی نفسہ حرام ہونے کے بعد اگر جلب منفعت مالیہ یا جاہیہ کی غرض سے اختیار کیا جائے تو کسی حال میں جائز نہیں۔ اور اگر دفع مضرت کی غرض سے اختیار کیا جائے کہ اُمّت مسلمہ پر کفار کی طرف سے جو مظالم و مضرات پہونچتے ہیں یہ اہل مناصب بقدر امکان اُن کو دفع نہ کرسکیں تو کم از کم تقلیل و تخفیف کرسکیں تو اس صورت میں حکم جواز کی گنجائش ہے۔ واللہ اعلم" (ص ۹۵)

اب جو مسلمان اس قسم کے منصب اور عہدے حاصل کرتے ہیں خود ہی اپنے گریبان میں سر ڈال کر سوچ لیں کہ کتنے ہیں جن کے دل میں خود اپنے مالی و جاہی منافع کی حرص و ہوس کے سوا "اُمّت اسلامی کے مصالح" کا خطرہ بھی آتا ہوگا! ایک طرف حرص و ہوس کی یہ دوڑ ہے۔ دوسری طرف اسلام کی صراط مستقیم یا راہ اعتدال سے ہٹ کر ایک "اسلامی جماعت" ہی "تحصیل منفعت" کا کیا ذکر اپنے کو کسی صریح ظلم و زیادتی کے ضرر سے بچانے کے لئے بھی غیر اسلامی قانون و عدالت سے مدد لینے پر "یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت" کا فتویٰ لگا دیتی ہے۔ حکیم الامت رح کی تعلیمات کی بہت بڑی خصوصیت یہی ہے کہ افراط و تفریط سے ہٹ کر اسلامی اعتدال و توسط کا جمال و کمال شاید ہی کہیں ہاتھ سے جانے پاتا ہو۔ بس ہر چیز اپنی جگہ پر ہے۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

ایک ورق بعد ہی اسی جمال و کمال کی ایک اور مثال وجد آفریں پڑھتے چلیں۔ مصنف نے اپنا حال عرض کیا ہے۔ کہ "کچھ روز سے موت بہت یاد آنے لگی ہے۔ مگر شوق و اشتیاق کے ساتھ نہیں بلکہ خوف و دہشت کے ساتھ" موتیوں میں تولنے کا جواب سنئے:۔

لہ اس سلسلہ میں سر دست صرف اتنا عرض ہے کہ "فاولئک ھم" کلیہ نہیں بن گیا ہے۔ یہاں تک کہ "من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفٰی و" "کی تصویر" ہی آنکھوں سے اوجھل سی ہوتی جارہی ہے اور "جماعت اسلامی" اس حقیقت کو کھول کر مسلمانوں کے سامنے لارہی ہے جس کے لئے وہ طعن نہیں بلکہ تحسین و امتنان کی مستحق ہے۔ (مدیر) مسلمانوں کی یہ بہت بڑی شامت اعمال ہے کہ یہ اضطرار، عادت

"نہ شوق مقصود ہے نہ خوف۔ دونوں مقصود بالعرض ہیں۔ اور مقصود بالذات تعلق آخرت اور تقلیل تعلق عن الدنیا ہے، جو دونوں طریق سے حاصل ہے"

بہت سے ورق اُلٹ کر صفحہ ۵۴۴ پر انسانیت و اسلامیت کے جمال و کمال کی ایک اور بڑی دلکش تقریر کا سراپا پڑھ جائیے۔ ایک سطر بھی چھوڑنے کی نہیں ساتھ ساتھ اس سراپا کھینچنے والے قلم کی داد دیجئے کہ کہاں کہاں نظر جاتی ہے۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ یہ تصویر حکیم الامتؒ کی بیماری کی ہے۔ جس نے بیماری میں "انسانیت و اسلامیت" کے ایسے درس دیئے تندرستی میں اس نے کیسے کیسے سبق نہ دیئے ہوں گے!

"مریضوں کی نازک مزاجی اور چڑچڑاپن مشہور و مشاہد ہے۔ طبیبوں سے، مختلف غذاؤں کی فرمائشیں عام ہیں۔ اور پھر اپنی طرف سے تجویزوں کی تو گنتی نہیں رہتی۔ آنے جانے والے جو ہوتے ہیں ان میں سے بھی مخلص و تجربہ کار اپنی اپنی فہم و بصیرت کے مطابق کچھ مشورے ضرور دیے جاتے ہیں۔ یہاں آنے والے لوگوں کی کیا کمی تھی۔ اچھے اچھے طبیب ڈاکٹر بھی حاضری دیتے اور زیارت کرنے آتے اور جو صاحب بھی آتے اپنے اخلاص کے تقاضے سے کوئی نہ کوئی دوا یا غذا یا تدبیر بھی بتلا جاتے۔ حضرت کی کیفیت اس وقت دیکھنے کے قابل ہوتی۔ آنکھیں نیچی کر کے بہت نرم و ملائم انداز میں فرما دیتے "جی بہت اچھا اپنے حکیم صاحب سے اس کا ذکر کر دوں گا آگے وہ جیسا مناسب خیال فرمائیں"۔ اور اپنی تو نازبرداری کسی سے کیا کراتے۔ اُلٹے خود ہی حکیم صاحب کی نازبرداری کرتے رہتے۔ اپنے کو اُن کے ہاتھ میں تمام تر دیکر خود مجسّم تسلیم و رضا بنے رہتے اور طبیب سے فرمائش کرنے کی جگہ اُن کی ہر چھوٹی بڑی ہدایت کی پوری پیروی کرتے"

خوب یاد آیا جسمانی بیماری کے جس معاملہ کی یہ مصوری اپنے جسمانی طبیب کے ساتھ فرمائی گئی ہے وہی تعلیم حضرت کی روحانی طبیب — شیخ یا مرشد — کے معاملہ میں تھی۔ اب آگے پڑھئے۔

"تھانہ بھون چھوٹنے سے حضرت کے معمولات میں جو فرق آرہا تھا اور جتنا ہرج ہو رہا تھا بالکل ظاہر ہے اور اس کی بنا پر جتنی بھی عجلت حضرت کو واپسی کی ہوتی کم تھی۔ لیکن طبیب کے سامنے اشارۃً بھی یہ ذکر نہ آنے دیتے کہ یہ بھی ایک صورت تقاضے کی اور منصب طبیب میں مداخلت کی ہے — اللہ اللہ! فطرت بشری اور شریعت اسلامی کے کن کن دقائق و حقائق پر نظر حکیم الامت کی رہتی تھی۔ کاش کسی صاحب نے حضرت کی کیفیات کو جو بحیثیت مریض وارد ہوتی تھیں ذرا غور کر کے نوٹ کر لیا ہوتا تو پورا ایک رسالہ آداب مریض پر تیار ہو سکتا تھا۔ ہمیشہ کے لئے نافع، آئندہ نسلوں کے لئے شمع راہ"

اسی دوران میں مصنف نے کسی عریضہ میں عرض کیا کہ "اگر بہ سہولت ممکن ہو تو تاریخ روانگی سے دو ایک دن قبل مجھے مطلع فرما دیا جائے تو عنایت کرم سمجھوں گا" جواب میں تحریر فرمایا

"انشاء اللہ اس کی کوشش کروں گا۔ لفظ کوشش اس لئے عرض کیا کہ حکیم صاحب نے باوجود ایک جماعت کے پوچھنے کے کوئی صاف بات نہیں بتلائی اور میرا پوچھنا موہم ہے تقاضے کو۔ اگر دو تین دن پہلے معلوم ہو گیا فوراً اطلاع عرض کر دوں گا"

اس پر انسانیت کے ادا شناس مصنف کو پھر وجد آگیا کر

"شرافت" اس آخری دقیقہ" اخلاق پر کہ طبیب سے اجازت چاہنا بھی گویا اس سے تقاضا کرنا ہے لوٹ لوٹ گئی ـــــ علماء و صوفیا کو انسانی اخلاق سے محروم اور خشک مزاج سمجھنے والوں نے کاش ایک بار بھی حضرت کی زیارت کر لی ہوتی"۔

اس میں شک نہیں کہ بعض نافہموں کی زبانی سنی سنائی باتوں کی بنا پر بلکہ محض سرسری زیارتوں کے بعد بھی حضرت کی عین شرافت نفس اور حسن معاشرت کی ان دقیق رعایتوں اور اداؤں سے ہی اُلٹے خشک مزاجی کے شبہات پیدا ہو جا سکتے تھے۔ لیکن تعلق و سابقہ کی سعادت جتنی زیادہ حاصل ہوتی جاتی شبہ کرنے والے کو خود اپنی فہم و فکر کا ماتم کرنا پڑتا۔ اور دوسرے کمالات کی طرح حضرت کی انسانیت و شرافت کا نقش بھی روز بروز گہرا ہی ہوتا جاتا۔ اسی کا اظہار ایک مکتوب میں بیتاب ہو کر مصنف نے اس طرح فرمایا ہے کہ

"جناب والا کے حسن اخلاق، حسن توجہ، جامعیت تحریر و احاطۂ جزئیات کا معتقد تو میں مدت سے تھا لیکن مولانا .... فرنگی محلی کے مکتوب کے جواب میں ان اوصاف کی اتنی نمایاں مثال دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ فارسی کی ایک مشہور لغت کا مصرعہ ہے ـــ "اے در کمال حسن عجب تر ز ہر عجب"!
اسے دہرانے کی تو جرأت نہیں کر سکتا۔ لیکن اتنا عرض کرنے کو تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ کمالات اشرفی کے باب میں میرا تجربہ کچھ اس نوعیت کا ہے کہ ہر تازہ مثال پہلے سے بڑھی ہوئی۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء" (ص ۵۶۵)

حضرت علیہ الرحمۃ بھلا اس پر سکوت کیسے فرماتے، فرمایا کہ "اس جوش شفقت کے جواب میں بجز اس کے کوئی جواب ذہن میں نہیں آتا۔

گر ہنر کہ با شد ہمہ عیب ـــ دوست نہ بیند بجز آں یک ہنر (اشرف برائے نام)

"کمالات اشرفی" کا بیان تو حکیم الامت نام اس پوری کتاب کی جان سخن ہی ہے، جس کا پورا لطف و اندازہ کتاب کے پڑھنے ہی سے ملیگا۔ لیکن ان کمالات کا خود مصنف پر جو پرتو پڑا ہے، چلتے چلاتے ایک سرسری نظارہ اس کا بھی کرتے چلیں صاحب قال کی حیثیت سے تو مصنف کے کمال کا قائل کون نہ ہوگا۔ لیکن صاحب حال ـــــ محمود و مقصود دونوں ـــــ ہونے کی خال خال ہی کسی کو خبر ہوگی۔ اور سب سے بڑا مقصود و محمود حال عبدیت یا "اپنے پندار کا بت توڑنا ہے"۔ انسانیت و شرافت جس کا نام ہے وہ بھی اس بت شکنی کے بغیر نصیب نہیں ہوتی۔ پہلے ایک عجیب و غریب خواب پڑھ لیں اور دیکھیں کہ کسی بندہ کو بندگی کی راہ میں صدق طلب کا کچھ بھی "حال" میسر آ جائے تو خدا کی طرف سے بیداری کیا خواب میں بھی کیسی کیسی دستگیریاں و رہنمائیاں ہوتی ہیں:-

"عین ختم رمضان پر شب گزشتہ خواب میں دیکھا کہ جناب والا کہیں سفر میں مقیم ہیں۔ اپنے مجمع کے اور بہت حضرات ساتھ ہیں۔ خواجہ صاحب سب سے پیش پیش ہیں۔ شب کا وقت ہے، میں ایک طرف سونے لیٹ گیا ہوں۔ جناب نے مجھے سوتا ہوا خیال فرما کر خواجہ صاحب سے میرا ذکر شروع فرمایا .... پہلے بہت سے کلمات حسن ظن اور عزت افزائی کے فرمائے۔ اس کے بعد کپڑوں کی ایک گٹھری کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ کاش یہ اس کو بازار میں بیچنے کو نکلتے تو بہت

خوب ہوتا (یا یہ کہ اپنی مراد کو پہونچ جاتے) اس فقرہ کا میرے دل پر بہت گہرا اثر ہوا۔ روتا جاتا ہوں اور اپنے دل میں کہتا جاتا ہوں کہ مولانا نے ارشاد فرمایا کہ محض علمی خدمات کافی نہیں۔ اپنی اصلاح اگر واقعی مقصود ہے تو اپنے پندار کا بُت توڑنا چاہیئے اور خلق کی نظر میں اپنے کو گرانا چاہیئے۔"

یہ خواب خود ہی ایسا ہے، کہ اس سرتاپا تکبّر و ترفع کی تعلیم و تمدن کے عہد جدید میں خصوصاً ہر قومی و سیاسی مصلح و مدبّر، ہر مصنّف و مقرّر، بلکہ ہر عالم و صوفی تک کو رات کے وقت سوتے میں نہیں دن کو جاگتے میں دیکھنا چاہیئے۔ سارا فساد مشرق و مغرب میں اسی کا تو ہے کہ "اپنے پندار کا بُت توڑنے" کا خیال خواب میں بھی شاید ہی کسی کو آتا ہو! خواب بجائے خود کوئی حجت نہیں، نہ حضرت حکیم الامت معمولاً خوابوں کی طرف اعتنا کو پسند فرماتے تھے، تاہم رویائے صالحہ کا بشارت بلکہ جزء نبوت ہونا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے۔ اور یہ خواب تو ایسی صاف غیبی رہنمائی و دستگیری تھی کہ حضرت نے بے تکلف فرمایا

"ہدایت و بشارت ہے۔ اور خواب میں محض صورت مقصود نہیں ہوتی معنیٰ مقصود ہوتے ہیں معنیٰ اس کے اصلاح ہے عُجب کی جس کا طریق صاحب معاملہ کے اجتہاد سے یا کسی شیخ کی تعلیم سے متعین ہو سکتا ہے۔"

اب آگے اسی خواب والے خط میں دریابادی کمال والے صاحبِ قال کا اپنی بے کمالی پر نظر کا "حال" رشک کے ساتھ سننے کا ہے :۔

"مدینہ منورہ کی حاضری کے وقت بھی نظر گنبد خضرا کی طرف نہ اُٹھتی تھی۔ نہ مواجہ مبارک میں جانے کی ہمت کرتا تھا مسجد نبوی میں قدم رکھتا تو گویا در و دیوار سے یہ صدائے ملامت و نفریں سنتا کہ یہ وقت دین کی نصرت کا ہے اور یہ بیہودہ محض (قال کی) لفاظی میں پڑا ہوا ہے۔ زیادہ سے زیادہ کبھی ہمّت ہوتی تو جاکر روضۂ انور کے پائیں میں بیٹھ گیا۔ اور جو کلام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم لیکر آئے تھے وہی کچھ دیر کے لئے انھیں سنا دیا۔" (صفحہ ۵)

ماشاء اللہ فنائیت و عبدیت کی کتنی بڑی دولت۔ حضرت نے بھی جواب میں ارشاد فرمایا کہ "یہ اعلیٰ درجہ ہے فنا کا، جو مجاہدات سے بھی میسر نہیں ہوتا، جو بلا تعب میسر ہو گیا کتنی خوش قسمتی ہے" خوب یاد آیا حضرت ہی کی مجلس میں سنا، یا کسی ملفوظ میں پڑھا کہ عرب و عجم کے شیخ وقت حضرت مہاجر مکی ؒ سے کسی نے ایسے عمل یا وظیفہ کی درخواست کی جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہو، فرمایا "بڑا حوصلہ ہے بھائی ہم تو اپنے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گنبد مبارک کی زیارت کے قابل نہیں پاتے۔" (او کما قال)

مدینہ منورہ میں اپنے اس حال کا ذکر مثالاً آیا ورنہ اصل میں خود حضرت حکیم الامت کی مجلس میں حاضری کے وقت مصنف سلمہٗ کی جو کیفیت ہوتی تھی وہ عرض کرتا ہے کہ

"مجھے تو یہ سبق جو مدینہ طیبہ کی حاضری میں ملا تھا، بس اسی سے ملتا جلتا آپ کی مجلس میں ملتا ہے۔ یعنی بجائے ذوق و شوق بڑھنے کے اپنی ہی گندگی ابتری اور تباہ کاری کا اور زیادہ احساس۔"

جواب حضرت علیہ الرحمۃ کی طرف سے جیسا مل سکتا تھا اس کا اندازہ ایسے مواقع پر ناظرین کو اوراق بالا میں کئی بار ہو چکا ہے، اپنے پورے لطف و لطافت کی شان سے اب بھی ویسا ہی سُن لیں۔

"خوردبین کی یہی خاصیت ہے کہ رائی گنبد نظر آتا ہے۔ سو اُردو رائی کا کمال نہیں۔ عربی رائی (دیکھنے والے) کا کمال ہے۔ رزقنا اللہ جمیعا۔"

اس موقع پر پہونچکر راقم بدحال کی نظر خود اپنے "حالِ بد" پر بے اختیار پڑی۔ یاد آگیا کہ مدینہ منورہ کی حاضری میں تو بہت" ادنیٰ درجہ" میں اس سیہ کار نابکار کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ مواجہ مبارک میں حاضر تو ہوجاتا تھا، لیکن نہ زیادہ قریب جانے کی ہمت ہوتی نہ نظر جماکر دیکھنے کی۔ اور بجائے پائیں کے بالین اقدس کی طرف بیٹھ کر بخاری شریف پڑھتا رہتا تھا کہ حضورؐ کے پائیں میں خود حضورؐ ہی کے کلام کی بے ادبی کا پہلو تھا۔ قرآن مجید کی تلاوت کا زیادہ معمول مکہ معظمہ میں تھا۔ " وللناس فیما یعشقون مذاہب" اسی طرح حضرت علیہ الرحمۃ کی خدمت میں بھی حاضری کے دوران میں خود حضرت کی پاک و پاکیزہ اعمال و اخلاق کی زندگی کا جیسا کہ صاف و شفاف آئینہ سامنے ہوتا تھا، اس میں اپنی مکروہ صورت پر نظر پڑکر خود اپنے سے نفرت لازم تھی۔

لیکن اپنے معاملہ میں ایک اشکال پیدا ہوگیا۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے حل بھی ذہن میں ڈال دیا۔ دونوں نذرِ ناظرین کے لائق معلوم ہوئے۔

اشکال یہ ہے کہ صاحب فضل و کمال مصنف کے "اعلیٰ درجہ فنا" کے ساتھ اپنے ماضی کی اس ادنیٰ مشابہت کے باوجود حال کا حال یہ ہے کہ جسم کے ظاہری فنا کا وقت بالکل سر پر ہے، مگر نفس کی باطنی منہ زوریاں، کہنا چاہیئے کہ جوں کی توں۔ بس حضرت ہی کی جوتیوں کے صدقہ میں اللہ تعالیٰ کا اتنا ضرور بڑا فضل ہے کہ ایک طرف اُن کے مقتضا پر الحمد للہ زیادہ عمل نہیں ہونے پاتا، دوسری طرف اختیاری ہمت سے عاجز و قاصر دیکھ کر "اضطراری مجاہدات" کی (جن کا ذکر بھی کہیں ذکر آچکا ہے) مار کم و بیش برابر پڑتی رہتی ہے جس سے " پندار کا بُت" اگر ٹوٹتا نہیں تو سرنگوں ضرور رہتا ہے۔ ٹوٹتا نہیں اس لئے کہا کہ موقع پانے پر سر اٹھانے لگتا ہے۔

حل یہ سمجھ میں آیا کہ ایمان و اعتقاد یا ذاتی تجربہ و مشاہدہ کی بنا پر کسی کی علمی و عملی خصوصاً دونوں کی جامع جلالت و عظمت کا سکہ دل پر اگر بیٹھ گیا ہو ــــ وہ بھی ناقابل انکار حد تک ــــ تو اس کے مقابل میں اپنی بے بساطی و بے مائگی پر نظر پڑنا نہیں نہ پڑنا تعجب ہوگا۔ ورنہ فنا و شکستگی کا اصلی کمال تو جب ہے کہ جو چھوٹے ہیں یا چھوٹے خیال کئے جاتے ہیں، اُن کے مقابلہ میں بھی اپنی بڑائی کا نہیں چھوٹائی کا ادراک و استحضار ہو۔ حضرت علیہ الرحمۃ جب کسی کی کچھ اصلاحی تنبیہ و تادیب فرماتے یا کوئی تربیتی مجاہدہ تجویز فرماتے تو بارہا فرماتے سنا کہ الحمد للہ عین اس وقت بھی یہ ادراک و استحضار قائم رہتا ہے۔ اور فرماتے کہ " میں تو ان آنے والوں کو خود اپنے لئے ذریعہ نجات سمجھتا ہوں" شریعت و طریقت کے رمز شناس حضرت مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا قول تو مشہور ہی ہے کہ " مومن، مومن ہی نہیں جبتک اپنے کو کافر فرنگ سے بدتر نہ جانے" وجہ بھی عارفوں کے عارف (رومی) نے بتلادی کہ

> ہیچ کافر را بخواری منگرید
> کہ مسلماں بودنش باشد امید

حضرت کی قبر کو اللہ تعالیٰ انوار سے بھرے اس معاملہ میں بھی کیسے کیسے روشن سبق پڑھا گئے ہیں۔ کسی نے سوال کیا کہ یزید پر لعنت کرنا کیسا ہے؟ قربان ہوجانے والا جواب عطا فرمایا کہ "مرنے کے بعد قبر میں جانئے جب

---

۵۲۷ مولانا مدظلہ کا جو شعر شرح میں پیش کیا گیا ہے اس کے بعد بھی یہ مزید محتاج التشریح ہے۔ (مدیر)

یہ اطمینان ہو جائے کہ ہماری حالت یزید سے اچھی ہے "

اب زبردستی ختم کرتا ہوں کہ پڑھنے والے گھبرا کر نہ کہنے لگیں کہ اتنے وقت میں تو ہم اصل کتاب ہی کچھ الٹ پلٹ کر پڑھ ڈالتے۔ تو اُن سے عرض ہے کہ تبصرہ کے ان اوراق کو زیادہ سے زیادہ

" قیاس کن زگلستان من بہار مرا "

کے درجہ میں جانیں۔ ورنہ پوری کتاب تو جیسا کہ اس کے سرورق پر لکھا ہے، اس میں بالکل مبالغہ نہیں کہ " فقہ و تفسیر، حدیث و سنت، سلوک و کلام، ادب و حکمت، صحافت و سیاست کے صدہا مضامین کا گلدستہ " ہے۔ اور پڑھنے والوں کو صفحہ صفحہ پر کوئی نہ کوئی بڑی قیمتی علمی یا عملی دولت ہاتھ آئے گی۔ اور راقم تبصرہ کی نظر میں چھوڑنے کی تو ایک سطر بھی نہیں۔ ہر رنگ اور ہر مذاق والے کو بہت کچھ اپنے اپنے رنگ و مذاق کا بڑا دلچسپ سرمایہ انشاء اللہ ملے گا۔

انسان کا بڑے سے بڑا شاہکار بھی خطا و نسیان سے پاک کیسے رہ سکتا ہے۔ کتاب تصنیف کی ایک نوکھی صنف اور اپنی نوعیت میں ایسی ہے کہ مضمون وار کوئی بتویب، تقسیم تو ممکن ہی نہ تھی کہ ایک مضمون کی چیزیں کسی ایک ہی عنوان کے سلسلہ میں مل جاتیں۔ ہر قسم کی چیزیں کتاب بھر میں منتشر ہیں۔ اس کے لئے اصل میں ضرورت تو اشاریہ (انڈکس) کی تھی۔ ورنہ بہت مفصل فہرست تو ہونا ہی تھی۔ لیکن مفصل کیا مجمل بھی ندارد! چھ سو صفحوں سے زائد کی ضخیم کتاب کے لئے صرف ایک صفحہ میں ۱۹۲۵ء سے ۱۹۵۲ء تک ہر سنہ کے سامنے مقالہ کے نمبر اور اُن کے سامنے صفحوں کے عدد دیدئے گئے ہیں، جن کا کوئی خاص نفع سمجھ میں نہیں آتا۔

[جناب مولانا عبدالباری ندوی نے کمالِ عقیدت و محبت کے ساتھ یہ تبصرہ جو خود ایک بسیط اور جامع مقالہ ہے تحریر فرمایا ہے! کوئی شک نہیں کہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ "حکیم الامت" تھے اور یہ لقب اُن کو ہر طرح زیب دیتا ہے!

" تزکیۂ نفس " کی اہمیت سے کون بدنصیب انکار کر سکتا ہے، جب تک مردِ مومن کا خود اپنا نفس مجلّٰی اور مزکّٰی نہ ہوگا تو وہ دوسروں کے دلوں کے دھندلے آئینوں کو کیا چمکائے گا ــــ مگر اسلام کی تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن مقدس نفوس کا تزکیۂ نفس فرمایا تھا، انھوں نے عدل و تقویٰ ہی کے جلو میں روم و مداین کے دروازے کھول دئے اور جان کی بازی لگا کر اللہ کے دین کو غالب کیا، " تزکیۂ نفس " اور " عزیمت " کا چولی دامن کا ساتھ ہے، جہاں " عزیمت " نہیں وہاں " تزکیۂ نفس " اور " رہبانیت کی سرحدیں بہت قریب ہو جاتی ہیں! اور جہاں صرف " عزیمت " ہی " عزیمت " ہے اور تزکیہ و تقویٰ نہیں وہاں یہ عزیمت " تیمور لنگی " اور " نادرشاہ درانی " کی جرأت و عزم سے مل جاتی ہے۔

اسلام کی مظلومیت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ کہیں صرف " عزیمت " ہی " عزیمت "

ہے اور کہیں محض "تزکیہ" ہی "تزکیہ" ہے ؛ اسی لئے اللہ کا دین غالب نہیں ہو رہا ہے، پس ضرورت ہے کہ مسلمان "تزکیہ نفس" اور "عزیمت" ——— دونوں طاقتوں ——— کو لیکر اٹھیں اور اللہ کے دین کو غالب کر دیں !

یہ حقیقت ہر لمحہ پیش نظر رہنی چاہئے کہ راتوں کی تنہائیوں کا عبادت گزار نبی اُمی (علیہ التحیات والسلام) فاتح بدر و حنین بھی تھا ! اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا میں ایک ایسی حکومت چھوڑی تھی جہاں منبر و محراب سے لیکر نظم مملکت کے ہر شعبہ میں اللہ کا قانون چلتا تھا ——— (ماہر القادری)]

مولانا ابو الحسن علی میاں ندوی کے خطوط

مولانا مسعود عالم ندوی کے نام!

علی میاں (مولانا ابو الحسن علی حسنی ندوی) کے چند خطوط نذرِ ناظرین ہیں۔ ان میں سے تین خط مکہ مکرمہ اور قاہرہ سے لکھے گئے تھے اور ایک راقم کے نام بغداد بھیجا گیا تھا۔ بہرحال سب کا تعلق "دیارِ عرب" ہی سے ہے۔ ان میں عربی کے ادیبوں اور لکھنے والوں کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کا ادبی ذوق ہے۔ ہم دونوں رہتے تو ہیں ہندوستان اور پاکستان میں، مگر علمی اور ادبی طور پر ہمارا طائرِ فکر قاہرہ اور دمشق میں پرواز کرتا رہتا ہے۔ ہم اردو ادب اور ادیبوں کی نسبت، عربی ادب اور ادیبوں سے زیادہ واقفیت اور دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ چیز اچھی ہے یا بری، یہاں اس سے بحث نہیں، ان خطوط کے پس منظر کے سمجھنے کے لئے اس حقیقت کا جاننا ضروری ہے۔
جی چاہتا تھا کہ مکتوب نگار کے ادبی کمالات اور مجاہدانہ خصوصیتوں کی طرف کچھ اشارہ کروں، مگر غور کرنے پر اس کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ موصوف کے کمالات سے کون واقف نہیں؟ ان کا ذکر کرنا، آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ البتہ کہیں کہیں حاشیے میں بعض ضروری امور کی تشریح کر دی گئی ہے۔

مکتوب نگار نے اپنے اس حقیر اور گنہگار دوست کے متعلق جن الفاظ میں بار بار اظہارِ خیال کیا ہے، اسے ان کی نگاہِ محبت پر محمول کرنا چاہیئے۔ محبت کی نظر خوبیاں ہی خوبیاں دیکھتی ہے۔

(م۔ ع)

---

(۱) ۲۷ گوئن روڈ۔ لکھنؤ ——— ۸ شوال المکرم ۱۳۶۰ھ

میرے نہایت مخلص و مشفق بھائی گل سرسبد احباب و سرمایۂ افتخار دوستان مولانا مسعود عالم صاحب ندوی جعلہ اللہ مبارکاً و مسعوداً اینما حل و نزل ——— السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ، آپ کا محبت نامہ الٰہ آباد[1] سے وسط رمضان مبارک میں پہونچا، پڑھا اور بار بار پڑھا ہر بار لطف تازہ و سرور بے اندازہ ع "تلک وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی"۔ رائے بریلی سے نامہ بری کی ہوا میں پرواز مشکل تھی، لکھنؤ آمد کا انتظار تھا، لکھنؤ آیا تو بخار کی حالت میں، اب بھی نقاہت ہے، کل دو خط دوسرے سے لکھوائے مگر نامہ مسعودی (نامہ دوست) میں اغیار کا دخل گوارا نہ ہوا۔

اول تو ترقی صحت پر مبارکباد، اللہ تعالیٰ دوستوں اور نیازمندوں کے لئے اور اس سے بڑھ کر سیدنا محمد روحی فداہ

---

[1] قیام الٰہ آباد کے کسی دوست کے ملوث خط میں، مکتوب الیہ کے نام کا خط بھی بھیجا گیا تھا۔ اگرچہ اچھی طرح یاد نہیں۔ بہرحال یہ مکتوب اسی خط کے جواب میں ہی وہ لفافے

کے "دینِ مظلوم" اور "اُمتِ مرحوم" کے لئے مبارک فرمائے، اللّٰھم آمین! آپ کا عراق میں ہونا گویا اس ناچیز کا ہونا ہے۔ آپ کے فضائل وکمالات مستزاد دین کی تخم ریزی کے لئے اس کشتِ ویراں میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھئے، حجت تمام کر دیجئے۔ دن رات ایک کر دیجئے، دل کو جلائیے اور بدن کو گھلائیے، خونِ دیدہ اور خونِ جگر بہائیے، اور اس طرح بہائیے، کہ دجلہ وفرات اپنی تنگ ظرفی اور کم مائیگی پر ماتم کریں۔ ایک ایک کا گریبان تھام کر کہئے، کہ "اے صحرائے عرب کے بھٹکے ہوئے آہو، لے عالم کی آبرو، لے براہیمؑ و محمدؐ کی آرزو، تو کہاں گم ہے؟ کیا سیدنا حمزہؓ کی دعائے نیم شبی اور آہِ سحرگاہی، مثنیٰ بن حارثہ کے خونِ شہادت، ابو عُبید ثقفی کی پامردی اور استقلال و شکیبی، سعد بن ابی وقاصؓ کی علمبرداری، علی بن ابی طالب کی جگر سوزی، اشک ریزی اور خطابت و تاثیر کی طوفان خیزی، آبروئے شہیداں، جگر گوشۂ رسولؐ کی تشنگی در خاندانِ رسالت کے خون کی ارزانی، ابو حنیفہؒ کی دماغ سوزی، احمد بن حنبلؒ کی تعزیر جرمِ عشق، ابن جوزیؒ کی حمایت سنت، عبد القادر جیلانیؒ کی دردمندی کا حاصل صرف یہ ہے کہ تو ائمہ ضلالت کا ادنیٰ غاشیہ بردار اور اس کی راہ کا غبار ہے۔ عراق کے اس مقبرہ میں صور پھونک دیجئے اور شورِ قیامت برپا کیجئے کہ ع:

"گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا"

شاید چلتی پھرتی لاشیں پھر زندہ ہو جائیں، آپ کو معلم ابراہیم نے عربی زبان کا ادیب بے بدل اسی دن کے لئے بنایا تھا۔ ندوہ نے اسی دن کے لئے گود میں پالا تھا۔ ہلالی صاحب کو عراق سے اسی لئے بھیجا تھا کہ آپ اس کام کے لئے تیار ہوں۔ راتوں کو رو دیجئے اور دن کو دل کا درد کا غذ پر اتار دیجئے۔ میدان بدر کی طرح ایک طرف اپنی قوت کی پونجی اور عمر کی کمائی قدموں پر رکھ دیجئے۔ دوسری طرف سر خاک پر رکھ کر پیشانی رگڑ کر، فتح و نصرت کی دعا کیجئے کہ وما النصر الا من عند اللہ۔ کیا لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تھا، کیا لکھ گیا:-

بک گیا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ تو سمجھے خدا کرے کوئی

گستاخی اور حد احترام سے تجاوز، معاف کیجئے کہ ع آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے۔

ہلالی صاحب[1] سے آپ نے اس ناچیز کے متعلق جو کلمۂ خیر فرمایا، وہ عین توقع کے مطابق ہے، شنشنۃ اعرفھا من اخزم[2] اور الشیٔ من معدنہ لا یستغرب[3]، اتنا اور فرما دیجئے کہ مشکل سے کوئی رات گزرتی ہوگی، کہ آپ کے لئے دعا نہ کرتا ہوں، آپ کے یاد کرنے کی تقریبیں بھی بڑی مبارک ہیں، فرض نمازوں کے بعد تسبیح فاطمہ اور اذکار ماثورہ جو آپ نے تعلیم کئے تھے، آپکو یاد دلاتے ہیں۔ نماز کو طمانیت و طول کے ساتھ ادا کرنا جو صرف آپ سے سیکھا تھا، آپ کی یادگار ہے۔ صبح جمعہ کو الم سجدہ اور سورۃ الانسان کا پڑھنا جو آپ کو دیکھ کر شروع کیا تھا، آپ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اور عربی لکھتے وقت آپ کا یاد آنا طبعی و قدرتی ہے۔ مکہ معظمہ حاضری ہوئی تو شیخ محمود شویل[4] کے مکان پر والدہ صاحبہ اور اہلیہ و ہمشیرہ کو سیدہ صفیہ بنت الشیخ تقی الدین کو دیکھنے اور ان سے ملنے کے لئے خاص طور پر بھیجا تھا۔ میں شیخ کی خدمت میں عریضہ لکھتا، لیکن ایک تو مرض کی نقاہت ہے، دوسرے استاذ کو خط لکھتے ہوئے ہچکچاہٹ اور اپنی غلطیوں کا ڈر لگتا ہے۔ پھر بھی ان شاء اللہ کسی موقع پر لکھوں۔ اتنا مضمون اُن کو عربی میں سنا دیجئے۔

---

[1] مکتوب الیہ اور کاتب دونوں کے استاذ ڈاکٹر شیخ محمد تقی الدین ہلالی مراکشی (سابق استاذ ادب عربی دار العلوم ندوہ (حال مقیم بغداد) استاذ محترم نے علی میاں کے خط نہ لکھنے کی شکایت کی تھی۔ [2] عربی کی ایک کہاوت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ "تم سے یہی توقع تھی"

[3] یہ بھی عربی محاورہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حسنِ سلوک خلافِ توقع نہیں۔

[4] حجاز کے مشہور عالم۔ ہندوستان بارہا آ چکے ہیں۔ ہلالی صاحب سے رشتۂ مصاہرت ہے۔

سیرت شہید[1] کے لئے آپ کے شوقیہ کلمات برادرم منظفر[2] نے لکھ کر بھیجے ہیں۔ کل ڈاک کے محاصل معلوم کئے ہیں، انشاء اللہ سیرت کا ایک نسخہ، الفرقان کا حج نمبر، جو خاص چیز ہے، "من الجاهلية الى الاسلام" اور "الى ممثلي البلاد الاسلامية" کے دو دو نسخے ایک آپ کے لئے اور ایک شیخ کے لئے بھیجوں گا۔ اگر یک دفعہ جانا مشکل ہوا تو شاید دو مرتبہ کرکے بھیجوں گا، انتظار فرمائیے۔

ان دونوں عربی رسالوں کے، جو بغرض اشاعت ہیں، یعنی "من الجاہلیہ" الخ اور ایک نیا رسالہ "معقل الانسانية" جو جلد انشاء اللہ چھپ کر آنے والا ہے اور جس میں خطاب عربوں ہی کو ہے، آپ کو معتدبہ تعداد میں بھیجوں گا تاکہ عراق کے اعیان اور اہل فکر کو آپ پیش کردیں، امید ہے کہ ان رسالوں میں آپ کی ترجمانی ہوگی اور آپ ان سے اپنا کام لے سکیں گے۔

شرف الدین[3] صاحب سے متعلق جو خدمت آپ نے سپرد کی ہے، وہ بڑی مشکل ہے، اس لئے کہ بمبئی گئے بغیر اس کی سربراہی مشکل ہے، مولوی عبدالسلام صاحب سے بھی تذکرہ آیا تھا وہ بھی ناامید سے ہیں، پھر بھی انشاء اللہ کوشش ہوگی اور اس کے نتیجے سے مطلع کیا جائے گا ان کا کاروبار تقسیم ہوگیا ہے۔ شیخ عبدالحکیم بن شرف الدین بڑے سنجیدہ اور معقول آدمی ہیں، آں کو شیخ خود لکھیں تو شاید مؤثر ہو،

مولوی عبدالسلام[4] صاحب اس وقت دوران خط میں آگئے، خط سنا اور شرف الدین والے معاملہ میں حصہ لیا، سلام کہتے ہیں، بھائی صاحب[5] اور مولانا منظور صاحب کا بھی سلام قبول فرمائیے، اچھا اب رخصت، خط کا جواب ضرور اور جلد دیجئے۔ عزیزی عاصم الکوثری کو محبت بھرا سلام، وہ خط لکھنے میں اسی طرح مدد کریں۔ والسلام

آپ کا علی،

---

(۲) مکہ معظمہ۔ رباط بھوپال —— ۱۹ ربیع الاول ۱۳۸۳ھ

برادر محترم و محب اکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ سے اپنی اس تقصیر کی مخلصانہ معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو اس وقت تک ایک خط بھی نہ لکھ سکا۔ حالانکہ اس وقت تک متعدد خطوط لکھنے چاہئے تھے۔ پھر جب کہ آپ نے ازراہ محبت یاد بھی فرمایا تھا، لیکن کچھ اس قدر انتشار اور کاموں کا عجیب ہجوم اور تنوع ہے کہ رائے بریلی[6] صرف خیریت کا خط بھیجا، بعض اوقات مہینہ مہینہ بھر لکھنے کی نوبت نہیں آتی، حالانکہ والدہ صاحبہ سخت پریشان ہوتی ہیں۔ آپ کو تو اطمینان و تفصیل کا خط لکھنا چاہتا تھا لیکن مجال بھی میسر نہ آیا، اس وقت بھی اتنا وقت ملا ہے کہ جانے آنے والی ہے ایک مہمان کا انتظار ہے، میں یہ خط لے کر بیٹھ گیا ضروری حالات تو معلوم ہو ہی گئے ہوں گے۔ اور ان میں کوئی غیر معمولی بات بھی نہیں، البتہ اس مرتبہ یہاں کے ادبی حلقوں میں بہت گھسنے کا موقع ملا، اور ان کو بہت قریب سے دیکھا، ان حضرات نے بھی استحقاق و اہلیت سے بہت بڑھ کر پذیرائی کی اور توقعات قائم کیں، بلکہ بعض احباب نے وکالت و اشاعت و تعارف اس حد تک شروع کردیا کہ بعض اوقات شرمندگی بھی ہوئی اور کوفت بھی اور بعض مرتبہ برأت بھی ظاہر کرنی پڑی۔ الاذاعة العربية السعودية پر تین بار تقریر کرنے کی نوبت آئی۔

---

[1] سیرت سید احمد شہیدؒ جس کے تیسرے ایڈیشن کی پہلی جلد ان دنوں تازہ تازہ چھپی تھی۔ [2] سید منظفر حسین شاہ ندوی کشمیری ناظم دینیات حکومت آزاد کشمیر۔ [3] شرف الدین داولاده —— تاجران کتب عربیہ، بمبئی —— ان کے ہاں ہلالی صاحب کی کتابیں امانت تھیں۔ [4] مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی۔ [5] جناب ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء [6] مکتوب نگار کا وطن مالوف۔

پہلی مرتبہ "من العالم الی جزیرۃ العرب" گویا عالم انسانیت کا استغاثہ جزیرۃ العرب کے نام، دوسری مرتبہ اس کا جواب "من الجزیرۃ الی العالم" گویا جواب دعویٰ، پہلے کا ایک نسخہ جو "المجم" میں چھپا ہے، آپ کی دلچسپی و مسرت کے لئے بھیج رہا ہوں، اس لئے کہ حقیقتاً یہ ہم سب کے جذبات و خیالات کی ترجمانی ہے اور آپ ہم ایک دوسرے کے کانوں میں کہہ رہے ہیں۔ رات تقریباً ۹۰ منٹ کی ایک تقریر ہفتہ سیرت کے سلسلہ میں نشر ہوئی جس کا عنوان ہے حلول محمد صلی اللہ علیہ وسلم للمشاکل الفردیۃ والاجتماعیۃ" ایک تقریر یادداں کے پاس ہے، جو شاید عنقریب مسجل ہو" النبویات فی شعر الدکتور محمد اقبال" یہاں کے کلیات و معاہد میں بھی جانا ہوا، اور تعلیمی حلقوں سے اچھا ربط پیدا ہو، کوشش یہ رہی کہ دین کی وقعت ان نئے حلقوں میں پیدا ہو اور اس کی طرف سے بلند تصور قائم ہو، اور حقیقت ان پر منکشف ہو کہ،

محمد عربی کا بروئے ہر دو سراست ۔۔۔ کسے کہ خاک درش نیست، خاک بر سرِ او

اس ابتدائی کام کی ابھی یہاں اچھی خاصی ضرورت ہے، الحمد للہ کہ یہ کوشش لاحاصل نہیں رہی اور خاصے ممتاز تعلیم یافتہ نوجوان یہ سمجھنے لگے کہ دین ایک قصہ ماضی نہیں ہے بلکہ ایک ابدی پیغام اور زندگی کا نظام ہے، اس مرحلہ پر مولانا کی کتابوں کے ترجمہ خصوصاً "تنقیحات" کے ترجمہ کی سخت ضرورت ہے۔ جبعی طور پر مختلف موقعوں پر مولانا کی کتابوں، جماعت اسلامی اور آپ کا نام آتا رہا۔ تعلیم پر مقالات کا ایک سلسلہ "البلاد السعودیۃ" میں شائع ہونے والا ہے، جس میں ایک اسلامی ملک میں تعلیم کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں جماعت اسلامی کی کوششوں کا صراحۃً ذکر ہے۔

آپ کو بہت سے احباب پوچھتے ہیں۔ ایک نوجوان ماجد السعد مدنی[1] کا خط بھی اس کے ساتھ بھیج رہا ہوں "المجم" کے تازہ نمبر میں "من رسالۃ الامراء" کے ایک استاد احمد علی[2] نے "دیار عرب میں" کی تلخیص کی ہے اور شخصیات کے متعلق آپ کے تأثرات اور کچھ مختصر سی روداد آپ کے سفر کی پیش کی ہے، یہ پرچہ بھی آپ کو پہونچے گا، افسوس ہے کہ یہاں کے حالات کے پیش نظر انھوں نے سفرنامہ کے تمام جاندار حصّے حذف کر دیئے ہیں۔ شیخ عبد اللہ المزروع[3] آپ کو خاص طور پر پوچھتے ہیں۔ "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین؟"[4] کا ایک نسخہ آپ کو لکھنؤ سے پہونچا ہوگا۔ میں نے تاکید لکھدی تھی۔ اگر نہ پہونچا ہو، تو بلا تکلف اپنے شاگرد خورد محمد ثانی[5] کو مکتبۂ السلام ۲۷ گوئن روڈ لکھنؤ کے پتہ پر (لکھ کر) تاکیداً منگوا لیجئے۔ مقدمہ سے بڑی مایوسی ہوئی۔ خواہ مخواہ ایک مصری ادیب و عالم کو اس کی زحمت دی کہ ایسی کتاب پر مقدمہ لکھیں جس کے موضوع سے شاید ان کو زیادہ ہمدردی نہیں۔ کاش کہ اپنے کسی ہندستانی بزرگ یا دوست سے لکھوایا ہوتا یا بغیر مقدمہ کے کتاب شائع ہوتی۔ البتہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض ادباء کتاب کی طرف سے استفسار کر رہے ہیں، "الثقافۃ" کے ایک تازہ پرچہ میں "الاستاذ شکری فیصل" کا بڑا مبسوط اور منصفانہ

---

[1] یہ اصل میں حیدرآباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ غالباً ان کے والد ماجد ہی نے حجاز کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ حجاز کے اچھے ادیبوں میں ان کا شمار ہے، اردو اور انگریزی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ [2] ایک روشناس نجدی ادیب۔ بعضوں کا خیال ہے کہ وہ "کار خاص" پر مامور ہیں۔ [3] مکتوب نگار کی عربی تصنیف، جس کے دوسرے ایڈیشن پر اداریہ میں تبصرہ نکل چکا ہے (ستمبر ۱۹۵۱ء) [4] عزیزی محمد ثانی ندوی سلمہٗ (خواہرزادہ مکتوب نگار)
[5] احمد امین، مصر جدید کے مشہور مصنف ہیں، لیکن ان کے ذہن و دماغ میں کجی شروع سے موجود ہے اور بڑھاپے میں بھی باقی ہے۔ مکتوب نگار سے راقم کو ان کے باب میں ہمیشہ اختلاف رہا۔ اس کتاب کے مقدمہ میں وہ کھل گئے۔ لیکن مصر کی جدید دینی بیداری کی وجہ سے ان کی یہ "زیادتی" پسند نہیں کی گئی اور مصنف کی طرف سے کئی روشناس ادیبوں نے احمد امین کی خبر لی۔

مضمون شائع ہوا ہے، جس میں کتاب اور اس کے موضوع کی عزت سے مدافعت کا حق ادا کیا ہے اور اس سے اختلاف کیا ہے کہ کتاب کی عبارت میں کہیں غموض ہے۔ جس غموض کی طرف احمد آمین صاحب نے اشارہ کیا ہے وہ مطبعی اغلاط کی وجہ سے ہے۔ مطبعی اغلاط بڑے فاحش ہیں اور واقعی ان کے ساتھ کتاب کا سمجھنا کہیں کہیں مشکل ہے۔

آج کل ہمارے مظفر شاہ کہاں ہیں؟ جہاں کہیں ہوں اُن کو یہ خط دکھا دیجئے کہ وہ یہاں فراموش نہیں رہے۔ ان کی طرف سے طواف کی بھی سعادت حاصل ہوئی۔ ان کا خط انشاء اللہ ساتھ رہے گا۔ اگر ان کی مطلوبہ کتابیں مصر میں مل گئیں تو لے لوں گا۔ ان کو بہت بہت محبت بھرا اسلام۔

پرسوں ترسوں غالباً (انشاء اللہ) مصر کو روانگی ہوگی۔ رات جہاز کی اطلاع ملی، اگر فوراً تیاری ہو سکی تو انشاء اللہ اسی سے روانگی ہو جائے گی، مصر مہینہ بھر سے زیادہ قیام کا ارادہ ہے، اگر موقع ملا تو انشاء اللہ وہاں سے بھی ایک خط لکھیں گے۔ اس خط کا جواب ذیل کے پتہ پر عنایت فرمائیے:-

ابو الحسن علی الحسنی الندوی، بواسطة الدكتور احمد امين بك۔
الادارة الثقافية للجامعة العربية - الجيزة - مصر۔

اس وقت اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں، جواب کے وجوب کے لئے اتنا ہی کافی ہے، عاصم صاحب سلام قبول کریں۔

ابو الحسن علی

رباط بھوپال۔ مکہ معظمہ

---

(۳) از قاہرہ —— ۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۰ھ

برادر گرامی قدر زید لطفہٗ —— السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ — اُمید ہے کہ مزاج بعافیت ہوگا، ۱۲ر ربیع الثانی کو قاہرہ پہونچا ہوا، مکہ معظمہ سے روانگی میں برابر تاخیر ہوتی گئی، یہاں تک کہ اندازہ اور ارادہ سے ایک مہینہ سفر مؤخر ہو گیا، لیکن اس تاخیر میں بھی حکمت تھی، یہ آخر دن بڑے مفید و کار آمد ثابت ہوئے۔ ۱۵ر کو سوئس پہونچے اور اسیوقت وہاں سے کار پر قاہرہ آئے۔ قاہرہ سوئس سے ۱۲۰ کیلو میٹر ہے۔ تین گھنٹے میں پہونچنا ہوا، مجلس الشیوخ کے ایک رکن (جو مصر کے بڑے تاجر اور سربرآوردہ شخص ہیں) شیخ جلال بے حسین کو اطلاع کر دی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ سب مراحل بآسانی طے ہو گئے، جو مسافروں کو درپیش آتے ہیں۔ تین چار دن اُن کے اصرار سے ایک ہوٹل میں ٹھہرنا ہوا۔ اس کے بعد ان کے توسط سے شارع موسیٰ میں ایک کمرہ لے لیا ہے، جہاں اسوقت تک قیام ہے۔

اگلے دن سے ان ممتاز شخصیتوں سے ملاقات کا سلسلہ شروع ہو گیا، جن کا نام ہندستان سے سنتے تھے، حسب ذیل حضرات سے ابتدائی دنوں میں ملنا ہوا:- ڈاکٹر احمد امین بے[1]، شیخ عبد المجید سلیم شیخ الازہر، احمد محمد شاکر، محمد حمد الغمراوی، محمد علی لطاہر صاحب الشوری، محب الدین الخطیب، محمد زاہد الکوثری، صالح حرب باشا رئیس جمعیات الشبان المسلمین، محمد علی علوبہ باشا، صالح اعشماوی، حسین یوسف، اسد حسنی رئیس تحریر العالم العربی، علی غایاتی صاحب منبر الشرق، شیخ احمد عبد الرحمان البنا والد

---

[1] پچھلے دنوں وفات پا گئے۔

شیخ حسن البناء، شیخ عبدالرحمان البناء شقیق[1] الشیخ حسن، احمد شقیری مساعد امین عام الجامعۃ العربیہ، عبداللہ العمری وزیر یمن، سید خضر حسین[2] رئیس الہدایۃ الاسلامیہ، استاذ فرید[3] وجدی منشی مجلۃ الازہر، شیخ محمد غزالی صاحب[4] "من ہٰذا علّمنا الاسلام" "والمناہج الاشتراکیۃ" وغیرہ، یہ بے جوڑ فہرست اس لئے لکھدی تاکہ ملاقاتوں کا تنوع اور روداد کا خلاصہ آجائے، اکثر ناموں سے آپ کو دلچسپی ہوگی،

اس عرصہ میں زیادہ تر اخوان سے ملنا ہوا۔ اور وہی در اصل یہاں کی صالح و فعال جماعت ہے، جس سے کچھ امید ہوتی ہے۔ سعید رمضان سے بھی ملاقات ہوئی، آپ کا تذکرہ رہا، لیکن وہ کچھ اجنبیت اور کچھ ہماری ہندستانی نسبت کی وجہ سے (جو اکثر حجاب بن جاتی ہے) زیادہ کھلے نہیں۔ پھر بھی ہم ان کی صلاحیتوں اور شخصیت سے متاثر ہوئے۔ الاخوان میں چند اونچی شخصیتیں بھی ہیں۔ ان میں سے بعض سے ملنا ہوا اور بعض سے باقی ہے۔ یہاں کے اخوان پر استاذ البہی[5] الخولی اور استاذ عبدالعزیز کامل کا ذہنی و اخلاقی اثر زیادہ ہے۔ عبدالحکیم عابدین صاحب سے بھی ابھی ملنا نہیں ہوا، بعض بڑے ذہین اور محبوب صفات کے آدمیوں سے ملنا ہوا، اور اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ شیخ حسن البنا مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے بڑی دل آویز اور ہمہ گیر شخصیت عطا فرمائی تھی اور ان کے مقناطیس نے بہت آہن پاروں کو کھینچ لیا تھا، اخوان صلاحیتوں اور اشخاص کا ایک اچھا ذخیرہ ہے۔ لیکن اسوقت وہ عالم تحیر میں ہیں[6]، غالباً شیخ بنا مرحوم کے بعد کوئی طاقتور قائد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قیمتی ذخیرہ کو تلف اور ضائع ہونے سے بچائے، عالم عربی اور شرق اوسط کو اس اخلاقی ابتری اور روحی افلاس کی حالت میں اسی جماعت سے آس لگی ہوئی ہے۔

محب الدین الخطیب سے خوب ملنا ہوا ملتے ہی آپ کا تذکرہ کیا اور پوچھتے رہے۔ پھر خود ہی کہا کہ ان کی کتاب[8] ایسے مرحلہ پر ہے کہ اگر وہ اس کو مناسب طریقہ پر ختم کر دیں تو اس کی اشاعت ہو سکتی ہے۔ پھر ان مجبوریوں کا تذکرہ کیا، جن میں اس کتاب کو چھوڑنا پڑا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر اس کا خاتمہ لکھدیں، تو ایک کام کی چیز باہر نکل آئے گی، اگرچہ حالات بدل چکے ہیں اور کتاب ناقص رہے گی، مگر بجائے خود وہ ایک تاریخ ہوگی۔ محب الدین الخطیب سے ملکر طبیعت خوش ہوئی، مصر کی اس مادی دنیا میں وہ بہت غنیمت ہیں۔ اخوان کے ہمدرد

---

[1] "شقیق" عربی میں سگے بھائی کو کہتے ہیں۔ [2] شیخ خضر حسین تونسی، موجودہ شیخ الازہر۔ [3] مصر کے پرانے اور بوڑھے مصنف اور اہل قلم [4] محمد غزالی کی ان کتابوں پر ترجمان القرآن میں تبصرہ نکل چکا ہے (ذی القعدہ وذی الحجہ ۱۳۷۰ھ) [5] البہی الخولی کی کتاب تذکرۃ الدعاۃ پر ترجمان القرآن میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے (رمضان وشوال ۱۳۷۱ھ) [6] یہ اخوان کے موجودہ مرشد عام اور ہوشمند قائد جناب حسن اسماعیل الہضیبی کے انتخاب سے پہلے کا ذکر ہے۔ [7] محب الدین خطیب، مشہور عالم، مفکر اور صاحب قلم ہیں۔ کوئی بیس برس مشہور ہفتہ وار اخبار "الفتح" نکالتے رہے اور اس کے حلقے میں نوجوانوں کی بڑی تعداد تربیت پاکر نکلی۔ مصطفےٰ حسنی السباعی (دمشق)۔ عمر بہاء الامیری (حلب)۔ عبدالغفار مدکر (انڈونیسیا)۔ محمد مکین (چین)۔ محمد النجمی مرحوم (مصر) نے الفتح ہی کے صفحات میں قلم پکڑنا سیکھا۔ خود حسن البنا مرحوم بھی الفتح اور اس کے ایڈیٹر کے خوشہ چیں رہے ہیں۔ یہ حقیر بھی الفتح ہی کی حوصلہ افزائی کی بدولت ٹوٹی پھوٹی عربی لکھنے لگا اور مسلسل اس میں لکھتا رہا۔ انھیں دنوں میں عاجز نے ایڈیٹر الفتح کی فرمائش پر اسلامی ہند کی تاریخ (حاضر مسلمی الہند وغابرہم) کے نام سے لکھی تھی، جس کی طباعت مکمل نہ ہو سکی۔ اور اس باب میں عاجز کو الخطیب سے دوستانہ شکایت بھی تھی۔ اور الحمد للہ کہ وہ شکایت اب دور ہو رہی ہے اور یہ طے پا گیا ہے کہ مناسب اضافہ اور تکمیل کے بعد کتاب شائع کر دی جائے امید ہے کہ اب زیادہ تاخیر نہ ہوگی۔ (م۔ ع)

ہیں، مادیت اور ضمیر فروشی سے بے زار، الگ تھلگ زندگی گزارتے ہیں، بڑا سفر کرکے جانا پڑا، جزیرۂ اروضہ میں قیام ہے، رہبر نے جو ایک عالم ہیں، کہا کہ الاستاذ محب الدین یسکن فی آخر الدنیا، فمن یأتیہ ؟ ہم نے کہا کہ لا یأتیہ الا محب، یہاں کے ادباء کا ذکر آیا، سخت تنقید کی - کہنے لگے کہ وہ صرف ایکٹر ہیں - ایکٹر کا کمال یہ ہے کہ ہر طرح کا پارٹ انجام دے سکے، اگر بادشاہ کا پارٹ انجام دینا ہو تو پورا بادشاہ معلوم ہو، اور اگر فقیر کا، تو اچھا خاصا فقیر نظر آئے - اسی طرح یہ ادباء اگر فلسفۂ قرآن پر لکھنا پڑے، تو قرآن کے رمز شناس نظر آئیں، اور اگر سیرت رسولؐ پر، تو مقام رسالت کے مرتبہ شناس، لیکن اسی روانی اور قابلیت کے ساتھ ایک دنیا دار بادشاہ یا لیڈر کی سوانح بھی لکھ دیں گے - پھر ایک بڑے ادیب کا ذکر کیا، جن کے قلم سے بعض اسلامی موضوعات پر کتابیں نکل کر مقبول ہو چکی ہیں، کہ ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ اگر (معاذ اللہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصر میں "اسلامی نظام" کی تنقید کے لئے تشریف لے آئیں تو سب سے پہلے میں مقابلہ کے لئے نکلوں گا" نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔"

محمد علی[۱] الطاہر بھی آپ کو بہت پوچھتے تھے، کہتے تھے کہ شرقِ اوسط کی سیاحت کے لئے نہیں آئے ؟ آج کل اُن کے یہاں اہلِ سیاست اور اہلِ وجاہت کا دربار لگا رہتا ہے۔ جب سے انھوں نے گزشتہ وزارت (سعدی) اور بالخصوص ابراہیم عبدالہادی پاشا کے مظالم کے خلاف اپنی جیل کی داستان "معتقل ھیکستیپ[۲]" لکھی ہے، اسوقت سے وہ مرجع خلائق بنے ہوئے ہیں - اس کتاب میں انھوں نے بہت کم لوگوں کو معاف کیا ہے، عبدالرحمان عزام پاشا، مفتی آمین الحسینی سب کی خبر لے ڈالی ہے - اور سب کے نامۂ اعمال چھاپ دیئے ہیں - ہم نے اُن سے کہا کہ اب رجال حدیث کے نقد و جرح کا دور تو ختم ہوا، یہ سیاست کا دور ہے، اس لئے آپ نے اسماء الرجال کی نئی کتاب لکھی ہے - اور اس میں پوری طرح رجال سیاست کی جرح و تنقید کا فرض انجام دیا ہے - اپنی کتاب "ذکریٰ الامیر شکیب ارسلان" جو بڑی ضخیم کتاب ہے، نیز بعض اور تالیفات ہدیہ کیں۔

آپ کا خط آنے کے تیسرے روز احمد امین صاحب سے ۱۷ ربیع الثانی کو ملا - لکھا ہو، تو وعدہ کا ہوگا، لیکن ہم کو مصر آنے پر ملا - جواب میں غیر معمولی تاخیر ہوئی - اکثر صبح ناشتہ کرکے نکلنا ہوتا ہے اور عموماً دیر رات کو یا عشاء کے بعد واپسی ہوتی ہے۔ اس لئے خطوط کا سلسلہ یہاں ٹوٹ سا گیا۔

احمد امین صاحب نے اپنے مقدمہ سے بڑھ کر اکرام کیا، شاندار دعوت "حدیقۃ الحیوانات" کے "جزیرہ الشای" میں کی، جو مصر کے شوقینوں کی تفریح گاہ ہے۔ "العقد الفرید" کی سب جلدیں، جو اُن کی تصحیح سے شائع ہوئی ہے، نیز "حیاتی" کا ایک نسخہ اور ایک قیمتی فاؤنٹن پن یادگار کے طور پر ہدیہ کیا جس سے یہ خط لکھا جا رہا ہے۔ صاحب، خلاق اور شریف آدمی ہیں؛ باقی جوش سے خالی اور زندگی کے آخری دور میں ہیں، اس لئے پرجوش مقدمہ لکھنے کی توقع فضول تھی،

آج "احمد حسن الزیات" سے ملاقات کا وقت مقرر ہے۔ ان شاء اللہ طہٰ حسین، عباس محمود العقاد اور دوسرے ادباء سے بھی ملنا ہے۔ جامعہ فواد، دارالعلوم بھی دیکھنا ہے۔

"اسمعی یا مصر[۳]!" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے، جو تحیہ، عتاب، نقد اور توجیہ سب کچھ ہے ان شاء اللہ آپ کی نظر

---

[۱] محمد علی الطاہر اور ان کی بعض کتابوں کا سیر حاصل تذکرہ ترجمان القرآن میں آچکا ہے (رمضان و شوال ۶۸ھ) راقم سے ان کے غائبانہ مراسم تھے۔ امیر شکیب ارسلان مرحوم کی محبت و عقیدت نے ہم دونوں کو قریب کر دیا تھا۔

[۲][۳] ملاحظہ ہو:- ترجمان القرآن (رمضان و شوال ۶۸ھ)

سے گزرے گا۔ "ماذ خسر العالم" اُمید ہے کہ آپ کو پہونچ گئی ہوگی۔ عبد اللہ العقیل عراقی[1] سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ اخون سے ملنے میں اکثر وہی واسطہ ہوئے، سلجھے ہوئے متین و ذہین نوجوان ہیں۔ انھیں سے معلوم ہوا تھا کہ آپ "المؤتمر الاسلامی" میں شرکت کے لئے کراچی گئے تھے۔ اُمید ہے کہ اب واپسی ہو گئی ہوگی، جواب کا انتظار رہے گا۔

عاصم صاحب ہماری طرف سے اور مولوی معین اللہ صاحب و مولوی عبد الرشید صاحب کی طرف سے سلام قبول فرمائیں۔

تازہ رقم: اس خط کے لکھنے کے بعد احمد حسن الزیات صاحب سے ملاقات ہوئی، آپ کو پوچھتے تھے۔ ابھی تک جو لوگ اد بار میں سے ملے ہیں ان سب سے زیادہ خوش اخلاق، اور کریم ثابت ہوئے، بہت ہی بشاشت سے ملے اور ہم چاروں ساتھیوں کو ایک ایک نسخہ تاریخ الآدب العربی کا اور تین تین حصے وحی الرسالۃ[2] کے ہدیہ کئے،

آپ کا:- علی

---

(۴) از قاہرہ ——— ۱۰ رشعبان المعظم ۱۳۷۰ھ

برادر محترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ! عنایت نامہ مورخہ ۱۰ رجب اسوقت سامنے ہے۔ تقریباً ایک مہینہ کے بعد جواب دینے کی توفیق ہو رہی ہے۔ کچھ مشغولیت، نقل و حرکت کی کثرت اور زیادہ تر کسل مندی اس تاخیر کی ذمہ دار ہے اور ہر حال میں عفو کی امید ہے۔

تقریباً ایک مہینہ ہی ہوتا ہوگا کہ دار الفتح سے آپ کے سلسلہ مضامین (انتشار الاسلام فی الہند)[3] کے چھپے ہوئے اجزاء لیکر ہوائی ڈاک سے آپ کو بھیج چکا ہوں، خیال تھا کہ اس کے ساتھ ہی آپ کو خط لکھوں گا، کہ یہاں تک آپ کی کتاب چھپی ہوئی موجود ہے۔ اگر آپ اس کو مکمل کر کے بھیجدیں تو خطیب صاحب تکمیل کے لئے تیار ہیں۔ اس کی رسید نہیں آئی، خدا کرے آپ کو وہ وراق مل گئے ہوں، بھیجنے سے پہلے میں نے اس کو پڑھ دیا تھا۔ معلوم ہوا کہ ابھی بہت بڑا حصہ باقی ہے، اس لئے کہ مجھے خوب یاد ہے کہ آپ نے تمام اسلامی تحریکات اور ادارں پر تبصرہ کیا تھا اور آخیر دور تک پہونچ گئے تھے معلوم نہیں آپ نے وہ مسودہ[4] بھیجا نہیں یا یہاں گاؤ خورد ہوگیا، بہرحال ایسی کتاب کی سخت ضرورت ہے، اور آپ سے زیادہ کسی کے لئے یہ موضوع آسان نہیں۔ اس لئے اسکو مکمل کر ہی دیجئے۔

ابھی شاید ایک ہفتہ ہوا، آپ کے نام تازہ رسالہ "الدعوۃ الاسلامیۃ وتطوراتہا فی الہند" کے دو تین نسخے بحری ڈاک سے بھیجے گئے ہیں۔ یہ درحقیقت وہ مضمون ہے، جو میں نے جمعیۃ الشبان المسلمین کے حفلۂ تکریم[5] میں پڑھا تھا۔ اس میں ہندستان کی تجدید و احیائے دین کی مختلف کوششوں کا مختصر تعارف آگیا ہے، ایک نسخہ سید صاحب[6] مدظلہٗ اور ایک مولوی ناظم صاحب[7] کے لئے

---

[1] ہمارے بصری نوجوان دوست، جن کے ذکر سے دیار عرب میں کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔ [2] وحی الرسالۃ، الزیات کے ان مقالات و تاثرات کا مجموعہ ہے، جو وہ ہفتہ وار الرسالۃ کے افتتاحیہ کے طور پر لکھتے ہیں۔ الزیات، اسوقت مصر کے سب سے بڑے انشا پرداز ہیں اور اسلام کی طرف مائل۔ [3] یہ اسی کتاب (حاضر مسلمی الہند وغابرہم) کے ابتدائی ابواب کا ذکر ہے۔ [4] مسودہ بھیجا تھا، غالباً وہاں گاؤ خورد ہوگیا۔ حسن اتفاق سے نقل محفوظ تھی جسے دوبارہ بھیجا جارہا ہے۔ [5] الشبان المسلمون والوں نے مکتوب نگار کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا تھا۔ [6] استاذ محترم جناب مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہٗ۔ [7] مولانا محمد ناظم ندوی (شیخ الجامعہ عباسیہ، بہاولپور)

بھی آپ ہی کی ڈاک میں بھیجدیا ہے۔ چند رسائل علیحدہ سے مودودی صاحب کے نام بھیجدیے ہیں۔

آج انشاء اللہ ایک نئی کتاب جو آپ کی دلچسپی کی ہوگی، ارسال خدمت کی جائے گی۔ یہ ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو یہاں کلیۃ دار العلوم اور کلیۃ الادب میں علامہ اقبال مرحوم اور ان کے پیغام کے متعلق کی گئیں۔ ۱۴۱ صفحہ کی چھوٹی سی کتاب ہے، مگر بعض اہم اور مفید معلومات آگئے ہیں، شاید یہاں اقبال کا کچھ مؤثر تعارف ہو، اور اس ارادہ کی تکمیل جو ان کے انتقال پر ہم نے اور آپ نے کی تھی۔ لیکن آپ زیادہ اہم کاموں میں مشغول ہوگئے اور الحمد للہ اصل دین کی خدمت میں مشغول ہیں، زادکم اللہ توفیقاً و اکرم۔ ہمارے ذہن کے انتشار اور ذوق کے تنوع کا حال وہی ہے ؎

"مزاج تو از حال طفلی نہ گشت"

مفتی امین الحسینی صاحب سے خاصی طویل و مفصل ملاقاتیں رہیں۔ آپ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرتے تھے۔ ان کو دار العلوم کی زیارت یاد ہے[1]۔ بڑے حاضر دماغ اور بیدار مغز اور وسیع الاخلاق آدمی ہیں، پرسوں محمد علی علوبہ[2] پاشا کو بھی انھوں نے لکھنؤ کا سفر اور دار العلوم کی حاضری یاد دلائی اور ان کو یاد آئی۔ مفتی صاحب سے عالم عربی اور فلسطین کے سلسلہ کے بعض بڑے تلخ حقائق و واقعات معلوم ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ شرق اوسط کا بُرا حال ہے۔ لبظاہر اخوان کے سوا کوئی امید کی شعاع نظر نہیں آتی۔

سعید رمضان اس مرتبہ بڑی گرم جوشی اور محبت سے ملے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان سے خصوصی تعارف کرادیا۔ پہلا سا حجاب نہیں تھا۔ آج کل تو وہ مغرب اقصیٰ کی سیر کر رہے ہیں، واپسی پر ملاقات ہوگی۔

اس عرصہ میں اخوان کے ذمہ داروں سے بڑی ملاقاتیں اور تبادلہ رہا، اور ان کی تحریک کا مطالعہ کرنے کا بڑا موقع ملا، انھوں نے بھی پورے اعتماد و خلوص کا اظہار کیا اور تفصیلات سنائیں۔ شیخ حسن البناء کی عقیدت میں بڑا اضافہ ہوا۔ حقیقتاً وہ ایک موہوب آدمی تھے، جن کو اللہ تعالیٰ نے اس گرتے ہوئے عالم عربی کو تھامنے کے لئے تیار کیا تھا، اور بڑی جامعیت عطا فرمائی تھی۔ ہر شخص کو ان کی محبت میں سرشار پایا، غیر متعلق بلکہ ناقد اشخاص کو بھی ان کی عبقریت و اخلاص کا معترف پایا۔ ڈاکٹر احمد امین اختلاف ذوق کے باوجود بڑے مداح ہیں۔ ہر طبقہ کا حال یہی ہے، سوائے شدید سعدیوں[3] کے۔ ہندستان کی دینی جماعتوں کو ضرور ان کے حالات اور اس تحریک کا مطالعہ کرنا چاہیئے، جیسا کہ اس حصہ کے دینی کام کرنے والوں کو ہندستان کی دینی تحریکات کا مطالعہ ضروری ہے۔

آپ کی تقلید میں روزنامچہ لکھتا رہا ہوں، صرف اس ترمیم کے ساتھ کہ عربی میں، تاکہ مشق ہو اور شاید ان ملکوں میں کام آئے۔ ایک ضخیم کتاب تیار ہوگئی ہے، ہر طبقہ کے لوگوں سے ملنا ہوا اور بے لاگ تبصرہ آگیا، ادباء مشہورین میں سے صرف عقاد[4] اور

---

[1] مفتی صاحب مدظلہ ۱۹۳۸ء میں ہندستان تشریف لائے تھے، تو لکھنؤ (ندوہ) میں ہم غریبوں نے ان کا خیر مقدم کیا تھا اور خوب ملاقاتیں رہی تھیں۔ یہ ان کی شرافت ہے، کہ اب تک اُسے نہیں بھولے۔ مکہ مکرمہ میں حقیر کا نام سنتے ہی یاد کیا۔ شرافت اور حسن اخلاق کا پیکر ایسا دیکھنے میں نہیں آیا۔ اطال اللہ بقاءہ و ابلغہ مناہ۔ [2] محمد علی علوبہ بھی اس سفر میں مفتی صاحب کے ہم رکاب تھے۔ [3] ابراہیم عبد الہادی اور محمود فہمی نقراشی مرحوم کی پارٹی کے لوگ، جنہوں نے اس مرد مجاہد کو قتل کرا کر اپنا نامۂ اعمال سیاہ کیا اور جنکی حکومت نے اخوان پر ظلم کے پہاڑ ڈھا کر دنیا اور آخرت کی رسوائی مول لی۔ [4] مصر کا سب سے بڑا ایکٹر ادیب —— علی میاں اس سے ملنا چاہتے تھے۔ یہ گنہگار تو اس طوائف صفت ادیب کی شکل دیکھنا بھی پسند نہ کرے۔ عقاد کی بخیہ دری کے لئے مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔

ظفر حسین سے ملنا نہیں ہو سکا، اعتاد کی تقریبِ یومِ اقبال میں گئی، انھوں نے گھر پر بلایا بھی مگر طبیعت منشرح نہ ہوئی۔ ظفر حسین[1] بڑے آدمی ہیں، ان سے وقت لینا بڑا مشکل کام ہے۔

ہمارے مولانا ناظم کہاں اور کس حال میں ہیں، انھوں نے تو بالکل قطع تعلق ہی کر دیا۔ ہمیں بھی اُن کا پتہ یاد نہیں رہا، کبھی بہت ملاقات ہوتی ہے۔ مولوی مظفر حسین صاحب کیا کر رہے ہیں، اُن کے لئے دل میں وہی جگہ ہے جو پہلے تھی، وہ تو شاید ہم سے مایوس ہو چکے ہوں لیکن ہم اُن سے مایوس نہیں، افسوس ہے کہ تقسیم نے جیتے جی جدا کر دیا، کاش آپ لوگوں سے حجاز ہی میں ملاقات ہو جائے معلوم نہیں سیرت سید احمد شہیدؒ کے جو نسخے "چراغِ راہ" کو بھیجے گئے تھے وہ کچھ نکل رہے ہیں یا نہیں، خریدی گئی یا نہیں۔

اُمید ہے کہ اس خط کو سامنے رکھ کر جواب دیں گے، اور حتی الامکان مفصل در جاندار جیسا کہ آپ کا معمول ہے۔ آپ کی دلچسپی کے لئے روزنامچے سے ایک عبارت نقل کر دوں جو آپ کے خط ملنے پر ۸ ربیع الثانی ۱۵ جنوری کو لکھی تھی:-

"وقد ناولني الدكتور احمد، ميں رسائل لی جاءت من الهند وباكستان علی عنوانه وفيها رسالة رشيقة بليغة للاستاذ مسعود الندوی فی اسلوبه الادبی والخلاصه الاخوی، ومن عادته اذا كتب الی أرسل النفس علی سجيتها، فتصبح رسالة تجمع بين الانشاء البليغ والحب الصادق العميق، واذا جمعت رسائله تكونت سلسلة جديدة من رسائل اخوان الصفاء من غير فلسفة وبحث فی حقائق الاشياء الخ

ڈاکٹر احمد امین نے کچھ خطوط مجھے دیئے ہیں، جو ہندوستان اور پاکستان سے اُن کے پتے پر میرے نام آئے ہیں، ان میں مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کا ایک نفیس و بلیغ خط ہے جو انھوں نے اپنے مخصوص ادبی سلوب اور برادرانہ اخلاص کے ساتھ لکھا ہے، وہ جب بھی کوئی خط لکھتے ہیں تو ہر طرح کے تکلفات اُٹھا رکھتے ہیں اور عنانِ قلم چھوڑ دیتے ہیں، چنانچہ ان کا خط یکسر فصیح و بلیغ انشاء اور دوسری طرف خالص اور گہری محبت کا مرقع بن جاتا ہے، اگر ہمارے خطوط اکٹھے کئے جائیں تو رسائل اخوان الصفاء کا ایک نیا سلسلہ بن جائے گا، جس میں مگر فلسفہ اور حقائق اشیاء کی بحثیں نہیں ہوں گی۔

کیا اس تاثر کے اعادہ کا آپ پھر موقع دیں گے، آپ کے ایسے ہی خط کا انتظار رہے گا، اپنے رفیق عزیز عاصم میاں کو سلام اور ہمارے رفیقوں کی طرف سے سلام قبول ہو، والسلام!

آپ کا:- علی

---

[1] ظفر حسین جیسے زندیق سے بھی ملنے کا اشتیاق حیرت انگیز ہے، اُن دنوں وہ وزارتِ تعلیم پر فائز تھے اس لئے شاید ملنا دشوار ہو۔

قابل اجمیری

تاثرات !

وہی اضطرابِ فراق ہے وہی اشتیاقِ وصال ہے
تری جستجو میں جو حال تھا تجھے پا کے بھی وہی حال ہے

نہ مآلِ زیست کی فکر ہے نہ تباہیوں کا خیال ہے
مجھے صرف اس کا ملال ہے کہ تمھیں بھی میرا ملال ہے

تری آرزو ہی کا فیض ہے تری یاد ہی کا کمال ہے
کبھی مجھکو تیرا خیال تھا مگر آج اپنا خیال ہے

نہیں کوئی راہ نما تو کیا ہے خلاف ساری فضا تو کیا
مجھے فکرِ سود و زیاں ہو کیوں تری یاد شاملِ حال ہے

یہ جنونِ شوق عجب جنوں نہ خلش خلش نہ سکوں سکوں
کبھی خار وجہ نشاط ہے کبھی پھول وجہ ملال ہے

عزیز حاصل پوری

ضیائے حسنِ حقیقی نظر جب آتی ہے
نگاہِ عشق چمکتی ہے جگمگاتی ہے

تری نگاہ ابھی ہے حرم سے نامحرم
ترا ضمیر حقیقت میں سومناتی ہے

حیرت شملوی

کتنا بکھرا ہے دل کا شیرازہ
کر سکے کون اس کا اندازہ

ہاں کبھی اس ریاضِ ہستی میں
دل بھی اک پھول تھا تر و تازہ

یہ تو سوچے کوئی کہ سائل پر
بند کس نے کیا ہے دروازہ

بندگانِ خدا کہاں جاتے
وا نہ ہوتا اگر وہ دروازہ

سادگی آپ اپنا زیور ہے
حسن کو کیا ضرورتِ غازہ

پھر کسی بے وفا کی یاد آئی
زخم پھر دل کے ہو گئے تازہ

کاش اُن کے غرور و نخوت کا
اب تو ہوتا کسی کو اندازہ

دل لگانے کا اُن سے اے حیرت
آج تک کھینچتے ہیں خمیازہ

بہار کوٹی

واردات!

دل تڑپتا ہے تو پیغامِ سکوں ملتا ہے
ایک مدت میں یہ اندازِ جنوں ملتا ہے

کام کی چیز ہے ناکامِ تمنا رہنا
کچھ نہ ملنے پہ توقع سے فزوں ملتا ہے

میں تو انساں ہوں فرشتوں کو پسینہ آ جائے
جب تبسم میں نگاہوں کا فسوں ملتا ہے

اس توجہ سے تغافل ہی نہیں بہتر تھا
اب تڑپنے میں بھی مشکل سے سکوں ملتا ہے

جیسے میخانے کے باہر کوئی دنیا ہی نہ ہو
ہو نہ ہو بادۂ گلرنگ میں خوں ملتا ہے

خلوتِ طور تجھے آتشِ نمرود مجھے
حسبِ توفیقِ نظر سوزِ دروں ملتا ہے

غیرتِ عشق پہ آتا ہے تو حرف آئے بہارؔ
زلفِ شبرنگ کے سائے میں سکوں ملتا ہے

آصف طربؔ

نگاہِ برق پہ جو خندہ زن نہیں اے دوست
وہ اک حسین قفس ہے چمن نہیں اے دوست

وہ برہمیِ محبت کی قدر کیا جانے!
جسے سلیقۂ دار و رسن نہیں اے دوست

زمانہ تھک بھی چکا اپنی گردشوں سے مگر
مری جبیں پہ ابھی تک شکن نہیں اے دوست

جو گرمیِ نگہِ آفتاب سہہ نہ سکے!
وہ پھول واقفِ رنگِ چمن نہیں اے دوست

بہ فیضِ حادثۂ غم یہ گردشِ حالات
طربؔ کے واسطے ہمت شکن نہیں اے دوست

عارفؔ

آ گئے ہیں ایک مرکز پر سمٹ کر حسن و عشق
کاش یوں ہی امتزاجِ شعلہ و شبنم رہے

حیرتِ نظارگی نے کر دیا خود سے بھی دور
اُن کی محفل میں نہ ملنے کے برابر ہم رہے

یوں غم جھلک رہا ہے رخِ کائنات سے
جیسے خوشی کا نام نہیں کائنات میں

ماہر القادری

.... اور وہ ہارتا چلا گیا!

—— جب زندگی اجیرن اور جینا دشوار ہوجائے تو کوئی کیا کرے (حامد نے بیڑی سلگاتے ہوئے کہا، اور اس کا آخری لفظ "کرے" پوری طرح ادا بھی نہ ہوا تھا کہ اس کا دوست نسیم جھٹ سے بول پڑا ۔ ۔ ۔) جب زندگی اجیرن ہوجائے تو آدمی کو چاہیئے شراب پی کر غم غلط کرے (. ور شراب پینے کے لئے جیب میں ایک دھیلا بھی نہ ہو تو —— حامد) تو پھر عشق بازی شروع کردے (مگر بھیا! آجکل پیسہ کے بغیر عشق بازی بھی تو نہیں ہوتی —— حامد) ہوسکتی ہے، عاشق ہوجانے میں روپیہ پیسہ کی کیا ضرورت ہے، بس کسی کو یک نظر دیکھا اور اس کے لئے مرنے لگے (یہ تو ایک طرفہ عشق ہوا، تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے اسی میں مزہ بھی ہے —— حامد) یہ بات ہے تو پھر بھیا۔ آدمی خودکشی کرلے، زندگی کے جنجال سے چھوٹ جائے گا (... مگر وہ ... کس طرح ... حامد) ساری دنیا کی تدبیریں بتلانے کے لئے میں ہی رہ گیا ہوں ۔ ۔ ۔ میاں! خودکشی کیا مشکل ہے، جب کوئی جان دینے اور مرنے ہی پر آئے تو سنکھیا ہے، افیون ہے، اسپرٹ ہے، طرح طرح کے زہر ہیں، اس میں دشواری ہو تو رسّی کا پھندا ہے، پستول ہے کہ لیلیٰ بائی، گولی چلی اور کام تمام! سمندر ہے، دریا ہے، کنویں اور تالاب ہیں، چھلانگ لگائی اور "خدا آباد" جا پہونچے، اور سب سے آسان بات یہ ہے کہ ریل کی پٹری پر سر رکھ کر لیٹ گئے، اور ذرا سی دیر میں "مرحوم" ہوگئے، مرنا کیا مشکل ہے، مشکلیں اور دشواریاں تو جینے میں ہیں .... اور ....!

نسیم کی بات ابھی پوری نہ ہوئی تھی کہ ایک سائکل سوار نوجوان تیزی کے ساتھ آیا اور ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا :-

"یہ آج کیا مسکوٹ ہورہی ہے، کیا آپ کی اس راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں اس خاکسار کو بھی شریک ہونے کی اجازت مل سکتی ہے؟"

اس پر حامد نے جواب دیا :-

"یہ آپ کے دوست نسیم صاحب مجھے خودکشی کی ترکیبیں بتا رہے ہیں، میں نے دیناؔ دکھڑا اس لئے بیان کیا تھا کہ یہ غمخواری فرمائیں گے۔ مگر (اور نسیم بیچ میں بول پڑا ۔ ۔)

—— میں نے ان کو پہلے تو جینے، مزے کرنے اور خوش رہنے کی تدبیریں ہی بتائی تھیں مگر یہ نہ ملنے اور میری ہر بات کی کاٹ کرنے لگے، تو پھر میں نے تصویر کا دوسرا رُخ پیش کردیا .....

تینوں دوستوں میں کھل مل کر باتیں ہونے لگیں اور حامد کے اس انکشاف پر کہ وہ کل شام سرکاری امانت کا تین ہزار روپیہ ریس (R A C E) میں ہار گیا، دوستوں کے چہرے فق ہوگئے۔

—— حامد! یہ کیا غضب کیا، سو دو سو نہیں، تین ہزار روپیہ، گھوڑ دوڑ کے جوئے میں ہار گئے اور وہ بھی اپنے نہیں، سرکاری تحویل کے! —— نسیم نے پتلون کی سلوٹ کو سلجھاتے ہوئے کہا

—— جس دن میں نے حامد کو مس نسترین کے ساتھ ریس کورس کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا تو اسی دن میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ خدانخواستہ کوئی مصیبت آنے والی ہے، میں نے ان حضرت سے کہا بھی تھا کہ گھوڑ دوڑ میں جانا ٹھیک

نہیں، یہ پسلے کہ میں وہاں کوئی جوا کھیلنے تھوڑی ہی جاتا ہوں، بس ذرا تفریح ہو جاتی ہے ——— اور ——— نسیم کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ حامد کے لبوں کو جنبش ہوئی ———

——— دوستو! اب نصیحت اور افسوس کا وقت نہیں رہا، جو ہونا تھا ہو چکا، ایک ہفتہ کے اندر اندر روپیہ کا انتظام نہ ہوا تو میں گرفتار ہو جاؤں گا، اس کی تدبیر سوچو اگر سوچ سکتے ہو (نسیم نے اس پر کہا) بھائی! اپنی گھڑی، انگشتری اور ایک دو چیزیں بیچ کر پانسو روپیہ کا تو میں بندوبست کر سکتا ہوں ——— اور شمیم ——— تم (شمیم جواب دیتا ہے) میرے حالات آپ سے چھپے ہوئے نہیں ہیں، کمپنی کے قرضہ کی مہینہ کے مہینہ پچاس روپیہ قسط جاتی ہے اور دو مہینہ سے تو قسطیں بھی رکی ہوئی ہیں، پھر بھی کہیں نہ کہیں سے تین سو کا انتظام کر دونگا (حامد نے اس پر کہا) اتنے میں کام چل جائیگا، چار دن کے اندر اندر آپ لوگ اپنے اپنے روپیہ کا انتظام کر دیں۔

اتنے روپیہ میں بھائی! کیسے کام چل جائیگا ——— نسیم نے سگریٹ کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا ———

——— حامد اس پر بولا کہ دو ہزار روپیہ میرے سالے اور چچا خسر نے دینے کے لئے ہامی بھری ہے ——— یہ الفاظ اس نے دبی آواز سے کہے، قدرے جھجکتے ہوئے، جھوٹ میں جرأت اور جان کہاں ہوتی ہے!

شمیم اور نسیم بات کے سچے اور وعدے کے پکے نکلے، ایسے غمخوار دوست آجکل ناپید ہیں! چوتھے دن حامد کے پاس ساڑھے آٹھ سو روپیہ پہونچا دیئے گئے، شمیم نے تین سو کی جگہ ساڑھے تین سو کا انتظام کیا اس سے زیادہ وہ بیچارے دو کچھ کر ہی نہیں سکتے تھے۔

حامد پر گھوڑ دوڑ کا بھوت سوار تھا اس کو یقین تھا کہ ان روپیوں سے ریس (R A C E) میں شرط لگا کر ہاری ہوئی رقم کو لوٹایا جا سکتا ہے اور کیا عجب ہے کہ دو چار ہزار اور زیادہ کی جیت ہو جائے، عقل نے بہت کچھ سمجھایا کہ جہاں ایکبار ٹھوکر لگ چکی ہے پھر اسی جگہ ادبدا کر جانا عقلمندوں کا کام نہیں، مگر نفس نے پٹی پڑھائی کہ ٹھوکروں ہی سے منزل کا پتا ملتا ہے، خطروں میں کودے بغیر گوہر مقصود ہاتھ کہاں آتا ہے، آخر قسمت کب تک یاوری نہ کرے گی، تین دوڑوں میں مسلسل ہار رہی اب کے جیت ہو کر رہے گی، مسٹر ڈنشا نے جن گھوڑوں کی نشاندہی کی ہے ان پر ضرور شرطیں لگانا، ڈنشا ہر کسی کو HINTS نہیں دیا کرتا، یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ جو اس نے اتنا کچھ بتا دیا۔

حامد کو دوستوں کے گھر شکریہ ادا کرنے کے لئے جانا چاہئے تھا مگر وہ نہیں گیا، ایک تو دل میں چور تھا، دوسرے یہ خیال تھا کہ گھوڑ دوڑ سے روپیہ جیت کر ہی وہ ان کے یہاں جائے گا ——— دی ہوئی رقمیں واپس کرنے کے لئے! شیطان کے دھوکے پُرپیچ ہی نہیں بڑے امید افزا بھی ہوتے ہیں!

آج گھوڑ دوڑ کا دن تھا، وہ نہایا دھویا، کپڑے بدلے، مانگ پٹی کی! یہ سب کچھ ہوتا رہا مگر "ریس" کا تصور ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے دل و دماغ سے جدا نہیں ہوا، امیدوں کے ہوائی قلعے بنتے رہے، تمناؤں کے رنگین غبارے اڑتے رہے، ان غباروں کو اس کے تخیل نے بنایا، اور پھر ان میں اسی کے تصور نے ہوا بھی آپ ہی بھری اور خود ہی امیدوں کی فضا میں اڑا دیا ———

حامد گھوڑوں کے ناموں کی چھپی ہوئی فہرست دیکھ رہا تھا، کہ اتنے میں اس کی بیوی نے آکر کہا ——— "میں کل سے کہہ رہی ہوں کہ میرے بھانجے کے لئے کوئی اچھا سا نام تجویز کر دو۔۔ مگر۔۔" اور حامد جھٹ سے بول پڑا، "لانگ فیو" ———

—— یہ کیا نام ہے کرسٹانوں جیسا؟ بیوی نے جواب دیا، بیگم صاحبہ! یہ ایک رفتار گھوڑے کا نام ہے، جو لوگوں کی تقدیر بدل دیا کرتا ہے' کیا سمجھیں —— اس پر اُس کی بیوی قدلیے جھنجلا کر کہنے لگی :-
—— تمھارے پوتوں کے کوئی بچہ پیدا ہو تو اُس کا نام گھوڑوں اور اونٹوں کے ناموں پر رکھنا، میرے بھانجے ......
.. (حامد بات کاٹ کر) ہاں: ہاں! تمھارا بھانجا ماں کے پیٹ سے " ہز رائل ہائی نس " پیدا ہوئے، اُس کا نام ہم جیسے چھوٹے آدمی رکھیں گے تو اُسے قبول کون کرے گا۔ . . . . تم ضرورت سے زیادہ خفا ہو گئیں بیگم! میں نے تو تمہیں چھیڑنے کے لئے کہا تھا کہ خفگی کے عالم میں تم ذرا زیادہ بھلی لگتی ہو ——!
حامد کے ہاتھ میں پنسل تھی، اپنی پسند کے گھوڑوں کے ناموں پر وہ نشان لگا رہا تھا (۷ ، ۴ ، ×) اُس نے کاغذ پر
" اِس پار کہ اُس پار "
غیر شعوری طور پر لکھ دیا، وہ گھر سے اِس انداز میں روانہ ہوا جیسے وہ کہیں بہت دور کے سفر پر جا رہا ہے، دل کی یہ کیفیت اُس کی سمجھ میں خود نہ آتی تھی، گلی کے موڑ پر پہونچکر اُس نے اپنے مکان کو کئی بار مُڑ مُڑ کر دیکھا، بالکنی لب خاموش سے الوداعی سلام کہہ رہی تھی ۔

ریس کورس میں آج اور دنوں سے زیادہ چہل پہل تھی، شراب، عورت، اور جُوا! اسی کے دم سے وہاں کی بہار ہے! اور ان تینوں چیزوں کی اس جگہ فراوانی تھی —— یہ اسلامی حکومت پاکستان کے دارالخلافہ کا " ریس کورس " تھا، یہاں ایک قدم قدم پر اسلام کو پامال اور رسوا کیا جا رہا تھا، یہ وہ مقام ہے جہاں حکومت کا قانون اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے، گناہ یہاں فضا میں تیرتے پھرتے ہیں اور کس کی ہمت ہے جو انگلی بھی اُٹھا سکے کہ :-
" یہ کیا کر رہے ہو، یہ کیا ہو رہا ہے؟ "
یہ مقام ہے جہاں کی جیت ہار پر جرائم کے پروگرام بنتے ہیں، غنڈہ گردی کو نہ جانے کتنی غذا اسی مقام سے ملتی ہے۔ —— کراچی کے سینہ کا سب سے زیادہ خطرناک ناسور، مگر بڑے بڑوں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے، کسی کو یہ ناسور' نظر نہیں آتا —— " بولو انگریز بہادر کی جے "!
گھوڑ دوڑ شروع ہوئی، حامد پہلی بار دو سو روپیہ جیتا، ہمت اور بڑھ گئی، دوسری ریس میں برابر سرابر رہا، اور تیسری میں چھ سو ہار گیا، پھر ہارتا اور جیتتا رہا یہاں تک کہ آخری ریس میں پائی پائی ہار گیا ——
اُمیدوں کے سربفلک قلعے دھڑام سے زمین پر گر پڑے، تمناؤں کے غباروں کی آن کی آن میں ہوا نکل گئی، اس کے پیروں تلے سے زمین سرکی جا رہی تھی، آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ گیا —— " کل روپیہ کی چیکنگ ہوگی —— تو۔ —— " اس تصور سے اُس کے کلیجہ کو دھکا لگا، وہ پاپیادہ چل رہا تھا، مگر کس طرح؟ جیسے کوئی پتنگ کٹ کر ہوا میں ڈانوا ڈول ہو رہی ہو!

روپیہ کی چیکنگ —— تین ہزار روپیہ غائب —— پولس —— گرفتاری —— حوالات —— یہ سب مرحلے اس کے ذہن پر ذرا سی دیر میں گزر گئے، اور اتنے میں دو منزلہ موٹر بس اُس کے قریب سے گزری، تیزی کے ساتھ! اور حامد اُس سے ٹکرا کر زمین پر گر پڑا، موت کا فرشتہ نہ جانے کب سے گھات میں تھا، اِدھر ٹکر لگی اور اُدھر روح پرواز کر گئی، وہ خود بھی یہی چاہتا تھا، موت ہی اُس کے لئے سکون کا سبب بن سکتی تھی —— بُرائی آخرت تک

آدمی کا پیچھا نہیں چھوڑتی !

لاکھوں آدمیوں کی بستی میں اُسے کون جانتا تھا، کئی گھنٹے کے بعد لاش کی شناخت ہو سکی، یہ کراچی تھی آدمیوں کا اس طرح بسوں اور موٹروں سے کچل جانا یہاں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے، موت کی خبروں میں اب کوئی اہمیت اور عبرت نہیں رہی !

مرنے والے نے گھر میں کچی کوڑی بھی نہ چھوڑی تھی، دوستوں اور عزیزوں کو ہی کفن دفن کا بندوبست کرنا پڑا، گورکن قبر کھودنے کی اُجرت نہ لیں تو بیچارے کھائیں کیا؟ اور قبرستان کی مسجد میں جنازے کی نماز پڑھانے والے ملّا کے ساتھ بھی زندگی کی ضرورتیں لگی ہوئی ہیں ! ان لوگوں کے کام آدمیوں کی موت ہی کے سہارے چلتے ہیں اور ملک الموت کو یہ خدا کے بندے دعائیں دیتے رہتے ہیں !

قبر کھودی جارہی تھی، شمیم اور نسیم اپنے پیارے دوست کے جنازے کے قریب بیٹھے تھے، آنکھیں خشک مگر دل رو رہے تھے، لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے، طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔

—— موٹر ڈرائیور ہی کم بخت اس غریب کا قاتل ہے —— ایک شخص نے کہا

—— اس کا قاتل ! (جنازے کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے) یہ نہ پوچھو ! یہ بات بہت دور جا کر پہونچتی ہے، نہ جانے کس کس کے دامن اس خون میں رنگے ہوئے ہیں، ریس کورس، کلب گھر، شراب خانے اور ڈانسنگ ہال یہ سب قتل گاہیں نہیں تو اور کیا ہیں —— میں —— یہ —— نسیم کی بات ختم ہونے سے پہلے گورکن نے آواز دی کہ قبر تیار ہو گئی، لوگ کھڑے ہو گئے —— اور ریس (R A C E) کا مقتول سپردِ خاک کر دیا گیا !

روحِ انتخاب

جہاد کے معرکوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں گو تیغ و سپر اور جسمِ مبارک پر خود و مغفر ہوتا تھا لیکن اس وقت بھی پیغمبر اور سپہ سالار کا فرق صاف نظر آتا تھا۔

عین اُس وقت جبکہ معرکہ کارزار گرم ہے، تیروں کا مینہ برس رہا ہے، تمام میدان لالہ زار بن گیا ہے، ہاتھ اور پاؤں اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے ہیں جس طرح موسم خزاں میں پتے جھڑتے ہیں، دشمن کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھی آرہی ہیں، عین اُسی حالت میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ دعا آسمان کی طرف بلند ہے، جنگ آور باہم نبرد آزما ہیں اور سرِ مبارک سجدۂ نیاز میں ہے، معرکۂ بدر میں حضرت علیؓ عین شدتِ جنگ میں تین بار خبر لینے کیلئے آئے اور ہر دفعہ دیکھا کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے، فوجیں تیروں کا مینہ برسا رہی ہیں اور لڑائی کا فیصلہ نہیں ہوتا، فاتح بے سلاح زمین سے مٹھی بھر خاک اُٹھا لیتا ہے اور دشمن کی فوجوں کی طرف پھینکتا ہے، دفعۃً فوجوں کا بادل پھٹ کر مطلع صاف ہو جاتا ہے۔

حنین میں دشمن نے دفعۃً اس زور سے حملہ کیا کہ تمام فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے بارہ ہزار آدمیوں سے (چند خاص رفقاء کے سوا) ایک بھی پہلو میں نہیں، سامنے سے دس ہزار قدر انداز تیر برساتے آرہے ہیں، لیکن مرکزِ حق اپنی جگہ پر قائم ہے اور ایک پُر جلال آواز آرہی ہے ——

انا النبی لا کذب — میں پیغمبر ہوں اور جھوٹا نہیں ہوں

عین اُس وقت جب کہ صفیں باہم معرکہ آرا ہیں، ہر طرف تلواریں برس رہی ہیں، ہاتھ پاؤں کٹ کٹ کر زمین پر بچھے جاتے ہیں، موت کی تصویریں ہر طرف نظر آرہی ہیں، نماز کا وقت آجاتا ہے، دفعۃً نماز کی صفیں قائم ہو جاتی ہیں، سپہ سالار امامِ نماز ہے، فوجیں صفوفِ نماز ہیں، رجز کے بجائے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہیں، جوش و خروش، تہور و جانبازی غیظ و غضب اب عجز و نیاز، تضرع و زاری اور خضوع و خشوع بن جاتا ہے، صفیں دو دو رکعتیں ادا کر کے دشمن کے مقابلہ پر چلی جاتی ہیں، ان کے بجائے لڑنے والے نماز میں شامل ہو جاتے ہیں یہ دو رکعتیں ادا کر کے پھر اپنی پہلی خدمت پر واپس چلے جاتے ہیں اور مشغولینِ جنگ آکر بقیہ نمازیں پوری کر لیتے ہیں، لیکن یہ تبدیلیاں فوجوں میں ہوتی ہیں امام (رسولؐ) اوّل سے آخر تک عبادت میں مصروف ہے۔

تعلیم و ارشاد، ہدایت و تلقین، تہذیب و تزکیہ کا کام ہر وقت جاری ہے، عین فتح کے وقت جب کہ مجاہدین فتح کے نشہ میں چور ہیں، مالِ غنیمت فروخت ہو رہا ہے، ایک ایک کو ہزاروں کی رقمیں وصول ہو رہی ہیں، ایک صحابی خوش خوش آتے ہیں اور جوشِ مسرت میں کہتے ہیں

یا رسول اللہ! آج میں نے مالِ غنیمت میں جتنا نفع اُٹھایا، کبھی نہیں اُٹھایا تھا، پورے تین سو اوقیہ[1] ہاتھ آئے، آپؐ فرماتے ہیں کہ میں اس سے بھی زیادہ نفع بتاؤں؟ وہ بڑے شوق سے پوچھتے ہیں، کیا؟

ارشاد ہوتا ہے نمازِ فرض کے بعد دو رکعتیں!

(علامہ شبلی نعمانی —— سیرۃ النبی جلد اوّل)

---

[1] اوقیہ دس روپیہ کے برابر ہوتا ہے!

ہماری نظر میں!

عورت اور اسلامی تعلیم

"عورت اور اسلامی تعلیم" از :- مالک رام ایم۔ اے، ضخامت ۱۹۲ صفحات ــــ قیمت تین روپیہ، ملنے کا پتہ :-
نگار بک ڈپو، لکھنؤ (بھارت)

جناب مالک رام (ایم۔ اے) اردو زبان کے اچھے انشا پرداز ہیں، ان کی کتاب "ذکرِ غالب" اردو دنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے، اب ان کی معرکہ آرا کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" منظرِ عام پر آئی ہے، جس کا ایک ایک ورق اس کی شہادت دیتا ہے کہ لائق مصنف اسلامی علوم سے کس قدر شغف اور آگہی رکھتے ہیں، زبان اور اندازِ بیان سے لیکر استدلال اور معقولات و منقولات تک ہر چیز خوب ہے۔

چہرہ "سترِ عورت" میں داخل ہے یا نہیں؟ اور "جلباب" کی صحیح تعریف کیا ہے؟ اس پر اہلِ علم نے کیسی کیسی بحثیں کی ہیں ــــــــ مگر جناب مالک رام صاحب نے کس قدر سلجھے ہوئے انداز میں اظہارِ خیال فرمایا ہے :-

"جلباب وہ چادر ہے جو عورتیں اپنے سارے لباس کے اوپر اوڑھتی ہیں اور خمار یعنی اوڑھنی سے بڑی ہوتی ہے جو صرف سر پر اوڑھنے کے کام آتی ہے۔ ــــ حکم دیا "یدنین علیہن من جلابیبہن" یہاں "مِن" تبعیض کا ہے، جیسا بیضاوی نے بھی لکھا ہے یعنی "وہ چادر کا کچھ حصہ اپنے منہ پر ڈال لیں! لٹکا لیں ــــ" مراد یہ ہے کہ جب عورت گھر سے نکلے گی تو ضروری ہے کہ وہ اپنے جسم و لباس کی آرائش چھپانے کے لئے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) ایک بڑی سی چادر اوڑھ لے، لیکن مزید ہدایت یہ کی کہ وہ اس کا کچھ حصہ اپنے اوپر ڈال لے، جس سے صاف مراد یہ ہے کہ وہ اپنا چہرہ پوشیدہ کرے ــــ یہی پردہ ہے، متعدد حدیثوں سے اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ خود صدرِ اسلام میں اس سے یہی مراد لیا گیا کہ منہ چھپایا جائے (صفحہ ۲۴، ۲۵)

یورپ کی تہذیب نے بہت سی برائیوں پر کچھ خوش نما ناموں اور حسین اصطلاحوں کے لیبل لگا دیئے ہیں، ان میں سے ایک برائی "یارانہ شادی" (COMPANION MARRIAGE) کی ہے یعنی ایک مرد اور ایک عورت کسی قسم کی ظاہری، در قانونی رسم پورا کئے بغیر، علانیہ یا خفیہ طور پر زن و شو کی حیثیت سے رہنے لگیں، لائق مصنف نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں یہ "زنا" کی ایک صورت ہے اور لائق تعزیر ہے۔

بھول چوک کس سے نہیں ہوتی، "عورت اور اسلامی تعلیم" کے مصنف کا قلم بھی کہیں کہیں بہک گیا ہے :-

صفحہ (۸) پر "اطلبوا العلم ولو کان فی الصین" کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے تعبیر کیا ہے حالانکہ یہ سرے سے حدیث ہی نہیں ہے، کسی کا قول ہے جو نہ جانے کس طرح "حدیث" مشہور ہو گیا،

صفحہ (۹، ۱۱۵) قد خسر الذین قتلوا اولادھم سفھاً بغیر علم (الانعام) اس کا ترجمہ "یقیناً وہ لوگ

سخت نقصان اٹھانے والے ہیں، جنھوں نے اپنی اولاد کو اپنی حماقت سے جاہل اور بے علم رکھ کر ہلاک کیا" درست نہیں ہے، اس آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے:۔ "یقیناً" خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنھوں نے اپنی اولاد کو جہالت اور نادانی کی بنا پر قتل کیا" "سفہاً بغیر علم" کا یہ مفہوم متعین کرنا کہ "عرب اپنی اولاد کو چونکہ جاہل رکھتے تھے اس لئے اُن کے اس فعل کو قرآن "قتلِ اولاد" سے تشبیہ دیتا ہے"! ٹھیک نہیں ہے۔

(صفحہ ۳۵) :۔

ولا تؤتوا السفہاء اموالکم التی جعل اللہ قیاماً وارزقوھم فیہا واکسوھم وقولوا لھم قولاً معروفا (النساء)	تم اپنے مال نادان اور کم عمر لوگوں کے حوالے نہ کرو کیونکہ تمہارا مال و دولت اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے معیشت اور زیست کا سامان بنایا ہے، ہاں! انھیں اُن کے مال سے کھانے کو دو پہننے کو دو اور انھیں نیک اور عمدہ تعلیم دو۔

"وقولوا لھم قولاً معروفا" کے ترجمہ میں "..... تعلیم دو" محل غور ہے، اس کی جگہ "اور انھیں نیک ہدایت کرو" ہوتا تو مفہوم سے قریب ترین ترجمانی ہوتی۔

(صفحہ ۵۷) ـــ والمحصنات من النساء الا ما ملکت ایمانکم (النساء) تمام آزاد یا بیاہی عورتیں تم پر حرام ہیں سوائے اُن کے جن سے تم نے خود نکاح کیا ہے:

یہ ترجمہ درست نہیں ہے، اس کی ٹھیک اور مناسب ترجمانی یہ ہے:۔

"اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں (یعنی محصنات) البتہ ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں (جو جنگ میں) تمہارے ہاتھ آئیں"

جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہو کر آئیں اُن سے نکاح کے بغیر تمتع ہو سکتا ہے مگر مصنف نے اس کے خلاف اظہار رائے کیا ہے اور اُن کی رائے درست نہیں ہے ــــــــ اسی طرح "محصن" زانی کو سزائے "رجم" دیئے جانے پر جو کچھ انھوں نے لکھا ہے نیک نیتی کے باوجود ٹھیک نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سزائے رجم دے کر قرآن پر اضافہ نہیں فرمایا بلکہ توریت کے حکم کو بحال رکھا، اور فرمایا:۔

"اللھم انی اول من احیا امرک اذ اماتوہ" خدایا! میں پہلا شخص ہوں جس نے تیرے حکم کو زندہ کیا جبکہ وہ اسے مٹا چکے تھے ــــــــ خود قرآنِ کریم میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ توریت کے بعض احکام کو باقی رکھا گیا ہے۔

صفحہ (۲۳) پر "ابن مکتوم" کی جگہ "ابن ام کلثوم" لکھا گیا ہے، جو غلط ہے اور غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے۔

کتاب کوئی شک نہیں کہ مجموعی طور پر بہت خوب ہے، اس کو پڑھ کر دل گواہی دیتا اور عقل اس کی تصدیق کرتی ہے کہ کسی مذہب نے عورت کے ساتھ اسلام سے بہتر سلوک نہیں کیا،

یہ کتاب دراصل مالک رام نہیں ــــــ مولانا عبد المالک" کے لکھنے کی تھی !!!

"سنیں گے نہ حالی کی کبتک صدا؟ یہی ایک دن کام کر جائے گی"

اربابِ علم و ادب حضرات! ہدیۂ سلام و رحمت!

انسانی زندگی کے ارتقاء و انحطاط میں ادب کا ہمیشہ سے نمایاں حصہ رہا ہے۔ اور ہر دور میں ادب نے انسانی ذہن کو اپنے خاص انداز میں ڈھالنے کا کام انجام دیا ہے۔ آج کا دور سچ مانیئے تو علم و ادب کا دور ہے۔ ہر دل و دماغ پر زبان و قلم کی حکومت ہے۔ اس لئے ہم اہلِ علم سے خصوصاً اور ادیبوں سے عموماً اپیل کرتے ہیں کہ ادب اسلامی کے ہم شعبہ اور تحقیق طلب گوشوں پر تحقیقات کرنے میں اور ایک عالمگیر صالح معاشرہ کی تعمیر میں ہمارا ساتھ دیں، یہ ناممکن ہے کہ ہمارے عقائد اور تصورات نقطۂ نظر اور تمدن و تہذیب تو بدل جائیں اور "ادب" جوں کا توں رہے بلکہ اسے بھی بدل دینا چاہیئے! عموماً یہ خیال پھیل گیا ہے کہ اُردو شاعری کی ساری کائنات محض حُسن و عشق اور گل و بلبل کی پارینہ داستان ہے مگر تحقیق سے ثابت ہوا کہ اُردو ادب میں وہ "گنجہائے گرانمایہ" بھی موجود ہیں جن کی بنا پر فرمایا گیا "ان من الشعر لحکمۃ" اُردو ادب کے ان ہی جواہر پاروں کو منظرِ عام پر لانے کے لئے اور اسلامی علوم و فنون اور اسلامیات کے وسیع مطالعہ و اعلیٰ تحقیقات کے کام کی تنظیم کے لئے قلبِ پاکستان ریاست بہاولپور میں علمی ادبی ادارہ موسومہ به "جمعیۃ الحسان" کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ جو ادب اسلامی کیلئے نیک فال ہے۔ جمعیۃ کا بنیادی طرزِ فکر یہ ہے کہ "ہماری جدید زندگی کیلئے اسلام کہاں تک صحت و تازگی کا سبب ہے"؟ جمعیۃ اسلامی "علوم و فنون" اور "شعر و سخن" کی تحقیقات کیلئے ایک ٹھوس عملی قدم اٹھانے والی ہے۔ اور سب سے پہلا منصوبہ یہ ہے کہ "ابتدائے اسلام سے آج تک کے نعتیہ کلام اور اہلِ کلام کی تاریخ مرتب کیجائے" اسوقت ریسرچ کمیٹی نے ہندستان کی نعتیہ شاعری پر تحقیق کا فیصلہ کیا ہے جس کی طرف سے "اُردو نعت گوئی" کے نام سے ایک کتاب شائع ہو رہی ہے جس میں اُردو نعت گوئی پر بلند پایہ علمی و تحقیقی مقالات شائع کئے جائیں گے۔ قارئین عزیز۔ نعت گوئی ہمارے ادب کا ایک مستقل اور جاندار عنوان ہے اور ابھی تک اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ نعتیہ شاعری میں تحقیق کی بہت گنجائش ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ریسرچ کا یہ خود ایک عنوان ہے! اراکین جمعیۃ الحسان نے صحیح فکر اور صالح نظر سے یہ کام شروع کیا ہے لیکن آپ کے تعاون کی سخت ضرورت ہے! آپ سے نہایت عاجزانہ اپیل کی جاتی ہے کہ اُردو نعت گوئی پر بلند پایہ علمی و تحقیقی مقالات و مضامین لکھ کر خدارا ہمیں اپنے علم و ادب کی زکوٰۃ سمجھ لیئے! جسکو دیتا ہے خدا راہِ خدا دیتے ہیں۔۔۔ پاکستان و ہندستان کے اہلِ علم و ادب سے عموماً اور انجمن ترقی اردو پاکستان، ندوۃ العلماء لکھنؤ، حلقۂ ادب اسلامی کراچی، جامعہ عثمانیہ دکن و جامعہ ملیہ دہلی و جامعہ علی گڑھ سے نسبت رکھنے والے اہلِ قلم حضرات سے خصوصاً اپیل کیجاتی ہے کہ خدارا ہمارا ہاتھ بٹائیں اور دُعائیں لیں۔۔۔ اُمید ہے کہ ہماری اس عاجزانہ استدعا پر لبیک کہتے ہوئے ہندو پاک کے تمام احباب اپنے اپنے مقالات و مضامین ہماری طے کردہ آخری تاریخوں تک (زیادہ سے زیادہ) ۳۰ اپریل ۱۹۶۳ء تک ضرور بھجوا دیں گے۔۔۔ بر کریماں کارہا دشوار نیست۔۔۔ مگر۔۔۔ جو احباب معاوضۃً یہ خدمت انجام دینا چاہیں انھیں مناسب معاوضہ دیا جائے گا۔۔۔ تمام خط و کتابت اور ترسیل مضامین کیلئے یہ پتہ یاد رکھیں۔ والسلام معززین الاحترام!

عاجز:۔ میر حسان الحیدری، دولتکدہ قاری احمد حسین صدیقی، خطیب اعظم گجرات، پاکستان

فاران
کراچی
پاکستان
ماہر القادری

جلد ۲ ——— نمبر ۱۲

ماہنامہ

فاران

مارچ سنہ ۱۹۵۳ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپیہ (پاکستانی) فی پرچہ ۸ر

۸ روپیہ (ہندستانی) فی پرچہ ۱۱ر

مُقامِ اشاعت

دفتر:- "فاران"

کیمبل اسٹریٹ

کراچی نمبر (۱)

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نقشِ اول

"**فاران**" کی چوتھی جلد کا آخری شمارہ اُس کے قدردانوں کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے! یہ فخر ومباہات کا نہیں "تحدیثِ نعمت" کا محل ہے کہ چار سال کی مدت میں "فاران" کی ایک اشاعت بھی ناغہ نہیں ہوئی، کم سے کم اُردو صحافت میں ایسی مثالیں شاذ ہی ملیں گی۔

جب "فاران" کا آغاز ہوا ہے تو راقم الحروف کو ذرا سا بھی انتظامی تجربہ نہ تھا، ناتجربہ کاری اور کاروباری معاملات سے بے خبری کا یہ عالم تھا کہ شروع شروع میں مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ایک "رم" میں کتنے کاغذ ہوتے ہیں، بس یوں سمجھئے کہ ایک وہ شخص جو کبھی گھٹنوں پانی میں بھی نہ اُترا تھا، اس نے پُرشور طوفان اور اتھاہ سمندر میں ایک کمزور سے سفینہ کو ڈال دیا، پھر اُس پر تنہائی اور بے یاری و مددگاری کی یہ حالت کہ ادارتی ذمہ داریوں میں بقدرِ یک سطر بھی کوئی ہاتھ بٹانے والا نہیں تھا اور آج تک نہیں ہے۔

دُشوار منزل، اجنبی رہگزر، نہ کوئی رہنما نہ رفیقِ سفر! پھر زادِ راہ بھی بہت ہی قلیل! اُس پر مُستزاد مشکلات کی بھیڑ، خطرات کا ہجوم اور دشواریوں کے جمگھٹے! مگر قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم نے دستگیری فرمائی اور اُس کے کرم نے نہ صرف یہ کہ میرے ہاتھ کو تھاما بلکہ حوصلہ پیدا کیا، ہمت بندھائی اور عزیمت واستقامت کی توفیق عطا فرمائی۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت کے قربان جائیے کہ سلسلہ جڑتا اور بات بنتی ہی چلی گئی، کام چلا تو پھر رکا نہیں، قدم اُٹھے تو پھر تھمے نہیں، راہ میں دُشواریاں آئیں مگر حوصلہ کو پست نہ کرسکیں، مشکلات کا سامنا ہوا لیکن عزم ذرا سی دیر کے لئے بھی تشویش میں مُبتلا نہیں ہوا، اور سب سے بڑا کرم یہ ہے کہ نہ تو دشواریاں اور مشکلیں فی الواقعی اتنی سخت تھیں کہ پائے استقامت

ڈگمگا جاتے اور نہ مجھے کسی آزمایش میں ڈالا گیا، ناشکری اور واقعہ کی غلط ترجمانی ہوگی اگر میں کسی معمولی سی فکر و تشویش کو اتنا بڑا کرکے اور مہیب بناکر دکھاؤں کہ لوگ یہ سمجھیں کہ میں نے رسالہ کیا نکالا ہے، سچ مچ "جہاد" کیا ہے ـــــ اس مبالغہ آمیزی سے طبیعت ابا کرتی ہے، اور میں کوئی جھوٹا کریڈٹ ہرگز لینا نہیں چاہتا، اگر ایسی پھند فریب کی باتیں کرنی ہوتیں تو اس کے لئے اور بہت سی راہیں کھلی ہوئی تھیں، میں اِس منزل کو جس پر گامزن ہوں سرے سے اختیار ہی نہ کرتا۔

میں کہ میں نے سیماب وش طبیعت پائی تھی، جم کر کام کرنے کی عادت نہ تھی اور کاروباری ذمہ داریوں کے بار کا تو ایک تنکا بھی کبھی نہ اُٹھایا تھا، اللہ تعالیٰ نے میری ان کمزوریوں کی قلب ماہیت سی کردی، اور جو شخص کسی کی ذراسی ترش بات سُن کر آتش زیرپا ہوجاتا تھا، اب اس کا یہ عالم ہے کہ بعض بعض خریدار جن کے پاس وقت پر رسالہ نہیں پہونچتا نہ جانے کیا کیا لکھ دیتے ہیں، مگر میں ان ناگواریوں کو برداشت کرجاتا ہوں، پی جاتا ہوں اور سختی کے جواب میں نرمی سے پیش آتا ہوں۔

ہر بندے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ ہوتا ہے اور اس خاک نشین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ آسانیوں اور اسباب آفرینیوں کا رہا ہے، زندگی کی ہر ضرورت وقت پر پوری ہوئی، حوصلوں سے کہیں بڑھ کر نوازا گیا اور تمناؤں سے زیادہ دیا گیا، یہ نوازشیں اور رحمتیں اس لئے نازل نہیں کی گئیں کہ میں اُن کا مستحق تھا اور میرے اعمال کا اسی صورت سے اجر ملنا ہی چاہئے تھا، میں اس تصور سے سو بار پناہ مانگتا ہوں، میرے اعمال حقیقت میں رحمت کے نہیں عتاب و غضب کے سزاوار تھے اور خالق کائنات اگر کسی انسان کے صرف اعمال کی اچھائی بُرائی کی بنا پر اُس کے ساتھ سلوک کرنے لگے تو مجھ جیسا گنہگار اور نابکار آتشیں زنجیروں کا مستحق قرار پائے اور میرے حصہ میں قہر و غضب کے سوا اور کوئی چیز نہ آئے، میرے ساتھ جو شفقت کا سلوک فرمایا جارہا ہے وہ کسی استحقاق کی بنا پر ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کا سبب صرف اُس کی رحمت اور ربوبیت ہے، یہ اجر بے مُزد اور کرم بے سبب ہے اور کون ہے جو اللہ تعالیٰ کی عطا پر روک ٹوک کرسکے۔

اللہ تعالیٰ کے اس فضل و کرم پر میری طرف سے تشکر و امتنان کا اظہار اس طرح ہوا کہ میں نے "فاران" کے قدردانوں سے کسی قسم کی مالی امداد کی اپیل نہیں کی، میں نے اس سلسلہ میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا، یہاں تک کہ توسیع اشاعت کے لئے اشارتاً اور کنایتاً بھی کوئی مطالبہ نہیں کیا اور خدا نہ کرے کہ اس کی نوبت آئے، خدائے قادر و برتر کو جب تک منظور ہوگا حالات سازگار رہیں گے اور جس دن اس کی مشیت کا کچھ اور تقاضا ہوا تو دوسری صورتیں بھی رونما ہوسکتی ہیں، میری یہ دُعا ہے اُس کی بارگاہ بے نیاز میں کہ کوئی سخت گھڑی آئے تو پائے استقامت اپنی جگہ جمے رہیں، ڈگنے نہ پائیں! کبھی دُھوپ کبھی چھاؤں! کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں، سدا سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے، زندگی کا مقصود اور معیار اللہ تعالیٰ کی رضا ہو تو پھر ہر مصیبت راحت بن سکتی ہے اور ہر انقلاب بلکہ زوال پر صبر کیا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے ہمارا معاملہ لین دین کا نہیں ہے اور نہ ہم نے اس شرط پر اُس کی بندگی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالا ہے کہ عیش و آرام جب تک میسر ہوں گے اُس وقت تک اُس کا شکر کیجئے اور اطاعت کرتے رہیں گے، مگر مصیبت کا کہیں سامنا کرنا پڑ گیا تو شکر شکایت سے بدل جائے گا، بندے کے لئے شکوہ و شکایت کا تو کسی حال میں محل ہی نہیں ہے، بندگی تو نام ہی کامل انقیاد اور پوری پوری اطاعت کا ہے! کون احمق ہوگا جو زوالِ نعمت کی تمنا کرے گا، ہر کوئی کامیابیاں، آسانیاں اور خوشیاں چاہتا ہے مگر خدانخواستہ ایسی صورت آبھی جائے تو شکر و اطاعت میں کسی قسم کا کوئی فرق پیدا نہ ہونا چاہئے۔

——— ہمارے سامنے قیصر و کسریٰ کی زندگی نہیں، محمد عربی (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) کی مقدس زندگی ہے کہ تین تین دن کے فاقوں میں بھی حضورؐ رات رات بھر خدا کے سامنے کھڑے رہے ہیں، ہر وقت اللہ کے دین کو غالب کرنے کی دُھن، دن رات اسی کے لئے جدو جہد، ہر آن یہی لگن، شعبِ ابی طالب ہو، بازارِ طائف ہو، بدر کا میدان یا فتح مکہ ہو، ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی رضا مطلوب اور اُسی کی خوشی مقصود! اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ اس عزیمت کی ایک جھلک سرکارؐ کے اس ادنیٰ غلام اور ناچیز اُمتی کو بھی مل جائے!

میں نے اس چار سال کی مدت میں سیکڑوں ورق سیاہ کئے ہیں، عوام نے نہیں خواص نے کیا کیا سراہا ہے، کیسی کیسی حوصلہ افزائیاں کی ہیں مگر کیا خبر کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کونسی تحریر قبول ہوئی اور کس کو رد کر دیا گیا، لوگ تو اظہارِ بیان اور اسلوبِ نگارش کو دیکھ کر رائے قائم کرتے ہیں ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ جو چیز لکھنے والے کے قلم اور کہنے والے کی زبان سے نکل رہی ہے اس میں اخلاص کس قدر شامل ہے؟ دلوں کا حال تو اللہ جانتا ہے اور اُسی کا جاننا معتبر بھی ہے، دُنیا کو تحریروں اور تقریروں سے دھوکا دیا جا سکتا ہے اور دنیا والے دھوکے میں آ بھی جاتے ہیں مگر اللہ کو دھوکا بھلا کون دے سکتا ہے۔

مجھے خود شرم آتی ہے کہ میری تحریریں پڑھ کر لوگ مجھے نہ جانے کیا سمجھتے ہوں گے حالانکہ یہ انکسار نہیں واقعہ ہے کہ یہاں "قال" زیادہ اور "حال" برائے نام ہے، قول اور فعل میں ابھی مطابقت کہاں پیدا ہوئی ہے، زبان اور عمل ایک سطح پر ابھی کہاں آئے ہیں، کتنے چٹخارے ہیں جو ابھی نفس کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، کتنی کمزوریاں اور بے اعتدالیاں ہیں جو زندگی سے دور نہیں کی جا سکیں، نفس اپنی فربہی کے لئے کیا کیا تقاضے کرتا اور کیسی کیسی تدبیریں سُجھاتا ہے؟ اور جن اعمال اور عادتوں کو "خوبیاں" کہا جا سکتا ہے، اُن کی کھوٹ اور نکمے پن کو نہ پوچھئے، ہائے! یہ بے دلی کی نمازیں اور یہ بے ذوق سجدے!

احوالِ واقعی

اللہ تعالیٰ کے اس فضل کا کہاں تک شکر ادا کیجئے کہ اُس نے حق گوئی کی توفیق عطا فرمائی، اور سچی بات کہنے میں جھجک پیدا نہ ہونے دی جو کہا کھل کر کہا اور دو ٹوک کہا، خطروں کی پرواہ نہیں کی "فاران" کے اوراق سے اس کی گواہی لی جا سکتی ہے ——— جن بزرگوں کے احترام و عقیدت سے دل کا ایک ایک گوشہ لبریز ہے، اُن کی کسی بات سے اختلاف کیا ہے تو بھی عقیدت، حق گوئی کی راہ میں مزاحم نہیں ہونے پائی، اللہ تعالیٰ کے اس فضل کا اظہار اس لئے اور بھی زیادہ کیا جا رہا ہے کہ پاکستان میں قلم، زبان اور ضمیر خریدے جا رہے ہیں، یہاں ایک اچھے خاصے آزاد اور دیانتدار آدمی کو "سرکاری" بنتے کچھ دیر نہیں لگتی، ضرورتیں آخر میرے ساتھ بھی لگی ہوئی ہیں، عیش آرام اور ٹھاٹ باٹ کی زندگی کون نہیں چاہتا، مگر اس قادرِ مطلق کا ہزار ہزار شکر کہ اُس نے ایمان و ضمیر کی اس سودے بازی سے بچائے رکھا، اور میرے دل میں یہ خطرہ ہی نہ آنے دیا کہ اعلانِ حق کے جرم میں اگر کوئی ناخوشگوار صورت پیش آگئی اور کسی مصیبت سے دوچار ہونا پڑا تو کیا ہوگا؟ میں نے رزق کی کنجیوں کا مالک اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو نہیں سمجھا۔

"فاران" کو متنوع اور دلچسپ بنانے کی میری طرف سے انتہائی کوشش رہی ہے مگر بندے کا ہر کام سو فیصدی ٹھیک نہیں ہو سکتا، ترقی، کمال اور حُسن و خوبی کی کوئی انتہا نہیں اس لئے ہو سکتا ہے اور ہو کیا سکتا ہے ایسا ہوا بھی ہوگا کہ بعض مضامین پڑھنے والوں کو زیادہ پسند نہ آئے ہوں، بہر حال جو کچھ میں کر سکتا تھا اُس سے دریغ نہیں کیا۔ "فاران" کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس میں آج تک کوئی مضمون قسط وار نہیں چھپا، چنانچہ قارئینِ "فاران" کے علمی ذوق اور ضبط و صبر پر اعتماد کرتے ہوئے تیس تیس چالیس چالیس صفحے کا ایک ایک مضمون شائع کیا ہے اور عام طور پر پڑھنے والے اُکتائے نہیں اور ناگواری محسوس نہیں کی۔

ہندستان کے چند نادہند ایجنٹوں کے علاوہ کاروباری طور پر "فاران" کو کسی اہلِ معاملہ سے شکایت نہیں رہی، سُنا ہے کہ اخباروں اور رسالوں کے "اشتہارات" (ADVERTISEMENTS) کی رقمیں باقی رہ جاتی ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کے کرم سے "فاران" کو اس ناخوشگواری سے سابقہ نہیں پڑا، اشتہار دینے والوں نے "فاران" کے ساتھ ہمیشہ خوش معاملگی کا ثبوت دیا جس کا میں شکر گزار ہوں ——— اور "فاران" کا اہلِ معاملہ سے جیسا سلوک رہا ہے اس کیلئے میں اپنی زبان سے خود کیا کہوں کہ اس میں تحسین و آفریں بلکہ خودستائی کا رنگ آپ ہی آپ پیدا ہو جائے گا۔

"فاران" میں کتابوں اور رسالوں پر تبصرہ جس انداز میں ہوتا رہا ہے، وہ اس کا خاص "امتیاز" ہے، میں نے اپنی بساط استعداد اور فہم و بصیرت کے مطابق انتہائی دیانت اور انصاف سے کام لیا ہے، بہت سے مصنفین نے "فاران" کے تبصروں کو سراہا ہے اور اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کا اعتراف بھی کیا ہے، مگر کوئی کوئی ایسے بھی نکلے کہ اپنی کتاب پر تبصرہ دیکھ کر چراغ پا ہو گئے اور انھوں نے دوسرے رسالوں میں "فاران" کی تنقید کے خلاف مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا، جو حضرات اپنے کلام اور مضامین کو تنقید سے بالاتر سمجھتے ہیں اور جن کا یہ زعم ہے کہ اُن کے قلم سے کسی قسم کی بھول چوک ہی نہیں ہوتی، تو اس ذہنیت اور اس مزاج کے لوگ اپنی کتابیں ہمارے یہاں نہ بھیجیں تو اچھا ہے۔ "فاران" اس خصوص میں کسی کی خوشی اور ناخوشی کی پروا نہیں کرتا، ایسے فرشتہ صفت شاعروں اور معصوم اہلِ قلم کو ہم دور ہی سے سلام کرتے ہیں، "فاران" اس معاملہ میں کسی قسم کے ذاتی تعلق، شخصی تعارف، شہرت، ناموری یا جتھہ بندی اور پارٹی بازی سے مرعوب اور متاثر نہیں ہو سکتا۔

بعض لوگوں نے اپنی شخصیت کے بارے میں خود ہی ایک رائے قائم کر لی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اُن کی اس رائے کا پورا پورا احترام کیا جائے، اور جو کچھ وہ اپنے کو سمجھتے ہیں دوسرے بھی اُن کو ویسا ہی سمجھیں، یہ نادانی کی باتیں ہیں، اور ایسی باتیں کم سے کم اہلِ علم کو تو زیب نہیں دیتیں۔

جہاں تک کتابت، طباعت، کاغذ اور عام "get - up" کا تعلق ہے "فاران" کا کام اوسط درجہ کا رہا ہے، اس سے زیادہ ہم کر بھی نہیں سکتے کہ ہر شخص کو اپنی حد اور وسعت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، سلامت روی کا تقاضا بھی یہی ہے! جو رسالے بڑی آب و تاب سے نکلتے ہیں اُن کی آمدنیاں بھی بے اندازہ ہیں کیونکہ وہ ہر قسم کے اشتہارات اپنے یہاں چھاپتے رہتے ہیں، نیم عریاں تصویریں، رنگین افسانے اور فلمی تبصرے ہوں، بس پھر چاندی ہی چاندی ہے، دیکھتے ہی دیکھتے رسالہ کی اشاعت ہزاروں تک پہونچ جاتی ہے اور اگر کہیں "معمے" کی چاٹ بھی شامل ہو تو پھر مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی کوئی حد و نہایت نہیں! جھونپڑے سے رسالہ کا کاروبار شروع کیجئے اور دس پانچ سال میں محل بنا لیجئے، غریب "فاران" کے پاس یہ چٹخارے کہاں؟ مگر خدا جانتا ہے کہ اس قسم کے رسالوں کی ترقی دیکھ کر میرا جی کبھی نہیں للچایا بلکہ اپنی اس حالت پر خدا کا شکر ادا کیا۔

چار سال کی مدت میں "فاران" کا ٹائیٹل تین بار بدلا گیا ہے، اور اب جو ٹائیٹل رسالہ میں لگ رہا ہے اس کے بارے میں میرے کانوں تک یہی اطلاعیں اور رائیں پہونچی ہیں کہ یہ دونوں سے بہتر ہے رسالہ کے ظاہری حُسن کو بڑھانے کے لئے سرِ ورق دو رنگا کر دیا گیا ہے - - - -

سہ چہ کند بینوا ہمیں دارد!

"فاران" کا اب تک کوئی "خاص نمبر" نہیں نکل سکا؟ کیوں؟ اس کا حال آپ بھی جانتے ہیں اور جو نہ جانتے ہوں وہ سُن لیں کہ حالات نے اجازت نہیں دی، بس اتنا اشارہ کافی ہے ——— مگر اب ارادہ ہوا ہے کہ آئندہ سال ربیع الاول

میں "سیرت نمبر" شائع کیا جائے، اللہ تعالیٰ کے بعد جو ذات سب سے زیادہ مدح و منقبت کی مستحق ہے، وہ حضور سید الاولین والآخرین خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذاتِ گرامی ہے، اس دنیا میں کوئی شک نہیں کہ بڑے بڑے انسان پیدا ہوئے ہیں مگر پوری انسانی تاریخ میں "انسانِ کامل" بس یہی ایک گزرا ہے اور اس سے بہتر شخصیت پر آج تک آفتاب طلوع نہیں ہوا، حضورؐ ہی کے اسوۂ حسنہ کو اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے لئے آخری اور قطعی معیار مقرر فرمایا ہے، پس اس کی ضرورت ہے بلکہ سب سے زیادہ اہم فریضہ ہے کہ حضورؐ کی مقدس سیرت کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے اور اس زمانہ میں جب کہ دنیا میں "جاہلیت" پھر سے ابھر آئی ہے نبی عربی (فداہ ابی و امی) کی مقدس زندگی کا چرچا اور زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔

کام کہنے کو بہت آسان نظر آتا ہے کہ مضامین جمع کئے، کاتب سے لکھوائے اور چھپ چھپا کر "سیرت نمبر" تیار ہو گیا، مگر اس کی اہمیت اور دشواریاں میرے سامنے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "سیرت" ظاہر ہے کہ اپنی طرف سے گھڑ کر (معاذ اللہ) نہیں لکھی جا سکتی، مستند کتابوں میں جو کچھ سرکارِ ختمی مرتبت کی پاک زندگی کے بارے میں موجود ہے اسی کو پھر سے دہرانا ہے، لیکن دہرانے دہرانے میں فرق ہے، ایک ہی نغمہ مختلف سازوں سے نکلتا ہے مگر اس کا انداز بلکہ اس کی تاثیر جدا جدا ہوتی ہے! "سیرت نمبر" کی ترتیب کا خاکہ جو میرے ذہن میں ہے اس کے مطابق اگر مضامین جمع ہو گئے تو فاران کا یہ "شمارہ" کیا عجب ہے کہ ادب و اخلاق کی ایک یادگار بن کر رہ جائے! یہ میرا عزم، توقعات اور خوش اندیشیاں ہیں، ہو گا وہی جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا، نہیں کہا جا سکتا کہ جن سے میں قلمی معاونت کی آس لگائے بیٹھا ہوں وہ کس حد تک میرا ساتھ دیتے ہیں، بات یہ ہے کہ ہر زندگی آج کل مصروف ہے، کسی کو مجبور تو نہیں کیا جا سکتا، اور یہ مارے باندھے کا کام بھی نہیں ہے یہ تو خوشی کا سودا ہے۔

"فاران" کے قدر شناسوں کو یہ سن کر شاید مسرت ہو گی کہ "سیرت نمبر" کے لئے ایک خوب صورت اور دیدہ زیب سرورق تیار ہو چکا ہے، اللہ کے بھروسہ پر عزم یہ ہے کہ کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں "سیرت نمبر" بہر حال شائع کرنا ہے، اتنے دن پیشتر تیاری اسی لئے شروع کی گئی ہے کہ کام خیر و خوبی اور اطمینان کے ساتھ انجام کو پہونچ سکے، جلدی میں بہت کچھ کور کسر رہ جاتی ہے، در پھر بڑا افسوس ہوتا ہے کہ ہائے! یہ ایسا کیوں ہو گیا اور یہ کیوں نہیں ہوا۔؟

ہمارا مقصود!

"دنیا (عالَم) کی تعریف نہ جانے کب سے یہ ہوتی آئی ہے کہ چونکہ "عالَم متغیر ہے اس لئے وہ حادث ہے"! مگر آج کی دنیا پر تو یہ تعریف سو فی صدی ٹھیک منطبق ہو رہی ہے، تغیرات اور انقلابات کی کوئی حد ہے، صبح سویرے اخبار ہاتھ میں لیتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ساری دنیا زلزلوں کی آغوش میں سانس لے رہی ہے، امن و امان اور آسودگی کا دور دور پتا نہیں، قطبین کی وہ آبادی کہ جہاں گنے چنے انسان رہتے ہیں وہاں امن ہو تو ہو، ورنہ انسانوں کی آبادی میں تو ہر جگہ انتشار اور اضطراب ہی پایا جاتا ہے، مسکراہٹوں اور قہقہوں کی اس دنیا میں بظاہر آج بھی کمی نہیں ہے مگر کچھ تو بے غیرتی کے قہقہے ہیں اور کچھ مسکراہٹوں کے پیچھے نہ جانے کتنی جراحتیں اور اذیتیں چھپی ہوئی ہیں۔

روس اور امریکہ دنیا کی سب سے بڑی طاقتیں سمجھی جاتی ہیں اور وہ ہیں بھی! برطانیہ کے پاس صرف توڑ جوڑ، سیاسی شعبدہ گری اور پچھلی ساکھ کی کچھ مقدار باقی رہ گئی ہے، طاقت اور وزن نہیں رہا، جرمنی اور جاپان غلام ہیں، فرانس پچھلی جنگِ عظیم میں تیسرے درجہ کی طاقت بن چکا ہے، ہندوستان اور پاکستان نوزائیدہ حکومتیں ہیں، اور خارجی معاملات میں پچھلا تجربہ نہیں رکھتیں، پھر وہ فکر و خیال، پالیسی اور مادی اسباب اور ذرائع کے اعتبار سے بھی خود کفیل نہیں ہیں، دوسروں کی امداد کی ضرورت مند نظر آتی ہیں، عرب ممالک کو انگریز پہلے ہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ کر کمزور کر چکا ہے، ترکی اب "مردِ بیمار" نہیں رہا، وہ بلاشبہ

"صحت مند" ہے مگر کسی بڑی طاقت کی حمایت کے بغیر اُس کی بقا بھی دشوار ہے، خلافت کا منشور مصطفےٰ کمال کی نوکِ شمشیر نے چاک کر دیا، وحدت مرکزیت، وحدت اور سالمیت باقی نہیں رہی اب حکومتِ ترکی اُس خطہ کا نام ہے جہاں دو کرور انسان بستے ہیں۔

ان حالات میں آج کی دُنیا پر یہ دو طاقتیں —— امریکہ اور روس —— ہی چھائی ہوئی ہیں اور یہ دونوں طاقتیں تہذیب و تمدن اور انسانیت دوستی کے دعوؤں اور صلح و امن کے نعروں کے باوجود ایک دوسرے کے خلاف آستینیں چڑھائے کھڑی ہیں، باضابطہ جنگ کا اعلان نہیں ہوا لیکن حقیقت میں وہ "حالتِ جنگ" ہی میں ہیں، دونوں کی کوشش یہی ہے وہ اِس کو مٹا دے، وہ یہ اُس کو فنا کر دے، صلح صفائی کے امکانات معدوم سے ہیں، تلخی بڑھتی ہی جا رہی ہے اور ہر طلوع ہونے والی صبح آپس کے اختلافات میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی کر دیتی ہے۔

جنگ ہر آن تیار کھڑی ہے، نہ جانے کب لڑائی کا بگل بج جائے، دونوں طاقتیں اپنے اپنے مورچے مضبوط کر رہی ہیں، ہم اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہیں کہ یہ خوفناک جنگ کسی نہ کسی طرح ٹل جائے مگر بظاہر آثار اُمید افزا نہیں ہیں، یہ دسوں نہیں بلکہ سینکڑوں اور ہا سینکڑوں ڈالروں کی لاگت کے جو جنگی ہتھیار تیار ہوئے ہیں، آخر اُن کے استعمال ہونے کے لئے کوئی دوسری زمین اور نئی دُنیا تو بننے سے رہی، اُن کو اسی زمین پر اور اسی دُنیا میں استعمال ہونا ہے، یہ مہیب جنگی تیاریاں مدافعت پر کب تک قناعت کرتی رہیں گی، "اقدام" کے لئے کسی نہ ایک طاقت کو مجبور ہونا پڑے گا —— پھر کیا ہوگا؟ تباہی اور اتنی بڑی تباہی کہ اگلی پچھلی تباہیاں اور ہلاکت آفرینیاں اس کے آگے گرد ہو جائیں گی، چھوٹی طاقتیں جو غیر جانبدار رہنا چاہیں گی شاید وہ بھی غیر جانبدار نہ رہ سکیں گی، اُن کو پھانسا جائے گا اور کمزوروں کو پسنا ہی پڑے گا، نہیں کہا جا سکتا کہ اس آگ کی لپیٹ میں آکر کس کس ملک کے دھوئیں اُڑ جائیں گے۔

پھر ہم کیا کریں؟ کیا جنگ کے اندیشے اور اُس کی ہولناکی کو اپنے ذہن و فکر پر مسلط کر کے بالکل حواس باختہ اور قطعاً مایوس ہو جائیں گی اور کیا یہ بزدلی، کم حوصلگی اور حماقت آنے والے خطرات کا سدِ باب کر سکے گی، اگر کسی محلہ میں آگ لگ رہی ہو تو پاس پڑوس کے رہنے والوں کو اس کے بجھانے اور اپنے بچاؤ کی تدبیر کرنی چاہئے یا وہ اس خوف سے کہ جل جانا تو مقدر ہی ہو چکا ہے، چادر اوڑھ کر لیٹ جائیں، اور اپنی جانوں کو شعلوں کی نذر کر دیں۔

ہم نہ اشتراکی ہیں اور نہ امریکہ کی جمہوریت پر یقین رکھتے ہیں، ہم مُسلمان ہیں، اس لئے ہمارے مرنے جینے کا معیار بھی سب سے جُدا ہے، ہماری تمنائیں اور آرزوئیں بھی دوسروں سے بالکل مختلف ہیں، امن و راحت ہو، صلح ہو، جنگ ہو، پھولوں کی سیج ہو یا پھانسی کا تختہ ہو، ہمارا مقصود صرف "رضائے الٰہی" ہے، ہمارا جینا اور مرنا اللہ ہی کے لئے ہے، "انا للہ" یہ ہے ہماری زندگی کا آغاز اور "وانا الیہ راجعون" یہ ہے ہماری زندگی کی آخری منزل! جان ایک نہ ایک دن جانی ہے، اس دُنیا کو بہر حال برباد اور ختم ہونا ہے، قیامت آکر رہے گی، پہاڑوں، ستاروں اور آسمانوں کو دُھنکی ہوئی روئی کی طرح ایک دن ہو ہی جانا ہے، کائنات کا ہر ذرہ فنا آمادہ ہے، خدا کی ذات کے سوا ہر چیز "فانی" عارضی اور فنا ہو جانے والی ہے، سدا نہ کوئی رہا ہے اور نہ رہے گا —— تو "مردِ مومن" ہونے کی حیثیت سے ہمیں انقلابات سے خوف نہیں کرنا چاہئے، اللہ کی مشیت تکوینی کو بدل دینا ہمارے بس کی بات نہیں، مقدرات کو کون ٹال سکتا ہے، جان جائے یا رہے، اطمینان کا ماحول ہو یا خطرات کی زندگی، کوئی عالم اور کیسی ہی حالت کیوں نہ ہو، ہمارا مقصود رضائے الٰہی ہونا چاہئے، اسی میں ہماری کامیابی ہے، یہی ہماری منزل ہے اور اسی میں ہماری نجات ہے۔

پاکستان میں اسلامی حکومت کا قیام، ہم اسی لئے چاہتے ہیں کہ یہی اللہ تعالیٰ کی رضا اور منشا ہے، پس انقلابات کی شورشوں

میں بھی ہمیں اپنے مقصد سے غافل نہیں رہنا چاہیئے، جہاں تک خارجی تعلقات کا تعلق ہے ہم کسی کے ساتھ مل کر رہیں یا غیر جانبدار رہیں ان دونوں حالتوں میں مقصود اللہ کی خوشنودی اور اُس کی رضا ہونی چاہیئے بس پھر کوئی غم نہیں چاہے بجلیاں ہی سر پر کیوں نہ ٹوٹ پڑیں پھر بھی ہم کامیاب ہی رہیں گے ——— اور اگر مقصود کوئی اور چیز ہو تو پھر ہمارے سروں پر پھولوں کی بارش بھی ہوئی تو بھی ہم ناکام ہی سمجھے جائیں گے۔

افسوس ہے کہ ہمارے ارباب اقتدار نے ابھی تک اس حقیقت کو نہیں سمجھا، اور انگریز کرسیوں اور عہدوں کی جس ہوس میں اُلجھا گیا ہے بس اُسی میں اُلجھے ہوئے ہیں، مگر اُن کی تمناؤں کی خاطر ہم تو اپنی دُنیا اور دین برباد کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، زیادہ دن تک یہ باتیں برداشت نہیں کی جاسکتیں، قرارداد مقاصد کے بعد دستوری سفارشات بھی منظر عام پر آچکیں مگر حکومت کی پالیسی اور خود ارباب حکومت کی زندگیوں میں کوئی تبدیلی ہمیں تو دکھائی نہیں دیتی، آخر یہ غفلتیں کب تک! یہ سرشاریاں اور فرض ناشناسیاں کب تک؟

"فاران" اس سلسلہ میں جس طرح اب تک اظہارِ حق کرتا رہا ہے، انشاء اللہ آئندہ بھی کرتا رہے گا، اُس کی پالیسی کسی لالچ اور دباؤ سے بدل نہیں سکتی، اُس کا بس ایک ہی مسلک ہے اور کسی قیمت پر وہ اپنے مسلک کو نہیں چھوڑ سکتا، چاہے سارا زمانہ اُسے چھوڑ دے!

بارِ الٰہا! حق دکھا، حق پر قایم رکھ اور حق کے لئے جدوجہد کرنے کی پوری پوری توفیق عطا فرما، یہ سر چاہے کٹ جائے مگر تیرے آستانہ کے سوا اور کہیں جھکنے نہ پائے، اس دل میں تیرے خوف کے سوا اور کسی کا خوف نہ سما سکے، تنگی اور آسودگی میں مصیبت اور راحت میں تیرا ہی دھیان رہے اور تیری ہی رضا مطلوب اور مقصود ہو! اے قادرِ مطلق! بدی سے نفرت اور بھلائی سے رغبت کا جذبہ عطا فرما، بُرائی دل میں تیر کی طرح کھٹکنے لگے، اور بھلائی میں لذت محسوس ہو، وہ ہمت دے کر "عشق" آج بھی آتش نمرود میں بے خطر کود پڑے اور سچائی آج بھی کربلا کے میدان میں اپنا سب کچھ لُٹا دے۔

جانتے ہیں کہ ہم بہت کمزور ہیں مگر تیری تائید حاصل ہو گی تو کس کی ہمت ہے جو حق کے اس سیل رواں کو روک سکے! ابابیلوں کی کنکریوں سے ہاتھیوں کی فوج کو "عصفٍ ماکول" بنا دینے والے خدا! تیرے ہی کرم اور قدرت کے بھروسہ پر ظلم و حق ناشناسی اور کفر و جاہلیت سے ٹکرانے کے لئے تیرے بندوں نے کمر ہمت باندھی ہے، تو چاہے گا تو وہ حق جو آج مظلوم ہے مستقبل کی سب سے بڑی غالب قوت بن جائے گا، اور ماضی کے فرعون اور نمرود جو آج چرچلوں، اسٹالنوں، آئزن ہووروں اور ہماسبھائیوں اور جن سنگھیوں کے بھیس میں نظر آتے ہیں یا تو ان کو حق کے آگے جھکنا پڑے گا ورنہ "تبت یدا ابی لہب وتب" کی وعید پر ان کا حشر ہو گا۔

ارض و سمٰوات کے خالق! قیامِ حق کے نظارے سے ان آنکھوں کو ٹھنڈک عطا فرما!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ!

فرمان فتحپوری

اُردو رسم الخط

کچھ لوگوں کو بیٹھے بٹھائے سوجھتی ہیں۔ اور جدتیں سوجھتی ہیں، ایک کام اچھی طرح چل رہا ہوتا ہے مگر وہ اُس میں بدعت کی مین میکھ نکالتے ہیں، اُردو زبان کو بھی اپنے اسی قسم کے جدت نوازنادان دوستوں سے سابقہ پڑا ہے، اب سے چند سال پہلے یہ کوشش کی گئی کہ اُردو زبان کو آسان اور عام فہم بنایا جائے ——— حالانکہ اُردو زبان جن فطری اور تدریجی مراحل سے گزر کر اب جہاں پہونچ چکی ہے وہ ایک معیاری زبان ہے اور عوام و خواص دونوں کی زبان ہے، اب اُس میں آپ کاٹ چھانٹ کریں گے اور ایک معیاری زبان کو آسان بنائیں گے تو یہ ایک غیر فطری کوشش ہوگی، سوچ سمجھ کر "محبت" کی جگہ "پریم" "مشکل" کی جگہ "کٹھنائی" پبلک اور عوام کی جگہ "جنتا" لیڈر کی جگہ "نیتا" انصاف کی جگہ "نیائے" "منصب کی جگہ" پدوی" "چیز کو" "وستو" لیکچر کو "دیاکھیان" "تدبیر کو" "اُپائے" اور توہین کو "اپمان" کہنا ——— اُردو زبان کے ساتھ دوستی ہے کہ دشمنی ہے! یہ مرعوبیت ہے، شکست خوردگی اور پسپائی ہے، ہندوستان میں جو لوگ اُردو کی حمایت کر رہے ہیں اُن کی خدمت میں خاص طور سے یہ گزارش کی جا رہی ہے کہ اپنے موقف کو وہ پہچانیں، اور جبر و زیادتی کے آگے ہتھیار نہ ڈالیں۔

دوسری آواز اُردو رسم الخط کے آسان بنانے کے لئے بلند کی جا رہی ہے، یہ مشورہ بھی ایک "شوخیٔ فکر" سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا! دشواریوں کو آسانیوں سے بدلنا اور مشکلات کو کم کرنا اور گھٹانا یقیناً ایک مفید بلکہ تعمیری کوشش ہے، لیکن یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ آسانیوں کی اس کوشش میں کہیں، اصل مقصد ہی مجروح نہ ہو جائے۔

"ا" اور "ع" دو حرف ہیں ان سے جو لفظ بنتے ہیں، وہ اپنے معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ممتاز ہیں، اب اگر کوئی یہ کہے ان میں سے صرف ایک حرف "الف" باقی رکھا جائے اور "ع" کو زبان سے نکال دیا جائے ——— تو پھر "عزت" کو "ازت" اور "عرب" کو "ارب" لکھا جائے گا، اور اس آسانی کے بعد "عرب" اور "ارب" میں جو امتیاز پایا جاتا ہے "ارب" کے بعد وہ امتیاز باقی نہ رہے گا، اور اس طرح یک مشکل دور ہوگی تو اس سے زیادہ بڑی مشکل اور شدید دشواری آن کھڑی ہوگی۔ اسی طرح "ز، ذ، ض، ظ" کی جگہ صرف "ز" کو باقی رکھا جائے اور باقی حروف خارج کر دیئے جائیں تو ایک طالب علم کو "محفوظ"[1] کے بارے میں آپ کس طرح سمجھائیں گے کہ اس کی اصل "حفظ" ہے جب کہ آپ اسے بھی "حفز"[2] ہی لکھیں گے!

اس تبدیلی کے بعد آسانیاں تو پیدا ہونے سے رہیں، بیچاری اُردو زبان کا حلیہ بگڑ جائے گا۔

جناب فرمان فتحپوری کا یہ مقالہ اس "احمقانہ تجویز" کے خلاف ایک دانشمندانہ احتجاج ہے:— (ماہر القادری)

---

[1] محفوظ [2] حفظ

مئی سنہ ۵۲ء کے "خاور" میں مدیر خاور جناب عندلیب شادانی کا ایک مضمون بعنوان "دعوت فکر" شائع ہوا ہے اس مضمون میں موجودہ اُردو رسم الخط کی دشواریوں کا اظہار کرتے ہوئے ضروری ترمیم و تنسیخ کے لئے چند تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں۔ اور اس بارے میں دوسرے اُردو جاننے والوں سے بھی آراء طلب کی گئی ہیں ۱۹۴۷-۴۸ء میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے بھی بالکل اسی نوعیت کا ایک مقالہ سپرد قلم کیا تھا جو اُن کی تصنیف "ادب و انقلاب" میں بھی شامل ہے۔ بلکہ شادانی صاحب کا مضمون باعتبار استدلال و امثال اختر حسین رائے پوری ہی کے مضمون سے ماخوذ ہے۔ اُس وقت چونکہ اُردو کا مسئلہ سیاسی عینکوں سے دیکھا جا رہا تھا۔ لہٰذا اخلاص و عدالت سے اس معاملے کو سلجھانے کے امکانات ہی نہ تھے۔ اب یہ مسئلہ پھر اٹھایا گیا ہے اور بہت برمحل۔

اُردو رسم الخط کی چند دشواریاں فی الواقع کبھی کبھی ہر اُردو نواز کے دل میں چٹکیاں لیتی ہیں یہ اور بات ہے کوئی اُن کا اظہار کرے کوئی نہ کرے۔ مدیر خاور نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے دوسرے اُردو ادیبوں کو بھی "دعوتِ فکر" دی ہے۔ لیکن یہ دعوتِ فکر ہمارے اہل قلم کے لئے مشکل ہی سے درخور اعتنا ہو سکے۔ کیونکہ پارسال "نگار" میں پروفیسر احتشام نے "زبان اور رسم الخط" کے عنوان سے اسی انداز کی بحث چھیڑی تھی جس کے لئے "نیاز فتحپوری" نے چند اہل قلم کے نام دے کر گزارش کی تھی کہ وہ اس بحث میں حصہ لے کر اس معاملہ کو ہمیشہ کے لئے طے کر لیں۔ لیکن پروفیسر شوکت سبزواری، مولوی عزیز حسین مرادآبادی اور راقم الحروف کے مضمون کے علاوہ چوتھا مضمون "نگار" میں میری نظر سے نہیں گزرا اور وہ بحث جہاں کی تہاں پڑی رہ گئی۔ احتشام صاحب کی بحث عام رسم الخط اور زبان سے متعلق تھی اور مدیر "خاور" کی بحث اُردو رسم الخط کے لئے مخصوص ہے اس لئے مجھے اُمید ہے کہ اس مرتبہ ہمارے اہل قلم اپنا ذاتی مسئلہ سمجھ کر اس موضوع پر ضرور کھل کر گفتگو کریں گے۔ اور کسی آخری نتیجہ پر پہونچ جائیں گے۔

ماہنامہ "خاور" میں فاضل مقالہ نگار نے اُردو رسم الخط کی دشواریوں کا اصل سبب متشابہ الصوت حروف کی کثرت کو قرار دیا ہے۔ چونکہ اُردو میں ہم آواز حروف متعدد ہیں اور پھر بولنے میں ان کا صوتی امتیاز بھی مٹ جاتا ہے اس لئے "بچے اور کم استعداد لوگ" املا میں بڑی دشواری محسوس کرتے ہیں اور صاحبِ مضمون کے خیال کے مطابق اگر (ا۔ ع) (ت۔ ط) (ث۔ س۔ ص) (ح۔ ہ) (ز۔ ذ۔ ض۔ ظ۔ ژ) میں ہر گروپ (group) سے ایک ایک حرف منتخب کر لیا جائے اور اُسے بقیہ ہم آواز حروف کی جگہ استعمال کیا جائے تو اُردو رسم الخط ضرور آسان ہو جائیگا۔ اسے دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اُردو حروف تہجی سے (ع۔ ء) (ط) (ث۔ ص) (ذ۔ ض۔ ظ۔ ژ) (ح) کو ہمیشہ کے لئے خارج کر کے اُن کی جگہ بالترتیب حرف ا۔ ت۔ س۔ ز۔ اور ہ کو برقرار رکھیں۔ اور اس طرح زبان میں کوئی خرابی واقع نہ ہو گی کیونکہ فاضل مضمون نگار کے خیال میں "املا کا دارومدار صوت یا آواز پر ہے"۔

اس بحث میں پڑنے سے پہلے یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اُردو رسم الخط کیا فی الواقع دشوار ہے۔ کیا یہ دشواریاں دوسری زبانوں میں نہیں ہیں۔ اور کیا اُردو کی طرح دوسری زبانوں کے مُبتدیوں اور بچوں کو یہ دشواریاں پیش نہیں آتیں۔ اُردو میں ہم صوت حروف کی تعداد چودہ ہے۔ اگر اوپر دیئے ہوئے فکر کے مطابق پانچ حروف شامل رہیں تو پھر صرف نو ہم آواز حروف کی دشواریاں رہ جاتی ہیں۔ اب ذرا اسی نہج سے دوسری زبانوں پر نگاہ ڈالئے۔ اور دیکھیں کہ اُردو رسم الخط اُن کے مقابلہ میں کتنا مشکل ہے۔ اُردو رسم الخط عربی سے مستعار ہے لیکن اُردو اعراب کی ضرورت نہیں ہے اور عربی میں ہم صوت حروف کی دشواریوں کے ساتھ یہ دشواریاں بھی لاحق ہیں۔ مزید برآں چونکہ عربی افعال میں ضمائر مستتر ہوتے ہیں اور صرف زبر۔ زیر اور پیش کی مدد سے اکثر جنس۔ صورت اور صیغے اور اتی (Gender voice– Number and Mood) بدل جاتی ہیں۔ اس لئے یہ مسئلہ

دشوار سے دشوار تر ہو جاتا ہے۔ اُردو عربی کے تابع ہوتے ہوئے بھی ان دقتوں سے اس لئے بچ گئی کہ اُردو کے تمام افعال ہندی سے لئے گئے ہیں۔ فارسی رسم الخط بھی چونکہ اُردو اور عربی رسم الخط کا ہم شکل و صورت ہے لہٰذا اُسے بھی اُردو سے آسان تر نہیں کہا جا سکتا۔ ہندی رسم الخط کو بعض لوگ بہت آسان کہہ دیتے ہیں لیکن وہاں بھی دشواریاں کم نہیں ہیں۔ ہندی میں حروف تہجی کی تعداد بہت سی زبانوں سے زیادہ ہوتے ہوئے بھی ہم آواز حروف کی تعداد اُردو سے کم نہیں ہے۔ مثلاً (प - त्व) (ब - झ) (स्र - ह्न) (ث، अ - ह्र) (त्र، आ) کے علاوہ تنہا "ج" کا استعمال پانچ چھ طرز سے ہوتا ہے۔ اب رہی انگریزی اور فرانسیسی سو ان کا رسم الخط مساویانہ انداز پر سب سے زیادہ مشکل ہے۔ یہ میں نے اس لئے کہا کہ دونوں زبانوں میں حروف تہجی کی تعداد مساوی اور اُن کے حروف بھی بالعموم ہم آواز اور ہم مخرج ہیں۔ انگریزی میں (A - E - I - O - U) کی آوازیں بظاہر مختلف ہیں۔ لیکن الفاظ میں اکثر جگہ ان کی آوازیں یکساں ہیں اور املا کے وقت ان میں تمیز پیدا کرنا سخت دشوار ہے۔ جیسے (AT, EARLY, SIR, OUGHT, UGLY) ہیں۔ اسی طرح J. G. کی آوازیں۔ V اور W کی آوازیں۔ CEASE اور SEA میں C اور S کی آوازیں۔ PIKCHER اور PICTURE میں "چ" کی آواز۔ ZOO اور HAS میں Z کی آواز۔ SURE, FASHION, TUTION, ADMISSION, OCEAN اور SHE میں "ش" کی آواز۔ PROFIT اور PROPHET میں "F" کی آواز KITE, QUITE اور CAT میں K کی آواز۔ علاوہ ازیں انگریزی اور فرانسیسی میں کتنے الفاظ ایسے ہیں جن میں ملفوظہ حروف مکتوب نہیں ہوتے۔ اور مکتوب حروف ملفوظ نہیں ہوتے۔ لیکن کیا ان دشواریوں نے ان زبانوں کی ترقی کے امکانات محدود کر دیئے ہیں اگر جواب نفی میں ہے تو پھر اُردو املا کی معمولی دشواری ہی کو دشواری کیوں گردانا جائے اور اُسے اپنے ماسبق اور ماحضر کے حدود ہی میں پھولنے پھلنے کا موقع کیوں نہ دیا جائے۔

لیکن اس بے جا تقابل سے کیا فائدہ؟ اگر اُردو رسم الخط آسان سے آسان تر بنایا جا سکتا ہے تو دوسری زبانوں کی تقلید میں اس سے کیوں انحراف کیا جائے۔ اور صاحب مضمون کے مجوزہ ترمیمات و تغیرات پر کیوں نہ پوری طرح غور و خوض کر لیا جائے۔ صاحب مضمون کا کہنا ہے کہ "کئی حروف کی آوازیں جو عربی میں مختلف تھیں اُردو میں آکر ایک ہو گئی ہیں۔" اور چونکہ "املا کا دارو مدار آواز پر ہے اور یہی وجہ ہے کہ بچے اور کم استعداد لوگ املا میں غلطی کرتے ہیں۔ اُن کے ذہن میں صرف آواز ہوتی ہے۔ جیسا سُنتے ہیں ویسا لکھتے ہیں۔" بچے اور کم استعداد لوگوں سے مشروط ہو کر یہ دلیل بڑی کمزور ہو گئی ہے۔ کیونکہ بچے اور کم استعداد لوگوں کی دشواریوں کو تمام اُردو خوانوں اور اُردو دانوں پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ کسی معیاری زبان کا کام بچے اور کم استعداد لوگوں کو اپنی بلند سطح پر لانا ہے نہ کہ اُن کی خاطر اپنی سطح سے فروتر ہو جانا۔ دوسرے یہ بات بھی اصولی طور پر نہیں مانی جا سکتی کہ اُردو میں عربی حروف کی آوازیں ہر جگہ ایک ہو گئی ہیں۔ کیونکہ کم از کم پہلے گروپ (Group) کے حروف (ا - ع) کی آوازیں ہر جگہ یکساں نہیں ہیں (اس گروپ میں "ہمزا" کو بھی شامل ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وہ ایک مستقل حرف کا کام کرتا ہے۔ اور اُس کی آواز ا اور ع سے متشابہ ہے) معاد - اعلان - اعادہ - معدہ - میعاد اور مدعا وغیرہ میں ع کی آوازیں نمایاں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مبتدی اور کم استعداد اس فرق کو محسوس نہ کر سکیں۔ اور اُن کی یہ نافہمی زبان میں تغیرات کرنے کا حق نہیں رکھتی۔ کیونکہ بچے اور کم استعداد لوگ تو اکثر الفاظ کا غلط تلفظ کرتے ہیں۔ مثلاً رکعت میں ک کو متحرک اور ع کو ساکن کر کے "رکات" پڑھتے ہیں۔ تو کیا اسے درست سمجھا جائے گا۔ اور اگر اس قسم کے تلفظ کو صحیح بھی مان لیا جائے تو کیا ع اور ہمزا کو ہر جگہ ا سے بدلا جا سکے گا۔ ہمزا کو ہٹانے سے تو بعض الفاظ کا املا ہی ناممکن ہو جائے گا، مثلاً فائدہ۔ زائد۔

تائید۔ بندۂ زر وغیرہ۔ اور نہ ہر جگہ ع کی کمی ا ہی سے پوری ہو سکے گی بلکہ اس راستے میں ذیل کی چند دشواریاں حائل ہوں گی۔

(۱) بعض الفاظ سے حرف "ع" کو ساقط کر دینا ہو گا اور ا کی ضرورت ہی نہ ہو گی۔ مثلاً موضوع۔ ممنوع۔ وقیع وغیرہ

(۲) ایسے الفاظ جن میں ع کے ماقبل یا مابعد ا ہو گا اور ماقبل کے ا کی حرکت "ع" کی حرکت کے مطابق نہ ہو گی ا کا استعمال ممکن ہی نہ ہو گا۔ جیسے اعادہ۔ اعلان۔ انعام وغیرہ

(۳) بعض جگہ ع کو بجائے ا کے یائے مجہول سے بدل پڑے گا مثلاً۔ قانع۔ صانع اور مانع آواز کے مطابق ترتیب سے قانے۔ صانے اور مانے، ہو جائیں گے۔

(۴) کثر ع کی جگہ (اکے بجائے "ہمزا" کی ضرورت ہو گی اور اگر اصولاً ہمزا کو بھی خارج کر دیا گیا تو ان کا املا ناممکن ہو جائے گا ورنہ تعب۔ لعب۔ مدعی کو۔ تئب۔ لئب اور مدئی لکھا جائے گا۔ کہیں کہیں ع کو یائے معروف سے بدلا جائے گا۔ جیسے کہ خود صاحب مضمون نے مثالاً "استعمال" کو "استیمال" لکھا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان تمام صورتوں میں اصل تلفظ کچھ نہ کچھ ضرور مجروح ہوتا ہے۔ بایں ہمہ وجوہ اگر اصولی طور پر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ املا کا دارومدار صرف صوت یا آواز پر ہے" اور" جیسا سنتے ہیں ویسا لکھتے ہیں" کو معیار قرار دے لیا جائے تو صاحب مضمون کی مجوزہ تبدیلیوں کے علاوہ حسب ذیل تغیرات بھی لازم آجائیں گے۔

(۱) اردو میں رواج پائے ہوئے عربی مرکبات اضافی و توصیفی سے ال یا صرف ا کو ساقط کرنا ہو گا۔ مثلاً ابن الوقت عبدالصمد اور عبدالرب کو ابن لوقت۔ عبدصمد اور عبدرب لکھا جائے گا۔

(۲) اکثر الفاظ میں تنوین کے بجائے ان کی آواز کے مطابق حروف استعمال ہوں گے۔ مثلاً دفعتاً۔ سلامٌ اور مثلاً کو ترتیب وار دفعتن۔ سلامُن اور مثلن لکھا جائے گا۔

(۳) چونکہ واو معدولہ آواز نہیں دیتا اس لئے ہر جگہ حذف ہو جائے گا اور خود خوشی۔ خواہش۔ خوشبو وغیرہ کا املا خُد۔ خُشی۔ خاہش اور خشبو ہو جائے گا۔

(۴) فارسی کے مُرکبات اضافی کے مضاف کے زیر کو صوتی بنیادوں پر یائے مجہول سے بدلنا ہو گا۔ مثلاً بندۂ خدا۔ راہ صواب وغیرہ کو بندئے خدا اور رہے صواب لکھ جائے گا۔ اور پھر میر انیس کے ان مصرعوں کے متعلق ع :-

گنج نبی کے گوہر یکتا حسین ہیں
کان نبی کے گوہر یکتا حسین ہیں
بحر نبی کے گوہر یکتا حسین ہیں

جو صوتی ذم کا لطیفہ مشہور ہے وہ تحریر میں آکر نہ صرف مستقل ذم کا پہلو اختیار کرے گا بلکہ آئے دن اس قسم کے لطیفے رواج پاتے رہیں گے جن کی کوئی توجیہ بھی نہ ہو سکے گی۔

(۵) اکثر الفاظ میں اشباعی حرکتیں آواز کے قرینے سے دوسرے حرف سے بدل جائیں گی۔ مثلاً فی نفسہٖ۔ دام اقبالہٗ کو فی نفسہی اور دام اقبالہو لکھا جائے گا۔

(۶) جن عربی و فارسی الفاظ میں نون کے بعد "ب" آتا ہے اُن میں "م" کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا دو شنبہ انبیاء۔ منبر۔ منبع وغیرہ کو دوشمبہ۔ امبیا۔ ممبر اور مبیا لکھ جائے گا۔

(۷) ایسے مرکبات عطفی ہیں جن میں حرف عطف کی آواز نمایاں نہ ہوگی حرف عطف کے ماقبل کے حرف کو متحرک کر لینا کافی ہوگا۔ جیسے صبر و شکر۔ نقل و حرکت وغیرہ کو صبرُشکر۔ نقلُ حرکت لکھ جائے گا۔

(۸) عربی کے ایسے الفاظ سے جن کے املا میں "یائے" کے اوپر ا آتا ہے ی خارج ہو جائے گی اور عقبیٰ۔ عیسیٰ۔ موسیٰ کو عقبا۔ عیسا اور موسا لکھا جائے گا۔

(۹) فی الواقع۔ فی الحقیقت فی الوقت کا املا فل واقع۔ فلحقیقت اور فلوقت ہو جائے گا۔

(۱۰) ہائے مختفی یا ہائے ہوز جو اکثر حرف اظہار حرکت کے لئے آتی ہے حذف ہو جائے گی۔ اور چہ۔ کہ۔ کلمہ۔ ماکہ۔ قبلہ۔ کعبہ اور خانہ کوچہ۔ کے۔ کلما۔ خاکا۔ قبلا۔ کابا اور خانا لکھا جائے گا۔

(۱۱) عربی کے حرف جار جو اردو میں مستعمل ہیں حذف ہو جائیں گے۔ اور بالکل۔ بالفعل۔ بالذات اور بالفرض کا املا بلکل۔ بلفعل۔ بذات اور بلفرض ہو جائے گا۔

مختصر یہ کہ اگر صرف اصوات پر املا کا انحصار کیا گیا اور اصوات کی صحت کا بھی کوئی معیار نہ ملحوظ رہا بلکہ "جیسا سنتے ہیں ویسا لکھتے ہیں" پر عمل کیا گیا تو تمام مذکورہ بالا تبدیلیوں کو بھی اردو رسم الخط میں اصولی جگہ دینی ہوگی۔ اور اس طرح موجودہ زبان کی شکل جس قدر مسخ ہوگی اس کا اندازہ اوپر لکھے ہوئے لفظوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

اب آیئے رسم الخط میں ترمیم کی تائید میں صاحب مقالہ کی دوسری دلیلوں کا جائزہ لیں۔ فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے۔

"یہ کہنا درست نہیں کہ تحریر میں دیکھ کر لفظوں کے معنی سمجھ لیتے ہیں۔ درحقیقت لفظ کے معنی تو پہلے ہی سے معلوم رہتے ہیں۔ حروف تو ہمیں اس لفظ کا تلفظ متعین کرنے میں مدد دیتے ہیں" یہاں آخری جملے سے کم از کم اس امر کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ "جیسا سنتے ہیں ویسا لکھتے ہیں" تلفظ کا معیار نہیں۔ بلکہ حروف تلفظ متعین کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ املا کا مدار صرف سماعت پر نہیں بلکہ کتابت پر بھی ہے۔ دوسری دلیل کہ "تحریر میں دیکھ کر معنی سمجھ میں نہیں آتے بلکہ معنی پہلے ہی سے معلوم ہوتے ہیں" بظاہر وزنی نظر آتی ہے لیکن ذرا سوچیں تو اس دلیل کی بنیادیں بھی ہلتی ہوئی ہیں۔ کسی لفظ کے بنیادی معنی۔ مادہ۔ مخرج یا مصدر کے معنی تو فی الواقع ہم تحریر سے نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن اگر ان کے معنی پہلے سے معلوم ہوں تو ان سے بنے ہوئے ہزاروں لاکھوں الفاظ کے معنی سمجھنے میں املا ضرور معاون ہوگا۔ مثلاً اگر ہمیں عقل و خطاب کے معنی الگ الگ معلوم ہوں تو پھر عقول۔ عاقل۔ عقلیات۔ عقلی۔ معقول۔ معقولیت۔ تعقل۔ عقلمند۔ عقیلہ اور خطبہ۔ خطیب۔ خطاب۔ خطابت۔ مخاطبہ۔ تخاطب۔ مخاطب۔ وغیرہ کے معنی سمجھنے میں املا صحیحا مدد دے گا۔ ایسے الفاظ کا املا بدلنے کی صورت میں ان کا مادہ یا ماخذ (ROUTE AND ORIGIN) گم ہو جائے گا۔ اور ہر لفظ کے معنی جاننے کے لئے الگ الگ لغت یا ماہر لغت کی ضرورت ہوگی۔ اور ایسے مشتقات اور متعلقات کے معنی ذہن و ادراک نکالنے کے بجائے اس کے مادے کے معنی کی طرح (ROUTE) رٹنا پڑے گا چونکہ اردو میں ایسے الفاظ کی کثرت ہے اس لئے مستثنیات (EXCEPTIONS) کا اصول بھی کام نہ دے گا اور ظاہر ہے کہ اس سے زبان کی تفہیم و تعلیم دشوار تر ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ رسم الخط میں ترمیم سے زبان کے صورت و معنی دونوں متاثر ہوں گے ورنہ نئے املا مروجہ رسم الخط میں ایسا بُعد واقع ہوگا کہ مادہ اور مخرج (R.OUTE) (ORIGIN) کے غائب ہونے کے بعد نئے املا کے الفاظ کی لغوی تحقیق ناممکن ہو جائے گی۔ مختلف زبانوں سے حروف کے توسط سے اردو کا جو رشتہ ہے وہ منقطع ہو جائے گا اور اردو کی تحقیق و تدقیق کا دروازہ مدتوں کے لئے بند ہو جائے گا۔ لہٰذا صاحب

مضمون کا یہ کہنا "جس وقت مجھے یا کسی اور کو لفظ کی لغوی تحقیق مقصود ہوگی تو لغت کی کتابیں موجود ہیں۔ کوئی دشواری نہ ہوگی" درست نہیں معلوم ہوتا۔

اب آئیے چند سطریں نئے املا میں لکھکر تمام متذکرہ مجوزہ بالا ترمیمات کا جائزہ لیں۔

"میرا دادا ہے ان اداؤں میں ایک بھی غیر ماسوم ادا نہیں اسمت پر فلسفیانہ نکتہ سنجی ایک ایسے دماغ کے لئے جو المی بہسوں سے لگاؤ رکھتا ہو خشش آیند مشغلا ہے۔ التجا تو بے موقا ہوگی ہاں اتنی آرزو ضرور ہے کاش کبھی وہ اس طرف متوجا ہو اور میرے اس ادا کو کہ نسیت اسمت مرادف الفاظ ہیں قریہ سالحہ سے جانچے اور اپنے زوق المی کا سبوت دے۔ گو میرے قبل از وقت ازہار رائے کو آپ بے تکی شہنائی سے تشبیہ دیں گے۔ لیکن اس خیال سے کہ "پندار" جب ناقابل تحمل ہو جائے اس کا ازہار مایوب نہیں میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ نامزد موزو پر نقد و نزر کے باد جو تسویر دفاتن چشم تسوور کے آگے آ کر کھڑی ہو جائیگی وہ ایک اورت ہوگی۔ سچ فرمائیے انسانی تخیل کی یہ بہترین سناعی اپنی نوییت کے لہاز سے جان دینے کے لایق ہے یا نہیں"

(خاور مئی ۵۲ء صفحہ ۳۸)

یہ سطور دانستہ املا کو دشوار یا آسان بنانے کی غرض سے وضع نہیں کی گئیں بلکہ صاحب مقالہ ہی کے ایک مضمون کے مختصر پیراگراف کو مجوزہ املا میں تبدیل کر دیا گیا ہے تاکہ نئے املا کی فطری دشواریاں سامنے آ جائیں۔ یہ عبارت جس قدر نامانوس اجنبی وحشت ناک صحیح طور پر پڑھنے اور لکھنے کے لئے دشوار ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اصل عبارت یہ ہے:۔

"میرا دعویٰ ہے ان اداؤں میں ایک بھی غیر معصوم ادا نہیں۔ عصمت پر فلسفیانہ نکتہ سنجی ایک ایسے دماغ کے لئے جو علمی بحثوں سے لگاؤ رکھتا ہو خوشش آئند مشغلہ ہے۔ التجا تو بے موقع ہوگی ہاں اتنی آرزو ضرور ہے کاش کبھی وہ اس طرف متوجہ ہو۔ اور میرے اس ادعا کو کہ "نسایت و عصمت مرادف الفاظ ہیں" قریحہ صالحہ سے جانچے اور اپنے ذوق علمی کا ثبوت دے۔ گو میرے قبل از وقت اظہار رائے کو آپ بے تکی شہنائی سے تشبیہ دیں گے لیکن اس خیال سے کہ پندار جب ناقابل تحمل ہو جائے اس کا اظہار معیوب نہیں۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ نامزد موضوع پر نقد و نظر کے بعد جو تصویر دفعتاً چشم تصور کے آگے آ کر کھڑی ہو جائے گی وہ ایک عورت ہوگی۔ سچ فرمائیے انسانی تخیل کی یہ بہترین صناعی اپنی نوعیت کے لحاظ سے جان دے دینے کے لائق ہے یا نہیں۔"

(صفحہ ۳۸ - خاور مئی ۵۲ء)

املا کی تبدیلی سے جیسا کہ اوپر کے مثال سے ظاہر ہے اکثر الفاظ کی شکل و صورت یکساں ہو جائے گی۔ مثلاً عرض اور ارض کا املا ارز ہو جائے گا اور صاحب مضمون کا خیال ہے کہ "اس سے لفظ کے معنی متعین کرنے میں قباحت نہ ہوگی کیونکہ پہلے سے بھی اس قسم کے الفاظ موجود ہیں جن کے کئی کئی معنی ہیں۔ اور محل و مقام کی مناسبت سے مختلف معنی سمجھ لیتے ہیں۔" اول تو ہر لفظ صرف ایک لغوی معنی رکھتا ہے بقیہ معنی مجازی یا التزامی ہوتے ہیں۔ اور اگر کسی لفظ کے "دو" یا اس سے زائد معنی ہوں بھی تو اسے زبان کا حسن نہیں کہا جا سکتا۔ کیوں کہ اس تنوع پسندی سے ذہن و حافظہ کی الجھنیں بڑھتی ہیں نہ کہ زبان کی تفہیم میں آسانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اردو چونکہ مختلف زبانوں سے مرکب ہے اس لئے اس میں یوں ہی متشابہ الصوت و متحد المعنی الفاظ کی کثرت ہے اور اگر رسم الخط میں مذکورہ بالا ترمیمیں وقوع پذیر ہوئیں تو ہر لفظ کے معنی بجائے سمجھنے کے "بوجھنے" پڑیں گے۔ یہ خیال کہ "طالب علم کو خاص درجہ تک پہنچ کر یہ حروف بھی سیکھ لئے جائیں" (وہ حروف جن کو متروک کرنے کا خیال ہے) صحت مند نہیں معلوم ہوتا۔ کیوں کہ جب ایک خاص مدت تک ان حروف سے کافی

ناآشنا ہوں گے تو پھر انہیں سیکھنا اور مہارت حاصل کرنا ایک نئی زبان سیکھنے کے مرادف ہوگا۔ لہٰذا یہ دو عملی نقطۂ نگاہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس سے زبان دو خاص حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور پھر زبان کا معیار قایم کرنے کی صورت بھی باقی نہیں رہتی۔

صاحب مقالہ کا یہ کہنا کہ قرآن مجید کے جن الفاظ کا تعلق ہمارے دین و مذہب سے ہے اُن کے املا میں یہ کہیں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا حامی نہیں" کسی اصول کی بنا پر ہے یا صرف عقیدت پر مبنی ہے۔ مسلمانوں کے کلچر۔ تہذیب۔ مذہب اور مذہب کے ماتحت ہر شعبۂ زندگی و روایات و تلمیحات کے سوا اُردو میں ہے کیا۔ اس مضمون میں فہرست دینے کی گنجائش تو نہیں لیکن یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہو کہ "دو ڈیڑھ سو" نہیں بلکہ قرآن کے بے شمار ایسے الفاظ اُردو میں مروج ہیں جن کا تعلق ہمارے دین و مذہب سے ہے اور یہاں بھی استثناء کا سوال نہیں اٹھتا۔ دوسرے یہ کہ مجوزہ ترمیموں سے اُردو اور عربی و فارسی میں اس قدر مغائرت ہو جائے گی کہ اُردو دانوں کو عربی و فارسی سیکھنے اور عربی و فارسی جاننے والوں کو اُردو سیکھنے کی جو سہولتیں میسّر ہیں وہ یکسر مفقود ہو جائیں گی۔

یہ ہیں مجموعی دشواریاں جو میرے پیش نظر تھیں اور جن کو نظر انداز کر کے اُردو رسم الخط میں ترمیم کی تائید اُس وقت تک نہ ہو سکے گی جب تک کہ اُن کا کوئی حل اصولی طور پر ہاتھ نہ آجائے۔ اُردو برسوں کے بعد آج اس لائق ہوئی ہو کہ دور حاضرہ کی تمام زبانوں سے نظر ملا سکتی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ اُردو املا میں غیر اصولی ترمیمات جمی جمائی زبان کے پیر اکھاڑ دیں۔ کیوں کہ زبانیں صدیوں میں بنتی ہیں اور اُن کی تعمیر و تخریب کا مسئلہ فانیؔ کے اس شعر کا تابع ہے۔

دل کا اُجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے

ماہر القادری

شاعری کی مشترک قدریں

انگریزی زبان کے اس مقولہ :-

POET IS BORN NOT MADE

کو اتنی شہرت حاصل ہو چکی ہے کہ اسکول کے طلبا ربھی اس سے آشنا ہیں، یہ مقولہ دُنیا کی اُن چند مشہور ترین "ضرب الامثال" میں شمار کیا جاسکتا ہے جو زبان زد ہر خاص و عام ہیں اور تحریر و تقریر میں جن کو بار بار دُہرایا جاتا ہے! اس مقولہ کا مصنف کون ہے؟ اس کا پتہ انگریزی ادب کے ماہرین اور علماء کو ہو تو ہو، عام طور پر لوگ اس "مقولہ ساز" کے نام سے بے خبر ہیں، اور ضرب الامثال اور مقولوں Sayings ، Proverbs پر ہی کیا منحصر ہے، زبان و ادب کی بے شمار ایجادات کے بارے میں تاریخ ادب ساکت ہے، دور کیوں جلیے اور ایران و توران کے افسانے کیوں بیان کیجئے، خود ہی اُردو زبان جو دُنیا کی سب سے زیادہ کمسن زبان ہے، اُس کے الفاظ بنانے والوں کے نام کسے معلوم ہیں !

پانی، روٹی، دال، گھر، گھڑی، لکڑی، بانس ..... وغیرہ لفظوں کا کون موجد ہے؟ جواب دیا جاسکتا ہے کہ یہ لفظ برج بھاشا سے لئے گئے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اُس شخص کا نام بتایا جائے جس نے سب سے پہلے برج بھاشا کے ان لفظوں کو اُردو میں منتقل کیا؟ اور ہم قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس سوال کا جواب نہیں دیا جا سکتا!

بات یہاں سے چلی تھی کہ انگریزی زبان کے اس مقولہ کا جو اس مضمون کا "سرنامہ" ہے مصنف کون ہے؟ اس کا تصنیف کرنے والا بہر حال کوئی بھی ہو، اُس نے بات پُر لطف کہی ہے، مگر ہمیں اس سلسلہ میں یہ کہنا ہے کہ یہ وصف "شاعر" ہی کیلئے مخصوص نہیں ہے ایک انجنیر، مہندس، مُصوّر، موسیقار ... بھی پیدا ہوتا ہے، بنایا نہیں جاتا!

فطری ذوق ایک جیسے نہیں مختلف ہوتے ہیں، کسی بچہ کو بھاگنے دوڑنے، کھیلنے کودنے اور لڑنے جھگڑنے سے غیر معمولی دلچسپی ہوتی ہے، وہ خطرات کی پروا نہیں کرتا، چوٹ لگتی ہے تو رونے کے لئے نہیں بیٹھ جاتا، بلکہ تتے گھاؤ میں بھی نچلا نہیں رہتا، اس مزاج کے بچے فطری طور پر "سپاہی" پیدا ہوتے ہیں، بعض بچے چیزوں کے تولنے اور سودا سلف لانے میں دلچسپی لیتے ہیں اور اُن کی اس دلچسپی کا لحاظ رکھتے ہوئے اگر اُن کو تجارتی کاروبار میں لگایا جائے تو وہ یقیناً کامیاب تاجر ثابت ہو سکتے ہیں! اور تاجروں اور سپاہیوں پر ہی کیا منحصر ہے، جو بچے ہنسوڑ ہوتے ہیں وہ بڑے ہو کر خوش طبع اور ظریف بن جاتے ہیں، تو "ظرافت" بھی ایک فطری اور وہبی وصف ہے، اکتسابی چیز نہیں ہے۔

دل و دماغ ہی سے نہیں "فطری صلاحیت" کا ظہور جسمانی قوا، اور اعضاء سے بھی ہوتا ہے، ایک ہاتھ گھنٹوں تلوار چلا سکتا ہے مگر ایک لکیر سیدھی نہیں کھینچ سکتا، تو نقاشی اور سپہ گری بھی فطری صلاحیتیں ہیں جو ودیعت کی جاتی ہیں۔

جس طرح ایک ناموزوں طبع کو دُنیا کی کوئی طاقت موزوں طبع اور شاعر نہیں بنا سکتی، اسی طرح ایک "بے سُرے" کو کسی کوشش، تعلیم اور تربیت سے خوش الحان نہیں بنایا جا سکتا، سائنس کوئی شک نہیں کہ بہت کچھ ترقی کر چکی ہے یہاں تک کہ پانی اور ہوا کی گرہ وہ کھول سکتی ہے، اور برق و بخارات کے اجزا تک کو اُس نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے مگر آج تک کوئی

ایسی مشین یا ماحول سائنس وجود میں نہیں لا سکی جو آدمی کی "فطرت" کو بدل دے، یعنی کسی میں صلاحیت تو ہو انجینیر بننے کی اور سائنس کی قوت سے اُسے بنا دیا جائے "مُغنّی"۔

یہ گفتگو اس لئے چھیڑی گئی تھی پڑھنے والوں تک ہمارا یہ خیال پہونچ جائے کہ "شاعری" کی طرح دوسری صلاحیتیں بھی فطری ہوتی ہیں، اور ہر فطری صلاحیت اگر اُس کو سازگار ماحول نہ ملے تو دب کر اور کمزور چنگاری کی طرح بجھ کر رہ جاتی ہے ـــــ کسی کو کیا معلوم کہ ان مزدوروں، تانگے اور رکشا چلانے والوں اور کلرکوں اور ٹائپسٹوں میں کتنے ایسے لوگ ہیں جن سے وہ کام لیا جا رہا ہے جس کے لئے اُنھیں پیدا ہی نہیں کیا گیا!

اس بات کو ہم ابھی ابھی واضح کر چکے ہیں کہ شاعر کی طرح دوسرے فن کار بھی پیدا ہوتے ہیں (ARE BORN) بنائے نہیں جاتے (NOT MADE) اگر فطری تخلیق کی اس یکسانی اور مماثلت کے ساتھ ساتھ شاعر اور دوسرے فن کاروں میں ایک امتیازی فرق بھی ہے، وہ یہ کہ تمام فنون کی تدریجی ترقی کے لئے "سیکھنا" ضروری ہے مگر شاعری کے لئے اس کی کم ضرورت پیش آتی ہے! اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شاعری کا بہت زیادہ تعلق "جذبات" سے ہے، اور "جذبات" "کسب" سے پیدا نہیں ہوتے، پس ہر فطری شاعر اپنا مُعلّم خود ہی ہوتا ہے۔

شاعری کی پہلی منزل "انفس" سے شروع ہوتی ہے اور پھر "آفاق" کی جانب بڑھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے، اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ شاعری مشاہدۂ انفس و آفاق کا نام ہے، یہی وجہ ہے کہ شاعر کبھی "آپ بیتی" سناتا ہے اور کبھی جگ بیتی! جس شاعر کا مشاہدہ جتنا بسیط اور عمیق ہوگا، اُس کی شاعری میں اُتنی ہی گہرائی، وہ پھیلاؤ ہونا چاہئے اور جہاں سطحیت، اُتھلا پن اور تنگی پائی جاتی ہے، وہاں مشاہدہ ہے تو سہی مگر تنگ اور ناقص ہے۔

ہمارے اس جملے سے:-

"تمام فنون کی تدریجی ترقی کے لئے "سیکھنا" ضروری ہے مگر شاعری کے لئے اس کی کم ضرورت پیش آتی ہے"

یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ "شاعر کو جاہل رہنا چاہیئے" تو اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے اپنے قول کی ہم یہاں وضاحت کرتے ہیں تاکہ بات مُبہم نہ رہے اور ہمارا مافی الضمیر لوگوں کی سمجھ میں آسکے!

جب ہم "آفاق" بولتے ہیں تو اس سے لالہ و گل، قوسِ قزح، نجوم و کہکشاں، ماہ و خورشید، دشت و سبزہ زار اور اس کائنات کے دوسرے مناظر اور فضاؤں کے ساتھ کتابیں، تحریریں اور قلم و قرطاس بھی مراد ہوتے ہیں! مقصد عرض کرنے کا یہ تھا کہ "نفسِ شاعری" کی ترقی کے لئے "سیکھنا" اُتنا ضروری نہیں ہے، جتنا دوسرے فنون کے لئے ضروری اور ناگزیر ہے!

یہی وجہ ہے کہ یونان کے ملک الشعراء "ہومر" نے اپنی شاعری میں "خیر و شر" پر اُس وقت گفتگو کی ہے جب کہ یونان فلسفہ کی ابجد سے بھی واقف نہ تھا اور فلسفیانہ تعقل و تفکر کی ابھی وہاں صبحِ کاذب بھی نمودار نہیں ہوئی تھی، ارسطو نے جب شاعری کے علمی اصول کی تدوین کی تو ہومر کی "ایلیڈ" کا سہارا لینا پڑا۔

بات ہے تو بظاہر مجلسی لطیفہ کی مگر علم و ادب اور فکر و تحقیق کی بزم میں بھی اس کا ذکر نامناسب نہ ہوگا، یہ سائنس داں اور فلسفی نہیں شعراء تھے جنھوں نے سب سے پہلے بادِ صبا اور نسیمِ سحر کو "قاصد" کی حیثیت سے پیش کیا اور اس طرح انھوں نے اہلِ نظر کی توجّہ کا رُخ اس طرف پھیرا کہ ہوا کی موجوں سے پیام رسانی کا کام لیا جا سکتا ہے۔

قیروان کے مشہور ناقد اور مُبصر ابنِ رشیق نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف کتاب العمدہ میں لکھا ہے کہ نابغہ ذبیانی سے دریافت

کیا گیا کہ سب سے اچھا شاعر کون ہوتا ہے؟ نا آپ نے جواب دیا ـــــــ "جس کا جھوٹ پسندیدہ ہو" ـــــــ مگر جس زمانہ تک لاسلکی کی ایجاد نہیں ہوئی تھی، اُس وقت تک لوگ ہنستے تھے کہ یہ شعراء ہوا سے خطاب کرتے ہیں:-

صبا! بلطف بگو آں غزالِ رعنا را
کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ ما را

یہ جھوٹ ہے، نری خیال آفرینی ہے، ہوائیں بھلا پیام رساں بن سکتی ہیں؟ مگر ایک زمانہ آیا کہ شاعروں کا یہ "جھوٹ" "سچ" اور یہ "خیال آفرینی" "واقعہ" اور "حقیقت" ثابت ہو کر رہی اور آج ہوائیں سچ مچ پیامبری اور خبر رسانی کا فرض انجام دے رہی ہیں!

شاعری جھوٹ اُس وقت ہوتی ہے، جب قزل ارسلان کی رکاب کو چومنے کے لئے افلاک[1] کی سیڑھیاں لگائی جاتی ہیں یا جب بادشاہوں کو "قدر قدرت" اور "خداوند نعمت" کہا جاتا ہے ـــــــ مگر جب شاعر کہتا ہے:-

وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں
وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے

تو بالکل سچ کہتا ہے کہ یہ ریاضی، سائنس اور فلسفہ کی دُنیا نہیں مشاہدہ و احساس کا عالم ہے جہاں محسوسات اور مشاہدات کی سچ مچ یہی کیفیت شاعر کے دل پر گزرتی ہے اور اُس کو ایسا ہی عالم نظر آتا ہے۔

قدرِ مشترک!

اور کہا گیا ہے کہ شاعری کا بہت کچھ تعلق مشاہدہ انفس و آفاق سے ہے، اور اس مشاہدہ میں یہ عنصر بھی ضرور شامل ہے بلکہ ناگزیر ہے کہ یہ انفس و آفاق وجود میں کس طرح آ گئے؟ کہا جا سکتا ہے کہ "چون وچرا" تو فلسفہ کا موضوع ہے، شاعری کو اس سے کیا تعلق؟ اسباب و علل کی جستجو تو فلسفی کرتے ہیں، شعراء کو اس سے سروکار ہی نہیں، شاعر تو باغ میں جاتا ہے اور گلاب کو دیکھ کر بے اختیار چیخ اُٹھتا ہے ... کہ ا۔

اے گل! بہ تو خورسندم تو بوئے کسے داری

مگر ہم پوچھتے ہیں یہ "کسے" کیا ہے؟ اسی ایک لفظ میں شاعری کے محسوسات و مشاہدات کا سارا طلسم بند ہے اور یہی وہ "کسے" ہے جس پر ہم گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

"چون وچرا" بیشک شاعری کا موضوع نہیں ہے، اور شاعر کی نگاہ فلسفی کی نگاہ سے مختلف ہوتی ہے، لیکن شاعر بھی انسان ہی ہوتا ہے اور "چون وچرا" کی تھوڑی بہت رمق ہر انسان میں پائی جاتی ہے! طلب و تحقیق کی ابتدا "کیوں" اور "کیا" (؟) ہی سے ہوتی ہے اور اس سے کوئی ذی عقل اور ہوش مند انسان بچ نہیں سکتا۔

پس دُنیا کی ہر زبان کے شاعروں کے کلام میں دو قدریں ہیں جو مشترک پائی جاتی ہیں ـــــــ ایک محبت دوسری خالقِ کائنات کے وجود کا اقرار! چین کے ملک الشعراء تو تو کے کلام کو پڑھو، ہومر کے رزم نامہ کا مطالعہ کرو، چاسر کی نظموں کو دیکھو، اور کالیداس، فردوسی اور ابو نواس سے لیکر رُڈیارڈ کپلنگ اور بہار زرتشتی تک کی شاعری پڑھ جاؤ یہ دونوں چیزیں جن کا ابھی ابھی ذکر کیا گیا ہے سب کے یہاں ملیں گی۔

---

[1] نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پائے
تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد (ظہیر فاریابی)

حکیم سنائی، فرید الدین عطار، مولانا روم، ابن یمین اور سعدی معلم اخلاق تھے مگر محبت کے شعلوں سے دامن نہ بچا سکے، اقبال جیسا مصلح اور مفکر شاعر جس نے بادہ وشاہد کے استعاروں سے دانستہ گریز کیا ہے، کہتا ہے:

بہ حرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

اس ذوقِ حضوری میں چاہے "مجاز" شریک ہو یا "حقیقت"! بہرحال یہ محبت ہی کی ترجمانی! اور سعدی شیرازی نے شاید تجربہ کے بعد ہی یہ کہا تھا:-

وفا داری مدار از بلبلاں چشم
کہ ہر دم بر گلِ دیگر سرایند

حسن وعشق کے یہ وہ آتش کدے ہیں، جو شعراء دہکا گئے ہیں جس کی آنچ دھیمی تو پڑ سکتی ہے مگر بجھ نہیں سکتی۔

یہ ایک قدرِ مشترک تھی ——— دوسری قدرِ مشترک یہ ہے کہ اگلے پچھلے تمام شاعروں[1] نے "نفس وآفاق" کے خالق کے وجود کا اقرار کیا ہے اور اس "اقرار" کو اپنے بعض افکار وتصورات کی اساس قرار دیا ہے۔

فیضی سبزہ وخس کو دیکھ کر بے اختیار کہہ اٹھتا ہے:-

ہر گیاہے کہ از زمیں روید
وحدہٗ لا الٰہ می گوید

غالب انفس وآفاق کے خالق اور محفلِ کائنات کے سجانے والے کی حمد اس اچھوتے انداز میں کرتا ہے:-

بزم ترا شمع وگل خستگیٔ بوتراب
ساز ترا زیر وبم معرکۂ کربلا

اس شعر میں غالب نے حمدِ باری تعالیٰ کے ساتھ "کردار" بھی بیان کئے ہیں اور تاریخی حقائق کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، مورخ نہیں شاعرانہ انداز میں! مورخ بیچارہ واقعات کو پیش کر سکتا ہے، مگر سوز وگداز کو کاغذ پر منتقل نہیں کر سکتا اور کرے گا بھی تو وہ لطافت کہاں سے آئے گی جو شاعر کے "اظہار وبیان" (EXPRESSION) میں پائی جاتی ہے۔

اس آسمان کے نیچے اور اس زمین کے اوپر سب سے زیادہ جہالت اور بے عقلی کی بات اگر کوئی ہو سکتی ہے یا کہی جا سکتی ہے، تو وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کی نفی اور انکار ہے، ایک کچا دھاگا اور ننھی سی سوئی بھی آپ ہی آپ نہیں بن سکتی، کوئی بناتا ہے تو بنتی ہے، اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ اتنی بڑی کائنات جس کی پہنائیوں کی کوئی حد ووسعت نہیں اور جس میں ایک خاص نظم، سلیقہ اور ربط پایا جاتا ہے، آپ ہی آپ وجود میں کیسے آسکتی ہے!

شعراء نے اللہ کی حمد بیان کی ہے، خدا کے تصور کو اپنے شعروں میں نئے نئے اسلوب سے پیش کیا ہے مگر اس کے باوجود ان کی شاعری میں "خشکی" پیدا نہیں ہوئی، اُن کا کلام صدیاں گزر جانے کے بعد بھی، شگفتہ، شاداب اور تروتازہ ہے، خدا کا نام لینا "توہم پرستی" نہیں بلکہ حقیقت کی سنجیدہ ترجمانی ہے۔

---

[1] اور مستثنیات سے کلیہ نہیں ٹوٹتا (ناشر)

اقبال کہتا ہے:-

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو

یہ شانِ استغنا اللہ کے تصور نے پیدا کی ہے کہ شاعر میر و وزیر کے جود و کرم کی پروا نہیں کرتا!

اللہ کی ذات و صفات کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے اس لئے اللہ کا تصور شاعر کی فکر کو بے حد و بے کنار بنا تا ہے جو لوگ خدا کو نہیں مانتے وہ کہہ سکتے ہیں کہ ایتھر اور انرجی بھی لامحدود ہیں مگر ایتھر اور انرجی کو اس طرح کوئی مانتا کہ وہ آدمی کے دل کے خطرے کی بھی خبر رکھتی ہیں اور انسان کے ارادوں کو بھی وہ توڑ سکتی ہیں! پس خدا کے منکر شاعروں کے کلام میں وہ بلندی اور پاکیزگی پیدا نہیں ہو سکتی، جو خدا پرست شاعروں کے کلام میں ہوتی ہے! بلندی کے ساتھ "پاکیزگی" کا لفظ میں نے جان کر استعمال کیا ہے۔

خدا کے اقرار سے قلب میں جو گداز پیدا ہوتا ہے، "انکار و الحاد" اور "بے یقینی" اُس گدازِ قلب کو کرخت بنا دیتی ہے اور شاعری میں سارا الجھیل سوز و گداز ہی کا ہے! اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل یقین، شاعر کو جرأت آزما اور حوصلہ مند بناتا ہے، یہاں یہ اعتراض وارد کیا جا سکتا ہے کہ جو شاعر خدا کے وجود کا انکار کرتے ہیں اُن کے کلام میں بھی بڑی جرأت اور حوصلہ مندی پائی جاتی ہے، جی ہاں! پائی جاتی ہے مگر پھاڑ کھانے والوں درندوں جیسی جرأت! ایک بے رحمانہ قسم کا انتقام جو مروت نا آشنا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات جمال اور جلال کا سنگم ہے اس لئے خدا کے ماننے کے بعد قوتِ غضب اور قوتِ رحم دونوں میں یک گونہ اعتدال پیدا ہو جانا چاہئے اور اس اعتدال، تناسب اور ہم آہنگی کی جھلک شاعری میں بھی پائی جانی ضروری ہے، جو بات کہی جائے سلیقہ اور قرینے سے کہی جائے، تخیل (IDEA) اور اظہار (EXPRESSION) میں ربط ہو، موزوں، متناسب اور دلکش الفاظ استعمال کئے جائیں ——— مگر "منکرِ خدا" کی نظرت میں بغاوت اس قدر رچ جاتی ہے کہ وہ "قدامت" کی تہمت دہر کر اور "رجعت پسندی" کا الزام لگا کر ہر حسین سے حسین "قدر" کو ٹھکراتا ہے چنانچہ خدا کے باغی شاعروں کے کلام میں عام طور پر بے ربطی پایا جاتا ہے، جس کا نام انھوں نے "اشاریت" رکھا ہے، اُن کے یہاں قدم قدم پر بے ربطی ملتی ہے جو لفظ جہاں چاہا رکھ دیا، اس سے غرض نہیں کہ لفظ اپنے صحیح مقام پر استعمال ہوا ہے یا نہیں، اس بے ربطی پر کوئی خدا کا بندہ احتساب و تنقید کرتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے کہ ہم لکیر کے فقیر نہیں ہیں! زبان و بیان کے پُرانے سانچے اس نئے دور میں نہیں چل سکتے، اُن کو توڑ دینا پڑے گا! حقیقت یہ ہے کہ خدا سے بغاوت کے بعد آدمی نیکی، بھلائی، انصاف اور حُسن و خوبی اور ربط و آہنگ سے بغاوت کرنے پر اُتر آتا ہے۔

جو شعرا، خدا کے منکر ہوتے ہیں، اُن کے کلام میں کرختگی اور خشونت پائی جاتی ہے، کسی کو ثبوت درکار ہو تو فارسی کے مشہور شاعر لاہوتی کا مجموعہ کلام پڑھ کر دیکھے، یہ مجموعہ ماسکو میں چھپا ہے اور کراچی میں بھی غالباً دستیاب ہو سکتا ہے۔

آج کی دُنیا صرف اس لئے مظلوم نہیں ہے کہ پیٹ بھرنے کو کھانا اور تن ڈھکنے کو کپڑا نہیں ملتا ——— اُس کی سب سے بڑی مظلومیت یہ ہے کہ "یقین" کی دولت کو اُس سے چھینا جا رہا ہے، پس سماج کی بھلائی چاہنے والا اور انسانیت کا سچا دردمند اور بہی خواہ وہی ہے جو روٹی کے ساتھ ساتھ "دولتِ یقین" کو بھی انسانوں کی طرف واپس کرا دے!

ترجمہ[1]:- خلیل الرحمٰن نعمانی

انقلابِ مصر کے بعد

اخوان المسلمون کے قائد (مرشدِ عام) حسن الہضیبی کا معرکہ آرا بیان

> ؎ جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
>
> اور ان
>
> ارشادات میں وہ ٹھنڈک موجود ہے
>
> ؎ دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں
>
> اور اس
>
> خطبہ میں وہ طوفان بھی موج زن ہے!

اللہ تعالیٰ نے مصرِ عظیم کی فوجوں کو اس مُبارک انقلاب کی توفیق دی، اور اس کی کامیاب مساعی اور جدوجہد سے ملّت کی نشاۃِ جدید کی اُمیدوں کے دروازے کُھل گئے، ملّت کی سابقہ بزرگی اور کھوئی ہوئی عزت کو دوبارہ زندہ کرنے کا موقع مل گیا، اور وہ کمیں گاہیں نیست و نابود ہوگئیں جن سے حق کے راستہ میں مزاحمت کا کام لیا جاتا تھا، اور جو اللہ کے راستہ میں سدِ سکندری بنی کھڑی تھیں! اور جنہوں نے مصلحینِ اُمت کے کام کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا، اور جو حقیقت میں قوم کے غرض پرستوں، مفسدوں اور فتنہ پرداز حاکموں کی پناہ گاہیں تھیں۔

اس کامیاب تحریکِ انقلاب کے بعد ہمارے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے منزل کی وسعت اور مقصد کی بلندیوں کی طرف دیکھتے رہیں، ورنہ یہ کامیابیاں کہیں ہمیں مغرور نہ کردیں، اور عام اصلاح جو ہمارے پیشِ نظر ہے اس سے ہم غافل اور بے پروا ہو جائیں۔ اگر ہم نے عام اصلاح کی جدوجہد جاری رکھی تو بہت جلد ہماری ملّت محسوس کرے گی کہ یہ اصلاح اس انداز پر ہوئی ہے گویا اس نے نئے سرے سے جنم لیا ہے، اور دورِ جدید کی صبحِ نو طلوع ہو رہی ہے، اور ملّت نئی منزل میں قدم رکھ رہی ہے۔

اگر ایسا نہ کیا گیا تو گویا ہم نے اس تحریک کا ثمرہ ضائع کر دیا! اور پھر ہم کو ایسی تباہی و بربادی کا سامنا ہوگا جس کے نتائجِ بد سے ملّت کا کوئی فرد بھی محفوظ و مامون نہ رہ سکیگا!

قوم کے ہر فہیم اور سمجھدار فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی بہتر رائے اور نیک مشورہ قوم اور حاکموں کے سامنے پیش کرے۔ یہ مشورہ خالصتہً لوجہ اللہ اور خواہشاتِ نفسانی سے پاک ہونا چاہیئے مشورہ دیتے وقت انہیں اُن اُمور کی طرف توجہ دلانا چاہیئے جن سے اُمت کی نشاۃِ جدید

---

[1] ترجمہ میں لفظوں سے زیادہ مفہوم کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

کی مہم میں مدد ملے اور اصلاح و ترقی کی متاعِ گم شدہ ہاتھ آئے!

تاریخ کے ایسے ہی نمایاں موڑ پر، اخوان المسلمون کا ہمیشہ سے یہ طرزِ عمل رہا ہے کہ وہ اپنی رائے اور مشورہ ملت اور اربابِ اختیار و اقتدار کے سامنے پیش کرے، اور ایسی رائے اور مشورہ پیش کرے، جس کی تائید اور تقویت، اللہ کی اس کتاب سے حاصل کی گئی ہو جس میں نہ سامنے سے باطل در اندازی کر سکتا ہو، نہ پیچھے سے۔ اللہ تعالیٰ کی یہی کتاب، اخوان المسلمین کی مشورت و رائے کی اساس ہے جو عام حقوق اور انسانی ذمہ داریوں میں مسلمان اور کافر میں مساوات کا حکم دیتی ہے اور جو تفریقِ جنس یا امتیازِ نسل و رنگ کی بالکل قائل نہیں ہے۔

پہلا مرحلہ:- عام تطہیر مکمل طور پر

اصلاح کی اقسام میں سے جس قسم کی طرف پہلے توجہ کرنا ضروری ہے اور جس کے بغیر کام کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا یہ ہے کہ ہر اس شخص کو گرفتار کر لیا جائے جس نے معزول بادشاہ کی بدعنوانیوں میں کسی قسم کی اعانت کی یا اس کے لئے فساد و طغیان بپا کرنے اور عیاشی کی زندگی گزارنے میں کوئی آسانی اور سہولت بہم پہنچائی! ایسے شخص کو نہ صرف گرفتار کیا جائے بلکہ ضروری ہے کہ اس کو سزا دی جائے! تطہیر کے کام کو محدود کر کے صرف بادشاہ کو معزول کر دینا، اس کے اعوان و انصار کو کھلا چھوڑ دینا اور اُن کی بدعنوانیوں کی باز پرس نہ کرنا نہ تو انصاف و عدالت کا تقاضا ہے اور نہ اس سے مصالحِ عامہ کی حمایت و رعایت کا مقصد حاصل ہوتا ہے!

ملک کا دستور جس کے احترام کی حکومت کے تمام وزراء قسم کھاتے ہیں، اس کا منتہائے مقصد اور اس کی اسپرٹ یہ ہے کہ دستور کی رو سے ذمہ داری اور مسئولیت کا بار تمام کا تمام وزراء کے کاندھوں پر رکھا ہوتا ہے۔ وزراء کی یہی مسئولیت اور ذمہ داری ہے جو ان کو پبلک اور عوام میں معتمد اور معتبر ٹھیراتی ہے، اور عوام کی جانب سے اطمینان و اعتبار کا اظہار کیا جاتا ہے!

پس جب یہ معتبر و معتمد لوگ ہی اپنی حدود سے گزر جائیں اور بدعنوانیوں میں مبتلا ہو جائیں تو یہ سب سے زیادہ سخت و شدید مواخذہ کے مستوجب ٹھیرتے ہیں۔

دستور کی یہ بات ثابت و واضح ہے کہ بادشاہ کا کوئی زبانی یا تحریری حکم بھی وزیر کو مسئولیت سے نہیں بچا سکتا! بلکہ دستور کی رو سے تو مسئولیت اور ذمہ داری تو مرکوز ہی کابینہ میں ہوتی ہے، حتیٰ کہ رئیس کابینہ (وزیر اعظم) بادشاہ کی ذاتی اور شخصی زندگی کے متعلق بھی جواب دہ اور ذمہ دار ہے! اس کے بعد کسی ایسے وزیر کا عذر کیسے قبول کیا جا سکتا ہے جس نے بادشاہ کیلئے فساد کا دروازہ کھولا اور جس نے بادشاہ کے لئے ملک و ملت کی دولت کو لوٹنے کی سہولت بہم پہنچائی، ملک و ملت کی زمینوں کو غصب کرنے چھین لینے کی راہ سجھائی، ملک و ملت کی مصالح کو پامال کرنے کی شہ دی! اور جس نے لوگوں کی آزادیاں چھینے، ملک و ملت کے صالح اور نیک فرزندوں کا خون ناحق بہانے میں اس کی مدد کی! اور جس نے محض بادشاہ کی خوشنودی کی خاطر دستور و قوانین میں ایسے استثنائی طریقے تجویز کئے جن کا نتیجہ گروہی عصبیت کی حمایت اور ملک و ملت میں بغاوت و فساد کی بنیاد ڈالنے کے سوا کچھ نہیں! اسی پر بس نہیں، صاحب اقتدار لوگوں نے تو تفریط و زیادتی کی ساری حدود پامال کر دیں، اور قوم کی امانت کو بڑی بُری طرح ضائع کیا۔ ان کا تو سارا وقت اپنی کرسیوں کی حفاظت و استحکام ہی میں گزرا ہے اور یہ مناصب کی کرسیاں ہی تھیں جن سے بادشاہ ان کو محروم کر سکتا تھا، اور یہ مسندیں اور کرسیاں ہی ان کی معراج اور حاصل زیست ہیں! جو اپنے وطن، اپنی قوم، گویا ہر چیز سے زیادہ ان کو عزیز ہیں۔ اور کرسی کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ہی مالِ حرام بھی بٹورتے رہے اور معصیت کے کاموں میں بھی مشغول رہے۔

اس لئے ضروری ہے کہ تطہیر کرنے والی قوت ان حکام سے ابتدا کرے، اور ان کو جلد از جلد عمومی زندگی سے علیحدہ کیا جائے اور سیاسی

تنخواہوں اور کمیشنوں سے ان کو بالکلیہ محروم کردے! اور ان پر مقدمہ چلایا جائے انھیں الزامات و اتہامات کی بنا پر جو بادشاہ پر لگائے گئے اور جن ناجائز تصرفات اور دست درازیوں کا وہ مرتکب ہوا اور ان باغیانہ مظاہروں اور دوسری بدعنوانیوں کی بنا پر جن کا اظہار ان سرکاری فائلوں کے ذریعہ ہو یا آئندہ کسی فائل اور سرکاری کاغذات کے ذریعہ انکشاف ہو!

(یہ مقدمہ چلانا، جواب طلب کرنا کسی انتقامی جذبہ کے ماتحت نہیں ہوگا) بلکہ اس لئے ہوگا کہ ملک کا ہر وہ فرد جس کو ملک کی زمام کسی بھی نوعیت سے سپرد کی جائے اس کو عبرت ہو اور وہ یقین کرے، کہ ایک صاحب اختیار بادشاہ کے احتساب سے ملت کی بازپرس اور سخت گیری زیادہ یقینی ہے اور اس سے چھٹکارا ممکن نہیں تاآنکہ خطاکار اپنے کئے کی سزا پالے۔

اور مقصدِ تطہیر اور اس کی غایت اس وقت تک حاصل نہ ہوگی جب تک مواخذہ میں ہر اس شخص کو شامل نہ کر لیا جائے جس نے مملکت کے مصالح کو بیکار و عبث سمجھا، یا جس نے مختلف وزارتوں کے زمانہ میں حق شہریت کو مجروح کیا، یہی باتیں اس بات کی متقاضی ہیں کہ کسب حرام کے متعلق بغیر کسی رورعایت اور نرمی اور تسامح کے فوراً قانون نافذ کیا جائے، اور بغیر کسی تردد، اور امتیاز کے ہر اس شخص سے بذریعہ عدالت جواب طلبی کی جائے جس نے لوگوں کی آزادیاں چھینیں، امن پسند شہریوں کو خوف زدہ اور مرعوب کیا اور اُمت کے آزاد فرزندوں کو عذاب دیکر سلطنت و اقتدار کا غلط استعمال کیا اور بے جا فائدہ اُٹھایا اور یہ حالات اس بات کا بھی تقاضا کرتے ہیں، کہ ان معاملات اور واقعات کی دوبارہ آزادانہ اور بے باکانہ تحقیق و تفتیش کی جائے جن کے بارے میں ظلم و طغیان نے عدل و انصاف کو اندھیرے میں رکھ کر بے دست و پا کر دیا تھا!

مثلاً فوجی معاملات، یا بعض نمایاں شخصیتوں کا دھوکا اور فریب سے قتل جس میں بعض وزراء نے نمایاں پارٹ ادا کیا!

اسی طرح تمام احکام عرفیہ اور آزادی و حریت کے منافی قوانین فوراً منسوخ اور کالعدم قرار دیئے جائیں!

دوسرا مرحلہ:- اخلاق و تربیت کی اصلاح

عسکری انقلاب نے ہمیں اس مبارک اقدام کا موقع دیا یعنی اقدام تطہیر کا! اب جب تک ہم مضبوط اور ٹھوس طریقہ پر اپنے قانون و اخلاق کی اصلاح کی طرف قدم نہ بڑھائیں گے ہمیں نہ اس انقلاب کا پورا پھل ملے گا۔ اور نہ وہ قدر و منزلت حاصل ہو سکے گی جو اس انقلاب سے متوقع ہو! اور پھر اصلاحی اقدام کرتے وقت ہمیں خیال رکھنا چاہیئے کہ تلخ تجربات کا اعادہ اور ناپسندیدہ اطوار کا ظہور نہ ہو، نہ اس قسم کے اشخاص و افراد کو آگے بڑھنے کا موقع دیا جائے جس قسم کے اشخاص و افراد کو ہم اپنے راستوں سے ہٹا چکے ہیں،

اس میں کوئی شک نہیں کہ قانون جب وہ تمدن کے سانچے میں ڈھل جائے اس کے مقاصد اور اُصول درست و مستقیم ہو جائیں پھر بھی جب تک قوت نافذہ کسی فرد صالح کے ہاتھ میں نہ ہو، قانون کا مقصد حاصل نہیں ہوتا اور وہ فرد ایسا ہونا چاہیئے جس کی تربیت دینی اصول اور اسلامی انداز پر ہوئی ہو جس کی وجہ سے اس کے دل میں انسانی شرف و مجد پوری طرح گھر کر چکا ہو، جس کی وجہ سے وہ اپنی خواہشات اور ہوائے نفسانی سے بچا رہے، اور اس تربیت کا اثر یہ ہو کہ وہ دوسرے انسانوں کے لئے وہی بات پسند کرے جو اپنے نفس کی خاطر اسے پسند ہو۔

پس جب ایسے دینی تربیت یافتہ شخص کو جب کوئی ذمہ داری سپرد کی جائے گی، یا اسے کوئی قوت و سلطنت کا منصب حاصل ہوگا۔ تو وہ اپنے رب پر بھروسہ کرنے والا اور ایمان لانے والا ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نہ ذلیل ہونے دے گا! اور نہ پست و حقیر! اور وہ مضبوط اخلاق اور پختہ کردار کا مالک ہوگا نہ تکبر کرے گا اور نہ ظالم و ستمگار ثابت ہوگا، امانت و دیانت کے معاملہ میں اس سے سب خوش ہوں گے! وہ نہ کسی کی امانت اور مال کو ہڑپنے کی فکر میں ہوگا اور نہ رشوت خوری اس کی عادت ہوگی! اور وہ ایسا شخص ہوگا کہ اس کی ذاتی زندگی اور اجتماعی زندگی دونوں سے بزرگی اور فضیلت کبھی جدا نہ ہوگی، وہ اپنے گھر میں بہترین نمونہ ہوگا، اور اپنے مکتب و جماعت میں اچھی مثال

(قد افلح من زکاھا وقد خاب من دساھا) قائم کرے گا !

اس باب کے خاتمے کے طور پر یہ بات ضروری ہے کہ حکومت ان باتوں کو ممنوع اور حرام قرار دے، جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے اور زندگی کے ان مظاہر کو محو کرے اور مٹائے جو اللہ کے اس فرمانِ تحریم سے ٹکراتے ہوں۔ جیسے قمار، شراب، سینما ہاؤس، رقص و سرود کی مجالس، فلمیں اور وہ رسائل و جرائد جو نفسانی خواہشات کو بھڑکاتے ہیں،

اور صرف دینی رجحان اور میلان تنہا نہ اس کے لئے کافی ہے اور نہ ضمانت کہ ایسے شخص کے اخلاق و عادات اسلامی ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے دل میں ایسے جذبات کی پرورش، اور نشو و نما اور نیکی کے داعیہ کے لئے اس شخص کا پوری جانچ اور کامل توجہ کے ساتھ محاسبہ کیا جائے" اور یہ محاسبہ اس لئے کیا جائے کہ اس کی ذاتی اور اجتماعی زندگی میں قرآنی آداب و اخلاق، راہ یاب ہو جائیں !

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے نظام تعلیم و تربیت کو نئے سرے سے نئی بنیادوں پر استوار کریں تاکہ یہ تبدیلی ایک ایسے گروہ کو جنم دینے کا سبب بنے، جس میں دینی، اخلاقی اور وطنی روح جاری و ساری ہو! اور ہمیں نئے سرے سے اسلامی، مصری تاریخ بھی لکھنا چاہئے، تاکہ استعمار پرست اور مستشرق غرض مندوں نے جو زہر تاریخ میں اُگلا ہے اس کا ازالہ بخوبی ہو سکے !

اور یہ بھی ضروری ہے کہ تمام اہلِ وطن کے لئے تعلیم کا کافی انتظام کیا جائے اور اس معاملہ میں سب برابر ہوں پھر اس کا انتظام بھی ضروری ہے کہ کالج اور یونیورسٹیاں مختلف انداز کی قائم کی جائیں۔ اور جن اسباب و سامان کی ضرورت ہو مہیا کی جائیں۔ جیسے کتب خانے، معمل (LABORATORY) نقشے، چارٹ وغیرہ وغیرہ تاکہ مصر ترقی کی نئی علمی راہ پر گامزن ہو، اور ہم جس اجتماعی اور اقتصادی ترقی کی بنا رکھ رہے ہیں اس میں اس کا بھی بہت بڑا حصہ ہو،

تیسرا مرحلہ :- دستوری اصلاح

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ایک نیک انسان اپنی زندگی آسانی اور خوشی سے، اس قانون کے تحت نہیں گزار سکتا جس کو پہلے پہل انگریزی استعمار کے عہد میں وضع کیا گیا، اور پھر دوبارہ سیاسی ظلم و زیادتی کے دور میں ! اسی وجہ سے دستوری متن میں ایسے رخنے اور خلا موجود ہے جنھوں نے آسانی سے ہماری پبلک زندگی میں انتشار اور پریشانیاں پیدا کیں، اور ہر وقت یہ خطرہ درپیش ہے کہ اب اس دستور میں اختلال پیدا ہوا تب ہوا !

مثلاً دستوری طور پر بادشاہ کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ ہر معاملہ میں دخل انداز ہو کر اپنے شاہانہ اختیارات استعمال کر سکتا ہے، یا اس کو بنیادی دستور کی حدود سے تجاوز کرنے کا اختیار ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دستور قوم کی تمناؤں اور ارادوں کا منبع اور پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ شاہی عطیہ اور "جہاں پناہ" کا دیا ہوا تحفہ ہے۔

اور جب دورِ ملوکیت کے وزراء نے اپنے طرزِ عمل سے دستور کو سراسر بیکار اور غیر مفید بنا دیا ہو تو ایسی حالت میں کامیاب انقلاب کا یہ طبعی تقاضا ہوتا ہے کہ ان قوانین اور دستور کو جسے سابقہ پارٹی نے بنایا ہو، ختم کر دے اور منسوخ قرار دے دے !

ایسی حالت میں مصری دستور کی یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ نہ واقعے کے اعتبار سے اس کا کوئی وجود باقی رہ گیا ہے اور نہ علم و دانش کے اعتبار سے اس کا وجود ہے ! ان حالات کا تقاضا ہے کہ بہت جلد کسی جمعیت کی تاسیس کی جائے، جو نیا دستور ایسی بنیادوں پر وضع کرے، جو اُمت کے عقیدہ کی تعبیر ہو، اس کے ارادہ و خواہش کی اس کے ذریعہ تکمیل ہو اور جو مصالحِ اُمت کی حمایت کرے ! نہ کہ شاہی عطیہ بن کر رہ جائے۔ دستور کی ترتیب ایسے اصولوں پر کی جائے جو حالاتِ زمانہ کے مطابق ہوں۔ اور وہ تمام اصول اور متون حذف کر دئے جائیں۔ جو مرضی شاہ کے اصول پر وضع کئے گئے ہیں۔ ان کی جگہ ان اصولوں اور بنیادی امور سے مدد لی جائے جو اسلام کے بنیادی اصول ہیں، جو زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں !

اسی اصول کے تحت میں وہ دفعات بھی خارج کردی جائیں جن کی وجہ سے وزراء اپنے آپ کو قانون سے بالاتر یا آخری مسئولیت سے ماوراء سمجھتے ہیں۔

اس سلسلہ میں بنیادی اساس جو اسلام مقرر کرتا ہے یہ ہے کہ جس کی ذمہ داری زیادہ ہے اس کی مسئولیت بھی زیادہ ہے۔ اور قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔

اسی وجہ سے ہر فرد اُمت کے لئے چاہے وہ حاکم ہو چاہے محکوم یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام امور اور تصرفات کا جواب دہ ہو۔ اور ہر قسم احتساب و عقوبت کے سامنے سر تسلیم خم کرے! اور یہ سر تسلیم خم کرنا ہر ایک کے لئے بلا کسی استثناء کے ہو!

اس کے لئے ہمیں سابق دستوری تجربوں سے بھی استفادہ کرنا چاہیے۔ تاکہ ہم جس اصلاح کی طرف توجہ کریں اس کی بنیاد واقعات محسوسہ پر ہو۔ اور یہ تجربے جب سے ہوئے۔ یعنی نیابتی زندگی کی ابتداء سے آج تک! ملک میں کبھی نیابت صالحہ کا وجود نہ پایا اور نہ کوئی صحیح نیابت قائم ہوئی۔

اور اس دعویٰ کی مفاسد کے شیوع اور برائیوں کے پھیلنے سے بڑی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ اور یہ دلیل تو ایسی ہے جس کا اعتراف آج کی تمام سیاسی جماعتیں خود کر رہی ہیں، اور کہتی ہیں کہ ان تمام خرابیوں کا ذمہ دار بادشاہ ہے، اسی کے حکم سے یہ ہوتا رہا ہے!

ان معاملات میں پارلیمنٹ نہ صرف کسی وزارت کو برخاست کرنے سے کامیاب ہو سکتی ہے۔ نہ بادشاہ کے مخصوص مفادات میں جواب طلبی سے نہ کسی وزیر کو بدل دینے سے، اور نہ کسی وزارت کے خلاف ملامت کا ووٹ پاس کرنے سے! اور کوئی مجلس بھی محض جواب طلبی کرنے سے کامیاب نہیں ہوتی بلکہ کامیابی کے لئے اصول کی پوری پوری پابندی ضروری ہے یعنی قول اور فعل میں تضاد نہ رہے!

گزشتہ دور میں عام طور پر ایسے قوانین وضع کئے گئے تھے جو آزادی اور حریت کے منافی تھے، اور سابق وزارت اور پارلیمان اُس کے آگے سر تسلیم خم کئے رہیں۔ ان پارلیمنٹوں نے تو وزارتوں کے لئے ایسی آسانیاں اور سہولتیں مہیا کیں بلکہ اُن کے لئے چور دروازے پیدا کئے کہ جن کے سبب وزارتوں نے اپنی تعیش پسندی، نفسانی خواہشات اور ظالمانہ جذبات کی آسودگی کے لئے بجٹ میں بھاری بھاری رقمیں محفوظ رکھیں یہاں تک کہ عوام کی زندگی، اصلاحی ضروریات اور ترقی کے کاموں میں خرچ کرنے کے لئے کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہنے دی۔

تمام گزشتہ پارٹیوں کے دور اقتدار میں پارلیمنٹ کی یہی روش رہی یہاں تک کہ وزراء کی ذاتی خواہشات اور بادشاہ کی دست درازیوں پر بھی قانون کا لیبل لگا دیا۔

ان بدعنوانیوں سے چھٹکارا پانے کی اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نہیں ہے کہ حیات نیابی اور قوانین انتخاب پر نظر ثانی کی جائے اور اُن کو صحیح و پاکیزہ اصولوں پر مُرتب کیا جائے تاکہ ان اصولوں کا حق مطلوب اور پسندیدہ طریقہ پر ادا ہو سکے:

چوتھا مرحلہ:- اجتماعی اصلاح:- آجکل عوام بہت ہی بڑے تفاوت کو برداشت کر رہے ہیں، اور اس تفاوت نے چند امیروں کو سرکش اور بدقماش بنا دیا ہے، اور غریبوں کی اکثریت کو تقریباً پامال و ختم کر دیا ہے اور یہ ایسا تفاوت ہے اور ایسی حالت ہے جس کو اسلام ہرگز پسند نہیں کرتا۔

اسلام اس بات کو بُرا جانتا ہے کہ مال و دولت صرف امیروں ہی میں محدود ہو کر رہ جائے۔ اسلام تو یہ چاہتا ہے کہ ملک کے ہر ایک باشندے کے لئے خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر کم از کم ان چیزوں کا بندوبست ضرور کیا جائے، اپنی جسمانی توانائی باقی رکھ کر کام کاج کے قابل ہو سکے۔ اگر وہ اپنے علاج کا انتظام خود نہ کر سکے تو اس کے مفت علاج، مفت تعلیم ——— کا انتظام

(اور یہ سب انتظام اس شخص کی بیوی بچوں اور اس کو زیر کفالت لوگوں کے لئے) ہونا چاہیئے!

اور ان باتوں کے حصول کا اسلامی طریقہ یہ ہے :-

۱- **عمل** :- ہر تندرست شخص پر کام کرنا فرض ہے، اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ کام سے جی چرائے اور ایسے شخص کی اعانت بالکل نہ کرنی چاہیئے، بلکہ اسے کوشش کرکے کام پر آمادہ کرنا چاہیئے۔ اور حاکم وقت کو چاہیئے کہ ایسے شخص کے لئے کام مہیا کرے اس کے وسائل و اسباب، اس کے لئے وسائل مہیا کرنے کا پابند اور ذمہ دار ہے!

۲- **اجتماعی کفالت** :- پس اگر کسی کو کوئی کام بالکل نہ ملے، یا کام اس کی ضروریات کے لئے کافی نہ ہو، یا وہ کام نہ کر سکے معذور ہو، تو حاکم کا فرض ہے کہ وہ اس کے معاملات میں دخل دے تاکہ وہ زندگی کی وہ بنیادی ضرورتیں پوری کر سکے جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، اور اس کی ضروریات کو زکوٰۃ کے ذریعہ پورا کرے زکوٰۃ ایک فریضہ ہے جس کی تعداد مقرر شدہ ہے! یہ ایسے صدقہ و خیرات نہیں جس کو کوئی افراد پر احسان جتانے کی غرض سے ادا کرے! یہ تو غریبوں کا حق ہے! اسی مقرف میں خرچ کیا جائے گا، جس مقصد کے لئے جمع ہوتا ہے، جس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کیا جا سکتا جب تک وہاں کے تمام غربا اور حاجتمندوں کی ضروریات اور حاجتیں پوری نہ ہو جائیں۔

اس سے ثابت و واضح ہوتا ہے کہ امیر و غریب آپس میں ایک دوسرے کے کفیل اور باہم یک دگر ہمدرد ہوں، لیکن اگر ضروریات اتنی زیادہ ہوں کہ زکوٰۃ کافی نہ ہو تو جس کے پاس مال زیادہ ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنا مال غریبوں کو دیدے تاکہ ان کی ضرورتیں پوری ہوں! اگر وہ ایسا نہ کریں تو حکومت انہیں اس پر مجبور کر سکتی ہے۔ ایسے قوانین بنائے جائیں، جو ضروریات اور حاجات کی اجتماعی اصلاح کی ضمانت ہو سکیں۔ اور جب تک یہ بنیادی ضرورتیں ہر فرد کے لئے مہیا نہ ہو جائیں۔ اسلام چور پر چوری کی سزا نافذ کرنے کی اجازت نہیں دیتا!

بناءعلیہ ایسے اسباب مہیا کرنے اور ایسے وسائل اختیار کرنے ضروری ہیں کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے مال حاصل ہو سکے! ایسے ذرائع جو اہم ہیں ان کو اختصاراً ہم ذیل میں درج کرتے ہیں :-

۱- زرعی املاک کی حد بندی!

بڑی بڑی زمینداریوں نے کاشتکاروں اور مزدوروں کو بے انتہا ضرر پہونچایا، اور ان کے حقوق ملکیت میں بہت بڑی رکاوٹ پیدا کی، اور ان کی حالت غلاموں جیسی بنادی، پس اس سلسلہ میں اصلاح کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ ضرورت کے مطابق ملکیت کو محدود کر دیا جائے، اور زائد از ضرورت زمین کو غربا اور چھوٹے چھوٹے مالکانِ زمین کو معقول قیمت پر فروخت کر دیا جائے، اور اس رقم کی ادائیگی کا انتظام طویل قسطوں کے ذریعہ کیا جائے، جیسا کہ تمام شاہی قابل کاشت زمینوں کی تقسیم کا معاملہ طے کیا گیا۔ اور جن سے چھوٹے زمینداروں اور ... کی اصلاح و فلاح اور بہبود مقصود ہے!

۲- مالکِ زمین اور کاشتکار کے تعلقات کی حد بندی!

یہ ظاہر ہے کہ محدود ملکیت کے بعد بھی بہت زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی رہ جائے گی جن کی کوئی ملکیت نہ ہوگی کیونکہ کاشت کے قابل زمین بہت کم ہے، اور کاشتکار بہت زیادہ، اور طریق کار یہ ہے کہ کاشتکار کو اپنے حاصل شدہ فائدے سے نقد روپیہ یا غلہ محصولوں کے طور پر ہر بیل کی جوڑی پر مقررہ تعداد میں دینا پڑتا ہے! اور اس میں اعتدال کا خیال ہوتا ہے نہ رعایت ملحوظ رہتی ہے! جس کی وجہ سے عموماً کاشتکار اپنی سال بھر کی محنت کے ثمرے سے محروم ہو جاتا ہے! بلکہ اکثر اوقات تو وہ قرض میں اتنا دب جاتا ہے کہ اس سے عہدہ برآ ہونے کی طاقت نہیں رکھتا۔

10235

اور تحدید ملکیت کے باوجود بھی اس صورتِ حال کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں، کہ نظام اجرت علی المزارعت کو قانوناً محدود کیا جائے، یعنی لگان کو ایسی نسبت سے مقرر کیا جائے جس پر اتفاق ممکن ہو، مثلاً نصفا نصف! یہی صورت انصافاً مناسب معلوم ہوتی ہے!

۳- اہلِ محنت (مزدوروں) کے قانون کی تکمیل!

مزدوروں کے موجودہ قوانین پر بھی نظر ثانی کی جائے اور ان میں مزدوروں کے تمام طبقے جن میں کاشتکار مزدور بھی ہیں شامل کئے جائیں تاکہ مزدور اور اس کے متعلقین بیکاری، معصیبت، معذوری، مرض، بڑھاپے اور وفات کی صورتوں میں کفالت کی طرف سے مطمئن ہو جائیں، قانون پر نظر ثانی کرتے وقت اُن کو سوسائٹی اور انجمن سازی کے کام میں مدد بھی دی جائے۔ اور ان کو اس بات کی بھی اجازت ہو کہ وہ مختلف جماعتوں میں باہمی وفاق قائم کریں، اور اسلام کی مبادیات کی روشنی میں اقتصادی بنیادوں پر مزدوروں کی اجرت کی حدبندی بھی کریں۔

ان کو اس بات کی ضمانت بھی قانوناً دی جائے کہ جو غلہ اہلِ محنت نے پیدا کیا اس میں سے اُن کا حصہ اُن کو دیا جائے گا۔ اور کمپنیوں کے بورڈ کے ارکان کو جو معاوضے ملتے ہیں ان کو ختم کیا جائے، اور مزدوروں کے ان حقوق کا تعین، ان کی حمایت، قانون میں غیر مبہم الفاظ اور پوری صراحت سے کی جائے!

۴- نظم ملازمت کی اصلاح!

ملازمین کی اصلاح کے لئے اعلیٰ و ادنیٰ ملازمین میں جو بُعد و تفاوت اور مراتب و مشاہرات میں فرق ہے اُس کو قریب کیا جائے۔ اور ان کی کارکردگی، اور معاش کے لئے قانونی اور مالی کفالت کی ذمہ داری لی جائے، اور زیر دستوں کو بالادستوں کی خواہشات کا تختۂ مشق نہ بننے دیا جائے اور اُن کی جور و زیادتی سے اُن کو بچایا جائے، ملازمت کے سلسلہ میں پیش آنے والے ناگوار حالات کی روک تھام کی جائے۔ احکامات اور اطلاعات کی وسیع پیمانہ پر نشر و اشاعت کا انتظام کیا جائے!

۵- خطابات کا سلسلہ ختم کیا جائے!

خطابات کا سلسلہ فرق مراتب ختم کرنے کا گویا تکملہ ہوگا۔ اور اس سے ایک ہی وطن کے بیٹوں میں کامل مساوات بھی اسی وقت قایم ہوگی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر سب کی خدمات خالصۃً لوجہ اللہ ہوں گی۔ اسی طرح جو نمود و نمائش اور ترفع اور تکبر کے مظاہر ہوں ان کے متعلق بھی ایسا ہی کیا جائے، اور ان کے اظہار کو عملاً روک دیا جائے!

۶- مسجدوں کو دینی۔ ثقافی اور اجتماعی مراکز بنانے کی تجویز!

بدوِ اسلام سے ہمیشہ مسجد جامع ان امور کا مرکز رہی ہے۔ لیکن یہ مقصد صرف "دو رکعت کے امام" سے حاصل نہیں ہوگا۔ اس کے لئے ایسے اشخاص کا انتخاب اور تقرر ضروری ہے جو متدین ہوں۔ پاکباز و نکوکار ہوں۔ اور مساجد کی طرف توجہ کرنے والے ہوں جو صرف اقامت صلوٰۃ پر ہی اکتفا نہ کریں بلکہ مسجدوں کو خاص کر قصبات کی مساجد کو اصلاح و ارشاد کی محفلوں میں بدل دیں جہاں سے قوم کی اصلاح، اور جہالت کا مقابلہ کیا جائے!

پانچواں مرحلہ:- اقتصادی اصلاح:-

مصر میں آج کل جن طریقوں سے دولت کی اُلٹ پھیر ہوتی ہے، اس بات کے لئے کافی نہیں کہ ایسے حالات میں اہلِ مصر اپنی زندگی اچھی گزار سکیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ پیداوار، دولت اور ترقی کے لئے دروازے کھولے جائیں۔ اور صحیح

بنیادوں پر ان طریقوں کی اصلاح کی جائے۔ اس لئے ہم چند تجاویز پیش کرتے ہیں:۔

۱۔ سود بند کیا جائے۔ اور مصارف کی تنظیم اس نوعیت سے کی جائے کہ یہ مقصد حاصل ہو سکے، اور اس کے لئے پہلے حکومت کو بطور نمونہ خود اپنے خصوصی مصارف میں تخفیف کرنی چاہئیے۔!

۲۔ قومی بنک کی تاسیس کی جائے، اور ایک گورنمنٹ پریس نشر و اشاعت کے لئے قائم کیا جائے، اور بہت جلد سکہ ڈھالنے کی ایک ٹکسال قائم کی جائے۔!

۳۔ مضاربت کے وہ تمام تحریری معاہدے (جو غیر ملکوں سے ہیں) جنہوں نے قومی اقتصادیات کو تہ و بالا کر دیا ہے یک قلم منسوخ کئے جائیں، اور ملکی مصالح کے پیش نظر غلہ وغیرہ کے سلسلہ میں اصلاح کے لئے ٹھوس عملی اقدام کیا جائے۔!

۴۔ بنجر زمین کی اصلاح مکمل طور پر کی جائے، اور صحرائی خطے سے معدنیات حاصل کرنے اور زرعی بنانے کے لئے پوری توجہ دی جائے۔!

۵۔ ملک میں ایسی صنعتیں جاری کی جائیں، جن سے شہری اور فوجی ضروریات پوری ہو سکیں۔!

چھٹا مرحلہ:۔ فوجی تربیت

فوج کے ہمدرد افراد سب سے پہلے اصلاح اور توجہ کے مستحق ہیں، حکومت کا یہ فرض ہے کہ ان کی تنخواہ والاونس وغیرہ کی ادائیگی میں بخل سے کام نہ لے۔ یہ ایک فریضہ ہے کہ اس کے مقابل میں دوسرے فرائض مؤخر کئے جا سکتے ہیں اور چاہے اس کی وجہ سے بجٹ کی دوسری شقوں پر تنگی اور زیادتی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ ہماری خواہش ہے کہ ہم اجمالی طور پر عسکری تربیت کے سلسلہ میں چند امور کا تذکرہ کریں:۔

۱۔ آداب و شعائر دینی کی لشکر میں رعایت رکھی جائے، اور عسکری لوگوں کے مابین بھائی چارہ کی بنیاد پر تعلقات کی استواری کی جائے!

۲۔ نظام عسکری کی اس طرح توسیع کی جائے کہ ایک محدود مدت کے بعد قوم میں کوئی فرد جو ہتھیار نہ رکھتا ہو ہتھیار کے بغیر نہ رہے۔ حتیٰ کہ پوری قوت ہی فوجی ہو جائے جو سازو سامان سے پوری طرح مسلح ہو!

ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

"نکل پڑو (خواہ) تھوڑے سامان سے (خواہ) زیادہ سامان سے (ہو) اور اللہ کے راستے میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرو"

۳۔ مدارس اور کالجوں میں فوجی تربیت کی طرف بیش از بیش توجہ کی جائے۔ اور اس تربیت اور فوجی مشغول کو نتیجہ خیز بنایا جائے اور تعلیم کے ساتھ ساتھ فوجی تربیت بھی جبری اور لازمی قرار دی جائے، اور یہ تربیت، تمام فنون حرب اور جنگ کے صحیح طریقوں پر مشتمل ہو!

۴۔ ایک جیش تعلیمی مرتب کی جائے تاکہ فوج سے کوئی انتظامی امور چھوٹ جائیں تو یہ اس کو پورا کرے!

۵۔ اسلحہ ساز فیکٹریوں کی قیام میں حکومت عجلت سے کام لے، تاکہ اسلحہ اور ذخیرہ سے فوج کی ضروریات کے مطابق ان کی امداد کی جائے اور فوج سازو سامان اور تعداد کے لحاظ سے مضبوط اور طاقتور ہو!

ساتواں مرحلہ :- پولیس کی اصلاح :- پولیس کے افراد امن داخلی کے محافظ شمار ہوتے ہیں اور وہ ملت کا ایک جز ہیں، ضروری ہو کہ ان کے آپس کے تعلقات بہتر اخلاق کی بنیاد پر قائم ہوں!

اس لئے مناسب ہو کہ ایسے خراب عناصر سے پولیس کو پاک کیا جائے جنھوں نے قوم کو ذلیل کرنے میں سرکشوں اور ظالموں کی معاونت کی، اور جنھوں نے قوم کے آزاد بیٹوں کو قید خانوں کی تنگ و تاریک فضا میں ڈھکیلنے کے لئے زمین ہموار کی! اور جس نے شہروں کو خوف اور گھبراہٹ سے بھر دیا جس کے آثار ہمارے درمیان اب تک زندہ اور موجود ہیں!

اور پولیس کو اس سے بھی بچایا جائے کہ وہ کسی گروہ کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ جائے، جو اس کے سیاسی مقاصد میں آلہ کار بنے، اور جب وہ گروہ وزارت بنائے تو اس کو غالب کرنے میں کوشاں رہے!

اور ضروری ہو کہ سیاسی پولیس کا نظام بھی ختم کیا جائے۔ جس نے پولیس کے نام نیک کو بدنام کر دیا ہو، اور جس کا اثر بغیر کسی حق اور استحقاق کے زندگی کے اکثر شعبوں پر پڑ رہا ہو، درحقیقت یہ مبغوض و مردود استعمار کے باقیات سیئات میں سے ہو،

پولیس کے افراد کی زندگی کا معیار بھی بلند کیا جائے۔ اور ان کو معاملات زندگی میں امن و اطمینان کی ضمانت دی جائے،

اور ایک طرف تو سپاہی اور افسروں کے باہمی تعلقات و روابط محبت و مودت کی بنا پر قائم کئے جائیں دوسری طرف پبلک سے بھی پولیس کے روابط دوستانہ ہوں!

حرفِ آخر

یہ تھے بنیادی اور اہم امور جن میں سے ہر ایک کی تشریح اور توضیح کی گئی! اور جن مشکلات کا ہمیں اب مقابلہ کرنا پڑ رہا ہو اس کی تین جہتیں اور حیثیتیں ہیں، مظلوم، ظالم، اور ایسے طریقے جو ظالموں نے ظلم ڈھانے کے لئے گھڑ لئے ہیں۔

قوم کی حالت سدھارنے کے لئے ان اُمور کی طرف توجہ ضروری ہو!

۱۔ حقوق ان کے اہل کی طرف لوٹا دئے جائیں۔ اور ہر حق والے کا حق واپس کیا جائے چنانچہ سیاسی قیدیوں کو آزاد کیا جائے، کیونکہ یہ گروہ نوجوان قوم کا ہراول دستہ ہو جن کے چہروں پر ظلم وستم کا پردہ پڑا ہوا ہو، اور وہ اس وقت بھی پابندِ سلاسل رہا جبکہ ظالم اور جلاد مزے اُڑاتے تھے۔

اسی طرح مال و جائیداد مغصوبہ بھی اُن کے جائز وارثوں اور مالکوں کو لوٹا دی جائے اور ہر شہری کے لئے زندگی کی ایسی سہولتیں اور آسانیاں فراہم کی جائیں جن کے ذریعہ سے وہ الحاد، فقر، ظالم حکمراں، اور سیاسی

تاجروں کی بنائی ہوئی زنجیریں اور بیڑیاں کاٹ کر پھینکدیں، اور ان نامردا زیادتیوں سے آزاد ہوجائیں!

۲- ظالموں سے قصاص لیا جائے، اور جنہوں نے حرام باتوں کو مباح کرلیا ہے، آزادیاں چھینی ہیں، ملت کے پاکیزہ اصولوں کو پاؤں تلے روندا ہے، اور جنہوں نے ملک کو اپنی شہوت رانیوں، اور خواہشات کی چراگاہ بنایا ہے، اور جنہوں نے فضول اور بیہودہ مصلحتیں، گھڑ گھڑ کر خود حرام کھانے اور کھلانے، اپنے اہل و عیال اور مددگاروں کو کھلانے کے ذرائع پیدا کئے، ان سب کو سیاسی میدان سے بیک بینی دو گوش نکال باہر کیا جائے!

۳- ظالموں نے ظلم ڈھانے کے لئے جو جو طریقے وضع کر رکھے ہیں، ان کو یک قلم بدلا جائے، اور یہ تغیر زندگی کے ہر اُس شعبہ میں کیا جائے جن میں ظالموں نے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے اثر، نفوذ اور رسوخ حاصل کیا ہے۔ رہا استقلال و آزادی کا قصہ، تو اس کا تو بس ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ انگریز کو مصر و سوڈان سے اور ہر استعماری اثر و قوت کو بلادِ اسلام سے نکالدیا جائے!

(لوگ سوال کرتے ہیں ایسا کب ہوگا؟ کہئے عنقریب ہی ہوگا!)

اخوان المسلمون کے ان خطوط اور نکات کو پیش کرتے وقت اللہ تعالیٰ کی وہ کتاب پیشِ نظر ہے، جو عدل و احسان کا حکم دیتی ہے، بھائی چارہ، اور اہلِ ذمّہ کی رعایت پر اُبھارتی ہے!

"اللہ تمہیں ان لوگوں سے احسان و انصاف کا برتاؤ کرنے سے نہیں روکتا جنہوں نے نہ دین کے بارے میں تم سے لڑائی کی نہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ سے ہم دعا کرتے ہیں جس کی قدرت بہت عظیم ہے کہ وہ دلوں کو ھدایت پر جمع کرے، اور ملت کو اپنے مقاصد اور موقف سمجھنے کی توفیق دے اور ہم سب کو سیدھے راستہ کی ھدایت نصیب فرمائے، اللہ بہت بڑا ہے اور اس کے لئے ہی ساری تعریفیں ہیں —!

تن درستی
اور
چہرے کا قدرتی حسن
عمدہ و صاف خون
کا آئینہ دار ہے

موسموں کی تبدیلی کے وقت بالخصوص موسم بہار
اور برسات میں خون کمزور اور ناصاف ہو جاتا ہے اور
انسان پھوڑے، پھنسیوں، خارش، داد، اگزیما
اور دوسری خون کی بیماریوں اور کمزوری کا شکار
ہو جاتا ہے،

صافی نہ صرف خون کو صاف کرتی ہے
بلکہ اسے طاقت ور بناتی ہے انسان کو چست اور
صحت مند رکھتی ہے صافی کو استعمال کرنے
والے امراض سے محفوظ رہتے ہیں اور مریض جلد
مرض سے نجات پاتے ہیں
صافی بچے، بوڑھے اور عورت مرد سب استعمال
کر سکتے ہیں
صافی قبض نہیں رہنے دیتی۔

صافی

همدرد دواخانہ، کراچی

شفیق جونپوری

سوز و ساز

نکہت کو تو دامن میں چھپایا گُلِ تر نے
پر باغ میں رہنے نہ دیا بادِ سحر نے

کس وقت بھلایا ہے رفاقت کی نظر نے
ساتھی کو جگایا بھی نہ یارانِ سفر نے

ذرّوں پہ جھکائی ہے جبیں نجم و قمر نے
دیکھی ہیں وہ راتیں مرے اجڑے ہوئے گھر نے

پھر گیسوئے جاناں کے تصور کے سہارے
آئی ہے شبِ غم مری بالیں پہ سنورنے

جب بجھنے کا وقت آیا تو کھوئی ہوئی شب کو
رو رو کے بہت یاد کیا شمعِ سحر نے

کچھ یہ کہ قیامت ہے جوانی کا زمانہ
کچھ تم کو سنوارا ہے مرے حسنِ نظر نے

خاموشیٔ پروانہ نے محفل کو سلایا
بیدار کیا نالۂ مرغانِ سحر نے

محروم ہوئے رات کے تاروں سے بھی یارب
سورج کو بھی پایا نہ غریبانِ سحر نے

سُرخی نہ مٹی خونِ عنادل کی ابھی تک
سو مرتبہ شبنم سے بھی دھویا گُلِ تر نے

مخمور بھوپالی

عنوان رہا بھی تو فسانہ نہ رہے گا
یہ وقت "یہ عالم" "یہ زمانہ" نہ رہے گا

دل توڑ کے گھبراؤ گے پچھتاؤ گے برسوں
یہ ساز "یہ محفل" "یہ ترانہ" نہ رہے گا

مغرور نہ ہو اپنی بہاروں پہ جوانی
جو آج ہے کل تک وہ زمانہ نہ رہے گا

ہاں ایسے میں مجروح بنا دو مرے دل کو
اس طرح سے پھر زد پہ نشانہ نہ رہے گا

اللہ رے سرمستیٔ آغازِ محبت
میں خود بھی نہ سمجھا یہ زمانہ نہ رہے گا

تم دردِ محبت کو محبت سے نہ دیکھو
ورنہ مرے مرنے کو بہانہ نہ رہے گا

مخمور بڑی چیز ہے یہ دورِ جوانی
ہم رہ بھی گئے تو یہ زمانہ نہ رہے گا

موجِ کوثر — کوثر نیازی

روشنی کا کسی عنوان بھی ساماں نہ ہوا
اک ستارہ شبِ فرقت میں فروزاں نہ ہوا

آخر اس جہلِ خرد کی بھی دوا ہے کہ نہیں
اور سب کچھ ہوا انساں، مگر انساں نہ ہوا

آہ! وہ آنکھ جو روئی نہ ترے غم میں لہو
ہائے! وہ دل جو غبارِ رہِ جاناں نہ ہوا

دلِ ہر غنچہ سے اب تک ہے تراوش خوں کی
رقصِ ابلیس ہوا، جشنِ بہاراں نہ ہوا

مستقل غم ہی یہاں ہے نہ مسرت کو ثبات
کون اس دہر میں خنداں کبھی گریاں نہ ہوا

عمر گزری ہے اسے راہ پہ لاتے کوثر
دل ہے کم بخت وہ کافر کہ مسلماں نہ ہوا

محسوساتِ ماہر — ماہر القادری

دید کے قابل ہے اُس گل رنگ ماتھے کی شکن
جیسے برگِ لالہ و گل پر ٹھہر جائے کرن

بے اثر ہیں سیکڑوں نغمے نہ ہو گر دل میں سوز
ایک نالے سے بدل جاتا ہے رنگِ انجمن

آتشِ گل کے بھڑک جلنے کا خطرہ ہو جسے
اُس کو کیا تسکین دے گی عشرتِ صبحِ چمن

اے کراچی! تیرے نظاروں کا پیہم شکریہ
اس کو کیا کیجئے کہ پھر بھی یاد آتا ہے وطن

جو کوئی بے شاہد و بادہ رہا
اُس کی فطرت کا ورق سادہ رہا

شیخ نے پی اور پی اس شان سے
مدتوں تک رہنِ سجادہ رہا

ایک میں ہی تھا جو اُن کی بزم میں
پاس رہ کر دُور افتادہ رہا

تجھے اپنے غم سے مطلب، مجھے غم ہے دوسروں کا
مرے سامنے نشیمن، ترے سامنے چمن ہے

درد و کیف

سید فضا جالندھری

وہ آئے بھی تو نظر سے نظر ملا نہ سکے
وفورِ شوق و تمنا کی تاب لا نہ سکے

نفس نفس تھا فسانہ نظر نظر روداد
نہ جانے سن نہ سکے وہ کہ ہم سنا نہ سکے

ترے کرم کی بشارت نہیں ہے اس کیلئے
جو اعترافِ ندامت پہ سر جھکا نہ سکے

گردشیں ہیں وہی ستاروں کی
ہائے! تقدیر غم کے ماروں کی

وہ مہکتے ہوئے گلِ رخسار
جان ہی جان ہیں بہاروں کی

کس نے دیکھا یہ مسکرا کے فضا
بڑھ گئی تازگی نظاروں کی

قفس میں کاہے کو یاد بہار آتی ہے
کہ زیست یوں بھی تو آخر گزر ہی جاتی ہے

ساحل کی زندگی تو کوئی زندگی نہیں
موجوں سے کھیل، بحر میں غوطے لگا کے دیکھ

کانٹے بچھائے گی خلشِ دل جگہ جگہ
دشواریاں ہیں راہ میں حایل جگہ جگہ

طوفاں کی زد میں آئے تو ہم پہ کھلا یہ راز
آغوشِ موج میں بھی ہے ساحل جگہ جگہ

جس طرح ٹوٹ جائے کوئی موتیوں کا ہار
دامن پہ ان کے اشک فضا یوں بکھر گئے

"اور"

ابوالبیان حماد

اے دوست تو آ جا مری شہ رگ سے قریں اور
ہو جائے فزوں تر یہ مرا ذوق یقیں اور

اک در ہے ترا وہ بھی اگر چھوٹ ہی جائے
کس در پہ جھکاؤں میں یہ بیتاب جبیں اور

دل لذتِ دیدار سے سرشار نہ ہو کیوں
فردوسِ نظر اور ہے فردوسِ بریں اور

دیکھوں تو بھلا کیوں میں کسی اور کی جانب
جز تیرے نہیں کوئی حسیں اور کہیں اور

ہے پاس مرے دردِ محبت کی امانت
ہے کوئی جہاں میں مرے مانند امیں اور

راس آیا نہیں مجھ کو جہانِ گزراں یہ
اے کاش میسر ہو فلک اور زمیں اور

واقف نہیں تو لذتِ ایمان و یقیں سے
اے بندۂ تخمیں ہے گماں اور یقیں اور

وہ دین ہی کیا جس میں نہ شامل ہو سیاست
یہ دین اگر ہے تو مرا دینِ مبیں اور

جوہر سعیدی

غزل (مسلسل)

بُجھتے ہوئے چراغ فروزاں ہوئے تو کیا — اب آپ زندگی کے نگہباں ہوئے تو کیا
جب زندگی میں ربط و تسلسل نہیں کوئی — رہ رہ کے آپ سلسلہ جنباں ہوئے تو کیا
کرکے مری بہار کو رعنائیوں سے دور — میرے لئے بہار بداماں ہوئے تو کیا
جب زندگی سی چیز ہی ممکن نہیں رہی — پیدا ہزار طرح کے امکاں ہوئے تو کیا
جب مطمئن ہے بے سر و سامانیوں سے دل — تکمیلِ شوق کے سر و ساماں ہوئے تو کیا
جب زندگی سمٹ کے سفینوں میں آگئی — پیدا ہر ایک موج سے طوفاں ہوئے تو کیا
دامانِ آرزو ہی نہیں دستِ شوق میں — پیدا اگر ہزار گریباں ہوئے تو کیا
میری وفا و فا کا اُڑا کر مذاق اب — اپنی جفا جفا پہ پشیماں ہوئے تو کیا

سنسان راستوں میں بھٹکنے سے فائدہ
ویران وادیوں میں غزل خواں ہوئے تو کیا

نیّر سعیدی

احساس و تاثر

مجھے تو گردشِ دوراں کا کچھ نہیں احساس — مگر میں سخت پریشاں ہوں لوگ کہتے ہیں

کبھی خوشی تھی مگر اب ہے غم عزیز مجھے — بدل گئے ہیں مری زندگی کے عنوانات
مسرتیں تو مجھے راس آ نہیں سکتیں — خدا کرے نہ ملے اب مصیبتوں سے نجات

ہے اہلِ وفا کی زندگانی — اک جذبۂ شوق جاں سپاری
تم سے تو نہ کی کبھی شکایت — جس طرح گزر سکی گزاری

جب تمہارا خیال آتا ہے — ہم غمِ زیست بھول جاتے ہیں

ارم لکھنوی

ہم باغِ تمنا میں دن اپنے گزار آئے
آئی نہ بہار اب تک، شاید نہ بہار آئے

ماہر القادری

جھلکیاں ——— •
پرچھائیاں ——— •
تصویریں ——— •

دیکھئے اور سوچیے کہ آپ کا فرض کیا ہے؟

ادھیڑ عمر کا ایک خوش پوش بھاری بھرکم آدمی اپنے بچّہ کی انگلی پکڑے ہوئے بڑی سڑک سے گزر رہا ہے، بچّہ کوئی نو دس سال کا ہوگا، لانبا قد، کھلتی ہوئی رنگت، ہونٹ اگر پتلے ہوتے تو خوبصورتوں میں شمار ہوتا اُس کا! پھر بھی خوش منظر فرد ہے، چہرے پر ذہانت کے آثار پائے جاتے ہیں ——— یہ دونوں ایک سینما ہاؤس کے قریب سے گزرتے ہیں، گیٹ پر ایک ایکٹریس کی قدِ آدم رنگین تصویر ——— بلاؤں پکے مجسّمہ (STATUE) ایستادہ ہے! ایکٹریس چاہے اتنی خوبصورت، متناسب الاعضا اور شوخ و جوان ہو کر نہ ہو مگر یہ تصویر بلا کی جاذبِ نظر اور قیامت کی دیدہ زیب ہے! آنکھوں میں کس قدر خمار پیدا کیا گیا ہے؟ لب، رُخسار کتنے رنگین ہیں، اور سینہ کا تناؤ نہ پوچھیے کہ چولی کے بند اب ٹوٹے اور تب ٹوٹے! یہ رقص کا سین ہے، پنڈلیوں کی جھلک اپنی جگہ خود مستقل دعوتِ نظارہ ہے! جو کوئی بھی یہاں سے گزرتا ہے، اس تصویر کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا، بچے اچھوں کے قلب کی رفتار یہاں سے گزرتے ہوئے تیز ہو جاتی ہے، رکشاؤں اور گھوڑا گاڑیوں کا اس جگہ کئی بار تصادم ہو چکا ہے ——— کیوں؟ یہی کہ رکشا والے اور کوچبان بھی آخر پہلو میں دل رکھتے ہیں، وہ اپنی رکشاؤں کو سنبھالیں اور گھوڑوں کو قابو میں رکھیں کہ اس شوخ و رنگین تصویر کو دیکھیں، ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے۔

——— ابا! یہ عورت ہاتھوں کو اُٹھا کر کیا کر رہی ہے ——— بچّہ نے دریافت کیا

——— یہ ناچ رہی ہے ——— باپ نے جواب دیا

[بچّہ تصویر کو دیکھتے ہوئے رُک جاتا ہے، باپ ٹھوکا دیتا ہے مگر وہ اُس کے دیکھنے میں محو ہے - - - -]

——— مُنّے! چلو آگے چلو، چلو ——— تم نے میری اُنگلی بھی چھوڑ دی ——— باپ نے کہا

——— ابا! یہ تصویر کتنی اچھی ہے، دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سچ مچ کوئی عورت کھڑی ہوئی ہے ——— بچّہ بولا

——— منے! یہ بُری چیز ہے، اسے نہ دیکھو ——— باپ نے کلائی کی گھڑی میں کوک بھرتے ہوئے جواب دیا

——— یہ بُری چیز ہے، تو اس بُری چیز کو یہاں چوراہے پر کس نے رکھ دیا ہے ——— بچّہ نے قدرے حیرت آمیز لہجہ میں پوچھا

——— سینما والوں نے! اس تصویر کو دیکھ کر اُن کے ٹکٹ بکتے ہیں ——— باپ نے کہا

——— مگر کل ہمارے پڑوس کے رہنے والے نے سڑک پر کوڑا پھینک دیا تھا تو پولیس افسر کا چالان کر دیا تھا - - اور میرے پوچھنے پر آپ نے کہا تھا کہ میلا اور کوڑا کرکٹ اس طرح سڑکوں پر پھینک دینا بُری بات ہے اور حکومت بُری باتوں پر روک ٹوک کرتی ہے ———

یہ اُس کا فرض ہے۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ (بیٹے کی بات کاٹ کر ۔ ۔ ۔ ہاں ! ہاں ! تم ہی کہوگے کہ حکومت اس بُرائی کو کیوں نہیں روکتی ——— باپ نے جواب دیا ۔ ۔ ۔) اور اتنے میں آگ بجھانے والے انجن کی ٹن ٹن نے اس گفتگو کے سلسلہ کو توڑ دیا ——— باپ اس بات کو زیادہ طول دینا بھی نہ چاہتا تھا۔

شہر کے ایک مشہور اور مقبول روزنامہ میں ایک مسلمان خاتون کی تصویر چھپی ہے جس کے نیچے لکھا ہے ——— کہ آپ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک کمیٹی میں شریک ہونے کے لئے پیرس جارہی ہیں ۔ ۔ ۔ " ایک لڑکی اس تصویر کو بڑے غور سے دیکھ رہی ہے اتنے میں اس کی ماں کمرے میں آجاتی ہے۔

——— بجمہ ! اخبار پڑھنے میں اتنی ڈوبی ہوئی ہو کہ میری بچل بھی تم نے نہیں سُنی ——— ماں نے پوچھا

——— امی ! میں آپ کو آواز دینے ہی والی تھی ——— لڑکی نے جواب دیا

——— کیا کسی لفظ کے معنی پوچھنے تھے ——— ماں نے دریافت کیا

——— امی ! آپ بڑی آپا (لڑکی کی چچازاد بہن) کو کل سمجھارہی تھیں کہ تم گھر سے تن تنہا کس طرح چلی آئیں تمھیں ایسا نہ کرنا چاہیئے، اللہ رسولؐ کو یہ بات ناپسند ہے ——— مگر اس اخبار میں ——— بیگم صاحبہ کی تصویر چھپی ہے اور وہ پیرس تشریف لے جارہی ہیں ——— لڑکی نے اخبار ماں کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا

——— یہ ۔ ۔ ۔ بیگم صاحبہ گناہ اور بے غیرتی کا کام کررہی ہیں بیٹی !! اللہ پاک ایسی عورتوں کی پرچھائیں سے بھی شریف عورتوں کو بچائے رکھے ——— یہ اسلام اور پاکستان کی رُسوائی کے سامان ہیں ۔ ۔ ۔ توبہ ۔ ۔ ۔ ! ——— ماں قدرے دلگیر ہو کر بولی

——— اور ہماری حکومت ان برائیوں کو نہیں روکتی (وہ تو اُلٹی ان باتوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے ——— ماں جواب دیتی ہے) اور اخبار والے ایسی تصویریں کیوں چھاپتے ہیں؟ (اس لئے کہ ان تصویروں کی بدولت اُن کے اخبار بکتے ہیں ——— اور ان "بیگموں" کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے ——— ماں نے کہا) ——— اور کسی آنے والے کے گھنٹی بجانے پر یہ سلسلۂ کلام رُک گیا۔

اوسط درجہ کا آرام دہ فلیٹ ہے، ایک ہال، ایک متوسط اور ایک تکونیا کمرہ ! بالکنی بھی ہے جس میں ایک چھوٹا سا پلنگ بچھ جا سکتا ہے، بجلی ہے، پنکھا ہے، غسل خانہ ہے، فلیش سسٹم ہے ! ضرورت کا سامان ہر طرح کا موجود ہے، مکان میں گنجائش ہوتی تو اور زیادہ سامان بھی مالک مکان خرید سکتا تھا، گھر والوں کی مردم شماری چھ نفوس پر مشتمل ہے، میاں، بیوی، تین بچے اور نوکرانی ! بیوی کے اصرار پر میاں نے ریڈیو خرید ا ہے، جو مسلسل چلتا بلکہ بجتا رہتا ہے، نئی چیز سے ہر کسی کو دلچسپی ہوتی ہے اور بچوں کے شوق اور دلچسپی کی تو کوئی حد و انتہا نہیں، کھیلنا تک چھوڑ دیا ہے، اُن کا زیادہ وقت ریڈیو سٹ کے آس پاس ہی گزرتا ہے۔

بچوں میں فطری طور پر استفسار اور دریافت کا مادہ ہوتا ہے اور نئی چیز کو دیکھ کر تو اُن کے شوق و استفسار سے خاموش رہا ہی نہیں جاتا ! یہ بچوں کی فطرت ہے جسے دبایا تو جاسکتا ہے، مگر بدلا نہیں جاسکتا، ریڈیو پر گانے سُن سُن کر بچے اپنے ماں باپ سے دریافت کرتے رہتے ہیں :—

—— "بالم" اور "ساجن" یہ کیا چیز ہیں —— "وصل کی رات" کونسی رات کو کہتے ہیں، مدبھری آنکھیں دیکھ کر کوئی پاگل کیوں ہو جاتا ہے —— یہ جدائی کی رات کیسی رات ہے جو کسی طرح کاٹے نہیں کٹتی —— "بام" نے "گوری" کی ناجک ناجک (نازک) کلائیاں کیوں مروڑ دیں —— یہ "نیناں" کیا ہوتے ہیں جن سے شراب پی جاتی ہے..!

بچوں کے ماں باپ نے ان سوالوں کو باتوں میں ٹال دینے کی کوشش کی اور وہ ٹال بھی گئے —— مگر چند دن کے بعد باپ نے دیکھا کہ اُس کی لڑکی آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔

"انکھیا ملاکے، جیا بر ماکے، چلے نہیں جانا —— ہو چلے نہیں جانا!"

گا رہی ہے اور اشارے کرتی جا رہی ہے...!

اسی دن تیسرے پہر کے وقت باپ ریڈیو سٹ بیچنے کے لئے لے جا رہا ہے، بیوی کہتی ہے کہ آپ کی چیز ہے، آپ اسے شوق سے بیچ سکتے ہیں، میں کچھ نہیں کہتی، مگر آپ قریب کے ہوٹل اور پاس پڑوس کے ریڈیو سٹ بھی بند کرا دیجئے اُن کی آواز کو آپ کس طرح روکیں گے ناممکن ہے کہ بچوں کے کانوں میں یہ گیت اور گانے نہ پڑیں اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ بچے دن رات کان بند کئے رہیں، خطا تو اوپر والوں کی ہے، اُن کی جن کے ہاتھوں میں ریڈیو کا انتظام ہے —— !

یہ ایک دفتر کی فائل ہے اس پر ہیڈ کلرک صاحب نے نوٹ لکھا ہے! مگر انگریزی بالکل گوارا شاہی! وہ بیچارہ بھی کیا کرے، ساری عمر اُردو بولنے اور اُردو بولنے والوں میں رہتے گزری ہے، بامحاورہ انگریزی ایکا ایکی کیسے لکھنے لگے! پھر کالج چھوڑتے ہی پیٹ کے دھندے میں لگ گیا، انگریزی لٹریچر کے مطالعہ کا موقعہ بھی نہیں ملا، تحریر و انشاء میں ترقی تو مطالعہ سے آتی ہے —— اور صاحب! کوئی صحیح اور بامحاورہ انگریزی لکھنا اور بولنا بھی جانتا ہو، مگر یہ تو پاکستان ہے، یہ تو اس بنیاد پر حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں مسلمانوں کا مذہب زبان اور کلچر محفوظ ہوگا، اور بڑے عہدیداروں کا یہ عالم ہے کہ ایک گھنٹہ کی گفتگو میں پچپن منٹ کے قریب انگریزی بولتے ہیں اور پانچ منٹ اُردو! ان کی گفتگو، لب و لہجہ، نشست و برخاست رہنے سہنے کا انداز، سگریٹ سلگانے اور پائپ پینے کی سج دھج ... انگریزوں جیسی ہے! غلامی کی مرعوبیت دماغوں سے نہیں جاتی، نہیں جاتی اور جو گئی بھی ہو تو نہ جانے کے برابر ہے! ڈانس ہیں، لنچ اور ڈنر ہیں، کلب گھر کی عیش سامانیاں ہیں، مذہب اور کلچر کیسا! اور زبان کہاں کی! یہ تبدیلیاں تھوڑا بہت ایثار اور قربانی چاہتی ہیں —— اور اس کا یہاں کوسوں پتہ نہیں! ہاں بیچارے "ملاؤں" کو صلواتیں سُنانے میں چشم بد دور کافی دلیر اور مشاق ہیں یہ اُن کا بڑا پسندیدہ موضوع ہے —— اور ... اور یہ کہ کسی جلسہ کی صدارت، کسی کارخانے یا کمپنی کا افتتاح ان سے کرانا ہو تو تھوڑی دیر قرآن شریف بھی سُن لیتے ہیں —— اور یہ بھی ان کا بڑا کرم ہے —— بس آگے آیت" (ط)!

صوبوں کی اسمبلیوں کے انتخابات ہو رہے ہیں —— بڑی اچھی بات ہے! جمہوریت کا یہی تقاضا ہے، مگر —— یہ —— ارے! یہ کیا ہو رہا ہے؟ دھن، دھونس دھوکے اور دھاندلی کی گرم بازاری! غضب خدا کا کہیں کہیں تو سرکاری ملازم کھلے خزانے مسلم لیگ کے اُمیدواروں کی حمایت کر رہے ہیں —— کیوں نہ کریں! اُن کو حکم دیا گیا ہے، ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت سب کچھ ہو رہا ہے —— مگر انصاف ——؟ بھائی! کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو،

چنڈو یا سفہ تو نہیں پی رکھا ہے تم نے! یا افیم کا انٹا تو نہیں چڑھا رکھا ہے ـــ انصاف کا ذکر چھوڑ دو پولیسی کی باتیں کرو... یہاں کرسیوں پر جمے رہنا ہے، وزارتوں کو بھلا کوئی آسانی سے چھوڑ سکتا ہے، عزت آبرو اور مال و دولت کے لئے ہر طرح کے جتن کرنے پڑتے ہیں۔

اے لو ۔ ۔ ۔ جعلی ووٹ، فرضی ووٹرس! ووٹوں کے ڈبے تک توڑے جا رہے ہیں، اور کوئی کچھ نہیں کہتا، کہے کون؟ چور کے بھائی گرہ کٹے ؎ ایں خانہ تمام آفتاب است! اور ان بدعنوانیوں پر نیک لوگوں نے واویلا کر کے بھی دیکھ لیا، بڑے آدمیوں نے اس کان سُنا اور اُس کان اُڑا دیا، ضمیر جب سخت ہو جاتے ہیں تو ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔

؎ بدوزد طمع دیدۂ ہوشمند!

جب لوگ یہ دیکھیں گے کہ آئینی انقلاب کے راستے سب کے سب بند کر دیئے گئے ہیں ـــ تو آخر کیا سوچیں گے! یہی کہ دوسری طرح سے انقلاب لائیں! مگر یہ تو بہت بری بات ہو گی! سو فی صدی بُری اسے اچھا کون بے وقوف کہتا ہے! بے آئینی اور لاقانونیت تو ہر حالت میں بُری چیز ہے ـــ تو یہ "بڑے لوگ" پاکستان میں ایک آتش فشاں بنا رہے ہیں ـــ مگر ان کو کون سمجھائے، جو کوئی سمجھاتا ہے اُسے یہ اپنا دشمن اور ملک کا غدار سمجھتے ہیں، ایسے بے تدبیر لوگ بھی دُنیا میں کم ہی پیدا ہوئے ہوں گے۔

کچھ لوگوں کو دفتر سے نکالا جا رہا ہے! کیوں! آخر ان کا قصور؟ کیا انھوں نے رشوت لی ہے، دفتروں کی فائلیں گم کر دی ہیں، یہ کام چور ہیں، وقت پر نہیں آتے، نااہل ہیں! جی! ان میں سے کوئی عیب بھی ان بیچاروں میں نہیں پایا جاتا، دیانتداری کا یہ عالم ہے کہ اپنے ذاتی کام کے لئے دفتر کا کاغذ اور سیاہی تک کام میں نہیں لاتے، انتہائی فرض شناس، مستعد، چاق چوبند اور اپنے کام میں برق! اتنے اچھے اہلکار اور اس قدر وفادار عمال ہر دفتر اور محکمہ کو میسر کہاں آتے ہیں ـــ تو پھر ان کا جُرم آخر کیا ہے؟ یہ نہ پوچھئے اس پر پردہ پڑا رہے تو اچھا ہے! مگر یہ پردہ آپ کو اُٹھانا ہوگا، بات چھپانی منظور تھی تو اس ذکر ہی کو نہ چھیڑا ہوتا ـــ لیجئے سُنئے! ان پر الزام یہ ہے کہ تم اس جماعت سے تعلق رکھتے ہو جو پورے کے پورے اسلام کو برپا کرنا چاہتی ہے، جس کا مقصد اعلاء کلمۃ الحق اور جس کی منزل مقصود دین حق کا قیام ہے۔

یہ بات ہے ـــ تو یہ نیک لوگ عتاب کے نہیں تحسین و آفرین کے مستحق ہیں، مگر یہ تو آپ فرما رہے ہیں، یہ تو جناب کا فیصلہ ہے، "اوپر والوں" کو کون سمجھائے کہ خدا کے ضرورت سے زیادہ عقلمند بندو! تم نے مصلحین کو "مفسدین" سمجھ رکھا ہے ـــ خدا کے غضب سے ڈرو، آخرت کی بازپرس کا خوف کرو، سدا ہی لیل و نہار نہ رہیں گے، بہر حال، ایک نہ ایک دن مرنا اور اللہ کے حضور جانا ہے، اُس دن کے لئے اپنی ان زیادتیوں کے لئے کوئی معذرت سوچ رکھو ـــ!

ان صاحب کو تنخواہ اور الاؤنس مل ملا کر چار سو روپیہ ملتے ہیں ـــ مگر دس ہزار کی موٹر میں

چڑھے پھرتے ہیں، گھر کا خرچ ڈیڑھ ہزار سے کیا کم ہو گا؟ تو یہ روپیہ کہاں سے آتا ہے؟ یہ نہ پوچھئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "دستِ غیب" کی پاکستان میں کیا کمی ہے، اس فن کے بڑے بڑے سپیشلسٹ یہاں موجود ہیں کہ سالم ہاتھی نگل جائیں اور ڈکار نہ لیں، لوگوں کی آنکھوں پر پٹی نہیں بندھی ہوئی ہے، ان حضرت کے کرتوت کون نہیں جانتا مگر بلی کی گردن میں گھنٹی کون باندھے! تھوڑا بہت خوف ہر کسی کو لگا ہوا ہے اس لئے کہ یہاں نہ جانے کس کس کے دامن آلودہ ہیں، اور کہاں کہاں پانی مرتا ہے۔

یہ ایک بہت بڑے ہوٹل کے "ڈانس" Dance کا اشتہار شائع ہوا ہے، ناچنے والی گرل کا فوٹو کتنا دیدہ زیب ہے، یہاں شرابیں اُڑیں گی، نیم برہنہ ناچ ہوگا، عشق عاشقی کے قصے چلیں گے، آج سے کوئی پانسو سال پہلے بابر کہہ بھی تو گیا ہے:-

بابر! بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست!

پاکستان تو اس دعوے کے ساتھ بنا تھا کہ یہاں عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ کے دور کے طرز پر معاشرہ قائم ہوگا —— مگر یہاں تو بنو امیہ اور بنو عباس کے عیش پسند فرمانرواؤں کی "سنت" زندہ کی جا رہی ہے! میرے منہ میں خاک ان کرتوتوں سے پاکستان کہیں بربادی کے کھوکھلے تنے کی طرح نہ ہو جائے، آثار اچھے نہیں ہیں

روانہ ہو گئیں! کون؟ پاکستان کی درجنوں لڑکیاں! کہاں؟ بمبئی! وہاں کیا کام ہے خیر تو ہے! جی! آپ کو یہ تک نہیں معلوم کہ پاکستان اور ہندوستان کی ٹیموں میں کرکٹ کا مقابلہ ہو رہا ہے! جی ہاں ہو رہا ہے۔ ۔ ۔ تو ان خدا کی نیک بندیوں کے وہاں جانے کی آخر کیا ضرورت آپڑی ہے —— صاحب! آپ بھی بڑے دقیانوسی قسم کے واقع ہوئے ہیں، کرکٹ میچ کی اہمیت کو نہیں سمجھتے، اور میں پوچھتا ہوں کہ کرکٹ میچ دیکھنے میں آخر برائی کیا ہے؟ جو آپ اس قدر مشتبہ اور مشکوک انداز میں جرح فرما رہے ہیں!

جی بعض وقت میں کچھ شوخ ہو جاتا ہوں —— یہ لڑکیاں جو بمبئی تشریف لے جا رہی ہیں، بس دن میں کرکٹ دیکھا کریں گی، راتوں کو یا تو چپ چاپ سو جایا کریں گی، نہ کہیں آنا نہ جانا نہ کسی فلم اسٹوڈیو کی سیر، نہ کوئی اور تفریحی پروگرام —— یا پھر رات بھر نماز پڑھا کریں گی، اور ان کے گھر والوں کو سو فی صدی اعتماد ہے ان "خاتونانِ حرم" پر! کہ طوفانوں میں پہنچ کر بھی ان کا تر دامن تک نہیں بھیگ سکتا، کاجل کی کوٹھری میں جا کر بھی یہ اچھوتی ہی رہیں گی، اور کسی غیر مرد کی پرچھائیں کو بھی ان کی غیرت گوارا نہیں کر سکتی۔

"ہپ ہپ ہرے" کیسی دور اندیش عقل اور کیا ذہن رسا پایا ہے، کہ قربان ہو جائیے۔

یہ لڑکی ابھی ابھی کالج سے آ رہی ہے، آنکھوں کے ڈورے سرخ سرخ سے ہیں —— دھیرے دھیرے گنگنا رہی ہے:-

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا ہوا کہ تم نے فراموش کر دیا

کس کی یاد؟ کس نے فراموش کر دیا؟ یہ وہ راز ہیں، جو کالجوں کی دیواروں، زینوں، برآمدوں اور باغیچوں میں دفن

ہیں! پاکستان کے محکمہ تعلیمات کا سب سے بڑا کارنامہ کہ اُس نے آنرس وخس کو یکجا کر دیا، یہ ہونا ہی چاہیئے تھا، نہ ہوتا تو اچنبھے کی بات تھی ——— دریا میں دھکا دے کر ڈھکیل دیا اور اس پر ———

باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

یہ وہ نادانیاں ہیں جن پر جانوروں کو بھی ہنسی آتی ہے!

بھارت نے دریاؤں کا رُخ ہی پلٹ دیا ——— کشمیر کا اب ذکر اس طرح آتا ہے جیسے کوئی کسی واقعہ کو کچھ بھول گیا ہو اور کچھ یاد ہو ——— پاکستان میں غذا کا کال ——— آپس کے لین دین میں پاکستانی سکہ کی قیمت گرتی چلی جارہی ہے ——— تجارت ضغطہ کے عالم میں کہ نہ جانے کس چیز کا کب کیا بھاؤ ہو جائے ——— کوریا کی جنگ کو دعا دو کہ پاکستان کی مالی حالت قابل اطمینان ہوگئی تھی، مگر کب تک؟ ناگہانی حالات اور امرجنسیوں (EMERGENCIES) کے بل بوتے پر کوئی قوم نہیں جی سکتی اور نہ کسی حکومت کا بجٹ متوازن رہ سکتا ہے ——— ڈالر قریب قریب ختم ہو چکے ... تو پھر ...!...!

کشمکش

سالم نے ایک رسالہ میں اس دلخراش داستان کو پڑھا، ایک ایک لفظ پر اُس کے دل کو دھچکا لگا ——— تو پھر آخر کرنا کیا چاہیئے؟ وہ سوچ میں پڑ گیا، ماتھے کی لکیریں جلد جلد بے ترتیب سی ہونے لگیں ——— نفس نے کہا "تقدیر کو کون بدل سکتا ہے، حالات خدا پر چھوڑ دینے چاہئیں ——— ہمارا کام دعا کرتے رہنا ہے، جو کچھ مشیت کو منظور ہوگا، ہو کر رہے گا ..." مگر ضمیر نے فوراً آواز دی:-

"یہ بزدلانہ قناعت اور راہبوں کا صبر اور اپاہجوں کی دُعائیں ہیں، مردِ مومن کی شان "عزیمت" ہے! انبیاء کرام کی یہی سنت رہی ہے، ضربِ کلیم ہی نے فرعون کی طاقت کو پاش پاش کیا تھا ——— اور تیشۂ ابراہیم کی صدا ہی نے بُت کدے میں توحید کی گونج پیدا کی تھی"

جس قوم کی تاریخ میں بدر و حنین ہو، تبوک و خیبر ہو، فتح مکہ ہو، اُسے سنیاسیوں، جوگیوں، جٹا دھاریوں، بھکشوؤں اور پادریوں کی باتیں زیب نہیں دیتیں ——— مگر یہ راہ کٹھن ضرور ہے! تو اسے پھولوں کی سیج کس نے بتایا تھا (سالم ماتھے سے پسینہ پونچھتا ہے) یہاں تو قدم قدم پر دشواریوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اہلِ جنت کے لئے آزمائشیں مقدر کر دی گئی ہیں ———

یہاں تو شعب ابی طالب سے لیکر صلح حدیبیہ تک ہر قسم کے معرکے پیش آتے ہیں، اس راہ میں فتح مکہ ہی نہیں خندق اور کربلا بھی ملتی ہے ——— مانا کہ حالات نہایت درجہ ناسازگار ہیں، مگر ہمت اور استقلال سے کام لیا گیا، یہ حالات بدلے جائیں گے تو بدیں گے، یہ اندھیاں مٹائی جائیں گی تو مٹیں گی۔

اور یہ بات بھی گرہ میں باندھ لو! کہ پاکستان میں کچھ لوگ محض اپنی ذاتی غرض اور شخصی مفاد کے لئے انقلاب چاہتے ہیں، اُن کی راہ ہی دوسری ہے! بھلائی کے لئے وہ جدوجہد کرے گا جس کا دل ذاتی مفاد کے جذبے سے خالی ہو، جس کی پرستش و بندگی کا مقصود اے الٰہی ہو اور جو فساد نہیں تعمیر چاہتا ہو ——— بس پھر بیڑا پار ہے ... !

سالم ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا! اس کی نگاہ الماری کے آئینہ پر پڑی تو اُسے ایسا نظر آیا جیسے کسی نے اُس کے ماتھے پر

"نصر من اللہ و فتح قریب" لکھ دیا ہو ـــــــ وہ اپنے اندر غیر معمولی قوت محسوس کر رہا تھا، اور بے خوفی بھی! زخمی شیروں اور مست ہاتھیوں کے جھنڈ میں وہ بے تکلف کود سکتا تھا، اُس کی خودی پھیلتی چلی جا رہی تھی :-

؎ قلندر در دو عالم می نگنجد

جیسا عالم تھا ـــــــ قریب کی مسجد سے اذان کی آواز آئی ـــ

اللہ اکبر! ـــــ اللہ اکبر!!

حلم کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی اور ساتھ ہی آنسو بھی آ گئے، بے شک "اللہ ہی بڑا ہے، سب سے بڑا"! اور اُس کے نام کو بلند اور اُس کے دین کو قایم کرنے کے لئے میں طوفانوں سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوں!

رُوحِ انتخاب

ہم جس عالمگیر دورِ تہذیب کے زغے میں آئے ہوئے ہیں، ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وہ ہر جہت سے مفسدہ انگیز اور غارتگر ثابت ہو رہا ہے۔ اس دورِ تہذیب نے ہم کو فقر و افلاس دیا ہے۔ نا مساوات اور ناہمواریاں دی ہیں۔ طبقہ بندیاں اور بلاک سازیاں دی ہیں۔ نقصادم اور جنگیں دی ہیں۔ فواحش اور جرائم دیئے ہیں۔ اضطراب اور انتشار دیا ہے اور زندگی کو پورے کرۂ ارض پر ایک مستقل کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس دورِ تہذیب نے جو مختلف نظام اپنی گود میں پال کر بہم پہنچائے ہیں وہ سارے کے سارے خیر و شر کے مرکبات ہیں جن میں شر کا پلہ بھاری ہے۔ ان میں سے کوئی بھی تمام تر نفعِ خیر و فلاح نہیں ہے۔ ان نظاموں کے مفاسد کی عمارتیں خیر کے ان حقیر سے جزو پر قائم ہیں جو ان میں سے ہر ایک کے اندر کسی نہ کسی حد تک موجود ہے ـــــ (اور خیر سے بالکل خالی ہو کر کوئی نظام دنیا میں نہیں چلا) ان مرکب نظاموں کے خیر کا جزو ہی وہ جزو ہے جس کو پروپیگنڈے سے ابھار کر لایا جاتا ہے اور پھر پروپیگنڈے کے دھندلکے میں ان کے مفاسد چھپا چھپا کے رکھے جاتے ہیں اور ان کے بارے میں طرح طرح سے تاویلیں کی جاتی ہیں۔ مگر مفاسد جب واقعات کے میدان میں ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں تو ان کی تاویل کرنا ممکن نہیں رہتا!

ہمارے نزدیک وہ ارباب دانش اور وہ ارباب شعر و ادب بڑے ہی قابلِ رحم ہیں کہ جو ان مرکب نظاموں میں سے کچھ کسی کے فریب خوردہ ہیں اور کچھ کسی کے مرعوب زدہ! ان کے لئے اپنے دورِ تہذیب سے بالاتر ہو کر سوچنا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ مرعوبیت کے مقام سے اوپر ہو کر تنقید کی نگاہ ڈال سکتے ہی نہیں۔ یہ جو کچھ موجود ہے، اس سے آگے سوچ ہی نہیں سکتے۔ یہ بجز اس کے کچھ کر ہی نہیں سکتے کہ اپنے دورِ تہذیب کی منڈی میں جا کر ایک مال کے مقابلے میں دوسرا مال پسند کریں ـــــ آہ! ایک نئی متوازی منڈی قائم کرنے کے لئے جو اونچے درجے کی آزادیٔ فکر مطلوب ہے وہ ان کو قدرت کی طرف سے ارزانی نہیں ہوئی۔ ان کا حال اس فیشن پرست نوجوان کا سا ہے کہ جو لنڈے بازار میں جا کر ایسے کوٹ پتلون کا سودا چکاتا ہے جو کسی کی اترن بن کر بکا ہے اور پھر وہ نہا دھو کر اسے زیبِ بدن کر کے سوسائٹی میں گھومتا ہے اور اپنے حسنِ ذوق اور اپنی جدتِ لباس پر داد طلب کرتا ہے ـــــ اتنا ہی نہیں جو لوگ معمولی کھدّر کے بنے ہوئے دیسی وضع کے کپڑے پہنے نظر آتے ہیں ان کا مذاق اڑاتا ہے۔

اسلامی ادیب سے یہ ترقی پسندی بن نہیں آتی۔ وہ موجودہ دورِ تہذیب کو ایک کل سمجھتا ہے اور اس کے خیر کے حقیر سے اجزاء سے دھوکا نہیں کھاتا بلکہ اس کے ہمہ گیر شر کو اس کے گوناگوں نظاموں کی تاریخ میں بغیر کسی خود فریبی کے دیکھتا ہے۔ چنانچہ اس کے سامنے اس کے مفسدہ انگیز نظاموں میں سے کسی کے انتخاب کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اس پورے دورِ تہذیب کے خلاف لڑائی لڑنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

وہ دیکھتا ہے کہ اس دورِ تہذیب کے مختلف نظاموں کے مظاہر میں چاہے کتنا ہی فرق ہو، لیکن ان کی فکری بنیاد ایک ہے اور وہ اسی فکری بنیاد کو فتنہ کی اصل جڑ سمجھتا ہے، اور اسی پر کلہاڑا چلانا چاہتا ہے!

کسی نظامِ زندگی اور کسی دورِ تہذیب کی صحت کا دار و مدار اس پر ہے کہ زندگی کی ماہیت کو اس نے کہاں تک صحت کے ساتھ سمجھا ہے۔ اور زندگی کی ماہیت کو سمجھنے کے لئے اوّل قدم یہ ہے کہ مجموعی طور پر پورے ہنگامۂ وجود کی حقیقت تک رسائی حاصل ہو۔ آج جس دورِ تہذیب سے ہمیں سابقہ درپیش ہے وہ اس ہنگامۂ وجود کے بارے میں اپنے مطالعہ کا آغاز اس فکری موقف سے کرتا ہے کہ اس میں کوئی ارادہ کارفرما نہیں ہے، اس کے پس منظر میں کوئی شعور ہنگامہ آرا نہیں ہے، اس کی رگوں میں کسی حکمت کا خون دوڑ رہا نہیں ہے، یہ مادے کا ایک بے معنی کھیل ہے، یہ ایک بے منصوبہ ہنگامہ ہے، یہ ایک غیر ارادی حرکت ہے، یہ ایک لاوارث سلطنت ہے، یہ ایک اندھی نگری ہے۔ اس بستی کا کوئی والی نہیں، اس خاندان کا کوئی سر دھرا نہیں، اس راج کا کوئی راجہ نہیں، اور اس چمن کا کوئی مالی نہیں۔۔ اس فکری موقف پر کھڑے ہو کر جب اس دورِ تہذیب کا فلسفہ زندگی کا جائزہ لیتا ہے تو وہ اسے مادے کا محض ایک تقاضائے ارتقاء اور بالکل آٹومیٹک تقاضائے ارتقاء معلوم ہوتی ہے، وہ جب انسان پر نظر ڈالتا ہے تو اسے حیوان قرار دیتا ہے، وہ جب اخلاق کا تجزیہ کرتا ہے تو اس کا معیار سے "افادیت" کے سوا کوئی نہیں ملتا ـــــ یہاں تک کہ اس موقف پر کھڑا ہونے کی وجہ سے یہ فلسفہ سائنس کی ساری

شہادتوں کو بھی رد کرتا ہوا حقایق کو اپنے تاویل کے ٹیڑھے ترچھے سانچوں میں ڈھالتا چلا جاتا ہے۔

ہمیں اس تہذیب کے فلسفے کے اسی بنیادی موقف سے اختلاف ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ ہنگامۂ وجود بے معنی نہیں، یہ ایک لاوارث جائداد نہیں، یہ اندھی نگری نہیں۔ اس میں نظم، قانون، توازن، توافق، تناسب، آرٹ، ربط، منصوبہ، حکمت اور ارتقاء کار فرما ہے۔ اس کے مظاہر صفات گواہی دے رہے ہیں کہ اس کے پیچھے ارادہ وشعور کار فرما ہے۔ اس کے نظم کا کوئی ناظم ہے، اس کے قانون کا کوئی قانون ساز ہے، اس کے آرٹ کا کوئی آرٹسٹ ہے اور اس کی حکمتوں کا سرچشمہ کوئی حکیم ہے۔ اب ہمارا فکری موقف "ایمان باللہ" قرار پاتا ہے۔ ہم زندگی کو، ڈے کا آٹومیٹک ظہور نہیں مانتے، ہم اس کو ارادۂ الٰہی کا ظہور مانتے ہیں۔ ہم انسان کو حیوان نہیں قرار دیتے، بلکہ اس کے سینے کو تمام حیوانات کے مقابلے میں ایک شرارۂ آسمانی سے آراستہ پاتے ہیں جو اس کے اندر خیر وشر کے اخلاقی حاسّہ کو بر سر عمل لانے والا ہے۔ اسی وجہ سے ہم اسے اپنے خالق کے سامنے جواب دہ مانتے ہیں اور اس کے لئے خالق کے مقابلے میں عبدیت ہی کے مقام کو صحیح مقام محسوس کرتے ہیں۔

ہم پوچھتے ہیں کہ اگر اس دورِ تہذیب کے فلسفوں کے مسحور ادیبوں کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے زاویۂ نگاہ سے زندگی کا مطالعہ کریں اور اپنے حاصل مطالعہ کو ادب کے سانچے میں ڈھالیں تو آخر اس دورِ تہذیب کے فلسفوں کے باغیوں کو کیوں حق نہیں پہنچتا کہ وہ بھی اپنے جداگانہ زاویۂ نگاہ سے زندگی کا مطالعہ کریں اور اپنے نتائجِ مطالعہ کو ادب میں سموئیں؟ آخر ادب صرف ملحدانہ فکر پر ایمان لانے والوں کا اجارہ کس بنا پر تسلیم کر لیا جائے اور خدا پرستانہ فکر کے علمبرداروں کے لئے اس میدان میں قدغن کیوں ہو؟

ہماری خدا پرستانہ فکر کی رو سے ایک صحت مند سماج وہ ہے جس میں ایک اللہ کے سوا کسی اور کی غلامی، اطاعت اور عبدیت پر کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ انسان مجبور نہ ہو جس میں ایک اللہ کے قانون کے سوا کسی فرد یا خاندان یا طبقے یا گروہ کی خواہشات قانون بن کر نافذ نہ ہو سکیں جس میں "خیر" کی ساری کی ساری قدریں اپنی اس تعبیر کے ساتھ اور اس حکمتِ انطباق کے ساتھ عملاً نفاذ پذیر ہوں جن کو خدا نے اپنے انبیاء کے ذریعے متعین کر دیا ہے جس میں شر کے ان سیلے اسباب مظاہر کو کچل ڈالا گیا ہو جن کو اللہ اور رسول نے پوری وضاحت سے ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ جس میں ہر فرد انسانی کو تمام بنیادی انسانی حقوق یکساں حاصل ہوں جس میں ترقی کے دروازے ہر شخص کے لئے یکساں کھلے ہوں اور نہ کسی کے لئے مستقل فوقیت حاصل کئے رہنے کے لئے وجوہ موجود ہوں، نہ کسی کے لئے مستقل رکاوٹیں ڈال کے رکھی جائیں جس میں زندگی کے ہر میدان میں مسابقت آزاد ہو لیکن وہ ہو اخلاقی حدود کے اندر! جس میں زندگی کی مسابقت میں گر پڑنے والے افراد کو سہارا دینے کی ذمہ داری پورے سماج پر عاید ہوتی ہو جس میں ایک دوسرے کو حق بات کہنے اور غلطی پر ٹوکنے کی آزادی ہر فرد معاشرہ کو پوری طرح حاصل رہے۔ جس میں آدمی اور آدمی کے درمیان سوائے اخلاقی فضیلت کے اور کوئی شے تقسیم مراتب کرنے والی نہ ہو جس میں اصول ومقصد کی وحدت کو توڑنے والی جاہلی عصبیتیں کار فرما نہ ہوں۔ جس میں مفاد پرستی کے بجائے حق پرستی اور نفع اندوزی کے بجائے خدمت وایثار کی اسپرٹ موجود ہو جس میں عورت کو مجلسی کھلونا بنانے سے بچایا جائے اور اسے مساوات اور آزادی کے لفظوں سے فریب دے کر اس کے کاندھے پر اس کے حصے کے فطری فرائض سے زیادہ کا بار نہ ڈالا جائے۔ جس میں عیاشی کے دروازے بالکل بند رکھے جائیں جس میں فلاح وبہبود کا معیار اخلاقی مقاصد ہوں، نہ کہ مادی مفاد جس میں خیر وفلاح کا معیار اونچا کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ انحصار تعلیم وتربیت کے ذرائع پر کیا جائے اور قانونی جبریت سے کم سے کم کام لیا جائے۔ جس میں فرد اور سماج کے حقوق کو ٹھیک ٹھیک توازن پر قایم کیا جائے کہ کوئی ایک دوسرے کو دبانے پر قادر نہ ہو۔ جس میں دوسری قوموں پر اپنا امپریلزم مسلط کرنے کے جذبات کے بجائے ساری انسانیت کو اس نظامِ خیر کی طرف بلانے اور نظامِ باطل سے نجات دلانے کا اجتماعی جذبہ کار فرما ہو!

(نعیم صدیقی)

ہماری نظر میں

قادیانی مذہب
(حصہ اول)

"قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ" مؤلفہ:- پروفیسر محمد الیاس برنی، ضخامت ۹۵۸ صفحات، مجلد — قیمت، آٹھ روپے، ملنے کا پتہ:- شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار، لاہور

"قادیانی مذہب" پروفیسر محمد الیاس برنی کی مشہور و معروف تالیف ہے، اتنی مشہور کہ تعارف کی ضرورت ہی نہیں رکھتی، اب اس کا چھٹا ایڈیشن ضروری اصلاح اور اضافوں کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے، ہر نئے ایڈیشن پر فاضل مولف نے "تمہید" لکھی ہے، یہ "تمہیدیں" اٹھارہ صفحات پر مشتمل ہیں، زبان سادہ اور انداز بیان عام فہم ہے — رسالوں اور اخباروں کے تبصروں (Reviews) کے اقتباسات زائد از ضرورت معلوم ہوتے ہیں۔

لائق مؤلف نے اس کتاب کی تالیف میں بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے، دس بیس نہیں ایک سو اکتالیس کتابیں صرف اس ایک تالیف کے لئے پڑھی ہیں! صاحب تالیف نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا، بس کہیں کہیں ہلکے ہلکے اشارے ضرور کر دیئے ہیں، یا پھر "عنوانات" قایم فرمائے ہیں، ورنہ پوری کتاب میں خود مرزا غلام احمد کی کتابوں اور قادیانیوں کے لٹریچر کے اقتباسات سے لبریز ہے، اور پھر دیانت اور احتیاط کا یہ عالم ہے کہ اقتباسات کے ساتھ مکمل حوالے (REFERENCES) موجود ہیں، قادیانیوں کے خلاف یہ ایک ایسی فرد جرم ہے، جس کے خلاف وہ کوئی صفائی پیش نہیں کر سکتے، یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں قادیانیت کے خد و خال پوری تفصیل کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ مؤلف نے "قادیانی مذہب" میں قادیان کے جھوٹے نبی کی ایسی پول کھولی ہے کہ ایک ایک سطر پر "لاحول" پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

یہ قادیانی اپنے مکار اور کاذب "نبی" کی طرح بڑے جھوٹے اور دغاباز واقع ہوئے ہیں، ان کے خود ساختہ مذہب پر جب کبھی لے دے ہوتی ہے تو یہ جھٹ سے اپنے اخباروں میں اعلان کرتے اور بڑے بڑے پوسٹر چھاپتے ہیں کہ "احمدی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "خاتم النبیین" مانتے ہیں اور "ختم نبوت" کے قایل ہیں، اور اُس کے ثبوت میں مرزا غلام احمد کے اقوال پیش کر دیتے ہیں — یہ اُن کی مکاری اور دجل و تلبیس ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مرزا غلام احمد پہلا مسلمان ہی تھا اور عام مسلمانوں کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "خاتم النبیین" ہی سمجھتا تھا اور حضور کے بعد کسی دوسرے مدعی نبوت و رسالت کو کاذب بلکہ کافر جانتا تھا اور اُس کا یہ اعتقاد و یقین تھا کہ حضور پر وحی رسالت ختم ہوگئی۔

۱؎ نواب میر عثمان علی خاں نظام دکن کو مولف نے جا بجا تعظیم آمیز انداز میں "امیر المؤمنین" لکھا ہے، مگر اب تو وہ "مزاج پرسی" ہیں، چرخ نادرہ کار کی ایک ہی گردش میں کیا سے کیا ہوگیا؟ وہ جی جمائی بساط ہی اُلٹ گئی، غالباً فردوسی کا شعر ہے اور حقیقت کا ترجمان ہے:-

همین است رسمِ سرائے فریب
گہے بر فراز و گہے بر نشیب

(صفحہ ۴) "صرف ایک روز قبل اپنے کو پتہ چلا" — "اپنے کو پتہ چلا" زبان کے اعتبار سے محلِ غور ہے۔ (صفحہ ۹۳۳) "قادیانی نمایشات کی خوب داد دی" — "نمایش فارسی ہے اس کی جمع عربی انداز پر بنانا درست نہیں، پھر "خواہشات" کی طرح یہ جمع "نمرت" یہ کہ رائج نہیں ہوئی بلکہ نامانوس بھی ہے! معنوی اعتبار سے بھی "نمایشات" کا استعمال ٹھیک نہیں ہے۔

۱۸۹۹ء تک تو وہ یہاں تک کہتا رہا کہ :-

"میرے لئے کافی فخر ہے کہ میں ان لوگوں (صحابہؓ) کا مداح اور خاکِ پا ہوں، جو جزئی فضیلت خدائے تعالےٰ نے انہیں بخشی ہے، وہ قیامت تک کوئی اور شخص نہیں پا سکتا۔ ۔ ۔"

۱۸۸۰ء میں مرزا غلام احمد، اُمت محمدی کے ایک مبلغ کی حیثیت سے منظرِ عام پر آتا ہے۔ "براہین احمدیہ" اسی دور کی یادگار ہے گیارہ سال بعد یعنی ۱۸۹۱ء میں وہ مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، اور یہ جنون ترقی کرتے کرتے، دعویٰ نبوت تک پہونچ جاتا ہے ـــــ چنانچہ میاں محمود خلیفہ قادیان نے کھلم کھلا اعلان کیا ہے :-

"۱۹۰۱ء کے پہلے کے وہ حوالے جن میں آپ نے نبی ہونے سے انکار کیا اب منسوخ ہیں، اور اُن سے حجت پکڑنی غلط ہے" (حقیقۃ النبوۃ صفحہ ۱۲۱)

تو یہ چالاک قادیانی مرزا غلام احمد کے اُس دور کے اقوال مسلمانوں کو فریب دینے کے لئے پیش کر دیتے ہیں جب وہ مسلمان تھا، مگر اُس کے دورِ ابتدا یعنی دعوئ نبوت کے زمانے کے اقوال چھپا دیتے ہیں۔ حالانکہ یہی اقوال اُن کے ایمان کی بنیاد ہیں۔

"خاتم النبیین" بول کر یہ قادیانی کیا مراد لیتے ہیں، اس راز کو قادیانی جماعت لاہور کے اخبار پیغام صلح (جلد ۲۳ مورخہ ۲۵ جنوری ۱۹۳۵ء) نے افشا کیا ہے، کیونکہ "صاحب البیت ادری بما فیہ"

"قادیانی (جماعت قادیان) خاتم النبیین کے معنی نبیوں کے ختم کرنے والے نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کرتے بلکہ اس سے اجرائے نبوت نکال کر حضرت مسیح موعود کو زمانہ کا نبی قرار دیتے ہیں اور خاتم النبیین اور ظلی نبوت کے الفاظ استعمال کر کے اسلامی دُنیا کو مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، کیونکہ خاتم النبیین کا مفہوم برخلاف اُمت کے ان کے یہاں اپنی مُہر سے نبوت جاری کرنے والے کے ہیں اور ظلی نبوت سے مراد اصلی نبی ہے، ظلی کا لفظ فقط طریقِ حصول نبوت کے فرق کو ظاہر کرنے کے لئے یا لوگوں کو مغالطہ میں ڈالنے کے لئے وہ استعمال کرتے ہیں ورنہ ان کا ظلی نبی، نبی ہوتا ہے، غرض کہ مسئلہ نبوت میں نبوت کا دروازہ چوپٹ کھول کر وہ آنحضرت صلعم کی ختم نبوت کا بیڑا غرق کر کے دم لیتے ہیں۔ ۔ ۔"

مرزا غلام احمد کی اسی تعلیم اور عقیدے کا اثر تھا کہ یار محمد قادیانی، احمد نور کابلی قادیانی، عبداللطیف قادیانی، چراغ دین جموی قادیانی، غلام محمد قادیانی اور عبداللہ قادیانی تماپوری نبوت کا دعویٰ کر چکے ہیں اور ساتواں قادیانی "چن بسویشور صدیق دیندار" ہے جو یوسفِ موعود" ہونے کا مدعی ہے، یہ شخص کہتا ہے :-

"حضرت مرزا (غلام احمد) صاحب کی بشارت میں جتنی صفتیں یوسفِ موعود کی آئی ہیں وہ کل کمال ذرجہ پر مجھ پر صادق آتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

نبی کاذب کی بشارتوں کا یہ مصداق (صدیق دیندار چن بسویشور) حیدرآباد دکن میں رہتا ہے اور اس کے کچھ چیلے چانٹے پاکستان میں بھی آگئے ہیں، ان کے سروں پر پٹے اور چہروں پر ڈاڑھیاں ہیں کلنگے ہوئے کپڑے پہنتے اور سبز عمامے باندھتے ہیں، مسلمانوں کو ان کے بہروپ سے ہشیار رہنا چاہئے کہ یہ بھی فتنۂ قادیانیت کی ایک شاخ ہے۔

ایک ہندو مفکر نے قادیانی تحریک سے کیا اثر قبول کیا، وہ پڑھنے کے قابل ہے :-

"اس تاریکی میں، اس مایوسی کے عالم میں ہندستانی قوم پرستوں اور محبان وطن کو ایک ہی اُمید کی شعاع دکھائی دیتی ہے، اور وہ آشا کی جھلک احمدیوں کی تحریک ہے، جس قدر مسلمان احمدیت کی طرف راغب ہوں گے وہ قادیان کو اپنا مکہ تصور کرنے لگیں گے اور

آخر میں محب ہند اور قوم پرست بن جائیں گے مسلمانوں میں احمدیہ تحریک کی ترقی ہی عربی تہذیب اور پان اسلام ازم کا خاتمہ کر سکتی ہے ——— کوئی بھی احمدی چاہے عرب، ترکستان، ایران یا دنیا کے کسی گوشہ میں بیٹھا ہو وہ روحانی تشنگی کے لئے قادیان کی طرف منہ کرتا ہے، قادیان کی سرزمین اس کے لئے جنبہ بومی (سرزمین نجات) ہو اور اسی میں ہندوستان کی فضیلت کا راز پنہاں ہے - - - - (ڈاکٹر شنکر داس مہرہ بی، ایس، سی، ایم، بی، بی، ایس، لاہور (مندرجہ اخبار بندے ماترم مورخہ ۲۲ر اپریل ۱۹۳۲ء)

غلام احمد کے کفر و ارتداد میں اللہ کے فضل سے پہلے بھی شک نہ تھا، اس کتاب کو پڑھ کر اس بات کا احساس ہوا کہ انبیاء کرام کی توہین کرنے والے اس دریدہ دہن کو مسلمانوں نے زندہ کیسے رہنے دیا، عجب نہیں کہ اُس زمانہ کے مسلمانوں سے اُن کی اس بھول چوک پر قیامت کے دن بازپرس ہو۔

پروفیسر محمد الیاس برنی اس تحقیق، جانفشانی اور خدمتِ دین کے لئے تمام مسلمانوں کی طرف سے تبریک و تحسین کے مستحق ہیں، اللہ تعالیٰ اس نیکی کا ان کو اجرِ جزیل عطا فرمائے گا، کتاب کیا ہے؟ قادیانیت کا کچا چٹھا ہے، جو کوئی اسے ایکبار پڑھ لے گا مرزا غلام احمد اور اُس کی اُمت پر لعنت بھیجے بغیر رہ ہی نہیں سکتا ——— اس کتاب کے بعض حصوں کا ترجمہ انگریزی میں ضرور ہونا چاہیئے کیونکہ یورپ میں ان لوگوں نے اسلام، قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر مکر کا جال پھیلا رکھا ہے ——— سندھی زبان میں بھی ترجمہ کی ضرورت ہو کیونکہ میرپور خاص کے نواح میں قادیانیوں نے اپنا گڑھ بنا رکھا ہو اور گاؤں کے سیدھے سادے مسلمانوں کو یہ اپنے دام میں پھانستے رہتے ہیں۔

کاش! حکومت پاکستان کے ارباب اقتدار کی نگاہ سے بھی یہ کتاب گزر جائے تاکہ اُن کو معلوم ہو جائے کہ پاکستانی مسلمانوں نے قادیانیوں کو اقلیتی فرقہ قرار دیئے جانے کا جو مطالبہ کیا ہے وہ کس قدر نرم اور جائز مطالبہ ہو ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس گروہ کے عقائد اور اس کی تنظیم پاکستان، اسلام اور اُمتِ مسلمہ کے لئے بڑے خطرے اور تشویش کا سبب ہے۔

رموز الغیب

"رموز الغیب ترجمہ اُردو فتوح الغیب" مترجم: - مولانا محمد صادق، شائع کردہ: - صاحبزادہ محمد فیض علی نقشبندی مجددی، ضخامت ۲۷۰ صفحات، خوبصورت جلد کے ساتھ، قیمت دو روپے بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ: ——— مکتبہ عرفان (۱۰) والی شریف، براستہ وزیر آباد، ضلع گوجرانوالہ (پاکستان)

حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ولایت، عظمت اور بزرگی پر کسی دلیل لانے کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ کی ذات۔

؎ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

کی مصداق ہے، حضرت شیخ اس زمانہ میں پیدا ہوئے تھے جب کہ زنادقہ اور بدعتیوں نے دین کو کھیل بنا رکھا تھا، آپ نے بڑی جرأت اور کامل عزیمت کے ساتھ ان کے خلاف جہاد کیا، اللہ تعالیٰ نے آپ کی زبان میں تاثیر رکھی تھی اور ساتھ ہی علم و حکمت کی دولت عطا فرمائی تھی، چنانچہ بیشمار بدعقیدہ لوگوں نے آپ کے دستِ حق پرست پر توبہ کی، بغداد میں آپ کے وعظ کی محفلوں میں ایک ایک لاکھ سے بھی زائد حاضرین کا مجمع ہوتا تھا اور اللہ کے فضل سے آپ کا یہ فیض کرامت تھا کہ دور کے بیٹھنے والوں کو بھی آپ کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔

اُس وقت جبکہ اسلامی ممالک میں عجمی فلسفہ کا غلبہ تھا اور قیاس درائے کی گرم بازاری تھی، حضرت شیخ قدس سرہٗ نے بغداد میں اس مدرسہ کی بنیاد ڈالی تھی جہاں خاص طور سے قرآن کریم کا درس دیا جاتا تھا کہ یہی دین کی اولین اساس ہے! حضرت شیخ کی تعلیمات کی بنیاد "توحید خالص"

؎ ڈاکٹر شنکر داس کی اس تحریر کو پڑھتے ہوئے یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ "قادیان" کو پاکستان میں نہیں رہنے دیا گیا وہ ہندستان میں شامل ہوگیا، اور ریڈکلف کمیشن میں سر ظفراللہ قادیانی پاکستان کی نمائندگی کر رہے تھے۔

ہے۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ آپ کے عقیدت مندوں نے آپ سے وہ تمام باتیں منسوب کر دیں، جن کے مٹانے کی آپ نے ساری عمر جدوجہد کی تھی۔

اگر "قادریت" کوئی نسبت ہو سکتی ہے تو وہ حقیقت میں عقیدۂ توحید، اتباعِ سنت اور سلفِ صالحین کی اسلامی روش کی پیروی کا نام ہے، مگر افسوس ہے کہ آج قادریت اور بدعت "ہم معنی" بن کر رہ گئی ہیں! حضرت شیخؒ جو توحید کے بہت بڑے مبلغ تھے، اُن کی روح ان باتوں سے کتنی اذیت محسوس کرتی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے تو ہر مصیبت کے وقت اپنے پکارنے کا حکم دیا ہے مگر آپ کے عقیدت مند "یا غوث" اور "یا عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ" کے نعرے لگاتے ہیں،

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کی مشہور کتاب "رموز الغیب" کا اُردو ترجمہ (فتوح الغیب) ہمارے سامنے ہے! مولانا محمد صادق صاحب صدیقی نے بڑی محنت اور عقیدت کے ساتھ شیخؒ کی اس بیش بہا تصنیف کو اُردو میں منتقل فرمایا ہے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس پر "تعارف" لکھا ہے، جس میں حضرت شیخ کی زندگی کے مختصر حالات بھی آگئے ہیں ——— آپ کے حالات میں یہ بھی مطلب ہے:-

"بادشاہوں سے ہدیہ قبول نہیں فرماتے تھے، ان کے علاوہ کوئی شخص تحفے لاتا تو قبول فرما لیتے اور اسی وقت حاضرین میں تقسیم فرما دیتے ——— خلیفۂ وقت یا کسی صاحبِ ثروت کے ہاں جانے کی عادت نہ تھی، اگر خلیفہ کی آمد کی خبر سنتے تو اُٹھ کر مکان کے اندر تشریف لے جاتے اور پھر باہر نکل آتے تاکہ خلیفہ کی تعظیم کے لئے اُٹھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہو ... ... "

یہ کتاب حضرت شیخ علیہ الرحمۃ نے عربی میں تصنیف فرمائی تھی، اس کا فارسی ترجمہ سب سے پہلے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا اور "مفتاح الفتوح" کے نام سے "فتوح الغیب" کی شرح بھی لکھی!

حضرت شیخ کی دینی تعلیمات کا یہ رنگ ہے:-

——— اگر خداوند تعالیٰ تجھے تکلیف میں پھنسا دے تو اُس کے بغیر اُس تکلیف کو دور کرنے والا کوئی نہیں اور اگر وہ تجھے نیکی اور آرام دینا چاہے تو کوئی اُس کے فضل کو روکنے والا نہیں۔"

——— پس جب تو کچھ مانگے تو اللہ تعالیٰ سے مانگ، اور جب مدد طلب کرے تو اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر!

——— خداوند تعالیٰ کے سوا کسی سے خوف نہ کر، اور اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی سے اُمید بھی نہ رکھ اور اپنے سارے کام خداوند تعالیٰ کے سپرد کر دے اور صرف اُسی پر بھروسا رکھ اور اپنی تمام حاجات اُسی سے طلب کر ... ... اور توحید کو لازم پکڑ ... ... !

(صفحہ ۱۱) "اور تو ایسا علم دیا جائے گا ... ... اور تو ایسا امن دیا جائے گا" "تو" کی جگہ "تجھے" ہونا چاہیے ———

——— (صفحہ ۱۴) "دھوکہ و فریب میں آگیا" ——— "دھوکہ" ٹھیٹھ اُردو کا لفظ ہے اس لئے "واوٗ" عطف درست نہیں، اسی طرح صفحہ (۵۹) پر "کمائی و کسب" میں واوٗ عطف غلط استعمال ہوا ہے ———

کتاب میں "ترکِ دُنیا" کا جو ذکر کئی جگہ آیا ہے وہ ردِ عمل ہے اُس زمانہ کے معاشرہ کا کہ نیچے سے لیکر اوپر تک کے لوگوں پر دُنیا چھائی ہوئی تھی، موت کا ڈر اور آخرت کے محاسبہ کا خیال دلوں سے نکل گیا تھا اور ہر کوئی گلچھرے اُڑانے، عیش کرنے اور دولت سمیٹنے کی دُھن میں غرق تھا، ورنہ حقیقت میں "زہد" اور "ترکِ دُنیا" ہم معنی نہیں ہیں۔

یہ کتاب بہرحال یقین آفریں ہے، اور اس کے پڑھنے سے تعلق باللہ مضبوط تر ہوتا ہے۔

مقامِ خیام

"مقامِ خیام":- از عبدالرحمٰن طارق، حجم ۳۰۸ صفحات، کتابت، طباعت کاغذ جلد اور رنگین دمصور سرورق، ہر چیز خوب سے خوب تر، ملنے کا پتہ:- مکتبہ ادب نواز، کشمیری بازار لاہور-!

مکتبہ ادب نواز اپنی عمر کے اعتبار سے بہت کمسن مکتبہ ہے، مگر اُس نے اس قلیل مدت میں بہت سی کتابیں بڑے سلیقہ اور اہتمام کے ساتھ شائع کی ہیں ———— جن میں سے ایک یہ "مقامِ خیام" ہے جو ہمارے پیشِ نظر ہے۔

کسی غیر زبان کی شاعری کا دوسری زبان میں منظوم ترجمہ بہت دشوار ہے، اب سے پہلے مثنوی مولانا رومؔ اور دیوانِ حافظؔ کے سلسلہ میں یہ کوششیں کی جا چکی ہیں اور ناکام ہی رہیں، علامہ شبلیؔ نعمانی اس راز کو پا گئے تھے، چنانچہ انھوں نے شعر العجم میں فارسی کلام کا ترجمہ نظم کے بجائے نثر میں کیا اور اس قدر خوب کیا کہ اُردو ادب میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے، حالانکہ شبلیؔ نازک خیال شاعر بھی تھے مگر انھوں نے اس وادیٔ سنگلاخ میں دانستہ قدم نہیں رکھا۔

جناب عبدالرحمٰن طارقؔ نے عمر خیامؔ کی منتخب رباعیوں کو اُردو نظم میں منتقل کیا ہے اور کوئی شک نہیں کہ بڑی جانفشانی اور دردسری سے کام لیا ہے، خیامؔ کی رباعیاں لائق مترجم نے آٹھ ابواب پر تقسیم کی ہیں:۔

حضورِ حق ———— تصوف و معرفت ———— اخلاقیات ———— پند و موعظت ———— بے ثباتیٔ عالم ———— حسن و عشق۔
شوخی و ظرافت ———— اور متفرقات!

پوشیدن بیدلاں چہ اطلس چہ پلاس زیرِ سرِ عاشقاں چہ بالین و چہ خشت (صفحہ ۵۴)

ترجمہ

بیدلوں کے جامہ کو یکساں ہیں اطلس اور پلاس زیرِ سرِ عاشق کے تکیہ ہو کہ ہو اک سنگ خشت

یہ شعر یوں ہوتا، تو ترجمہ میں روانی آجاتی:۔

بیدلوں کے واسطے یکساں ہیں اطلس اور پلاس عاشقوں کے سر کے نیچے چاہے[1] تکیہ ہو کہ خشت

من از دمِ عیسوی شدم زندہ بجاں مرگ آمد و جودِ من دست بشست (صفحہ ۶۸)

ترجمہ

میں دمِ عیسیٰ سے زندہ ہو کے جب چلنے لگا موت نے بہلا دیا یہ ہے مرا فخرِ وجود

"موت نے بہلا دیا" اور "یہ ہے مرا فخرِ وجود" ان دونوں ٹکڑوں سے ایک تو شعریت خاک میں مل گئی دوسرے ترجمہ بھی عجیب تر ہوگیا۔

خورشید چراغدان و عالم فانوس ما چوں صوریم کاندرو حیرانیم (صفحہ ۸۹)

ترجمہ

دہر اک فانوس ہے، خورشید ہے اُس کا چراغ ہم ہیں تصویریں جو حیرت سے چلے جاتی ہیں چال

"چلے جاتی ہیں چال" یہ آخر کس مفہوم کا ترجمہ یا کس "شاعریت" کی ترجمان ہے!

صفحہ ۱۴۳ پر "تزویر" کو (ذال کے ساتھ) "تذویر" لکھا ہے!

اے دل اگر از غبارِ تن پاک شوی تو روحِ مجردی برافلاک شوی
عرش است نشیمنِ تو، شرمت بادا کائی و مقیمِ خطۂ خاک شوی (صفحہ ۱۰۱)

ترجمہ

اے دلِ غافل! اگر تو گردِ تن سے پاک ہو بن کے اک روحِ مجسم بر سرِ افلاک ہو

[1] خواہ —— بھی پڑھ سکتے ہیں

عرش ہے تیرا نشیمن شرم اس پستی پہ کر　　طائر سدرہ مقیم کارگاہ خاک ہو!

اگر ترجمہ میں یہی رنگ رہتا تو غنیمت تھا! ـــــ بہرحال جناب طارق کی کوشش، محنت اور حوصلہ قابل داد ہے

بیعت کی ضرورت

"بیعت کی ضرورت اور اس کا مفہوم" از:۔ صاحبزادہ محمد فیض علی مجددی، ضخامت ۲۸ صفحات قیمت چھ آنہ، ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ عرفان، وادوالی شریف، تحصیل وزیرآباد ضلع گوجرانوالہ!

اس کتابچے کے نام ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس میں کیا ہوگا؟ صاحبزادہ محمد فیض علی نقشبندی مجددی نے اس رسالہ میں "بیعت کی ضرورت" دکھائی ہے اور اس کے مفہوم سے بحث کی ہے، اور اس کی تائید میں قرآن کی آیتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور بزرگانِ دین کے اقوال پیش کئے ہیں! کوئی شک نہیں کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے جہاد کے علاوہ نیک کاموں کے کرنے اور برے کاموں کے چھوڑنے کے لئے بھی بیعت لی ہے، اور وہ آج بھی لی جا سکتی ہے لیکن پیری مریدی کا جو طریقہ آجکل رائج ہے اس میں صرف اتنا ہی نہیں ہے، وہاں سلسلے اور خانوادے ہیں، شجرے ہیں، گدیاں اور سجادے ہیں کہ باپ مرتا ہے اور بیٹا اس پر بیٹھتا ہے اور اس طرح بیٹھتا ہے کہ باپ کے خلفاء اور مریدین کے ہاتھوں دستار بندی ہوتی ہے، نذریں پیش کی جاتی ہیں اور اس خصوص میں ایسی ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کا احادیث و آثار میں ثبوت نہیں ملتا!

کیا پیری اور مریدی کے اس سلسلہ اور اس کے لوازم کے لئے صاحبزادہ صاحب دلائل لا سکتے ہیں؟ معاملہ صرف "بیعت کی ضرورت" پر جا کر ختم نہیں ہو جاتا یہ سلسلہ تو رشتۂ بجاک کی طرح دراز ہے! اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی راہ اعتدال اور جادۂ اقتصاد پر قائم رکھے (آمین)

ریاض الاخلاق

"ریاض الاخلاق" از:۔ محمد صادق سیالکوٹی، حجم ۳۸۴ صفحات (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ:۔ دائرۃ التبلیغ پورہ ہیراں، سیالکوٹ شہر۔

جناب مولانا محمد صادق سیالکوٹی نے احادیثِ نبوی کی روشنی میں اسلامی زندگی کے اخلاق و اطوار اور معاشرت کے آداب مرتب اور مدون کئے ہیں، یہ کتاب بڑے اخلاص اور دردمندی کے ساتھ ترتیب دی گئی ہے اور کوئی شک نہیں کہ اس موضوع پر بڑے کام کی کتاب ہے۔ اسلامی معاشرت اور دینی زندگی کی تعلیم کے ساتھ فاضل مولف نے شرک و بدعت کا بھی جگہ جگہ رد کر کے خالص توحید کو اجاگر کر دیا ہے۔

مولانا محمد صادق صاحب کا اندازِ بیان صاف اور سادہ ہے مگر جہاں "ادبیت" پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہاں تکلف پیدا ہو گیا ہے ـــــ مثلاً "خواتین کے درمیان جب محبت کا ساغر گردش کرنے لگتا ہے ـــــ" (صفحہ ۱۴) "خدائے قدوس کی بارگاہِ منزل سے گیسوئے اخلاق کی عنبر فشانیوں کی فضا میں شانہ کشی کی توفیق مانگتے ہیں (صفحہ ۱۸) "اس کے رخشِ عمر کو اپنی زیست میں دوچار بار صدہا لعنت سے دوچار ہونا پڑے" (صفحہ ۱۱۴) جیسے جملے وجدان کو کھٹکتے ہیں۔

(صفحہ ۳۲) روح کش گناؤنے لفظ ہے ـــــ "روح فرسا" لکھنا چاہئے تھا ـــــ (صفحہ ۳۹) "اور حسد و بغض کی آلودگیوں میں لتھڑے ہوئے" ۔ ۔ "ـــــ" آلودگی میں لتھڑنا" پہلی بار سنا اور وجدان تلملا کر رہ گیا ـــــ (صفحہ ۱۳۸) "نقل اتارنے" کو "نقل نکالنا" لکھا ہے جو زبان و محاورہ کے اعتبار سے نادرست ہے ـــــ (صفحہ ۳۴۲) حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ سے جو حدیث مروی ہے اس میں "لم یو قر کبیرنا" کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے ـــــ "بہن (خواہر) کا ہر جگہ املا "بھین" ملتا ہے جو صحیح نہیں ہے!

"ریاض الاخلاق" کو پڑھ کر خوفِ خدا، خوفِ آخرت اور دین سے تعلق پیدا ہوتا ہے اور جتنی دیر تک یہ کتاب مطالعہ میں رہتی ہے ذہن و فکر اور دل و دماغ پر پاکیزہ تاثرات قایم رہتے ہیں، دو چار حدیثوں کے علاوہ تمام احادیث صحاح ستہ سے لی گئی ہیں، فاضل مؤلف کو اللہ تعالیٰ اس محنت کا اجر عطا فرمائے کہ اس زمانہ میں جب کہ بد اخلاقی اور بدکاری کی نجاستیں قدم قدم پر بکھری ہوئی ہیں، موصوف نے اخلاق کے پھولوں سے مشامِ جاں کو معطر کر دیا ہے۔

تذکرہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی

"تذکرہ مولوی ذکاء اللہ" از:- سی، ایف، اینڈریوز، مترجمہ:- ضیاء الدین احمد برنی ضخامت ۲۰۰ صفحات، مجلد گردپوش اور کئی تصویروں کے ساتھ، قیمت تین روپے بارہ آنے، ملنے کا پتہ:- "تعلیمی مرکز" ۱۰۵ گیدومل لیکمراج روڈ، کراچی ۱!

مولوی ذکاء اللہ دہلوی (ہندستان میں) انیسویں صدی عیسوی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کی معروف شخصیتوں میں شمار کئے جاتے ہیں، انھوں نے تعلیمی مسائل اور سائنس اور ریاضی پر اُس وقت مضامین لکھے تھے جب کہ بہت سوں کو قلم پکڑنا بھی نہ آتا تھا، مولوی عنایت اللہ دہلوی مرحوم جو برسوں حیدرآباد دکن کے دار الترجمہ کے ناظم رہے ہیں اور ترجمے کے فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے، انھی منشی ذکاء اللہ کے لائق فرزند تھے۔

مسٹر سی، ایف اینڈریوز (آنجہانی) کے منشی ذکاء اللہ دہلوی مرحوم سے گہرے مراسم تھے اور وہ اُن کی خدمت میں بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ حاضر ہوا کرتے تھے، اینڈریوز نے اپنے تاثرات کو کتابی شکل میں پیش کیا، جس کو جناب ضیاء الدین احمد برنی (بی-اے) نے اُردو میں منتقل کر کے، ماضی کے تہذیب و تمدن، تعلیمی ترقی اور سیاسیات کی نہ جانے کتنی جھلکیاں ہمیں دکھا دیں۔

فاضل مترجم خود مصنف (سی، ایف، اینڈریوز) سے شاگردی کا تعلق رکھتے ہیں اور صاحبِ سیرت (منشی ذکاء اللہ دہلوی) کے یہاں بھی اُن کا آنا جانا رہتا تھا، اس لئے اس کتاب کے ترجمے میں دو دو نسبتیں شریک ہو گئی ہیں، جس کے سبب ترجمہ میں اور زیادہ روانی اور شستگی پیدا ہو گئی ہے، لائق مترجم نے بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ اس فرض کو انجام دیا ہے۔

جناب ضیاء الدین برنی اس کتاب کا ترجمہ ۱۹۳۲ء میں "کتابی دنیا" (دہلی) کو دے چکے تھے مگر ۱۹۴۷ء میں دلی کے مسلمانوں کو جس خونیں ہنگامہ اور عبرتناک غارت گری سے دوچار ہونا پڑا! اس کتاب کا مسودہ بھی اُس کی لپیٹ میں آکر آگ کے شعلوں کی نذر ہو گیا، برنی صاحب ہی کا یہ دل گردہ ہے کہ اُنھوں نے از سرِ نو ترجمہ کو مرتب کیا اور آج وہ ہمارے سامنے ہے!

مصنف کی زندگی ہی میں اس کتاب کا مقدمہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم نے لکھا تھا جو اس میں شامل ہے، پیش لفظ[1] ڈاکٹر سید سجاد صاحب دہلوی ایم-اے، پی، ایچ، ڈی (سابق صدر شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن) نے تحریر فرمایا ہے۔

مسٹر سی، ایف، اینڈریوز نے شروع کے اسّی صفحوں میں دہلی کے تمدن و تہذیب کی جھلک، انگریزی عملداری، غدر ۱۸۵۷ء کے واقعات اور قلعۂ معلیٰ کے حالات کو دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے اور اس کے بعد منشی ذکاء اللہ دہلوی مرحوم کے حالات پر جو کچھ لکھا ہے وہ "بیوگرافی" کا ایک اچھا نمونہ ہے، اُن کے قلم نے کہیں کہیں گل کاریاں بھی کی ہیں۔

---

[1] پیش لفظ میں "علمی کارناموں" کو "کارنامہ جات علمی" لکھا ہے جو دفتری زبان ہے ——— "زلہ خوار" کا املا "ذلہ خوار" نظر آیا، ممکن ہے یہ کاتب کی غلطی ہو ——— "انگریزی وضع کا مکان تھا مگر اُس میں انگریزی فرنیچر ندارد تھا" ——— "ندارد" یہاں اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے ——— "قحط الرجال" کے انداز پر "قحط الکتب" غلط نہیں ہے مگر نامانوس فقرہ ہے (م-ق)

مصنف نے لکھا ہے :- "دہلی کے قدیم باشندوں میں سے جو لوگ ہندو تھے جب میں اُن کے پاس اطلاعات حاصل کرنے کی غرض سے گیا انھوں نے خود بغیر کسی پس و پیش کے مجھ سے یہ بات بیان کی کہ آخری مغل بادشاہوں کا برتاؤ ان کے فرقے کے ساتھ بہت اچھا تھا اور اس سلسلہ میں انھیں کبھی شکایت نہیں ہوئی ———" کیا بھارت کے مہا بھائی اور جن سنگھی لیڈر سُن رہے ہیں؟ کیا ہندو مت احسان فراموشی سکھاتا ہے؟ حکومت کے نشہ میں مستی تو فروہ ہوتی ہے لیکن اتنی نہیں کہ شرافت اور انسانیت کا احساس ہی سرے سے باقی نہ رہے۔

اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی ذکاء اللہ دہلوی کو سرسید احمد خاں مرحوم سے بڑی عقیدت تھی ——— ایک بار علی گڑھ کالج میں انگریز پروفیسروں اور طالب علموں میں اختلاف ہو گیا جس نے نازک صورت اختیار کر لی منشی ذکاء اللہ دہلوی، ڈپٹی نذیر احمد کو لیکر سی مالیف اینڈ ریوز کے پاس گئے اور اُن سے علی گڑھ چلنے کے لئے کہا، چنانچہ ان بزرگوں نے علی گڑھ کا سفر کیا اور وہاں جاکر معاملات کو سلجھا دیا۔

منشی ذکاء اللہ دہلوی مرحوم اُردو زبان کے بڑے پُر جوش حامی تھے، وہ فطری طور پر مذہبی آدمی تھے، وضع کے پابند، مصائب کو ہنسی خوشی سے جھیلنے والے ارض ہند سے غیر معمولی محبت مگر ملکہ وکٹوریہ، گلیڈ اسٹون اور لارڈ رپن سے بھی بہت متاثر تھے، انگریزوں کے تسلط کو عارضی نہیں بلکہ ایک مستقل حقیقت سمجھتے تھے، ملکہ وکٹوریہ کے مدح خوانوں میں تھے اور انگریز کے دور کو ہندستان کے لئے رحمت جانتے تھے ——— اور یہ اُن کی سیرت کا بلاشبہ کمزور پہلو تھا!

مولوی ذکاء اللہ مورخ تھے، ریاضی داں تھے، کتابوں کے مصنف اور مترجم تھے اور ساتھ ہی بزم سخن بھی مگر تقریر کے مرد میدان نہ تھے، خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے ایک مرتبہ اُن کے بارے میں فرمایا :-

"ذکاء اللہ دوستوں کے سامنے تو بلبل ہزار داستان ہیں لیکن مجمع میں اُن کی زبان بند ہو جاتی ہے اور بہرے گونگے بن جاتے ہیں"

(صفحہ ۱۴۱) "وہ بہت پُر امن تھے اور جنگجوئی پن اُن میں نام کو نہ تھا ——— "جنگجوئی پن" وجدان کو کھٹکتا ہے ——— (صفحہ ۱۲۹) "ذکاء اللہ کے دل و دماغ میں نئے مفاد قائم ہوئے" یہ ترجمہ بامحاورہ نہیں ہے "نئے مفاد قائم ہوئے" نے جملہ کو مہمل ضرور بنا دیا ——— (صفحہ ۱۴۱) "اختلافات کو پُر درد سنجیدگی سے دور کرنے کی کوشش کی" ——— "دردمندانہ سنجیدگی" لکھنا چاہئے تھا ——— صفحہ ۱۰۳ پر "رعد اندازی" اور صفحہ ۲۰۷ پر "کیرکٹر کی صیانت" بھی وجدان کو تشویش میں ڈالتی ہے!

کتاب اپنے موضوع پر پڑھنے کے قابل ہے، اس میں بہت سی ایسی چیزیں آگئی ہیں جن کا جاننا لکھے پڑھے لوگوں کے لئے فائدے سے خالی نہیں ہے!

سفینے

"سفینے" از :- ابر احسنی گنوری، ضخامت ۱۰۰ صفحات، مجلد قیمت دو روپے آٹھ آنے، ملنے کا پتہ :-

دفتر ماہنامہ "احسن" رام پور (یو-پی- ہندستان)

جناب ابر گنوری کا شمار اُن اساتذہ میں ہوتا ہے جو شاعر ہی نہیں "شاعر گر" بھی ہیں، ابر صاحب شاگردوں کا اچھا خاصہ وسیع حلقہ رکھتے ہیں اور تلامذہ کی تربیت و اصلاح کا کام "مزد بے اجر" کے طور پر انجام دیتے ہیں، عروض اُن کا خاص فن ہے، زبان و ادب کی اس قدر خدمت کے باوجود افسوس ہے کہ آسودگی نصیب نہیں ہوئی مگر طبیعت میں قناعت اور مزاج میں خودداری ہے اور ہر عالم میں زندگی ہنس کر گزار دیتے ہیں ——— موصوف کی نظموں کا مجموعہ ہمارے سامنے ہے۔

کتاب کے آغاز میں "عرضِ مصنف" آٹھ صفحوں پر مشتمل ہے، جس میں مصنف نے غزل اور نظم کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ——— (صفحہ ۵) "کیونکہ اُس کے انداز بیان کی لطافت اور نزاکت کا بوجھ سنبھالنا ان کے بس کی بات نہیں۔۔۔" اس

خیال کو دوسرے لفظوں میں ظاہر کرنا چاہیئے تھا" انداز بیان کی لطافت اور نزاکت کا بوجھ۔۔ "اچھا نہیں لگتا ——— (صفحہ ۷) "اس مجموعے میں صرف دو ایک نظمیں ایسی بھی نظر آئیں گی جو اصلاحی مواد سے خالی ہیں۔۔" "اصلاحی مواد" نے جملہ کو بہت کمزور بنا دیا!

کتاب کے آخر میں حضرت آسی نے اپنے حالات لکھے ہیں۔۔۔ (صفحہ ۱۶۷) "کافی محنت کے بعد انھوں نے (والدین نے) یا دلِ ناخواستہ اسے منظور کیا" ——— یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے "محنت" نہیں "منت" ہوگا ———

مُرج بنی ہوئی تھی جب تیری چشمِ آدم   خفت خطا کی، اُس پہ حواکے ہجر کا غم   (صفحہ ۲۰)

"آنسو" نظم کا عنوان ہو اُس کا یہ شعر ہے ——— "مُرج" نے اس مصرعہ کی شعریت کو غارت کر دیا۔

ہم نے ستم کی تحلیل کر دی   ہر حکم رب کی تعمیل کر دی   (صفحہ ۲۵)

"ستم کی تحلیل" سے نہ جانے شاعر کا کیا مقصد ہے؟

کتنی مملو ذلتوں سے اس کی بود و ہست ہے   اس کا جو بھی قول ہے، جو فعل ہو وہ پست ہو   (صفحہ ۴۵)

اول تو "مملو" ہی کافی ثقیل ہو پھر "بود و ہست کا ذلتوں سے مملو ہونا" عجیب تر ہے!

کر دیا کے پتلے بیداد میں جواں تھے   انسانیت کے سر پر اک برقِ بے اماں تھے   (صفحہ ۵۰)

"بیداد میں جواں تھے" ——— یہ کیا محاورہ اور کونسی زبان ہو! شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ وہ بیداد کرنے میں بڑی جوانمردی دکھاتے تھے مگر "بیداد میں جواں تھے" سے اس مفہوم کی ترجمانی نہیں ہوتی!

؎ خدا کرتا ہے منکروں سے محبت   (صفحہ ۷۵)

"کرتا" میں الف بُری طرح دب رہا ہے، جو عروضی اعتبار سے ناجائز نہیں ہو مگر وجدان کو بھلا نہیں لگتا۔

تیرا اک جملہ جہاں میں صد قیامت خیز ہے   تیرا ہر ہر شعر گویا انقلاب انگیز ہے

؎ تیرا اک جملہ زمانہ میں قیامت خیز ہے" یا اسی طرح کا کوئی اور مصرعہ ہوتا تو "صد" لانے کی ضرورت نہ پڑتی، یہ لفظ کھٹکتا ہے ———

پستیٔ جذبات کی کہ فہم بیماری ہے کیوں   حُسن سے مفہوم تیرا حُسنِ بازاری ہے کیوں   (صفحہ ۸۴)

مصرعہ اولیٰ میں شعریت نام کو نہیں! "پستی جذبات" کو بیماری کہنا یہ بھی عجیب اندازِ بیان ہے ———

تجھے تلاش کروں گا میں کوہساروں میں   ہر ایک دشت میں ہر پھول کی بہاروں میں   (صفحہ ۱۲۳)

"پھول" کی جگہ "باغ" ہونا چاہیئے، "دشت" کے مقابلہ میں "پھول" نہیں "باغ" لانے کی ضرورت تھی!

دشمن ہیں حکومت کے تعصب کے ہیں بندے   ہیں ملک میں پھیلے ہوئے ہر سمت درندے   (صفحہ ۱۳۵)

"درندہ" کی "ر" پر زبر نہیں، زیر ہے ——— ضرورتِ شعری کے لئے "بندے" کے ساتھ "درندے" قافیہ کیا تھا تو حاشیہ پر اس کا اظہار کر دینا تھا۔

(صفحہ ۱۴۴) "رستے اور دھرم" جس نظم کا عنوان ہے اُس میں "خدا" کو "پِتا" کہا ہے اس طرح تو عیسائیوں اور ہندوؤں کے یہاں بولا جاتا ہے ایک مسلمان کو یہ اندازِ بیان زیب نہیں دیتا

جو چلے آتے تھے روٹی مانگنے پر   وہ ڈنڈے پا گئے اور اپنے ہی سر   (صفحہ ۱۵۰)

"شعریت" کا اس میں دور دور پتا نہیں، اور مصرعہ ثانی زبان اور بیان کے اعتبار سے محلِ غور ہے۔

فوج اُٹھی وہ حق کا پرچم لہلہانے کے لئے   زعمِ باطل، زورِ باطل اس کا ڈھانے کے لئے   (صفحہ ۱۵۹)

"لہلہانا" تو سبزے اور پھلواری کی صفت ہے، پرچم کے لئے تو "لہرانا" بولتے ہیں۔

یہ رباعی خوب ہے :۔

انگلش کا نہ فارسی کا غم کھائے گی ... یہ رعبِ حکومت سے نہ گھبرائے گی
بھاشائیں ہیں سب باج گزارِ اردو ... ہندی بھی اسے دے کے ہی کچھ پائے گی

یہ قطعہ بھی اچھا ہے :۔

انساں کو عمرِ فانی کیوں کر کفیل ہوگی ... یہ بے وفا ہے اس میں کیا قال و قیل ہوگی
اس کی درازیوں میں کوتاہیاں نہاں ہیں ... جتنی طویل ہوگی اتنی قلیل ہوگی

جناب ڈاکٹر شفا گوالیاری کے یہ تاریخی مصرعے :۔

"باغِ نعمت، بزمِ دیواں، یہ صحیفے" ——— "عطرِ جادو، جوششِ دریا، عیشِ قدسی" ——— "عہدگُلِ نسخۂ اصل شفائی" جن سے کتاب کا سنِ تصنیف نکلتا ہے، خاصے بہل ہیں! تاریخی مصرعوں میں مانا کہ عام شعروں کی طرح شگفتگی اور برجستگی نہیں ہوتی مگر یہ بھی نہیں ہو تا کہ مصرعے بالکل اٹل بے جوڑ ہوں!

جناب آبر احسنی انصاری گنوری کی بعض نظمیں جاندار ہیں مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ اُن کی غزلوں کے مقابلہ میں اُن کی نظمیں بہت پھیکی ہیں۔

شعرستان

"شعرستان" :۔ مرتبہ نعمان تاثیر ——— مظہر صدیقی ضخامت ۴۱۶ صفحات، مجلد (شعرا کی ایک سو ایک تصویروں کے ساتھ) قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ "پرچم" حسن علی آفندی روڈ، کراچی!

جناب مظہر صدیقی ماہنامہ "پرچم" کے مدیر اور حضرت سیماب کے صاحبزادے ہیں سیماب مرحوم نے فرمایا تھا۔

؎ سلسلۂ شعرِ مہذب کا مرے گھر سے چلا

تو مظہر صاحب نے جس سلیقہ اور تہذیب کے ساتھ شعرائے پاکستان کا یہ تذکرہ مرتب کیا ہے، وہ اُن کے والد بزرگوار کے اس دعوے کا بولتا ثبوت ہے!

دس بیس نہیں دو سو پچیس شاعروں کے خود نوشت حالات، خود اُن کے انتخاب کئے ہوئے کلام کے ساتھ اس تذکرہ میں موجود ہیں، پاکستان بننے کے بعد اس طرز کی یہ پہلی ادبی پیشکش ہے جو منظرِ عام پر آئی ہے، اس تذکرے سے جو اشعار ہم نے ایک نظر میں منتخب کئے ہیں، وہ قارئینِ "فاران" کی آسودگیٔ ذوق اور تفریحِ وجدان کے لئے پیش کرتے ہیں :۔

وہیں زندہ یہ واعظ کے بس کی بات نہیں ... تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں
عجب نہیں جو محبت ہو زندۂ جاوید ... کہ عرضِ شوقِ نفس دو نفس کی بات نہیں

...

لے کم تنخواہ کسی قیمت پر بھی نہ بیچ ... دل ایک ہی تو چیز ہے اس کا بدل کہاں

...

ہر شخص بنالیتا ہے اخلاق کا معیار ... خود اپنے لئے اور زمانے کے لئے اور (اسد ملتانی)

...

رستہ ہو بت کدے کو بھی اُس جلوہ گاہ کا ... شاید حرم سے پھیر ہو تھوڑا سا راہ کا (اطہر ہاپوڑی)

...

آج چہکے گلوں کے زرد لبے ... شاید ان سے بھی اہلِ درد ملے (اطہر نفیس)

...

کہاں کا اُجالا کہاں کی سحر ... ہے شیشوں میں بند آفتاب آج تک
نہ جانے کتنے سورج ہوگئے پیوندِ خاک اب تک ... زمیں کا دوسرا رُخ آسماں معلوم ہوتا ہو
کچھ اپنے اعتبارِ نظر سے بھی کام لے ... چل کارواں کے ساتھ مگر راہبر سے دور (بہار کوٹی)
گرتے ہیں اُجائیں، اشکوں کے گوہر ... کتنا لٹے گا غم کا خزانہ
یوں گناہوں کی سزا دیتی ہو رحمت دیکھنا ... رونقِ بزمِ جہاں اک لغزشِ آدم سے ہو (رشید تبسم)
کل یک بہ یک کہیں سرِ محفل وہ آگئے ... سب رند رہ گئے مے و ساغر لئے ہوئے (جلیل قدوائی)
یوں اُس گلی میں گزرا زمانہ ... بیتاب جانا، مایوس آنا
ہے سامنے منزل تو نہیں پاؤں میں دم اور ... ہمت کا تقاضہ ہے کہ دو چار قدم اور
فائدہ کیا کہ بات بھی جائے ... آپ کو کچھ خیال ہو تو کہیں
آپ ہی کا خیال ہے ہم کو ... اور کوئی خیال ہو تو کہیں (حامد لکھنوی)
بہزار نامرادی مجھے تیری ہی تمنا ... بہزار بے نیازی مجھے تیری ہی ضرورت (حسرت ترمذی)
کہیں کہیں ہے مسرت مگر بہت محدود ... خوشی ضرور ہے لیکن کسی کسی کے لئے (خمار انصاری)
ان کو دیکھا تو محبت بھی سمجھ میں آئی ... ورنہ اس لفظ کی تعریف سنا کرتے تھے (آلِ رضا)
اجازت ہے تمہارا نام لکھ لوں ... مرے دل کا ورق سادہ ہے اب تک (رئیس امروہوی)
کیا ہوا گر ترے آنچل کا کنارہ نہ ملا ... میرا آنسو ہی تو تھا گردشِ آوارہ تو نہ تھا (سرشار صدیقی)
ہے کائنات میں روشن اسی سے شمعِ حیات ... جو غم نہیں تو اندھیرا ہے آدمی کے لئے (شاعر لکھنوی)
فطرت ہی بدل دی مری بے بال و پری نے ... ڈرتا ہوں قفس سے کوئی آزاد نہ کردے (طاہر دیوبندی)
چاندنی اور اداس تنہائی ... تم ہو کس حال میں خدا جانے
سنا ہو تم نے شاید میرے ہمسایوں میں چرچا ہو ... کہ اکثر رات کو رونے کی اک آواز آتی ہے
بے نیازانہ برابر سے گزرنے والے!! ... تیز کچھ قلب کی رفتار ہوئی تھی کہ نہیں (عندلیب شادانی)
یوں بھی گزری ہے زندگی برسوں ... نہ قفس تھا نہ آشیانہ تھا
توبہ توبہ یہ ترے حُسن کا مغرور انداز ... دیکھنے والا بھی مغرور ہوا جاتا ہے (فرخ اصفہانی)
چاہتا ہے نظمِ محفل اک مکمل انقلاب ... چند شمعوں کے بھڑکنے سے سحر ہوتی نہیں
بہت نازک ہیں آدابِ محبت ... نظر سے کام لیتا ہوں جبیں کا
آج ہی شکوۂ بیداد کا آیا تھا خیال ... آج ہی تیری مدارات بہت یاد آئی (قابل اجمیری)
آدابِ بزمِ ناز کا احساس ہے مجھے ... ایسا بھی کیا کہ لے نہ سکوں تیرا نام بھی (مشتاق مبارک)
چٹک لے کلی لیکن آہستگی سے ... یہ آواز گوشِ خزاں تک نہ پہنچے (محشر بدایونی)
خزاں اُدھر سے کبھی بھول کر نہیں گزری ... حضور جس روشِ گلستاں سے گزرے ہیں
رہِ حیات میں تھا گرچہ حادثوں کا ہجوم ... گزرنے والے مگر درمیاں سے گزرے ہیں (مضطر اکبرآبادی)

اُس میں جگہ جگہ "صنعتِ اہمال" سے کام لیا گیا ہے۔ ۔۔ ۔۔

"جسندہ آہنگ جو سابقہ نظم لہریہ آہنگ[1] سے صریحاً مختلف ہے اور ہماری شاعری کو عروضی حیثیت سے نئے راستے پر ڈال دیتی ہے، میری حالیہ کوششوں میں داخل ہے، میں اسے شاعرانہ موسیقی کا "تیورپن[2]" قرار دیتا ہوں، یعنی سُروں کا اُتار چڑھاؤ موسیقی کی طرح عمودی ہے اُفقی نہیں، اس آہنگ کی وضع یونانی نہیں۔ ۔۔ ۔۔ بول تیکھے[3] ہیں سُریلے نہیں اگرچہ اس تیکھے پن میں جری قسم کا سُریلا پن ہے، تفصیل کی بجائے شوخ نکتے ہیں۔ ۔۔ ۔۔"

اور یہ بھی آپ نے ارشاد فرمایا ہے :—

"ایک مفکر کی حیثیت سے میری انتہائی کوشش یہ ہے کہ کسی نظریہ شخصیت یا اسلوب میں گم ہو جانے کی بجائے اپنا زاویۂ نگاہ پیدا کیا جائے اور سلسلۂ فکر کو اس حد سے آگے بڑھایا جائے، جس حد تک ہمارے پیش رو بالخصوص اقبالؔ اسے پہونچا چکے ہیں —"

خاورؔ صاحب نے پہلے تو اپنے بارے میں یہ فرض کر لیا ہے کہ آپ "مفکر" ہیں۔ ۔۔ ۔۔ پھر یہ کوشش کی ہے کہ اقبالؔ جہاں تک شاعرانہ فکر کو پہونچا گئے ہیں اُسے آگے بڑھایا جائے۔ ۔۔ ۔۔ لوگ کیسی کیسی غلط اندیشیوں میں مبتلا ہیں اور اپنے بارے میں کیا کیا رائے رکھتے ہیں۔

اقبالؔ کی حدِ فکر سے جو صاحب آگے بڑھنے کی کوشش میں مصروف ہیں، اُن کی نظم کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے :-

دھوپ سراسر دھوپ کا عالم سورج اپنے جوبن پر
کرتی تھیں سرگوشیاں باہم جیسے کھنکتے ہوں زیور

"دھوپ سراسر دھوپ کا عالم" آخر یہ کیا بات ہوئی! پھر زیور کی آواز کو "کھنکنا" نہیں کہتے! اور سرگوشی اور زیور کی آواز میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔

آناً فاناً صندل کی نکہت چاروں جانب پھیل گئی
ہر اک پیڑ میں برق کی صورت حُسن کے اُس کی سیل گئی

یہ آخری شعر ہر اعتبار سے کس قدر بے جوڑ، غیر متوازن اور کمزور ہے۔ ۔۔ "حُسن کے اُس کی سیل گئی" کسی صاحبِ ذوق اور شستہ مذاق شاعر کی زبان سے ایسا مصرعہ سوتے میں بھی نہیں نکل سکتا —— اور اُس پر دعوے ہیں اقبالؔ کی ہمسری ہی نہیں بلکہ برتری کے —— کیا خبر تھی کہ اُردو ادب کو ایسے حادثوں سے بھی گزرنا ہوگا ——

"شعرستان" کا مطالعہ بہر حال دلچسپی سے خالی نہیں ہے، اس کے ترتیب دینے والوں نے کاغذ کی اس ہوشربا گرانی کے زمانے میں بڑے حوصلے سے کام لیا ہے!

[1،۲،۳] "لہریہ آہنگ" اور "تیورپن" — یہ کیا ترکیبیں ہیں؟ پھر وہ کیسے "بول" ہیں جو سُریلے تو نہیں ہوتے مگر پھر بھی تیکھے ہوتے ہیں۔ ایک ہی سانس میں یہ بھی کہتے ہیں کہ بول "تیکھے ہیں سُریلے نہیں ہیں" اور اُسی سانس میں یہ بھی فرماتے ہیں اگرچہ اُس تیکھے پن میں جری قسم کا سُریلا پن ہے"! شاید "بزدلانہ قسم کا سُریلا پن" بھی ہوا کرتا ہے —

؎ بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو!

چراغِ راہ "اشاعتِ خاص"

"چراغِ راہ" اشاعتِ خاص" مرتبہ:۔ نعیم صدیقی، ضخامت ۲۲۸ صفحات، قیمت تین روپیہ چار آنہ (سالانہ چندہ پانچ روپیہ، اشاعتِ خاص سمیت سات روپیہ) ملنے کا پتہ:۔ دفتر "چراغِ راہ" ۹۔ لوٹیا بلڈنگ، آرام باغ روڈ، کراچی۔

"چراغِ راہ" پاکستان کا مشہور ماہنامہ ہے، جو بڑا اعتبار سے "اسلامی ادب" کا صحیح نمایندہ ہے اور شعر و ادب اور دین و اخلاق میں جس کی خدمات نہایت گراں قدر ہیں، آج چاہے کوئی اس کے احسان کو نہ مانے اور اس کی اہمیت کو تسلیم نہ کرے لیکن "آنے والے ادبی ناقد اور مورخین اعتراف کریں گے کہ ماہنامہ "چراغِ راہ" نے پیچ پیچ ظلمتوں میں چراغ روشن کئے تھے!

"چراغِ راہ" کا یہ "خاص نمبر" بڑے اہتمام سے منظر عام پر آیا ہے، جسے چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے — (۱) ادبی و تنقیدی مقالات (۲) نظمیں اور غزلیں (۳) افسانہ و طنز اور (۴) جائزہ پاکستان! مقالے معیاری اور بلند سے بلند تر ہیں، خاص طور سے جناب نعیم صدیقی کا مقالہ "اسلامی ادب کا فلسفیانہ پس منظر" اس حصّہ کی جان ہے، اس مقالہ کے دو مختصر سے اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

> "جس تہذیب نے چار چھ صدیوں میں یہ سماں پیدا کیا ہے، اس کی ناکامی کا حال یہ ہے کہ اس نے کھیتوں کی پیداوار کئی گنا بڑھا دیں مگر آدمی آج پہلے سے زیادہ بھوکا ہے، تیز رفتاری سے اس نے ضروریاتِ زندگی پیدا کرنے کے لئے مشینوں کے انبار جیا کر دیئے ہیں اور بھاپ اور بجلی کے ہیبت ناک دیو مسخر کرکے پیش کر دیئے ہیں مگر آدمی آج پہلے سے زیادہ محتاج اور محروم ہے! اس نے شہر شہر اور قریے قریے میں تعلیم گاہیں کھول دی ہیں مگر آدمی اپنی حقیقت کے بارے میں پہلے سے زیادہ جاہل ہے
>
> ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
>
> ہاں! اس تہذیب نے امن کے بچاؤ کے لئے اسلحہ خانہ بھر دئے ہیں، لیکن آدمی آج پہلے سے زیادہ خوف زدہ ہے،
>
> —— "اسلامی ادب ایک صدائے احتجاج ہے تہذیبِ حاضر کے خلاف، ایک اعلانِ جنگ ہے مروجہ فلسفہ و فکر کے مقابل"

افسانوں میں جیلانی۔بی۔اے کا افسانہ —— "تعلیم تین باجوہ افسانہ نگاری کا شاہکار ہے"، "اوبہ" کے بعد جیلانی نے یہ دوسرا غیر فانی نقش پیش کیا ہے، ٹیک ٹک زبان، پلاٹ آغاز اور انجام غرض ہر چیز خوب سے خوب تر ہے — —— نعیم صدیقی نے "میرا گاؤں" میں پنجاب کے دیہات کی زندگی کی کامیاب عکاسی اور اس ماحول کی صحیح ترجمانی کی ہے —— گاؤں کی چوپال پر افسانہ نگار نے چند لفظوں میں کس قدر واقعاتی تبصرہ کیا ہے ——

> "اس چوپال میں جھگڑے چکائے بھی جاتے ہیں اور اسی سے جھگڑے کھڑے بھی ہو جاتے ہیں ۔ ۔ ۔"

افسانہ نگاروں میں محمودؔ فاروقی کی کمی محسوس ہوئی!

نظمیں اور غزلیں بھی خاصی جاندار اور دلچسپ ہیں، مگر نثر کے مقابلہ میں نظم کا حصّہ کمزور ہے، نظموں کے انتخاب میں شدت کی ضرورت تھی، چاہئے اٹھائیس تیس غزلوں اور نظموں میں چھٹ چھٹا کر آٹھ دس نظمیں اور غزلیں ہی کیوں نہ رہ جاتیں ——

(صفحہ ۲۶) "لیکن ان نغموں میں جو تجسس اور استفہام کی کسک ہے" یہ پورا جملہ ہی "ترقی پسندانہ" ہے۔ ——— (صفحہ ۵۷) "تعمیرِ نو کا نقشہ اگرچہ دوسرا ہے، لیکن اس میں مواد (MATERIAL) تو وہی لگے گا" یہاں "مواد نہیں" "مسالہ" کا محل تھا ——— (صفحہ ۱۴۳) "پستہ قد اور گدر عورت" "گدر" پھل کی صفت ہے، انسانوں کو گدر یا پکا ہوا نہیں کہتے ——— (صفحہ ۱۴۴) "اس نے عہدِ طفولیت میں معروف کھیلیں دور سے دیکھی تھیں" "کھیل" مذکر ہے، مؤنث نہیں ——— (صفحہ ۱۴۸) "اس کی روح پگھل رہی تھی" "تحلیل ہو رہی تھی" لکھنا چاہئے تھا، "روح" کے ساتھ پگھلنے کا کیا جوڑ ——— (صفحہ ۱۴۸) "بدنی خواہشات" "جسمانی خواہشات" موزوں تر تھا ——— (صفحہ ۱۴۹) "مدینہ کی شاہراہ رہزنوں سے اٹی پڑی تھی" "بھری پڑی تھی" یا "پٹی پڑی تھی" لکھنا تھا "اٹنا" گرد وغبار کے لئے بولتے ہیں ——— (صفحہ ۱۵۰) "بڑے بڑے الفاظ بالکل بنجر اور ویران تھے" ——— لفظوں کو "بنجر" اور "ویران" پہلی مرتبہ سُنا ——— (۱۹۲) "صبح مٹکا اوندھا کر سیر بھر دہی لیا" ——— مٹکے کو اوندھایا جائے گا تو قریب قریب سارا ہی مٹکے سے نکل پڑے گا، "مٹکے کو ٹیڑھا کرکے" لکھنا چاہئے تھا ——— (صفحہ ۱۶۶) "دیتو نائی دس بارہ سال سے "رانڈ" پڑا تھا" ——— بیوہ (عورت) کو رانڈ کہتے ہیں، اور وہ مرد جس کی بیوی مرجائے "رنڈوا" کہلاتا ہے ——— (صفحہ ۲۷۲) "اور اوزارات مستعار طور پر یا نقد قرضہ کے ذریعہ مہیا کئے جاتے" ——— اوزار کی جمع (اوزارات) سے وجدان پر کتنی تکلیف دہ چوٹ پڑتی ہے۔

اور اسلام کو دُنیا میں نگینے کی طرح — زندگانی کے ہر اک فعل میں جڑنا ہو مجھے (صفحہ ۱۲۲)

پورا شعر آورد ہی آورد ہے، اس خیال کو دوسرے لفظوں میں ادا کرنا چاہئے تھا۔

نظموں میں جہاں "ترقی پسندانہ" رنگ پیدا ہوگیا ہے، وہاں شعریت خاک میں مل گئی ہے، اسلامی افسانہ نگاروں اور شاعروں کو اس انداز سے اجتناب کرنا چاہئے، کہ ترقی پسندوں کا اسلوبِ نگارش اربابِ ذوق اور اہلِ علم کے نزدیک پسندیدہ اور معتبر نہیں ہے، یوں شعراء حضوری اور مروت کی اور بات ہے کہ کوئی زبان سے کچھ نہ کہے یا تھوڑی بہت تعریف کردے۔

جناب حمید اللہ صدیقی کا مقالہ خوب ہے مگر "ترقی پسند ادب" پر انھوں نے اس انداز میں تنقید کی ہے کہ اُس کے معائب کے مقابلہ میں محاسن زیادہ نمایاں ہو گئے ہیں۔!

"چراغِ راہ" کی اس اشاعتِ خاص نے مجموعی طور پر "اسلامی ادب" کو کچھ اور آگے بڑھا دیا ہے۔!

الحسنات "قرآن نمبر"

"الحسنات کا قرآن نمبر" مرتبہ:۔ ابو سلیم محمد عبدالحیؔ ضخامت ۱۴۴ صفحات، دو رنگ کا سرِ ورق، قیمت ایک روپیہ چار آنہ ——— سالانہ چندہ پانچ روپیہ آٹھ آنہ ——— ملنے کا پتہ:۔

مکتبہ الحسنات رام پور (یو۔پی۔ ہندستان)

"الحسنات" مشہور پندرہ روزہ رسالہ ہے جو مہینہ میں دو بار لڑکوں، لڑکیوں اور عورتوں کے سامنے نہایت آسان اور دلنشین زبان میں دین کی دعوت پیش کرتا ہے، اسی دینی

اصلاحی اور تبلیغی رسالہ کا "قرآن نمبر" ہمارے سامنے ہے، جسے بڑے سلیقہ، کمال خلوص اور دینی جذبہ کے ساتھ مُرتب کیا گیا ہے۔

"قرآن نمبر" کا ہر مضمون نہ صرف یہ کہ پڑھے جانے کے قابل ہے بلکہ اس کا مستحق ہے کہ مسلمان اُسے اپنے دلوں میں اُتار لیں، نظمیں بھی ہلکی پھلکی اور مقصد کے عین مطابق ہیں، مضامین یُوں تو سبھی اچھے ہیں مگر فاضل ایڈیٹر کے مقالات کے علاوہ مولانا ابو الحسن علی ندوی، مولانا سید حامد علی اور اسلام اللہ صاحب پریمی کے مضامین نے اس شمارہ کی قدر و قیمت میں اور اضافہ کر دیا ہے!

کچھ لوگ فحش افسانوں، عُریاں تصویروں، اور قمار بازی کے معموں کو رسالوں میں چھاپ کر روزی کماتے ہیں اور جناب ابو سلیم محمد عبدالحی صاحب نے دینی خدمت کو فکر و ادب کا موضوع بنا لیا ہے، اپنی اپنی ہمت اور اپنے اپنے ذوق اور ظرف و حوصلہ کی بات ہے! اللہ تعالیٰ "الحسنات" کے کارکنوں کی مدد فرمائے کہ بھارت کے ظلمت کدے میں یقین و ایمان کے چراغ روشن کئے ہوئے ہیں اور کسی خطرے کی پروا نہیں کرتے!

(مطبوعہ ادبی پریس رابسن روڈ کراچی۔ پرنٹر و پبلشر ماہر القادری)

RAHMAN
PRINTING
PRESS